مصنف

نمبر ۶

مجلس مصنفین علیگڑھ کا سہ ماہی علمی رسالہ

مدیر و ناشر

سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ)

قیمت سالانہ: للعہ چار روپے

دفتر

مصنف کانفرنس کمپاؤنڈ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ!!

باہتمام خانصاحب جواہر خاں

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں (کتبہ حافظ عبدالرحمن) طبع ہوا

بحث پر نکلتے ہوں۔ مقام مسرت ہے کہ "انجمن ترقی اردو" نے اس کمی کا احساس کرکے "معاشیات" کا اجرا کیا اور ایک بہت بڑی قومی ضرورت کو پورا کیا۔ مضامین کی ترتیب میں کافی محنت اور سلیقہ سے کام لیا گیا ہے۔ ایڈیٹر طفیل احمد خاں ایم۔ اے۔

ملنے کا پتہ:۔ انجمن ترقی اردو دہلی

ماہنامہ "رازِ ترقی" ایڈیٹر خاں بہادر شیخ عبداللہ صاحب ایڈوکیٹ۔ سکریٹری گرلس کالج علیگڑھ علامہ راشد الخیری مرحوم۔ اور سید امتیاز علی صاحب تاج مرحوم کی طرح شیخ عبداللہ صاحب کا بھی شمار طبقۂ نسواں کے محسنین میں ہے۔

عرصۂ دراز سے صاحب موصوف طبقۂ نسواں میں تعلیم جدید کی ترویج و اشاعت کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اب ان کی ہمتِ بلند نے ایک ماہوار رسالہ "رازِ ترقی" کے اجرا کی صورت میں ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ مضامین سب اچھے ہیں۔ بالخصوص قمر آزاد صاحبہ کا مضمون تعلیم یافتہ خواتین کے لئے درسِ عبرت کے بہت سے پہلو لئے ہوئے ہے

تعلیم بالغات کے سلسلہ میں علیگڑھ شہر میں کام کرتے ہوئے ہمیں بھی ان تلخ حقائق کا بارہا مشاہدہ ہوا ہے۔ لیکن اعلیٰ طبقہ کی بیگمات کے اُن بگڑے ہوئے تیوروں نے جو عوام کا نام آتے ہی ان کی پیشانیوں پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ اظہارِ خیال کا موقع نہیں دیا۔ خدا کرے عزیزہ قمر آزاد اپنی عملی خدمات سے اس گہری خلیج کو پاٹنے میں کامیاب ہوں۔ جو اس وقت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور عام جاہل خواتین کے درمیان حائل ہے۔

ادب پارے از مولوی ضیاء الاسلام صاحب ایم۔ اے ڈپٹی کلکٹر۔ مصنف "دامِ خیال" و "گلمسز آف ماڈرن اردو لٹریچر" ناشر حلقۂ ادب ۱۳ اسٹینلے روڈ الہ آباد۔ قیمت عہ/

یہ کتاب جناب ضیاء الاسلام صاحب کی نثری تقاریر کا مجموعہ ہے۔ جس میں چند قدیم و جدید شعراء و نثر نگاروں پر ایک نظر اور چیدہ کتب پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ بالغ نظر نقاد نے جدید اصول تنقید سے کام لیکر موجودہ ادبی رجحانات پر بے لاگ اظہار رائے کیا ہے۔ ضیاء صاحب کو چونکہ اُردو ادب سے بیحد دلچسپی ہے۔ اس لئے اُن کی دلی تمنا ہے کہ ہماری زبان کے نظم و نثر نگار اپنی منزلت کے اعتبار سے ہی درجہ پائیں جو زندہ قومیں اپنے اہل علم کے ساتھ روا رکھتی ہیں۔ تقریریں مختصر ہیں اسلئے موضوع تشنہ

مُصنّف

جلد ۲	بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۴۴ء	نمبر ۶

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	ذکر ماضی اور فکر فردا	سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ)	۲ تا ۱۶
۲	ایرانِ قدیم میں دنیا کی پانچویں شہنشاہی	مولانا سید مفضل احمد صاحب	۱۷ تا ۳۰
۳	اردو شاعری کی تنقید میں چند اصولی بحثیں	ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی صاحب ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی (علیگ)	۳۱ تا ۵۰
۴	مسئلۂ علم کے متعلق چند علمائے اسلام کے نظریے	مولانا یعقوب بخش صاحب راغب بدایونی	۵۱ تا ۷۱
۵	خط و خطاطی اور اسکی مختصر تاریخ	شیخ ممتاز حسین صاحب جونپوری	۷۲ تا ۱۰۵
۶	حُسن معروضی ہے یا موضوعی؟	پروفیسر میاں محمد شریف صاحب ایم اے (کینٹب)	۱۰۶ تا ۱۲۳
۷	جامعۂ عثمانیہ کی ادبی زندگی	سید اظہر حسین رضوی صاحب معاون مدیر اخبار سلطنت۔ حیدرآباد دکن	۱۲۴ تا ۱۵۸
۸	خود شناسی کی ضرورت اور مشکلات	مولوی نصیر الحق صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) سب جج ریاست بھوپال	۱۵۹ تا ۱۶۵
۹	تاریخی نوادر ← انگریزی نظامِ تعلیم سے مسلمان کیوں علیحدہ رہے؟	مترجمہ پروفیسر عبد الباسط صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی۔ اسلامیہ کالج۔ لاہور	۱۶۶ تا ۱۶۷
۱۰	اردو نثر کے بہترین نمونے ← ’الہلال‘ کا پہلا مقالہ افتتاحیہ	مولانا ابو الکلام آزاد صاحب	۱۶۸ تا ۱۸۱
۱۱	تبصرے	اظہر رضوی	۱۸۲ تا ۱۸۴

ایک دوسری نظم کا عنوان "قومی لیڈر" ہے اس میں ان کے مخاطب وہ ابن الوقت لیڈر ہیں جن کی رہنمائی کا انحصار اخبارات کو بیانات دیدینے اور جلسوں میں دامن بچا بچا کر ملکی تقریر کر دینے پر ہے ؎

تفنگ و تیر و شمشیر و تبر سے ان کو کیا نسبت
یہ فاتح کاغذی دنیا کے ہیں مردِ صحافت ہیں

ایک اور نظم "بیدار ئے اسلام" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

گرمِ جہاد بن کر پھر سخت کوش بن جا — پھر بت شکن نظر آ پھر سرفروش بن جا
اے تیغ مردِ مومن اس طرح موجزن ہو — یہ لاش اکثریت ایک جسم بے کفن ہو

اگر نکہت صاحب نے اسی سلامت روی کے ساتھ جیسی کہ ان سے توقع ہے شعر و ادب کی خدمت جاری رکھی تو آیندہ ان کا شمار ملک کے مشہور قومی شعراء میں ہوگا۔ "چمن زار" ملنے کا پتہ علی بھائی ۳۷۳ رحمت اللہ روڈ بمبئی۔ قیمت تین روپیہ چار آنہ۔ ؎ ۳ر

نگار کا انتقاد نمبر

جناب نیاز فتحپوری ملک کے اُن مایۂ ناز ادیبوں میں سے ہیں جو بلاشبہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

دُنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان کے دَورِ ارتقاء کی تاریخ پر نظر ڈالو، ادیب اور تنقید نگار شانہ بشانہ دکھائی دیں گے۔ درحقیقت زبان کو معراجِ ترقی پر پہنچا دینے کا کام ادیب سے زیادہ تنقید نگاروں نے کیا۔ وہ ایک ایسی کسوٹی ہیں جس پر سونا کندن بنتا ہے۔ اُردو میں اس موضوع پر اب تک اس قدر کم لکھا گیا ہے کہ جو کچھ ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے اُردو کی اسی کمی پر کہا تھا۔ ع

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

نیاز صاحب اپنی دوسری ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ فنِ تنقید پر بہترین مواد نگار کے ذریعہ ہمیشہ دیتے رہے ہیں مستقبل میں انھیں کی بنائی ہوئی شاہراہوں پر چل کر ہماری نوخیز نسلیں اُردو کو دنیا کی ایک ترقی یافتہ زبان بنا سکیں گی۔

ماہنامہ معاشیات

معاشیات اور اقتصادیات جیسے اہم اور ضروری مضامین پر اردو میں ایک دو ہی رسالے ہوں گے جو ... اردو داں طبقہ کی کوئی خاص توجہ نہیں ہے۔ یہی وجہ

تصانیف سید الطاف علی بریلوی

حیات حافظ رحمت خاں — روہیلکھنڈ کے مشہور روہیلا سردار حافظ الملک حافظ رحمت خاں شہید کی اردو زبان میں پہلی مکمل و مبسوط باتصویر سوانح عمری جس میں اٹھارویں صدی عیسوی میں روہیلہ قوم کے کارنامے اور ولولہ انگیز حالات نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ملک کے طول و عرض میں مقبولیت عام حاصل کر چکی ہے۔ حجم ۳۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد ۴ روپے۔

مسلمانوں کی تعلیمی جد و جہد — (بزبان انگریزی) اس کتاب میں ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے اس وقت تک کی مسلمانان ہند کی بالخصوص اور مسلمانان یو۔پی کی بالعموم تعلیمی کوششوں اور عہد بعہد کی جد و جہد کو تفصیل کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ آنے۔

مسلمان کی دنیا — مصنف نے اپنی دو سالہ سیاحت یورپ کے تاثرات اور مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے اسباب و علل کو افسانہ کی شکل میں مرتب کیا ہے۔ قیمت چھ آنے۔

معرکۂ انتخاب جداگانہ و مخلوط — جداگانہ یا مخلوط کونسا طریقۂ انتخاب مسلمانوں کے لئے مفید ہے۔ اس سوال کا جواب عام فہم زبان میں دیا گیا ہے۔ قیمت دو آنہ۔

رباعیات عرش فاروقی — بریلی (روہیلکھنڈ) کے ایک باکمال نوجوان شاعر و ادیب منشی اعتماد الدین احمد عرش فاروقی مرحوم کے درد انگیز حالات زندگی اور بطور نمونہ کلام ان کی پُرکیف اور رباعیات کا مجموعہ۔ قیمت چھ آنے۔

صوبۂ متحدہ میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم — دوسری اقوام کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اپنی تعلیمی ترقی میں جو شدید مشکلات اور رکاوٹیں درپیش ہیں ان پر نہایت مؤثر مقالہ ہے ساتھ ہی حل مشکلات کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ قیمت آٹھ آنے۔

نواب دوندے خاں — (بزبان انگریزی و اردو) حافظ الملک حافظ رحمت خاں اور امیر الامراء نواب نجیب الدولہ کے ہمعصر اور شریک کار عزت الدولہ دلاور الملک نواب دوندے خاں بہادر بہرام جنگ کے مجاہدانہ واقعات اور سرفروشانہ حالات کا مجموعہ اور مرہٹہ قوم سے نبرد آزمائی کا مرقع ہے۔ قیمت چار آنے۔

غلام قادر روہیلہ (سلطنت مغلیہ کا آخری محافظ) — بزبان انگریزی و اردو (زیر طبع)۔
قیمت ۰ر

ملنے کا پتہ

مینیجر کانفرنس بک ڈپو سلطان جہاں منزل، علی گڑھ (یو۔پی)

کانفرنس گزٹ علی گڑھ

یعنی

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا تعلیمی و اصلاحی اخبار

جو زیر نگرانی

نواب صدر یار جنگ بہادر آنریری سکرٹری کانفرنس

مہینہ میں چار بار شائع ہوتا ہے اور اس میں علی گڑھ تعلیمی تحریک، مسائل تعلیم و تربیت، موجودہ نظام تعلیم اور اصلاح تمدن و معاشرت پر بحث کیجاتی ہے۔ ہندوستان کے اسلامی پریس نے نہایت عمدہ و حوصلہ افزا الفاظ میں اس پر ریویو کیا ہے اور اس کے اخلاقی و اصلاحی بلند پایہ مضامین کی خاص طور پر مدح و ستائش کی ہے۔ طلبہ، اساتذہ، والدین اور عام ناظرین غرض سب کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور ضروری ہے۔ اخبار بہت عمدگی اور نفاست سے اچھے کاغذ پر چھپتا ہے اور متعدد تعلیم یافتہ و لائق اصحاب اس میں بلند پایہ مضامین لکھتے ہیں اور جدید تالیفات پر خاص اہتمام سے ریویو کرکے ارباب تالیف کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ نمونہ ایک کارڈ لکھنے پر مفت ملتا ہے۔ جو اصحاب بادائے قیمت پیشگی اخبار کے خریدار ہوں گے اُن کی خدمت میں دو کتابیں یعنی التربیۃ والتعلیم ضخامت ۱۵۰ صفحہ اور رسالہ تمدن و معاشرت ضخامت ۸۰ صفحہ ہدیۃً پیش کش کی جائیں گی۔ یہ دونوں کتابیں نہایت مفید و قیمتی مضامین پر مشتمل ہیں، جو تعلیم و تربیت، مذہب اور اصلاح معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ کانفرنس گزٹ کی سالانہ قیمت تین ۳ روپیہ ہے۔ جنگ کی وجہ سے قیمت میں اضافہ نہیں کیا گیا۔

ایڈیٹر:۔ محمد اکرام اللہ خاں ندوی

ملنے کا پتہ

صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علیگڑھ یو۔پی

مشہور فرم کے ایک ذمہ دار کارکن ہیں آپ نے ازراہ مہربانی سیٹھ صاحب موصوف کی "جگادھری پیپر مل" سے کنٹرول نرخ پر ہمیں اسقدر کاغذ دلا دیا کہ آیندہ دسویں شمارہ تک مصنف کا نقش فریادی، کم از کم "کاغذی پیرہن" کے لئے کسی تیاتتا بھگوان کا ناکام بھکاری نہ بنے گا۔

مجلس مصنفین کے اخراجات کے علاوہ صرف مصنف کے لئے ہمیں بارہ سو روپیہ سال کی ضرورت ہوتی ہے۔ ۲۵ اگست ۴۲ء تاریخ قیام مجلس سے اس وقت تک اس خصوص میں جن جن احباب اور بزرگوں نے جس جس طور پر معاونت فرمائی اس کی تفصیلات مجلس کی سالانہ رپورٹوں اور مصنف میں شائع ہوتی رہی ہیں لیکن ابھی تک کسی کریم النفس ساقی نے "بقدر ظرف" ہماری "تشنہ کامی" کو سیراب نہ کیا تھا۔

یہ امتیاز ہمارے صوبہ متحدہ کی سب سے بڑی اور واحد اسلامی ریاست مصطفیٰ آباد عرف رام پور کو حاصل ہوا۔ ۲۲ فروری ۴۴ء کو "رضا اکیڈمی" اور "یوم غالب" کے جلسے تھے۔ محب گرامی مولانا امتیاز علی خانصاحب عرشی کی وساطت سے عالیمرتبت جناب سید بشیر حسین زیدی صاحب سی۔ آئی۔ ای۔ بی۔ اے (آکسن) بار ایٹ لا وزیر اعظم ریاست رام پور کی دعوت پر ہمیں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ رام پور کی روایتی مہمان نوازی اور جناب زیدی صاحب کی عنایاتِ خاص سے متمتع ہونے کے علاوہ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اعلیٰ حضرت حضور ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر ریاست رام پور کی ترقی پسند گورنمنٹ نے مصنف کے لئے تین سو روپیہ سالانہ کی "مستقل امداد" منظور فرما دی۔ مصنف کی بنیادوں کو پائیدار بنانے میں امداد مذکور کس قدر قیمتی ثابت ہوگی اسکا اظہار الفاظ میں ناممکن ہے ؎

سعدی ثنائے تو نہ تواند بشرح گفت — خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست

دوسری بروقت معاونت جس نے ہم کو قرض کے موجودہ بار سے سبکدوش کر دیا۔ نیز میر عزیز الرحمٰن صاحب کے دلوائے ہوئے کاغذ کو فوراً خریدنے کے قابل بنایا حیدرآباد سے ہوئی۔

کچھ عرصہ گذرا مخدومی نواب علی یار جنگ بہادر ایم۔ اے (آکسن) معتمد امور دستوری سلطنت آصفیہ حیدرآباد دکن سے مجلس کی امداد کے لئے درخواست کی گئی تھی۔

روہیلہ علی گڑھ

(ایک انگریزی ماہوار رسالہ)

جسطرح آج بیسویں صدی عیسوی میں "مسلم لیگ" اور "کانگریس" کی ہندوستان میں حصولِ اقتدار کے لئے قانونی اور دستوری لڑائی ہو رہی ہے۔ اسی طرح پوری اٹھارویں صدی عیسوی اور انیسویں صدی کے نصف اوّل میں روہیلہ مسلمانوں اور غیر مسلم مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں وغیرہ کے درمیان شمشیر و سناں اور توپ و تفنگ کی جنگ جاری تھی۔ حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ کے ۱۷۰۷ء میں وصال کے بعد جب سلطنتِ مغلیہ زوال پذیر ہوئی۔ تو یہ کشمکش شروع ہو گئی۔

پچاس سال کی مسلسل تیاری اور چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کے بعد ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں روہیلوں کو فتح عظیم اور مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی۔ اسی زمانہ میں صوبۂ فرخ آباد۔ روہیلکھنڈ اور مغربی دوآبہ میں نواب احمد خان بنگش۔ حافظ الملک حافظ رحمت خاں اور نواب نجیب الدولہ کی علی الترتیب تین ۳ نہایت طاقتور حکومتیں قائم تھیں۔ اور ساتھ ہی روہیلہ سردار نواب نجیب الدولہ دس سال تک دہلی میں سلطنتِ مغلیہ کے وزیر اعظم اور کمانڈر انچیف افواج کی حیثیت سے آمرِ مطلق رہے۔ عہدِ زوال سلطنتِ مغلیہ میں مسلمانوں کے لئے یہ بہترین زمانہ تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران میں ان حکومتوں کا دوبارہ احیاء ہوا۔ غرض روہیلوں کی تاریخ اور اُن کے جنگی و سیاسی کارنامے حد درجہ ولولہ انگیز اور سبق آموز ہیں۔

آج شکست خوردہ اقوامِ ہند کی تاریخ و سیاست کو بڑھا چڑھا کر دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ اُس پر لاکھوں روپیہ صرف ہو رہا ہے۔ صدہا کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور متعدد کثیر الاشاعت جرائد جاری ہیں۔ لیکن ہماری غفلت اور بے حسی سے بہادر و غیور روہیلے گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ اُنکے وطن روہیلکھنڈ کی وحدانیت اور اُس کا نام بھی مٹانے کی کوشش ہو رہی ہے۔

راقم السطور نے اس صورتِ حال سے متاثر ہو کر بیز اسوجہ سے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی کی تاریخ و سیاست ہی ہماری اسوقت کی سیاست پر اثر انداز ہے۔ گزشتہ پندرہ سال سے روہیلوں کی سیر و تواریخ کو اجاگر کرنے کی خدمت اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ اُردو میں بہت کچھ لکھا اور لکھوایا گیا۔ لیکن چونکہ اربابِ حکومت۔ غیر مسلم اصحاب اور خود مسلمانوں کا اعلیٰ طبقہ اردو کی چیزوں کا مطالعہ نہیں کرتا۔ اس لئے **روہیلہ** نامی انگریزی کا یہ ماہوار رسالہ جاری کرنے کی اجازت حاصل کی گئی ہے۔ پہلا پرچہ انشاءاللہ جون ۱۹۴۶ء کے اوّل ہفتہ میں شائع ہوگا۔ قیمت سالانہ صہ، یا ششماہی ۳ مے پیشگی روانہ کیجئے۔ تاکہ آپ ابتدا ہی سے اُسکے خریدار ہو جائیں۔ اور کسی پرچہ کے مطالعہ سے محروم نہ رہیں۔ سب مضامین پُر از معلومات۔ اثر انگیز۔ اور عہد حاضر کی تعمیر ملی میں مدد دینے والے ہوں گے۔

علیگڑھ ۲۴ اپریل ۴۶ء

سید الطاف علی بریلوی

ذکرِ ماضی

اور

فکرِ فردا

اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر! (غالب)

مصنف کی گذشتہ اشاعت میں ہم نے عرض کیا تھا کہ 'مجلس مصنفین' کے اس سہ ماہی علمی رسالے کے:-

"مستقلاً جاری رہنے کا ناظرین کرام کو کامل اطمینان رکھنا چاہئے کیونکہ مصنف علی گڑھ سے جاری ہوا ہے اور علی گڑھ میں سرسید علیہ الرحمۃ کی یہ کرامت کارفرما ہے کہ یہاں جو کام خلوص دل سے جاری کیا جاتا ہے ہمیشہ قایم رہتا ہے اور ہر قسم کی الجھنوں اور رکاوٹوں کے باوجود یوماً فیوماً ترقی ہی کرتا رہتا ہے۔"

یہ سطور دراصل ناظرین مصنف سے زیادہ خود اپنی تسکین کے لئے ہم نے سپرد قلم کی تھیں ورنہ اُس وقت کی حقیقی کیفیت یہ تھی کہ نہ ہمیں مصنف شائع کرنے کے لئے آئندہ کاغذ دستیاب ہونے کی کوئی اُمید باقی رہی تھی اور نہ یہ توقع تھی کہ قریب دوسو روپیہ بقایا قرض اور تین سو روپیہ زیر طبع شمارہ کا بل ادا کرنے کی کوئی صورت نکلے گی۔ مجلس مصنفین کے ایک سے ایک کامیاب جلسوں میں شرکت کرنے والے بزرگوں اور مصنف کو ذوق وشوق سے مطالعہ کرنے والے قدردانوں کو اندازہ ہی نہیں ہو سکتا کہ ہمارے ظاہری جوش وخروش کی تہ میں کتنی روح فرسا افسردگیاں اور جاں گسل مایوسیاں پرورش پا رہی تھیں لیکن سرسید جیسی مقبولِ بارگاہ ایزدی ہستی کا واسطہ دیا جائے اور رحمت الٰہی جوش میں نہ آئے ناممکن! یہ نہ ہو تو پھر علی گڑھ جیسی 'مَلیریازدہ' اُجاڑ بستی میں رہنے اور یہاں قومی کام کرنے سے فائدہ ہی کیا۔ آپ سنکر خوش ہوں گے کہ اللہ نے ہماری لاج رکھ لی۔

دارالعلوم علی گڑھ کے ایک مخلص فرزند میر عزیز الرحمن صاحب سیٹھ کرم چند تھاپر کی

اسی سلسلہ میں محترمی جناب پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی بھی ہماری دلی مبارکباد کے مستحق ہیں کیونکہ ڈاکٹر ابواللیث صاحب پروفیسر صدیقی صاحب کے شاگرد رشید ہیں اور آپ ہی کی نگرانی میں لیث صاحب نے اپنا مقالہ طیار کیا تھا۔

بزمِ مصنف

گزشتہ سہ ماہی میں بھی پچھلی ماہی ذی نیں اور موقر اخبارات و رسائل کے ہمت افزا تبصرے موصول ہوئے جن سے ناظرین کرام کی دلچسپی کے لئے حسب ذیل "بزم مصنف" ترتیب دی جاتی ہے:-

مولوی نصیر الحق صاحب بی اے ایل ایل بی علیگ سب جج بھوپال

رسالہ مصنف نمبر ۵ موصول ہوا۔ شکریہ۔ ماشاء اللہ اس کے دیکھنے سے پچھلے نمبروں کا اشتیاق اور بڑھ گیا۔ آپکا رسالہ نہایت محنت اور قابلیت سے تیار ہوتا ہے اور مختلف تصانیف جو جناب نے بھیجی تھیں ان میں بھی بعض نہایت دلچسپ اور لاجواب تھیں یہی کیفیت مصنف نمبر ۵ کے مضامین "فلسطین قدیم میں دنیا کی چوتھی شہنشاہی از مولانا سید طفیل احمد صاحب" اردو ادب پر غدر ۱۸۵۷ء کا احسان از مولوی حسن عبد اللہ صاحب ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ "ہندوستان میں تصنیفی مشکلات اور ان کا حل از مولانا سعید احمد صاحب ایم اے دہلی۔ اور "فن افسانہ نگاری پر ایک نظر از مولوی سلطان حیدر جوش صاحب کی ہے اور ان پر خاص طور پر سبحان اللہ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔

مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتب خانہ ریاست رامپور

ابھی ابھی مصنف کا پانچواں شمارہ ملا۔ اور میں نے اول سے آخر تک سرسری نظر ڈال کر اطمینان سے مطالعہ کرنے کے لئے اپنے ذوق کے مضامین چھانٹ لئے۔ ڈاکٹر سرراس مسعود صاحب پر جو مضمون مخدومی مولوی عبد الحق صاحب نے تحریر فرمایا ہے اس کو تمام کئے بغیر نہ رہا گیا۔ کیا اچھی تصویر کشی کی ہے اس مرحوم مایۂ ناز اور فخر قوم شخصیت کی۔

موصوف نے ازراہِ معارف پروری نواب عقیل نواز جنگ بہادر معتمد سیاسیات کی توجہ بہانی مبذول کی اور بالآخر ان ہر دو اکابر سلطنت کی کوشش سے حضرت اقدس سلطان العلوم حضور نظام خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کی سرکار نے پانچسو روپیہ کا یکمشت گرانقدر عطیہ مرحمت فرمادیا۔

کلاہ گوشہ مجلس بآفتاب رسید — چو سایہ برسرش انداخت چوں تو سلطانے

یہ عطیہ اس امداد پر مستزاد ہے جو سلطنت آصفیہ کے اسکولوں اور کالجوں کے لئے نظامت تعلیمات کی جانب سے مصنف کی مستقل خریداری کے ذریعہ کی گئی ہے۔

مجلس مصنفین کی ترقی میں ایک اور قدم لکھنؤ میں اس کی شاخ قائم کئے جانے سے اٹھایا گیا ہے۔ مشہور خطاط اور اہل قلم شیخ ممتاز حسین صاحب جونپوری کی دعوت پر ۱۲ مارچ ۴۴ء کو راقم السطور لکھنؤ گیا۔ اسی روز بعد مغرب جناب پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب چیرمین شعبۂ اردو و فارسی لکھنؤ یونیورسٹی کے دولت کدہ پر کچھ منتخب اہل علم حضرات کا جلسہ ہوا۔ مجلس مصنفین علی گڑھ کے اغراض و مقاصد کے متعلق تبادلہ خیال ہوا اور اس کی ایک شاخ لکھنؤ جیسے مرکز علم و ادب میں قائم کرنے کی تجویز بالاتفاق منظور ہوئی۔ شیخ ممتاز حسین صاحب جونپوری معتمد منتخب ہوئے۔ اس مجلس کا پہلا جلسہ جناب حکیم قاسم حسین صاحب کی دعوت چائے پر ۲۶ مارچ ۴۴ء کو منعقد ہوگا اور اسمیں پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب اپنا مقالہ "اردو ادب میں آب حیات، کا مرتبہ" پڑھیں گے۔ مجلس مصنفین کی شاخ لکھنؤ کے جلسوں کی روئیدادیں اور اس کے مقالے مصنف میں اس کی اگلی اشاعت سے طبع ہونا شروع ہوں گے۔ انشاء اللہ!

ناظرین مصنف کو اس اطلاع سے مسرت ہوگی کہ مجلس مصنفین کے پرجوش رکن اور مصنف کے مستقل مقالہ نگار ابواللیث صدیقی صاحب ایم۔ اے (علیگ) لکچرر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملگئی اور اب وہ "ڈاکٹر" ہوگئے اس نمایاں کامیابی پر ہم لیث صاحب کی خدمت میں پرخلوص ہدیۂ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مقالے پڑھے جاتے ہیں جن کو یکجا کرکے یہ رسالہ مرتب کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زیادہ تر مقالے تحقیق اور کاوش سے لکھے جاتے ہیں اور قابلِ مطالعہ ہوتے ہیں۔ علی گڑھ میں اس مجلس کا قیام اور اس رسالہ کا اجرا، دنیائے علم و ادب کے لئے بڑا مستحسن قدم ہے اور امید ہے کہ ندوی صاحب کے زیرِ انتظام اسے ضرور استقامت نصیب ہوگی۔

رسالہ "اُردو" دہلی

مصنف مجلس مصنفین علی گڑھ کا سہ ماہی رسالہ ہے اور یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ علی گڑھ سے ایک جدید علمی ادبی رسالہ کی اشاعت کا انتظام کیا گیا ہے۔ ہمیں توقع ہے مجلس مصنفین اس رسالہ کو استقلال کے ساتھ جاری رکھے گی اور اسے بلند پایہ بنانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھے گی۔ علی گڑھ میں اس کے لئے کافی سامان اور مناسب فضا موجود ہے۔ سید الطاف علی صاحب جو اس کی ترتیب کا کام بڑے شوق اور مستعدی سے انجام دے رہے ہیں، اگر یونیورسٹی کے اربابِ ذوق کو اس کی اعانت پر آمادہ کرلیں گے تو یہ اردو کا ممتاز رسالہ ہوجائے گا۔ لیکن یہ کام آسان نہیں اس کیلئے غیر معمولی کوشش اور سرگرمی کی ضرورت ہوگی۔

رسالہ میں مختلف قسم کے ادبی اور علمی مضامین ہوتے ہیں اور بعض مضامین پُر مغز ہیں۔ اور غور و فکر سے لکھے گئے ہیں۔ جس کیلئے ہم قابلِ مرتب کو مبارکباد دیتے ہیں۔

سید آصف علی صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی۔ وائس پرنسپل اسلامیہ کالج بریلی

مصنف کا پرچہ نمبر ۵ مگر میرے لئے نمبر ۳ موصول ہوا۔ بڑا شکریہ۔ تینوں پرچوں کو دیکھنے اور پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ ترقی بہرکام ہے۔ ہر آخری پرچہ پچھلے پرچوں پر صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے فوقیت رکھتا ہے۔ مولانا سید طفیل احمد صاحب کا عہدِ قدیم کی شہنشاہیوں کا سلسلہ بڑا پُر از معلومات اور دلچسپ ہے۔ "تاریخی نوادر" اور "اُردو نثر کے نمونے" بھی بیش بہا جواہرات ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر تحقیقی تاریخی اور ادبی مضامین بہت ہی جاذبِ توجہ ہیں۔

مجلس مصنفین کے جلسے اور ان کی کارروائیاں کیسی دلچسپ ہوتی ہوں گی ان کا صرف تصور کرکے ہی کافی لطف آتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ شرکت کی جائے۔ دوسرے سالانہ اجلاس کی تفصیلی رپورٹ جو شائع ہوئی ہے کیا آپ میرے پاس بھیج سکیں گے؟ ممنون ہوں گا۔

آپ کی یہ سب ادبی کارگذاریاں حقیقتاً قابلِ رشک ہیں اور ملک کا ادبی طبقہ آپ کا

آخر میں "مکاتیب غالب" پر جناب سید اظہر حسین صاحب رضوی کا تبصرہ نظر سے گذرا۔ اگر آپ مجھے ان بزرگ کا مکاتبتی پتہ لکھ بھیجیں تو شکریہ ادا کروں۔ انھوں نے میری حقیر کوشش کی جن کریمانہ لفظوں میں داد دی ہے اس کا شکریہ نہیں بلکہ ان گراں ارض تجویزوں کا جو درستی عبادت کے سلسلہ میں تحریر فرمائی ہیں۔ خدا انہیں جزائے خیر دے۔

ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی (الہ آباد یونیورسٹی) اور قاضی عبدالودود صاحب بار ایٹ لا پٹنہ کے بعد یہ میری تنقید ہے جو انتہائی ہمدردی کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ کیا بتاؤں اور کن لفظوں میں اپنی مسرت کا اظہار کروں کہ یہ ایک نادیدہ کرمفرما کی عنایت بے غایت ہے اس لئے اس کو نعمت غیر مترقبہ کہنا بجا ہوگا۔

مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی مدیر دائرہ معارف قرآنیہ	مصنف و معمول ہوا شکریہ مضامین بلند پایہ ہیں۔

ترتیب خوب بہتر ہے۔ شذرات لکھنے کا حق تم کو قدرت سے ودیعت ہوا ہے۔ نجف خاں پر مضمون لکھا جا رہا ہے۔ یہ وہی ہے جس نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے پہونچے اُتروا دیئے تھے۔ امیر الروایات میں یہ داستان ہے۔

مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی سکریٹری پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس یو۔پی بدایوں	مصنف کا تازہ پرچہ

پہونچا۔ خوب ہے۔ آپ کی کوششیں نہ صرف عطیات نقدی کے حاصل کرنے میں قابل تعریف ہیں بلکہ رسالے کے لئے اچھے اچھے دماغوں پر ڈاکہ ڈالنا بھی آپ ہی کا کام ہے۔ میرا مضمون "سر شاہ سلیمان اور ادب اردو" نہ معلوم آپ کے ناظرین کے اندازہ میں رسالہ کے معیار پر پورا اُترے گا یا نہیں؟ میں نے اپنے مضمون کے ساتھ ہی ایک دوسرے مرحوم وائس چانسلر یعنی سر راس مسعود پر ڈاکٹر عبدالحق بابائے اردو کا مضمون پڑھا جس میں مرحوم راس مسعود کی ان خدمات کے متعلق جو انہوں نے ادب اردو کی انجام دی تھیں ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ اگر فرصت ہوئی تو میں اس کمی کو پورا کروں گا اور "راس مسعود اور ادب اردو" کے عنوان سے ایک چھوٹا سا مضمون لکھ دوں گا۔ آج کل تو میں ایک دوسرا تالیف کا کام کر رہا ہوں۔

رسالہ جامعہ دہلی	رسالہ مصنف پیش نظر ہے۔ علی گڑھ میں ایک مجلس مصنفین قائم ہوئی ہے جس کے سکریٹری الطاف علی صاحب ہیں۔ اس مجلس نے وقتاً فوقتاً

مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایڈیٹر صاحب نے رسالہ کی ترتیب میں انتہائی قابلیت اور جانفشانی کا مظاہرہ کیا ہے۔ رسالہ کا علمی، ادبی اور تاریخی معیار بہت بلند ہے۔ قابل قدر معلومات بڑی محنت سے فراہم کی گئی ہیں۔ کاغذ کی نایابی کے زمانے میں اچھے کاغذ پر رسالہ شائع ہوتا ہے۔ محترم سید الطاف علی بریلوی۔ بی۔ اے۔ علیگ اس رسالہ کے مدیر ہیں۔ ان کی اعلیٰ لیاقت اور صحافتی تجربہ مصنف کی عمدگی اور خوبی کی ضمانت ہے۔ دسمبر نمبر علامہ ڈاکٹر عبدالحق جیسے جلیل القدر اصحاب اور ارباب علم وفن کے بلند پایہ مضامین و مقالات پر مشتمل ہے۔ یہ رسالہ ہر علم دوست کے گھر میں موجود ہونا چاہیئے۔

مولانا محمد عبداللہ صاحب منہاس ایڈیٹر "راست گفتار" امرتسر	مصنف کا شمارہ دسمبر ۴۳ء پیش نظر ہے

کاغذ کی گرانی کے زمانہ میں رسالے کا باقاعدہ اجرا قابل داد ہے۔ مصنف کا مدیر و ناشر ملت کے لئے جو خوان یغما تیار کرتا ہے وہ اپنی گوناگوں دلچسپیوں کے لحاظ سے قابل قدر ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا مضمون "سر سید راس مسعود" عقیدتمندوں کے لئے ایک بے نظیر تحفہ ہے۔ پروفیسر سید معین الحق صاحب کا مضمون "سلطان محمد تغلق کی سیرت" علم تاریخ کے شیدائیوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ مضمون کا وہ حصہ جس میں پروفیسر صاحب نے سلطان محمد تغلق سے متعلق غلط اور مشہور روایات کی تردید کی ہے خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ "اردو ادب پر غدر ۱۸۵۷ء کا احسان" (از مولوی حسن عبداللہ صاحب) اور فلسطین قدیم میں دنیا کی چوتھی شہنشاہی (از مولانا سید طفیل احمد صاحب) یہ دونوں مضامین بہت خوب ہیں۔ باقی مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجلس مصنفین اور مصنف کے مدیر و ناشر اس علمی اور ادبی کوشش کیلئے ملک و ملت کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر سید شریف احمد صاحب چشتی بی۔ اے۔ ڈی لٹ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ امرتسر ممبر مسلم یونیورسٹی کورٹ	پیش نظر مصنف شمارہ دسمبر ۴۳ء ایک لاجواب لازوال علمی ادبی اور سب سے بڑھ کر تاریخی ذخیرہ ہی

مصنف ایک مہر منور ہے۔ جو اپنی عالمتاب شعاعوں سے ایک دنیا میں جگا جوند پیدا کر دیتا ہے۔ لاریب مصنف کا مطالعہ ایک معمولی قابلیت کے انسان کو بھی قلیل عرصہ میں عالم اور مورخ بنا سکتا ہے۔ مصنف تشنگان علم و ادب کے لئے آب حیات کا حکم رکھتا ہے

مرہونِ منت ہے۔

لفٹننٹ کرنل غلام سید معین الدین صاحب بی۔ اے علیگ حیدرآباد دکن | مصنف پہونچا۔ اس زمانہ میں ایسی آب و تاب
اور التزام کے ساتھ رسالہ نکالنا آپ ہی کا کام ہے۔ خدا برکت دے۔

مولوی عبدالشکور صاحب ایم۔ اے پرنسپل حلیم مسلم کالج کانپور | مصنف کا تازہ پرچہ پہونچا۔ اس کو دیکھکر بہت زیادہ مسرت ہوئی۔
مضامین کے تنوع اور کتابت و طباعت کے لحاظ سے یہ پرچہ بہت حوصلہ افزا ہے۔ یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ اس گرانی کے زمانہ میں بھی آپ "مصنف" اس کامیابی کیساتھ نکال رہے ہیں ہر پرچہ پچھلے پرچہ سے بہتر ہوتا ہے۔ پروفیسر سید معین الحق صاحب کا مضمون "سلطان محمد بن تغلق کی سیرت تاریخ فیروز شاہی کی روشنی میں" خصوصیت کیساتھ دلچسپی سے پڑھا گیا۔ اللہ پاک آپ کو کامیاب فرمائے۔

افسر الاطباء حکیم مرزا محمد جمشید علی خاں صاحب بریلی | الحمدللہ مصنف کا پانچواں نمبر بھی بصیر افزائے ضعیف البصر ہوا۔ مصنف اب مجالس
ادبی کا خود مصنف ہے ؎

حاجت مشاطہ نیست روئے دل آرام را

اِن دِنوں مریضوں کے ہجوم سے شب ہی کو فرصت ملتی ہے اور حق یہ ہے کہ مصنف کا مطالعہ شب کو بہت مزہ دیتا ہے۔ چنانچہ میں نے شب کے سکون میں خواب آور نہیں خواب ربا دوا سمجھ کر اس کا مطالعہ اپنے معمولات میں شامل کر لیا ہے۔ جناب سید اظہر حسین صاحب رضوی نے "مکاتیب غالب" پر جو تبصرہ فرمایا ہے وہ بہت سے مجروح دلوں پر مرہم رس کا کام دیتا ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی چیرمین شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

مصنف نمبر ۵ پہونچا۔ ماشاءاللہ خوب ترقی کی ہے۔ اب اُردو سے بڑی امیدیں وابستہ ہوگئی ہیں۔

روزنامہ زمیندار لاہور | مجلس مصنفین علی گڑھ کے زیر اہتمام ایک سہ ماہی علمی رسالہ شائع ہوتا ہے جس کا دسمبر نمبر پیش نظر ہے۔ اس شمارہ کے

ے آپ کا تبادلہ ہے یا نہیں۔ اس میں برابر کچھ لکھا کرتا ہوں۔ شاید آپ کی پسند کے درخور ٹھہرے۔

شیخ ممتاز حسین صاحب جونپوری جوائنٹ سکریٹری آل انڈیا شیعہ کانفرنس لکھنؤ | عرصہ ہوا۔ آپکا خط آیا تھا جمیں

آپ نے خطاطی پر ایک مقالہ پڑھنے کی فرمائش کی تھی جس کا میں نے وعدہ کیا تھا۔ اس فن کی تاریخ پر اردو زبان میں میرے علم میں کوئی کتاب نہیں۔ عربی۔ فارسی اور انگریزی میں کتابیں ہیں، مگر جن لوگوں نے لکھا ہے وہ زیادہ تر فن خطاطی سے ناواقف تھے۔ اسلئے فنی طور پر ایک جگہ ذکر نہیں ملتا۔ میرے پاس کچھ نوٹ ہیں اور سید جالب مرحوم اڈیٹر "ہمدم" اور مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم نے ایک زمانہ میں مجھ سے خطاطی کی تاریخ پر ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی تھی مگر وہ خیال ناممکمل رہ گیا۔ اب ایک مدت کے بعد آپ کی ذرہ افزائی نے وہ بھولا ہوا خواب پھر یاد دلا دیا۔ میں نے مضمون آپ کی فرمائش سے قریب قریب پورا کر لیا ہے۔ اس کا تعلق کچھ مصوری سے بھی ہے اور میرے دوست مسٹر ...لڈر پرنسپل آرٹ اینڈ کرافٹس اسکول لکھنؤ نے کچھ کتابوں کا پتہ دیا ہے۔ ان کو بھی دیکھ رہا ہوں۔ میں کچھ قدیم کتبے اور خطاطی کے نمونے بھی اپنے ساتھ علی گڑھ لاؤں گا تاکہ اس خشک سی مضمون کے ساتھ ان کی سیر کرا دینے سے مضمون کی دلچسپی بڑھ جائے۔ میرا عقیدہ ہے کہ خطاطی تہذیب و تمدن کا نقش اولیں ہے اس لئے اگر آپ کی مجلس کی بدولت میں علی گڑھ کے ارباب علم کو اس فن شریف کی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہوا تو دل کو اطمینان ہوگا کہ کچھ کام ہوا۔

پروفیسر محمد طاہر فاروقی صاحب چیرمین شعبہ اردو و فارسی آگرہ کالج۔ آگرہ | کرم نامہ آج ہی ملا۔ اتفاق سے مفتی انتظام اللہ شہابی

صاحب بھی آج ہی آئے۔ ان کو بھی خط دکھایا۔ پروفیسر مولانا زاہد حسن قادری صاحب مقالہ پڑھنے کو کسی طرح راضی نہیں ہوتے۔ انتہائی اصرار کیا محض بغرض شرکت آنے کو تیار ہیں۔ مقالہ کی تعمیل سے تو میں بھی عاجز محض ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ اگر آپ مصروف ہیں تو یہ بندہ بھی پہلا کئی دفتروں کو نمٹاتا ہے۔ ذرا دیکھئے تو رات کے پونے دو بجے مندوب کے لئے منی آرڈر کا فارم بھرنے کی توفیق ہو رہی ہے۔

اس کا معیار ہندوستان کے دیگر اسلامی علمی ادبی رسائل سے بہت بلند ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ایشیا کی اس واحد اسلامی یونیورسٹی کے علمی آرگن کو مدیر و ناشر بھی ایسا ہی قابل دردمند اور مخلص نصیب ہوا ہے۔ سید الطاف علی صاحب بریلوی بی اے۔ علیگ کا خلوص اور قابلیت رسالہ کی ترتیب اور انتخاب مضامین سے ظاہر ہے۔ کاغذ کی گرانی، کمیابی بلکہ نایابی کے زمانہ میں رسالہ کا باقاعدہ اجرا، قابل داد ہے۔

ڈاکٹر مولانا عبدالحق صاحب کا مضمون سر سید راس مسعود مرحوم کے عقیدتمندوں کیلئے ایک بے بہا تحفہ ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے سر سید مرحوم کے خاندان کی ملی قربانیوں کا نقشہ نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ مضمون اپنی صداقت، سلاست اور لطافت کے لحاظ سے بہت بلند پایہ ہے۔ یہ کامل بلکہ اکمل منثور مرثیہ ہے۔ اردو علم و ادب میں اس طرز تحریر کی جدت لائق تحسین ہے۔

پروفیسر سید معین الحق صاحب ایم۔ اے کا مضمون "سلطان محمد تغلق کی سیرت" علم تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے مشعل ہدایت کا حکم رکھتا ہے۔ مضمون کا وہ حصہ جس میں پروفیسر صاحب نے سلطان سے متعلق غلط اور مشہور روایات سے جس خوبی سے انکار کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے اور تاریخی حوالجات سے آپ نے اصل حقیقت کو بے نقاب کرکے یوروپین اور غیر مسلم مورخین کی نیتوں کو عریاں کرکے دکھا دیا ہے۔ یہ ایک ایسا احسان ہے جسے مسلمانان ہند فراموش نہیں کرسکتے۔

"اردو ادب پر غدر ۱۸۵۷ء کا احسان" (از مولوی حسن عبداللہ صاحب) اور فلسطین قدیم میں دنیا کی پہلی شہنشاہی (از مولانا سید طفیل احمد صاحب) یہ دونوں مضامین بھی خوب ہیں۔ باقی مضامین بھی اپنی طرز، عنوان اور ملی ضروریات کے لحاظ سے نہایت ارفع و اعلیٰ ہیں۔

مجلس مصنفین علی گڑھ اور مضمون کے مدیر و ناشر ملک و ملت کے انتہائی شکریہ کے مستحق ہیں۔ میرے خیال میں ہر علم دوست گھر میں اس رسالہ کا مطالعہ اور اجرا اشد ضروری ہے۔

مولوی سید حسن امام صاحب ایڈیٹر رسالہ ندیم گیا

ندیم کا شاد نمبر ابلاغ خدمت کیا ہے۔ اور تبصرہ کی زحمت بھی دی ہے بمصنف نمبرہ کا شکریہ قبول فرمائیے۔ نمبرہ کے لئے آنکھیں دیر تک لگی رہیں گی بمبئی کے ماہنامہ "انوار"

مجلس کے جلسے

مصنف کی سابقہ اشاعت نمبر ۵ میں آپ مجلس مصنفین علی گڑھ کی چھتیسویں[۳۶] مجلس تک کی روداد ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

سینتیسویں[۳۷] مجلس

جناب ڈاکٹر راجہ غلام سرور صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ استاد شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی کی دعوت پر زیر صدارت ڈاکٹر ابواللیث صاحب صدیقی ۱۱ر نومبر ۱۹۴۳ء کو پانچ بجے شام آفتاب لائبریری کانفرنس کمپاونڈ میں منعقد ہوئی۔ پندرہ ممبران شریک ہوئے اور مشہور فسانہ نگار جناب مولوی سلطان حیدر صاحب جوشؔ (علیگ) پنشنر ڈپٹی کلکٹر نے اپنا مقالہ "فن افسانہ نگاری پر ایک نظر" پڑھا۔

اڑتیسویں[۳۸] مجلس

بتاریخ ۲۱ر نومبر ۱۹۴۳ء پروفیسر غلام سرور صاحب ایم۔ اے (لیڈس) ریڈر انگلش ڈپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی کی دعوت پر موصوف کے دولت خانہ نمبر ۵ ذکاء اللہ روڈ میں زیر صدارت ڈاکٹر راجہ غلام سرور صاحب ۴½ بجے شام منعقد ہوا۔ اور جناب مولانا سید خلیل احمد صاحب نے اپنا مقالہ "ایران، قدیم میں دنیا کی پانچویں شہنشاہی" پڑھا۔ ۲۱ اراکین مجلس شریک جلسہ ہوئے۔

انتالیسویں[۳۹] مجلس

زیر صدارت پروفیسر غلام سرور صاحب ایم۔ اے (لیڈس) ۳۰ر نومبر ۱۹۴۳ء کو ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی دعوت پر منعقد ہوئی اور اس میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے اپنا مقالہ "اردو شاعری کی تنقید میں چند اصولی بحثیں" پڑھا۔ اُنیس ممبروں نے جلسہ میں شرکت فرمائی۔

روزنامہ سرفراز لکھنؤ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک مجلس مصنفین ہے جس کے اراکین اکثر اہل علم و ادب سے اپنی مجلس میں مضمون پڑھواتے ہیں۔ نقد و تبصرہ نہایت مخلصانہ انداز سے کرتے ہیں۔ اس طرح مضمون مکمل ہوتا ہے۔ پھر ایک سہ ماہی رسالے میں شائع کیا جاتا ہے جسمیں ایسے مضامین نکلتے ہیں اس رسالہ کا نام ہی مصنف ہے اور اس کو سید الطاف علی صاحب بی۔ اے ہیڈ اسسٹنٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس و سکریٹری مجلس مصنفین مرتب کرتے ہیں۔

یہ رسالہ علم و ادب کی بڑی خدمت کر رہا ہے۔ اردو زبان کے نہایت مستند اور بہتر ادبی، علمی رسالے میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس میں تجربہ کار اور ذی علم ادیبوں کے مضامین ہوتے ہیں۔ جن کو غور و فکر اور نہایت تحقیق کے ساتھ حوالۂ قلم کیا جاتا ہے۔ اس بزم کے پندرہ روزہ جلسے ہوتے ہیں اور ان میں مقالے پڑھے جاتے ہیں اور علمی و ادبی چرچے رہتے ہیں۔ اس بزم کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ علم و ادب کی یاد تازہ ہوتی رہتی ہے اور نئے نئے اہل ادب کو ادبی ذوق بڑھانے اور اسکو ترقی دیکر اس بزم میں شرکت کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

بس ذکر سے مطلب یہ ہے کہ علی گڑھ کی طرح لکھنؤ بھی علم و ادب کا منبع اور اردو زبان کا مرکز ہے، یہاں یونیورسٹی اور کتنے بڑے بڑے کتب خانے، کتنے کالج، کتنے مختلف زبانوں کے عالم و ادیب اور اہل تصنیف و شعراء، کتنے عربی کے ہونہار اور ذہین طلبہ، کئی درجن ادبی انجمنیں اور بقول سر فتح علی خاں مرحوم ایک اینٹ اٹھاؤ تو اس کے نیچے سے دو تین شاعر نکلتے ہیں۔ باوجود اس کے یہاں کوئی اس طرح کی مجلس مصنفین نہیں۔

لہٰذا یا تو علی گڑھ کی مجلس مصنفین اپنی شاخیں خاص خاص مقامات پر قائم کرے اور لکھنؤ میں خاص کر یا خاص خاص مقامات پر کچھ اہل ذوق تیار ہو جائیں اور وہ خود اپنی مجلس مصنفین قائم کریں مگر جو کچھ کیا جائے استقلال کے ساتھ اور مستحکم بنیاد پر۔ لکھنؤ اس کا عرصہ سے مستحق ہے۔ یہاں ضرورت ہے کہ تمام نزاعی امور سے الگ ہو کر صرف خالص علمی و ادبی مجلس مصنفین کی بنا جلد سے جلد کر دی جائے ؎

مُعاونینِ مصنف

عطیہ حیدرآباد کے علاوہ ۲۵ نومبر ۴۳ء لغایتہ ۲۲ مارچ ۴۴ء مصنف نمبر ۵ کے سلسلے میں دو سو پانچ روپیہ کی آمدنی ہوئی جن بزرگوں اور احباب نے چار روپیہ یا چار روپیہ سے زائد کے عطیات مرحمت فرمائے ان کے اسمائے گرامی دلی شکریہ کیساتھ درج ذیل ہیں:-

۱۔ نواب صدر یار جنگ صاحب بہادر علی گڑھ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۵ر
۲۔ پروفیسر سید بشیر علی صاحب علی گڑھ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰ر
۳۔ پروفیسر خواجہ منظور حسین صاحب بی اے آنرس (آکسن) علی گڑھ ۔۔۔۔۔ ۱۰ر
۴۔ مولوی محمد نعیم الحق صاحب جج بھوپال ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵ر
۵۔ میر عزیز الرحمٰن صاحب نئی لائن۔ کالا محل۔ دہلی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵ر
۶۔ سلطان صاحبہ۔ بتوسّل میر عزیز الرحمٰن صاحب۔ ریٹائرڈ انجینیر جالندھر ۔۔۔ ۵ر
۷۔ نذیر احمد صاحب جی۔ آئی۔ پی ریلوے آفس۔ وکٹوریہ الونیو۔ بمبئی ۔۔۔۔۔ ۵ر
۸۔ خان بہادر خلیفہ اسد اللہ صاحب امپیریل لائبریری۔ کلکتہ ۔۔۔۔۔۔۔ ۵ر
۹۔ پروفیسر محمد طاہر صاحب فاروقی۔ آگرہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵ر
۱۰۔ مولانا یعقوب بخش راغب صاحب بدایونی۔ علی گڑھ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵ر
۱۱۔ سکریٹری صاحب انجمن اسلامیہ ترقی اردو۔ بانکی پور۔ پٹنہ ۔۔۔۔۔۔۔ ۴ر
۱۲۔ مولانا عبدالرؤف صاحب۔ ناظم نذیریہ پبلک لائبریری۔ پھاٹک حبش خاں۔ دہلی ۔۔ ۴ر
۱۳۔ مولوی حکیم بشیر الدین صاحب وکیل مومائی۔ مادھوپور ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴ر
۱۴۔ پروفیسر حسن عسکری صاحب ایم۔ اے پٹنہ۔ یونیورسٹی پٹنہ ۔۔۔۔۔۔۔ ۴ر
۱۵۔ بہاری لعل بھارگو صاحب۔ الہ آباد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴ر
۱۶۔ مولوی مرزا حیدر بیگ صاحب۔ ایڈوکیٹ محلہ روضہ۔ جون پور ۔۔۔۔۔ ۴ر
۱۷۔ پرنسپل صاحب گورنمنٹ کالج۔ جھنگ۔ پنجاب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴ر
۱۸۔ ڈائرکٹر صاحب پبلسٹی بیورو مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴ر
۱۹۔ مولانا امتیاز علی صاحب عرشی۔ ناظم کتب خانہ قلعہ معلّٰی۔ ریاست رامپور ۔۔۔۔ ۴ر

چالیسویں مجلس

جناب پروفیسر ابرار حسین قادری صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی لکچرر جغرافیہ ڈپارٹمنٹ کی دعوت پر موصوف کی کوٹھی "ابرار منزل" میں ۱۹ جنوری ۴۲ء ۴½ بجے شام ہوئی۔ ڈاکٹر محمد محمود احمد صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ لکچرر شعبہ فلسفہ نے صدارت فرمائی اور جناب عنایت علی خاں صاحب ایم۔ اے لکچرر شعبۂ حیوانیات نے اپنا مقالہ "آغاز حیات" پڑھا ۱۸ ممبران شریک جلسہ ہوئے۔

اکتالیسویں مجلس

یکم فروری ۴۲ء کو ساڑھے چار بجے شام زیر صدارت پروفیسر آل احمد سرور صاحب۔ ایم۔ اے جناب عنایت علی خاں صاحب کی دعوت پر نمبر ۲ ذکاء اللہ روڈ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں منعقد ہوئی۔ اس مجلس میں مجلس کے ۲۵ ارکان شریک ہوئے اور جناب پروفیسر جلال محمد شریف صاحب ایم۔ اے۔ (کینٹب) نے اپنا مقالہ "جمال معروضی ہے یا موضوعی" پڑھا۔

بیالیسویں مجلس

بمقام کانفرنس لائبریری ۱۰ فروری ۴۲ء کو جناب مولوی وحید الحق صدیقی صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی کی دعوت پر پانچ بجے شام منعقد ہوئی۔ ستائیس حضرات شریک ہوئے۔ اس مجلس میں مشہور خطاط اور اہل قلم جناب شیخ ممتاز حسین صاحب جونپوری نے خصوصیت کے ساتھ لکھنؤ سے تشریف لاکر "خط نستعلیق" اور اس کی مختصر تاریخ" کے عنوان پر مقالہ پڑھا۔ جناب پروفیسر عبدالعزیز میمن صاحب صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی نے صدارت فرمائی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایران قدیم میں

دُنیا کی پانچویں شہنشاہی

(از مولانا سید طفیل احمد صاحب مدظلہٗ)

جس جلسہ میں یہ مقالہ پڑھا گیا اُس کے صدر ڈاکٹر راجہ غلام سرور صاحب ایم۔ اے
پی۔ ایچ۔ ڈی۔ لکچرار شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی تھے۔ میں ممنون ہوں کہ مقالہ سننے کے بعد موصوف
نے بعض واقعات کی تصحیح فرماکر میری رہنمائی اور امداد کی۔

(طفیل احمد)

میں نے سب سے اول آپ کے سامنے "مصر قدیم میں دُنیا کی پہلی شہنشاہی" پر ایک مقالہ پیش کیا تھا۔ اُس میں عرض کیا تھا کہ پہلے زمانہ میں ہر ملک کے لوگ اپنے اپنے ملکوں کو تہذیب کے اعتبار سے سب سے زیادہ پُرانا کہا کرتے تھے۔ مگر جب سے 'حفریات' یعنی زمین کھود کر معلومات فراہم کرنے کے فن نے ترقی کی ہے تب سے مختلف ملکوں کی نسبتی قدامت کا تعین کرنا سہل ہو گیا ہے۔ اُنھیں معلومات کی بنا پر میں نے مصر کا مقالہ پیش کرتے وقت اُس ملک کو سب سے زیادہ قدیم اِس بنا پر قرار دیا تھا کہ میرے نزدیک وہاں کی شہنشاہیت کو دنیا کی تاریخ میں اولیت کا مرتبہ حاصل تھا۔ اُس کے بعد میں نے "بابل میں دوسری شہنشاہیت" پر ایک مقالہ پڑھا۔ تیسری پُرانی تہذیب جزیرہ کریٹ کی تھی مگر اُس کی نسبت مجھے یقین نہ تھا کہ

۲۰۔ مسٹر ایم۔ ٹی۔ کے۔ قدوائی و ہمکیس ڈائرکٹریٹ بلاک ۷ شاہجہاں روڈ۔ نئی دہلی .. للعہ

۲۱۔ مولوی عبد المجید صاحب اسسٹنٹ لائبریرین عربک کالج۔ دھلی .... للعہ

۲۲۔ مولوی عبد اللطیف صاحب۔ رئیس بہادر گنج۔ شاہجہاں پور .... للعہ

۲۳۔ نوابزادہ مرتضیٰ علی صاحب بمبئی .... للعہ

۲۴۔ سید جلیل حسنی صاحب۔ ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول پیلی بھیت .... للعہ

۲۵۔ قاضی نصیر الدین صاحب ایم۔ اے۔ قیصر باغ۔ لکھنؤ .... للعہ

۲۶۔ خان بہادر فضل الرحمٰن خانصاحب ایم۔ ایل۔ اے۔ شاہجہاں پور .... للعہ

۲۷۔ واحد میاں صاحب۔ شاہجہاں پور .... للعہ

۲۸۔ پروفیسر عبد الباسط صاحب پیرزادہ۔ اسلامیہ کالج۔ لاہور .... للعہ

۲۹۔ لائبریرین صاحب امپیریل لائبریری۔ کلکتہ .... للعہ

سید الطاف علی بریلوی

مدیر رسالہ
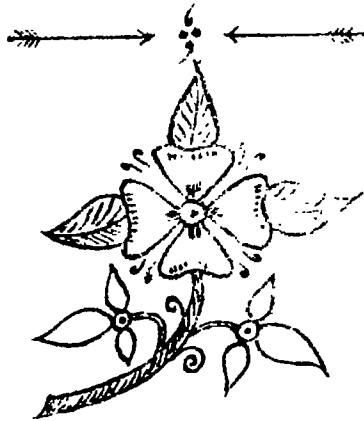
مشہور فاتح "اٹیلا" ۴۵۳ق۔م۔ میں تھا اور اُس نے تمام یورپ فتح کر ڈالا تھا۔ یورپ والے اسے ڈاکو کہتے ہیں اور یہ یقینی نہیں کہ اُسے دنیا کی تاریخ میں شہنشاہیت کا معزز مرتبہ حاصل ہوا کہ نہیں۔ اسی طرح فینقوب یعنی Phoencians نے صنعت و تجارت میں بڑی ترقی کی۔ مگر مجھے نہیں معلوم کہ وہاں کے حکمرانوں کو شہنشاہیت کا مرتبہ حاصل ہوا یا نہیں۔ اسی طرح Hittites کی قوم بہت پرانی تھی اور اس کے صحیح حالات معلوم ہونے کی بھی ضرورت ہے۔
اس تمہید کے بعد میں اپنا مضمون "ایران قدیم" کے متعلق پیش کرتا ہوں۔

قدیم ایران تین[۳] صوبوں پر مشتمل تھا۔ عیلام۔ شمال میں، میدیا مغرب میں، فارس (Persis) جنوب میں، ان تینوں صوبوں کے باشندوں کی ابتدائی تاریخ جدا جدا ہے۔ مگر امتداد زمانہ سے یہ تینوں صوبے مل کر ایک حکومت کے تحت میں آگئے۔ اور چھٹی صدی قبل مسیح میں اس ملک کی دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور سلطنت ہوگئی۔ یہ سلطنت آریہ قوم کی تھی جس کے نام پر اس ملک کا نام "ایران" ہوا۔ آریوں کی یہ سب سے پہلی وسیع سلطنت تھی جس کی وجہ سے یورپ اور ایشیا میں پہلی بار اس قوم کا نام روشن ہوا۔ آریوں کی نسبت خیال ہے کہ وہ وسط ایشیا سے آئے۔ یہ لوگ خانہ بدوش تھے مویشی اور گھوڑے پالتے تھے۔ اور زرخیز ملکوں میں زراعت بھی کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ یورپ کی طرف چلے گئے اور جرمنی، اٹلی، اور یونان میں آباد ہوئے۔ کچھ ہندوستان آئے۔ اور کچھ قدیم ملک باختر سے جو شمال میں تھا صوبہ فارس میں آکر رہ پڑے۔ ذیل میں تینوں صوبوں کا تھوڑا تھوڑا حال درج کیا جاتا ہے:۔

عیلام | ایران کے صوبوں میں سب سے اول عیلام والوں نے نہایت قدیم زمانہ میں ایک طاقتور سلطنت قائم کی تھی۔ جس کا دارالحکومت سوسا تھا۔ مورخ ایچ۔ جی ویلز کے نزدیک یہ لوگ نہ سومری تھے اور نہ سامی بلکہ حبشی نما تھے۔ مگر دوسرے مورخوں نے انھیں آریہ قرار دیا ہے۔ ارض القرآن[۱] مصنفہ سید سلیمان ندوی میں عیلام کو سام کا پہلا بیٹا لکھا ہے۔ دوسری جگہ عیلام کی تورانی زبان لکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی حکومت مصریوں اور بابل والوں سے بھی زیادہ قدیم تھی مگر اس قدر نمایاں نہ تھی کہ انھیں دنیا کی بڑی قوموں میں شمار کیا جاتا۔ ان کا ایک بادشاہ انیسویں صدی قبل مسیح میں ہونا بیان کیا گیا ہے۔ جس کا نام (Kudur Lagamar)

---

[۱] ارض القرآن جلد اول صفحہ ۱۰۴ و صفحہ ۱۳۸۔

وہاں کا پہلا حکمراں "مائناس" محض ایک بادشاہ تھا یا شہنشاہی کے مرتبہ پر پہونچ گیا تھا۔ مزید براں مجھے اُس کے یکجائی حالات کی کوئی کتاب نہیں ملی اس لئے میں نے اُس ملک کو چھوڑ کر "فلسطین میں دُنیا کی چوتھی شہنشاہی" پر ایک مقالہ پڑھا اور آج "ایران قدیم کی پانچویں شہنشاہی" پر اپنی ناقص معلومات آپ کے سامنے حاضر لایا ہوں۔

میں عرصہ سے اس امر میں رہنمائی کا طالب ہوں کہ مختلف ملکوں کی قدامت کا جو معیار میں نے قرار دیا ہے آیا وہ صحیح ہے یا نہیں؟ میرے معیار کے مطابق بعض ملک جو تہذیب کے اعتبار سے نہایت قدیم سمجھے جاتے تھے ترتیب میں بہت نیچے ہو گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہندوستان اور چین جن کی تہذیبیں نہایت قدیم سمجھی جاتی تھیں وہ میرے حساب سے چھٹے اور ساتویں نمبروں پر آتے ہیں۔ اسی لئے میری استدعا ہے کہ مجلس مصنفین اس امر کے تعین کے لئے کہ تہذیبوں کی قدامت کا معیار اور اس معیار کے اعتبار سے مختلف ملکوں کا درجہ اور مرتبہ کیا رکھا جائے۔ ایک سب کمیٹی مقرر کرے۔ نیز رسالہ "مصنف" کے قابل ناظرین سے درخواست ہے کہ وہ بھی اس مسئلہ کی تحقیق فرما کر اپنے خیالات بذریعہ "مصنف" ظاہر فرمائیں۔

میری تحقیق میں شہنشاہیت کی اوّلیت کے اعتبار سے دُنیا کے بڑے بڑے ملکوں کے مراتب کی ترتیب حسب ذیل ہے:۔

	نام ملک	نام شہنشاہ اوّل	سنہ جلوس	کیفیت
(۱)	مصر	مینس (Menes)	سنہ ۴۰۰۰ ق۔م	
(۲)	بابل	شرعون اوّل (Sargon I)	سنہ ۳۰۰۰ ق۔م	
(۳)	کریٹ	مائناس (Minos)	سنہ ۲۵۰۰ ق۔م	معلوم نہیں کہ وہ شہنشاہ تھا یا بادشاہ
(۴)	فلسطین	حضرت داؤدؑ (David)	سنہ ۹۹۰ ق۔م	
(۵)	ایران	کورش بزرگ (Cyrus)	سنہ ۵۵۰ ق۔م	
(۶)	مقدونیہ	سکندر اعظم (Alexander)	سنہ ۳۳۴ ق۔م	
(۷)	ہندوستان	چندر گپت	سنہ ۳۲۲ ق۔م	
(۸)	چین	Shi-Hwang-ti	سنہ ۲۴۶ ق۔م	

یہ سنہ ملک میں نے حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پہلے کے لئے ہیں۔ بعض پُرانے ملکوں کو میں نے اس لئے چھوڑ دیا ہے کہ مجھے اُن کے متعلق یقینی معلومات نہیں۔ مثلاً یہ کہ وسط ایشیا کا

ایک بادشاہ کا انتخاب کیا جائے اور بالاتفاق "ڈیوکیسز" کو اپنا بادشاہ منتخب کیا۔ ڈیوکیسز کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس نے کہا کہ جب تم لوگوں نے مجھے بادشاہ بنایا ہے تو میرے لئے ایک محل بناؤ اور میری جان کی حفاظت کے لئے پہرہ دار مقرر کرو۔ جب میڈیوں نے یہ سب باتیں قبول کر لیں تو ڈیوکیسز نے شاہی اختیارات حاصل کر کے شہر اکبتانہ تعمیر کیا، اُسے پایۂ تخت بنایا اور اُس کے گرد سات گول دیواریں مختلف رنگوں کی بنائیں جن کے اندر کا رقبہ یونان کے پایۂ تخت ایتھنز (Athens.) کے برابر تھا۔ اندر کی دو فصیلیں سونے اور چاندی کے پتروں سے آراستہ کی گئی تھیں۔ ڈیوکیسز بالعموم منظرِ عام پر نہ آتا تھا اور نہ براہ راست لوگوں سے بات چیت کرتا تھا بلکہ وکیلوں اور تحریری درخواستوں کے ذریعہ حالات معلوم کر کے معاملات کی خفیہ اور علانیہ تحقیقات کرتا اور تب احکام صادر کرتا تھا۔ اُس کے سامنے نہ کوئی مسکرا سکتا تھا اور نہ تھوک سکتا تھا۔ اُس کے اثر سے تہذیب کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک دوسرے کے سامنے بھی نہ تھوکتے تھے۔ یہ سب باتیں اُس نے شاہی عظمت اور شاہی دبدبہ قائم کرنے کے لئے جاری کی تھیں۔ تاکہ اُس کے ذریعہ سے ملک میں امن و امان قائم رہے۔ چنانچہ اس طریقہ سے اُس نے تمام مختلف اقوام کو ملا کر ایک حکومت قائم کی جو انصاف، تہذیب اور امن کا ایک عمدہ نمونہ بنی اور اس نمونہ کی پیروی بالعموم ایرانی بادشاہوں نے کی۔ ڈیوکیسز نے ۵۳ سال حکومت کر کے وفات پائی۔

ایک وہ وقت تھا جبکہ میدی، اشوریوں کے غلام تھے۔ پھر ۷۱۵ق۔م میں وہ آزاد ہوئے اور اُس کے ۹۴ سال بعد ۶۲۱ق۔م میں ڈیوکیسز کے پوتے ہوخشترہ (Cyaxares.) نے ۶۲۱ق۔م میں تخت نشین ہو کر اور بنو پولصر شاہ بابل سے مل کر شہر نینوا کو تاراج کیا۔ مگر دورانِ جنگ میں اتفاق سے ۲۸ مئی کو پورا سورج گرہن واقع ہو گیا۔ اُسے خدا کی ناراضی کا نتیجہ سمجھ کر فریقین نے صلح کر لی۔ اس بادشاہ کے مرنے پر "استاجیز" (Astyages.) تخت آرا ہوا مگر اُسے صوبہ فارس کے بادشاہ "ہخامنشی ساتی" (Achemes.) نے شکست دی کر صوبہ میدیا کا الحاق کر لیا۔

صوبہ فارس یا پرسس یا پرشیا کا پایۂ تخت "پرسی پولیس" یا استخر تھا۔ اُس کے تحت میں اب عیلام اور میڈیا کے صوبے آ گئے اور پورے ملک ایران پر ہخامنشی خاندان کی حکومت قائم ہو گئی۔ تاریخ میں کوروش بزرگ کو جو ہخامنشی خاندان کا پہلا بادشاہ تھا کلِ ایران کا سب سے

(ایک انگریزی ماہوار رسالہ)

جس طرح آج بیسویں صدی عیسوی میں مسلم لیگ اور کانگریس کی ہندوستان میں حصولِ اقتدار کے لئے قانونی اور دستوری لڑائی ہو رہی ہے۔ اسی طرح پوری اٹھارویں صدی عیسوی اور انیسویں صدی کے نصف اوّل میں روہیلہ مسلمانوں اور غیر مسلم مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں وغیرہ کے درمیان شمشیر و سناں اور توپ و تفنگ کی جنگ جاری تھی۔ حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ کے ۱۷۰۷ء میں وصال کے بعد جب سلطنتِ مغلیہ زوال پذیر ہوئی۔ تو یہ کشمکش شروع ہو گئی۔

پچاس سال کی مسلسل تیاری اور چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کے بعد ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں روہیلوں کو فتح عظیم اور مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی۔ اُسی زمانہ میں صوبہ فرخ آباد۔ روہیلکھنڈ اور مغربی دوآبہ میں نواب احمد خان بنگش۔ حافظ الملک حافظ رحمت خاں اور نواب نجیب الدولہ کی علی الترتیب تین نہایت طاقتور حکومتیں قائم تھیں۔ اور ساتھ ہی روہیلہ سردار نواب نجیب الدولہ دس سال تک دہلی میں سلطنتِ مغلیہ کے وزیر اعظم اور کمانڈر انچیف افواج کی حیثیت سے آمرِ مطلق رہے۔ عہدِ زوال سلطنتِ مغلیہ میں مسلمانوں کے لئے یہ بہترین زمانہ تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران میں ان حکومتوں کا دوبارہ احیاء ہوا۔ غرض روہیلوں کی تاریخ اور اُن کے جنگی و سیاسی کارنامے حد درجہ ولولہ انگیز اور سبق آموز ہیں۔

آج شکست خوردہ اقوامِ ہند کی تاریخ و سیاست کو بڑھا چڑھا کر دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ اُس پر لاکھوں روپیہ صرف ہو رہا ہے۔ صدہا کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور متعدد و کثیر الاشاعت جرائد جاری ہیں۔ لیکن ہماری غفلت اور بے حسی سے بہادر و غیور روہیلے گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ انکے وطن روہیلکھنڈ کی وحدانیت اور اُس کا نام بھی مٹانے کی کوشش ہو رہی ہے۔

راقم السطور نے اس صورتِ حال سے متاثر ہو کر نیز اس وجہ سے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی کی تاریخ و سیاست ہی ابھی اس وقت کی سیاست پر اثر انداز ہے۔ گزشتہ پندرہ سال سے روہیلوں کی سیر و تواریخ کو اجاگر کرنے کی خدمت اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ اردو میں بہت کچھ لکھا اور لکھوایا گیا۔ لیکن چونکہ اربابِ حکومت۔ غیر مسلم اصحاب اور خود مسلمانوں کا اعلیٰ طبقہ اردو کی چیزوں کا مطالعہ نہیں کرتا۔ اس لئے روہیلہ نامی انگریزی کا یہ ماہوار رسالہ جاری کرنے کی اجازت حاصل کی گئی ہے۔ پہلا پرچہ انشاء اللہ جون ۱۹۴۶ء کے اوّل ہفتہ میں شائع ہوگا۔ قیمت سالانہ ۵ یا ششماہی ۳ پیشگی روانہ کیجئے۔ تاکہ آپ ابتدا ہی سے اسکے خریدار ہو جائیں۔ اور کسی پرچہ کے مطالعہ سے محروم نہ رہیں۔ سب مضامین پُر از معلومات۔ اثر انگیز اور عہد حاضر کی تعمیر ملی میں مدد دینے والے ہوں گے۔

علیگڑھ ۲۰ اپریل ۱۹۴۶ء

سید الطاف علی بریلوی

سولن نے کہا کہ کسی شخص کو اُس وقت تک خوش نصیب نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ وہ زندہ ہے۔

یہ قصہ سُنکر کوروش بزرگ بہت متاثر ہوا اور اُس نے کریسس کا قصور معاف کرکے اُسے اپنا مشیر بنا لیا اور لیڈیا کو الحاق کرکے اُس کے پایۂ تخت 'سارڈس' کو مغربی ممالک پر حملہ کرنے کے لئے اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔ یہ ۵۴۷ ق۔م کا واقعہ ہے۔

کوروش بزرگ نے لیڈیا فتح کرنے کے بعد کچھ یونانی جزائر پر قبضہ کیا اور پھر بابل پر فوج کشی کی جہاں کا بادشاہ 'نبونیدس' (Nabonidas) تھا۔ اس شہر کے بیچ میں سے دریائے دجلہ بہتا تھا اور شہر کی فصیل میں اس دریا کے گزرنے کے لئے محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ کوروش بزرگ کی فوج اِن محرابوں میں سے ہو کر شہر میں داخل ہو گئی اور راتوں رات اس پر قبضہ کر لیا۔ اور کشت و خون نہیں کیا۔ اور نہ مندروں اور دیوتاؤں کو گزند پہونچائی۔ اِس شہر کے لوگ حد درجہ دولتمند تھے اور تجارت و صنعت اور کاروبار کرتے تھے۔ ایرانیوں نے اُنھیں اپنی حالت پر چھوڑ دیا۔ بابل میں پچاس سال سے یہودی قید تھے، کوروش بزرگ نے اُن کے ساتھ ہمدردی کی اور اُنھیں آزاد کرکے فلسطین لوٹنے کی اجازت دیدی۔ یہودیوں کا اپنے وطن کو واپس جانا 'رجعتِ کبریٰ' کہلاتا ہے۔

کوروش بزرگ ۵۲۹ ق۔م میں ملکہ 'تامیرس' کے مقابلہ میں لڑائی میں مارا گیا۔ یہ ملکہ ملک 'سیتھیا' پر حکمراں تھی جس کا نام اب ترکستان ہے۔ کوروش بزرگ کی تعریف میں تمام بڑے بڑے مورّخ رطب اللسان ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے ملک کے لوگوں کو خاک سے اٹھا کر آسمان پر پہونچا دیا۔ اور اپنی مملکت کو بحر اسود سے لے کر مصر کے شمال تک اور طرابلس سے لے کر شمال میں دریائے جیحوں تک اور جنوب میں اٹک تک وسعت دی اور صدہا اقوام کو جو کسی بادشاہ سے مغلوب نہ ہوئی تھیں اپنے تحت میں لایا۔ مگر ملکوں کے فتح کرنے میں بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ مفتوحوں کے ساتھ جور و ظلم نہ کرتا تھا۔ جو سردار یا بادشاہ مغلوب ہو کر اُس کی اطاعت قبول کر لیتے اُنھیں اپنے منصب پر بحال کر دیتا۔ اُس کی رعایا میں صدہا اقوام سینکڑوں زبانیں بولنے والی تھیں۔ اور اُن کے ساتھ اُس کا ایسا دلکش برتاؤ تھا کہ لاکھوں آدمی اُسے دیکھنے کی تمنا کرتے تھے۔

کوروش بزرگ کے بعد اُس کا بیٹا 'کمبوجیہ' تخت نشیں ہوا۔ جسے یونانی کمبوجیہ کہتے تھے۔

پہلا بادشاہ قرار دیا گیا ہے۔ اُس زمانہ میں ایرانیوں کے خدا 'ہرمزد' یا بقول پروفیسر براؤن "اہورامزدا" (Ahuramuzda) کے حکم کے مطابق بادشاہ کا یہ فرض تھا کہ "وہ عدل قائم کرے، جھوٹ بولنے والوں اور دشمنوں کو سزا اور دوستوں کو انعام دے اور ہرمزد کے زیر سایہ اُس کے قوانین کا نفاذ کرے۔"

حقیقی معنوں میں ایران کا پہلا شہنشاہ کوروش بزرگ تھا جو ۵۵۹ق۔م میں تخت نشین ہوا۔ راقم الحروف کے معیار کے مطابق وہ دُنیا کا پانچواں شہنشاہ تھا۔ وہ شاہ ایسٹاجینیز مذکور کا نواسہ، خاندان عیلام کا شہزادہ اور عیلام کے صوبہ انشان کا حاکم تھا۔ اکبتانہ فتح کر کے وہ کُل ایران کا بادشاہ ہوا۔ تب وہ ایشیائے کوچک کے صوبہ لیڈیا پر جو پہلے زمانہ میں ایران کے تحت میں تھا، حملہ آور ہوا۔ لیڈیا کے باشندے پندرہ سال قبل بغاوت کر کے ایرانی حکومت سے آزاد ہو گئے تھے اور اس وقت کریسس (Craesus) اُس صوبہ پر حکمراں تھا۔ اس بادشاہ کے قلمرو میں سونے کی کانیں تھیں جن کی وجہ سے وہ نہایت دولتمند ہو کر "قارون" کے نام سے دنیا میں مشہور ہوا۔ اُس کے خزانوں کی کنجیوں کی نسبت روایت ہے کہ وہ چالیس اونٹوں پر لادی جاتی تھیں۔ شہنشاہ کوروش بزرگ قارون کے ملک لیڈیا پر حملہ کر کے اُسے شکست دی اور گرفتار کر کے اُسے قتل کرنے کا حکم دیا۔ جب قاتل نے کریسس یا قارون پر تلوار اٹھائی تو قارون نے چلا کر کہا "او سولن! او سولن!" کوروش بزرگ نے یہ سُنکر کریسس کو اپنے پاس بلایا اور اُس سے اِن الفاظ کے معنی پوچھے۔ اس نے عرض کیا کہ 'سولن' ایک حکیم ہے جو یونان کے سات عقلا میں شمار کیا جاتا ہے وہ میرا درباری ہے۔ ایک بار میں نے اُسے اپنے تمام خزانے دکھا کر پوچھا کہ تمہارے نزدیک انسانوں میں سب سے زیادہ کون خوش نصیب ہے۔ اِس کے جواب میں سولن نے ایک یونانی کا نام لیا جس نے ایک خاموش مفید اور پُر امن زندگی بسر کی تھی اور اپنے ملک کے لئے لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔ قارون نے یہ سمجھ کر کہ اس کے بعد وہ قارون کو خوش نصیب بتائے گا۔ پھر بھی سوال کیا۔ اِس کے جواب میں سولن نے دو نوجوانوں کا نام لیا جو اپنی ماں کے نہایت تابعدار تھے۔ اُن کی ماں نے خوش ہو کر دعا کی کہ خداوند تعالیٰ اِن پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔ اُس کی دُعا ختم نہ ہونے پائی تھی کہ یہ دونوں نوجوان لڑکے سونے لگے اور ایسے سوئے کہ پھر کبھی نہ اُٹھے۔ تب کریسس نے سولن سے پوچھا "کیا ان دونوں بھائیوں کے بعد بھی میں خوش نصیب نہیں ہوں؟ جواب میں

محصولات اور جبریہ فوجی بھرتی کی خدمت سے تین سال کے لئے معاف کردیا۔ بالآخر شاہی حرم سے یہ بات نکلی کہ یہ شخص کون کون ہے۔ درآنحالیکہ اصل "بارڈیس" کے کان سالم تھے۔ اس راز کے افشاء سے لوگ اُس سے بگڑ گئے۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر "دارا" نے چھ اعلیٰ خاندانوں کی مدد سے قلعہ میں گھس کر اس فرضی بادشاہ بارڈیس کو قتل کردیا۔ اور تخت ایران پر قابض ہوگیا۔ نام نہاد بارڈیس کی حکومت صرف سات ماہ رہی تھی۔

داریوش اول یا دارائے اعظم

کوروش بزرگ اگرچہ ہخامنش کے خاندان سے تھا مگر اُس نے بحیثیت عیلام کا شہزادہ ہونے کے حکومت حاصل کی تھی۔ اور اُس میں میڈیا اور پرسشیا کا اضافہ کرکے صوبہ عیلام میں۔ ہتا تھا اُس کا جانشین دارا بھی اگرچہ ہخامنشی کی نسل سے تھا۔ جیساکہ مندرجہ ذیل شجرہ سے واضح ہوتا ہے لیکن عیلام والوں کو پسند نہ تھا۔

شجرۂ نسب خاندان ہخامنشی

ہخامنشی
چیش پش اول
کبوجیہ اول
کوروش اول
چیش پش دوم

آریارمنا
ارشام
ویشتاسب

کوروش دوم
کبوجیہ دوم
(۱) کوروش سوم (بزرگ) [جو ہخامنشی خاندان کا پہلا بادشاہ تھا
سنہ وفات ۵۲۹ ق۔م]

(۳) داریوش اول [سنہ وفات ۴۸۵ ق۔م] (۲) کبوجیہ سوم [سنہ وفات ۵۲۲ ق۔م]
(۴) خشیارشای اول [سنہ وفات ۴۶۵ ق۔م]
(۵) اردشیر اول [سنہ وفات ۴۲۵ ق۔م]
(۶) داریوش دوم [سنہ وفات ۴۰۴ ق۔م]
(۷) اردشیر دوم [سنہ وفات ۳۵۸ ق۔م]
(۸) اردشیر سوم [سنہ وفات ۳۳۸ ق۔م]
(۹) داریوش سوم [سنہ وفات ۳۳۰ ق۔م]

اُس نے اوّل اپنے بھائی ''بارڈیس'' کو خفیہ طور پر قتل کرایا جسے کورش بزرگ کچھ صوبے دے گیا تھا۔ پھر اُس نے بالائی مصر پر حملہ کرکے اُس کے پایۂ تخت 'منفس' (Memphis) کو فتح کرلیا۔ اُس نے اپنے مغلوب حریف 'سام تھیک' [1] کی جان بخشی کی اور مصریوں کا لباس اور طریقے اختیار کئے اور اُن کے دیوتاؤں کی عظمت قائم رکھ کر ہر دلعزیزی حاصل کی۔ پھر اُس نے کارتھیج پر حملہ کرنا چاہا جو دولت کے لئے نہایت مشہور تھا۔ مگر اُس کی بحری فوج کے لوگوں نے جو فنیقی تھے اپنے ہم قوموں پر حملہ کرنے سے انکار کردیا اس لئے وہ مہم ترک کرنا پڑی۔ اس کے بعد کیوجیہ نے ۵۰ ہزار سپاہیوں کی فوج سے حبش (افریقہ) پر حملہ کیا۔ وہاں اُسے خفیف کامیابی اور زیادہ تر ناکامی ہوئی۔

اُسے پہلے ہی مرگی کے دَورے پڑتے تھے اب اس ناکامی سے اُس کا مزاج زیادہ چڑچڑا ہوگیا۔ مصر سے اس کی غیر حاضری میں وہاں کا مقدس بیل مرگیا تھا اور اُس کی جگہ نئے بیل کی خوشی میں شہر میں دعوتیں ہورہی تھیں۔ کیوجیہ یہ سمجھا کہ مصری میری ناکامی کی خوشی میں یہ جشن منارہے ہیں اس لئے اُس نے اس مقدس بیل کو اپنے خنجر سے مار ڈالا اور مندر میں جاکر اُن کے دیوتاؤں کی بے حرمتی کی اور اسی طرح اور بہت سے مظالم کئے۔ اب چونکہ مصر میں اس کا ٹھہرنا مشکل ہوگیا تھا اس لئے اُس نے اپنے وطن کا رُخ کیا۔ شام میں پہونچ کر اُسے ایک نقیب ملا جس نے تمام فوج کے سامنے علی الاعلان کہا کہ اب کیوجیہ پسر کورش کی حکومت ختم ہوگئی۔ اور ''بارڈیس'' [2] تخت نشین ہوگیا ہے۔ بارڈیس کون تھا؟ یہ کیوجیہ کا حقیقی بھائی تھا جسے اُس نے تخت نشیں ہوتے ہی خفیہ طور پر قتل کرادیا تھا۔ جو لوگ اس قتل کی سازش میں شریک تھے اُن میں سے ایک شخص نامی ''گوماتا'' تھا جو ''بارڈیس'' کے بہت مشابہ تھا۔ اُس نے کیوجیہ کی طویل غیر حاضری سے نفع اُٹھاکر پایۂ تخت میں اُسی کے خلاف بغاوت کرادی اور خود مفقود الخبر بارڈیس کے نام سے ظاہر ہوکر تخت پر قابض ہوگیا۔ اب کیوجیہ نے نقیب کی زبانی یہ خبر سُنی تو شدت رنج میں خودکشی کرلی۔ اور اس طرح ''گوماتا'' ایران کا بادشاہ ہوگیا اور لوگوں نے اُسے کورش کا بیٹا سمجھ کر اُس کی اطاعت قبول کرلی ''گوماتا'' عرف بارڈیس نے لوگوں کو خوش کرنے کے لئے اُنھیں

---

[2] Bardius. [1] Psamthek.

ی وجہ سے اُسے اُس طرف توجہ کرنی پڑی۔ ان لوگوں کو دراصل یونان سے نسلی رہتی تھی۔
س لئے دآرا نے یونان تک پہونچنے کے لئے دردانیال کا راستہ اختیار کیا اور وہاں اور
دریائے ڈینیوب پر پُل بنائے اور اُن پر سے گزر کر دوسری جانب پہونچا۔ دآرا اپنے ساتھ ۸ لاکھ
فوج لے گیا۔ جب دآرا نے "سیتھین" قوم پر حملہ کیا تو وہ لوگ تمام اپنا سامان رسد ساتھ لے کر
پیچھے چلے گئے۔ اُن کا پیچھا دآرا نے رُوس کے علاقہ کے اندر تک کیا۔ اس بیکار مہم پر نقصانات
اٹھا کر دآرا واپس آیا۔ اور تھریس میں ۸۰ ہزار فوج اپنے جرنیل "میگے بیزس" کی سرکردگی
میں چھوڑ کر اپنے پایۂ تخت کو واپس آ گیا۔ اس افسر نے ان ممالک کو مغلوب کرنا شروع کیا۔
یہاں تک کہ ۵۰۰ ق۔م میں کل تھریس اور مقدونیہ کو فتح کر لیا۔ مقدونیہ وہی صوبہ ہے جہاں
دو سو سال بعد سکندر اعظم پیدا ہوا۔ اور تمام دنیا میں نامور ہوا۔

مگر سوئے اتفاق سے اب پھر ایشیائے کوچک کے یونانیوں نے عام بغاوت کر دی۔ جس
کی وجہ سے دآرا کو پھر اس طرف توجہ کرنی پڑی۔ اور ایشیائے کوچک کو فتح کرنے میں اُسے پانچ
سال لگ گئے۔ اور چونکہ ایتھنز کے یونانیوں نے ایشیائے کوچک کی بغاوت میں خاص حصّہ لیا
تھا اس لئے ۴۹۲ ق۔م میں اُس نے ایک مہم تیار کر کے اپنے داماد "مارڈونیس" کی سرکردگی
میں بھیجی۔ مگر مقدونیہ میں ایک طوفان اس قدر زور کا آیا کہ اُس میں ۳۰۰ جہاز اور ۲۰ ہزار آدمی
ضائع ہو گئے۔ جس کی وجہ سے مارڈونیس کو ایشیائے کوچک واپس آنا پڑا۔ مگر دآرا ہمت نہ ہارا
اور دو سال کے اندر نئی مہم تیار کر کے وہاں بھیجی۔ یہ فوج فتح کرتی ہوئی ایتھنز سے ۲۰ میل
اس طرف تاریخی مقام "میریتھان"[۱] میں جا پہونچی۔ اس وقت ایرانیوں کی فوج ایک لاکھ تھی
اور اُس کے مقابلہ میں یونانی صرف ۱۰ ہزار تھے۔ پریشانی میں اُنھوں نے اپنے پرانے دشمن
"اسپارٹا" والوں سے مدد مانگی جو وقت پر نہ پہونچ سکی۔ بالآخر تنہا اُنھوں نے اپنے سے
دس گنی فوج کا جان توڑ مقابلہ کیا۔ اور اُن پر شاندار فتح پائی۔ اس شکست کا حال سُن کر
مصریوں نے باوجود دآرا کے بے شمار احسانات کے آزادی حاصل کرنے کے لئے علم بغاوت بلند
کر دیا۔ باوجود اس کے دآرا نے یونان پر تیسرا حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ مگر اسی دوران
میں وہ ۴۸۵ ق۔م میں ۳۶ سال حکومت کر کے فوت ہو گیا۔ اس عہد میں ایران کا انتہائی
عروج ہوا۔ دآرا کی مملکت کے رقبہ کا اندازہ اُس کی قبر کے طویل کتبہ سے ہوتا ہے جس میں سے

Marathon. ۵۳ Megabazus. ۵۱

دوسری بات یہ تھی کہ کوروشس بابل کے دیوتاؤں کی پوجا کرتا تھا۔ برخلاف اس کے "دارا" زرتشت کے مذہب کا پیرو تھا۔ ان وجوہ سے زیادہ تر رعایا اُس کی مخالف تھی۔ چنانچہ صوبہ جات عیلام، بابل، میدیا، اور پارتھیا وغیرہ نے یکے بعد دیگرے اُس سے سرکشی کی۔ صرف مصر، شام، اور ایشیائے کوچک وفادار رہے۔ مندرجہ بالا سرکش صوبوں کو مغلوب کرنے میں اُسے پانچ سال لگے۔ اُس کے پیشرو "بارڈیس" نے یہودیوں کو بیت المقدس کی تعمیر کرنے کی ممانعت کر دی تھی۔ اور اُس کی اجازت اپنی دریا دلی سے کوروشس نے دیدی تھی۔ دارا نے اُنہیں پھر تعمیر کرنے کی اجازت دیدی۔ نہ صرف یہودیوں بلکہ جملہ اقوام کے ساتھ "دارا" کا برتاؤ فیاضانہ تھا۔ اُس نے تمام مفتوحہ قوموں کو اپنی زبان، مذہب اور تہذیب پر قائم رہنے کے لئے آزادی دیدی تھی۔

بغاوتیں فرو کرنے کے بعد دارا نے اپنی مملکت کو منظم کرنا شروع کیا اور اُسے باقاعدہ صوبوں میں تقسیم کر کے اُن پر گورنر مقرر کئے اور انہیں شاہی اختیارات عطا کئے۔ صوبوں کی حیثیت کے مطابق مالگزاری اور محصولات قائم کئے۔ چنانچہ شمالی ہندوستان سے بھی دس لاکھ پاؤنڈ سالانہ وصول ہوتے تھے۔ اُس زمانہ میں دریائے اٹک سے سونا نکلتا تھا۔ بعض ملکوں سے نقد کی جگہ جنس کی شکل میں مالگزاری وصول کی جاتی تھی۔ مثلاً مصر سے ایک لاکھ ۲۰ ہزار فوجی سپاہیوں کے لئے جو وہاں رہتے تھے، غلہ لیا جاتا تھا۔ میڈیا سے ایک لاکھ بھیڑیں ۴ ہزار خچر اور تین ہزار گھوڑے۔ آرمینیا سے ۳۰ ہزار مرغی کے چوزے، بابل سے ۵۰۰ خواجہ سرا، سالانہ لئے جاتے تھے۔ اور سیلیشیا سے ایک سفید گھوڑا روزانہ لیا جاتا تھا جس سے سال میں ۳۶۵ گھوڑے وصول ہو جاتے تھے۔

محصولات وصول کرنے کے ساتھ دارا رعایا کی آسائش کو بھی مدنظر رکھتا تھا۔ اُس نے دریاؤں کے پل اور گھاٹ بنوائے، دریائے نیل سے بحر احمر تک آبپاشی اور بار برداری کے لئے ایک بڑی نہر نکالی۔ عمدہ سڑکیں اور اُن پر سرائیں بنوائیں۔ اُن کی نگرانی کے لئے پہرہ دار مقرر کئے۔ ڈاک کا انتظام گھوڑوں کے ذریعہ کیا۔ اور ایران کے بادشاہوں میں سب سے اوّل چاندی کا سکہ جاری کیا۔

ملکی انتظامات سے فارغ ہو کر اُس نے توسیع سلطنت کی طرف توجہ کی اور ۵۱۲ ق م میں ایک مہم بھیج کر پنجاب کا الحاق کیا۔ اب ایشیائے کوچک اور جزائر ملحقہ میں یونانیوں کی بغاوتوں

۴۶۵ ق۔م وہ فوت ہوگیا۔

خشایارشائی اوّل کے بعد اگرچہ اس خاندان کے پانچ بادشاہوں نے ۴۶۵ ق۔م سے لے کر ۳۳۰ ق۔م تک یعنی ایک سو پینتیس ۱۳۵ سال تک اور حکومت کی لیکن اُن کی حکومت رُو بہ تنزل ی۔اُن بادشاہوں کے نام مع اُن کے سنہ وفات کے ذیل میں دئے جاتے ہیں۔

(۱) اردشیر اوّل	سنہ وفات	۴۲۵ ق۔م
(۲) داریوش دوم	″ ″	۴۰۴ ″ ″
(۳) اردشیر دوم	″ ″	۳۵۸ ″ ″
(۴) اردشیر سوم	″ ″	۳۳۸ ″ ″
(۵) داریوش سوم	″ ″	۳۳۰ ″ ″

۳۳۰ ق۔م میں داریوش سوم اور اسکندر رومی کے درمیان ایک سخت لڑائی ہوئی۔ یرانی فوج کو شکست ہوئی اور داریوش سوم حالتِ فرار میں فوت ہوا۔اور اس طرح ایران کے س عظیم الشان خاندان کا خاتمہ ہوا۔

یرانیوں کے مذہب کا بانی ”زرتشت“ تھا۔اُس کا زمانہ بعض کے نزدیک ۱۰۰۰ ق۔م تھا گر بالعموم وہ ۶۰۰ ق۔م سمجھا جاتا ہے۔ اس مذہب کے نزدیک سب سے بڑا معبود ”میترا“ یا ”سورج دیوتا“ تھا۔اُس نے دو دیوتا پیدا کئے ایک ”ہرمزد“ جو روشنی۔نیکی۔صداقت ور صفاتِ گوئی کا دیوتا تھا۔دوسرا ”اہرمن“ جو تاریکی۔بدی۔رازداری۔عیاری اور حکمت عملی کا دیوتا تھا۔ ہرمزد اور اہرمن میں سخت لڑائی ہوئی۔یہاں تک کہ ہرمزد اہرمن پر غالب آگیا اُسی کی اب پرستش ہوتی ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ اس مذہب کا بانی زرتشت کوئی مجدد یا پیغمبر تھا جس نے ابتدا میں توحید کی تعلیم دی مگر چونکہ ہر طرف دیوتا پرستی کا چرچا تھا اسلئے یہ عقیدہ غالب آگیا۔اور لوگوں کے عام عقائد کے مطابق دو اور دیوتاؤں کا اضافہ ہوکر مثل مصر اور بابل وغیرہ کے تین دیوتاؤں کی تثلیث قائم ہوگئی۔مگر بعد میں صرف ”ہرمزد“ کی پرستش باقی رہ گئی۔اس مذہب میں توحید کے عقیدہ کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اُس میں کسی مورتی کی پوجا نہیں ہوتی۔البتہ ”میڈیا“ والے دوسرے دیوتا ”اہرمن“ کے معتقد ہوگئے۔اس لئے وہ لوگ شیطانوں کو پوجنے لگے۔اور جادو اور اوہام میں مبتلا ہوگئے

چند اقتباسات یہ ہیں:-

"دارا بادشاہ کہتا ہے میرے خاندان کے آٹھ بادشاہ ہوئے میں نواں ہوں۔ مجھے ہرمزد نے ۲۲ ملک عطا کئے جن کا میں بادشاہ ہوں۔ ان میں سے چند نام یہ ہیں پرشیا سوسیانیا، بابل، اسیریا، عرب، مصر، اسپارٹا، یونیا، آرمینیا وغیرہ وغیرہ"

"دارا بادشاہ کہتا ہے: دیکھئے ایماندار تھے اُن کی میں نے پرورش کی انھیں عزیز رکھا اور اُن کی حفاظت کی۔ جو میرے مخالف تھے اُنھیں برباد کر دیا۔ ہرمزد کے فضل سے جو ملک مجھے دئے گئے وہ نہایت خوش رہے۔"

اس کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دارا نے اپنی رعایا کی پرورش کرنے اور اُن کی حفاظت کرنے کے فرائض کیسی خوبی سے ادا کئے۔

خشایارشا دارا کے بعد اُس کا بیٹا خشایارشا ۴۸۵ ق۔م میں تخت نشین ہوا۔ مگر وہ عیش پسند اور آرام طلب تھا اور اُس کا ارادہ یونان پر حملہ آور ہونے کا نہ تھا۔ مگر اُس کے درباریوں نے اُسے آمادہ کر دیا کہ وہ اپنے باپ کے ارادہ کی تکمیل کرے۔ چنانچہ اُس نے اپنے تمام صوبہ دار کو جمع کر کے مشورہ کیا جس میں چھ مہینے صرف ہوئے۔ اور ۴۸۱ ق۔م میں دس لاکھ فوج ایشیائے کوچک کے پایۂ تخت "سارڈس" میں جمع کر دی۔ جس کی نظیر اس سے قبل دنیا میں نہ ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ فوج اتنی زیادہ تھی کہ جب دردانیال میں دوہرا پل بنا کر اُس پر سے گزری تو اس میں سات دن اور سات راتیں صرف ہو گئیں۔ تھریس اور مقدونیہ میں سے گزرنے میں اسے کوئی مزاحمت پیش نہیں آئی۔ یہانتک کہ وہ "تھرماپلی" تک جا پہونچی تھا اسپارٹا کا ایک بادشاہ صرف دس ہزار فوج سے مقابلہ کے لئے آیا ہوا تھا۔ مگر ایرانیوں نے ایک تنگ درہ سے گزرنے کی کوشش کی۔ جہاں یونانی اس مذکور صرف تین سو آدمی بچا سکا۔ انھیں تین سو سے اُس نے لاکھوں آدمیوں سے ٹکر لی۔ اور اس قدر حیرت انگیز مردانگی سے اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ جان دیدی کہ آج ڈھائی ہزار سال بعد بھی اُس کا نام عزت اور احترام سے لیا جاتا ہے۔ بہرحال اُس وقت تو خشایارشا نے ایتھنز لے لیا۔ مگر پھر بحری لڑائی میں اُس کے دو سو جہاز یونانیوں نے ڈبو دئے اور وہ سخت شکست کھا کر ایشیا کو واپس ہو گیا۔ ایشیائے کوچک پہونچنے پر وہاں کے یونانیوں نے بھی بغاوت کی جس کی وجہ سے اُسے اپنے پایۂ تخت "سوسا" کو جانا پڑا۔ اس ناکامی نے اُس کی کمر توڑ دی۔ اور بیس سال بعد

اُردو شاعری کی تنقید میں چند اصولی بحثیں

از

(ڈاکٹر محمد ابواللیث صدیقی صاحب۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ علیگ)

اس مقالہ کا مقصد یہ ہے کہ اردو شاعری کی تنقید میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے اُن کا
لیا جائے اور دیکھا جائے کہ اس پُرآشوب دور میں ہمارے ناقدین اپنے فرائض کس طرح
دے رہے ہیں۔ اگرچہ یہ خیال اب عام ہے کہ شعر و ادب پر باقاعدہ تنقید کا دور اسی زمانہ
رُوع ہوتا ہے اور یہ کسی قدر صحیح بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ خود
ے شعراء اور ناقدین نے بھی عہد قدیم میں ناقد کے فرائض انجام دئے ہیں۔ چنانچہ پہلے ہمیں
لے جدید اور قدیم رجحانات کا مختصر ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اُردو میں شعر کے حُسن و قبح کے بیان پر سب سے پہلی شہادت اُردو کے مشہور قدیم شاعر
ی کے کلام میں ملتی ہے۔ اپنی مشہور مثنوی قطب مشتری میں اس نے شعر کے متعلق حسب ذیل
ت کا اظہار کیا ہے:-

(۱) شعر وہی قابل تعریف ہے جس میں ربط اور سلاست ہو۔

(۲) زیادہ مہمل کلام کہنے سے تھوڑا سا منتخب کلام کہنا زیادہ بہتر ہے۔

(۳) زبان اور بیان میں اساتذۂ سلف کی پیروی کرنا چاہئے۔

(۴) شعر اگرچہ بغیر زیبائش و آرائش کے بھی اچھا شعر ہو سکتا ہے لیکن صنائع و بدائع
سے اس کے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

ع رہے کہ یہ خیالات اب سے ساڑھے تین سو سال پہلے کے ہیں۔ کیونکہ قطب مشتری کا
نہ تصنیف سنہ ۱۰۱۸ ہجری ہے۔

یہ بالکل ابتدائی دور تھا۔ آگے چل کر ہمیں میر تقی میر صاحب کا مشہور تذکرہ نکات الشعرا ملتا ہے

لاحظہ ہو سب رس از ملا وجہی و قطب مشتری از ملا وجہی۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔

ان کے پوجاری "مجوس" میگائی (Magi) کہلاتے تھے۔

زرتشت کی آسمانی کتاب "اوستا" ہے اور "زند" اس کا ترجمہ اور تفسیر۔ متن اور تفسیر دونوں مل کر "زند اوستا" کہلاتے ہیں۔ اس مذہب کی بنیاد تین چیزوں پر ہے۔

راست خیالی۔ راست گفتاری۔ اور راست کرداری۔ اس مذہب میں پجاری یا پروہتوں کی بڑی وقعت تھی اور ان کا اثر حکومت پر بھی تھا۔ ان کا خاص لباس جبہ چادر، پٹکے اور اونچی ٹوپی پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ "موبد" کہلاتے تھے۔

اپنے زمانہ کے بادشاہوں کی رہنمائی کے لئے زرتشت نے نظام سلطنت کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ لکھا ہے کہ:-

"زمانۂ قدیم میں ایران میں جمشید نامی بادشاہ تھا۔ وہ بمنزلہ رعایا کے باپ کے تھا۔ اس کی مانند آفتاب نے کوئی جلیل القدر بادشاہ نہ دیکھا تھا۔ اس کے زمانہ میں جانور تک ہلاک نہ ہوتے تھے۔ نہ پانی کی کمی ہوتی تھی، نہ پھلدار درختوں کی اور نہ ایسے جانوروں کی جو انسانی غذا کے کام میں آتے ہیں۔

جمشید کے زمانہ میں نہ پالا پڑتا تھا نہ گرمی پڑتی تھی، نہ موت تھی، نہ بے لگام جذبات تھے۔ انسان پندرہ سال کی عمر کا معلوم ہوتا تھا۔ بچے حفاظت کے ساتھ پرورش پاتے تھے۔

جمشید اپنی رعایا کا باپ تھا اور اس کے زمانۂ حکومت میں یہی حالت رہی۔"

اس بیان میں اگرچہ بہت مبالغہ ہے مگر اس سے اس امر کا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شخصی حکومت کے بادشاہ سے کس کس قسم کی توقعات کی جاتی تھیں۔ اور رعایا کی طرف سے وہ کیسے کیسے خلاف قیاس امور کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔

طفیل احمد

۵۔ صفائی شعر کا حسن ہے کیونکہ شاعری کا مقصد اثر انگیزی ہے۔ اگر کلام میں تعقید یا
غلاق ہوگا تو یہ بات حاصل نہ ہوگی کہ کلام شاعر کے دل سے نکلے اور سامع کے دل میں بیٹھے،
س کا ذکر میر صاحب نے تذکرہ میں جا بجا کیا ہے۔
۶۔ شاعری کو مضامین محدود نہیں ہیں، اکثر اچھے شاعر وہی ہیں جو گل و بلبل کے مضامین
کے ماسوا اور مضامین بھی نظم کرنے میں کوشش کرتے ہیں، چنانچہ تاباں، سودا اور سجاد
کے کلام کا یہی حال ہے۔
۷۔ شعر "تہ دار" ہونا چاہیے۔
۸۔ دردمندی اچھے شعر کا جوہر ہے۔
۹۔ طرز خاص پیدا کرنا چاہیے۔
۱۰۔ توارد سے بچنا چاہیے۔
میر صاحب کے یہ خیالات شعر و شاعری پر ایک اہم تنقید کی حیثیت رکھتے ہیں، آگے چل کر
میر صاحب فرماتے ہیں :-

"جاننا چاہیے کہ ریختہ کی کئی قسمیں ہیں .... تیسرے یہ حرف و فعل
فارسی کے کلام میں لائیں اور یہ قبیح ہے، چہارم یہ کہ فارسی تراکیب لاتے ہیں اکثر
تراکیب جو زبان ریختہ کے مناسب ہوں جائز ہیں اور اس کو شاعر کے علاوہ کوئی
دوسرا شخص نہیں جان سکتا اور ایسی تراکیب جو ریختہ کے لئے نامانوس ہوں وہ معیوب
ہیں اور اس کے جاننے پر سلیقہ شاعری کا منحصر ہے ــــــ" لـه

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ابتدائی دور میں بھی فارسی کا اثر قبول کرنے کی حدود
مقرر اور معین تھیں۔ غرض ہماری تنقید کے اس پہلے اور ابتدائی دور میں بھی نقد شعر کا سلیقہ
موجود تھا۔ اس قسم کے تذکرے جو اس نقد کے آئینہ دار ہیں تعداد میں بہت ہیں چند مشہور
تذکرے یہ ہیں۔ تذکرہ مخزن نکات (قیام الدین قائم) تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن دہلوی)
تذکرہ ہندی گویاں (مصحفی) تذکرہ ریاض الفصحا (مصحفی) تذکرہ مجموعۂ نغز (قدرت اللہ قاسم)
گلزار ابراہیم (علی ابراہیم) گلشن ہند (مرزا علی لطف) طبقات الشعرا (قدرت اللہ شوق)
گلستان سخن (قادر بخش صابر) چمنستان شعرا (لچھمی نرائن شفیق) یہ چند قدیم تذکرے ہیں، جو

لـه ترجمۂ عبارت نکات الشعرا۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔

اسے بعض حضرات نے محض 'بیاض' لکھا ہے اور اس کی تنقید کو مشاعرہ کی واہ واہ کہا
لیکن یہ کہنا انصاف کا خون کرنا ہے یہ صحیح ہے کہ اس میں شاعری کی ماہیت اور اس کے ا
پر بحث نہیں کی گئی ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ میر صاحب جن کے متعلق مشہور ہے کہ بڑے
بڑے شاعر کا کلام سنکر بھی داد دینا تو درکنار سر کو جنبش تک نہیں دیتے تھے وہ بغیر کوئی ا
سامنے رکھے کسی کے کلام پر رائے زنی نہیں کر سکتے ہیں۔ اصولوں پر بحث کرنے کی ضرورت میرؔ
نے غالباً اس وجہ سے نہیں سمجھی کہ اُس زمانہ میں ناقد ہی ناقد کا فرض انجام دیتا تھا اور
کے ذہن میں سارے اصول اور مسلمات صاف اور واضح ہوتے تھے، اب جبکہ ہر دوسرا
لکھنے والا اس فن میں دادِ سخنوری دے رہا ہے یہ ضرورت آپڑی ہے کہ اصول اور
کا علٰحدہ علٰحدہ تجزیہ کیا جائے۔ بہر حال میر صاحب نے شاعری کے متعلق جن اہم خیالات کا
ہے اُن کا خلاصہ یہ ہے:۔

ا۔ اصل شاعری قافیہ پیمائی میں نہیں ہے کیونکہ ناظم اور شاعر میں فرق مراتب ہے۔ موز
طبع ہونا اور مضمون کو نظم کر لینا اور بات ہے۔ شعر کہنا دوسری بات، اس کی تفصیل میر صاحب
نے داؤد، شاغل، دلاور بیگ، محمد عارف کے ذکر میں کی ہے۔[۵۲]

۲۔ ربط کلام ایک امر ضروری ہے جو غیر شاعر کے کلام میں نہیں ملتا اس کا ذکر شعرائے
کے سلسلہ میں اس طرح کرتے ہیں۔

اگرچہ ریختہ از دکن است اما چوں از آنجا یک شاعر مربوط بہم نہ رسیدہ لہذا شروع
بنام آنہا نکردہ ـــــــــ

صباؔئی احمد آبادی۔ محمد یار خاکسار کے بیان میں اس کی اور تشریح موجود ہے۔

۳۔ شاعر کو خوش فکر ہونا چاہیئے چنانچہ میر صاحب کے نزدیک مضمون، سوداؔ کی
شاعرانہ شہرت کا دار و مدار اسی خوش فکری پر ہے۔

۴۔ "تلاشِ لفظِ تازہ" اچھے شاعر کی نشانی ہے۔ کیونکہ مضمون جو شاعر کے ذہن میں
ہوتا ہے وہ اگر اچھا بیان حاصل نہ کر سکے تو اس کی خوبیاں فی ذہنِ شاعر ہی رہ جاتی ہیں۔ اس
کی مثال خاص طور پر سوداؔ کی شاعری ہے۔

---

۵۱ ملاحظہ ہو اُردو تنقید پر ایک نظر،

۵۲ ملاحظہ ہو نکات الشعراء، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو۔

٦

ہیں کوچے سے آشنا ہوں۔

(۳) مضامین مقررہ کے علاوہ جو غزل میں نظم ہوتے چلے آئے ہیں، جذبات انسانی میں سے دیگر جذبات کو بھی موضوع غزل بنایا جائے۔

(۴) باعتبار مضامین اور خیالات غزل میں وسعت پیدا کی جائے۔

(۵) زبان کو بہتر بنایا جائے لیکن نہ اس طرح کہ یکایک کوئی اہم تبدیلی اسلوب بیان میں پیدا ہو جائے۔

(٦) ردیف ایسی اختیار کی جائے جو قافیہ سے میل کھاتی ہو اور ردیف قافیہ غیر مانوس نہیں لکھی جائیں۔

اس تنقید میں کئی امور نہایت اہم ہیں۔ حالی کے سامنے لکھنؤ کے دور آخر کی غزلیں تھیں۔ ان کو دیکھ کر انہیں لکھنا پڑا کہ زبان میں صنعت اور خیالات میں رکاکت وسخافت پائی جاتی ہے۔ حالی کے علاوہ اور لوگ بھی اس طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ چنانچہ خود لکھنؤ میں عام صنعت گری اور رکاکت کے خلاف ایک تحریک کا آغاز ہوا۔ یہ مرثیہ گوئی کی تحریک تھی جس نے نسیم، امانت، صاحبقراں کے لکھنؤ میں انیس اور دبیر کو پیدا کر دیا۔ ان لوگوں نے عوام کے مذاق کی اصلاح کی اور یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اسی کی بدولت جب مرثیہ گوئی کا عہد زریں ختم ہوا اور غزل نے لکھنؤ میں نیا جنم لیا تو آرزو، ثاقب، صفی، عزیز وغیرہ نے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ اُن کی غزلیں ان دونوں عیوب سے پاک ہیں، نہ الفاظ میں صنعت ہے نہ خیالات میں رکاکت۔

غزل کے علاوہ حالی نے جن اصناف پر تنقید کی ہے اُس میں مثنوی خاص طور پر اہم ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

(۱) مثنوی کے لئے ایک ضروری شرط ربط ہے، جن لوگوں پر غزلیت کا رنگ غالب آجاتا ہے اُن سے مثنوی کے فرائض اچھی طرح انجام نہیں پا سکتے۔

(۲) قصہ کی بنیاد ناممکن اور فوق العادت واقعات پر نہ رکھی جائے۔

(۳) مبالغہ سے پرہیز کیا جائے۔

(۴) کلام اقتضائے حال کے مطابق ہو۔

(۵) جو حالت بیان کی جائے وہ لفظاً اور معناً نیچرل اور عادت کے موافق ہو۔

بغیر تاریخی ترتیب کے بیان کئے گئے ہیں۔ دورِ حاضر میں اگرچہ تذکرہ نگاری کا انداز بہت کچھ بدل گیا ہے لیکن بہت سی کتابیں ایسی تصنیف ہوئی ہیں جو انھیں تذکروں کے تحت میں آتی ہیں مثلاً آبِ حیات (محمد حسین آزاد) گلِ رعنا (عبدالحی) شعر الہند (عبدالسلام ندوی) تاریخِ ادب اُردو (رام بابو سکسینہ) پنجاب میں اُردو (محمود شیرانی) دکن میں اُردو (نصیر الدین ہاشمی)۔ ان تذکروں اور قدیم تذکروں میں اصولِ تنقید میں کچھ فرق ہے۔ پہلے ذاتی حالات اور تاریخی واقعات پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا تھا۔ اب ان چیزوں کو بھی شاعری کے مطالعہ میں بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ پہلے تحقیق میں زیادہ کاوش نہیں کی جاتی تھی اب کوئی بات بغیر کاوش اور تحقیق کے قبول نہیں ہوتی۔

تذکروں کا دور ختم ہوا تو باقاعدہ تنقید کا آغاز ہوا اور پہلی مرتبہ شعر کی ماہیت اور شاعری کے عام اصول اور شعر و الفاظ معرضِ بحث میں آئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حالی نے اس کام کا آغاز کیا۔ اگرچہ ان کے بعض بیانات محلِ نظر ہیں لیکن یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اُن سے پہلے شعر کی ماہیت اور اصول سے کسی تذکرہ نگار نے تعلق نہیں رکھا تھا۔ آئندہ تنقید کی عمارت جس بنیاد پر قائم ہوئی وہ حالی کا مقدمہ ہی ہے۔ ان کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ نفسِ شعر وزن کا محتاج نہیں قافیہ درحقیقت شعر کے لئے ضروری ہے نہ شعر کے لئے۔ شاعر کے لئے تخیل، مطالعہ کائنات اور تفحصِ الفاظ کی تین شرطیں ضروری ہیں۔ لیکن تخیل کو قوتِ ممیزہ کا محکوم رکھنا چاہیے۔
شاعری پر بحث کرنے کے بعد حالی نے اُردو شاعری کے مختلف اصناف کا جائزہ لیا ہے اس سلسلہ میں قدرتی طور پر انھوں نے پہلے غزل پر تنقید کی ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے:-

(۱) غزل میں کوئی خاص مضمون مسلسل بیان نہیں کیا جاتا۔

(۲) اس میں عشقیہ مضامین کے ساتھ تصوف، اخلاق اور مواعظ بھی شامل ہوگئے ہیں۔

(۳) الفاظ میں ضعف اور خیال میں رکاکت اور سخافت یوماً فیوماً بڑھتی جاتی ہے، اس لئے غزل میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس اصلاح کے لئے حالی کی تجاویز یہ ہیں:-

(۱) غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ ایسے جامع الفاظ میں ادا کئے جائیں کہ محبوب کا مرد یا عورت ہونا ظاہر نہ ہو۔

(۲) شراب اور کباب کے مضامین یا تصوف کے مسائل نظم کرنا وہی لوگ اختیار کریں،

شاعری کا Neo-classical نظریہ جو سترھویں اور اٹھارھویں صدی
ابتدا تک انگلستان میں مقبول رہا۔ مختصراً یہ ہے:-

(۱) شاعری نیچر کی نقالی ہے۔

(۲) فن شاعری کے اصول اور ضوابط متقدمین سے اخذ کرنا چاہئیں جو فطرت
راز داں تھے۔

(۳) اُن کی شاعری کے نمونوں کو اپنے لئے مثال بنانا چاہئے۔

(۴) Neo-Classical اسکول کے شعرا اس کے قائل نہ تھے کہ شاعری
تخیل کی پیداوار ہے یا اس کا منبع اور سرچشمہ "شاعرانہ الہام" ہے بلکہ اُن کے نزدیک
شاعری محض اور خالص اُن ذہنی صلاحیتوں اور اعمال کی پیداوار تھی جیسے لفظ (Wit)
سے ظاہر کرتے تھے۔

(۵) اسی بنا پر ان لوگوں کے نزدیک شاعری اصول اور ضوابط کی پابندی کا نام اس لئے
ان کی تنقید در اصل اصول اور ضوابط کی تنقید تھی۔[۱]

اگرچہ انگریزی نقادوں نے اپنے نظرئے فرانسیسی کلاسیکل اسکول کی تحریروں پر قائم
کئے تھے لیکن ان اصولوں کو ملکی ضروریات اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق دیکھتے اور برتتے تھے۔
چنانچہ رائمر (Rymer) اور ڈرائیڈن (Dryden) کی بحثوں سے اسکی
تائید ہوتی ہے۔ رائمر کا خیال تھا کہ فطرت کی کارفرمائی ہر جگہ یکساں ہے اس لئے موجودہ
زمانہ میں بھی اسٹیج پر یونانیوں کے طرز کے المیہ وہی اثر پیدا کر سکتے تھے جو عہد قدیم کے یونانی
میں پیدا کرتے تھے۔ ڈرائیڈن کا اس پر یہ اعتراض تھا کہ زمانہ، ملکی آب و ہوا، لوگوں
کے عادات اور اطوار طبیعت میں ایسا اختلاف پیدا کر دیتے ہیں کہ ممکن ہے جس چیز پر یونانیوں
کو وجد آجائے انگریز اسے بالکل پسند نہ کریں۔ اس بحث سے ضمناً اس خیال کی بھی تائید
ہوتی ہے کہ ہر ملک کی زبان کا مزاج مخصوص ہوتا ہے کسی طرز یا صنف کی کامیابی ایک
ملک میں ہرگز اس پر دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی دوسرے ملک کے لئے بھی موزوں ہے
اور رائج ہو سکتی ہے۔ بالفاظ دیگر مشرقی ادب و شعر کا مزاج مغربی شعر و ادب سے مختلف بلکہ
بعض حیثیتوں سے متضاد ہے اس لئے بعض ایسی اصناف کو مغرب سے مستعار لیکر مشرق میں

---

[۱] یہ ویسا ہی رنگ ہے جو دورِ آخر کی فارسی شاعری یا لکھنؤ کی اُردو شاعری کے عہد میں نظر آتا ہے۔

(۶) قصہ میں ایک بیان دوسرے کی تکذیب نہ کرے۔
(۷) کوئی بات تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف نہ ہو۔
چونکہ آگے چل کر ہمیں خود مختلف اصناف پر بحث کرنا ہے اس لئے حالی کے بیان پر یہاں اظہار خیال نہیں کیا گیا ہے۔

حالی کے دورِ عبوری سے نکل کر ہم اس عہد میں آپہنچے ہیں جہاں مغربی زبان، ادب اور تنقید کے مطالعہ نے ہمارے اکثر خیالات اور تصورات کو منقلب کر دیا ہے۔ اس لئے دورِ حاضر کی تنقید وں کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب ہو گا کہ ہم مغرب میں تنقید کی ابتدا اور ارتقا کا مختصر سا جائزہ لیں تاکہ دوراں کے عام رجحانات کا اندازہ لگایا جا سکے۔

انگلستان میں تنقید کے دو نہایت اہم رجحانات ہیں، ایک رومانی Romantic اور دوسرا (Neo-Classical) رومانی نظریے کی بنیاد افلاطونیت پر ہے اور (Neo-Classical) والے اپنی ابتدا شاعری کی اس تعریف سے کرتے ہیں جو ارسطو نے کی ہے۔ سولھویں صدی سے پہلے تک انگلستان میں تنقید کا وجود نہ تھا۔ چنانچہ شاعری کے متعلق یہ دونوں نظریے اسی صدی میں اٹلی سے انگلستان پہنچے۔ ابتدائی زمانہ میں خود انگلستان والوں کا کوئی خاص رجحان پیدا نہیں ہوا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد کوشش کی گئی کہ ان دونوں نظریوں میں جو اختلاف بلکہ تضاد تھا اسے کسی طرح رفع کیا جائے۔ لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی، چنانچہ رفتہ رفتہ (Neo-classicism) کے اصول علٰحدہ اور واضح ہو گئے اور سترھویں صدی عیسوی کی فرانسیسی شاعری کے زیر اثر یہ نظریہ باقاعدہ مرتب اور مدوّن ہو کر انگلستان کی شاعری پر ایک صدی سے زیادہ تک اثر انداز ہوتا رہا۔ اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں Neo-classicism کا زوال ہوا اور رومانیت Romanticism نے فتح پائی۔ اس سے شعر و شاعری کے تصورات میں بڑا انقلاب آیا۔ کم و بیش ایک صدی تک انھیں خیالات کا دور دورہ رہا۔ سو سال بعد ماتھیو آرنلڈ نے Romanticism کے علمبرداروں کی اس تنقید سے فائدہ اٹھایا جو انھوں نے Neo-classicism پر کی تھی اور Classical شاعری کے اصولوں کو دوبارہ مرتب، مدوّن اور واضح کیا۔

رواج دینا جو اس زبان کے لئے مناسب نہیں ہیں حق لاحاصل ہے۔

اٹھارھویں صدی کے نصف آخر سے رومانیت کے علمبرداروں کا عروج شروع ہو
اُن کے سامنے یونانی متقدمین کے نمونوں کی جگہ گاتھی طرز کے نمونے تھے۔

گاتھی طرز پر ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھار ہو رہی تھی، متقدمین یونانیوں کے کار
کو آرٹ کی معراج کمال سمجھتے تھے۔ انھیں گاتھی طرز میں ایک قسم کی کرختگی، ناہمواری ا
انتشار نظر آتا تھا اور وہ اپنے اصولوں پر پرکھتے تھے تو انھیں سوائے خامیوں کے
نظر نہ آتا تھا، چنانچہ رومانیت کے علمبرداروں کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ ان اعتراضات
جواب دیں جو متقدمین، رومانیت یا گاتھی شاعری پر کرتے تھے، دوسرے یہ کہ وہ اپنی [illegible] پر
میں متقدمین کے مقررہ اصولوں کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ متقدمین کا عقیدہ یہاں۔
اس پر بہت برافروختہ تھے کہ ان نئے شاعروں نے جو شاعری کے چند نئے اصول ایجاد
کیا ہے تو ان کی شاعری تو صرف بےمعنی گوئی رہ گئی ہے۔ رومانیت کے علمبردار یہ صفائی
پیش کرتے تھے کہ ہماری شاعری ایک ایسی قسم کی شاعری ہے جس پر متقدمین کے اصول عا
نہیں ہوتے بلکہ اس کو اس کے اپنے اصولوں اور ضوابط پر پرکھنا چاہئے۔

اگر غور کیا جائے تو اردو ادب میں شاعری اور تنقید اسی دور سے گزر رہی ہے جس۔
انگریزی اب سے دو سو سال پہلے گزر چکی ہے۔ ہمارے یہاں متقدمین کی شاعری ہے جس
پرکھنے کے کچھ اصول ہیں۔ ان کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا جا چکا ہے اس کے ساتھ
جدید دور کے آغاز میں شاعری میں ایک نیا تجربہ ہو رہا ہے اور اسی لئے تنقید کے تصور
اور قدروں میں انقلاب ناگزیر ہے۔ متقدمین اپنے اصولوں پر جدید شاعری کو پرکھتے ہیں
نقائص کی کثرت انھیں ناامید کر دیتی ہے اور وہ شاعری کے مستقبل کو نہایت تاریک س
لیتے ہیں، اسی طرح جدید شعرا اور ناقد متقدمین کے کمالات کو اپنے اصولوں پر جانچتے اور
ہیں۔ دونوں جماعتوں میں جو انتہا پسند ہیں وہ ہٹ دھرم ہیں۔ ادب اور تنقید میں اعتد
ہی کا دوسرا نام حسن ہے۔ جس طرح متقدمین کے اصولوں سے جدید شاعری کو پرکھنا نا
ہے اسی طرح جدید تنقید کے اصولوں پر متقدمین کے کلام کو جانچنا نازیبا ہے۔

ہماری موجودہ دور کی تنقید نگاری کی عام لے یہی ہے چونکہ آگے چل کر ہمیں ایک ا
تحریری تنقید کا نفس جائزہ لینا ہے جس میں ہر موقع پر نقد کرنے والے نے ہمیں مغربی اد

ی مثال پریاں چڑیلیں، جادوگر، دیو اور مرے ہوئے لوگوں کی روحیں ہیں۔ انھیں مسٹر
یڈن رہ Fairy way of writing کہتے ہیں جو تصنیف و تالیف میں سب سے
ہے کیونکہ اس کا انحصار صرف شاعر کے تخیل پر ہے۔ اس کے سامنے کوئی اصلی نمونہ نہیں
جس کی وہ نقل کر سکے۔ اس لئے اُسے صرف اپنی ایجاد سے کام لینا پڑتا ہے۔
(J. Addison – Sheatator No 419)

ایک تیسرا موضوع شاعری کے اصول اور قوانین کا ہے۔ ہماری زبان میں یہ عروض
شامل ہیں، ہر زبان کی شاعری میں اس کے اپنے اصول ہوتے ہیں جن کی پابندی
کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ شاعری کے دورِ زوال میں ہر ملک میں شاعری صرف
ں قانون کی پابندی کا نام رہ جاتی ہے۔ روح شاعری فنا ہو جاتی ہے لیکن ایسے
میں بھی جب کہ شاعری اپنے معراج کمال پر ہوتی ہے وہ ان قانون کو ضرور ملحوظ
تی ہے۔ جسے آزاد نظم کہا جاتا ہے وہ بھی آزاد نہیں اس کے بھی اپنے قانون ہیں
کی پابندی اس میں ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں بعض ناقدین کی رائے
کر :-

(۱) نظم (Varse) ہر اس تحریر کے لئے ضروری ہے جس پر شعر (Poem)
طلاق ہوتا ہے۔ صرف اس وجہ سے نہیں کہ ہم ہر اس تحریر کو جو نظم (Varse) میں
شعر (Poem) کہنے کے عادی ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ کوئی تصنیف جس کا
ری ہو کہ وہ ہمیں ہر ممکن اور معقول ذریعہ سے لطف پہنچاتی ہے اور جو ہمیں یہ لطف نہیں
جو اس کے امکان میں ہے اور کسی طرح اس کے لئے ناموزوں نہیں گویا اپنے فرائض کے
ام دہی میں ناکام رہتی ہے (R. Hu-z al Idea of universal poetry)
34177

(۲) وزن بجائے خود توجہ کے لئے ایک محرک ہے (S.T. Coleridge)
(۳) یہاں مختصراً مجھے بحر کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ میں یہ تسلیم کئے لیتا ہوں کہ یہ مسلم ہے کہ
سیقی اپنی مختلف بحروں، اوزان اور قافیہ کے ساتھ اس قدر اہم ہے کہ اسے کبھی نظر انداز
ں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد میں سوائے اس کے اور کیا نتیجہ نکالوں کہ وہ بڑا ہی احمق ہوگا

دونوں میں اپنی اپنی خوبیاں ہیں یا نہیں اگر دونوں کو علحدہ علحدہ اُن کے اپنے اصولوں
جائے۔ یہی حال دونوں قسم کی شاعری کا ہے۔ اگر Fairy Queen کو یو
نمونوں سے جانچا جائے تو اس کی بے ربطی اور انتشار دیکھ کر ہم حیران رہ جاتے ہیں۔ لیکن
ہم یہ مان کر کہ یہ گاتھی اثرات کی ترجمان ہے اسے دیکھیں تو اس میں ربط اور توازن۔
.Hurd - Letters on Chi valry and Romance

دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ شاعر کہاں تک اپنی کوششوں میں صداقت اور اصلیت ملحوظ
پر مجبور ہے۔ ایشیائی شاعری پر ایک عام اعتراض یہ ہے کہ اس میں مافوق الفطرت عناصر
شامل ہوتے ہیں اس لئے شاعر بالعموم اصلیت اور واقعیت کو نظر انداز کر دیتا ہے جو قابل
ہے۔ اس سلسلہ میں بعض دیگر مغربی ناقدین کے خیالات یہ ہیں۔

(۱) ایک شاعر صرف اصلیت اور واقعیت کا پابند نہیں۔ نہ وہ تاریخ کے قانون میں
ہوا ہے۔ (Dryden - Dedication of the Aeneies)

(۲) اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ کسی روح کا ظاہر ہونا۔ یا جادو سے ایک محل
خلاف امکان ہے تو میں نہایت بیباکی سے اس کا جواب دیتا ہوں۔ ایک بڑا شاعر
اُن واقعات کے بیان کے لئے مجبور نہیں ہے جو صحیح یا قرینِ قیاس ہوں، بلکہ وہ آز
کے اظہار میں اپنے آپ کو بالکل آزاد سمجھتا ہے جن کا تعلق ہمارے حواس ظاہری سے نہ
اور اس لئے انھیں صرف علم اور عقل کی مدد سے نہیں جانا جا سکتا، وہ اپنے تخیل کو ایک
ترمیدان عطا کر سکتا ہے۔ غالباً اتنا کہنا بالکل کافی ہے کہ ہر عہد اور ہر مذہب میں مذہب
انسانوں کی ایک کثیر تعداد نے ہمیشہ جادو کے اثر کو تسلیم کیا ہے۔ اور بعض روحیں، بھو
پلید ظاہر ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ شاعری کے لئے صرف اس قدر بنیاد کافی ہے۔
Dryden. - The Authors apology for Heroic Poetry)

(۳) نظم کی ایک قسم ایسی ہے جس میں شاعر فطرت کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے۔
پڑھنے والوں کے تخیل کو ایسے افراد اور ان کے اعمال سے لطف اندوز ہونے کا موقع د
جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ وہ (شاعر) انھیں خاص صورت بخش

امین میں بھی اُردو شعرا کا بڑا سرمایہ شعرائے ایران کے اُگلے ہوئے نوالے ہیں۔ اس تقلید
ثر یہاں تک ہوا کہ اُردو شعرا نے اوزان یا بحروں میں اضافہ کی طرف خیال بھی نہیں کیا۔[1]
اس سلسلہ میں یہ امر بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اُردو شاعری نے یقیناً فارسی کے زیر اثر
ٹھ کھولی۔ لیکن اس کے علاوہ اور راستہ کہاں تھا۔ ہندوستان میں اس وقت سوائے
ے سنسکرت کے کوئی اور علمی یا ادبی زبان ایسی نہ تھی جس میں شعر و شاعری کا سرمایہ ہوتا
رجسے اُردو اپنا رہبر بنا سکتی، لیکن اس ابتدائی دور میں بھی اُردو شاعری کا رنگ بعض اعتبا
ے فارسی سے علیحدہ تھا۔ مثلاً:—

(۱) فارسی پر یہ عام اعتراض ہے کہ اس میں امرد پرستی کے مضامین نظم ہوتے ہیں اور
ربات عشق کا اظہار بالعموم مرد کی زبان سے مرد کے لئے کیا جاتا ہے جو غیر فطری ہونے کے
لاوہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی قابل گرفت ہے، ہندوستان میں یہاں کی خاص تہذیب و
معاشرت کے زیر اثر عورت کو عاشق اور مرد کو اس کا مطلوب قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ جذبات
ت بھی عورتوں کی زبان سے ادا کرائے جاتے ہیں، اُردو کے ابتدائی دور میں بھی اس
ے نمونے بکثرت ملتے ہیں جن میں سے صرف چند کا یہاں ذکر کیا جا سکتا ہے جن حضرات نے ہماری دکنی
اعری کے نمونوں کو ملاحظہ فرمایا ہے انھوں نے افضل جھنجھانوی (المتوفی ۱۰۳۵ھ) کے بارہ ماسہ
ضرور دیکھا ہوگا جن کے متعلق میر حسن نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "حسب حال خود بکٹ
کہانی گفتہ۔" اور یہ شعر نقل کیا ہے:— ؎

مسافر سے جنھوں نے دل لگایا انھوں نے سب جنم روتے گنوایا

س میں انھوں نے اپنی داستانِ عشق نظم کی ہے۔ لیکن طریقہ وہی اختیار کیا ہے جو ہندوستان
میں رائج تھا یعنی عورت کو طالب اور مرد کو اس کا مطلوب قرار دیا ہے۔ اس کا ایک طویل
قتباس "پنجاب میں اردو" مولفہ محمود شیرانی میں اور کچھ حصہ راقم کے مضمون "اُردو کے
بعض تاریخی ماخذ" مطبوعہ سہیل علی گڑھ ۱۹۲۴ء میں مل سکتا ہے۔

(۲) اُردو زبان میں ریختی، ایک خاص صنف ہے یعنی عورتوں کی زبان میں شاعری۔
س کا نمونہ دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں مل سکتا۔ اس کی ایجاد اور رواج سے یہ تو یقیناً ثابت

---

[1] اس بحث میں زیادہ تر اعتراضات وہ لئے گئے ہیں جو کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر" میں کئے ہیں
کلیم صاحب کی کتاب تنقید کے اس عام رنگ کی ترجمان ہے جو انگریزی خواں اردو ناقدین کے یہاں ملتا ہے

جو ان چیزوں سے مدد نہ لے، میں اس کی قطعی ضرورت بیان کرنے کے لئے کچھ اور رکھنا غیر ضروری سمجھتا ہوں (E.A. Pope – the Poetic Principle,

(۴) ہر زبان میں اس کے مناسب وزن اور بحریں ہوتی ہیں جو اس میں استعمال کے لئے موزوں ہیں اور جو کثرتِ استعمال اور رواج سے زبان کے مزاج میں داخل ہو کر بالکل فطری بن جاتی ہیں، تمام شاعری الفاظ کی ترتیب ہے جو ان اصولوں کی پابندی سے حاصل ہوتی ہے جو عام نثر اور گفتگو سے مختلف ہیں S.DANIEL – Defence of Rhyme

(۵) ہر زبان میں اس کی مخصوص خوبیاں ہوتی ہیں۔ جو ایک زبان کے لئے موزوں اور پسندیدہ ہے اکثر دوسری زبان کے لئے ناپسند بلکہ بے تکا ہو سکتا ہے۔

E. Bysshe – Art – of English Poetry.)

(۶) مقفیٰ شاعری کو غیر مقفیٰ شاعری پر جو ترجیح حاصل ہے وہ اتنی واضح ہے کہ اس کا بیان گویا وقت کو بیکار کھونا ہے T. Dryden – Epistle dedicatory of the rival ladies)

(۷) ہمارے زمانہ میں نظم غیر مقفیٰ کی تائید میں بہت کچھ بحث و تکرار سننے میں آتی ہے...... اب تو ہر نامعقولیت کو بھی اپنے بچاؤ کے لئے کوئی نہ کوئی ہمدرد مل جاتا ہے۔

(O. Goldsmith – Dedication of the Traveller,)

یہ چند اصولی بحثیں ہیں جو آگے آتی ہیں۔ پچھلی سطور میں جو کچھ کہا گیا وہ اسی کی تمہید ہے ترتیب کے لئے ہم نے بحث کے دو حصے علیحدہ کر لئے ہیں۔ پہلے حصہ میں اردو شاعری کی عام تنقید پر نظر ڈالی گئی ہے، دوسرے حصہ میں مختلف اصنافِ سخن کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا گیا ہے

اُردُو شاعری

اُردو شاعری پر سب سے بڑا اور عام اعتراض یہ ہے کہ اس نے فارسی شاعری کے سایہ میں پرورش پائی اس لئے قدرتی طور پر ابتدا ہی سے اس نے فارسی کا اثر زیادہ قبول کیا لیکن آگے چل کر یہ اثر اس کے لئے مضر ثابت ہوا۔ کیونکہ اردو شعرا نے تقلید کی دھن میں اپنی قوتِ ایجاد سے بالکل کام نہیں لیا۔ فارسی کی تقلید صرف نحو اور قواعد عروض تک محدود نہ تھی۔ بلکہ

تھیں۔ چنانچہ مولانا آزاد نے آبِ حیات کے مقدمہ میں اُردو نظم کی تاریخ کے سلسلہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اگر فارسی کے مضامین اُردو شعراء عام طور پر اختیار کرچکے ہوتے تو شاہ صاحب ولی کو کیوں خاص طور پر متوجہ کرتے۔

(۶) اس دَور میں بکثرت خیالات جن کا تعلق براہ راست ہندوستانی فضا سے ہے عام طور پر ملتے ہیں۔ عاشقانہ اشعار میں گل و بلبل شمع و پروانہ کے ساتھ پپیہا اور بھونرا بھی استعمال ہوا ہے۔ ایسے عاشقانہ اشعار خاص طور پر سلطان محمد قلی قطب شاہ، سراج اورنگ آبادی اور ولی دکھنی کے یہاں ملتے ہیں۔

(۷) فارسی شاعری کی تاریخ میں "ہندوستان میں فارسی شاعری کی ارتقا" کا ایک خاص دَور گزرا ہے۔ اور یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے خاص حالات اور واقعات نے فارسی شاعری کو بہت متاثر کیا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مولانا شبلی لکھتے ہیں:۔

> "اس موقع پر ایک عجیب نکتہ خیال دلانے کے قابل یہ ہے کہ فارسی شاعری نے ہندوستان میں آکر جو لطافت پیدا کی ایران میں اس کو نصیب نہیں ہوئی۔ چونکہ بظاہر یہ نہایت تعجب انگیز بات ہے اسی لئے ہم کسی قدر تفصیل سے ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں۔"

اس کے بعد مولانا شبلی ہندوستان کی یہ صفت بیان کرتے ہیں کہ یہاں آکر ہر چیز موزوں اور متناسب ہو جاتی ہے، مختلف قوموں کے لوگ، مختلف کھانے اور کپڑے جو باہر سے آئے یہاں آکر ان میں خاص لطافت پیدا ہوگئی، مغلوں کا آرٹ ایرانی تصورات کا پس منظر رکھتا ہے لیکن ایران کو تاج گنج جیسی ایک عمارت بھی نصیب نہیں ہوئی۔ یہی حال شاعری کا ہے۔ مولانا کے آخری الفاظ یہ ہیں:۔

> "ایران کے ان شعراء کو جو ایران سے ہندوستان آئے اور یہاں کی آب و ہوا اور خیالات سے متاثر ہوئے اُن کا کلام اُن شعرائے ایران سے ملاؤ جو ایران میں ہی رہے، دونوں کے کلام میں صاف یہ فرق نظر آئے گا۔ عرفی۔ نظیری۔ طالب آملی۔ کلیم قدسی۔ غزالی کے کلام میں جو لطافت، نزاکت، باریک خیالی اور رنگین ادائی پائی جاتی ہے وہ شفائی اور محتشم کاشی میں کہاں پائی جا سکتی ہے۔ حالانکہ یہ دونوں اسی زمانہ کے شاعر اور شعرائے ایران کے سرتاج اور دربار شاہی کے انتخاب ہیں۔"

جب فارسی شاعری ہندوستان آکر اپنے وطن کے اصلی رنگ و روپ کو برقرار

ہو جاتا ہے کہ اُردو شعرا میں تقلید اور قدامت پرستی کے باوجود اجتہاد اور ایجاد کی قوت تھی جس کا اظہار اس نئی صنف کی صورت میں ہوا، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ریختی میں شاعری کے بڑے امکانات تھے، ممکن تھا کہ یہی شاعری شعر میں اخلاق اور اعتدال پسندی کا ... بنتی لیکن یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ وہ ایسے دَور میں شعراء کی مشق اور مشغلہ کا ذریعہ بنی، جب بعض مخصوص اثرات نے شاعری کو اخلاقی نقطۂ نظر سے بہت پست کر دیا تھا۔

(۳) بسنت، ہولی، ٹھمری، ہندوستان کی خاص پیداوار ہیں۔ اُردو میں ان کے بکثرت نمونے موجود ہیں۔

(۴) مرثیہ جس نوعیت کے ساتھ اُردو میں ہے نہ پہلے فارسی میں تھا نہ اب ہے۔ فارسی بلکہ عربی شاعری بھی اس صنف کی اس حیثیت سے محروم ہے حالانکہ مرثیہ کا سرچشمہ عرب کی شاعری ہے، مرثیہ جس میں واقعاتِ کربلا کا مفصل، مسلسل شاعرانہ اور فنی انداز بیان ہو، فنی حیثیت سے اُردو میں ہی موجود ہے۔ تفصیلات سے آگے چل کر ... کے تحت میں دوبارہ بحث کی گئی ہے۔ اس لئے یہاں اتنے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۵) حکیمانہ شاعری جس کا نمونہ ہمارے یہاں اقبال کی شاعری ہے، فارسی ... حیثیت سے نہیں ملتی، چنانچہ فارسی شعرا کی طویل فہرست میں ایک نام بھی ایسا نہیں جو خیالات کے اعتبار سے اقبال کے برابر درجہ رکھتا ہو۔ یہی حال مرزا غالب کا ہے۔ اگرچہ ایسی شخصیتیں ہمارے یہاں کم ہیں لیکن ان کا ہونا ایک خاص رجحان کی دلیل ہے۔ یہ رجحان اجتہاد اور ایجاد کا رجحان ہے۔

(۶) اب یہ بات عام طور پر تسلیم ہو چکی ہے کہ ولی سے پہلے دکن اور شمالی ہند میں علیحدہ اُردو زبان کی ترقی اور اشاعت ہو رہی تھی۔ یہ اثر یہاں تک عام تھا کہ محمد شاہجہاں آبادینی اُردوئے معلّٰی اور محاورہ دکن یعنی ولی کی زبان میں بڑا فرق نظر آتا۔ ولی جب شاہ سعد اللہ گلشن کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اُنھوں نے دو نصیحتیں فرمائیں: (۱) جو فارسی میں بیکار پڑے ہیں اُنھیں ریختہ میں کام میں لاؤ۔ کون تم سے محاسبہ کریگا (۲) کو موافق اُردوئے معلّٰی شاہجہان آباد نظم کرو۔

پہلی نصیحت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تک فارسی کے مضامین سے اُ... نے کام نہیں لیا تھا، نہ صرف مضامین بلکہ بحریں بھی بالعموم ہندی دوہوں کی استعمال

(۱) غزل پر سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ اس میں سوائے اس کے کہ سب اشعار ہم وزن، ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں اور کوئی باطنی ربط نہیں پایا جاتا، اس میں بے ربطی انتشار اور پراگندگی کے علاوہ کچھ اور نہیں آتا یعنی جس طرح ایک مکمل نظم میں خیال کی ابتدا ترقی اور انتہا ہوتی ہے ویسی کوئی چیز غزل میں نہیں ملتی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے شاعر کی نفسیاتی کیفیت پر توجہ کرنا ضروری ہے۔ شاعری کے متعلق ارباب ذوق متفق ہیں کہ انسان پر جب کوئی قوی جذبہ طاری ہوتا ہے تو خودبخود اس کے منھ سے موزوں الفاظ اور فقرے نکلنے لگتے ہیں یہی شعر ہوتے ہیں۔ اس وقت شاعر کے ذہن کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ کوئی خیال، کوئی واقعہ، کوئی چیز شاعر کے جذبات کو تحریک میں لاتی ہے۔ پرانے تجربے اس نئی تحریک سے مل کر ایک نیا تجربہ پیش کرتے ہیں جو کسی نئے خیال، نئے احساس یا نئے جذبے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور وہی خیال، احساس یا جذبہ موزوں اور متناسب الفاظ میں زبان سے ادا ہو جاتا ہے۔ لیکن جذبات کا سلسلہ بجلی کی چمک نہیں تھی کہ آئی اور آناً فاناً چلی گئی، جذبات ہمیشہ سلسلے سے آتے ہیں۔ اور اس سلسلہ کو ربط خیال (Association of Ideas) کا قانون پابند رکھتا ہے۔ اسی قانون کے ماتحت ایک خیال دوسرے خیال کو اور دوسرا خیال تیسرے خیال کو اور تیسرا خیال چوتھے خیال کو ذہن میں پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہر دو آگے پیچھے آنے والے خیالات میں کوئی ربط یا رشتہ ضرور ہوتا ہے۔ اگر یہ ربط یا رشتہ شعوری ذہن میں ہوتا ہے تو فوراً ہمیں بھی محسوس ہونے لگتا ہے۔ مثلاً شاعر بہار سے متاثر ہوا، پھولوں کا خیال آیا، نرگس کے تصور نے محبوب کی چشم شہلا یاد دلا دی، محبوب کا خیال آتے ہی اس کا ستم جور و جفا سب یاد آ گئے، اب بہار اور جور و جفا میں بظاہر کوئی ربط نہیں لیکن تسلسل خیال کو دیکھیں تو ربط نظر آنے لگتا ہے، لیکن ذہن کی ایک حالت اور ہے۔ جسے تحت شعوری (Sub-conscious) کہتے ہیں۔ اگر آگے پیچھے آنے والے خیالات میں جو رشتہ ہے وہ تحت شعوری ذہن نے پیدا کیا ہے تو دوسرے لوگ تو درکنار اکثر خود شاعر بھی اس ربط کے وجود سے بے خبر رہتا ہے۔ لیکن اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اظہار جذبات کے لئے انسان نثر استعمال کرے یا نظم، غزل کہے یا مثنوی یا قطعہ، یہ ناممکن ہے کہ جو خیال ایک فقرے یا شعر میں آئے وہ دوسرے فقرے یا شعر سے بالکل غیر مربوط ہو، ایسی بے ربط گفتگو مجذوب کی بڑ، ہو سکتی ہے اور یہ ماننے میں تامل

نہ رکھ سکی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اُردو شعرا کا سلسلہ ایران سے ہی ملا رہا ہو۔ دراں حالیکہ اسی ملک کی پیداوار تھی اور اس کے شاعر اسی آب و ہوا، تہذیب و معاشرت، اور ماحول میں سانس لیتے تھے۔

(۸) بحروں کے سلسلہ میں اس طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ میں تغیر یا اضافہ کا خیال اُردو شعرا میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ ہندوستانی موسیقی کی راگ راگنیاں اُردو میں بکثرت ہیں، ان کی بحریں فارسی یا عربی کی تو بحریں نہیں ہیں اور ایسی چیزیں اُردو شاعری کی تاریخ میں ابتدا ہی سے موجود ہیں۔ چنانچہ امیر خسرو کے تصنیف کردہ راگ راگنیوں سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

ان مختصر اشاروں سے یہ نتیجہ نکالنا غالباً بیجا ہوگا کہ فارسی شاعری کی تقلید میں شعرا نے اپنی ذہانت، قوتِ اختراع اور ایجاد کو مٹا دیا یا یا عام طور پر فارسی کا اثر اردو کی ترقی کے حق میں مضر ثابت ہوا۔ واقعہ اس کے برعکس ہے اگر اُردو شعرا نے بیان اور میں اپنے ابتدائی دور میں فارسی سے فائدہ نہ اٹھایا ہوتا تو اردو کی تعمیر ممکن نہ ہوتی۔ فارسی کے اثر او راقتدار کا ایک خاص زمانہ ہے۔ یعنی مغلوں کی حکومت کے شباب سے شروع ہو کر محمد شاہ کے عہد تک فارسیت کا دَور دَورہ رہا۔ لیکن محمد شاہ کے عہد میں حکومت کے انحطاط کا اثر فارسی زبان پر بھی پڑا۔ جس طرح مغلوں کے سخت نظم و انتظام سے لوگ گھبرا کر آزادی میں سانس لینا چاہتے تھے اسی طرح فارسی زبان بالخصوص شاعری کے سخت قوانین برداشت کرنا انھیں اب گوارا نہ تھا۔ یہی وجہ ہوئی کہ اُس عہد میں پہلی مرتبہ دہلی میں فارسی کے علی الرغم اُردو شاعری کو سرپرستی نصیب ہوئی۔ اس کے بعد سے آج کے دن تک رفتہ رفتہ فارسی کے اثرات مٹتے جا رہے ہیں اور نظر آتا ہے کہ تھوڑے دنوں بعد یہ دھندلے نقوش کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا، اس کی بجائے انگریزی شعر نے جو اثر ڈالا ہے وہ ترقی پسند شعر کی صورت میں جلوہ گر ہے۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

اُردو غزل کی تنقید

اُردو غزل کی تنقید میں حالی کے چند خیالات تمہید میں نظر سے گزرے، اب ان کی تشریح اور تفصیل ملاحظہ ہو:-

پھر دیگر ذرائع سے جو معلومات حاصل ہوئی ہوں ان کو شامل کرکے شعر کا اصل مفہوم پیدا کرتا ہے،
مثلاً صرف ایک شعر لکھتا ہوں ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اس میں غزالاں، مجنوں، دیوانہ، ویرانہ سب علامات عشق و عاشقی کے ہیں اور یہ سب محض رمزی اشارے ہیں۔ نواب سراج الدولہ کی وفات کی خبر پا کر ان کے ایک صوبہ دار رام نرائن موزوں نے پڑھا تھا۔ سراج الدولہ کے مرنے کا حال لوگوں سے پوچھتا تھا اور درد و کرب سے پڑھتا تھا۔ کیا سراج الدولہ کی بےکسی اور شہادت، اس کا خلوص اور محبت اس کی وفات سے مملکت کی ویرانی، ان سب کا بیان اس ایک شعر اور انھیں رمزی اشاروں میں موجود ہے۔ ان رمزی اشاروں کے استعمال کرنے کا ایک بڑا سبب ہے۔ یہ زمانہ سیاسی اعتبار سے بڑی کشمکش اور تزلزل کا تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ جو دل پر گزرے اور جو کہنے کی تمنا ہو اس کا صاف صاف اظہار کیا جا سکتا، یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں کو پردہ ہی پردہ میں بیان کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے قبل اور بعد کی غزل بالخصوص اس طرح مطالعہ کئے جانے کے قابل ہے۔

(۲) علاوہ مذکورہ بالا مضامین کے اخلاقی مضامین بھی غزل کا خاص موضوع ہیں۔ میر تقی میر اردو شعرا کے سرتاج ہیں، ان کے کلام میں عشقیہ مضامین کے علاوہ دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری، تکبر اور غرور کے انجام، انسان کی مجبوری اور بےبسی، خودداری اور خودشناسی کی تلقین کے موضوعات کلام کے بیشتر حصے میں موجود ہیں، ان کے علاوہ ناسخ اور آتش، انشا اور مصحفی کے زمانہ میں سوسائٹی پر عیش کوشی اور ہوسناکی غالب تھی ان کے کلام میں بھی اخلاقی مضامین کا کافی عنصر ملے گا۔

(۳) اسی طرح فلسفیانہ اور مفکرانہ غزلیں بکثرت ملتی ہیں۔ غالب، فانی، اقبال کی غزلوں میں سب سے نمایاں عنصر مفکرانہ مضامین ہی کا ہے۔ غالب اور فانی کا فلسفہ قنوطیت کا ہے اور اقبال کا رجائیت کا۔ ان تینوں باکمالوں کے فلسفے ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ بالخصوص اقبال کے تصورات۔ یہ تصورات اقبال کی نظموں کا خاص موضوع ہیں لیکن غزلیں بالخصوص آخر دور کی غزلیں ان سے خالی نہیں۔

(۴) انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں قومیت کے تصور کی تشکیل ہوئی اور قوم، قومیت، قوم پرستی کے الفاظ ادب میں عام ہوئے، غزل پر بھی ان کا اثر ہوا، چنانچہ موجودہ دور میں

ہوتا ہے کہ صدیوں کے مشاہیر غزل گو شعرائے ایران و ہندوستان کسی شدید دما
میں مبتلا تھے۔

علاوہ ازیں میکانیکی یک رنگی جو غزل میں نہیں ملتی وہ نظم مسلسل میں کہاں ہے؟ غز
بے ربطی کا شکوہ کرنے والے ایک صاحب[1] نظم کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"شاعر کسی واردات قلبی، کسی تصور داخلی، کسی مشاہدۂ خارجی سے متاثر ہو کر اس
کے انکشاف پر مجبور ہوتا ہے لیکن اس کی نظم تکمیل کے بعد ایک جذبے یا خیال کی ترجمان
نہیں ہوتی بلکہ مختلف اثرات، جذبات، تفکرات، نقوش اور الفاظ سے مرکب ہوتی ہے۔"

غزل کے مضامین میں جو تنوع نظر آتا ہے اسے ایک دوسرے پہلو سے دیکھنا بھی
ہوگا۔ ایک مکمل اور مسلسل نظم کیا ہے؟ وہ موزوں الفاظ کا ایک ایسا سلسلہ ہے جس میں
خیال ایک ہوتا ہے۔ کیا اس اعتبار سے غزل کا ہر شعر ایک مکمل نظم کا بدل نہیں ہو سکتا۔ فر
ایک شاعر شب ہجراں کا حال نظم کر رہا ہے۔ وہ چاہے تو ایک طویل نظم میں اس کو بیا
اور چاہے تو میر کی طرح صرف ایک شعر کہنے پر اکتفا کرے:۔

شب کو فت سے ہجراں کے جہاں تن پہ رکھا ہاتھ جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ وہیں تھ

اس طور پر غزل نظموں کے ایک مجموعے کی حیثیت رکھتی ہے جس میں رنگا رنگی بے ربطی اور را
کرنے کی بجائے تنوع اور دلچسپی پیدا کر دیتی ہے۔

غزل پر دوسرا عام اعتراض اس کے محدود مضامین کے باعث ہوتا ہے یعنی اس می
جذبات عشق ہی کو نظم کیا جاتا ہے لیکن یہ اعتراض یوں قابل غور نہیں کہ کم شعرا نے اس مخص
کی پابندی کی ہے ورنہ عام طور پر علاوہ عشقیہ مضامین کے دیگر مضامین بھی اس میں ملتے ہیں۔

(۱) اگرچہ غزل کا موضوع خاص واردات قلبی کی ترجمانی ہے لیکن اکثر غزل گو شعرا
اپنی غزلوں میں اپنے ماحول کی پوری ترجمانی کی ہے۔ کیا میر کی غزلیں پڑھ کر دلی کی
اور بربادی کا نقش دل پر ثبت نہیں ہوتا۔ کیا انشاء کی غزلیں اس عیش اور فارغ الب
پتہ نہیں دیتیں جو ان کے زمانہ میں لکھنؤ کو نصیب تھی۔ کیا ناسخ اور آتش اپنے اپنے عہ
ترجمانی اپنی غزلوں میں نہیں کرتے۔ حسن و عشق کے متعلق جو مخصوص اصطلاحیں اور علا
میں ملتی ہیں وہ صرف بطور اشارہ استعمال ہوتی ہیں اس لئے اُن سے ہمارا خیال مد

---

[1] کلیم الدین احمد۔

مسئلۂ علم کے متعلق چند علمائے اسلام کے نظریے

(از جناب مولانا یعقوب بخش صاحب راغب بدایونی معلم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی)

میں نے یہ مقالہ یکم دسمبر [illegible] کو مجلس مصنفین کے جلسہ میں پڑھا تھا اور "مسئلۂ علم کے متعلق چند علمائے اسلام کے نظریات" پیش کرنے کی جرات کی تھی۔ ظاہر کہ یہ عنوان نہایت علمی تھا اور کاوش، فکر و نظر کے لئے قلب مطمئن اور ماحول سازگار چاہتا تھا۔ آپ میری مشکل کا اندازہ کر سکتے ہیں، اگر یہ احساس ہو کہ بحث یکسر غیر دلچسپ پھر اردو کا دامن فراخ ابھی تک اصطلاحات فلسفہ کے رنگینیوں سے کنارہ کش۔ مجھے کہاں تک زحمت برداشت کرنا پڑی ہوگی۔ میں داد نہیں چاہتا۔ توجہ اور تامل کی التجا کرتا ہوں ــــ بہرحال جو خیالات کتابوں کے مطالعہ کے وقت دماغ میں محفوظ رہ گئے تھے ایک جگہ جمع کر دئے گئے ہیں اگر موقع ملا اور ناظرین مصنف نے ہمت افزائی فرمائی تو اس سلسلہ میں کچھ اور بھی عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

(یعقوب بخش راغب البدایونی)

یہ تو ہم سب جانتے ہی ہیں کہ علم کے معنی ہیں جاننا۔ لیکن اس جاننے کی حقیقت کیا ہے اسے کسی عالم نے کچھ جانا اور کسی نے کچھ۔ پہلی ہی فکر میں ہر نظر کو اس کے مختلف معنی نظر آنے لگے۔ دانستن۔ دانش۔ مبدا انکشاف۔ ذات مدرک کے پاس حاضر۔ صورت حاصلہ۔ حصول صورت۔ قبولِ نفس۔ تاثر و انفعال۔ صفت عالم۔ اعتقاد جازم۔ حالت ادراکیہ۔ حالت انجلائیہ۔ وجود۔ نور۔ وجود عالم۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایک چیز کی تعریف میں یہ اختلاف ہے۔ یا ایک حقیقت کے بیان میں، جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔ علم کیا ہوا گونگے کا خواب ہو گیا۔ کچھ سمجھیں تو تعبیر کر سکیں یہاں جانتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ یہ ہے کیا۔ پھر جسے ہم نے جانا اسے دوسرے کیوں نہیں مانتے

حسرت موہانی جو خالص غزل گو ہیں، اسی رجحان کی ترجمانی کرتے ہیں۔

(۵) مرثیہ گو شعرا نے غزل کو اپنے مخصوص مضامین یعنی گریہ و بکا کے لئے استعمال کیا ہے۔ چنانچہ سلام اور نوحے غزل ہی کے طرز پر لکھے جاتے ہیں۔ مرثیہ گوئی نے شاعری پر جو اثر ڈالا وہ غزل کی اسی رجحان سے ظاہر ہوتا ہے۔

ان مختصر اشاروں سے غالباً واضح ہو گیا ہوگا کہ باعتبار مضامین اردو غزل کا دامن خالی نہیں۔ لیکن یہ تسلیم کر لینے میں مجھے ذرا تامل نہیں کہ ابھی غزل کے مضامین میں تنوع اور اضافہ کی گنجائش باقی ہے۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ غزل کو مسلسل نظم کی طرح قطعہ بند لکھنے کا رواج جس کی مثالیں متقدمین کے یہاں کہیں کہیں ملتی ہیں عام کر دیا جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نفسیاتی کیفیات کی تحلیل اور تجزیہ کو غزل کا ایک خاص موضوع بنایا جائے۔ مثلاً ایک ایسے عاشق کے جذبات کی ترجمانی کی جائے جو محبت اور فرض کی نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہو، غرض اس قسم کے مختلف اور اہم مضامین غزل میں داخل ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اُن کے بیان میں شاعرانہ حسن قائم رہے۔ اسی طرح غزل کی ساخت میں بھی ترمیم و اضافہ کی گنجائش ہے۔ ممکن ہے کہ حالی کا مشورہ یعنی غیر مردف غزلیں لکھنے کا رواج عام ہو جائے، یا قافیے کے سخت قوانین میں کچھ ترمیم کرنا پڑے لیکن غزل کی ہمہ گیری، اس کے دامن کی وسعت اس کی ابدیت کے لئے کافی ہے۔ ممکن ہے نئی اصناف سخن رواج پائیں اور ہمارے اظہار خیال کا ایک اہم ذریعہ بن جائیں لیکن غزل کی ضرورت اس وقت بھی محسوس ہوگی۔ کسی منفرد جذبہ کو مختصر الفاظ میں جب بیان کرنا ہوگا یا یاد رکھنا ہوگا تو غزل کا ایک شعر ہی ہمارا مقصد پورا کرے گا۔ فقط

ابواللیث صدیقی

معلم ثانی ابونصر فارابی۔ اور اس کے اشارے
معلم ثالث شیخ الرئیس کی تحقیق و تشریح،
اور راک کی تفصیل

ارسطو کا فلسفہ جب یونانی سے عربی ہوگیا۔ تو جس شخص نے معلم ثانی کا لقب پایا وہ ابونصر فارابی[۱] ہے۔ چوتھی صدی ہجری میں اگرچہ سیف الدولہ کے دربار میں کبھی کبھی یہ موسیقی کے کمالات بھی دکھاتا نظر آرہا ہے لیکن فلسفہ کی ہر شاخ میں علم کے پھول اسی کی فکر کی بہار دکھا رہے ہیں۔ اس کی کتابیں کیا ہیں؟ انھیں فلسفہ کی مختصر ڈائری کہئے یا صرف شذرات کہیں، متاخرین کی طرح تفصیل و تشریح نہیں۔ جو کچھ ہے تحقیق ہے۔ اشارے ہیں۔ بیان نہیں۔

مشرق میں ارسطو کے فلسفہ میں جو سربلند ہے وہ شیخ الرئیس ابو علی سینا[۱] ہے جس کا لقب معلم ثالث قرار دیا گیا اور جس نے سنہ ۴۲۸ھ میں وفات پائی ہے۔

---

۱ ابونصر فارابی کے حالات میں نے تقریباً چوبیس سال اُدھر کسی اُردو رسالہ میں پیش کئے تھے غالباً قاری سرفراز حسین مرحوم کا رسالہ تمدن تھا یا کوئی اور۔

۱ شیخ کے حالات اور اس کا فلسفہ ایک مستقل مضمون چاہتا ہے۔ یہاں ہم صرف ایک بات کا ذکر کریں گے۔ جس پر بہت کم نظر گئی ہے۔ شیخ کا نام اکثر مورخین نے ابو علی لکھا اور باپ کا نام الحسین اور آگے شجرۂ نسب یہ ہے۔ الحسین بن عبداللہ بن الحسین بن سینا لکھا گیا۔ لیکن جمال الدین القزوینی نے اپنی کتاب مفید العلوم صفحہ ۲ میں شیخ الرئیس ابو علی الحسین بن عبداللہ بن سینا ذکر کیا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ اصل میں بخارا کے ایک گاؤں تجینہ کا رہنے والا تھا۔ شیخ نے اپنے آپ کو ابن سینا کے نام سے مشہور کیا۔

سینا کے معنی ضیاء (چمک) کے ہیں۔ پھر لکھا مشہور یہ ہے کہ بخارا کے ایک گاؤں افشنہ کا رہنے والا تھا جو بخارا سے ایک فرسخ دور اور یہ قریہ مارستین کے قریب مشہور ہے۔ لیکن ابوالریحان احمد البیرونی نے جو شیخ کا معاصر تھا اپنی کتاب "تحدید نہایات الاماکن" میں ایک جگہ شیخ کو ابن سینا لکھا اور دوسری جگہ ابو علی السنوی تحریر کیا ہے۔

کتنے تعجب کی بات ہے کہ شیخ نے اپنے وطن کو اپنا دادا بنالیا۔ یہاں ہم لوگ وطن کو مادرِ وطن کہتے ہیں اور شیخ جناب وطن کو جدِ امجد بناتا ہے۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ اصلی لفظ افشینہ کو ابوسینا یا ابن سینہ بنایا گیا ہے یہ افشنہ کی بگڑی یا بنی صورت ہے۔ اس مضمون کی ماخذ شیخ الرئیس کی چند کتابیں ہیں جو اس مقالہ کی تحریر کے وقت ہمیشہ تو پیش نظر نہیں رہیں لیکن اُن کے اقتباسات جو ذکر ہیں، وہ لٹن لائبریری سے لئے گئے ہیں۔ شیخ کی کتابیں:۔ شفا۔ نجاۃ۔ اشارات مع شرح رازی و طوسی۔ کہیں کہیں تعلیقات شفا کا حوالہ بھی اس مقالہ میں آپ پائیے گا وہ میرزا جان کے کسی حاشیہ یا ملا صدرا کے اسفار سے منقول ہے۔

بیداری دماغ نے مُراقبہ کے عالم میں جو خواب دیکھا تھا اُس کی تعبیریں کتنی مختلف ہوگئیں دیکھنا راویوں میں اتنا اختلاف ہے تو کیا اس کی بھی کچھ حقیقت ہے۔ کہ کمالِ ظہور زبانوں سے گویائی چھین لیتا ہے کیا یہ واقعہ نہیں ہے

حجاب اُٹھاتے ہیں دیکر نگاہ چھین کے ہوش زبان ملتی ہے لیکن بیاں نہیں ملتا

یا علم کوئی ایسی حقیقت ہے جس کی تعریف ہی بقول امام ابو حامد[51] الغزالی المتوفی ۵۰۵ھ سخت دشوار ہے امام فخرالدین الخطیب[52] الرازی المتوفی ۶۰۶ھ تصورِ علم کو بدیہی مانتے ہیں پھر تعریفیں جو مخدوش دیکھیں اُس کا سبب ٹھیرایا علم کا کمالِ ظہور۔ امام ابو حامد الغزالی اور دوسرے علما نظری بتاتے ہیں۔ اور تعریف کی دشواری کو تقسیم و تمثیل سے حل کرنے کی فکر میں ہیں اس نکتہ پر کہ علم بدیہی ہے یا نظری۔ غور کرنا تو بعد کی بات ہے پہلے تو اُن کی سن لینا ضرور ہے جنھوں نے علم کو جان کر کچھ کہا ہے اور علم کی کچھ تعریف یا تعبیر کی ہے۔

آپ کو شاید معلوم ہو کہ یونانی فلسفہ کے دو مدرسے تھے ایک حجرہ نشین فلسفیوں کا تھا جنھیں رواقیین کہتے ہیں۔ اس میں شاگرد کو مراقبہ کرنے اور فکر میں نور اور عقل میں انجلا پیدا کرنے کی پہلی پہل مشقیں اور ریاضتیں کرائی جاتی تھیں۔ اس مدرسہ کا نصاب ہمارے پاس افلاطون[53] کے ذخیرۂ علم کی صورت میں آیا۔ علمائے اسلام نے اس پر غور کیا اور افلاطون کے نظریۂ نور و اشراق کو بار بار زیادہ آرائش کر دیا۔ انھیں علمائے اسلام کو اشراقی کہتے ہیں۔ شیخ مقتول اس فلسفہ کے علم بردار ہیں۔

دوسرا یونانی مدرسہ ارسطو[54] کی اجتہادِ فکر و نظر نے بنایا۔ اس میں استاد شاگرد ارسطو کے نقشِ قدم پر پیہم دوڑتے یا میدانِ بحث میں فکر و نظر کے گھوڑے دوڑاتے تھے انھیں مشائی کہتے ہیں۔ ارسطو اس فلسفہ کا معلم اول ہے۔ علمائے اسلام نے اس فلسفہ کو جب اپنایا تو اُسے مسلمان کئے بغیر نہ چھوڑا۔ اُن کے اثر سے نہ حکمت نظری بچ سکی اور نہ حکمت عملی۔

[51] امام ابو حامد الغزالی کے حالات کے لئے دیکھو الغزالی اگرچہ ہمیں اس کتاب میں غزالی کے آئینہ میں مولوی شبلی نظر آتے ہیں۔ اور دیکھو ابن خلکان کی وفیات۔

---

[52] امام رازی کے حالات کے لئے پڑھو (علم الکلام حصہ اول) مولانا شبلی اور ابن خلکان وغیرہ۔

[53] افلاطون کے حالات کے لئے دیکھو تاریخ فلاسفہ۔

[54] ارسطو کے حالات کے لئے دیکھو تاریخ فلاسفہ۔

ادراک کے وقت میری ذات میں میری ذات کی طرف سے کوئی اثر (صورت) ایسا پایا جائے (یا حاصل ہو) تو میں اپنی ذات کا بھی اُسی طرح ادراک [illegible] طرح اُن چیزوں کا ادراک کرتا ہوں جو مجھ سے غائب یا مغائر ہیں۔ تو یوں ہوگا کہ میری ذات میں میری ذات کی طرف سے اسی طرح ایک اثر پایا جائے گا جس طرح اپنے سے غیر چیزوں کی طرف سے ایک اثر یا صورت میری ذات میں پائی جاتی ہے۔ تب کہیں اُن کا ادراک ہوتا ہے لیکن اپنی ذات کے ادراک کے لئے اس اثر (صورت) کی تاثیر صرف اسی سبب سے ہوگی کہ اُس کا وجود میرے لئے ہو (یعنی برتقدیر فرض اثر و حصول صورت اگر میں اپنی ذات کا ادراک اسی صورت (اثر) کے سبب کروں تو یہ جب ہوگا کہ اثر، صاحب اثر، یا صورت، صاحب صورت کے ساتھ مل کر ایک وسیلہ بن جائے کہ میرا وجود میرے لئے ظاہر ہو۔ اور میرا حضور میرے سامنے) لیکن جب میرا وجود بالاصالہ میرے لئے ہے (کیونکہ اپنے آپ سے کسی شئے کا غائب ہونا محال ہے) اس کی کوئی حاجت نہیں کہ اپنی ذات کے ادراک میں اس وقت تک (منتظر) رہوں کہ میری ذات میں میری ذات کے سوا کوئی دوسرا اثر پیدا ہو جائے۔ (تو مجھے اپنا حضور ہو۔ میری ذات میرے سامنے ہے حصول صورت اور تاثیر اثر کی کوئی حاجت نہیں)

نتیجہ اس عبارت کا یہ ہے کہ اپنا ادراک ہو تو علم و معلوم و عالم سب متحد ہیں اور دوسروں کا علم ہو تو اُس کی حقیقت کی تمثال یا صورت مدرِک کی سامنے حاضر ہوتی ہے تب کہیں اُس کا ادراک ہوتا ہے اس طریقہ میں علم صورت ہے معلوم شئے خارجی ہے اور عالم عالم ہے سب ایک دوسرے کے مغائر ہیں۔ کیونکہ اثر۔ صورت۔ صاحب صورت نہیں ہو سکتی۔ علم معلوم و عالم میں اتحاد محال ہے۔ یہ تو ہے شفا کی تعلیقات کی بات لیکن آپ نے دیکھا کہ اشارات میں معلوم کی حقیقت کی تمثال کا قیام یا حصول، مدرک کے سامنے شیخ کے نزدیک علم ہے پھر اپنی ادراک میں حضور صورت ہے نہ حصول یہ تعلیقات کی بات ہے۔

شیخ الرئیس کی تحقیق معنی ادراک و تعقل

۳۔ عقلیت حضرت باری عز اسمہٗ کی بحث میں صورتوں کی حصول کی نفی کر دی اور کہا کہ صورتوں کا فیضان ہوتا ہے۔ عاقل اور ان صورتوں کے درمیان جو اضافت ہے وہی تعقل ہے یعنی واجب الوجود کی عقلیت یوں نہیں کہ صورتیں بہت سی اُس میں حاصل ہوں بلکہ صورتوں کا اس سے فیضان ہوتا ہے یہاں تک کہ عقل بسیط جب ہمیں حاصل ہوتی ہے تو ہمارے نفسانی علوم کی خلاق ہوتی ہے۔

شیخ الرئیس کی تحقیق ادراک و علم کی تشریح

شیخ نے شفا میں تفصیل سے نجاۃ و اشارات میں اشاروں میں کئی باتیں بتائی ہیں۔ جن سے ہمارا ذہن مطمئن نہیں ہوتا کہ شیخ خود بھی کسی معنی علم سے مطمئن تھا یا یہ اضطراب، ہمارے سوء فہم و فکر ناقص نے پیدا کیا جس میں ہم مبتلا ہیں حقیقت میں کوئی اختلاف شیخ کے بیان میں نہیں ہیں تو بیان مختلف نظر آتے ہیں۔ شیخ علم کے لئے کئی لفظ بولتا ہے۔ ادراک بھی۔ تعقل بھی۔ ادراک و تعقل کے معنی بھی مختلف اس کی کتابوں سے چنے جا سکتے ہیں۔

۱۔ عاقلیت حضرت باری و معقولیت کے معنی مادہ سے مجرد ہونے کے ہیں (اس کا یہ مطلب کہ تعقل ایک امر سلبی رہے) شیخ نے حضرت باری کو عاقل و معقول بتا کر جہاں یہ ثابت کیا کہ کثرت ذات و صفات باری میں نہیں آتی وہیں یہ ذکر کیا کہ اس کی عاقلیت کے معنی مادہ سے تجرد کے ہیں ۔۔۔ اور یہ امر عدمی ہے۔

۲۔ ادراک اور علم اس صورت کا نام ہے جو جوہر عاقل میں مرتسم ہو کر ہی ذات کا اپنا تعقل حضور صورت کے سوا کچھ نہیں۔ شفا میں تصریح کی جو صورت جوہر عاقل میں مرتسم ہوتی ہے ماہیت معقول کے مطابق ہوتی ہے لیکن اشارات نمط ثالث میں یہ عبارت ہے۔ ادراک الشی ھو ان تکون حقیقته متمثلة عند المدرك (ترجمہ وہی جو ہم نے پہلے ذکر کیا) پھر اس کی جو تفصیل تعلیقات شفا میں فرمائی کہ میں اپنا ادراک کیسے کرتا ہوں وہ ایسی پیچیدہ عبارت میں ہے جسے ہم حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ صرف اس لئے کہ شیخ کی موشگافی کا آپ پتا لگا سکیں[۱] (عبارت فٹ نوٹ میں دیکھئے جسے ہم نے اس لئے لکھا کہ فہم میں غلطی سے ناظرین بچ سکیں) یہ بحث ہے کہ نفس کو اپنا علم حضوری ہے یا حصولی[۲]۔ شیخ نے دعوی کیا کہ حضوری ہے اور عالم معلوم علم سب ایک ہیں اور ان میں کسی کے درمیان کسی قسم کا تغائر نہیں اگر علم حصولی ہوتا تو ایسا اثر یعنی وہ صورت میری ذات میں حاصل ہوتی کہ اس اثر یعنی صورت کے سبب اپنی ذات کا ادراک کرتا۔ لازم باطل ہے (یعنی میں ایسا اثر نہیں پاتا) تو ملزوم بھی باطل ہے۔ یعنی نفس کو اپنا علم حصولی نہیں۔ لازم کے باطل ہونے کی شیخ نے یہ تفصیل کی ہے۔" اگر اپنی ذات کو

---

[۱] ان وجدت اثرا من ... کذلک ادرکت ذاتی کما ادرکت شیئا آخر یوجد منه اثر فی ذاتی ولکن لیس لوجود الاثر تاثیر فی ادراکی لذاتی الا بسبب وجوده لی واذا کان وجودی لی لم یحتج فی ادراکی لذاتی الی ان یوجد اثر آخر فی سوی ذاتی۔ تعلیقات

[۲] حضوری و حصولی کی بحث آگے آتی ہے۔

شیخ الرئیس کی تحقیق معنی ادراک وعلم

۸۔ شیخ نے طبیعیاتِ[1] شفا میں کہا کہ گمان[2] ہوتا ہے کہ یہ بات ٹھیک ہو کہ ہر ادراک (چاہے احساس ہو یا تعقل) اتحاد[3] کے کسی نہ کسی قسم کے ذریعہ مدرَک کی صورت کے اخذ کرنے ہی سے ہوتا ہے۔ پس اگر ادراک کسی ایسی چیز کا ہے جو مادہ سے تعلق رکھتی ہے تو اس کی صورت کا اخذ مادہ سے کسی نہ قسم کی تجرید کر کر ہوتا ہے۔ پس حس جو مادہ سے صورت کو لیتی ہے تو مادہ کے لواحق کے ساتھ (مثلاً شکل وغیرہ) حس کے اخذ صورت کرنے میں صورت اور مادہ کے درمیان نسبت باقی رہتی ہے اگر یہ نسبت زائل ہو جائے تو یہ اخذ بھی باطل ہو جائے (وہ صورت جو پہلے حس میں تھی اب خزانۂ خیال میں جمع رہتی ہے کہ حس مشترک کسی طرف خیال کے خزانہ سے جب توجہ کریں پھر آجائے۔ اور اگر خیال سے بھی گم ہو جائے جیسا کہ نسیان میں ہوتا ہے، تو پھر دوبارہ حس کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ حس کو شے مادی سے نسبت مقابلہ کی ہے کہ ایک دوسرے کے سامنے ہے) اس کا حاصل یہ ہے کہ ادراک جب کسی مادی کا ہوتا ہے تو اُس کی صورت مادہ سے کسی نہ کسی تجرید سے مجرد ہوتی ہے۔ اگر مادہ اور لواحق مادہ مثلاً شکل کیفیت و کمیت وغیرہ سے اُس صورت کو قطعاً مجرد نہ کریں تو پہاڑ کو دیکھ کر آنکھ پھٹ جائے اور دماغ بھی اور آگ کے معائنہ و تصور سے آنکھ جل جائے اور نہ ذہن بھی۔ حس کو اس اخذ صورت میں تجرید تو ہوتی ہے لیکن تجرید ناقص ہوتی ہے کہ صورت کی نسبت صاحب صورت سے باقی رہتی ہے تجرید کامل حواس نہیں کرتے بلکہ عقل کرتی ہے۔ اس تجرید میں شے مادی کے تمام عوارض اور خصوصیات کے قطع نظر کی جاتی ہے کہ ماہیت کلی ہو کر بھی ادراک ہوتی ہے اس قسم کی پھر یہ عقلی کا حاصل یہ ہوتا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۶ سے) (۱) کم کمیت مقدار تقسیم کو قبول کر سکے (۲) جو بذات نسبت کا اقتضا کرے وہ کیف ہے باقی اعراض نسبت کا اقتضا کرتی ہیں (اب نسبت دیکھئے) (۳) اضافت (۴) این کہاں ہے (۵) متی کب سے (۶) وضع بعض اجزاء شے کی نسبت بعض اجزا سے کس وضع پر ہے (۷) ملک استعداد یہ وہ کم ہے جو ایک جگہ قرار پکڑے ہے کہ شے منتقل ہو تو یہ بھی منتقل ہو (۸) فعل اثر اندازی (۹) انفعال اثر پذیری۔

[1] طبیعیات شفا فن سادس مقالہ ثانیہ فصل ثانی (لٹن لائبریری کتب خانہ مولوی سبحان اللہ خاں مرحوم۔

[2] یہ شیخ کے لفظ یشبہ کا ترجمہ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے حق ہونے کا گمان کیا جاتا ہے یہ لفظ شیخ ایسی ہی جگہ بولتا ہے جہاں کسی بات کی حقیقت مظنون ہو صاف اور یقینی نہ ہو۔

[3] اتحاد ذاتی جیسے ایک انسان زید کا تصور حیوان ناطق کے ذریعہ علم بالکنہ۔ بالکنہ کے طور پر یا عرضی جیسے زید کی وہ صورت جو حس مشترک میں حاصل ہوتی ہے۔ یہ دو قسم کی اتحاد ہیں۔ اتحاد عرضی میں صورت حاصلہ زید ذات زید سے بالعرض متحد ہے۔

۴۔ الہیات شفا میں احساس محسوس کا نام علم بتایا جو حاس کو ہوتا ہے۔ (احساس کون نفس کا)۔

۵۔ الہیات میں جس جگہ بالذات علم کو مقولۂ کیف میں اور بالعرض مقولۂ اضافت میں داخل کیا وہاں علم کو ایک ایسی کیفیت اضافی بتایا جو امر خارجی کی طرف اضافت رکھتی ہے۔

۶۔ نجات میں لکھا کہ نفس حیوانی میں کچھ ظاہری قوتوں کے علاوہ باطنی قوتیں بھی ہیں۔ ان میں کچھ محسوسات کی صورتوں کا ادراک کرتی ہیں اور کچھ معانی کا۔ (صورت و معنی کی مثال سے دونوں کے ادراک کا فرق سمجھا جا سکتا ہے)

۷۔ تغیر العلم بتغیر المعلوم کی بحث میں علم کو ایک کیفیت اضافیہ قرار دیا۔ (صورتوں کے نقش ہونے اور امر خارجی کی طرف مضاف ہونے والی کیفیت ہونے میں علم بہر حال اضافت ہوگا لیکن پہلی صورت میں مقولۂ کیف سے، دوسری میں تو وہ معلوم سے جس مقولہ کا معلوم اسی مقولہ کا علم جوہر تو جوہر عرض تو عرض) لیکن الہیات میں علم کو مقولۂ کیف سے ... کیا اور ... کا یہ جواب دیا کہ ایک چیز جوہر و کیف یا عرض کیف ہو سکتی ہے۔

---

۵ وجود کی تقسیم ممکن اور واجب کی طرف بہت مشہور ہے اس مقالہ میں چونکہ مقولہ کا لفظ بار بار آئے گا اسلئے ہم یہاں اس کی تشریح کئے دیتے ہیں ممکن الوجود کی جن کا وجود بھی ضروری نہیں اور نہ ہونا بھی) اجناس عالیہ (وہ جنسیں جن کے نیچے اور اجناس ہوں اور آخر میں انواع) ایک جوہر اور نو عرض سب مل کر دس ہیں۔ انھیں کو مقولات عشر کہتے ہیں یہ استقراء سے معلوم ہوا شیخ نے شفا میں تصریح کی کہ ان کے کم و بیش ہونے یا نہ ہونے پر کوئی برہان نہیں۔ صاحب ۶ مواقف حضرت قاضی عضد الدین الایجی المتوفی سنہ ۷۵۶ھ نے اس کا حصر ثابت کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ بلا وجہ ہے تفصیل کے لئے شرح مواقف علامہ سید شریف الجرجانی المتوفی سنہ ۸۱۶ھ مع حاشیہ چلپی المتوفی سنہ ۸۸۶ھ اور حاشیہ عبد الحکیم سیالکوٹی المتوفی سنہ ۱۰۶۷ھ دیکھئے۔ مقولات عشر۔

(جوہر) ذات و حقیقت شے جو کسی موضوع و محل میں نہیں لا فی موضوع ہے۔

(عرض جو موضوع کو عارض ہو یعنی کسی شے کی حقیقت کی تحقیق کے بعد جو شے اسے عارض ہو (عرض کی دو قسمیں عرض لازم و عرض مفارق عرض لازم کی بھی دو قسمیں، عرض لازم ماہیت مثلاً ناطق ہونا۔ عرض لازم وجود مثلاً انسان کے لئے ضاحک یا کاتب ہونا۔ وہ اعراض جو جوہر کو جو عارض ہوتی ہیں نو ہیں۔ (بقیہ حاشیہ ۵۷ صفحہ دیکھیے)

نوٹ حاشیہ ۶ مواقف علم کلام میں نہایت لاجواب کتاب ہے ۶ موقف ہیں، پہلا مقدمات میں، دوسرا امور عامہ میں، ہم نے پہلے اور دوسرے کو اس مقالہ کے لکھنے میں زیر فکر رکھا۔ شرح مواقف مع حواشی قسطنطنیہ میں سنہ ۱۲۹۲ھ میں چھاپی گئی اور مصر میں سنہ ۱۳۲۵ھ میں یہی نسخہ یہاں موجود ہے۔ یہاں میرے کتب خانہ میں (بدایوں) موجود ہے۔

پانچوں قوتوں کے ادراکات مجموعے کے طور پر آجاتے ہیں لیکن شیخ نے[1] قوت بصر کو طبقہ جلیدیہ میں چھپی ہوئی صورت کا مدرک ٹھیرایا ہے (جیساکہ آپ نے ابھی پڑھا)۔

(۲) تخیل۔ یہ اس چیز کا خیال ہوتا ہے جسے خارج میں کسی مادۂ وضعیہ میں دیکھا تھا تخیل کے لئے حضوری مادہ شرط نہیں۔

(۳۔۴) توہم۔ معانی جزئیہ کا اور تعقل امور کلیہ کے ادراک کا نام ہے جنھیں وہم۔ یا عقل نے انتزاع کیا ہو۔ ادراک وہمی و عقلی میں بالذات کوئی فرق نہیں اسی لئے کہ خیال کی طرح حضوری مادہ ان دونوں میں بھی شرط نہیں، صرف اضافت جزئی کا (وہمی ادراک میں) اور کلی کا (عقلی ادراک میں) فرق ہوتا ہے دونوں میں اس اضافت کی صحت مطابقت و عدم صحت مطابقت سے فرق کیا جاسکتا ہے اس طرح چار کی جگہ ادراک کی تین نوعیں رہ جاتی ہیں حس تخیل تعقل۔ حس کا آلات حاسہ سے اور تخیل و تعقل کا قلب سے تعلق ہے اور یہ تینوں ل نفس انسانی سے قائم مانے گئے ہیں۔ پھر اس طرح کہ ادراک حس کا قوام ادراک خیال سے اور اُس کا قیام تعقل سے ہے۔ سماعت بصارت وغیرہ کا عقل سے قطع نظر کوئی وجود ہی نہیں۔

پھر عقل اس ذات کا خاصہ ہے اور اُسی سے اُس کا قوام و قیام ہے بلکہ وہ خود وہی ہے جو انا میں اکہکر اپنے وجود کا اعلان کرتی ہے۔

(اسی تفصیل کو محفوظ رکھیئے)

اب شیخ الرئیس کی سُنئے لیکن اس سے پہلے علم کی ایک تقسیم پر نظر ڈالی جائے جو شیخ کی گزشتہ تصریح ادراک کی تشریح کا نتیجہ ہے۔

. . . . (۱) کچھ علما نے دیکھا کہ علم عالم کی صفت ہے اور حصول صورت . . . . کی صفت (تو سوچا کہ حصول صورت علم کیوں کر ہوگا) اس لئے انھوں نے حصول صورت سے ہٹ کر یہ کہا کہ نفس کا صورت کے معنی تک پہنچنا علم ہے۔ (یہ بات ہماری دانست میں انھوں نے امام رازی کی اضافت سے لی ہوگی) نفس انسانی کو وصول معنی کے مراتب میں پہلا مرتبہ شعور نصیب ہوتا ہے۔ پورے معنی پر وقوف ہوا تصور حاصل ہو گیا۔ اس حد تک یہ معنی باقی رہے کہ جب چاہا جان لیا۔ اسے حفظ اور اس طلب کو

---

[1] طبیعیات شفا۔ منہا البصر..... یدرک این طبع فی السلسلة الجلیدیة۔

کہ جزئی زید کلی ہو جاتا ہے۔ شیخ کی اس تصریح سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ بعض حواس ظاہری کے احساس و اخذ صورت کا بھی قائل ہے۔ اگرچہ کوئی فلسفی یہ نہیں مانتا کہ شامہ یا ذائقہ یا سامعہ میں حصول صورت ہوتا ہے بلکہ سب کا اتفاق ہے کہ وقت معائنہ و احساس صورت حس مشترک میں حاصل ہوتی ہے۔ مگر شیخ کی اس عبارت میں حس کا عام لفظ ہے قید حس مشترک نہیں تو کیا ہمیں یہ حق ہے کہ ہم سمجھیں کہ ادراک حواس بھی کرتے ہیں۔ اور تجرید کئے بغیر کسی چیز کا ادراک ہی نہیں ہوتا۔ یعنی مادہ بھی جب ادراک ہوتا ہے کہ مادہ سے مجرد ہو۔ اور مادہ نہ ہے۔

۹۔ طبعیات شفا میں شیخ کی یہ تصریح بھی ہمیں ملتی ہے کہ بصر ایک قوت ہے جو ایک مجوف عصب (پٹھے) میں مرتب ہے اور رنگ دار اجسام کو امثال کی ان صورتوں کا جو طبقہ جلیدیہ میں چھپی ہوئی ہیں ادراک کرتی ہے۔ اس سے یہ یقین ہوتا ہے کہ شیخ دوسرے اور فلاسفہ کی طرح اس بات کا قائل نہیں کہ تمام صورتوں کا حصول (جو حواس خمسہ کے ذریعہ) حس مشترک ہی میں ہوتا ہے اور وہیں ادراک بلکہ کم از کم وہ بصر کو اجسام متلون کی امثال و اشباح کی مدرک مانتا ہے یعنی طبقہ جلیدیہ میں جو صورتیں موجود ہیں بصر ان کا ادراک کرتی ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ قوی ظاہری میں کم از کم حس بصر مدرک ہے اس صورت کا جو طبقہ جلیدیہ میں ہے تو کیا ہمیں بصر کو صاحب علم جاننے کا موقع ہے۔

۱۰۔ ہر جگہ شیخ نے نفس کو بذات خود مدرک کلیات اور جزئیات کا مدرک بذریعہ حواس بتایا ہے۔ اور مادہ سے مجرد کرنا جس قوت کا کام ٹھیرایا ہے۔ اس کا نام نہیں لیا۔ ۹ میں یہ تصریح ہے کہ حس مادہ سے لواحق مادہ کے ساتھ اخذ صورت کرتی ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ کسی مادی شے کی اس صورت کا جو مادہ سے مجرد ہے اخذ کرنا ہی ادراک ہے۔ تو یہ ادراک تو حواس کا فعل ہوا نہ کہ نفس کا۔

اب ہم ذرا تفصیل سے آپ کو شیخ کی تحقیق کی طرف دعوت فکر دیتے ہیں

تفصیل اور ادراک کی انواع

تمام مشرقی حکمانے ادراک کی چند نوعیں قرار دی ہیں، احساس تخیل۔ توہم۔ تعقل۔

(۱) احساس۔ کسی شئے مادی کے ادراک کا نام ہے جو خارج میں کسی خاص ہیئت میں موجود ہو۔ جس میں اگر ذہنی صورت میں بھی وہ عوارض و خصوصیات محسوس ہوں۔ کیسی ہے (کیف) کتنی ہے (کم) وضع وغیرہ جس پوری طرح مادہ سے تجرید نہیں کرتی یہ تجرید ناقص کہی جاتی ہے۔ ایک باطنی حس کو تمام حکما حس مشترک کہتے ہیں، اسی حس میں ظاہر کی

.... نصیر الدین محقق طوسی المتوفی ۶۷۲ھ ۱۲۷۴ء
نے ایک خاص رسالہ مسئلۂ علم پر لکھا جو اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں۔ اس رسالہ کے وجود کا پتہ ملا صدرا نے اسفار اربعہ میں دیا ہے۔ شرح اشارات میں محقق شیخ کی رائے کے مؤید نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اُن اعتراضات کے جواب کی کوشش کی ہے جو امام نے شیخ پر اپنی شرح اشارات میں کئے ہیں۔

کتب منطق میں امام فخر الدین الرازی کے متعلق یہ قول مشہور ہے کہ وہ علم کو تصور و تصدیق کا مقسم بھی مانتے اور مجموع تصورات کو کہ ہر تصور بجائے خود علم ہے تصدیق کہتے ہیں۔ لیکن مباحث مشرقیہ میں انھوں نے تصریح کی ہے تعقل و شعور اضافت کا نام ہے جو عاقل و معقول کے درمیان ہوتی ہے۔ "تم نے اپنی ذات کا ادراک کیا تو یہ اضافت تمہاری ذات سے (اس حیثیت سے کہ وہ عاقل ہے) تمہاری ذات کی طرف (اس حیثیت سے کہ وہ معقول ہے) پائی جائے گی۔ اگر تم کسی دوسرے کا تعقل کرو۔ تو اس کی صورت اور تمہارے درمیان جو اضافت متحقق ہوگی اسی نسبت عقلیت کا نام تعقل ہوگا۔ مواقف میں قاضی ایجی نے یہ بتایا ہے کہ امام پہلے تو علم کو بدیہی جانتے تھے پھر انھوں نے ذرا تنزل فرما کر علم کی یہ تعبیر کی کہ وہ اعتقاد جازم ہے جو بداہت یا نظر سے پیدا ہوتا ہے۔

بعض علما نے علم کو نفس میں انتقاش مانا ہے چونکہ صورت کے حصول کے وقت نفس کچھ نہ کچھ ضرور متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے علم صورت کے قبول کا نام ہے۔ حصول کا نام نہیں۔

اور علما نے علم کی مختلف تعبیریں کی ہیں اور اس لفظ کا کئی معنیٰ پر اطلاق کیا ہے وہ جس کے ذریعہ معلوم کی معرفت ہو ادراک معلوم اثبات معلوم جس نہج پر معلوم ہو کیا جائے۔ کسی چیز کا اعتقاد وہ جس سے ہم کسی چیز کو جان لیں۔ وہ صفت کہ موصوف سے جب قائم ہو تو موصوف کا عالم ہونا ضروری ہو جائے۔

ان تعریفات کی کثرت اور اختلافات کے متعلق امام حجۃ الاسلام ابو حامد الغزالی المتوفی ۵۰۵ھ نے المستصفیٰ میں تصریح کی کہ "مدرکات (ادراک کرنے والی قوتوں) کی ایسی جامع اور مانع تعریف جو جنس و فصل سے مرکب ہو بہت دشوار ہے۔ علم تو ایک ادراک ہے اس کی تعریف تو دشوار تر ہے ہاں تقسیم اور مثال سے اس کے معنی بیان کئے جا سکتے ہیں۔ تقسیم اس طرح کہ اعتقادات کو شک و ظن سے جزم کے ساتھ۔ اور جہل سے واقع کی مطابقت کے ذریعہ تمیز کر سکتے ہیں۔ رہا اعتقاد مقلد تو وہ متمیز نہیں ہوتا۔ مثلاً زید گھر میں ہے اس کا ایک مقلد کو اعتقاد تھا اب

متذکرہ احساس وجدان کو ذکر کہتے ہیں۔

علامہ قطب الدین شیرازی نے علم کو حضور شے یا ذہن میں حاضر بتا کر تصریح کی کہ علم ادراک پر بھی اطلاق کیا جاتا ہے اور مدرک پر بھی۔ پھر اسی علم کی دو قسمیں تصور ساذج اور تصور مع تصدیق قرار دیں۔ اس کے صاف معنی کہ علم کی طرح معلوم تصور بھی اور تصور متصور بھی۔ دونوں ہوتا ہے۔ حصول صورت کو جو علم کہتے ہیں شارح مقاصد علامہ تفتازانی نے ان اہل مذہب کو تنبیہ کی کہ عقل میں حصولِ صورت عالم کی صفت ہے۔ نہ کہ صورت کی۔ جیسے علم صفت ہے عالم کی۔

شارح مقاصد نے علم کے دو معنی اور بھی بتائے ہیں:

اوّل تصدیق کے اقسام میں ایک قسم علم اور یہ جزم مطابقت اور ثبات کے ہم آغوش ہے اس معنی میں علم سے ظن جہل مرکب اور تقلید مقلد خارج ہو جاتی ہے (غالباً یہ وہی ہے جسے منطقی حکم کہتے ہیں)۔

(۲) تصور مطابق واقع اور تصدیق یقینی (کہ لغت اور عرف کے مطابق ہے) اس معنی کی تعبیر دو عبارتوں میں کی گئی ہے: ایک وہ صفت جس کے ذریعہ بصورت تجلی وانشراح و مذکور (جس کی یاد ہو رہی ہے) اس شخص پر کھل جاتا ہے جس سے یہ صفت قائم ہے لفظ شے سے بچ کر مذکور کا لفظ اس لئے برتا گیا کہ معدوم و موجود دونوں شامل ہو جائیں۔ ظن و جہل اس تعریف سے یوں خارج کہ ان میں تجلی ہوتی ہے مقلد کے اعتقاد میں نہ تجلی ہوتی ہے نہ انشراح اس لئے علم نہیں۔

دوئم وہ صفت جو ان معانی میں تمیز واجب کرتی ہے جو اپنے نقیض کو برداشت نہیں کر سکتے۔ یعنی اللہ کی تخلیق سے یہ صفت موصوف میں اس لئے پیدا کی جاتی ہے کہ امور جزئیہ و کلیہ میں تمیز دی جا سکے۔ مواقف میں یہ تعریف امام رازی کے نام سے پیش کی ہے کہ پہلے تو وہ علم کو بدیہی کہتے ہیں پھر ذرا نیچے اتر کر یہ تعریف کرتے ہیں۔ وہ صفت جو ان معانی میں تمیز کی موجب ہے جو متحمل نقیض نہیں اور جن کا منشا بداہت یا استدلال ہوتا ہے۔

ہم ان تمام معانی علم میں صرف ان آخری معانی علم کو پسند کرتے ہیں اور اپنا مختار ٹھیراتے ہیں۔ وجہ ترجیح اگلے مباحث میں زیر نظر آئے گی۔

(۱) علم حالت انجلائیہ ہے یا محض انکشاف اس کا منشی مجرد ہی ایک مدرک عالم غیر مادی موجود ہے اس کی توجہ والتفات کے سبب۔ یا صرف اس عالم کا وجود ہی علم ہے علم وجود نظوری اور شہودی ہے۔

---

۵ دیکھو درۃ التاج الثمن لائبریری کتب خانہ مولوی سبحان اللہ مرحوم۔ موجودہ کتب خانہ قادریہ بدایوں)۔

لیکن شرح اشارات میں امام نے شیخ کے مقابل جو استدلال اور اعتراض کئے ہیں اُن میں علم کو حالت نسبیہ یا کیفیت اضافیہ ٹھیرایا ہے تفصیل آگے آئے گی۔

بعض علما نے علم کو انتقاش مانا۔ اور کچھ نے اس کی یہ تصریح کی۔ کہ علم ایک انفعال ہے صورت کے حصول کے وقت نفس کچھ نہ کچھ متاثر ہوتا ہے اس لئے علم صورت کے قبول کا نام ہے۔ حصول کا نہیں۔

علم کے متعلق گزشتہ نظریوں پر نقد و تبصرہ

کیا علم امر سلبی ہے؟ ہمارا وجدان ہمیں بتاتا ہے کہ جب کسی چیز کا تعقل ہوتا ہے تو اس کے حاصل ہونے کا ادراک کرتے ہیں۔ کسی چیز کے زایل ہونے کا نہیں۔ اب غور کیجئے شیخ کی اس تعریف کی بنا پر یہ ضروری ہے ہمیں کسی چیز کا علم نہ ہو جب تک ہم اسے مادہ سے مجرد معلوم نہ کریں۔ حالانکہ یہ بھی ایک علم ہے، دوسرے علم خود بھی سلب ہے اور ظاہر ہے کہ جہل کا۔ لیکن جہل کی ایک قسم جہل مرکب بھی ہے جو علم اور جہل سے بنا۔ تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ علم یا تو اپنا یعنی جہل مرکب کے جز علم کا عدم ہے یا اپنے عدم (جہل) کا عدم۔

کیا علم کسی ادراک سابق کا زوال ہے۔ مطارحات میں شیخ الاشراق المقتول سنہ ۵۸۷ھ ۱۱۹۱ء نے علم کے زوالِ ادراک سابق نہ ہونے پر بحث کی ہے۔ قطبیہ میں علامہ قطب الدین رازی نے اس بحث کا اشارہ کیا۔ محقق دوانی نے جرح کی۔ میرزاہد نے اس کی تردید کی۔ میرزاہد نے خود بتایا کہ علم انتفائے ادراک سابق نہیں۔ اب رہی یہ بات کہ علم مادہ سے تجرد پائی ہوئی چیز کا نام ہے تو حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کو مادہ سے مجرد جاننا اس کا علم نہیں ہو سکتا۔ کسی کو غیر مادی جان لینے سے ہم اس کے عالم ہو جاتے ہیں؟ یوں ہو تو خاص دلیل کی ضرورت کیا کہ کوئی موجود مادہ سے مجرد بھی ہے یا ہو سکتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہر مجرد عقل ہے اور عاقل۔ لیکن اس کا علم ہمیں دلیل کے بعد ہوتا ہے۔

ایک ہی وقت میں جو مجہول تھا معلوم کیسے ہوا۔ ظاہر ہے کہ ادراک محض تجرد اور عدم نہیں بس کیا حصول صورت علم ہے؟

(بقیہ نوٹ صفحہ ۶۲ سے) جس میں نظر محال ہو۔ یہ تعریف آپ جانتے ہیں کتنی لغو ہے اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ بدیہی کوئی بھی چیز نہ ہو۔ نہ حدسیات۔ نہ تجربیات۔ نہ متواترات۔ نہ اولیات۔
(تفصیل کے لئے فاضل ملا حسن کا حاشیہ دیکھئے)

زید گھر سے نکلا اس کا اعتقاد اپنے حال پر باقی ہے اور علم معلوم کے تغیر سے متغیر ہو جاتا ہے۔
مثال سے اس طرح علم کے معنی واضح ہوتے ہیں بصیرت قوت باصرہ کے مشابہ ہے جس طرح باصرہ میں صورت چھپتی ہے آئینہ میں صورت کا عکس آتا ہے عقل بھی آئینہ کی طرح ہے اس میں معقولات کی صورتیں حقیقتیں اور ماہتیں چھپتی ہیں۔ پس معقولات کی صورتوں کو عقل کے اخذ کرنے صورتوں کے چھپنے اور حاصل ہونے کا نام علم ہے یہ مثال و تقسیم حقیقت علم کو تمہارے فہم کے قریب کر دیگی۔"

الغزالی کی اس تصریح سے ظاہر ہوا کہ علم کی حقیقی تعریف نہیں ہو سکتی مگر جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں امام رازی نے فرمایا کہ علم کی تعریفوں میں جو خلل واقع ہوا وہ اس لئے علم کی غایت ظہور کے اس حد تک پہنچ گئی کہ علم سے زیادہ مجلی چیز کوئی نہ رہی جس کے ذریعہ علم کی تعریف ہو سکے۔

علامہ تفتازانی المتوفی ۷۹۲ھ نے شرح مقاصد میں لکھا "لفظ علم کئی معنی پر بولا گیا ہے۔
(۱) ادراک عقل۔ (۲) عقل میں کسی شئے کا حصول۔

بعض علما علم کو حالتِ انجلائیہ کہتے ہیں جس سے بوجود شرائط و توجہ معلوم کھل جاتا ہے علم ہو کر یہی حالت تصور یا تصدیق ہو جاتی ہے اور صورتِ علمیہ ایسی مخلوط ہوتی ہے کہ صورت کو مبداء انکشاف و علم کہنے لگے۔ (اس پر کئی شبہے کئے گئے ہیں (۱) حالت کیف سمی مطابقت واقعہ و عدم مطابقت سے موصوف کیسے (۲) بغیر توقف نفس کے ساتھ قائم ہے تو بدیہی یا نظری کیسے ہوگی (۳) کیف تصدیق انکشاف اجزاء کے بعد سے مبدا کہاں (۴) مبدا شے معین کا میز و کاشف۔ اور یہ قوت ادراک اشیاء سے برابر کی نسبت رکھنے والی ہے)۔ ایک بحث یہ بھی ہے کہ مبدا اگر جزئی ہے تو منقسم نہ ہوگا اور کلی تو معین کا میز نہ ہوگا۔ اور نہ مبدا۔ حل یہ ہے کہ مفہوم کلی اور منقسم اور مصداق علم تشخص ذہنی مبدا سے موصوف تھا ولیکن تصدیق کو علم اصطلاحی نہیں کہتے اور نہ تصور و تصدیق کو دو مختلف نوعیں علامہ[٭۵] خیر آبادی علم کو حالت انجلائیہ مانتے تھے اور ذہن میں اشیا کی امثال کے حصول کے قائل تھے آخر میں وحدت الوجود ماننے لگے تو علم کو نور و ظہور کہنے لگے۔

معنی علم کے متعلق مواقف میں قاضی عضد الدین ایجی نے چند مذاہب کا ذکر کیا ہے جو مختلف جماعتوں کے مختار ہیں۔ ان میں ایک مذہب حضرت امام رازی کا مختار ٹھیرایا ہے۔ شارح مواقف علامہ سید شریف الجرجانی نے تصریح کی کہ امام علم کو بدیہی کہتے تھے پھر تنزل فرما کر علم کی تعریف کی کہ علم وہ اعتقاد جازم ہے جو بداہت[۵] یا استدلال سے پیدا ہوتا ہے۔

---

[۵] بدیہی کی تعریف تمام کتب فلسفہ و منطق میں یہ کی گئی ہے کہ جو بغیر کسب نظر حاصل ہو وہ بدیہی ہے۔
لیکن میر زاہد نے شرح مواقف کے حاشیہ میں کہا کہ بدیہی وہ ہے جس کا حاصل کرنا کسب سے ممکن ہی نہ ہو۔ یعنی

[٭۵] علامہ خیر آبادی کا فلسفہ مستقل مضمون چاہتا ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۶۳ پر دیکھئے)

نفس میں حاصل ہوتی ہے اور وہ اس کا ادراک کرتا ہے اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ اس نفسی ادراک میں پہلے حصول صورت کا علم ہوگا نہ کہ علم حصولِ صورت ہوگا یعنی نفس کو علم سے پہلے علم ہوتا ہے جو غلط ہے۔

کیا علم بمعنی حصولِ صورت کی تصور و تصدیق قسمیں ہیں جیسا کہ میر باقر داماد فرماتے ہیں	(۱) حصول ایک معنیٰ اضافی ہے جو انکشاف کا مبداء ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ جیسا کہ ہم نے پہلے

اشارا کیا۔

(۲) تصور و تصدیق دو متباین نوعیں ہیں اور وجود و حصول امورِ عامہ سے ہیں جن کے حصصی افراد ہوتے ہیں اس لئے تصور و تصدیق اس حصول صورت کے (جو صرف وجودِ ذہنی ہے) افرادِ حصصی ہوں گے۔ نہ کہ دو متباین نوعیں ہیں یہ اعتراض میر زاہد کا تھا۔ ملا حسن[۱۵] فرنگی محلی المتوفی ۱۲۰۹ھ نے فرمایا کہ اگر حصول صورت سے حاصل مصدر (یعنی حالتِ انکشافیہ) مراد لی جائے تو تصور تصدیق میں تباینِ نوعی پیدا ہو سکتا ہے ہمارے خیال میں میر باقر کی طرف سے یہ بات نہیں کی جا سکتی وہ حصولِ صورت کو حالتِ ادراکیہ نہیں کہتے۔ ملا صاحب خود اپنی طرف سے معنیٰ بدل دیں تو میر زاہد کی ان سے گفتگو نہیں۔ خود میر زاہد علم کو حالتِ ادراکیہ جانتے ہیں اور تصدیق کو حالتِ اذعانیہ مانتے ہیں جو انکشاف کے یعنی حالتِ ادراکیہ کے پیچھے حصولِ صورت کے بعد نفس کو حاصل ہوتی ہے۔ میر زاہد کے نزدیک تصور و تصدیق ادراک کی دو متباین نوعیں نہیں بلکہ کیفیت کی دو نوعیں ہیں۔

حصولِ صورت اگر علم ہو تو صورت تو بصر کے پاس ہوتی ہے جیسے انکشاف کے لئے مشائی ناکافی مانتے ہیں رہا یہ کہ عقل یا مدرک کے پاس حصولِ صورت ہوتا ہے اس پر یہ گفتگو ہے کہ جب کسی ذات

---

[۱۵] محمد حسن (ملا حسن) ابن قاضی غلام مصطفیٰ بن قاضی اسعد بن قطب شہید۔ استاذ الہند نظام الدین سہالی کے شاگرد تھے استاذ الہند نے ایک دن کسی بات پر استدلال میں شیخ کی شفا کا حوالہ دیا ملا حسن نے کہا کہ عقیدت میں تقلید نہیں چلتی شیخ یہ کہتے ہے میں کہتا ہوں، قوی الحافظہ اور بڑے ذہین تھے تشقیق شقوق میں کمال رکھتے تھے۔ سلم العلوم کی شرح منطق میں داخل درس نظامی ہے مسلم الثبوت کی شرح کی ۱۲۰۹ھ میں رام پور میں انتقال کیا زوا ہد ثلثہ پر ان کے حواشی ہیں جن سے میں نے فائدہ اٹھایا ہے۔

ملا مبین بن ملا محب اللہ ملا حسن کے داماد بھی تھے اور شاگرد بھی منطق و فلسفہ کے دقیق مسائل کے بیان کرنے میں دا کمال حاصل تھا اور واقعی ملا مبین تھے۔ ملا حسن نے جن کتابوں کی شرح لکھی ان تمام کتب درسیہ پر شرح اور حواشی لکھے ہیں شرح مسلم و حواشی زواہد ثلثہ و شرح مسلم الثبوت قابل دید کتابیں ہیں ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی۔

حصول معانی مصدریہ سے ہے جنھیں عقل انتزاع کرتی ہے۔ ان کا وجود خارج میں تو ہوتا ہی نہیں تو حصول۔ صورتِ حاصلہ سے پہلے موجود نہیں ہو سکتا۔ ہاں مبداء اشتقاق کے اعتبار سے حصول حاصل پر متقدم ہے لیکن یہ لفظی مباحث میں درکار ہے۔ فلسفہ احکام لفظی پر اپنے دقائق کی بنیاد نہیں رکھتا۔

جب ہم اپنی ذات کا ادراک کرتے ہیں تو ہمیں کسی صورت کے حصول کا ادراک نہیں ہوتا۔ اور نہ کوئی صورت حاصل۔ پس کیا ہمارا تعقل عین ہماری ذات ہے؟ یہ نہیں تو پھر کیا صورت ہماری ذات پر زائد ہوتی ہے اگر یہ ہے تو یا تو وہ صورت ہماری مثل ہماری ذات کے برابر موجود ہوگی۔ پس ترجیح کیسے دیجئے گا کہ ہم کون ہیں اور کون ہم نہیں۔ ہماری صورت ہماری مثل ہے تو ہماری طرح اسے جوہر ہونا چاہیئے لیکن وہ تو ہماری ذات سے قائم ہے اس لئے عرض ہے کیا ایک ہی چیز جوہر اور عرض ہو سکتی ہے۔

مطلق حصولِ صورت تو جمادات کو بھی ہے۔ کیا وہ بھی مدرک ہیں؟ —— شیخ نے شفاء میں کہا کہ امور عامہ کسی مقولہ میں داخل نہیں۔ حصول وجود کے مترادف ہے اور امور عامہ سے ہے۔ اس لئے۔ کہ مقولہ کیف سے تعلق رکھتا ہے حصول نہیں ہو سکتا۔

صورت شخص کو ہزار تخصص سے خاص کیجئے لیکن رہے گی وہ کلی کیونکہ نفس نے اسے ادراک کیا ہے۔ ہم اپنے کو ایک شخصیت ناقابل اشتراک جانتے ہیں اور اسی طرح ہر جزئی معلوم کو، پھر اگر صورتِ حاصلہ علم کا نام ہے نفس کو معلوم کیوں کر ہو سکتی ہے۔ نفس ادراک کرتا ہے کلیات کا اور دیکھتے ہیں ایک شخص جزئی۔

صورتِ ادراکیہ اگر ہماری ذات پر زائد ہے تو ہم اسے وہ کہہ کر پکاریں گے جس طرح اور چیزوں کو جو ہماری ذات کے علاوہ ہیں وہ کہہ کر پکارتے ہیں۔ حالانکہ میں اپنی ذات کی طرف میں کہہ کر اشارہ کرتا ہوں حقیقت کا مدرک کے پاس متمثل ہونا علم اگر ہو سکتا ہے تو مدرک کے پاس معلوم کا حضور شرط ہونا چاہیئے۔ کیا اس شرط کے وجود کا نام علم ہے اور حصولِ صورت علم نہیں پھر میں جب اپنا ادراک کرتا ہوں میرے پاس میری حقیقت کی کوئی تمثال نہیں ہوتی مجھے تو اپنی حقیقت کا علم ہی نہیں ہوتا۔ تمثال کیسی۔

مشائی حکماء نے حصولِ صورت کی یہ توضیح کی کہ حاسہ میں حصول صورت مطلقاً تو انکشاف کے لئے کافی نہیں۔ حواس جاسوسوں کی طرح ہیں ان کے واسطے سے صورت

یہاں ایک بحث اور بھی ہے۔ فخر المتاخرین مولانا فرنگی محل نے فرمایا ہے کہ مبصر کا حضور بظاہر تو بصر کے پاس ہوتا ہے۔ نفس کے پاس کہ مدرک ہے نہیں ہوتا لیکن حقیقت میں مدرک نفس ہی کے پاس بواسطہ آلات ہے آلات حاسہ متقابلہ آئینوں کی طرح ہیں بصر کے پاس مبصر کا ہونا نفس مدرک کے پاس حضور ہے۔

یہ بات کہنہ کر آپ حضرت علامہ خیرآبادی کے اس اعتراض کو دُور کرنا چاہتے ہیں کہ مبصر قطعاً نفس مدرک کے پاس حاضر نہیں اور بصر بالاتفاق مدرک نہیں۔ پس مبصر بنفسہ علم نہیں ہو سکتا۔ ہمارے خیال میں آئینہ سے تمثیل تمثیل ہے دلیل نہیں اگر اسی تمثیل سے حقیقت علم کا مشاہدہ ہو سکتا ہے تو اس سے بہتر سیّد قمرالدین کے آئینے ہیں جنھوں نے وجود اصلی و وجود ظلی۔ کی تفریق سے سارا مسئلۂ علم حل کر ڈالا۔ تمثیل سے حقیقت نہیں کھل سکتی۔

اگر آلات حاسہ آئینے ہیں تو ان آلات حواس کا مرکز منتہی تو اعصاب دماغی و نخاعی ہیں اور یہ بالکل بدیہی مشاہدہ ہے۔ پس ان آئینوں سے دیکھنے والا نفس بھی وہیں ہونا چاہیئے جہاں یہ اعصاب ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ نفس مادہ سے مجرد نہیں بلکہ مادی ہے کہ مادی جسم سے قرب مکانی رکھتا ہے۔ کہ جب صورت آلہ حاسہ کے آئینے میں جلوہ گر ہو تو وہ (نفس دیکھ لے) نفس مدرک کو مشائی مادہ سے مجرد جانتے ہیں اور اُس کا بدن سے تعلق تدبیر و تصرف مانتے ہیں پھر وہ ان آلات حس کے پاس کیسا اور یہ قرب و بُعد کس نہج کا جس کے علم کے بغیر ہمیں نہ اپنا علم ہو سکے نہ اپنے علم کا علم لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہم ہیں اور جانتے ہیں جب اپنے ادراک میں ہم اپنے آلات کے حس سے کام نہیں لیتے تو پھر مدرک ہمیں ہوئے نہ کہ ہمارے آلات حس۔

الفاظ وضعی | ہمیں جو کچھ علم حاصل ہوتا ہے الفاظ کے ذریعہ سے بھی اب یہ بات دیکھنا ہے کہ:۔

(۱) الفاظ خارجی موجودہی کے لئے بنائے گئے۔ یعنی جن چیزوں کا ہم نے اپنے حواس سے تجربہ کیا اثر ڈالا یا اثر قبول کیا صرف انھیں کو جانا نام خود رکھا یا کسی سے سنا اور بولنے لگے اور اس بنا پر جو چیز خارج میں نہیں اُس کے لئے نہ ہمارے ذہن میں کوئی مفہوم ہے نہ زبان پر کوئی لفظ۔ اگر ہم کچھ بولتے ہیں تو وہ بھی نہ کسی خارجی موجود ہی کا نام ہوتا ہے

(۲) الفاظ صرف انھیں معانی کے لئے ہیں جنھیں ہم سمجھے خارج میں اُن کا موجود ہونا ضروری نہیں۔ ہم بہت ایسے الفاظ بولتے ہیں جن کے معنی کا خارج میں پتا نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے یہ دُو راہیں اس مسئلہ کو حل کرنے والے کے سامنے تھیں لیکن بارھویں صدی ہجری میں قاضی مبارک

مدرک اور عقل ہونا جان لیا گیا تو اس حالت اور رائی کو حصول کہئے یا وصول قبول کہئے یا انفعال اضافت جانئے یا ارتباط۔ تعلق جانئے یا نسبت پہلے اس کا علم ہوگا پھر علم کا۔ گویا علم سے پہلے اس نسبت وغیرہ کا علم ہونا چاہئے۔ دوسرے ان لفظوں میں کسی لفظ سے کوئی قطعی حقیقت علم کی واضح نہیں ہوتی۔ پھر صورت کو جو علم کہتے ہیں تو یہ بھی بصر کے پاس ہے اور اسی کی محسوس اور اس پر بھی وہی گفتگو ہے جو مشائیوں کی طرف سے شیخ الاشراق کے خلاف پیش کی گئی جو علم البصار کا حضوری مانتے ہیں کہ مبصر کا حضور بصر کے پاس ہے نفس کے پاس نہیں۔ پس بصر کو مدرک ماننا چاہئے کہ علم یعنی صورت بصر کے پاس موجود ہے رہا یہ کہ نفس کو اس صورت سے ارتباط ہو جاتا ہے تو علم ہوتا ہے تو اس پر دو طرح نظر کی جا سکتی ہے۔

(۱) بقول علامہ عبدالعلی بحرالعلوم المتوفی ۱۲۲۵ھ[۱] یہی بات شیخ الاشراق کی طرف سے بھی کہی جا سکتی ہے۔

(۲) اس کے معنی یہ ہوئے کہ ارتباط علم ہے نہ کہ حصول صورت یا صورت حاصلہ۔ ارتباط سے کیا مطلب۔ یہ نفس کو معلوم ہوتا ہے یا مجہول۔ معلوم ہے تو نفس کو ارتباط کا پہلے علم ہوگا اور معلوم کا بعد کو۔ اور اس سے ظاہر کہ علم سے پہلے علم ہو جائیگا۔ جیسا کہ ہم نے ابھی کہا۔

---

[۱] عبدالعلی احمد بحرالعلوم حضرت استاذ الہند نظام الدین سہالوی کے آخری بیٹے تھے پڑھتا تھا بہت مگر علم سے ابتدا میں کچھ دلچسپی نہ تھی جن علما کی دستاربندی ہوتی تھی وہ ان کے والد کے ہاتھ سے شاہ پیر محمد کے عرس کے موقعہ پر (شاہ پیر کے ٹیلہ پر) ہوتی تھی۔ حضرت کی وفات سے بعد ایک سال یہ بھی تماشا دیکھنے گئے بھیڑ کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکے ایک طرف سے کچھ راستہ بنانا اور بڑھنے لگے اس شان سے کہ ہاتھ میں بٹیروں کی کابک ایک شخص نے دیا دھکا کہ کہاں بڑھتا ہے یہ مولویوں کا جلسہ ہے تم نے کہا کہ مجھے نہیں جانتا میں ہوں نظام الدین کا بیٹا اس نے کہا کہ ان کے ہونے تو ان کی جگہ صدر میں نہ بیٹھتے۔ اس کا ایسا اثر ہوا کہ بٹیریں اڑا دیں کابک توڑ دیا کتابوں پر مشغول ہو گئے۔ ملا حسن جب دہلی گئے اور ان کے علم معقول کی شہرت ہوئی تو شاہ عبدالعزیز نے کہا کہ یہ لکھنؤ کے لوگ قال الشیخ وقال الرازی جانتے ہیں حدیث و فقہ کیا جانیں اس کی خبر کسی نے مولانا عبدالعلی کو لکھنؤ پہونچائی حضرت نے ارکان اربعہ لکھ کر شاہ صاحب کو بھیجدیا۔ کتاب کے جواب میں شاہ صاحب نے مولانا عبدالعلی کو خط لکھا اس میں بحرالعلوم کا خطاب دیا جو تمام عالم اسلامی میں مشہور ہو گیا۔

آپ نے زواہد ثلٰثہ کی شرح لکھی میں نے جس سے فائدہ اٹھایا۔ بحرالعلوم نے ۱۲۲۵ھ میں مدراس میں وفات پائی۔

میں اُس کا تحقق ہی نہ ہوگا یہ تو معدوم ہے اور جس کا تحقق وہ موجود (صاحب مواقف نے اسے اہلِ حق کا مذہب بنایا ہے)

(۲) معدوم ثابت نہیں واسطہ امر حق ہے (یہ قاضی ابوبکر باقلانی کا عقیدہ رہا' اور امام الحرمین کی بھی پہلے یہی رائے تھی پھر انھوں نے اس سے رجوع کیا۔ بعض معتزلہ بھی اسی بات کے قائل ہیں) ان لوگوں کی رائے میں معدوم کا یا تو کوئی تحقق ہی نہیں ہوتا یہ معدوم ہے یا باعتبار ذات تحقق ہوتا ہے یہ موجود ہے یا کسی غیر کی تبعیت میں (یا عتبار ذات غیر) تحقق ہوتا ہے یہ حال یا واسطہ ہے انھوں نے واسطہ کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ صفت ہے کسی موجود کی جو خود بذاتِ خود نہ موجود ہے نہ معدوم۔

(۳) معدوم ثابت ہے اور موجود و معدوم کے درمیان واسطہ نہیں (یہ اکثر معتزلہ کی ہے۔ ان کی رائے میں معدوم کا یا تو فی نفسہٖ تحقق ہی نہیں یہ منفی (ممتنع الوجود کے مساوی ہے) یا فی نفسہٖ کسی نہ کسی وجہ سے تحقق ہے یہ موجود اور معدوم ممکن کے شامل ہے انھوں نے معدوم کی ایک اور تقسیم کی (۱) جس کا اعیان (خارج) میں کوئی وجود ہی نہیں معدوم ہے ممکن ہو یا ممتنع۔
(۲) جس کا خارج میں کون ہے یہ موجود ہے۔ منفی ان کے نزدیک معدوم سے خاص ہے۔

(۴) معدوم ثابت ہے اور حال بھی حق ہے یہ بعض معتز کی رائے ہے ان کی رائے میں خارج میں موجود ہے یا تو اس کو مستقل کون حاصل ہے یہ موجود ہے یا غیر مستقل کسی دوسری ذات کی تبعیت میں یہ حال ہے یا خارج میں اُسے کون نہیں یہ معدوم ہے اب اگر فی نفسہٖ معدوم کو تحقق و تقرر ہے تو یہ معدوم ثابت ہے ورنہ منفی ہے۔

علما کی رائے: معلومات کی حکمانے دو قسمیں کی ہیں (۱) وہ جو کسی نہ کسی اعتبار سے ممکن ہے کہ جانا جائے یا تو اس کا کسی وجہ سے بھی تحقق نہیں یہ معدوم ہے اور جسے کسی طرح کا تحقق ہے یہ موجود ہے اب اس موجود کے لئے یہ ضروری کہ اپنی حقیقت کے سبب غیر سے ممتاز اور منفرد ہے اب اگر یہ امتیاز ہویت شخصیہ کی وجہ سے ہے کہ اور بہت سی شخصیوں میں اُس کی شرکت فرض نہیں کیجاسکتی تو یہ موجود خارجی ہے ورنہ موجود ذہنی ہے۔ ان کے نزدیک ذہن امر کلی ہی کا ادراک کرتا ہے موجود ذہنی غیر سے ممتاز صرف ماہیت کلیہ ہی کے سبب سے اور موجود خارجی ماہیت کلیہ اور تشخص کے سبب بھی ممتاز ہوتا ہے۔

شارحِ مسلم نے ایک تیسری راہ نکالی۔

الفاظ کا موضوع بنفس شئے (جوں کی توں) ہے اس بات کا لحاظ کئے بغیر کہ وہ چیز ذہن میں ہے یا خارج میں۔ مطلب یہ ہے کہ الفاظ کے مفہوم ذہن میں حاصل ہوتے ہیں۔ اگر ہم اُن کے معانی جانتے ہیں مفہوم سے کچھ نہ کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ کسی کا تصور ہو یا نہ ہو یا تصور ہو ہی نہ سکتا ہو۔ اگر کسی چیز کا وجود خارج میں محال ہے تو اُس کے محال ہونے کا مفہوم ذہن میں ہوگا اور وہی علم ہوگا۔ جب ہم بولیں گے اُس لفظ کا مطلب سمجھیں گے۔ اور ہمیں علم ہوگا کہ محال ہے۔

بداہت و نظریت پہلے یہ غور کرنا کہ بداہت و نظریت علم کی صفت ہے یا معلوم کی۔ پرانے علماء کی تحقیق یہ ہے (بدیہی) ہونا یا نظری ہونا علم کی صفت نہیں معلوم کی صفت ہے۔ کیونکہ بدیہیت نظر سے بے پروا۔ اور نظریت محتاجِ نظر ہے۔ اب معلومیت ہے۔ یا مجہولیت۔ یہ دونوں حالتیں اُس شئے کی ہیں جو ذہن میں حاصل ہوتی ہیں۔ تصورات میں اشیائے متصورہ کا بالکنہ یا بالوجہ نظر کے ذریعہ حاصل کرنا مطلوب ہوتا ہے اس میں عوارض ذہنیہ کا کوئی دخل نہیں۔ اسی طرح تصدیق میں نفس نسبت سے تحصیل اذعان مطلوب ہوتی ہے اس حقیقت سے نہیں کہ ذہن کے ساتھ قائم ہے حصول ذہنی میں نظریت کا مدار واسطۂ نظر کی تحقیق پر ہے اور بدیہیت کا عدم واسطہ نظر پر لیکن میر زاہد[1] کی تحقیق یہ ہے کہ بدیہی یا نظری ہونا معلوم کی صفت نہیں بلکہ علم کی ہے۔

معلومات کی تقسیم فلسفہ مابعد الطبیعۃ میں امورِ عامہ سے بھی بحث کی جاتی ہے یہ امورِ عامہ وہ ہیں جو موجود کی کسی قسم سے مخصوص نہیں۔ یا جو تمام مفہومات کو شامل ہیں پھر یا توعلی الاطلاق (امکان عام اس کی مثال ہے) اور یا برسبیل تقابل (مثلاً وجود و عدم) ان امورِ عامہ سے حصول ثبوت کون وجود وتحقق اور ان کے مقابل "حصول نفی" کون عدم۔ غیر محقق، کے مروضات ہمارے معلومات ہیں۔

متکلمین کی چار رائیں معلومات کی معتزلہ و متکلمین کے نزدیک چار قسمیں ہیں اور یہ در حقیقت اُن کے چار گروہ کے مذہب ہیں۔

(۱) معدوم ثابت نہیں اور موجود و معدوم کے درمیان کوئی واسطہ (حال) نہیں۔ اس مذہب کے لوگ کہتے ہیں کہ معلوم (یعنی وہ جس کی شان یہ ہے کہ جانا جائے) یا تو خارج

ملا فاضل شارحِ مسلم اور صاحبِ مسلم پر اگلے صفحات میں آپ نوٹ ملاحظہ کریں گے۔

[1] میر زاہد منطق کے ذکر ہیں۔ ان کی یہ تحقیق حاشیہ شرح تہذیب ملا جلال میں دیکھنا چاہئے۔

طرف سے جواب نہیں ہو سکتا۔ تفصیل یہ ہے:۔

سیّد نے کہا۔ کہ ہم اُسے نہیں مانتے کہ امکانِ علم سے امکانِ تحقق لازم آتا ہے۔ علم بالوجہ کے طریقہ پر شے کو علم کے وقت شے ذہن میں حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کی وجہ حاصل ہوتی ہے یعنی معدوم مطلق ذہن میں بالوجہ حاصل ہوتا ہے۔ وجہ شے کے حصول کو شے کا حصول نہیں کہتے۔

اس مختصر جواب کو حاشیہ شرح تہذیب ملا جلال میں سیّد زاہد نے اس طرح پیش کیا ہے کہ ذہن میں وجہ بالذات حاصل ہوتی ہے اور اس کی طرف التفات بالعرض ہوتا ہے اور شے بالعرض حاصل ہوتی ہے اور بالذات اس کی طرف التفات ہوتا ہے اس بنا پر وجہ معدوم مطلق ذہن میں موجود ہے معدوم مطلق موجود نہیں لیکن چونکہ اس کی وجہ ذہن میں حاصل ہے اُسے معلوم کہتے ہیں"

اس جواب پر ایک تو یہی بات کہنا ہے کہ یہ تفصیل (وجہ بالذات حاصل اور بالعرض ملتفت الیہ) حکما کا عقیدہ نہیں وہ علم بالوجہ میں ذو الوجہ کو ذہن میں حاصل بالذات مانتے ہیں التفات کی شرط نہیں کرتے اسے ذہن میں بالعرض ہے۔ اُن کے نزدیک شے بنفسہ ذہن میں حاصل ہوتی ہے پس اُن کے مسلمہ پر یہ اعتراض اُٹھائے نہیں اُٹھ سکتا۔ یا تو معدوم مطلق کو معلوم نہیں معلوم جانیں تو اُسے مطلق موجود سمجھیں۔ حکما کی طرف سے دو جواب پیش کئے گئے۔

(۱) وجود ذہنی میں ماہیت کے مطابق معلوم کا دوسروں سے ممتاز ہونا بھی ضروری ہے صرف حصولِ ذہنی ہی کو وجودِ ذہنی نہیں کہتے معدوم مطلق کی حقیقت کلیہ ہی نہیں کہ تمائز کی ضرورت ہو اور معدوم مطلق ماہیت کے مطابق دوسرے معلومات سے ممتاز ہو۔ یہ جواب بہت ہی کمزور ہے

(۲) مطلق موجود ہم وجود بالفعل کو مانتے ہیں ذہن میں ہو یا خارج میں معدوم مطلق ایسا نہیں لیکن اُس کا حصول ذہن میں ممکن ہے ورنہ اُس پر مفہوم معدوم کا اطلاق نہ ہو سکتا۔ بالفعل ذہن یا خارج میں تو معدوم مطلق موجود نہیں مگر حصول ممکن ہے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ جانا جا سکتا ہے۔ اس کا علم ممکن ہے۔ یہ جواب بھی ہیچ ہے حصول اور ثبوت وجود میں کیا فرق ہے۔ جس کا حصول ممکن اُس کا تحقق ممکن یہ اشکال جوں کا توں باقی ہے۔

سیّد کے جواب پر دوسرا معروضہ یہ ہے کہ وجہ سے سیّد کی مُراد کیا؟ وجہ مطلق۔ کہ ذاتی اور عرضی دونوں کو شامل ہے۔ تو ذاتی وجہ تو ذوالوجہ سے بالذات متحد ہوگی کیونکہ ذاتی صفت تو ذات کے ساتھ ہے اگر معدوم مطلق وجہ ذاتی سے ذہن میں حاصل ہونا تو اُس کا تحقق ضروری ہے اور اشکال باقی۔ وجہ کو عرضی مانئے تو اُس میں جو گفتگو ہو سکتی ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ باقی دارد)

تقسیم معلومات حکما کی رائے میں ایک اشکال اور اس کے جواب

آپ نے پڑھا کہ معلوم (حکما کے نزدیک) معدوم مطلق بھی ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ معلوم کی ایک قسم ہے۔ اور معلوم وہ جو کسی نہ کسی اعتبار سے جانا جائے۔ علم کے کئی طریقے ہیں علم بالوجہ۔ علم بوجہ۔ علم بالکنہ۔ علم بکنہہ۔ مثلاً انسان کی کنہ حقیقت حیوان ناطق اور وجہ علم ضاحک ہے جو حیوان ناطق کی انسان کی حقیقت نہیں بلکہ اُس کے لئے عارض ہے۔

علم بالوجہ[۱] میں تمام حکما ذوالوجہ (شئے معلوم) کو ذہن میں حاصل بالذات جانتے ہیں اور صورت علمیہ کے ساتھ اُسے بالعرض متحد جانتے ہیں۔ علم بوجہ بدیہیات کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ علم بالوجہ نظریات سے۔ معدوم مطلق بدیہی نہیں اس سے بوجہ معلوم نہیں ما حصل ظاہر ہے معدوم مطلق کو معلوم جاننے والے علم بالکنہ کے طریقے پر بھی اُسے معلوم نہیں مان سکتے۔ جس میں صورۃ علمیہ مدرک کے ملاحظہ کے لئے آئینہ اور مدرک کے ساتھ متحد ہوتی ہے یہاں معلوم معدوم ہے اب رہا بکنہہ وہ بھی بدیہیات سے خاص معدوم نہ بدیہی اور نہ بحد بدیہی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ معدوم مطلق کیوں کر معلوم ہو سکتا ہے اس کا عدم مطلق ضروری ہے وہ اگر معدوم مطلق ہے تو اُس کے معنی یہ کہ اُس سے وجود کی تمام اقسام میں ہر قسم وجود مسلوب ہے اور اس کی حقیقت کا کہیں تحقق نہ ہوا اس لئے معدوم مطلق کا نہ تو علم بالکنہ ہو سکتا ہے نہ بکنہہ کیوں کہ نہ اس کی حقیقت نظری نہ بدیہی۔ ہاں علم بالوجہ ہو سکتا تھا مگر یہ دیکھئے کہ وہ ہے معدوم مطلق اور وجود کی ایک قسم وجود ذہنی بھی ہے اور علم حصول صورت ہو یا صورۃ حاصلہ دونوں صورتوں میں معلوم موجود ذہنی ہوگا۔ اگر معدوم مطلق معلوم ہوگا تو اُسے موجود مطلق کہئے وہ معدوم مطلق کہاں ہوا۔

اشکال کا خلاصہ یہ ہے کہ جس کا علم ممکن اس کا تحقق ممکن اور معدوم مطلق وہ جس کا عدم مطلق ضروری اور تحقق ناممکن پس معدوم مطلق کے علم کا امکان نہیں۔ اس اشکال کا سب سے بہتر جواب سید[۲] زاہد ہروی نے پیش کیا ہے۔ وہ اگرچہ اُن کے مسلک پر تو ایک حد تک کافی ہے لیکن حکما کی

---

[۱] علم بالکنہ کی مثال جب انسان کی تعریف حیوان ناطق کے ذریعہ مطلوب ہو تو حیوان ناطق انسان کا آئینہ ہو حاصل بالذات حیوان ناطق ملتفت الیہ بالذات انسان اور حاصل بالعرض بھی انسان اور ملتفت الیہ بالعرض حیوان ناطق کنہ انسان حاصل بالذات ملتفت الیہ بالعرض اور کنہ والا بالعرض حاصل و ملتفت الیہ بالذات۔ علم بالوجہ میں اگر انسان کی تعریف ضاحک کے ذریعہ مطلوب ہو تو صورت علمیہ ضاحک انسان کا آئینہ ہو گی مگر بالذات متحد نہیں بالعرض ہے علم بکنہہ بدیہیات سے متعلق ہے اور علم بالوجہ بھی علم بکنہہ میں صورۃ علمیہ حیوان ناطق انسان کا آئینہ نہیں بنایا گیا علم نفس صورت سے متعلق اور صورت نفس معلوم انسان سے متحد اسی طرح علم بوجہ میں ضاحک انسان کا آئینہ نہیں لیکن انسان کے ساتھ بالعرض متحد ہے۔

[۲] سید زاہد بر شرح مواقف۔

جب انسان اسم و فعل اور کلام و کلام سے نا واقف تھا تو یہی تصویریں اُس کے خیال کا پرتو تھیں اور یہی تصویریں خطاطی کا سنگِ بنیاد اور خطاطی اور مصوری کا مشترکہ سرچشمہ تھیں۔

آج کل غالب کے اشعار اور عمر خیام کی رباعیوں کو تصویروں کے ذریعہ سے سمجھایا جاتا ہے لیکن پانچ چھ ہزار سال پہلے خیالات کے نقوش کو تصویروں سے نمایاں کیا جاتا تھا۔ اِس وقت شاعری میں مصوری کی جاتی ہے اُس وقت مصوری میں شاعری کی جاتی تھی اور خطاطی اِن دونوں فنونِ لطیفہ یعنی شاعری اور مصوری کے ہنر مشاطگی سے سنور رہی تھی اور یہی وجہ ہے کہ اس میں دونوں کے اجزا پائے جاتے ہیں۔

خطاطی کا تاریخی مواد

حجری عہد تاریخ انسانی میں تہذیب و تمدن کا پہلا دور مانا جاتا ہے۔ پہلے پتھروں پر، پھر پیتل وغیرہ پر تصویریں بنائی گئیں۔ جب انسان نے آگ سے کام لینے کا راز معلوم کیا تو مٹی کی تختیوں پر کچھ نقوش اور تصویریں اور خطوط کو منقوش کرکے پکانا شروع کیا گیا۔ کم و بیش پانچ چھ ہزار سال قبل مسیح کی تہذیب و تمدن کے آثار ان پتھروں، پیتل اور مٹی کی پختہ تختیوں سے معلوم ہوئے ہیں جو مصر، چین، ایران، بابل، آشور، نینوا، ہندوستان اور جنوبی امریکہ وغیرہ کے چٹانوں، پتھروں، غاروں اور کھنڈروں میں ملے ہیں۔ یہ تصویریں ہزارہا سال سے زمین کے نیچے پوشیدہ تھیں ادھر علم الارض و معرفت الآثار کے محققین کے ارمان مضطرب اُدھر خاکِ بابل و نینوا کے کھنڈروں میں زمین کے نیچے درونِ پردہ کچھ تحریروں اور کتبوں کا بیتاب جلوۂ مشتاق ؎

حدیثِ حسن و مشتاقی درونِ پردہ پنہاں بود
بر آمد شوق از خلوت نہاد ایں راز بر صحرا

ان کتبوں کو دیکھ اور علوم کی مدد سے بہت سی باتوں کا پتہ چلایا گیا۔ یہ کتبے نہ صرف مصر و عراق ایسے مشہور متمدن اور قدیم جگہوں میں ملے ہیں بلکہ دنیا کے بیشتر حصّوں کے علاوہ جنوبی امریکہ میں لیک سوپیریر[۱] کے کنارے چٹان پر بھی ایک تصویر لکھی نکلی ہے جس میں چند کشتیوں کی تصویر بنی ہے ہر کشتی پر چھوٹی چھوٹی لمبی لکیروں سے آدمیوں کی تعداد ظاہر کی گئی ہے۔

۱؎ The out line of History, by H.G. Wells,

خط و خطاطی اور اُسکی مختصر تاریخ

(از جناب شیخ ممتاز حسین صاحب جونپوری)

خط قبل تاریخ

خطاطی کے ایجاد کی صبح ازل، عہدِ ماضی کی گہری تاریکیوں میں گم ہو گئی مگر جہاں کہیں اس کے دبے ہوئے نقوش اُبھرے ہیں وہ عرب کے فلاسفر عالم کے لفظوں میں بولتے ہوئے نکلے ہیں کہ خط انسان کے ہاتھ کی زبان اور دل کا ترجمان ہے۔ تمدن نے بتایا کہ خطاطی اکثر علوم کی محافظ اور بیشتر فنون کے خزانوں کی کنجی ہے۔ یہ خود ایک علم بھی ہے اور ایک مستقل فن بھی۔

تخلیق کائنات کے بعد انسان جس ارتقائی دَور سے گزرتا ہوا آدمیت کے پیکر میں نمودار ہوا اور اُس کی انفرادی زندگی سیر و شکار کی حد سے نکل کر زراعتی اور تمدنی حیات کی طرف بڑھی اور یہ جنگلوں کو چیرتا ہوا ساحل دریا پر آیا اور اِدھر اُدھر اس کے کنبے اور قبیلے بسے تو اجتماعی زندگی نے پیغام اور سندیسے بھیجنے اور خیالات کو محفوظ کرنے کے لئے اسے مجبور کیا کہ یہ کوئی چیز خط کی طرح کی ایجاد کرے۔ یہی تمدنی ضرورت پہلے پہل ایجادِ خط کی داعی ہوئی۔

خطاطی کا پہلا نقش

انسان کی وحشیانہ زندگی کی جودت بھی قرار دیجائے یہ اُس وقت بھی اپنے گرد و پیش جانوروں اور اُن کے حرکات کو دیکھتا اور تصویریں بناتا رہا۔ کیونکہ ان وحشیوں کی بنائی ہوئی تصویر جو انھوں نے اپنے حکمراں اور بادشاہ کی یاد میں سانپ کی شکل کی بنائی ہے جس کی پشت پر چاقو کے پھلوں کی طرح کے خاردار نشانات بنے ہیں اور گنی کے مقام میں ان کی قدیم جائے پناہ چٹان پر بنائی گئی ہے۔ جن کی یہ شکل ہے

اس کے بعد ایک دوسرا دَور آیا اس وقت بھی اس کا دل جذبات و احساسات سے خالی نہ تھا۔ کبوتروں کو محبت سے مست ہو کر ناچتے دیکھ کر اُسے جب دوستی اور محبت کے جذبے کو ظاہر کرنا ہوتا تھا تو کبوتر کی تصویر بنا کر اس جذبے کی ترجمانی کرتا تھا، دشمنی اور عداوت کے اظہار کے لئے سانپ کی شکل اور جنگ وجدل کے لئے شیر اور چیتے کی تصویریں بنا دینے سے اس کے خیال کو سکون ہوتا تھا۔

ماخذ مانا گیا ہے۔ اس میں بھی مصر اور بابل و عراق کے ہیروغلفی نے ابتدائی سب سے زیادہ حصہ ایجاد خطوط میں لیا۔

ہیروغلفی کے مرکز | ہیروغلفی کے خاص مرکز تین قرار پائے ہیں :۔

(۱) مصر (۲) عراق (۳) چین

چین اور جاپان اور شمالی امریکہ کے حصے میں ابتک کسی نہ کسی عنوان سے ہیروغلفی کا وجود باقی ہے ورنہ اور جگہوں سے مفقود ہو گیا۔

مصری ہیروغلفی خط داہنے سے بائیں طرف کو لکھا جاتا تھا۔ مصری ہیروغلفی کی ایک صورت عمودی قسم کی تھی جس طرح ابھی تک چین میں رائج ہے۔ دوسری صورت عرضی تھی جس طرح آج کل تمام حروف سطر سطر میں لکھے جاتے ہیں۔

دنیا کے چھ مقامات کے لوگوں نے ہیروغلفی خط پھیلانے میں خاص حصہ لیا۔

ہیروغلفی پھیلانیوالے | (۱) مصری (۲) بابلی و عراقی (۳) چینی (۴) ہٹی ٹس شامی و فلسطینی (۵) سومرین (۶) امریکائی۔

قدیم مصر اور قدیم بابل اور عراق کے ہیروغلفی خط اور اس سے نکلنے والے خطوط کا ساتھ ساتھ ذکر کیا جائے گا اس لئے کہ کچھ عرصہ کے بعد ملکی تعلقات اور آمد و رفت اور معاشرتی ضرورتوں کی وجہ سے خط کو کسی خاص خطے تک محدود رہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی خاص کر اُس وقت جب آواز کے لئے حرف مقرر کرنے کا راز معلوم ہو گیا تو سیکڑوں خط جگہ جگہ پیدا ہو گئے اسی لئے ہیروغلفی کی شاخ در شاخ بہت سے جو خطوط نکلے اور فنا بھی ہو گئے ان کے ایجاد کے زمانے اور جگہ کے تعین میں دشواری ہو گئی۔

ہیروغلفی خط مصر اور عراق میں ۲۷۰۰ سال قبل مسیح اور بعض تحقیقات اور ثبوت سے پتہ چلتا ہے کہ ۵۰۰۰ سال قبل مسیح رائج ہوئے، چینیوں کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ وہ ان ممالک کے دوش بدوش زمانے کا ساتھ دیتے رہے۔ مصری ہیروغلفی کی تقسیم بلحاظ صورت و عمل تین طرح پر ہے۔

• ۱۔ تصویر نویسی (پکٹوگرافی۔ Pictography) یہ صورت ہیروغلفی خط کی بالکل ابتدائی صورت ہے جس کا ایک جزو اب بھی بصورت نشان گھٹتے گھٹتے حرف میں باقی رہ گیا۔ چین اور شمالی امریکہ میں تو یہ آج بھی اصلی صورت میں کم و بیش باقی ہے۔
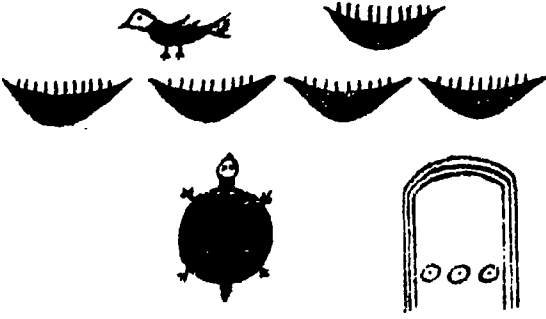
ایک محراب کے بیچ میں تین گول گول سورج بنا کر ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ ہم تین دن میں سر ہوئی پھر اس کے بعد ایک کچھوے کی تصویر بنا کر بتایا گیا ہے کہ بسلامت خشکی پر آ گئے
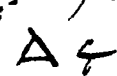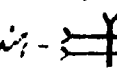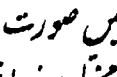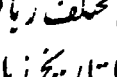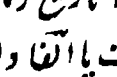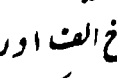
کشتیوں کی تصویر کے اوپر ایک پرند کی تصویر بنا کر سردار قافلہ کو ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ اُس زمانہ کی تصویر ہے جب کوئی خط ایجاد نہیں ہوا تھا اور واقعہ اور خیال کی تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ یہ بہت ممکن ہے کہ کشتیوں پر آ کر جو لوگ یہاں اُترے تھے وہ ان مقامات سے چلے ہوں جہاں وہ پھیلے تھے اور تصویروں کے ذریعہ سے وہاں ادائے خیال کا طریقہ رائج ہو چکا تھا اور یہ عنوان وہ اپنے ساتھ لے کر آئے اور جنوبی امریکہ میں بس گئے ہوں۔ خشکی سے جو قافلے ایران اور ہندوستان کو نکل گئے اُن کی بھی یادگار ملتی ہیں۔ بہرحال یہ سب قدیم سے قدیم نمونے ہیں جو بالآخر خطاطی کا ماخذ قرار پائے اور ایسی تصویروں کا نام ہیروغلفی خط ہوا۔

اقسام خط ہیروغلفی

ہیروغلفی بلحاظ خط پانچ خاص اقسام پر تقسیم ہوا اور ہر ایک کی الگ شاخیں پھوٹیں (۱) مصری ہیروغلفی خط جس میں ۵ قسمیں ہیں (۲) بابلی، عراقی یا میخی ہیروغلفی خط جس کی ضمنی شاخیں نو ہیں (۳) چینی ہیروغلفی خط جس کی نوعیت پانچ ہے (۴) میکسکن یعنی شمالی امریکائی ہیروغلفی خط جس کے دو شعبے ہیں (۵) ہٹی ٹس یعنی شامی و فلسطینی ہیروغلفی خط جس میں پھر چار ضمن ہیں۔

مصری ہیروغلفی

ہیروغلفی کا دوسرا نام تصویری خط ہے۔ تمام دنیا کے جتنے مختلف حروف تہجی ہیں وہ سب انھیں خطوط تصویری سے نکلے ہیں۔ صرف چند ایسے ہیں جو حرفوں کی آواز کا راز معلوم ہو جانے کے بعد بلاواسطہ ایجاد ہوئے۔ مگر ان کی ایجادیں بھی کسی نہ کسی قسم کے ہیروغلفی کے حروف تہجی سے خیال نے مدد لی۔ یہی وجہ ہے کہ ہیروغلفی کو دنیا کے خطا

کے داہنی طرف جھکا رہتا تھا مثلاً (ﻟ) خط نسخ (عربی) میں الف کا قد ایک سینگ کی یادگار رہ گیا اور دوسرے سینگ کے بجائے صرف ایک مُنا سی نوک باقی رہ گئی جیسے سینگ ٹوٹ جانے پر ہوتی ہے۔ عربی خط کے الف کی یہ صورت ہے (ﺍ) نستعلیق کی رعنائی نے اسے بھی گوارا نہ کیا اور الف میں حُسن پیدا کرنے کے لئے اس کو سرو بھی یا قدِ یار بنا دیا۔ نستعلیق کے الف کی صورت یہ ہے (ا)۔

فینقی خط میں بیل کے سینگوں کے سرے اوپر کر دئے گئے اور انگریزی A کو الٹ دیا گیا۔ مثلاً ≮ یونانیوں میں یہ شکل ہے A Δ Δ۔ بابلی خط میخی میں آلپو بیل کو کہتے تھے اور راس کی صورت یہ ہے ⟨⫨ ۔ ہندوستانی قدیم خط شتقہ میں یہ صورت ≮ قدیم ہندی میں یہ ≮ صابی خط میں صورت یہ ہے ⊏ صافی میں یہ ≮ × یہی حال اور زبانوں کے خط کا ہے۔ غرضکہ دنیا کی مختلف زبانوں کا جائزہ لے کر جو تغیرات حرفوں میں ہوتے گئے کوئی شخص پتہ لگاتا ہوا تاریخ زمانہ کے اوراق پیچھے کی طرف برابر الٹتا چلا آئے تو آخر میں اس کو ہر خط کے الف یا الفا والی آواز کے حرف میں مصریوں کا گم شُدہ بیل مل جائے گا۔ تمام مورّخ الف اور A کو دیکھ کر اور دیگر زبانوں کے حروف کی صورت کے تغیر پر غور کر کے الف سے یہی کہنے پر مجبور ہوں گے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من اندازِ قدت را می شناسم

ہر ایک حرف کی تاریخ اسی طرح تصویر جاناں در بغل کی طرح اُسی حرف کے ساتھ ساتھ ہے، یہ بحث یونہی ضمناً اور مثالاً صرف صوت نویسی کا ابتدائی عنوان اور ہیروغلفی کی آخری قسم کو سمجھانے کے لئے ضبطِ تحریر میں آ گئی ورنہ حروفِ تہجی کی تاریخ کا موضوع الگ ہے۔ بیان یہ کرنا ہے کہ یہی دورِ زمانہ تھا جب حروفِ تہجی کی ابتدا پہلے پہل دُنیا میں ہوئی اور یہاں سے خطّاطی کی تاریخ کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔

یہ صدیوں اور قرنوں کی کہانیاں ہیں جو اس جگہ یونہی سُنا دی گئیں، اب پھر مصر کے نگارخانے پر نظر کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہیروغلفی کے ابتدائی دَور میں مصری پہلے تو ۲۴ تصویروں سے اپنا مطلب ظاہر کرتے تھے جن کی تعداد بڑھتے بڑھتے ۹۰ اور ایک مدت میں ۷۰۰ تصویروں تک پہونچ گئی۔

ف۱ پیدائش خط و خطاطان مصر۔

یہ صورت کسی چیز یا جانور کا نام نہ لکھنے اور محض اس کی تصویر بنا کر اس کو بتا دینے سے متعلق ہے۔ مثلاً مذکورہ بالا مثال میں لیک سوبیریر کے چٹان والی تصویر میں جو کشتی کی تصویر بنی ہے اس سے مراد کشتی لی جائے گی کوئی اور چیز نہیں۔

۲۔ خیال نویسی (آئڈوگرافی۔ Ideography) یہ ہیروغلفی کی وہ صورت ہے جس میں تصویر میں ایک شاعرانہ انداز اور شان ہے اور بطور استعارے کے تصویر استعمال کی جاتی تھی یعنی جس چیز کی تصویر بنائی جاتی تھی اس کی مخصوص صفت یا مخصوص عمل کی طرف خیال کو بجا کر اس سے کام لیا جاتا تھا۔ مثلاً لیک سوپیریر والی تصویر میں کچھوے کی تصویر سے کچھوا جانور مراد نہیں ہے بلکہ کچھوے کو بنا کر خشکی پر اہل کشتی کے پہنچ جانے کی خیال نویسی کی گئی ہے اسی طرح تین سورج سے تین دن اور کشتی کے آگے آگے اڑنیوالے پرندے سے پر قافلہ کا استعارہ کیا گیا ہے۔

(الف) ایک ضمنی صورت اسی کے تحت میں یہ بھی تھی کہ لفظوں یا ارکان لفظی کے لئے کوئی تصویر بنا دی جاتی تھی اور ہیروغلفی خط کے اصطلاح میں اس کا نام ارکان لفظی خط یا Syllable writing ہے۔

۳۔ صورت نویسی (ہائروگرافی۔ Hierography) ہے یہ وہ آخری اور ترقی پذیر صورت ہے جب آواز کے لئے نشان مقرر کرنے کے راز سے انسان کو آگاہی ہوگئی اور ہر آواز کے لئے اس کی مناسبت اور مشابہت صوتی سے جس صورت کے نام میں اس آواز کے ابتدائی مخرج سے کان آشنا ہوئے ان کی تصویر بنا دی گئی۔ یہ وہ منزل ہے جب صورت اور صوت کا ملاپ ہوا ہے اور یہی صورت آگے چل کر صاف ہوتے ہوتے حرف کی شکل میں منتقل ہوگئی بلکہ یوں کہا جائے کہ خود صورت یا تصویر کا ایک جزو حرف بن گیا۔ مثلاً بیل کا نام مصری زبان میں جا ہے جس طرح اور جس آواز اور حرکت کی وجہ سے الفا پڑا ہو جب الف کے قسم کی آواز کو تصویر سے ادا کرنا ہوتا تھا تو پہلے پورا بیل، پھر بیل کا سر مع سینگ کے بنا دیا جاتا تھا۔

بیل (الفا)

یہی تصویر درجہ بدرجہ مختصر ہوتی گئی جب اور گھٹی تو محض دو سینگیں باقی رہیں جو رومن رسم خط A میں ابتک قائم ہے۔ اہل عرب نے اس کو اور مختصر کیا اور خط کوفی میں سینگ کا ایک سرا رہ گیا جو نیچے کی طرف مثل سینگ

تصویر کا تعین ہو چکا تو ۲۲ قسم کی آوازوں کے لئے ۲۲ تصویریں بنائی جانے لگیں۔ یہ ۲۲ تصویریں رفتہ رفتہ تصویری لباس اُتار کر ایک ایک حرف کا نشان بن گئیں اور یہ وہی ۲۲ حروف ہیں جو صدیوں اور قرنوں کے بعد ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت میں محدود ہوئے۔ جب عربوں نے ہزارہا سال بعد اس پر چھ حروف اور بڑھائے تو ثخذ ضظغ ہو گیا۔ اسی پر ایرانیوں نے پ، چ، ژ، گ اور ہندیوں نے اردو کی ایجاد کے وقت ہندی اور بھاشا کے الفاظ کے تلفظ کے لئے ٹ، ڈ، ڑ بڑھائے مگر ابجد سے ضظغ تک کے حروف تھے جس کے لئے بجائے حرف کے اعداد بہت پہلے معین کئے جا چکے تھے اور خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں اسی سے ایک نیا فن تاریخ گوئی ایجاد ہوا جس سے عمارات وغیرہ کے سنہ تعمیر کے اعداد حرفوں سے نکالے جاتے تھے اور عمارتوں پر کندہ کرا کے تاریخیں لگائی جانے لگیں۔ قدیم مصریوں کے یہاں تاریخ تعمیر کی تحریر کا کام تصویروں سے لیا جاتا تھا۔

اسی زمانے میں جبکہ مصر میں تصویری خط رائج تھے۔ ساتھ ہی ساتھ عراق بابل و نینوا میں ایک خاص قسم کا تصویری خط رائج تھا جس میں کیلوں یا تیروں کی طرح کے خط سے تصویر بنائی جاتی تھی اور کچھ خیالات کے ادا کرنے کے طریقے قریب قریب اسی طرح کے رائج تھے جس کا ذکر تفصیل سے مصری ہیروغلفی کے اقسام اور عنوان خط کے تحت میں بیان کیا جا چکا ہے اور یہاں اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں مصری اور بابلی خط سے جو اور خط نکلے اُن کا ذکر ایک ساتھ کیا جائے گا۔ پہلے اصل ماخذ یعنی بابلی تصویری خط جس کا نام "خط میخی یا مسماری ہے" کر دینا ضروری ہے۔

میخی خطِ تصاویر

پانچ قسم کے خاص تصویری خط کے اقسام میں سے ایک قسم خط میخی کی بھی ہے۔ یہ دوسرے مرکز عراق و بابل کا تصویری خط ہے۔ اس کو خط میخی اس لئے کہتے ہیں کہ اس خط میں جو کچھ لکھا جاتا تھا اور جو تصویریں بنائی جاتی تھیں ان کے حدود کیل یا میخ سے مشابہ ہوتے تھے۔ اس کی نو قسمیں تھیں۔

خطِ میخی کا رواج بابل، نینوا، عراق، ایران اور ایشیائے صغرا وغیرہ میں تھا۔

آپ خود غور کیجئے کہ کسی پکچر گیلری یا تصویر منزل میں جہاں ۰۰۰ ۷ تصویریں ہوں اور ایک سکنڈ سے بھی کم عرصہ میں جلدی جلدی کئی تصویریں حافظہ سے باہر کرنا ہی نہیں بلکہ خط تصویر نویسی اور خیال نویسی اور صوت نویسی کے اصول کے ماتحت اس طرح ان تصویروں کو بنانا اور سمجھانا ہو کہ گھوڑے کو گھوڑا ہی سمجھ لیا جائے، گدھا یا بیل نہ سمجھا جائے تو ایسے عالم اور ایسی دنیا میں اور ایسے زمانے میں کیا کیا دقتیں نہ ہوئی ہوں گی۔ پھر اس زمانے میں خطاطی ایک بڑا مقدس شیوہ تھا۔ ہیروغلفی کے معنی ہی مذہبی تحریر کے ہیں۔ مذہبی لوگ اس کے لکھنے کے مجاز تھے اور ابتداً یہ ہیروغلفی مخصوص مذہبی طبقے کا خط تھا۔ طبقہ علماء

ہیراطیقی خط | کے لئے ایک الگ خط کی ضرورت تھی اس لئے اسی ہیروغلفی سے ہیراطیقی خط ایجاد ہوا۔ (نمونہ خط ہیراطیقی [illegible]) ہیراطیقی خط ہیروغلفی سے زیادہ مشابہ نہ تھا۔ یہ خط کتب مذہبی وغیرہ لکھنے کے کام میں آتا تھا اسی لئے اس کا نام ہیراطیقی ہوا جس کے معنی مذہب و پیشوایانِ دین سے۔ عوام الناس ان خطوط کو لکھنے کے مجاز نہ تھے اس لئے ان لوگوں کے لئے ہیروغلفی خط

دیموطیقی خط | سے ایک اور خط ایجاد کیا گیا جس کا نام دیموطیقی تھا۔ اس لئے کہ دیموس کے معنی عوام الناس کے ہیں (نمونہ خط دیموطیقی [illegible] 36 [illegible]) ان خطوط کے لکھنے میں دشواری ہوتی تھی اس لئے آج کل کے خط شکستہ کے قلم ایک خط ہیراطیقی خط سے ایجاد ہوا جو بخلاف ہیراطیقی خط ملا ملا کر لکھا جاتا تھا اس کا نام

کرسیفی خط | کرسیفی خط تھا اس خط میں کچھ لکیریں تھیں کچھ تصویریں (نمونہ خط کرسیفی)

[illegible]

خط مصر میں ۰۰ ۹ سال قبل مسیح تک باقی رہے۔ ان خطوط کا انکشاف آج کل کے زمانے میں اس پتھر کے کتبے سے ہوا جس پر ہیروغلفی۔ دیموطیقی اور یونانی خطوط کے کتبے ایک ہی مضمون کے تھے۔ ۱۷۹۹ء میں جب نپولین بوناپارٹ کی فوج مصر کی مہم سر کرنے گئی تھی تو یہ پتھر ملا جو مصر سے فرانس پھر وہاں سے انگلستان پہونچ گیا اور اس وقت لندن کے برٹش میوزیم میں ہے۔ اس کا نام حجر الرشید ہے یا روزیٹا اسٹون کہتے ہیں (Rossetta Ston) جب تصویری خط کے دورانِ رواج میں آواز کے لئے

عراق کے عجائب خانے کے کئی سو کتبے ایسے ہیں جن میں عراق اور بابل قدیم کے مکانوں کے بیعنامے، آراضی کو لگان پر دینے کے اسناد، بردہ فروشی کے متعلق تحریریں، شادی کے معاہدے، تنسیخ معاہدے کی دست آویزیں اور معاملات دیوانی کے فیصلے مٹی کی پختہ تختیوں پر منقوش ہیں جن کی نسبت اس خط کے محققین کی رائے ہے کہ از روئے ادب بھی یہ اسی طرح بیش قیمت ہیں جس طرح قدیم تمدن کے ثبوت کے لئے زریں اسناد ہیں۔ کوہ بے ستون پر جو کتبہ خط میخی میں ہے اور اس کے ساتھ تصویریں بھی ہیں ان میں دس قیدی دآرا بادشاہ کے سامنے گرفتار کر کے لائے گئے ہیں جن کے ہاتھ پشت کی جانب سے بندھے ہیں اور سب کے گلے ایک ہی رسی سے باندھ دئے گئے ہیں۔ دآرا مع اپنے وزراء کے شاہانہ کرو فر سے کھڑا ہے، اوپر بلندی پر اہرمن کی تصویر ہے۔

ایک مٹی کی پختہ تختی پر دُنیا کا نقشہ بنا ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ سمندر دُنیا کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس میں ایک تختی پر دُنیا کے طوفانِ عظیم کا ذکر ہے جس کے حالات تاریخی وہی ہیں جو طوفانِ نوحؑ کے ہیں۔ بے ستون کے چٹان کے کتبے میں جو بہت آخر زمانے کا ہے خط میخی کے ساتھ ساسانی اور بابلی خط کی عبارتیں بھی منقوش ہیں۔ ان سے ان تمام ممالک کے تمدن اور تعلقات کا سُراغ ملتا ہے۔

۱۸۳۷ء میں سر ہنری لارنس کوہ بے ستون دیکھنے گئے تھے اور تین زبانوں کی کتبوں سے مطالب اخذ کر کے انھوں نے ۱۸۴۷ء میں خط میخی وغیرہ کے پڑھنے کے متعلق ایک کتاب شائع کی ہے۔ یہ سب کتبے کیا ملے گویا کچھ علوم و فنون کے خزانوں کی کھوئی ہوئی کنجی مل گئی اور مستکشفین نے بہت سی باتوں کا پتہ چلا لیا۔

اب ان خطوط کا ذکر کیا جاتا ہے جو مصر اور عراق میں خط تصاویر کے آخر دور میں ایجاد ہوئے جب آواز کے لئے نشان بصورت حرف مقرر ہو چکے تھے۔ اب ایک نئی کنجی ہاتھ آگئی اور متمدن اقوام نے اپنے اپنے خطوط ایجاد کرنے شروع کر دئے۔

خط فنیقی | اسی زمانے کہ ہیروغلفی اور ہیراطیقی اور دموطیقی خطوط مصر میں اَوجِ کمال پر تھے۔ خطۂ ''فنیقہ'' شام اور فلسطین کے قریب ہے۔ وہاں کی رہنے والی ایک تاجر قوم جس کو فنیقی کہتے تھے جہاز رانی اور تجارت میں خاصی ترقی کر رہی تھی۔ ان کا میل جول کریٹ اور مصر والوں سے بہت زیادہ تھا۔ تمام ساحل بحرِ روم پر ان کی نو آبادیاں

مصر میں مصریوں کا خط تصویر اور یہ خط میخی والا خط تصویر دونوں رائج تھے۔ میخی خط بھی مصر کے ہیروغلفی کی طرح دُنیا کا قدیم ترین خط شمار کیا جاتا ہے۔ یہ خط بائیں طرف سے داہنی طرف کو لکھا جاتا تھا۔ ۵۰۰۰ سال قبل مسیح سے چوتھی صدی عیسوی تک اس کا رواج تھا۔ بابل کی تہذیب و تمدّن کا ابتدائی زمانہ سب مقامات سے زیادہ قدیم ہے۔ بابل کے ابتدائے دَورِ تمدّن سے اس کی ابتدا ہوئی اور یہ خط نینوا اور ایران تک پھیل گیا۔ اس خط کا سب سے قدیم کتبہ بابل کے قدیم شہر ورقہ اور مغیرہ میں پایا گیا اور نینوا اور ایران وغیرہ میں بھی بیشمار کتبے ملتے ہیں۔ مصر کی ہیروغلفی کے سلسلۂ ذکر میں جو صورتیں تصویر نویسی اور خیال نویسی وغیرہ کی ظاہر کی گئی ہیں وہ سب اس میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً لفظ نینوا کو اس خط میخی میں مکان کے اندر مچھلی کی شکل بنا کر لکھا کرتے تھے جس سے مُراد یہ ہے کہ نینوا[1] میں بسنے ماہی گیروں کے بہت مکانات تھے۔
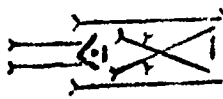
(نمونہ خط میخی) لفظ نینوا

قدیم بابل کے مختلف حصوں میں اس خط کی مختلف قسموں میں مچھلی کی شکل مختلف طرح سے بناتے تھے[2] اور اس کو (خا) کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے۔ ۴۰۰۰ سال قبل مسیح کے کتبوں سے پتہ چلا ہے کہ یہی شکل اور یہی (خا) کا لفظ ہندوستان میں بھی مچھلی کے لئے مستعمل تھا۔ مصر اور بابل کے قدیم بادشاہوں سے باہم گر اسی خط میخی اور مصری خط تصویر میں مراسلت کے ثبوت میں بکثرت پختہ مٹی کی تختیاں مصر اور بابل کے کھنڈروں سے برآمد ہوئی ہیں اور اسی طرح کی پختہ مٹی کی تختیوں اور پتھروں پر نقوش کوہ بے ستون کرمان شاہ دشت مرغاب اور ایران کے اکثر حصوں میں پائے گئے ہیں۔ یہ خط ایران کے قدیم خطوط کا ماخذ ہے۔ مصر میں الف کی آواز کے لئے جس طرح آلفا کا لفظ تھا جس کے معنی بیل کے ہیں۔ اسی طرح بابل میں بھی بیل کو آلپو کہتے تھے اور تصویری نشان دونوں کے ملتے جلتے ہیں خصوصاً فنیقی خط کے A کی شکل الٹ دینے سے خط میخی کے آلپو کی شکل بن جاتی ہے۔ قدیم بابل اور مصر کے تعلقات اور تمدّن کا پتہ ان بے شمار کتبوں سے ملتا ہے جو عراق کے عجائب خانے میں ہیں۔

---

[1] عربی میں نون مچھلی کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع نینان ہے۔ حرف نون کی شکل مچھلی سے ماخوذ ہے

[2] رسالہ نگار ۱۹۳۱ء

طرح ہندی خط کے ماخذ میں بھی اشتراک کی کوئی صورت ہو۔

(نمونہ خط پہلوی) ...

خطِ یونانی[1] | ایران میں علاوہ خطِ میخی اور پہلوی کے خط آرامی اور ساسانی خطوط بھی رائج تھے۔ تجارت کی وجہ سے فنیقی قوم کا تعلق دُور دُور تک تھا۔ یونانیوں سے بھی ان کا تعلق بہت قریبی تھا۔ یونانیوں کو مصریوں کی تہذیب و تمدن سے بہت فائدہ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ پہلے یونانیوں نے فنیقیوں اور مصریوں سے حروفِ تہجی سیکھے پھر قبطیوں کے خط سے چھٹی صدی عیسوی میں استخراج کرکے اپنے لئے الگ یونانی حروفِ تہجی کی بنا ڈالی۔ یونانی خط قبطی سیرھاک اور ارامی خط سے بہت مشابہ ہے۔ ان کے ابتدائی حروف تہجی ۲۲ تھے۔ پھر بضرورت ان میں اضافہ ہوتا گیا۔ انگریزی چھوٹے بڑے حروفِ تہجی سے ان کے خطوط تمام تر مشابہ ہیں صرف بعض بعض حرفوں میں قدیم خطِ تصویری کے نشانات باقی رہ گئے ہیں۔ انھوں نے فنیقیوں سے جو حروف نئے تھے ان کی صورت میں بہت اصلاحات کیں اور مختصر کرکے جاذبِ نظر بنایا۔ پہلے خط داہنی طرف سے بائیں طرف کو لکھا جاتا تھا، یونانیوں نے الٹ کر بائیں سے داہنی طرف لکھنا شروع کیا۔ انھوں نے حروف کو ملا کر لکھنے کی ابتدا کی جس سے تحریر اور کتابت میں روانی بڑھ گئی۔ یونانیوں سے اہل روما نے حروف اخذ کئے۔ یہیں سے مشرق و مغرب کے خطوط الگ ہو گئے اور یہی زمانہ ہے کہ پہلے پہل قدیم مصری یا فنیقی خط دو حصوں پر تقسیم ہوا۔ ایک مشرقی، دوسرا مغربی۔

مشرقی ملکوں میں جو خطوط ایجاد ہوئے اور فنا ہو گئے ان میں سے مخصوص اور اہم خطوط کا ذکر آگے آئے گا یہاں ان مشرقی و مغربی خطوط کی بلحاظ تقسیم آبادی دُنیا فہرست دیدی جاتی ہے یہ وہ خطوط ہیں جو عوام الناس میں اس وقت رائج ہیں اور ملکی اور قومی خط کی حیثیت سے جہاں جہاں پائے جاتے ان کے نام یہ ہیں:۔

عربی یا نسخ خط | عراق۔ فلسطین۔ شام۔ مصر۔ طرابلس۔ الجیریا۔ ٹیونس۔ مراقش۔ ملایا۔ جاوا۔ سماٹرا وغیرہ

نستعلیق خط | ہندوستان۔ بلوچستان۔ افغانستان۔ ایران۔ ترکستان۔

---

[1] نمونہ خطِ یونانی۔ A B T Z بڑا۔ a B T S چھوٹا۔

تھیں۔ ایس سیٹک تاجر قوم کو اپنے تجارتی کاروبار چلانے اور حساب کتاب درست رکھنے کے لئے ایک ایسے رسم خط کی ضرورت تھی جو خصوصیت سے تجارتی کاموں میں مددگار ہو۔ اس قوم نے پہلے تو مصریوں کے رسم خط کو اختیار کیا اور مصریوں کے ۲۲ حروف تہجی میں ۴ اور بڑھا کر اپنا حروف تہجی الگ مکمل کر لیا۔ ۵۰۰ سال قبل مسیح اُن کا زور بہت گھٹ گیا اور یہ عراق اور مختلف حصوں میں منتشر ہو گئے۔ ان کے حروف تہجی کی ایجاد کا زمانہ ۱۰۰۰ سال قبل مسیح خیال کیا گیا ہے۔ (نمونہ خط فنیقی) 4,9 7 7 Δ ∃

خط قبطی کم و بیش اسی زمانے میں مصریوں میں سے کچھ لوگ دین مسیحی میں داخل ہو گئے۔ ان لوگوں کو قبطی کہتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے لئے ایک الگ خط ایجاد کیا جو انھیں کے نام پر قبطی خط کہا جانے لگا۔ قبطیوں نے ۲۵ حروف یونانیوں کے خط سے لئے اور دیموطیقی حرف سے سات اور حروف ملا کر ۳۲ حروف سے اپنا حروف تہجی ایجاد کیا۔ قبطی خطوط کے تمام حروف کی شکل قریب قریب وہی ہے جو مختلف حرفوں کی شکل میں چھوٹے اور بڑے انگریزی حروف کی شکل و صورت ہے۔ (نمونہ قبطی خط) ꜲB S

آرامی خط جس زمانے میں فنیقیوں کے خط ایشیائے صغرا میں رائج تھے ایک اور سیٹک قوم آرامی جو شمالی فرات و دجلہ کے نواح میں آباد تھی اس نے فنیقیوں کے خط سے ایک خط اپنی قوم کے لئے مرتب کیا جو فنیقی خط سے بہت مشابہ تھا۔ یہ خط رفتہ رفتہ انطاکیہ سے مکہ اور حوالی مصر سے وسط ایران تک پھیل گیا اور اس خط کی مدد سے مستشرقین نے بہت سی باتوں کا پتہ لگایا (نمونہ خط آرامی) 𐡇 F ꝯ ⌣ 3 ꟸ T 6 ⋝ ꟸ ꟸ 7 4 ɣ

خط پہلوی یا قدیم ایرانی خط ایران کا قدیم خط میخی تھا۔ مصر اور عراق سے ایرانیوں کے قدیم تعلقات و فتوحات و تہذیب و تمدن کی ایک کڑی ان کا خط بھی ہے۔ مدتوں کے بعد تحریر کی سہولت کے لئے اسی زمانے میں کہ مصری اور فنیقی اپنے اپنے خطوط کی ترقی اور اصلاح میں سرگرم تھے خط پہلوی رائج ہوا یہ خط پہلوی اس زمانے کے بعض خطوں سے جو مصر میں رائج تھے قدرے صورتاً اور ہندوستان کے ہندی خط سے ہر طرح بہت زیادہ مشابہ ہے۔ ممکن ہے کہ الفاظ اور نسلی اشتراک کی

---

a Coverse History of the world,

خط کوفی۔ نبطی اور مسند حمیری رائج تھا اور اہل اسلام کی ابتدائی تحریریں ممکن ہے کہ مسند حمیری خط میں بھی کہیں کسی حصۂ دنیا میں اب بھی موجود ہوں۔

خط نبطی | خط نبطی حضرت ابراہیمؑ کے قبیلہ نبطی سے منسوب ہے۔ یہ نبطی قوم بلاد بطریہ فلسطین اور سینا کے مابین آباد تھی اور دوسری صدی عیسوی میں اہل روما سے پریشان ہوکر عرب میں آئی اور حجاز کے شمال میں جہاں آباد ہوئی اُس کو انباط کہتے ہیں۔ یہ خط بدوؤں اور صحرا نشینوں کا خط تھا جو اہل عرب کے مورث تھے۔ یہ خط پالمیری خط سے مشابہ ہے۔ (نمونہ خط نبطی) [نمونہ حروف]

خط پالمیری | خط پالمیری کی ایجاد آرامی خط سے ہوئی۔ مصر کے مقام پالمیرا سے یہ منسوب ہے جس طرح نبطی خط بدوؤں اور صحرانشینوں کا تھا پالمیری خط کا رواج شہری اور متمدن اقوام میں تھا۔ اس خط کے کتبے لندن، پیرس اور آکسفورڈ کے عجائب خانوں میں ہیں۔ اس کی ایجاد کے زمانہ دراز کے بعد پالمیری کے حروف تہجی سے سیریاک اور استرانکلو خط ایجاد ہوا۔ (نمونہ خط پالمیری) [نمونہ حروف]

سیریاک | خط سیریاک یا استرانکلو پالمیری خط سے ایجاد ہوکر شرق میں چین تک پہنچ گیا اور اسی سے اور حروف تہجی (اویغور) (مغل) (کالموک) اور (منچو) پیدا ہوئے اور خط سیریاک سوریہ وغیرہ میں اب تک رائج ہے۔ (نمونہ خط سیریاک) [نمونہ حروف] مذہبی تحریرات کی ضرورتوں نے آرامی خطوط میں بہت سے تغیرات کئے۔ سیریاک خط کا تعلق مشرق کے عیسائیوں سے ہے۔ چھ سو سال قبل مسیح اس کا رواج ہوا اور آٹھویں صدی عیسوی میں یہ خط فنا ہو گیا۔ اس کی مختلف شاخوں سے مختلف خطوط نکلے۔

سُریانی | سُریانی خط کو سطرنجیلی خط بھی کہتے ہیں۔ عراق عرب میں اس خط کا بہت رواج تھا اور حیرہ (کوفہ) میں بھی۔ سُریانی اس خط سطرنجیلی میں اپنی مقدس کتاب انجیل وغیرہ لکھتے تھے اور نبطی خط میں معمولی روزمرہ کی باتیں لکھتے تھے۔ خط کوفی کو سطرنجیلی خط سے بہت مشابہت ہے اور اس کے بہت سے قواعد خط کوفی نے اختیار کئے چنانچہ خط سطرنجیلی میں جب الف ممدودہ کسی لفظ کے درمیان میں آتا تھا تو الف کو الگ نہیں لکھتے تھے مثلاً ظالین اور مالین کو ظلین اور ملین کی طرح لکھتے تھے اور الف الگ سے

---

a1 The Alphabet by mr Taylor.

ناگری خط | صوبہ یو۔پی اور ہندوستان کے محدود طبقے اور محدود رقبے میں۔

چینی خط | چین و جاپان۔

جاپانی خط | جاپان۔

رومن خط | بہ تبدیل واوٗ نے تغیر یورپ کی تمام چھوٹی بڑی سلطنتوں اور امریکہ و بعض حصۂ افریقہ وبعض جزائر میں۔

لاطینی خط | یونانیوں سے اہلِ روما کے خاصے تعلقات تھے انھیں کے حروف تہجی سے اطالیہ نے خط اتروسک ایجاد کیا۔ اتروسک خط میں ۲۰ حروف تھے۔ اسی خط سے لاطینی خط ایجاد ہوا۔ یہ خط رفتہ رفتہ بہ تبدیل صورت وہیئت تمام ممالک یورپ مثل جرمنی۔ فرانس۔ ہالینڈ۔ پرتگال۔ اٹلی۔ انگلستان۔ فرانس اور افریقہ وامریکہ وغیرہ میں پھیل گیا۔ روس میں بھی اسی خط کی ایک شاخ ہے۔ (نمونہ لاطینی) A B ∠ Δ

عبرانی خط | جس زمانے میں ایشیائے صغرا میں فنیقی اپنے حروف تہجی کی ترقی میں مصروف تھے اسی کے قریب زمانے میں یہودیوں نے اپنی قوم کے لئے فنیقی خط کی مدد سے عبرانی خط ایجاد کیا۔ حضرت موسیٰ کو لکھی لکھائی توریت اسی قدیم خط میں ملی تھی۔ یہ خط اب قریب قریب مفقود ہوگیا۔ جدید قسم کا عبرانی خط پہلی صدی قبل مسیح میں ایجاد ہوا۔ فنیقی خط سے یہ خط نکلا ہے اس وجہ سے یہ خط فنیقی خط سے بہت مشابہ ہے (نمونہ خط عبرانی) [illegible]

مسند حمیری | حمیری خط کا دوسرا نام مسند ہے اسی وجہ سے دونوں لفظوں کو ملا کر اس خط کو مسند حمیری کہتے ہیں۔ یمن میں ایک قبیلہ حمیر دوسرا معین تیسرا سبا تھا۔ ان سب میں یہ خط مسند رائج تھا۔ اس خط کے حرف الگ الگ لکھے جاتے تھے۔ حمیر جن سے یہ خط منسوب ہے ان کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ۲۱۲۶ سال قبل ہے۔ حمیری خط لوہے کی کیلوں سے بہت مشابہ ہیں۔ مسٹر ہالوے نے جو پرانے کتبے سرزمین یمن میں پائے ہیں وہ اسی خط کے نمونے ہیں۔ ۱۸۷۵ء میں فرانس اور انگلستان کے سیاحوں کو بیت الحکومت ارب وصنعا کے کھنڈروں میں بھی اسی خط کے کتبے ملے ہیں۔ پہلے پہل یہ خط یمن میں رائج ہوا۔ پھر عرب کے اکثر مقامات میں پھیل گیا۔ بنو حمیر سے حیرہ (کوفہ) والوں نے اور اہل حیرہ سے قریش اور اہل طائف نے سیکھا[۱]۔ جس وقت اسلام کا ظہور ہوا تو عرب میں

۱؎ صناعۃ الطرب طبع بیروت صفحہ ۳۲۰۔

نے عراق کے حکمراں حجاج بن یوسف کو لکھا اور اس کے حکم سے نصر بن عاصم نے تشابہ حروف ب ت ث وغیرہ کو تمیز کرنے کے لئے نقطوں کی ایجاد کی اور اسی کے ساتھ حرکت زیر زبر پیش کے قواعد مرتب ہوئے اور عبارت میں ٹھہرنے اور وقف کی علامتیں مقرر ہوئیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ انگریزی ادب میں کاما۔ سمی کولن وغیرہ کا خیال اسی سے لیا گیا ہوگا۔ قرن اوّل کے خط کوفی میں جتنے قرآن لکھے گئے اور جو اور تحریریں خط کوفی کی مصر وغیرہ کے عجائب خانوں میں ہیں اُن میں نقطے نہیں ہیں۔ مثلاً فاذا انزل۔ (فاذا انزل) قرن دُوم کے قرآن پر زیر زبر پیش کے لئے نقطے ہیں۔ الکظمین الغیظ و العافین عن الناس (الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس) اس کے بعد پھر نقطے برابر ملتے ہیں۔ قرن دوم کے بعد جب ۳۱۰ھ میں خط نسخ ایجاد ہوگیا تو رفتہ رفتہ یہ کوفی خط دُنیا کے منسوخ خطوط میں شمار ہونے لگا۔ اس کے بعد بھی آٹھویں صدی ہجری تک اکثر لوگ خط کوفی میں قرآن لکھتے تھے مگر بہت کم کم۔ صدیوں بعد کچھ لوگوں نے خط کوفی کے قسم کے کچھ حروف چپٹے کرکے لکھنا شروع کیا اور اس کا نام خط کوفی جدید رکھ دیا۔ جیسا کہ اس وقت کہیں کہیں ہندوستان میں کلمۂ طیبہ لکھا ہوا ملتا ہے اور اب چند سال سے یہ اتنا مطبوع طبع ہوتا گیا کہ اُردو انگریزی یہاں تک کہ ناگری حروف بھی چپٹے چپٹے لکھے جانے لگے اور زیادہ تر سائن بورڈ اور کتابوں کے ٹائٹل پر نام بالچیل بھنڈار وغیرہ اس طرح کے خط میں لکھا ہوا دیکھا جاتا ہے اس کو خط کوفی سے کوئی تعلق نہیں۔

چوتھی صدی ہجری کے مزاروں کے کتبے اکثر خوشنمائی کے لئے کچھ چپٹے اور کچھ پٹری دار حرفوں میں لکھے ہوئے ملے ہیں ممکن ہے کہ گورستان سے یہ خیال آبادی میں لاکر عبرت کے لئے پھیلایا گیا ہو۔ بجائے بیل کے طغرے بیلدار قسم کے حروف میں تفریحی ضرورت کے لئے البتہ لکھے جاتے ہیں۔

منصور دوانیقی کے عہد میں اسحاق بن حماد ایک خوشنویس گزرا ہے جس نے ۱۵۰ھ میں خط کوفی سے ۱۲ خط ایجاد کئے جن کے استعمال کی ضرورت مخصوص اور محدود کاموں سے متعلق تھی۔ مثلاً کوئی خط آرائش مکان کے لئے لکھا جاتا تھا۔ کوئی خط محض تفریحی تھا۔ یہ سب دولت و حشمت کے زمانے کی نمود اور تفریح کے خط

اس کے اوپر لکھ دیتے تھے۔ جیساکہ خط کوفی کی تمام کتابت میں اور آج اکثر قرآن جو خط نسخ میں لکھے گئے ہیں ان میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ فن تاریخ گوئی میں جن لوگوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے اعداد ۷۸۶ قرار دئے ہیں انھوں نے سطرنجیلی خط کے اصول پر رحمٰن کو ملاکر لکھنے کی وجہ سے الف کا ایک عدد چھوڑ دیا ہے اور جن لوگوں نے ۷۸۷ اس کا عدد قرار دیا ہے وہ رحمان کو الف کے ساتھ لکھتے ہیں نستعلیق اور اردو فارسی خط میں بھی یہی اصول کارفرما ہیں۔ سریانی خط سریانیوں اور یہودیوں اور کلدانیوں کا مخصوص خط ہے۔ عرب کے بہت بڑے حصے میں خط کوفی کی ایجاد سے پہلے یہ خط رائج تھا۔ (نمونہ خط سریانی) ܐ ܒ ܓ ܕ ܗ ܘ ܙ

صاحب صحیح بخاری لکھتے ہیں کہ حضرت خدیجہ زوجہ پیغمبر صلعم کے ابن عم ورقہ بن نوفل بھی سریانی اور عبرانی میں ماہر تھے۔

خط کوفی | خط کوفی کی ایجاد چوتھی صدی عیسوی میں نبطی خط اور خط سریانی یا سطرنجیلی سے ہوئی انبار میں یہ خط ایجاد ہوا۔ حجاز انبار اور حیرہ (کوفہ) میں یہ خط لکھا جاتا تھا۔ حیرہ کا نام بعد کو کوفہ قرار پایا۔ حرب ابن امیہ کوفہ سے یہ خط سیکھ کر آئے اس لئے عرب میں اس کا نام خط کوفی پڑا۔ اور رفتہ رفتہ یہی اس کا نام ہوگیا۔ جس وقت سرزمین حجاز پر نیر اسلام طلوع ہوا اس وقت مختلف حصۂ حجاز و عرب میں مسند حمیری۔ عبرانی۔ سریانی۔ نبطی اور کوفی خط رائج تھا۔ اہل عرب اس وقت خطاطی سے بہت کم واقف تھے۔ جنگ بدر میں جو قیدی اور غلام خطاط گرفتار ہو کر آئے تھے ان کے لئے پیغمبر اسلام کی ہدایت تھی کہ وہ اہل عرب کو خطاطی کی تعلیم دیں۔ اسلام کے جو احسانات علم و فن پر ہیں ان میں ایک بڑا احسان یہ بھی ہے کہ خط و خطاطی کی تعلیم میں ابتدا سے اسلام نے بڑی حمایت ہر زمانے میں کی۔ پہلے خط کوفی میں نقطے اور زیر زبر پیش نہ تھے۔ ابوالاسود دؤلی نے تقریباً ۴۰ھ ہجری سے پہلے صرف حرکت یعنی زیر زبر پیش ظاہر کرنے کے لئے نقطے ایجاد کئے یہ نقطے گول گول ہوتے تھے پھر بھی ب ت اور ث وغیرہ کے امتیاز کے لئے اس وقت نقطے نہ تھے۔ جب اسلامی ممالک میں فتوحات سے وسعت ہوئی اور کثرت سے لوگ دین اسلام میں داخل ہوئے تو نقطے حرفوں پر نہ ہونے سے قرآن اور دیگر عبارت کے پڑھنے میں دشواریاں پیش آئیں۔ اس وقت بنی عباس کے عہد کے خلیفہ عبدالملک بن مروان

ہوا، اسی طرح نسخ اور تعلیق سے نستعلیق ایک نیا خط ساتویں صدی میں ایجاد ہوا۔

(نمونہ خط تعلیق) یتولی الصالحین والدین

نستعلیق | میر علی تبریزی ایک ذی علم شاعر اور تعلیق اور نسخ کے خوشنویس تھے ان کی بڑی آرزو یہ تھی کہ وہ کوئی ایسا خط ایجاد کرتے جو حسن و خوبی میں دنیا کے تمام خطوط پر فوقیت حاصل کر لیتا۔ چنانچہ انھوں نے ساتویں صدی میں نسخ اور تعلیق کے جوڑ اور دائرں میں ایک خوشنما اصلاح اور ترمیم کرکے انھیں دونوں خطوط کی مدد سے نستعلیق خط ایجاد کیا۔ نسخ و تعلیق کا لفظ رفتہ رفتہ مل کر نستعلیق ہوگیا اور اس طرح ایک نئے خط کے ساتھ زبان میں ایک نئے لفظ کا بھی اضافہ ہوگیا اور اب نستعلیق خط کے حسن و خوبی پر نظر کرکے یہ لفظ محاورہ میں داخل ہوگیا اور لکھنؤ کے مستند شاعر مرزا شوق نے اپنی مشہور مثنوی زہرِ عشق میں بھی یوں استعمال کیا ہے۔

اس سن و سال پر کمال خلیق چال ڈھال انتہا کہ نستعلیق

میر علی تبریزی نے نستعلیق کے قواعد مرتب کئے اور یہ شاعر تھے اس لئے فن خطاطی کی تعلیم کے اصول بھی انھوں نے نظم کر دئے۔ یہ خط اس قدر مقبول ہوا کہ رفتہ رفتہ اس نے خط نسخ کی جگہ لے لی۔ میر عماد الحسینی ایسا باکمال استاد اس فن نے پیدا کیا جن کا خط اتنا پختہ اور خوبصورت تھا کہ وہ جیسا حرف ایک جگہ لکھ دیتے تھے تمام کتاب میں اُسی نمونے کا لکھتے تھے۔ ان کا کمالِ فنِ نستعلیق خط کی تحریر کا اعجاز تھا اور آج ان کا کمال ایران کی تاریخ خطاطی میں یادگار ہے۔ ان کے بھانجے آغا عبدالرشید دیلمی، ہندوستان میں بعہد شاہجہاں بادشاہ آئے اور شاہزادہ دارا شکوہ کے اتالیق مقرر ہوئے۔ دارا شکوہ نے انھیں سے خط نستعلیق حاصل کیا اور ہندوستان میں انھوں نے نستعلیق کی تعلیم دیکر بڑے بڑے کامل فن تیار کئے اور ہندوستان کی تاریخ خطاطی پر ان کا ایسا احسان ہے کہ جب تک ایک خوشنویس اس سرزمین پر نستعلیق کا جاننے والا زندہ ہے ان کی یاد محو نہیں ہو سکتی۔ مسلمان سلاطین ہند اور ایران اور ان کے وزرا نے نستعلیق کو ترقی دینے میں کاملین فن کی حوصلہ افزائی بیش بہا انعام و اکرام سے کی جس کی نظیر کسی اور قوم میں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ عہد سابق میں ایران و ہند کے شرفا کے گھر گھر خوشنویسی دوڑ گئی اور شرافت اس طرح خوشنویسی کی مترادف ہوگئی کہ ہر طبقہ کے لوگ فنِ سپہ گری اور

تھے جو زمانے کے ساتھ مٹ گئے۔

خطِ نسخ | خطِ نسخ جس کا مشہور نام عربی خط ہے ۳۱۰ھ یا نویں صدی عیسوی میں نبطی خط کی مدد سے خلیفہ المقتدر باللہ کے زمانے میں اس کے وزیر ابن مقلہ نے ایجاد کیا جو خود بھی بہت بلند پایہ خوشنویس اور عالم تھا ممکن ہے کہ بعض تحریریں کسی قسم کے خطِ نسخ یا موجودہ خط سے مشابہ قسم کے عربی خط میں لکھی ہوئی شاید پائی جاتی ہوں جس سے بعضوں کو یہ گمان ہوتا ہے کہ خطِ نسخ کی ایجاد ابن مقلہ کے زمانے سے پہلے ہو چکی تھی اور ابن مقلہ نے اس میں کچھ اصلاح کی ہو، اس لئے تاریخ نے اس کو موجد قرار دیا ہو۔ اس کو خطِ نسخ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ خطوطِ سابقہ کا ناسخ ہے۔ خطِ نسخ سے خطِ ریحان، رقاع، توقیع، ثلث اور طغرا ایجاد ہوا۔ ان میں سے ریحان خط ایک قسم کا تغرئی خط تھا جو اب مفقود ہو گیا۔ خطِ طغرا بھی قریب قریب

(نمونہ خطِ ریحان) [illegible] (نمونہ ثلث) مسلم یونیورسٹی

ایسا ہی خط ہے اور وہ عمارتوں کے آرائشی کتبے اور مہریں و دستخط وغیرہ خاص عنوان سے بنانے کے کام میں آتا تھا اور اب بھی کہیں کہیں اس کے لکھنے والے ہیں۔ کسی عبارت کو کسی مخصوص شکل میں ترتیب دیکر بعض خاص قواعد کے ماتحت اس کی ترتیب دی جاتی ہے۔ کچھ عرصے سے نستعلیق میں بھی طغرا نویسی مخصوص طرز پر داخل ہو گئی ہے دستخطوں کو توڑ مروڑ کر لکھنے کا طریقہ عجب نہیں کہ اسی خط کی شگوفہ کاری کا نتیجہ ہو۔ خطِ توقیع کا موجد ابراہیم سنجری تھا بعض لوگ ان سب خطوط کا موجد ابن مقلہ کو بتاتے ہیں۔ خطِ توقیع اس کام میں آتا تھا کہ خلفائے بنی عباس کے عہد میں مدتوں درخواست کی پشت پر اسی خط میں حکم[1] لکھا جاتا تھا۔

تعلیق | خلفائے بنی عباس کے عہد میں تمام ممالکِ اسلامی یہانتک کہ ایران میں بھی عربی زبان دفتروں میں رائج تھی اور بکثرت شعرا عربی ہی میں شعر کہتے تھے اور عربی خط ایران میں بھی رائج تھا۔ پہلوی اور دیگر خطوط بھی ملک کے حصوں میں بدستور رائج تھے۔ پہلوی اور دیگر خطوط کے لکھنے میں دقتیں محسوس ہو رہی تھیں اس لئے تعلیق کا خط رائج ہوا جو خط شکستہ کے طرز کا خط ہے یہ اس وقت بھی رائج ہے۔ نسخ اور تعلیق ایران میں ساتھ ساتھ زیر استعمال تھے۔ جس طرح بھاشا اور فارسی کے اتحاد سے ہندوستان میں اردو کا وجود

---

[1] صبح الاعشیٰ۔

زلفِ عروس، خطِ بیچاں، خط ناخن، خط توام وغیرہ مگر یہ سب کتابت کے کام کے نہیں اس لئے یہ برائے نام خط ہیں۔ اسی طرح چاول پر قل ھو اللہ اور چنے کی دال پر سورۂ فاتحہ لکھنا ایک قسم کی تفریحی صنعت ہے۔

خط شکستہ | فرمانروایانِ صفویہ اور اکابرامرا میں مرتضیٰ قلی خاں شاملو تھے جو مدتوں ہرات میں حکمراں اور بہت ہنرپرور اور علم دوست تھے۔ ان کا زمانہ سنہ ۱۱۰۰ھ کا ہے انھوں نے یہ دیکھ کر کہ خط نستعلیق کے لکھنے میں زیادہ روانی نہیں ہے اسی نستعلیق سے خط تعلیق کے اصول پر اپنے عہد میں ایک نیا خط شکستہ ایجاد کیا جس کا دوسرا نام خطِ دیوانی ہے۔ یہ خط عدالتوں اور خانگی مراسلت میں اپنی انتہائی روانی اور سہولت کتابت کی وجہ سے بجلی کی طرح ایران سے ہندوستان تک دوڑ گیا۔ اس خط کے حرفوں کی آمیزش کے خاص خاص اصول ہیں اگر ان کو سیکھ لیا جائے اور اسی اصول سے کتنا ہی تیز اور گھسیٹ خط شکستہ لکھا ہو نستعلیق کی طرح فرفر پڑھا جا سکتا ہے یہ ہندوستان میں خط شکست کی تعلیم کے طریقے کا نقص ہے کہ اس نے دشواری بڑھا دی اور ہر شخص اپنے خود ساختہ طرز کا آپ موجد اور دوسروں کے لئے اس کی تحریر اور اس کا خط شکستہ بلائے جان۔

(نمونہ خط شکستہ) یہ کس رنگ مسیحا کا جا نسرہے

خط شفیعہ | مرتضیٰ خاں شاملو حکمران ہرات کے یہاں منشی باشی کے عہدے پر ایک کامل خوشنویس مرزا شفیعا ہراتی مامور تھے۔ انھوں نے خط شکستہ میں جوڑ اور پیوند مستعار لئے اور سڈول کر کے ایک نیا خط شفیعہ ایجاد کیا۔ مرزا شفیعا نقاشی میں بھی یدطولیٰ رکھتے تھے اس وجہ سے ان کے خط میں خاص حسن تھا اور خط شفیعہ کی ایجاد میں اس سے ان کو بڑی مدد ملی۔ شفیعہ خط کے بعض جوڑ اور توڑ مروڑ اتنے حسین ہوتے ہیں کہ جس طرح عشق پیچاں کا درخت کسی دوسری شاخ کی آویزش اور چھوٹے چھوٹے پھولوں کی بہار سے دلفریب نظر آتا ہے۔ مرزا شفیعا ہندوستان میں بھی آئے تھے اور پھر ہرات واپس چلے گئے۔ ان کا زمانہ بھی وہی سنہ ۱۱۰۰ھ کا ہے۔ (نمونہ خط شفیعہ)

یہ کس رنگ مسیحا کا کمال ہے درد کہ بہ لب خموشہ آنگ ملا

خط زود نویسی | خط طلی کی ایجاد کے ابتدائی زمانے سے یہ بات ہر ملک اور قوم کے پیش نظر رہی اور اسی بات نے درجہ بدرجہ بہت سے خط ایجاد کئے اور وہ یہ بات

فنِ خطاطی ضرور حاصل کرتے تھے۔ جب قدر دانی بڑھی تو فنِ مصوری اور خطاطی نے مل کر کتابوں کی حُسن ترتیب میں زور لگایا۔ کتابوں میں تصویریں بنائی جانے لگیں۔ اشعار اور مقولوں کی خیالی تصویریں بننا شروع ہوگئیں۔ یورپ نے جہاں اور علوم و فنون میں ترقی کی نستعلیق کی کتابوں کو باتصویر دیکھ کر۔ کیا عجب ہے کہ ایک خاص عنوان باتصویر کتابوں کا جس طرح اختیار کیا ہے یہ خیال مشرقی ممالک سے لیا ہو۔

ہندی نستعلیق خطِ نستعلیق کے ذکر میں ایک خاص بات جو فنِ خطاطی سے متعلق ہے اُس کا ذکر کر دینا ضروری ہے اور اس سے کسی قدر یہ شبہ بھی رفع ہو جائے گا کہ ایرانی نستعلیق خط اور ہندی نستعلیق خط بظاہر صورت میں تو دونوں ایک ہیں مگر اس میں تھوڑا فرق ہے یعنی ہندوستان کا نستعلیق خط نہ تو بالکل بدیسی ہے نہ بالکل ہندوستان کی پیداوار ہے۔ بدیسی تو اس کو صرف اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ صورتاً وہی خط ہے جو ایران میں ایجاد ہوا اور وہاں سے آیا لیکن اس کی صورت انگریزی یا بدیسی خط کی طرح نہیں ہے۔ اس کو بدیسی خاص کر اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس سے ناگری کی ایجاد اور رواج پر اثر پڑتا ہے۔ خطاطی کی تاریخ ابتدا سے یہ بتاتی آرہی ہے کہ اکثر خطوط صورت اور شکل میں دوسرے خط سے مشابہ یا بعض صورتوں میں یکساں بھی تھے لیکن ان میں کچھ حرفوں کے اضافے یا خاص خاص فرق کی وجہ سے وہ جداگانہ خط مانے گئے۔ مثلاً چینی اور جاپانی خط یا مصری خطوط سے نکلنے والے بعض خطوط ہیں۔

ہندی نستعلیق خط میں بھاشا کی وجہ سے ٹ۔ ڈ۔ ڑ تین حرفوں کا اضافہ ہوا اور یہ اضافہ ہندوستان میں یہاں کی زبان کی ضرورت اور اس کے لئے ایک رسم الخط کی ضرورت کی وجہ سے ہوا۔ یہ فرق اس کو بدیسی خط قرار دینے میں تاریخی حیثیت سے محل ہے۔ دوسرا فرق ہندی نستعلیق خط اور ایرانی نستعلیق خط کی شانِ تحریر کا فرق ہے اور یہ فرق قریب قریب اسی طرح کا ہے جیسے ہندوستانی آدمی اور ایرانی النسل انسان کی صورت اور شان کا فرق ہوتا ہے۔ یہ ایک فنی بات ہے جس کے لئے زیادہ تفصیل شاید اس مضمون کے موضوع سے باہر ہوگی۔

فرعی یا مختلف تفریحی خط نستعلیق کی جب اور قدر بڑھی تو بیشمار تفریحی اور آرائشی خطوط پیدا ہوتے گئے جن میں سے چند یہ ہیں:۔ خط گلزار، غبار، ماہی، سنبل، ریحان، امیقہ،

خط | ہیروغلفی خط کا تیسرا بڑا مرکز چین تھا۔ پہلے دو مرکزوں سے یورپ اور ایشیا میں جو
ؤ پھیلے ان کا ذکر ہو چکا۔ امریکہ اور افریقہ میں رومن خط پھیلنے کا ضمناً ذکر کر دیا گیا
ل میں بہت طوالت ہے۔ اب چین اور جاپان کے ساتھ ذرا آگے چل کر ہندوستان
خط کا مختصر ذکر ضروری ہے۔ اور ملکوں میں ہیروغلفی خط اپنی صورت بدل کر خط کے لباس
آ گیا اور تصویری خط کی شان جاتی رہی مگر چین میں ابتک کم وبیش تصویری صورت
ساتھ وہ ابتدائی اصول جو ہیروغلفی کی خصوصیات میں ہیں کچھ کچھ پائے جاتے ہیں۔
ں ایک ایک لفظ کے لئے ایک ایک صورت ہے کہیں آئڈوگرافی یا خیال نویسی
اصول رائج ہیں۔ چینی خط کی ابتدا کا زمانہ قریب قریب وہی خیال کیا گیا ہے جو
راور عراق کے ہیروغلفی کے پھیلنے کا زمانہ ہے۔ چینی اپنا ہیروغلفی خط برابر استعمال
تے رہے یہانتک کہ بودھ مذہب پھیلانے کے لئے جب کچھ لوگ ہندوستان سے
ن گئے اور وہاں یہ مذہب پھیلا تو اسی کے ساتھ ہندوستان کے اُس وقت کے خط سے
تی حروف کی بھی شان وہاں کے خط میں پیدا ہو گئی ہے اس لئے موجودہ چینی خط کچھ
ویری ہے کچھ صوتی نشان کا مجموعہ ہے۔ چین میں[۱] ۴۰۶۷ قسم کی تصویریں ہیں طلباء کو
ں کا خط سیکھنے اور روانی سے لکھنے کے لئے ۱۵ سے ۲۰ سال کی مدت درکار ہوتی
ہے۔ چینی خط عمودی صورت میں اوپر سے نیچے کی طرف لکھا جاتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ
ی نیچی آتی ہے پھر ایک سطر کے بعد دوسری سطر داہنے سے بائیں طرف کو قائم
ی جاتی ہے۔

تصویری خط کی پانچ قسموں میں ایک خاص قسم چینی خط کی ہے اور اس چینی
ط کی پھر پانچ شاخیں الگ الگ نکلی ہیں جن کی نوعیت جداگانہ ہے اور انھیں میں سے
یک جاپانی قسم ہے۔

جاپانی خط | جاپان کی تہذیب وتمدن کی مدت بہت کم ہے۔ تیسری صدی عیسوی میں انکا
یل جول چینیوں سے ہوا اور انھیں کے خط سے انکا خط بھی نکلا ہے لیکن جاپانی خط جو
ہیروغلفی خط کی ایک قسم ہے چینی خط سے تھوڑا مختلف ہے۔ جاپانیوں نے یہاں ارکان
لفظی کے لئے علامتیں مقرر کر لی گئی ہیں اور کچھ حروف بھی ہیں۔ چین سے ایک بودھ مذہب

---

[۱] a History of Alphabet by. M Taylor.

ہے کہ اول تو خط ایسا ہو کہ اس کے لکھنے میں وقت کم صرف ہو، دوسرے خط جگہ کم گھیرے، تیسرے اپنے مفہوم کے ادا کرنے میں واضح ہو۔ اس میں ساتھ ہی ساتھ حسن کتابت کے اجزا بھی ہوں تو اور بہتر ہے۔ یورپ میں سیاسی اور ملکی ضرورت نے سرایزک پٹ مین کو زود نویسی یا شارٹ ہینڈ ایجاد کرنے پر آمادہ کیا ان کی کوشش انگریزی زبان کی زود نویسی کے متعلق تھی۔ اردو، ہندی، عربی، فارسی زبان کو جلد سے جلد لکھنے کے لئے ڈاکٹر مرزا محمد ہادی صاحب رسوا مرحوم نے جو بہت بڑے ادیب شاعر اور بہت سے علوم کے ماہر بھی تھے بامداد حکیم شیخ ممتاز حسین صاحب عثمانی مرحوم جو اودھ پنچ اخبار کے اڈیٹر اور ایک بہترین انشاپرداز ہونے کے ساتھ عربی کے خاصے عالم تھے اردو زود نویسی کا فن ایجاد کیا اور ان کے شاگرد سید محمد رضا صاحب نقوی نے اردو۔ ہندی شارٹ ہینڈ سیکھنے کے لئے جو عدیم المثال کتاب لکھی ہے اس میں مدتوں کی تحقیق اور جستجو کے بعد جو قابل ذکر بات لکھی ہے وہ انھیں کے لفظوں میں یوں ہے :۔

"پٹ مین کے زمانے میں کون کہہ سکتا تھا اور آج سے پہلے کس نے کہا ہوگا کہ عربی رسم الخط میں وہ تمام شکلیں موجود ہیں جن کو فن مختصر نویسی یا شارٹ ہینڈ کی تدوین میں پٹ مین اور آج کل کے متعدد طریقوں کے بنانے والوں نے ناگزیر خیال کرکے اختیار کیا ہے جس سے وہی انکار کر سکتا ہے جو دن کی روشنی کو دیکھنے کے بعد اس کو اندھیرے سے تعبیر کرے۔ پٹ مین نے اپنے شارٹ ہینڈ میں نہ صرف عربی خط کی ان امتیازی خصوصیتوں سے کام لیا ہے بلکہ آوازوں کے اظہار کے لئے جو علامتیں مقرر کی ہیں اُن کی شکلیں بھی بالکل وہی رکھی ہیں جو عربی خط کے حرفوں میں ملتی ہیں یعنی ان علامتوں میں عربی حرفوں کے اجزائے ترکیبی انفراداً یا ترکیباً استعمال کئے ہیں۔"

یہ بات خاص اہمیت رکھتی ہے اور مسلمانوں کا فخر اس پر بجا ہے کہ جب سے دنیا میں اسلام کا ظہور ہوا مشرق میں مادر خطوط خط کوفی سے اس وقت تک جتنے خط ایجاد ہوئے بلاکسی اشتثنا کے سب کے موجد مسلمان ہیں اور مسلمان ہی کامل بھی گزرے اگرچہ یہ خطوط دنیا کے مختلف ملک اور قوم میں پھیلے اور سبھی نے ان کو حاصل کیا۔ یہ مخصوص بات شاید خطاطی کے سوا کسی اور علم و فن کے ساتھ وابستہ نہ ہو۔

جگتائی		ہندوستانی		
صانی	صابی	سابق	مشتق حرف	
X ꓘ	⌐‾⌐	ꓘ	ꓘ	الف
⊐	◻ ◻	◻	⊢	ب

ان تمام حرفوں میں جتنی صورتیں الف کے قسم کی آواز کے لئے ہیں سب میں خط تصویری کی جھلک ہے اور آلفا کا سینگ ہے۔ ب کی آواز والے تمام حروف مصری بیتا سے اور مصری قدیم خط سے مشابہ ہیں اس لئے سوائے اس کے کوئی اور نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہندوستان کا قدیم خط مصری اور بابلی خطِ تصویر سے نکلا ہے۔ اس کے علاوہ اشوک سے پہلے چندرگپت کے زمانے میں یونانی حروف تہجی کے قسم کا حرف یہاں رائج تھا۔ بادشاہ دارا نے پنجاب کے بعض حصوں کو تقریباً پانچویں صدی قبل مسیح میں فتح کیا اور یہ پتہ چلا ہے کہ دو صدی تک یہاں ایرانی حروف رائج تھے۔ اب ایک صورت اور ہے جس[1] سے پتہ چلتا ہے کہ ۳۰۰۰ سال قبل مسیح کے زمانے میں یہاں اور بابل میں ایک خط رائج تھا جیسا کہ خطِ میخی کے ذکر میں کہا گیا ہے کہ وہی تصویری خط وہی لفظ اور وہی تلفظ جو ہندوستان میں رائج تھا وہ بابل میں بھی رائج تھا۔ حال میں ٹکسلا کے قریب جہلم اور اندس کے وسطی حصے میں کچھ کتبے برآمد ہوئے ہیں جو تقریباً ۳۰۰۰ سال ق م کے معلوم ہوئے ہیں مگر ابھی یہ زیر تحقیقات ہیں۔ آنولہ ضلع بریلی کی تحصیل میں رام نگر ایک مقام ہے جو عہد قدیم میں راجاؤں کی راجدھانی تھا۔ یہاں کھنڈروں کی کھدائی کا کام ابھی جاری ہے ممکن ہے کہ ان سے مزید حالات معلوم ہوں۔ بہر حال جس قدر مذکورہ مثالوں اور قرائن سے ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کا قدیم خط میر دلغلی سے نکلا ہے اور یہ غلط ہے کہ یہاں کا قدیم خط کسی اور جگہ کے قدیم خط سے نہیں نکلا اس بات کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ کس خط کو موجودہ خط میں ہندوستانی خط کا موقت کی ضرورت کے لئے قرار دیا جائے۔

۱۹۴۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ کا جو خلاصہ شائع ہوا ہے اس سے معلوم

[1] رسالہ ''نگار'' ۱۹۳۱ء۔

کا مہنت عرصہ ہوا جاپان گیا تھا جس کا نام کوُ ڈیلشی تھا اس نے وہاں بودھ مذہب پھیلا اور صوتی خط کا جو طریقہ چین میں رائج تھا اس کی تعلیم دی۔ لیکن جاپانیوں نے اپنے خط پر اصلاح کر کے دشواریاں دُور کر دی ہیں اور وہ رفتہ رفتہ اور ملکوں کی طرح آواز کے لئے اپنے یہاں کے حروف تہجی کو مکمل کرتے جاتے ہیں۔

ہندوستانی خط ہندوستان میں اتنی مختلف اور متعدد قومیں آباد ہیں اور زبانیں اس قدر زیادہ تعداد میں بولی جاتی ہیں اور اتنے مختلف قسم کے خطوط قریب قریب ہر صوبہ میں مستعمل ہیں کہ یہاں کا کوئی خاص خط قرار دینا دشوار ہے۔ ہندوستان کے قدیم سے قدیم خط کے بارے میں انگلستان کے محققین مختلف الرائے ہیں۔ ڈاکٹر ڈِک کی رائے ہے کہ ہندوستان کا قدیم خط میخی خط سے نکلا ہے۔ ڈاکٹر برنل کی رائے ہے کہ آرامی خط سے نکلا ہے جو بابل اور ایران میں کبھی رائج تھا۔ جنرل کننگھم کی رائے ہے کہ یہاں کا خط خط تصویری سے نکلا ہے۔ ان باتوں کی جانچ کرنے سے معلوم ہوا کہ فنیقی قوم کا تعلق ہندوستان سے بوجہ تجارت شاید ۰۰ ۶ سال قبل مسیح یا اس سے اور پہلے سے تھا۔ یہ لوگ مغربی ساحل کی طرف سے آئے ان کے حروف تہجی مکمل تھے مغربی ساحل کی طرف سے ان کے خط سے جو خط نکلا وہ اس حصّہ میں پھیلا ہوگا۔

دوسرا سلسلہ پنجاب کے حصے کے خطوط کا ہے۔ کابل اور افغانستان کی طرف سے ایرانی آئے اور ان کے خط سے جو قدیم زمانے میں خط نکلا پنجاب کے نواح میں پھیلا۔

۱۸۳۶ء میں دریائے اِنڈس کے مغرب میں جو کتبہ برآمد ہوا وہ جہاں سے برآمد ہوا ہے اس مقام کا نام کپور ڈگری ہے وہاں اشوک بادشاہ کا فرمان ایک ستون پر کندہ ہے۔ یہ پالی پراکرت اور ہندی باختری خط میں ہے۔ یہ کتبہ ایرانی قدیم خط سے بہت ملتا جلتا ہے۔ کپور ڈگری کا کتبہ داہنی طرف سے بائیں طرف کو لکھا گیا ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسی کتبہ کے خط سے یہاں کے خطوط کا وجود ہوا اور انھیں سے پالی۔ ڈراویڈین اور ناگری حروف نکلے۔ اشوک کے زمانے کے خط بہت کچھ تصویری خط سے نکلے ہوئے خط سے ملتے جلتے ہیں اور اُن کی صورت یہ ہے: —

(۲) دیوناگری خط یو۔پی۔اودھ اور بعض ریاستوں اور شمالی حصّے وغیرہ میں رائج ہے۔
(۳) پالی۔لنکا اور جنوبی حصّے میں رائج ہے۔
(۴) گجراتی خط گجرات اور راجپوتانہ میں رائج ہے۔
(۵) پنجابی خط جس میں گورمکھی وغیرہ بھی شامل ہے پنجاب اور متصل کے اضلاع میں لکھا جاتا ہے۔
(۶) بنگلہ خط صوبہ بنگال میں رائج ہے۔
(۷) ڈراویدین خطوط جنوبی حصّہ ملک کے باشندوں میں رائج ہے۔
(۸) ملایالم جزائر کے باشندوں کا خط ہے۔
تمام وجوہ اور سہولتوں پر نظر کرنے سے نستعلیق خط اس قابل ہے کہ اس کو ہندوستانی خط ہونا چاہئے۔

نوٹ صفحہ ۹۶ کا سلسلہ :۔ یہ سب باتیں سیاسی ہیں اور ایمانداری کی صحیح ترجمان نہیں۔ اس قسم کی تمام ملمع سازی کا تجزیہ کرنے سے باتیں سب صاف ہو جاتی ہیں:۔

ا۔ پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ ناگری اور ہندی اور ہندی نستعلیق خط کی کیا حیثیت ہے۔ ناگری یا ہندی خط ہندوستان میں بدیسیوں کے میل جول اور انھیں کے خط کی مدد سے پیدا ہوا۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ کسی بدیسی خط یعنی ایرانی خط فنیقی خط یا یونانی خط یا ہیروغلفی سے خیال لے کر نہیں پیدا کیا گیا بلکہ یہ ہندوستان کی خالص ایسی پیداوار ہے کہ کسی قوم اور کسی اور خط کا اس پر احسان نہیں۔ اس لئے یہ خالص ہندوستانی خط ہے تو اوّلاً یہ بات سرے سے غلط ہے اور تاریخ خطاطی اور قرائن اور اشوک اور چندرگپت کے وقت کے کتبوں اور واقعات و تاریخ کے خلاف ہے۔ جیسا کہ اوپر کچھ ضمناً ذکر کیا گیا کہ دیوناگری خط یا ہندی خط ایرانیوں یا ہندی یا خروشتی یا کسی اور بدیسی خط کی وجہ سے اوّلاً ظہور میں آیا۔ اگر ایسا نہیں ہے اور یہ اتنا مقدس خط ہے اور اس میں اتنی روح مذہبیت ہے جتنی قدیم ہیرالیفی خط میں ہے اور مذہبی خط ہے اور مذہبی قدیم کتابیں اس میں لکھی گئیں ہیں جب عوام الناس مجاز نہ تھے کہ یہ خط لکھیں اور اشلوک سنیں تو خطاطی کی تاریخ بتاتی ہے کہ مذہبی خط کو ہمیشہ ملکی اور عوام الناس کے خط سے بالکل ہی الگ رکھا گیا ہے۔ مشرقی خطوط میں تو یہ ابتدا ہی سے رواج تھا جیسا کہ ہیرالیفی اور پالیری خط وغیرہ کی مثالیں شاہد ہیں اس لئے دیوناگری کی حیثیت ملکی دفتری اور عدالتی خط قرار دی جانے کی مستحق بربنائے رسم و رواج نہیں۔

ہندی نستعلیق کا خط جو ہندوستان میں رائج ہوا وہ بالکل وہی نہیں جو ایران کا نستعلیق خط ہے
(صفحہ ۹۸ دیکھو)

ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ۲۲۵ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اس میں خط کا کوئی ذکر نہیں۔ کئی کئی زبانیں ایک ایک خط میں لکھی جاتی ہیں۔ چھانتے چھانتے کم از کم چالیس قسم کے خط یہاں ملتے ہیں جن میں سے ایک دیوناگری خط اور ایک نستعلیق اردو خط بھی ہے۔ ان ۴۰ خطوط کے ماخذ کی تلاش خالی از دشواری نہیں۔ اس لئے یہاں کے خط کا اصل ماخذ جب معلوم ہوگیا کہ بہیرو غلفی ہے تو اس کے بعد اور بحث کو بنظرِ طوالت اس وقت نظرانداز کرنا پڑا۔ اور یہ تحریر کیا جاتا ہے کہ یوں تو ۴۰ خط یا زیادہ یہاں مستعمل ہیں لیکن ۴۰ خطوط میں خاص خاص خط یہ ہیں۔ (۱) نستعلیق خط ہندوستان کے مختلف صوبوں اور سرحد میں رائج ہے۔[۱]

---

[۱] اس جگہ جب یہ غور کرنے کی ضرورت ہوئی کہ آخر اتنے قسم کے خطوط جو ہندوستان میں رائج ہیں ان میں سے اس وقت کون خط ہر اعتبار اور بکثرت وجوہ اور مفاد کے لحاظ سے اس کا مستحق ہے کہ ہندوستانی خط قرار دیا جائے تو صرف ہندی نستعلیق ہی پر نظر پڑتی ہے اور حقیقتاً یہی خط مستحق ہے اس لئے کہ ناگری کی طرح اس کی ایجاد کی غرض مذہبی خیال اور ضرورت پر نہیں ہوئی۔ بلکہ ملکی زبان کے لئے ہوئی۔ عہدِ سلاطین مغلیہ سے نستعلیق برابر ملکی خط قرار پایا۔ برابر اسی خط میں دفتر کے کاغذات رہے۔ شاہانِ مغلیہ سے جب ایسٹ انڈیا کمپنی اور گورنمنٹ برطانیہ کو یہ ملک ملا تو نستعلیق ہی خط میں دفتر کے تمام کاغذات رکھے گئے۔ سکہ جو ملا اس پر نستعلیق ہی خط کا کتبہ تھا اور اولاً صرف اسی نستعلیق خط کا کتبہ دیسی خط میں خود گورنمنٹ برطانیہ نے سکہ پر قائم رکھا۔ ناگری کا کتبہ سکہ پر قائم نہ کرنے کے لئے اگر گورنمنٹ برطانیہ جواب دینا چاہے تو یہی معقول جواب ہو سکتا ہے۔

ایک بڑی دشواری جو نستعلیق خط کی راہ میں حائل کر دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس خط کو اردو زبان اور ہندی زبان کے جھگڑے کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے۔ نستعلیق خط میں اردو زبان لکھے جانے کی وجہ سے خط کو زبان کے نزاع کے تابع کر دیا گیا ہے ورنہ یہ بہت ممکن تھا کہ اردو یا ہندی یا ہندوستانی یا ورناکیولر جس لفظ سے چاہے تعبیر کیا جائے کوئی زبان ملکی زبان قرار دی جاتی اور سہولت اور عالمگیر وسعت کے لحاظ سے نستعلیق ہی کو خط قرار دیا جاتا مگر اس کے ساتھ یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ یہ مسلمانوں کی زبان کا خط ہے اور اردو زبان گویا محض مسلمانوں کی زبان ہے اور مسلمان بدیسی ہیں اور نستعلیق خط بدیسی ہے اور ہندی ہندوؤں کی مقدس زبان ہے اور یہاں کا آسمان سے اترا ہوا خط ہندی یا دیوناگری ہے۔ اور جو زبان ملک میں بولی جاتی ہے وہ وہی زبان ہے جس کا مخصوص خط ہندی اور دیوناگری ہے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۹۷)

اسی تاریخی ذکر کے سلسلہ میں دو باتیں ایسی ہیں جو یونہی چھوڑ دینے کے قابل نہیں۔ ایک تو یہ بات ہے کہ خط کے طریقہ تحریر پر نظر کرنے سے یہ ایک تاریخی بات معلوم ہوتی کہ دنیا میں سب سے پہلے خط کا جو نقش کھینچا گیا اس میں لکیر اور تصویریں داہنی طرف سے بائیں طرف کو بنائی گئیں۔ یہ ایک فطرتی بات تھی جو عمل میں آئی پھر بعد کو بائیں طرف سے داہنی طرف کو بھی خطوط لکھے گئے۔ تفصیل اور نفسیاتی حیثیت سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالنا مقصود نہیں۔ صرف اس کی مختصر تاریخ یوں سن لیجئے کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت آدم سے حضرت سلیمان کے عہد تک داہنی طرف سے بائیں طرف کو اور حضرت عیسیٰ کے زمانہ سے حضرت دانیال

نوٹ صفحہ ۹۸ کا سلسلہ:- ۲۔ خط کی بحث کے ساتھ زبان کے مسئلہ کو شامل کر دیا جائے تاکہ نستعلیق کو ملکی خط کی حیثیت حاصل نہ ہونے پائے اس لئے یہ دیکھنا ہے کہ اردو اور ہندی کی حیثیت اس ملک میں بہ حیثیت ملکی زبان کے کیا ہے۔

یہ مسئلہ بہت آسان اور صاف ہے نہ ہندی زبان باہر سے آئی نہ اردو۔ دونوں ہندوستان کی پیداوار ہیں اور ان کو نہ کسی اسلامی ملک سے واسطہ ہے نہ اسلامی ممالک کے رہنے والوں سے سروکار۔ مسلمانوں کی قومی زبان عربی ہے اردو قومی زبان مسلمانوں کی نہیں۔ جب یہاں آئے تو فارسی عربی بولتے ہوئے آئے۔ اردو زبان عرب یا ایران سے ساتھ لے کر نہیں آئے۔ ممالک اسلامی کے مسلمان اردو زبان کو اسلامی زبان نہیں مانتے نہ حقیقتاً اردو اسلامی زبان ہے۔ اس حیثیت سے اس کو کوئی جگہ کبھی نہ اسلامی ممالک میں ملی نہ یہاں۔ عجب مصیبت اور بے وفائی کا شکار ہمیشہ اردو زبان رہی کہ ہندو اس کو اپنے آغوش میں لینے سے کراہت کرتے ہیں، باہر کے مسلمان اسے اسلامی زبان نہ ہونے کی وجہ سے اپنے آغوش میں نہیں لیتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنی خود غرضی چلن اور خداداد قابلیت سے خود وسعت پیدا کر کے تجارتی یا اور ضرورت کی وجہ سے یہ عالمگیر زبان ہو گئی۔ بہرحال اردو زبان ہندوستان کا تحفہ ہے اور یہیں کی پیداوار ہے۔ ہندو مسلمانوں اور تمام ملک والوں کی صدیوں کی سعی کا یہ نتیجہ ہے اس لئے اس کی پرورش اور سرپرستی کے فرائض ہندو مسلمان دونوں پر عائد ہوتے ہیں اور جس طرح ایک ماں کی دو اولادیں ہوں اس طرح مادر ہند کی ایک اولاد ہندی زبان ہے۔ دوسری اردو۔ بلکہ اس کو دو الگ اولاد کے بجائے کسی ایسے دو مادّے سے تشبیہ دی جائے جو مل کر ایک ہو گیا ہو۔ اور ایک ذات ہو۔ اس طرح اردو حقیقتاً بھاشا کے متنے پر اردو ہی

(صفحہ ۱۰۰ دیکھو)

اس قدر جو کچھ ذکر کیا گیا وہ خطاطی کی مختصر تاریخ کا صرف ایک جزو تھا کہ ایجاد خط کی کیا ضرورت تھی اور خط ایجاد ہو کر کیسے درجہ بدرجہ پھیلا۔ اتنی بات بھی تفصیل کیا، اجمال سے بھی نہ بیان ہو سکی۔ صرف کچھ باتوں کی طرف اشارات کر دیے گئے۔ بعض خطوط اور حالات تاریخی کا بیان بطور اجمالی فہرست کے کر دیا گیا ورنہ ان میں ہر خط اپنی تاریخ کی تفصیل کا محتاج ہے اور ہر خط کا ایک ایک حرف اپنی تاریخ آپ بتانے کے لئے صورت بیں عالم میرسس کہتا ہوا خاموش ہے جیسا کہ الف کی صورت تحریر کے تاریخی انقلاب کا مختصر سا ذکر اس بات کے ثبوت میں پیش کر دیا گیا۔

نوٹ صفحہ ۹۷ کا سلسلہ:- ایران کی نستعلیق میں ٹ۔ ڈ اور ڑ حروف تہجی کا جزو نہیں۔ ہندی نستعلیق جس میں ٹ۔ ڈ۔ ڑ شامل کئے گئے یہ ہندوستان میں شامل کیے گئے اور بھاشا کی وجہ سے شامل کئے گئے۔ بھاشا اپنا نمایندہ ان حروف کو قرار دے کر تمام حقوق سے دست بردار ہو گئی اور یہ موجودہ ہندی نستعلیق خط ہندوستان کی پیداوار اور اسی طرح یہاں کی پیداوار ہے جس طرح دیوناگری یہاں کی پیداوار ہے۔

خطاطی کی تاریخ بتاتی ہے کہ اکثر خط کی ایجاد اسی طرح ہوئی ہے کہ کچھ پرانے اور کچھ نئے حروف ادھر سے کچھ اُدھر سے کچھ لیلئے گئے اور نیا خط وجود میں آیا۔ اکثر صورت و شکل بالکل یکساں رہی یا کچھ برائے نام فرق پیدا کر دیا گیا۔ خطاطی اور خط کا عنوان تاریخی ہے وہ بھی ہندی نستعلیق خط پر صادق آتا ہے۔ ایران کے نستعلیق اور ہندوستان کے نستعلیق کی صورت و شکل میں اسی طرح کا فرق ہے جس طرح ایران کے آدمی اور ہندوستان کے آدمی میں فرق ہے اور اس فرق کو ہر شخص شکل سے سمجھ سکتا ہے، صرف صاحب ادراک، خوشنویس اور خطاط سمجھ سکتا ہے ورنہ یوں تو ایرانی کے جسم میں وہی اعضا وہی جوڑ پیوند ہوتے ہیں جو ہندی آدمی کے جسم میں ہوتے ہیں۔

مگر حقیقتاً کچھ ایسی باتیں فرق کی ہیں جو ہندی اور ایرانی کو الگ کر دیتی ہیں اس سے زیادہ باتیں صاحب ادراک کے لئے ہندی نستعلیق اور ایرانی نستعلیق میں موجود ہیں لیکن یہ مسئلہ اس حیثیت سے کبھی سامنے آج تک لایا ہی نہیں گیا نہ ملک کے لیڈروں کو خطاط کی حیثیت سے اس پر بحث کی ضرورت پڑی اس لئے یہ پردے کی بات پردے ہی میں رہ گئی۔ جب کبھی اس حیثیت سے خط کی بحث سامنے آئے تو ہندی نستعلیق کی حیثیت اور ہندی اور دیوناگری کی حیثیت ایک ہے۔

(صفحہ ۹۹ دیکھو)

چھوڑ دے آسان نہیں مگر رُخ کی وجہ سے ہاتھ آنکھ اور اعصاب پر جو اثر پڑتا ہے اس
بات کو ملحوظ رکھ کر اگست ۱۸۹۱ء کی ساتویں بین الاقوامی کانگریس میں جو بمقام لندن منعقد
ہوئی تھی طبی طور پر غور ہو کر بہت سے طریقے جو صحت کے لئے خط کی تحریر میں مضر تھے دُور
کئے گئے اور بعض اصول پر نظر ثانی کی گئی۔ مشرقی دُنیا میں اس طرف توجہ نہیں کی گئی۔

دوسری بات جو خطاطی کی تاریخ میں کچھ کم قابل توجہ نہیں وہ اس کے اثرات ہیں
جو تاریخی حیثیت سے مختلف شعبہ حیات اور علم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس قدر طول طویل مضمون
کے بعد اس پر بھی تفصیل سے لکھنے کا موقع نہیں اس لئے کہ اس میں ہر بات جس پر خطاطی کا

نوٹ صفحہ ۱۰۰ کا سلسلہ:- راہ میں حائل نہیں۔ نزاع جس کے مابین ہے وہ دونوں باہر سے آگئے
اور یہیں رہ گئے۔ ایک کو بہت زیادہ زمانہ آئے ہوئے ہو گیا ایک کو بہت کم۔ مگر ہیں دونوں
بدیسی۔ اب دونوں کا یہی گھر، یہیں دونوں کی جائداد، یہیں کاروبار۔ ایک ہی گورنمنٹ کی دونوں
رجسٹرڈ رعایا۔ ان میں سے کسی کی وہ حیثیت نہیں جو عرب یا ایران کے مسلمان یا چین اور افریقہ
و امریکہ یا انگلستان سے آنیوالوں کی حیثیت ہوتی ہے یا عارضی قیام کرنے والوں کی حیثیت ہوتی
ہے یعنی جن کا حقیقتاً دوسرے ملک سے تعلق ہوتا ہے اور ہندوستان میں برائے نام اور قیام
عارضی طور پر ہے اور وہ دوسرے ملک کی رعایا ہیں۔ اُن کی زبان الگ اُن کی قومیت ملکی اور شخصی الگ
الگ۔ یہاں ملکی قومیت اور تمام اعتبار سے ہندو اور مسلمان کی حیثیت اب یکساں ہو گئی۔ مدت اور
زمانے کی کمی بیشی کا سوال اس بات کے لئے مانع نہیں ہو سکتا کہ ایک کو کچھ کم یا دوسرے کو مدت کے
لحاظ سے زیادہ تعلق ہے یا یہ کہ مسلمان جواب یہاں رہ گئے اور ہندوؤں کی طرح کئی پشتیں ہو گئیں
اب ان کو چلے جانا چاہئے اگر ایسا ہو تو سوائے دراویدین کے کسی اور کو یہاں رہنے اور ٹھہرنے کا
حق نہیں نہ اپنا خط پھیلانے کا حق ہے نہ زبان جاری کرنے کا حق ہے۔ اس حیثیت سے بھی نستعلیق خط
کو ملکی حیثیت اختیار کرنے کے لئے کوئی امر مانع نہیں۔

نتیجہ یہ کہ خطاطی کے نقطۂ نظر سے ہندی نستعلیق خط ایک مستقل خط ہے اور ہندوستان کی پیداوار
اور ہندوستان کا مشترکہ خط ہے اگرچہ صورتاً اس کا خط بہت زیادہ مشابہ ہے۔ یا وہی خط مان لیا
جائے جو ایرانی نستعلیق کا خط ہے۔ اس کی ضرورت ویسی ہی ہے جیسے یورپ کے ملک میں مختلف قسم
کے رومن خط کی صورت ہے کہ کوئی اپنے اصلی ماخذ سے زیادہ مشابہ ہے کوئی کم۔ ہندی نستعلیق اپنے
(صفحہ ۱۰۲ پر دیکھو)

کے زمانہ تک۔ پتہ چلا ہے کہ حروف بائیں سے داہنی طرف کو لکھے گئے اس دوران میں جو خطوط کتابت کے لئے مستقل رُخ قائم کر چکے تھے وہ بدستور بعد میں رہے جو نئے خط پیدا ہوتے گئے وہ اسی طرح جیسے ذکر کیا گیا دَورِ زمانہ کے تابع ہوتے گئے۔ یہ بات خطاطی کی تاریخ میں اس لئے بہت اہم اور قابل ذکر ہے کہ تحریر و کتابت میں رُخ اور طریقۂ تحریر کا انحراف نی صحت سے تعلق رکھنے والی چیز ہے اور خطاطی کے دَور میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ دُنیا کی متمدن قوموں کی توجہ اس طرف منعطف ہوئی ہے۔ کسی خط کا رخ داہنی سے بائیں کو یا بائیں طرف سے داہنی طرف کو اس طرح پھیر دینا کہ وہ اپنے تاریخی طریقۂ تحریر کو

نوٹ صفحہ ۹۹ کا سلسلہ :۔ بھاشا بھی ہے صرف اس کا نام بدل گیا۔ بہرحال جس طرح یہاں کی یہ زبان ہے یہیں کی پیداوار ہے اور اس مظروف کے لئے یہاں کا نستعلیق خط ظرف ہے۔ دونوں ہندی نژاد زبانیں ہیں اور دونوں الگ الگ خط میں سما گئیں۔ اس لئے ملکی خط کی حیثیت نستعلیق خط کو دئے جانے میں یہ بات اس کے سدِّ راہ کبھی نہ ہونا چاہئے، چاہے کسی زبان کو صاف اور صیقل کرکے اور ترقی دے کر اور کچھ نئے الفاظ اس کے حلق میں ٹھونس کر اور انگلش سے دیگر اور گھٹا بڑھا کر ملکی زبان بنا دیا جائے۔ جیسا کہ کچھ عرصہ سے کوشش جاری ہے۔ چاہے اُردو کو بھاشا بنا دیا جائے یا بھاشا کو اُردو۔ یا کوئی تیسری زبان رفتہ رفتہ پیدا کر دی جائے ملکی حیثیت سے اور اپنی سہولتِ تحریر اور عالمگیری وسعت کی وجہ سے نستعلیق کا خط کبھی نظرانداز کرنے کے قابل نہیں اسی ہندی نستعلیق کو ہر حالت میں ہندوستانی خط قرار دینا چاہئے۔

۳۔ اب ایک صورت اور یہ رہ گئی کہ کہا جاتا ہے کہ مسلمان بدیسی ہیں اور ہندو یہیں کے باشندے ہیں (سب تو نہیں ہیں) اور کہا جاتا ہے کہ اس حیثیت سے مسلمانوں کو اس ملک کی زبان اور خط کے مسئلہ میں ہندوؤں کے مقابلہ میں کوئی مضبوط حق اور دعوی بحیثیت بدیسی مہمان کے نہیں اور اس وجہ سے ہندی نستعلیق خط کے ملکی خط ہونے میں یہ خیال مانع ہے کیونکہ ان بدیسیوں کے خط کو دیسی زبان کے لئے کیوں ظرف بنایا جائے۔

اوّل تو یہ بدیسیوں کا خط نہیں۔ یہ ہندوستان کا خط ہے۔ جب ٹ۔ ڈ۔ ڑ بڑھا کر ایرانی نستعلیق سے ہندی نستعلیق خط کا وجود ہوا۔ دوسرے صورت یہ ہے کہ جو لوگ واقعی ہندوستان کے قدیم اصلی باشندے ہیں وہ دراوید ہیں ان کی زبان الگ، ان کا خط الگ، وہ اس

(صفحہ ۱۰۱ دیکھو)

اعداد پر ایک خاص علم کی مستحکم بنیاد رکھی گئی ہے جس کو علم الحروف اور جفر جامع کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس علم کی ایجاد کا تعلق بتایا جاتا ہے۔ حروف سے نقوش اور تعویذ اور اس کے اثرات کا تعلق ضمنی طور پر خطاطی کی تاریخ سے ہے مگر اس کو نظر انداز کرکے تاریخ خطاطی کا ذکر کرتے وقت حروف ہجی کی ضمنی تاریخ تو بیان کی جائے اور علم الحروف کا ذکر چھوڑ دیا جائے یہ ایک بڑی اہم فروگزاشت ہوگی۔ اس زمانۂ علم اور سائنس میں ایسے کسی علم کا ذکر معلوم نہیں کیا وقعت رکھے۔ مگر بہرحال یہ ایک علم ہے اور اس کی صداقت مشاہدہ اور عمل سے بارہا ثابت ہو چکی ہے کہ انھیں حروف کے اعداد کسی خاص اصول و اثرات کے تحت میں معین کئے گئے ہیں اور ان کو ریاضی کے سوال کی طرح عبارت میں بسط کرکے انھیں حروف ہجی اور ان کے اعداد سے صحیح صحیح جوابات نکالے جاتے ہیں۔ استدلال اور بحث کا محل نہیں نہ یہ خاص جزو اس موضوع کا اصلی مقصد ہے اسلئے ایک سچی مشاہدہ اور تجربہ کی بات پیش کر دینا اس ذکر کی تائید میں کافی ہے۔ غالب مرحوم کی خوش فکری اور آزاد خیالی ان کے اشعار اور عالی مضامین سے ظاہر ہے۔ غالب شاعر تھے علم الحروف یا جفر جامع کو ایسا آزاد طبع شاعر کیوں ماننے لگا۔

حافظ حاجی مخدوم احمد صاحب مرحوم ایک معمر بزرگ تھے جن کی خدمت میں مجھے بھی نیاز حاصل تھا۔ وہ علم الحروف یعنی جفر کے زبردست اور اکمل روزگار ماہر تھے ان کے استاد ایک عرب جفار تھے۔ یہ حافظ صاحب شاعر بھی تھے اور غالب سے اصلاح بھی انھوں نے لی تھی۔ یہ دونوں بزرگ یعنی حافظ صاحب اور عرب صاحب غالب سے ملے اور ان سے کہیں علم جفر کا ذکر آ گیا۔ غالب علم جفر کی صحت کے قائل نہ تھے۔ طے یہ پایا کہ غالب کوئی مصرع کہیں اور اس مصرع کو خود چھپا رکھیں بحر بتا دیں اور حروف مصرع کے اعداد باقاعدہ ابجد جوڑ کر بتا دیں اور مصرع بھی چاہے نہ بتائیں۔ اس پر کوئی دوسرا مصرع علم الحروف یا علم جفر کے ذریعہ سے استخراج کر دیا جائے۔ چنانچہ غالب نے (۲۲۶۰) کا عدد بتایا، یہ یاد نہیں رہا کہ اور کیا باتیں سوال کے متعلق بتائیں۔ وہ مصرع جس کے عدد بتائے تھے یہ ہے۔ ع

وہ ہے مشتاقِ ستم اور میں ہوں مشتاقِ جفا

اس پر باقاعدہ علم جفر جو مصرع نکلا وہ یہ ہے۔ ع

طینت اس کی اور ہے میری طبیعت اور ہے

اثر پڑا اپنی تاریخ دہرانے کے لئے تفصیل کی محتاج ہے۔ مثلاً خطاطی کی تاریخ میں کاغذ اور
دیگر سامانِ کتابت کا تعلق اقتصادیات اور تجارت سے ہے اور اس کا ذکر تمدن سے بھی گہرا
تعلق رکھتا ہے۔ دریائے نیل کے کنارے اُگنے والے درخت پیپرس سے کیونکر کاغذ بنا اور
اندلس کے مسلمانوں سے یورپ نے کیونکر اور کب کاغذ بنانا سیکھا اور کاغذ کا اثر خطاطی
کی تاریخ سے کیا تعلق رکھتا ہے۔ یہ سب باتیں تفصیل طلب ہیں۔ پھر اسی سلسلہ میں حرفوں کے
اثرات اور علم الحروف کا ذکر بھی ایک خاص تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ حروف تہجی کی بناء
کے وقت کی تاریخ کے سلسلہ میں ابجد ہوز کے اعداد کا ضمنی ذکر آگیا تھا۔ ان حروف کے

نوٹ صفحہ ۱۰۱ کا سلسلہ :۔ اصلی ایرانی نستعلیق سے صورتاً تمام تر مشابہ نہیں۔ ایک تو وہی ٹ۔ ڈ۔ ڑ
کے اضافے کا فرق۔ اور پھر بہت سے جوڑ پیوند اور دائروں اور کشش اور بعض دیگر باتوں میں فرق
ہے۔ اگر اس پر بھی کہا جائے کہ ایک ہے تو یہ بھی سہی۔ جس طرح یورپ کے تمام مخطوط جو رومن خط ہیں مختلف
حصوں میں پھیلے ہیں نستعلیق اگر ایران اور ہندوستان دونوں جگہ میں رہے تو دیکھا کیا نقصان ہے
بلکہ اور زیادہ فائدہ ہے۔ پھر تجارتی اور ملکی تعلقات کی وسعت کی وجہ سے اور بہتر ہے۔ اب یہ سوال
اِس زمانے میں ہندی نستعلیق کے لئے نہیں اُٹھایا جاسکتا کہ اِس کو ملکی زبان کا خط نہ ہونا چاہئے اسلئے
کہ بھاشا نے اِسے اپنے افعال دیدئے جو اصل زبان میں بمنزلہ رُوح کے ہیں۔ بھاشا نے اپنے حرف
ٹ۔ ڈ۔ ڑ دئے۔ اپنا تلفظ دیا۔ بھاشا نے اس کے لئے اپنے کو مٹا دیا بلکہ اِس اُردو زبان میں سما گئی
جس میں نستعلیق خط لکھا جاتا ہے۔ جو لوگ اب اس کے خلاف ہوں کہ نستعلیق خط کو ملکی زبان کا خط نہ ہونا
چاہئے ان کو یہ بات کسی طرح نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ اِن کے مورث نے عہد مغلیہ میں جب اس کی
نشو ونما ہو رہی تھی خود اس کی پرورش و پرداخت میں حصہ لیا۔ یہ سوال اُس وقت اُٹھانا چاہئے
تھا ان کے مورثوں کے نزدیک یہ نہ صرف غیر ضروری تھا بلکہ مہمل اور غیر اہم تھا۔ اس لئے جب
ان قدما مورث نے خاموشی اختیار کی اور اسے ملکی خط تسلیم کرلیا اور صدیوں سے ایسا عملدرآمد ہوتا
آیا تو جب متحدہ سعی سے اس کا ڈھانچہ بن رہا تھا اور اُس وقت اس کے لئے ایک ظرف کی تلاش
تھی اور اُردو بہ حیثیت زبان اور ہندی نستعلیق خط بہ حیثیت ملکی خط کے رُوپ میں آتا چلا تھا اُس
وقت یہ سوال پیدا کرنا چاہئے تھا کہ اس کا خط نستعلیق نہ ہو، دیوناگری ہو یا کچھ اور ہو مگر ایسا نہیں کیا گیا
تو اب اتنے دنوں بعد یہ بحث مانع تقریر مخالف سے زیادہ اہمیت آئین اور اصول کی نظر میں
نہیں رکھتی۔ ان حالات کے ماتحت اس مضمون کے موضوع کی ضرورت کے لئے بھی سوائے ہندی نستعلیق

سب باتیں کچھ اسی طرح بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں جس طرح علم الحروف سے سوالات کے جوابات نکالنے کا ذکر اوپر کیا گیا مگر مجھے اس کی صحت کا یقین ہے۔ پہلے مجھے معلوم نہ تھا کہ خط اور تحریر سے سیرت۔ عادات اور مرض کا پتہ بھی چلایا جاتا ہے، مجھے ایک بار عرصہ ہوا ایک اعلیٰ درجہ کے خوشنویس کے خط میں کچھ ایسی باتیں متضاد ملیں جس سے پتہ چلتا تھا کہ اسے اختلاج قلب کے قسم کی کوئی بیماری ہے۔ کیونکہ ہر جوڑ اور دائرے میں کچھ کچھ کہیں کہیں ایسی باتیں ملتی جاتی تھیں جس سے کچھ شک سا پیدا ہوتا جاتا تھا اور یہ خیال ہوتا تھا کہ خوشنویس کی مشق تحریر کامل ہے مگر کوئی اندرونی کیفیت دل میں ہے جو کمال کے ادا کرنے پر کہیں کہیں مانع اور سدراہ ہوتی ہے بالآخر غور سے معلوم ہوا اور پتہ لگا کر تصدیق کی تو یقین ہوا کہ اسے اختلاج قلب کی بیماری ہے

کچھ عرصہ ہوا اخبار پائنیر میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ لندن میں ایک لیڈی بیمار پڑی جس طرح وہ اچھی ہوتی جاتی تھی اس کا خط اچھا ہوتا جاتا تھا اور بجائے تھرمامیٹر سے جانچ کرنے کے روز اس کے خط اور تحریر اس کی رفتار صحت کا ماہرین فن پتہ لگاتے جاتے تھے۔ آپ کے خود مشاہدہ میں یہ بات آتی رہتی ہے کہ جب آپ کسی ایسے شخص کا خط دیکھتے ہیں جس کے ہاتھ میں رعشہ ہوتا ہے تو بغیر مسٹر باٹو دل کی نوایجاد علم کے اصول کو جانے ہوئے آپ اس کے خط کو دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ کسی ایسے شخص کی یہ تحریر ہے جس کے ہاتھ میں رعشہ ہے۔ میرے پاس ایک اعلیٰ درجہ کے خوشنویس کا کتبہ ہے جس کو دیکھ کر آپ میں سے ہر شخص یہ بتا دے گا کہ لکھنے والے کے ہاتھ میں رعشہ ہے۔ بہر حال اس پر بحث ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ غرض یہ کرنا ہے کہ خط طلی کے اثرات میں یہ وہ حیرت انگیز کرامت ہے کہ ابتک شاعری کو جزو پیغمبری کہا جاتا تھا اب خط طلی کو جزو پیغمبری کہنے میں کیا تامل ہے۔

پانچ چھ ہزار سال پہلے کبھی تصویروں کو خیال کا پرتو قرار دیکر خط کی ایجاد میں حصہ لیا گیا اور اسی خیال اور خط طلی کے اثرات نے آج دنیا میں انسان کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ کاش مصر عراق اور بابل کے قدیم تمدن والے انسان جو عمارتوں پر تصویریں غاروں اور مٹی کی تختیوں پر نقوش خط چھوڑ گئے اور ان کے کتبے آج تک گنج گراں مایہ کی طرح زمین اگلتی جاتی ہے آج موجود ہوتے تو دیکھتے کہ وہ پرانی دنیا کی فضا اور سناٹے میں جب نہ موٹر کی سیٹی کی آوازیں تھیں نہ ہوائی جہاز کی گھڑگھڑاہٹ تھی، انھوں نے جو خط ایجاد کیا اور جو محنت کی تھی وہ کس طرح ٹھوکا نے لگی۔ فقط

ممتاز حسین

حافظ صاحب مرحوم جو غالب مرحوم کے شاگرد تھے فرماتے تھے کہ غالب نے اس کے احترام اور اپنے عذر تقصیر کے لئے تین دن شراب ترک کر دی تھی۔ اس کو اہل علم چاہے معتقدات سمجھیں اور علمی بات نہ سمجھیں مگر بات سچی ہے اور علم جفر کے سچے علم ہونے کی یہ تائیدی مثال ہے۔

اب خطاطی کے اثرات سے ایک جدید اور حیرت انگیز علم کا ذکر کریں جو سائنس اور فلسفہ کے دور میں سترھویں صدی کے ایک مغربی ماہر نفسیات مسٹر باڈول نے فر[انس] میں ایجاد کیا۔ اس جدید علم کے ذریعہ سے انسان کی سیرت۔ اخلاق۔ عادت۔ نیک چلنی بدچلنی، صحت۔ سن وسال۔ قوم وقبیلے کا پتہ خط کو دیکھ کر چلالیا جاتا ہے۔ اس علم کی تائید[ی] مثالوں میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ۱۷۹۵ء تک نپولین اعظم کے دستخط سے حوصلہ مندی او[ر] اعتماد نفس کا اظہار ہوتا ہے ۱۸۰۴ء میں وہ صرف نپولین لکھتا تھا اور اس کی [قو]ت کی ترقی پر دستخط مختصر ہونے لگے تھے۔ دوران جنگ کے تمام دستخطوں کے نیچے جو لکیر ہو[تی] کھینچتا تھا وہ بہت موٹی ہوتی تھی۔ اس کے عام خط سے اس کی تلون طبعی کا ثبوت [دیا] گیا ہے۔ واٹرلو کی شکست کے بعد جب اس کا دل پژمردہ سا ہو گیا تو اس وقت۔ بعد اس کی تمام تحریروں کو سابقہ تحریر اور دستخط سے ملا کر اس علم کی تائید میں سراغ کی گئی تو معلوم ہوا کہ پھر تا آخر عمر اس کے خط سے روانی رخصت ہو گئی نہ حرفوں مو[ں] پیوستگی باقی رہی نہ وہ روانی۔ دستخط کی لکیر میں بھی وہ اوج پسند کشش باقی نہ ر[ہی]

اسی علم کی تحقیق کے سلسلہ میں محققین نے پتہ لگایا کہ انسان جب بولتا ہو[تا] تو آواز کے ساتھ ایک لطیف شئے برآمد ہوتی ہے جسے بعض لوگوں نے بصورت رنگ دیکھا ہے اور بعض نے کسی خاص شکل وصورت میں مشاہدہ کیا ہے۔ اس کی تحقیقات کے [لئے] میں لطیف آلات کی ایجاد سے پتہ چلایا گیا ہے کہ اگر کوئی گیت گایا جائے تو موجیں مختلف میں ابھر آتی ہیں۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر امریکہ کے ایک ماہر نفسیات مسٹر ہنری لارنس انکشاف کیا ہے کہ ہر شخص کی تحریر رنگین ہوتی ہے اور یہ رنگ جذبات کے لحاظ سے رہتا ہے۔

ہنری لارنس اور اس کے ساتھ اس کے بتائے ہوئے اصول کے تحت میں ا[س] نے مشاہدہ کیا ہے کہ خط اور تحریر سے رنگین، اور متحرک کرنیں پیدا ہو کر کاغذ پر نظر آتی ہیں۔

کے بغیر وہ قطعی بے جمال ہیں۔ تو ان تمام صورتوں میں جمال کے موضوعی نظریے کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

ان دونوں الفاظ "معروضی" اور "موضوعی" کو مندرجہ بالا معنوں میں لیتے ہوئے میرا خیال یہ ہے کہ جمال نہ محض موضوعی ہے اور نہ معروضی۔ بلکہ بقول جگرؔ ہ

حسن کے ہر جمال میں پنہاں میری رعنائیِ خیال بھی ہے

اگر جمال محض معروضی شے ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک ہی قدرتی شے کبھی حسین اور کبھی غیر حسین معلوم ہوتی ہے۔ اور اگر یہ محض ہماری اپنی فطرت کی کوئی صفت وضع یا عکس ہے تو اس بات کی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ہم عام انسانوں کی حیثیت سے جمال کو بجائے اپنی ذات میں پانے کے اشیا میں پاتے ہیں۔ حلولیت (Empathy) کے نظریہ سے اس امر کی وضاحت تو ہو جاتی ہے۔ کہ شعرا چاند تاروں کو کیوں اس طرح مخاطب کرتے ہیں۔ گویا وہ انھیں کی طرح کے انسانات ہیں۔ اور انسانوں کی طرح خیالات خواہشات جذبات اور طبائع رکھتے ہیں۔ اور یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ کیوں ہم ایک رنگ کو گرم یا سرد۔ بھاری یا ہلکا خیال کرتے ہیں۔ لیکن اس نظریے سے اس بات کی وضاحت نہیں ہوتی۔ کہ غروبِ آفتاب گلاب کے پھول۔ جنگل کے منظر یا ایک تصویر کو جمیل کیوں کہا جاتا ہے۔

ہیگل کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے میرا یہ خیال ہے کہ جمال موضوع اور معروض کے مابین ایک رشتہ کا نتیجہ ہے۔ تجربہ Experience دراصل اس ارتسام کا نام ہے۔ جو خارجی محرکات سے پیدا ہوتا ہے اور نہ محض اس مظہر کو کہہ سکتے ہیں جو نفس کی جانب سے ان محرکات کا قدرتی یا تحصیلی ردعمل ہے۔ بلکہ ہر تجربہ دراصل ان دونوں سے مرکب ہے۔ پُر جمال غروبِ آفتاب۔ ایک خوشنما تصویر۔ ایک دلفریب صورت یا ایک دلنواز نغمہ ایک منفرد تجربہ ہے۔ اس لئے ہر منفرد تجربے کی طرح اس میں ارتسام Impression اور اظہار (Expression) ہر دو کے عناصر موجود ہیں۔ ارتسام کا حصہ مشاہدہ میں زیادہ ہے۔ اور اظہار کا آرٹ میں۔ ہر قسم کا ادراک ایک طرف شخصیت اور دوسری طرف عالمِ معروضات objective world دونوں کا خشتہ کر تقاضا ہے۔ احساسِ حسن۔ عمل صرفی اور منطقیانہ قیاس کے حلقوں

جمال معروضی ہے یا موضوعی

(از جناب پروفیسر میاں محمد شریف صاحب ایم۔ اے۔ کینٹب)

فلسفیانہ باریکیوں سے پہلوتہی کرتے ہوئے عام تکیۂ خیال کی بنا پر ہم یہ فرض کئے یہ
ہیں کہ لفظ "اشیا" سے ہماری مراد پہاڑ۔ کتابیں۔ تصویریں۔ مورتیں۔ نظمیں اور گیت
وغیرہ ہیں۔ اور جب ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ آیا جمال معروضی ہے یا موضوعی تو ہمارا مقصد ا
امر کی تحقیق ہوتا ہے کہ آیا جمال اس نوعیت کی کوئی چیز ہے یا اس قسم کی اشیا کی کو
صفت ہے یا یہ کہ ان کے درمیان کسی رابطہ کو ظاہر کرتا ہے۔ یا ان کے جوہر کا نام ہے
جس کا وجود دیکھنے والے کی ذات سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ یا اس کے برخلاف یہ
دیکھنے والے اور صناع کی کوئی صفت۔ ذہنی قوت وضع یا فعل ہے۔ جب شیلے کہ
کہ شاعر "عالم رنگ و بو کا پردہ اُٹھا دیتا ہے۔ اور اس کے خوابیدہ حسن کو جو ا
ہیئتِ ظاہری کی رُوح ہے۔ بے نقاب کرتا ہے۔ یا جب اصغر اسی مضمون کو یوں با
ہے کہ ؎

بند ہو آنکھ اُٹھے منظرِ فطرت سے حجاب — لاؤ اک شاہدِ مستور کو عُریاں کر دیں

تو اس طرح وہ دونوں جمال کے معروضی نظریے کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن جب وہی اصغر ا
دوسرے جذبے کے زیر اثر یہ اشعار کہتا ہے کہ ؎

حُسن کے فتنے اُٹھے میرے مذاقِ شوق سے — جس سے میں بے چین ہوں یہ خود مری آواز ہے

ہیں نگاہِ شوق کی رنگینیاں چھائی ہوئیں — پردۂ محمل اُٹھا تو صاحبِ محمل نہ تھا

ہاں وادیِ ایمن کے معلوم ہیں سب قصے — موسیٰ نے فقط اپنا اک ذوقِ نظر دیکھا

یا جب وائی کاؤنٹ ہیموِل بیان کرتا ہے کہ" دورِ شفق میں بذاتہٖ کوئی جمال نہیں
وہاں محض کرۂ ہوا میں گرد و غبار۔ انجرات اور بادلوں کے ذریعے روشنی کی لہ
کا انتشار اور پرتو ہے" یا جب کروچے یہ کہتا ہے کہ" مناظرِ قدرت حسین صرف اُسی
ہوتے ہیں جب انھیں ایک آرٹسٹ کی نظر سے دیکھا جائے۔ اور آرٹسٹ کے اظ

قدر ہے۔ مقدران کے علاوہ وجود نہیں رکھتی۔'' میں الیگزنڈر کے بیان میں صرف اتنی ترمیم کرنا چاہتا ہوں کہ جمال اس ہیئتِ ترکیبی میں پایا جاتا ہے جو ان دونوں کے مابین رشتہ کا نتیجہ ہے۔ درحقیقت جمال ایک شئے مجرّدہ ہے جس چیز کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں وہ جمال مجرّدہ نہیں ہے بلکہ ایک جمیل معروض ہے اور اس کی ترکیب جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں دوگونہ ہے۔ جمال اسی طرح ایک جمالیاتی تجربہ کی ایک صفت ہے جس طرح کہ رنگ معروضِ محض کی ایک صفت ہے۔ اگر'' بادلوں کے ذریعہ آفتاب کی روشنی کی لہروں کا انتشار و انعکاس'' ایک معروض ہے تو دلفریب غروب آفتاب اس معروض اور فہم کرنے والے موضوع کے مابین ایک رشتہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے یہ نہ محض موضوعی ہے اور نہ محض معروضی بلکہ ایک تجربہ ہے جو معروض اور موضوع دونوں کے باہم رابطہ سے پیدا ہوا ہے۔ چونکہ ایک شئے کسی ایک وقت میں خالی از جمال معلوم ہوتی ہے اور دوسرے وقت میں جمیل۔ اسلئے یہ ضروری ہے کہ معروضِ محض اور جمالیاتی تجربہ جس کا کہ معروض محض ایک جزو ہے ان دونوں کے مابین ایک فرق قائم کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر مجھے آج ایک منظر خوبصورت نہیں معلوم ہوتا، حالانکہ کل وہ مجھے جمیل نظر آتا تھا یعنی اگر آج مجھے وہ ایک معروض محض معلوم ہوتا ہے حالانکہ کل میرے لئے ایک جمالیاتی حقیقت تھا تو اس فرق کی وجہ اس منظر کی متقابلۃً مستقل صفات معروضی نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا نفس کسی خاص طریقہ پر عمل پیرا ہے۔ گو مناظر میں جمال کا عدم و وجود نفس کے فعل پر منحصر ہے لیکن یہ اسی فعل کا مرادف نہیں۔ اس کا انحصار موضوع کے ایک خاص فعل پر ہے۔ یہ خود موضوع کی کوئی صفت یا فعل نہیں ہے۔ اگر دُوربین کے ذریعہ سے دیکھنے میں چاند اپنی اصلی جسامت سے دس گنا معلوم ہوتا تو اس کی یہ بڑھی ہوئی جسامت دراصل دُوربین کی وجہ سے ہے لیکن یہ دُوربین کی صفت نہیں ہے یہ مادۂ مدرکہ کی صفت ہے کہ وہ اگر دُوربین کے ذریعہ سے دیکھا جائے تو اپنی اصلی جسامت سے بڑا معلوم ہوتا ہے جس طرح کہ یہ دُوربین کا فعل ہے کہ وہ چاند کو بڑا کر دیتی ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ جسامت کا بڑھ جانا چاند کی یا دُوربین کی صفت ہے۔ یہ دراصل صفت ہے اس نئے ادراک کی جو دُوربین کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ یہی بات ایک جمیل تجربہ کی صورت میں صادق آتی ہے۔ جمال ایک دلکش غروب آفتاب کی صفت ہے نہ'' بادلوں کے ذریعہ سورج کی روشنی کی لہروں کے

کے اندر ارتسام اور اظہار کی باہم ترکیب کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس کا حلقہ وہ ہے جہاں کہ صریحی عمل اور منطقیانہ استدلال کا گزر ہی نہیں۔ عمل صریح اور منطقی تخیل بھی بلاشبہ ارتسام اور اظہار دونوں سے مرکب ہیں۔ لیکن یہ اور طرح کے مرکبات ہیں۔ علاوہ دیگر اختلافات کے ایک فرق یہ ہے کہ ایک میں کوئی خاص مقصد پیش نظر ہوتا ہے اور دوسرے میں منطقی روابط۔ جب جارجیس (Gorgias) یہ کہتا ہے کہ "سرود کی قوت روح کے خیال کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر روح کو اپنے سحر سے مسحور کرلیتی ہے" تو وہ اسی ارتسام اور اظہار کی ترکیب کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ہر چیز بجائے خود داخل و خارج کے باہمی عمل کا نتیجہ ہے۔ لیکن شئے جمیل درحقیقت اور بھی زیادہ دیسی ہے۔ اس لئے کہ وہ ایک ایسے باہمی عمل سے پیدا ہوتی ہے۔ جو تعبیر شدہ معروض اور شخص مدرک کے مابین ہوتا ہے۔ "کرۂ ہوا میں گرد و غبار ابخرات اور بادلوں کے ذریعہ ضیاء آفتاب کی لہروں کا انعکاس و انتشار" ایک ایسا معروض ہے جس کی ترکیب میں دیکھنے والے کے جسم و روح کو استقدر دخل ہے۔ جس قدر کہ خارجی وجوہ کو۔ خواہ وہ وجوہ کچھ ہی ہوں۔ لیکن ایک دلکش غروب آفتاب ایک ایسی ترکیب کا نتیجہ ہے کہ جو پہلی ترکیب سے بالا ہے یہ وہ ترکیب ہے جو نتیجہ ہے اس رابطہ کا جو معروض مرکبہ یعنی "بادلوں سے سورج کی روشنی کی لہروں میں انتشار اور انعکاس" اور نفس مدرکہ کے مابین ہوتا ہے۔ اور وہ موضوعی عناصر جو اس وقت استعمال ہوتے ہیں۔ اُن سے مختلف ہیں۔ جو پہلے معروض محض کی ترکیب کا موجب ہوئے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ احساسات نظر وغیرہ سے مختلف ہوتے ہیں جیساکہ پراَل Prall کا خیال ہے۔ "اگر توجہ وجدانی ہونے کی بجائے محض ادراکی ہے۔ تو یہ ثانوی ترکیب معروض التوا میں پڑجاتی ہے"۔ جو صفات حسی نفسی عملیات کے ایک مجموعہ کے ساتھ معروض محض کی ترکیب کرتی ہیں۔ وہی بعض دیگر عملیات نفس سے مل کر ایک جمیل تجربہ بناتی ہیں۔

جمال کو موضوعی اسی وقت کہا جا سکتا ہے جبکہ اس میں صرف موضوعی عناصر ہوں لیکن حقیقت حال یہ نہیں ہے۔ عناصر معروضی شلاً "بادلوں سے آفتاب کی روشنی کی لہروں کا انتشار و انعکاس" غروب آفتاب کے جمالیاتی تجربہ کے اسی طرح اجزاء ترکیبی ہیں جس طرح کہ وہ عناصر جو موضوعی ہیں۔ الیگزنڈر کا خیال ہے کہ جمال میں بھی "ہر ایک قدر کی طرح دو پہلو ہیں یعنی موضوع قدر اور معروض قدر اور دونوں کے باہم رابطہ کا نام

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ایک منظر کو خوبصورت منظر میں تبدیل کرنے میں
روض محض ایک خوابیدہ شریک کار نہیں ہے۔ صفاتِ حسی کے اپنے تقاضات ہوتے
ں جو موضوع کے فعل کا تعین کرتے ہیں۔ مثلاً تیز روشنی کا تقاضا یہ ہے کہ آنکھ کی پتلی
سکڑ جائے اور آنکھ کے پردے کسی قدر بند ہو جائیں۔ انا کسی ایک خاص طریقہ پر متاثر
ہو جاتا ہے اور اس کے تقاضے سے ایک خاص قسم کا ردعمل ظہور میں آتا ہے۔ بیشک
موضوع اپنے داخلی وسائل کے ذریعہ تجربہ پر بہت بڑا اثر ڈالتا ہے لیکن خارجی محرکات
ار ارتسامات بھی موضوع پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ اس کے اوپر زور ڈالتے ہیں اور اس کو
بنی طاقتوں کو ظاہر کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ جارجیس کی اصطلاح میں جمالیاتی تجربہ میں
معروضی "قوت" ہی ہے جو سب بندوں کو توڑ کر موضوع کی فطرت کے دریاؤں کو
روانی بخشتی ہے اور پھر اس کا ردعمل خود معروض پر ہوتا ہے اور ایک نیا نتیجہ یعنی ایک
جمالیاتی تجربہ ظہور میں آتا ہے جیسا کہ کوفکا Kofka نے بتایا ہے ہر ایک وضعی
معروض کا انحصار خارجی اور داخلی شرائط پر ہوتا ہے اور حسن کا ادراک اس عام قانون
سے مستثنیٰ نہیں کہا جا سکتا۔

آئیے اب ہم جمالیاتی تجربے کے ارتسامی پہلو کا بغور مطالعہ کریں۔ وہ صفت جو حسی
مواد کے لئے جو کہ ایک حسین مجموعے کے اجزا ہیں ضروری ہے وہ اس کی وحدت ہے۔ بہت
ممکن ہے کہ ایک سادہ رنگ۔ آواز یا خوشبو زیادہ پیچیدہ جمالیاتی تجربات کی خصوصیات
میں سے اور کوئی خصوصیت نہ رکھتی ہو لیکن اپنی طرف توجہ مبذول کرانے کے لئے اس میں
وحدت ضروری چیز ہے۔ لیکن وحدت کا لازمی ہونا پیچیدہ جمالیاتی تجربات میں اور بھی زیادہ
عیاں ہو جاتا ہے۔ اگر ایک وضعی معروض ایک منظم وحدت نہ ہو تو وہ جمیل نہیں ہو سکتا۔ جمال
کی ان پیچیدہ صورتوں میں ہم آہنگی اور تال و توازن بھی ضروری ہیں۔ علاوہ ازیں
معروض کی اور خصوصیات بھی ہو سکتی ہیں جو جبلی ردعمل کے لئے محرکات کا کام کرتی ہیں۔
مثلاً علاماتِ جنس و نوع۔ جسمانی کمزوری۔ قوت وغیرہ۔ قدرتی جمال میں یہ علامات پہلے ہی
سے موجود ہوتے ہیں اور فن میں آرٹسٹ ان علامات کو حسی مواد میں داخل کرتے ہیں اور
اس کو صورت (Form) سے خطاب کرتے ہیں۔

جن ارتسامات میں یہ خواص ہوتے ہیں وہ موضوع کے عضویہ میں بعض مظاہر یا

انتشار و انعکاس کی" اور نہ نفس شاہد کی۔ یہ صفت ہے نہ معروض کی اور نہ موضوع کی بلکہ اس تجربہ کی جو دونوں کے باہم تعاون سے مرتب ہوتا ہے۔

باعتبار وقت ایک ہی دماغ میں معروض محض کا ادراک ہمیشہ معروض جمیل سے قبل نہیں ہوتا۔ دراصل ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ بایں ہمہ منطقی نقطۂ نظر سے یہ اس تجربہ کی اولین شرط ہے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص مثلاً الف غروب آفتاب کو خوب صورت منظر سمجھے لیکن اس کے بہر بار کا مشاہدہ موضوع یعنی "بادلوں کے ذریعہ سورج کی روشنی کی لہروں کے انتشار و انعکاس" سے مشروط ہے۔ بعض دیگر نفوس کے لئے یہی روشنی کی لہروں کا انتشار و انعکاس محض روشنی کی لہروں کا انتشار و انعکاس کے سوا اور کچھ نہ ہو اور مطلقاً خالی از جمال ہو۔ ایک ہی نوعیت کی معروضی صفات ایک طرح کے موضوعی حالات میں معروض محض بن جاتے ہیں اور ان حالات میں اور اس کے علاوہ اور شرائط کے ماتحت تبدیل ہو کر ایک معروض جمیل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اے۔ سی۔ بریڈلے لکھتا ہے کہ "ایک خوبصورت منظر ایک حقیقی منظر نہیں ہے۔ جب ایک حقیقی منظر جمالیاتی حیثیت حاصل کرتا ہے تو اس کے بہت سے اجزا نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ فنون لطیفہ کے کسی نمونے کی خوبصورتی کے مشاہدے میں حقیقی شے کی کوئی اہمیت نہیں لیکن یہ اسی حد تک اہم ہے جس حد تک کہ یہ اس مشاہدے یا اس نمونے میں ظاہر ہوتی ہے"۔ میں یہ کہوں گا کہ بہت کچھ جو کہ حقیقی منظر میں پہلے موجود تھا اب نہیں رہا اور بہت کچھ جو اس میں موجود نہ تھا اب اس میں آگیا ہے۔

جو فرق ہم یہاں مدرکہ معروض محض اور اس کی خوبصورت شکل مثلاً "بادلوں کے ذریعہ سے سورج کی روشنی کی لہروں کے انتشار و انعکاس" اور دلکش غروب آفتاب کے مابین قائم کر رہے ہیں وہ بعینہٖ اس فرق کے مانند ہے جو گسٹالٹ عالمان نفسیات نے ایک منظر میں باعتبار جغرافیائی اور وضعی معروض کے قائم کیا ہے۔ ان کی اصطلاح میں معروض محض جغرافیائی معروض ہے اور معروض جمیل معروض وضعی ہے۔ معروض وضعی مختلف اشخاص کے لئے مختلف ہو سکتا ہے۔ اگر بالفرض جغرافیائی معروض آ ہے اور فہم کرنے والا ب ہے تو وضعی معروض آب ہوگا اور جمال نہ آ کی صفت ہوگی اور نہ ب کی۔ بلکہ آب کی۔

تحریک دینے کے لئے صفات حسی میں جس چیز کا ہونا لازمی ہے وہ ہے کہ ان علامات میں سے ایک یا ایک سے زیادہ ضرور موجود ہوں۔ جمالیاتی فیصلہ میں عام طور پر صرف جدا جدا احساسات، سادہ آوازوں، خاص قسم کے رنگوں یا مفرد لکیروں ہی پر خوبصورتی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ مگر بعض اوقات یقیناً یہی واحد سادہ ارتسامات مظاہر سے مل کر جمیل ہو جاتے ہیں۔ زیادہ پیچیدہ صورتوں میں نہ محض وحدت بلکہ ہم آہنگی۔ وزن اور دوسری خصوصیات بھی جو جبلتہائے کشش کو بھڑکاتی ہیں موجود ہوتی ہیں۔

اب ہمیں اس تصویر کے دوسرے رُخ کی طرف توجہ کرنی چاہئے یعنی جمالیاتی تجربہ کے شرائط و اجزائے موضوعی کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ جن موضوعی اجزا کی طرف سب سے پہلے توجہ منتقل ہوتی ہے وہ احشائی۔ حرکی اور عضوی احساسات ہیں۔ یہ عناصر اظہار جمالیاتی حقیقت کے نہایت ضروری اجزا ہیں اور یہ اپنے معروضی اجزا کے ساتھ اس طرح مخلوط ہوتے ہیں کہ ان کو علیحدہ کرنے کے لئے نہایت احتیاط کے ساتھ تجزیۂ نفس کرنا ضروری ہے۔ یہ محض نفسی ردِعمل ہی نہیں ہیں جو ماحول کی پیش کردہ محسوسات کے ساتھ بلکہ جمالیاتی حقیقت کی تعمیر کرتے ہیں۔ بیشمار چھوٹے چھوٹے تاثرات بدنی ردِعمل سے پیدا ہو کر جمالیاتی منظر پیش کرتے ہیں۔ جب میں سازندگان سے کوئی راگ سُنتا ہوں تو بہت سے احساسات جو میرے بدنی ردعمل سے پیدا ہوتے ہیں مجموعی جمالیاتی ہیئت میں ضم ہو کر میرے لئے راگ کو جمیل بنا دیتے ہیں۔ "ہم" "ہیجان۔ دھڑکن۔ لرزش۔ حرارت" یہ سب تاثرات بدنی ردِعمل کے ساتھ ساتھ کارفرما ہوتے ہیں۔ ان بدنی تبدیلیوں کے تاثرات کے ساتھ جذبات کا ذوب بھی ہوتا ہے، جو اشیاء جمیل کو مبہم سا جذباتی رنگ دیدیتے ہیں۔ راگ اور نظم میں ان کا خاص طور پر کافی حصہ ہے۔ ان عضوی تاثرات اور جذبات کا ذوب کا تاثر (راحت و کرب) بھی جمالیاتی حقیقت کا ایک جزو ہے۔ تمام حسین چیزیں مسرت بخش ہوتی ہیں اور تمام بدصورت چیزیں تکلیف دہ۔ یہ حقیقت اس قدر مسلّمہ ہے کہ بہت سے ماہرانِ جمالیات نے جمیل کی تعریف یہ کی ہے کہ جمیل وہ ہے جو خوش کن ہو۔ شئے جمیل کے مختلف عناصر انفرادی حیثیت سے ایجابی یا سلبی رنگ کے تاثر رکھ سکتے ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے وہ خود ہمیشہ خوشگوار ہوتی ہے۔ یہ رنگِ تاثر تین طریقوں سے پیدا ہوتا ہے۔ (۱) موادِ حسی اور وحدت۔ وزن۔ ہم آہنگی۔ جنسی علامات وغیرہ میں سے ایک یا ایک سے

ردِعمل پیدا کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اور ان میں کہاں سے یہ قوت آتی ہے؟ یہ قدرت کے ایسے نتیجے ہیں جن کی توضیح نہیں کی جاسکتی۔ بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ قدرتی محرکات ہمارے جبلتوں کے مناسب معروضات ہیں اور ان کا جبلی فعل سے تعلق عضویہ کے لئے مفید ہے ان دونوں کے باہمی تعلق میں جمالیاتی ارتقا کا بہت بڑا حصہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ روشنی سادہ یا مخلوط رنگ ہم آہنگی اور تال ذہن کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور اس کی قوتوں کو روانی بخشتے ہیں۔ ایک تین دن کا بچہ روشنی کی جانب مائل ہوتا ہے اور کچھ دنوں بعد تیز رنگوں میں جاذبیت پاتا ہے۔ اور بعد ازاں ہلکے رنگ اور ملے جلے رنگوں میں دلکشی محسوس کرتا ہے۔ تین سال کے بچے تال کو سمجھنے لگتے ہیں اور اپنے سر، بازوؤں اور ہاتھوں سے تال دینے لگتے ہیں اور جو راگ سنتے ہیں اس کے ساتھ ناچنے لگتے ہیں۔ ہم آہنگی کی طرف بچہ کی کشش بہت دنوں بعد ہوتی ہے لیکن جب وہ اس کی طرف مائل ہوتا ہے اس کا نمایاں اثر پایا جاتا ہے۔ ردِعمل اور محرکات کا یہ باہمی تعلق اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ فطرت سب تجربات کی تعمیر میں جمالیاتی تجربات کی ترکیب میں بھی اور اسی طرح نفس کے ساتھ تعاون کرتی ہے۔

یہ تعاون اور ہم آہنگی بلکہ خوش آہنگی ایک ایسے ازلی مُغنی کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کے گائے ہوئے راگ کے یہ دونوں زیر و بم ہیں۔ حسن کی یہ علامتیں مثلاً وحدت، ہم آہنگی، وزن وغیرہ موضوع میں جن جبلتوں کو تحریک میں لاتی ہیں، اُن کو مجموعی طور پر ایک ہی جملہ میں جبلتہائے جاذبہ کہا جاسکتا ہے۔ ان جبلتوں میں میرے نزدیک جبلت جنسی۔ جبلتِ محافظت۔ مل جل کر رہنے کی جبلت۔ جبلتِ تجسس۔ جبلتِ اطاعت جبلتِ حصول۔ جبلتِ تعمیر۔ جبلتِ ہمدردی اور جبلت ہنسی شامل ہیں۔ ان جبلتوں کی وجہ سے اپنے قدرتی معروضات کے ساتھ تقرب حاصل کرنے اور ان میں محو ہو جانے یا اُسے برقرار رکھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ کوئی نفرت انگیز معروض جمیل نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ ایک ایسے معروض کا جو بحیثیت مجموعی دلکش ہو۔ ایک جزو بن سکتا ہے۔

جبلتہائے جاذبہ کو ایک متوازن تحریک دینے کے لئے ایک نغمے کے لئے ضروری نہیں کہ ان علاماتِ صوری میں سے ہر ایک موجود ہو۔ جمالیاتی تجربہ کے مواد مثلاً رنگ۔ آواز وغیرہ میں صرف وحدت کا وجود ہی کافی ہے موضوع کے مظاہر

پیدا ہوتے ہیں اور افکار سے افکار پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں اور مجموعی حلقۂ جمیل ایک ایسے مبہم ماحول سے گھر جاتا ہے جو کنائی صفات اور علائق سے بھرپور ہوتا ہے۔ یہ افکار و تصورات تمثیلی اشارات کے ذریعہ سے حلقۂ جمال میں روحانی کیفیات کا ایک ذخیرہ جمع کر دیتے ہیں جو ان کی مدد کے بغیر فنون کے لئے مواد نہ بن سکتا۔ نظم میں حسن کا تعلق خاص طور پر روحانی کیفیات سے ہے تشبیہات اور استعارات بدرجۂ اتم توجہ چاہتے ہیں۔ وہ ان موتیوں کی طرح ہیں جو دور دراز سمندروں سے لائے گئے ہوں یا ان جواہرات کی طرح ہیں جو بعید ممالک سے حاصل کئے گئے ہوں اور جن کو جمع کر کے نت نئی ترکیبوں سے جڑا گیا ہو۔ وہ نادر ہوتے ہیں اور ان کی ندرت کو عمل ہی کی طرف کیوں نہ اشارہ کرتی ہو عمل سے باز رکھتی ہے اور روح کو اپنے میں محو کر لیتی ہے۔

استعارات تمثیلی تصورات ہیں اور تصورات علم النفس کی رُو سے ایسے ہی واقعات ہوتے ہیں جیسے کہ محسوس شدہ اشیاء۔ لیکن افکار واقعات نہیں ہوتے وہ مطالب ہوتے ہیں۔ مطالب کو نہ تو ادراکی طور پر دیکھا جا سکتا ہے نہ ان کی تصویر ذہن میں کھینچی جا سکتی ہے وہ محض اشیاء کے حوالے ہیں۔ وہ محض اشیاء کے مطالب ہیں چونکہ افکار جمالیاتی واقعہ کے موضوعی عناصر میں شامل ہیں اس لئے تمام ترقی یافتہ جمالیاتی واقعات پُر معنی ہوتے ہیں اور یہ معانی نفس کے جبلی اور تحصیلی رجحانات پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ دراصل ان کا انحصار نفس کی پوری تعمیر پر ہے۔

ہم نے ابتک یہ بتایا ہے کہ عضوی تاثرات۔ جذبات کا ذوب۔ تصورات رنگ تاثر اور افکار ہی جمالیاتی واقعہ کے اجزائے ترکیبی ہیں لیکن در اصل صرف یہ اظہاری عناصر ہی نہیں ہیں جو جمال کے پیدا کرنے میں عمل پیرا ہوتے ہیں بلکہ پوری شخصیت سے اس کا تعلق ہے۔ جب ایک چھوٹا سا بچہ ایک راگ کو سنکر اپنے سر اور ہاتھ و پاؤں سے تال دیتا ہے تو اس طرح اس عمل میں اس کا تمام جسم و نفس کار فرما ہوتا ہے۔ انبساط کا اثر کسی ایک جذبہ یا رجحان پر نہیں ہوتا اور اس حقیقت کو نظر انداز کرنے میں ہی فرائڈ اور اڈلر اور ایڈگر غلطی پر ہیں اس لئے کہ اول الذکر تمام حسن و جمالی کا دار و مدار جبلت جنس پر رکھتا ہے اور موخر الذکر جبلت تعمیر پر۔ کسی ایک جبلت پر اثر بالعموم ایک مخصوص صریح ردعمل پیدا کرتا ہے۔ جب یہ ردعمل دب جاتا ہے تو عصبی علامات اور ذہنی آلام پیدا ہو جاتے ہیں۔

زیادہ صوری علامات۔ (۲) منتشر عضوی اور حرکی تاثرات (۳) ان منتشر تاثرات کا عضو پر اثر اور اس وجہ سے حسیت میں تبدیلی اور اس تبدیلی کے باعث مواد محسوسات میں تبدیلی۔

عضوی تاثرات۔ جذبات کا ذوب اور رنگ تاثر یعنی راحت و کرب کے علاوہ نظم یا راگ کی طرح کے پیچیدہ جمالیاتی تجربات میں تمثالی اور تخیلی مواد بھی بہت کافی ہوتا ہے۔ یہ حقیقت اس قدر نمایاں ہے کہ اظہاریت کے معتقدین کے نزدیک مجموعی جمالیاتی حقیقت محض تخیل ہی میں مکمل ہو جاتی ہے۔ جمالیاتی تجربہ کے لئے افکار منسلکہ لازمی نہیں ہیں لیکن جب یہ موجود ہوتے ہیں تو اس کے حلقہ کو بہت زیادہ وسیع کر دیتے ہیں۔

تمثال اور افکار جمالیاتی حلقہ میں یا تو مبہم ہوتے ہیں یا صریح۔ جب مبہم ہوتے ہیں تو عناصر معروضہ میں ضم ہو کر ان میں انسانی روح کے انوار تجلیات کا رنگ بھر دیتے ہیں۔ صریح تمثال اور افکار کی حیثیت سے یہ دو طرح کا کام کرتے ہیں۔ اول جمالیاتی کیفیات نفسی میں جن سے شاعر کو تعلق ہے وہ معروضات کا کام دیتے ہیں وہ محض معروضات اور ان کی صفات کی یاد ہیں یعنی تمثیلی اور فکری تصویریں ہیں اور اس لئے وہ معروضات کی طرح ہی کام کر سکتی ہیں اور کرتی ہیں۔ ذہن میں محفوظ معروضات اور ان کی صفات کی حیثیت سے ان میں ایک یا زیادہ صوری خصوصیات مثلاً وحدت۔ ہم آہنگی۔ وزن وغیرہ لازمی طور پر ہوتی ہیں یا ماہر فن قصداً گو اضطراراً ان میں یہ خصوصیات پیدا کر دیتا ہے۔ تاکہ ان کے استعمال سے جمالیاتی مواد اس قدر دلکش ہو جائے کہ نفسی مظاہر پیدا ہونے لگیں۔

ان ذہنی عملیات کا دوسرا کام اظہار سے متعلق ہے۔ یہ تمثیلی یا فکری ردعمل ہیں۔ جو غیر مناسب معروضات یا اُن کے تمثیلی اور فکری تصورات تحریک میں لا کر اُن کا اپنے گرد مظہر حالہ بنا لیتے ہیں۔ یہ ایک ایسے عمل سے پیدا ہوتے ہیں جس کو پروفیسر اسٹاوٹ نے تشبیہات کی ترکیبی تولید بتایا ہے۔ یہی وہ عمل ہے جو ایک حد تک آرٹ میں تشبیہات استعارات۔ اور نشانات کا ذمہ دار ہے۔

یہ تشبیہات۔ استعارات اور نشانات کلیہ کا کام دیتے ہیں جن سے وہ جذباتی اور ذہنی رجحانات جو گزشتہ زمانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ بکثرت معرض وجود میں آ جاتے ہیں اور اس طرح جمالیاتی تجربہ اظہاری ارتعاشات سے مملو ہو جاتا ہے۔ تصورات سے آنے

توکسی حاجت کا احساس ہی نہیں ہوتا اور اس لئے کوئی عمل صریح بھی رونما نہیں ہوتا۔ محض ایک عمل کم بیدار اور عمل تخیل ہی رہ جاتے ہیں۔ مشاہدے میں یہ عمل اس توجہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جو شاید مشہود کی طرف مبذول کرتا ہے اور فن میں اضطراری تعبیر کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس لئے وہ عمل جو مشاہدے اور فن سے متعلق ہے اس عمل سے کوئی تعلق نہیں رکھتا جو خود وجدانی کیفیت سے باہر کسی اور مقصد کے حصول ذریعہ ہو۔ جیساکہ اِسٹرن نے بتایا ہے عمل ان حسب ذیل تین صورتوں میں مقصد لئے ہوئے ہوتا ہے :-

(۱) فعل کا اندرونی مقصد۔ جیساکہ کھیلوں میں (مثلاً کرکٹ کا میچ جیتنا)۔

(۲) مقصدِ کائنات جس کا خود فاعل کو علم نہیں ہوتا جیساکہ لڑکیوں کے کھیل میں گڑیا گڈے کی شادی۔

(۳) ایسا مقصد جو عمل سے باہر ہوتا ہے مگر جس کا عامل کو علم ہوتا ہے جیساکہ تاش کھیلنے کے ذریعہ سے روپیہ کمانا۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فن سے متعلق فعل بلا کسی مقصد کے ہوتا ہے تو ہمارا مدعا اس سے محض یہ ہے کہ اس میں اِس تیسری صورت کا مقصد نہیں پایا جاتا۔ پہلی دو قسم کے مقاصد آرٹ کا لازمی جزو ہیں۔

یہ جمالیاتی عمل بھی انسانی اعمالِ صالح کی ایک شکل ہے۔ بدقسمتی سے اس حقیقت کو زاہدانِ خشک اور شیوخِ مدرسہ اکثر بھول جاتے ہیں۔ غالب یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ

ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال ۔۔۔ خُلد کا اک در ہے میری قبر کے اندر کھلا

غرض فن کی تخلیق اور شہود میں فاعل کی شخصیت کی حالت دیگر ذہنی حالتوں کی طرح وقوفی۔ بُراثر اور عملی ہوتی ہے۔ وقوفی طور پر یہ جز نہیں نظر ہے۔ باعتبار اثر یہ رس یا فوری تسکینِ جذبات سے مملو ہو ۔۔۔ ہے اور باعتبار عمل بیرونی غرض و غایت سے پاک ہوتی ہے اس طرح فاعل کا تمام ذہن ایک خاص کیفیت میں ہوتا ہے۔

ذہن کی یہ کیفیت اسی وقت ممکن ہوتی ہے جبکہ ہیجانات میں توازن ہو۔ عدم توازن کی صورت میں فوری تسکین اور طلبی بے غرضی ممکن نہیں۔ اس صورت میں بھی جبکہ معروض جمیل محض ایک ہی جبلت ۔۔۔ کا محرک ہو۔ مثلاً برہنہ مرد اور عورتوں کی تصویر۔ تو یہ ان سارے وقوفی۔ جذباتی اور طلبی عناصر کے ساتھ جو تمام عضویہ کی تحریک سے پیدا ہوتے

حسی مواد اور ان پر مبنی تصورات یا اس کی طرف ذہنی حوالے یعنی افکار یہ سب اس وقت تک جمالیاتی پہلو اختیار نہیں کر سکتے۔ جب تک کہ تمام عضویہ کو حرکت میں نہ لائیں اور جبلتوں کی مجموعی، مبہم قوتوں کو آزاد نہ کریں۔ ہم بھی بچہ کی طرح مشاہدہ اور اشیاء کی تخلیق اپنی ساری ہستی کے ساتھ کرتے ہیں لیکن جب ہم ایک جمیل شے کی تخلیق یا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہماری تمام ذات ایک عجیب حالت میں ہوتی ہے۔ ہم واقف ہیں لیکن ہمارا وقوف ایک ٹھوس شے تک محدود ہے نہ کہ اس کی کسی عمومی خصوصیت تک۔ سوائے اس کے جو ذہن میں فطری طور پر پیدا ہو جائے۔ چونکہ نفس مقاصد و ذرائع کے انتخاب یا فکری تحلیل میں مصروف نہیں ہوتا ہے بلکہ معروض کی موجودہ وحدت میں پوری طرح محو رہتا ہے تو اس میں وجدانیت یا فہم بلا واسطہ اس طرح کا ہوتا ہے کہ جس میں موضوع اور معروض کے مابین فرق بھی مقابلۃً محو ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح فیصلہ اور اعتقاد بھی کچھ دیر کے لئے جاتے رہتے ہیں۔ فن کے تخلیقی عمل میں شعور کی اس فوری اور وجدانی کیفیت کا اس کے گزرنے کے بعد مطالعہ کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک الہام تھا جسے کسی خارجی قوت نے روح پر نازل کیا ہو ۔ اسی قسم کا توہم اشراقی وضع کے جمالیاتی نظریات کا موجب ہو جاتا ہے۔ کون بڑا شاعر ہے جو اپنے آپ کو پیغمبر نہیں سمجھتا۔ اور اس میں غالب کا ہم زبان نہیں ہوتا۔ کہ ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں غالب سریرِ خامہ نوائے سروش ہے

ہمارے اوپر ایک خاص اثر ہوتا ہے لیکن یہ اثر کسی خاص جبلت سے متعلق نہیں ہے جیسا کہ ہم اس سے قبل بیان کر چکے ہیں۔ یہ کئی جذبات کا ذب اور عضوی احساسات کی منتشر اور غیر ممیز شکل میں محسوس ہوتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو کہ قدیم ہندوستان کے ماہرین جمالیات نے 'رس' کے نام سے تعبیر کیا ہے یہ ہمارے کسی حصہ کی نہیں بلکہ مجموعی طور پر تمام ذات کی فوری تسکین کا احساس ہے۔

ہم عمل میں مشغول ہوتے ہیں لیکن یہ عمل کسی محرک کا صریح رد عمل نہیں ہے۔ چونکہ جمالیاتی دائرہ میں ہم کو فوری تسکین حاصل ہوتی ہے اس لئے کسی مقصد کے تلاش کرنے کے ذریعہ سے تسکین حاصل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عمل صریح کسی حاجت کے پورا کرنے کی غرض سے کیا جاتا ہے لیکن جب موجودہ سے کامل اطمینان حاصل ہو رہا

...... ماہرِ فن عالم اور صاحب عمل تینوں ایک عام آدمی کے مقابلہ میں جبلی توانائی سے زیادہ بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اس حیثیت سے غیر معمولی انسانوں یعنی geniusesمیں کوئی فرق نہیں ہوتا خواہ اُن کا حیطۂ عمل فنِ سائنس یا زندگی ہو اگر یہ صحیح ہے تو وہ کونسی چیز ہے جو ماہرین فن کو ان دوسری شخصیتوں سے ممیز کرتی ہے؟ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ایک سائنس داں میں تفحص کی جبلت غالب رہتی ہے اور یہ جبلت بیدار ہوتی ہے اس عدم اطمینان سے جو موجودہ معلومات کی قلت و تہی دامنی سے پیدا ہوتا ہے اور ایک صاحب عمل میں خودی کی جبلت زور پر ہوتی ہے اور یہ اس عدم اطمینان سے بیدار ہوتی ہے جو موجودہ مشکلات سے پیدا ہوتا ہے۔ موجودہ سے عدم اطمینان یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان ہر دو اشخاص کا عمل ایک ایسے مقصد کی جانب ہوتا ہے جو موجود نہ ہو سے آگے ہے اور اس لئے یہ اشخاص ہیجانات میں وہ توازن حاصل نہیں کرسکتے جو موجودہ پر اطمینان ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ ان کے برخلاف ماہرِ فن اور حسن پرست جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اپنے فوری مشاہدے سے اطمینان حاصل کرتے ہیں اور ان کا کوئی مقصد اس عمل سے خارج نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ نظر بذاتِ خود کسی دنیاوی۔ قومی یا ذاتی مقصد کو پیش کرے۔

مقاصد کائنات میں نظر کی مثالیں ہمیں ایسکیلس۔ فلاطون۔ رومی اور اہل تصوف کے تخیل میں ملتی ہیں اور عمرانی مقصد کی مثال دکٹر ہیوگو۔ ٹالسٹائی۔ شیلے۔ شا۔ گورکی۔ ابسن۔ اقبال وغیرہ نے کلام میں پائی جاتی ہے ذاتی مقصد کے ادراک کی مثال شاید کیٹس کی شاعری کے سوا اور کہیں نہیں

علاوہ ازیں ایک اور خاص دماغی عمل ہے جو اس فرق کا موجب ہے۔ فرائڈ نے اس عمل کو اس کی سلبی صورت میں دباؤ بتایا ہے۔ لیکن اس کے ایجابی پہلو پر زور دینے کے لئے میں اس کو "تحفظ" کہوں گا۔ یہ ایک عام نفسیاتی اصول ہے کہ محرک اور ایجاب میں جس قدر وقفہ زیادہ ہوگا اسی قدر آزاد اور اضطراری تصور اور تفکر کا ارتقا ہوگا۔ نوزائیدہ بچے میں محرک کی موجودگی میں فوری ردِ عمل کا مادہ ہوتا ہے۔ بایں ہمہ ان دونوں میں کچھ نہ کچھ وقفہ ضرور رہتا ہے۔ جیسے جیسے بچہ اپنی حرکات پر قابو پاتا جاتا ہے یہ وقفہ بتدریج بڑھتا جاتا ہے۔ تصورات و تفکرات بھی ساتھ ساتھ بڑھتے ہیں اس لئے کہ تمام حسی محرکات حسی عمل کے ذریعہ سے معکوس حرکات میں

ہیں ایک جان ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کی صفت خصوصی ختم ہو جاتی ہے اور اس کے
ساتھ اس کی وہ قوت بھی ختم ہو جاتی ہے جو ایک مخصوص جبلت کو اپیل کرتی ہے۔ یہ ایک
عام محرک بن جاتا ہے جو تمام ہیجانات کو متحدہ طور پر کامل ہم آہنگی کے ساتھ برسر کار لے
ہے۔ کوئی ہیجان دوسرے ہیجانات سے تضاد نہیں رکھتا۔ یہ توازن ان ہیجانات یا ہیجا
کے مجموعوں کے مابین جو باہم متضاد ہوں توازن نہیں اس لئے کہ اس کے معنی تو تواز
ہوں گے نہ کہ توازن متحرک۔ جب برابر کی قوتیں ایک دوسرے کے مقابل ہوتی ہیں
اس کا نتیجہ جمود ہوتا ہے جب تمام قوتیں ایک ہی جانب برسرِ عمل ہوتی ہیں تو وہ اپنی حرکت
برقرار رکھتی ہیں اور ان میں توازن متحرک پیدا ہوتا ہے۔ لیقرؔ نے اس توازن کو "اعما
اتحاد اور ان کی ہم آہنگی" قرار دیا ہے اور غالبؔ نے اسے "آرزو خرامی" کہا ہے۔ بظا
یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی محرک کی خصوصیات اتحاد و ہم آہنگی کا عکس موضوعی اعمال پر
پڑ جاتا ہے۔ اور چونکہ یہ خصوصیات ارتسام و منظر دونوں میں ہوتی ہیں اس لئے ان سے
تعبیر شدہ شئے جمیل میں بھی پائی جاتی ہیں۔ تمام احساسات۔ افکار۔ ہیجانات اور توقعا
مل جل کر معروضی مواد (حقیقی یا ذہنی) کے گرد ہالہ بنا لیتے ہیں اور شئے جمیل کی تخلیق کا
باعث ہوتے ہیں۔ صرف ذہنی عضویہ یا شخصیت جمال کا مشاہدہ کر سکتی ہے جس میں اس قس
کے ہیجانات کا توازن متحرک ہو۔ اس توازن کی حرکی کیفیت دو قسم کے اعمال میں ظا
ہوتی ہے :۔

(۱) کسی منظر یا موضوع کو زیر توجہ رکھنے میں۔

(۲) فن میں تصور کا اضطراری ظہور۔ اس کی مزید تشکیل اور اس کا دوسروں
اظہار۔ بہر حال یہ توازن یا ایک جمہوری نظام کی طرح ہوتا ہے۔ جس میں تمام ہیجانات گویا برا
کا حق رکھتے ہیں۔ یا ایک مطلق العنان حکومت کی طرح جس میں تمام نظام ایک ہی ہیجان کے
زیر اقتدار کار فرما ہو۔ دوسری حالت میں اکثر جذبۂ محبت کی حکومت ہوتی ہے اور شاعر کی
حالت ایسے عاشق کی سی ہوتی ہے جو فنا فی العشق ہو اور جس کے لئے بیرونِ عشق کوئی مقص
نہ ہو۔ حتیٰ کہ وصالِ یار کی خواہش سے بھی بے نیاز ہو جائے اور کہہ اٹھے کہ ع

تشنۂ دردم مرا با وصل و با ہجراں چہ کار

وہ عشق سے اس قدر لذت گیر ہوتا ہے کہ اس کے لئے خیال وصال بھی تکلیف دہ ہو جاتا ہے

داستاں ان کی اداؤں کی ہے رنگیں لیکن　　اس میں کچھ خونِ تمنا بھی ہے شامل میرا

جبلی خواہشات کے دباؤ ہی سے انسانی نصب العین بنتے ہیں اور یہ نصب العین فن کے اندرونی اجزاء قرار پاتے ہیں۔ اس لئے افلاطون اور ہیگل بھی حقیقت کے ایک پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں، جب وہ کہتے ہیں کہ فن نصب العین کی تشکیل کا نام ہے۔

اِس کی کیا وجہ ہے کہ ماہر فن اس قدر سریع الحس ہوتا ہے اور معمولی سی چیز اس میں غیر معمولی تاثیر پیدا کر دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معمولی سے موقع پر بھی دبی ہوئی جبلتوں کی محفوظ اور جمع شدہ طاقت اضطراری طور پر تصورات کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ جبلی طاقتوں کا دب کر محفوظ ہو جانا اور فکری اور تصوری عمل کے ارتقا کا سبب بننا کم و بیش ہم سب میں پایا جاتا ہے لیکن ماہر فن وہ شخص ہے جس کے حصہ میں جبلی توانائی زیادہ آتی ہے اور دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں دباؤ و تحفظ کا بھی اس کو زیادہ حصہ ملا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذرا سی تحریک سے تصورات کے فوارے چھوٹنے لگتے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھلنے لگتے ہیں

ضبط جنوں سے ہر بن مو ہے [illegible]　　[illegible] تیشے تو نیشتر [illegible]

بہرحال دباؤ کے ذریعہ تحفظ کا عمل [illegible] ہے اور [illegible] آرٹسٹ کے جسم و جاں کے لئے ناقابل برداشت ہونا چاہئے کیونکہ اس حالت میں اس کا نتیجہ دیوانگی ہوگا۔ اس طرح ہیجانات کا توازن جو تمام آرٹ کی لازمی شرط ہے اور جمال کے تخیل کے لئے ضروری ہے ٹوٹ جائے گا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جس خاندان میں ذہانت زیادہ ہوتی ہے اس میں دیوانگی بھی زیادہ پائی جاتی ہے اور شاعر اور مجنوں کو ایک باریک پردہ جدا کرتا ہے۔ شاعر اگر شاعر نہ ہوتا تو دیوانہ ہوتا۔ بقول غالب:-

گر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا　　بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

تنگیِ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے　　کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

اظہار عین فطرت ہے اور اس کا دباؤ سراسر بیماری ہے۔ اور ہم آہنگ خواہشات کا ضبط کے ساتھ اظہار و ارتسام سے مل کر فن کہلاتا ہے۔ تھامس مان اپنی تصنیف "لوئی ان وائمر" میں بزبانِ ایڈیل یہ کہتا ہے کہ "فن بے ضبطی کی حالت [illegible] ہے" ایک دیوانے اور ماہر فن میں خاص خاص فرق یہ ہیں:-

(۱) ماہر فن کی ذہنی ترکیب یا ساخت مرتب و منظم ہوتی ہے اور دیوانے کی غیر مرتب

منتقل نہیں کئے جاتے ۔ بلکہ عضویہ ان کو میلانات کی شکل میں محفوظ رکھتا ہے۔ بذ نیا ؤ
اصطلاح میں عصبی توانائی اور نفسیاتی اصطلاح میں شعوری تجربہ کا تحفظ فوری ایجابو
میں رکاوٹ کی وجہ سے عمل میں آتا ہے۔ ماحول کے مزاحمات اور حادثات ان ایجابات
رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ سب سے بڑی رکاوٹیں مکان ۔ زمان اور عمرانی قوانین ہیں
ایک بچہ جبکہ وہ اپنی ماں کو کچھ فاصلہ پر دیکھتا ہے تو وہ ماں کے ہاتھوں میں اچھل کر
کا ہیجان محسوس کرتا ہے لیکن مکان کا فصل اس ردعمل میں رکاوٹ ڈالتا ہے اس سے
تصور کرنے لگتا ہے کہ وہ ماں کی گود میں ہے۔ اپنے دودھ کی بوتل کو دیکھ کر بچہ اس کو
چاہتا ہے لیکن اُسے دودھ کے وقت کا انتظار کرنا ہے اس لئے اس وقت تک اسے
کے تصور میں رہنا ہے۔ ایک لڑکا اپنی دوست لڑکی کو بوسہ دینا چاہتا ہے لیکن تہذیب
اس فعل میں مانع ہے اس لئے اس کو محض بوسے کے خواب ہی پر قناعت کرنا ہوتی ہے۔
مزاحمات کی وجہ سے جبلتوں کی توانائی عمل صریح میں ظاہر نہیں ہوتی اس لئے وہ مح
ہو جاتی ہے جیسے جیسے انسان کی زندگی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ مزاحمات جو انسان کی خواہشا
کو صریح عمل کی صورت میں لانے میں مانع ہوتے ہیں بڑھتے جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ
اس کے تصورات۔ خیالات اور نصب العین کا دماغی ذخیرہ بھی بڑھتا جاتا ہے۔ ع

رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

صورت حال یہ ہے کہ جو نالے لب تک نہ گئے ہوں وہی سینے کے داغ بنتے ہیں اور ان
حسن کی چراغاں ہوتی ہے۔ چونکہ رُکی ہوئی توانائی اضطراری اور بلاواسطہ اظہار کے
کی عدم موجودگی میں بالواسطہ اظہار کے طریقے نکال لیتی ہے۔ اس لئے اظہار کی تعمیر
استعارات اور اشارات کے پھول کثرت سے لگائے جاتے ہیں۔ غالب نے اس مصرع میں

نفسِ سوختہ رمزِ چمن آرائی ہے

اسی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ ناتمام خواہشات سے تمنائیں اور آرزوئیں بنتی ہیں اور ا
حسن کی آبیاری ہوتی ہے۔ ع

سو حسن کروں پیدا ایک ایک تمنا سے

اور جب تمناؤں کا خون ہو جائے تو اس سے حسن میں صدہا رنگینیاں جلوہ نما ہوتی ہیں۔ ا
میں اصغر نے یہ کہنے میں کسی قدر انکسار سے کام لیا ہے کہ:

دخل ہے۔ اگر کانٹ کی طرح اشیا محض کو مجازی کہا جائے تو اشیا جمیل اس اتحاد سے عمل میں آتی ہیں جو معروض اور موضوعی مجازیات یا مظاہر کے مابین ہو۔ اور حسن ان اشیا کی ایک خاص صفت ہے۔ اس صفت کو وجود میں لانے کے لئے ایک ایسے معروض جس میں کہ اتحاد۔ ہم آہنگی۔ وزن اور دوسری صورتیں جو جاذب جبلتوں سے متعلق ہیں اور ایک ایسے موضوع جس کے ہیجانات میں حرکی توازن ہو، ان دونوں کے درمیان اتحاد ضروری ہے۔

مجھے ارسطو سے اس بات میں اتفاق ہے کہ معروض کی صفات صوری مشاہدۂ جمال کے لئے ضروری ہیں اور میں ہیگل سے اس امر میں متفق ہوں کہ جمال معروض اور موضوع کے باہم رشتہ سے پیدا ہوتا ہے اور اس میں نصب العین کی تشکیل ہوتی ہے۔ کروچے کے خیال سے مجھے اس حد تک اتفاق ہے کہ جمال کے لئے اظہار ضروری ہے۔ رچرڈس ٹھیک کہتا ہے کہ صرف وہ معروضات جو ہیجانات کے توازن کا سبب بنتے ہیں جمیل کہے جا سکتے ہیں۔ میں سینتیانہ سے متفق ہوں کہ خوبصورت شے ہمیشہ خوشگوار ہوتی ہے۔ فرائڈ کا یہ خیال بھی بجا ہے کہ جمال کے مشاہدہ اور تخلیق میں اور جبلتوں کے ساتھ ساتھ جبلت جنس کا بڑا درجہ ہے۔ لیکن میرے خیال میں ان میں سے ہر ایک شخص اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں میں سے صرف ایک پر زور دیتا ہے۔ حالانکہ فن کے ایک جامع نظریے کے لئے ان تمام پہلوؤں پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ جمالیاتی تخیل میں آسانی کی خواہش ہمیشہ باعث مضرت رہی ہے اور اس لئے اب اس کو ختم کر دینا چاہئے۔ خواہ ہم پر انتخابیت کا الزام ہی کیوں نہ عائد کر دیا جائے۔

ایم شریف

(۲) ماہر فن کا تجربہ وسیع، ہم آہنگ اور خوشگوار ہوتا ہے۔ اور دیوانے کا تجربہ تنگ میکانکی۔ اور اکثر غیر خوشگوار ہوتا ہے۔

ہم نے دباؤ اور تحفظ کی یہ بحث اس لئے شروع کی تھی کہ ایک طرف آرٹسٹ دوسری طرف سائنس داں اور مرد کار کے مابین فرق معلوم کریں۔ ہم نے جواب میں یہ کہا کہ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ شخص کی جبلت کا سائنس داں میں تقدار ہوتا ہے اور خودی کی جبلت مرد کار میں اور ان دونوں کا مقصد موجودہ شہود سے آگے ہوتا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ نسبت ماہر فن کو دباؤ کے ذریعہ سے تحفظ کا زیادہ حصہ ملا ہے۔

کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان عناصر کا ذکر کرنے کے بعد جو آرٹ کے خوبصورت نمو کی تعمیر کے لئے ضروری ہیں اب ہم اپنے نتائج کو مختصراً بیان کرتے ہیں:۔

اس مسئلہ میں کہ آیا جمال معروضی ہے یا موضوعی میرا جواب یہ ہے کہ یہ نہ صرف معروضی ہے اور نہ محض موضوعی۔ کروچے اسے محض موضوعی قرار دیتا ہے۔ لیکن اگر اشیا میں جاذبیت نہ ہو تو۔ ع

نگاہِ شوق کو یارائے سیرِ دید نہ ہو

شیلے اسے بالکل معروضی قرار دیتا ہے مگر ع

حسن کا رنگ بھی ہے ذوقِ نظر کا محتاج

نہ ہم اس اشراقی مابعد الطبیعاتی نظریے کے قائل ہیں کہ ؎

بے خود و محو جسم و جاں | مست زمین و آسماں
حسن نے دستِ ناز سے | چھیڑ دیا ہے سازِ عشق

اور نہ اس موضوعی نظریے کے قائل ہیں کہ ؎

رستم جو ہوا ہے کرے مجھ پہ عکس ذوقِ نظر | بساط آئینہ حسن خود نما معلوم

ہمارے نزدیک جمال نام ہے اس ترکیب یا تعبیر کا جو ایک خاص قسم کے معروضات موضوع کی ایک خاص حالت کے باہمی روابط سے پیدا ہوتی ہے۔ معروض میں تناسب ہم آہنگی اظہار حسن۔ اظہار جاعت وغیرہ میں سے کوئی نہ کوئی خصوصیت لازماً ہوتی ہے اور موضوع میں ہیجانات کا توازن حرکی لازمی ہے۔ جمال کی ابتدائی صورتوں میں ارتسام کا حصہ اظہار کی نسبت زیادہ ہوتا ہے اور اس کی زیادہ پیچیدہ شکلوں میں ارتسام کی نسبت اظہار

مترادف اور مساوی الفاظ نہیں رکھتی تھیں ایسے صحیح سانچے میں ڈھالی گئیں کہ خود "اُردو"
اُن کی تخلیق پر ناز کرنے لگی۔ یہ اجنبی اصطلاحیں اپنی پیدائش کے اولین دور میں اور شاید
اب بھی بعض "نازک طبیعتوں" پر بار ہوں گی لیکن یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ وہ لوگ جو
کل اِن الفاظ کی تشکیل پر منہ بنا رہے تھے آج اُن کی بناوٹ اور مٹھاس کے دلدادہ ہیں،
اس لئے یہ ماننے میں اُمید ہمارا ساتھ دیتی ہے کہ اِس وقت کی مخالفتیں بھی مستقبل قریب میں
ہماری "ہمنوائی" میں بدل جائیں گی۔

اِس تحریک کی مخالفت میں جس شدت سے تنقیدیں کی گئیں اور ہمارے ولولوں کو
جس قوت سے دبانے کی مسلسل کوششیں کی جاتی رہیں، دراصل وہی اُس کی کامیابی کا
ذریعہ بن گئیں۔ لیکن اب بھی یہ عالم ہے کہ ہندوستان کے اکثر صوبوں اور بعض جامعات
کے ذمہ دار افراد بھی یہ سمجھتے ہیں کہ جامعہ عثمانیہ کے طالب علموں کا معیار قابلیت اور دوسری
جامعات کے طلبہ کے مقابلہ میں "قابل لحاظ حد تک" کم ہوتا ہے۔ اور اِس "کم لیاقتی" کی وجہ
غالباً سوائے اِس کے اور کچھ نہیں ہوتی کہ اِس جامعہ کا طالب علم تمام علوم کی تعلیم اپنی ہی
زبان میں حاصل کرتا ہے، جو اُس کی مادری زبان ہے یا پھر ایسی زبان ہے جسے ملک کے
طول و عرض میں لکھا، بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ (مشہور مورخ ونسنٹ سمتھ سے اقتباس
کرتے ہوئے سر اکبر حیدری مرحوم نے اِس زبان کے متعلق اپنی یادداشت میں لکھا تھا کہ
اِس کی ترکیب نحوی اتنی ہی سادہ اور لچکدار ہے جتنی کہ انگریزی کی۔ اور اِس زبان میں
الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود ہے جو مغربی ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی اور دوسرے ماخذ
سے لئے گئے ہیں)۔

یہ اعتراض کہ مختلف علوم کو "اُردو" میں پڑھنے کی وجہ سے طالب علم میں وہ لیاقت
پیدا نہیں ہوتی جو غیر ملکی زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہو سکتی ہے، کس قدر لغو اور غلط تصور
کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہمارا دماغ ایک نئی بات کو اُس وقت زیادہ
آسانی سے قبول کر لیتا ہے جب اُس کی "اپنی زبان" میں تشریح کی جائے۔ اِس کے
برخلاف وہ تعلیم و تربیت جو ایک نامانوس اور اجنبی زبان کے غیر فطری واسطہ سے ہوتی
ہے ظاہر ہے کہ زیادہ مشکل اور نتیجۃً کم سود مند ثابت ہوتی ہے اور جہاں تک معیار قابلیت
و لیاقت کا تعلق ہے۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جامعہ عثمانیہ کا نصاب تعلیم بلا لحاظ

جامعۂ عثمانیہ کی ادبی زندگی

(از جناب سید اظہر حسین رضوی صاحب معاون مدیر اخبار سلطنت حیدرآباد دکن)

---

۶ ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ کا دن ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب اور ایک سبق کا آغاز کرتا ہے۔ اس "نئے سبق" کی کامیابی اور ناکامی کے فیصلہ کا حق تو مستقبل کے مورخ کو ہوگا لیکن آج یہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ آواز جو پچیس ۲۵ سال قبل جامعہ عثمانیہ کے در و دیوار سے بلند ہوئی تھی اس کی گونج کو ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک محسوس کیا جا رہا ہے۔ جامعہ عثمانیہ نے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنا کر ہندوستان کے تمام علمی اداروں کو جو دعوتِ فکر و عمل دی اس کا کامیاب نتیجہ ہمارے سامنے امید افزا اور روشن مستقبل کی صورت پیش کر رہا ہے۔ حیدرآباد کے احسانات اردو ادب پر ناقابل فراموش اور انمٹ ہیں۔ اپنی تاریخ کے ابتدائی دوروں سے اس وقت تک اس ملک نے ادب کی جس فراخدلی سے سرپرستی کی ہے اس کی نظیر کہیں ڈھونڈھنے سے بھی نہ مل سکتی اور جامعہ عثمانیہ کی تشکیل و قیام تو ایک ایسا کارنامہ ہے جس نے ہندوستان کی تحقیق و تجسس اور غور و فکر کی بیسیوں نئی راہیں کھول دی ہیں۔ جن مضبوط اساسوں پر تحریک قائم کی گئی تھی گو وہ پہلے نہایت کمزور اور ناپائیدار سمجھی جاتی رہیں لیکن آج ان کی استواری اور قوت کا ہر شخص قائل اور معترف ہے۔ اصولی یا نظری طور پر یہ نعرہ کہ:-

"ہم اپنی زبان میں تعلیم دیں گے"

بالکل اٹل تھا لیکن دو مجبوریاں سخت اور پریشان کن تھیں۔ ایک درسی کتب کی موجودگی دوسرے علمی اصطلاحوں کی کمی ——— لیکن ارادوں کے استقلال اور غیر متزلزل محنت و ریاضت نے ان دشواریوں کو پانی کی طرح ہلکا کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ کام جو شاید غیر ممکن سا سمجھا جا رہا تھا خوبصورتی سے انجام تک پہنچ گیا۔ غیر زبان کی کتابوں کو اردو کا جامہ پہنایا گیا۔ ہزاروں اور لاکھوں الفاظ کے ترجمے ہو گئے۔ علمی اصطلاحیں جو بادی النظر میں

کہوں گا کہ وہ ادب کے ایک ہمہ گیر تصور کو "وطنیت" کے تنگ دائرہ میں محدود نہ کریں۔
جس طرح وہ اپنی ادبی صلاحیتوں کو منظر عام پر لانے کا ذریعہ مقامی اخبارات اور رسائل
کو بناتے ہیں اسی طرح باہر کی صحافت میں بھی برابر کا حصہ لیں اور اس خوشگوار غلط فہمی
کو دور کریں جو اُن کے متعلق بعض سنجیدہ اذہان میں بھی پیدا ہوگئی ہے۔ یہاں اس تلخ
حقیقت کا اظہار بھی نہایت ضروری ہے جو "وطن پرستی" کا جو لا بنتے ہوئے سارے
ہندوستان کی ادبی فضا کو مکدر کر رہی ہے۔ وطن دوستی کا جذبہ مذہب کے بعد یقیناً
دنیا کے تمام جذبوں سے زیادہ سچا اور لائق احترام ہے لیکن "ہیرا" چاہے کیپ ٹاؤن
کی کانوں سے نکالا ہوا ہو۔ یا گولکنڈہ کے کھنڈروں سے پایا ہو۔ بہر حال ہیرا ہے اور
اُسی قدر و قیمت کا مستحق ہے جو اُسے معنوی اور صوری اعتبار سے حاصل ہے۔

جامعہ عثمانیہ کی ادبی زندگی کا جائزہ لینے سے قبل ایک بات اور عرض کر دینا ضروری
ہے۔ وہ یہ کہ جامعہ عثمانیہ مقابلتہً ایک "کم عمر" جامعہ ہے لیکن اس کے مزاج میں بوڑھوں
کی سی "سوجھ" ہے۔ اس کا نظام فکر اوروں سے جدا ہے۔ یہ ایک "پیغام" ہے حیدرآباد
کا تمام ہندوستان کے نام۔ یہ ایک آرزو ہے جو سنگ و خشت کے قالب میں ڈھل گئی ہے

. . . . اور . . . .

جامعہ عثمانیہ کے سپوت "ایک اہم تجربہ کے حامل ہیں" ان کو اسی نظر سے جانچا جائے۔ اس
مختصر مضمون کے لکھنے کا یہ مقصود ہے کہ اس سے جامعہ عثمانیہ کے سپوتوں کی اجتماعی جہد کا
ایک سرسری اندازہ ہو سکے اور یہ بات عام علم میں لائی جائے کہ یہاں کے لکھے پڑھے لوگوں
نے ادب کی کیا خدمت کی اور کس طرح سرگرم کار ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی ادبی زندگی کو مختلف شعبہ جات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

شعبہ فنون | اس شعبہ میں لسانیات اور لسانیات میں مختلف زبانیں اردو، فارسی، عربی،
تلنگی، مرہٹی، کنڑی، فرانسیسی اور جرمن ہیں۔ انگریزی زبان کو لازمی زبان قرار دیا گیا ہے۔
اس شعبہ کی دوسری شاخ تاریخ ہے۔ جس میں مقامی تاریخ سے لیکر دنیا بھر کی
تاریخ اور اسی کے ساتھ علم سیاسیات بھی شامل ہوتا ہے۔ تیسرے فلسفہ و منطق
چوتھے معاشیات و عمرانیات وغیرہ

شعبہ سائنس | دوسرا شعبہ ہے۔ اس میں طبعیات، کیمیا، ریاضیات، ارضیات Geology

ہر مضمون میں ہندوستان تو ہندوستان کسی بیرونی جامعہ سے بھی کسی طرح کم نہیں ہے کچھ کوئی وجہ نہیں کہ یہاں کا پڑھا ہوا طالب علم کسی دوسری جامعہ کے طالب علم سے اپنے مضمون میں پیچھے ہو۔

ایک دوسری شکایت عام طور پر اس "جامعہ" کے متعلق یہ بھی سنی جاتی ہے کہ یہاں کے فارغ التحصیل طالب علم سرے سے کوئی "ادبی ذوق" نہیں رکھتے یا پھر اگر ان میں کچھ ادبی مذاق پایا بھی جاتا ہے تو وہ اُسے منظر عام پر نہیں لاتے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب، یو۔پی، اور بنگال وغیرہ میں وہی دو چار گنے چنے نام بار بار دُہرائے جاتے ہیں جو اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے کافی معروف ہو چکے ہیں۔ میرے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہی جب یو۔پی کی ایک جامعہ کے پروفیسر نے مجھ سے کہا کہ حیدرآباد کے ڈاکٹر زور کا تو میں نے نام سنا ہے لیکن اور ایسا کوئی نام میرے کانوں میں نہیں پڑا۔ جس سے میں یہ کہہ سکوں کہ حیدرآباد اور جامعہ عثمانیہ کے نوجوان ادب کی ترویج میں حصہ لے رہے ہیں۔

اوّل تو یہ بات ہی بے بنیاد ہے کہ حیدرآباد اور جامعہ عثمانیہ میں وہ ادبی چہل پہل نہیں جو دوسرے شہروں مثلاً دلّی، لکھنؤ، لاہور یا بعض اور جامعات میں پائی جاتی ہے۔ دوسرے مملکتِ حیدرآباد کو اپنی وسعت و ہمہ گیری میں بجائے خود ایک "وحدت" حاصل ہے۔ یہ ایک ایسا ملک ہے جہاں کی تہذیب، معاشرت، تمدّن اور ثقافت ہندوستان کے اور حصوں سے بالکل مختلف اور الگ ہے۔ حیدرآباد کا رقبہ اتنا وسیع ہے کہ اگر کوئی شخص اُس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پیدل سفر کرنا چاہے تو یہ مسافت کوئی ڈیڑھ ماہ میں طے ہو گی۔

مملکت حیدرآباد و برار کا رقبہ ایک لاکھ چار سو آٹھ مربع میل ہے جو یورپ کی چار سلطنتوں انگلستان، اسکاٹ لینڈ، بلجیم اور ہالینڈ کے رقبہ کے مساوی ہو گا (یہ جنگ سے پہلے کی باتیں ہیں) مستقر حیدرآباد (دار السلطنت) سے ریاست کی شمالی مغربی سرحد رونچے گاؤں (ویجاپور) تک کوئی پانچسو میل کا فصل ہے۔ ان سرسری اعداد و شمار سے حیدرآباد کی وسیع دنیا کا تصور کیا جا سکتا ہے جو اپنا ایک الگ نسلی، تمدنی، معاشرتی، جغرافیائی اور ملکی نظام حیات رکھتی ہے۔

لیکن اس موقعہ پر میں جامعہ عثمانیہ کے لکھنے والوں سے نہایت پُر زور الفاظ میں

جمہوریہ چین :- میر عابد علی خاں بی۔اے۔ (عثمانیہ)۔

ابنِ خلدون کے سیاسی و معاشی نظریے :- پروفیسر عبدالقادر ایم۔اے (عثمانیہ) کی یہ کتاب علم تاریخ کے بانی ابن خلدون کے نظریوں سے بحث کرتی ہے۔

فیض محمد صدیقی بی۔اے (عثمانیہ) ڈپ۔ایڈ۔ سوانح نگار کی حیثیت سے کافی متعارف ہیں۔آپ کی دو تاریخی کتب (۱) سر سالار جنگ اور (۲) عماد الملک۔تاریخی سوانح ہیں جو ہندوستان بھر میں مشہور و مقبول ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور ایم۔اے (عثمانیہ) پی۔ایچ۔ڈی نے میر مومن کی سوانح حیات کو تاریخ وار حالات کے تحت قلمبند کیا ہے جو قطب شاہیہ دور میں اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر تھے۔ حیدرآباد کا ایک تاریخی پس منظر اِس تاریخی موضوع پر موصوف کی ایک قابلِ قدر کتاب ہے۔

افسوس کہ شیخ چاند (مرحوم) ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی (عثمانیہ) کی زندگی کا شعلہ بہت جلد بجھ گیا۔ ورنہ یہ مادرِ درسگاہ کے نام کو اور روشن کرتا۔ شیخ چاند (مرحوم) کو جوانی کی نذر کھا گئی اور دو چار کارناموں سے زیادہ وہ کچھ نہ چھوڑ سکا اور جو کچھ چھوڑا بھی وہ زمانہ کے دست برد سے نہ بچا۔ نظام الملک آصف جاہ اوّل مرحوم کی تاریخی یادگار ہے۔ جسے قبولیتِ عامہ حاصل ہے۔ سوداؔ کے کلام اور زندگی پر مرحوم کا ایک تحقیقی مقالہ اب بھی دنیائے ادب میں ایک خاص درجہ کا مالک ہے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق مدظلہ اِس جواں مرگ کے متعلق لکھتے ہیں کہ :-

> "وہ بہت ہی اچھا ادبی ذوق رکھتا تھا اور بہت شستہ اور صاف نثر لکھتا تھا۔ محض اپنی محنت۔ وشوق سے اُس نے اُردو ادب کے متعلق وسیع معلومات حاصل کی تھیں۔ اِس کی تحریروں کو اِبھی سے مقبولیت عامہ حاصل ہو گئی تھی۔ اِس کا تحقیقی مقالہ سوداؔ کے کلام و حیات پر اِس کی ادبی تحقیق کی زندہ یادگار ہے"

یہ وہی شیخ چاند ہے جس نے مولوی صاحب قبلہ کی مشہور لغات میں بھی اُنکا ہاتھ بٹایا تھا۔

سید علی محسن ایم۔اے (عثمانیہ) اور ظہیر الدین ایم۔اے (عثمانیہ) نے ابراہیم عادل شاہ ثانی اور سلطان احمد شاہ بہمنی پر بڑی محققانہ اور مفصل تاریخ لکھی ہے۔

ادبی تاریخ، تذکرے، تحقیق و انتقاد | ادبی تحقیق اور انتقاد میں ڈاکٹر زور کا نام سب سے پیش پیش ہے۔ ڈاکٹر صاحب جس بے جگری اور سچی تڑپ سے کام کر رہے ہیں اُس کا اندازہ

حیوانیات، نباتیات، سکیات (Final Means) اور سائنس کے اور دوسرے شامل ہیں۔

شعبۂ دینیات و اخلاقیات | یہ شعبہ حدیث، فقہ، اصول فقہ، فلسفہ و منطق اور علم اخلاق و نفس پر مشتمل ہے۔

"شعبۂ قانون اور اصول" کلیہ طب، کلیہ انجینرنگ، کلیہ تعلیم المعلمین اور کلیہ اناث وغیرہ دوسرے مختلف شعبے ہیں۔

اس توضیح بالاجمال کی تمہید سے غالباً یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی زندگی میں کیسی ہمہ گیری اور گوناگونی ہے۔

جن شعبوں اور اُن سے متعلق جن علوم کا ذکر کیا گیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے سپوتوں نے کم و بیش ہر علم اور ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے۔ الگ الگ ہر شاخ کو لیکر اُن اجمالی نظر ڈالنا بھی ایک طویل عمل ہے۔ اس لئے ہم اپنی سہولت کی خاطر ان لکھنے والوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک وہ جو نثر نگار ہیں (اس جماعت میں ہر علم اور ادب کی ہر صنف کا نثر نگار شامل ہوگا) اور دوسرا وہ گروہ جو شعر و سخن سے تعلق رکھتا ہے۔ مترجمین کا ذکر بھی اسی تقسیم کے تحت کیا جائے گا۔

نثر نگاری کے سلسلہ میں اردو ادب کے کارناموں کو اُجاگر کرکے پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی اور دوسرے علوم پر ہم ایک سرسری اور اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالیں گے۔ چونکہ ہماری "ادبی زندگی" زیادہ تر اسی اردو ادب کے گرد گھومتی ہے۔

تاریخ و سیاسیات | پروفیسر عبدالمجید صدیقی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (عثمانیہ) تاریخ نگاری کا فطری ذوق رکھتے ہیں۔ غیر معمولی شہرت کے مالک ہیں۔ دکن کی تاریخ، آپ کا پسندیدہ موضوع ہے۔ درج ذیل کتب مصنف کی مشہور تصانیف میں سے ہیں (۱) تاریخ گولکنڈہ (۲) مقدمہ تاریخ دکن۔ (۳) اعظم الامرا ارسطو جاہ۔ (۴) فیروز شاہ بہمنی (۵) تاریخ احمد نگر اور (۶) سیاسیات۔

سیاسیات پر یہ چند کتابیں بھی قابلِ ذکر ہیں:۔

جنگ زدہ ممالک:۔ مرتبہ میر حسن ایم۔ اے (عثمانیہ)۔

نازیت:۔ شاہد حسین رزاقی ایم۔ اے (عثمانیہ)۔

کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں۔ آپ کی درج ذیل کتب بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔

جدید اردو شاعری:۔ حالیؔ سے لیکر موجودہ دور کی اردو شاعری تک ایک مبسوط تبصرہ ہے۔

حیدرآباد کی تعلیمی ترقی:۔ اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے۔ جس میں گزشتہ ۲۵ سالہ ادبی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اردو مثنوی کا ارتقاء:۔ سروری صاحب نے اپنی اس کتاب میں نہایت باریک بینی اور دقتِ نظر سے کام لیا ہے۔ جس میں مثنوی کے تدریجی ارتقاء پر محققانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

تاریخ ادبیات ہندی:۔ پروفیسر سروری کی یہ کتاب ہندی ادب کی تاریخ سے متعلق ہے۔

میر حسن ایم۔ اے (عثمانیہ) سلجھے ہوئے لکھنے والوں میں ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔

مغربی تصانیف کے اردو ترجمے:۔ اس کتاب میں مولف نے مغربی تصانیف کے اردو ترجموں کو ایک اجتماعی شکل میں پیش کیا ہے۔

مولانا عبدالماجد (دریابادی) اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب ہے۔ ... مقدمہ بہ حیثیت مجموعی کافی دلچسپ، پرمغز اور قابلِ مطالعہ ہے۔ مصنف کے فخر کے لئے یہی کافی ہے کہ انھوں نے اپنے موضوع پر زیادہ سے زیادہ مواد جمع کر دیا ہے۔[1]" صدق لکھنؤ (۲۰ نومبر ۱۹۴۲ء)

تاریخ ادبیات انگریزی:۔ میر حسن نے اس کتاب میں انگریزی ادب کی تاریخ سے بحث کی ہے۔

ورڈسورتھ اور اس کی شاعری:۔ میر حسن کا یہ کارنامہ ورڈسورتھ کی زندگی اور اس کے شاعرانہ کمال کو اجاگر کرتا ہے۔ اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے۔ اس کے متعلق کچھ "رائیں" سن لیجئے:۔

"وہ لوگ جو خالص ادبی ذوق رکھتے ہیں اور مشرق و مغرب دونوں جگہ کی شاعری پر مقابلتاً نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب خصوصیت سے قابلِ قدر ہے۔"

مولانا نیاز (فتح پوری)

"میر حسن صاحب نے یہ بہت قابلِ قدر کام کیا ہے۔ ان کی محنت قابلِ شکر اور لائق قدر ہے اور اردو شعرا کو یہ کتاب ضرور پڑھنا چاہئے۔"

مولوی عبدالحق مدظلہ

ٹیگور اور ان کی شاعری:۔ چونکہ اسی سلسلہ کی ایک کتاب ہے۔ اس لئے یہاں اس کا ذکر کر دینا ضروری ہو گیا۔ اسے حیدرآباد کے مشہور شاعر مخدوم محی الدین ایم۔ اے (عثمانیہ) نے لکھا ہے۔ اس کتاب

---

[1] اس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ مستند اہلِ قلم بھی عثمانی فرزندوں کے متعلق کیسی رائے رکھتے ہیں۔ (اظہر رضوی)

اُن کی بیسیوں تصانیف اور اُن کے ادبی انہماک سے ہو سکتا ہے۔

مرقع سخن: - یہ ڈاکٹر صاحب کی مشہور کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے جس میں دورِ آصفیہ کے شعرا کا تذکرہ ہے۔

عہدِ عثمانی میں اُردو کی ترقی: - ڈاکٹر زور نے اپنی اس کتاب میں دورِ عثمانیہ میں اُردو کی ترویج و اشاعت
پر روشنی ڈالی ہے۔

محمود غزنوی کی بزمِ ادب: - زور صاحب کی اس کتاب میں غزنوی فارسی شعرا کا ایک مبسوط تبصرہ

سرگزشتِ غالب: - غالب کی زندگی پر یہ ایک مستند تاریخی کتاب ہے۔

روحِ غالب: - اس کتاب میں ڈاکٹر زور نے غالب کا ایک انسان اور ”ادیب و شاعر“ کی حیثیت
سے تاریخی روشنی میں جائزہ لیا ہے۔

گارساں دتاسی: - فرانس کے مشہور مستشرق اور اردو کے سچے بہی خواہ کے ادبی کارناموں پر بحث کی گئی

مکتوباتِ شاد (عظیم آبادی)، [illegible] وغیرہ۔ ڈاکٹر زور کی اسی سلسلہ میں لائقِ مطالعہ کتب

روحِ تنقید: - فنِ تنقید پر اردو میں سب سے پہلی کتاب ہے۔ جسے ڈاکٹر زور نے ۱۹۲۵ء میں لکھا
اُس وقت مصنف نے بی اے میں (Graduation) کی سند بھی حاصل نہیں کی
یہ کتاب مختلف جامعات کے نصاب میں داخل ہے۔

تنقیدی مقالات: - اسی سلسلہ کی دوسری کڑی ہے۔ جس میں اُردو کے ادبی کارناموں کا تحقیقی جائزہ لیا گیا

اُردو شہ پارے: - اردو کے آغاز سے ولی دکنی تک کے ادب پر محققانہ تبصرہ ہے۔

اردو اسالیبِ بیان: - ہندوستانی کی تاریخ اور مختلف انشاپردازوں کے اسالیب پر تحقیق کی روشنی ڈ[illegible]

تاریخ ادبیات اُردو: - ڈاکٹر زور نے اس کتاب میں اُردو ادب کی تاریخ پر تبصرہ کیا ہے۔

ہندوستانی لسانیات: - اس کتاب میں اُردو زبان کا لسانی تجزیہ اور تشریح کی گئی ہے۔ اپنے فن
غالباً اُردو کی پہلی کتاب ہے جس میں اُردو ہندی جھگڑے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

فنِ انشاپردازی، ہندوستانی صوتیات وغیرہ۔ ڈاکٹر زور کی اور دوسری کتابیں ہیں۔

”مرقع سخن“ والی روایت پر، **متاعِ سخن** (کلام نواب عزیز یار جنگ عزیز
شاگردِ داغ)، **فیضِ سخن** (کلام شمس الدین محمد فیض)، **بادۂ سخن** (کلام ڈاکٹر احمد حسین خا[illegible]
ایمانِ سخن (کلام شیر محمد خاں ایمان) **کیفِ سخن** (کلام رضی الدین حسن کیفی) **سراجِ سخن** ([illegible]
سراج اورنگ آبادی) کا ذکر بھی ضروری ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی (عثمانیہ) ادب کے ایک

اس لئے اور بھی زیادہ لائق قدر ہیں کہ ان میں آخری چار کتابیں دوسری زبانوں سے "اپنی زبان" میں منتقل کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر زورؔ نے بھی بعض نیم تاریخی افسانے لکھے ہیں :-

طلسمِ تقدیر، سیرِ گولکنڈہ، اور گولکنڈے کے ہیرے، زورؔ صاحب کے مشہور تاریخی افسانوں کے مجموعہ ہیں۔

پروفیسر محشر عابدی بی۔ اے۔ ایم۔ ایس۔ سی (عثمانیہ) افسانہ نگار کی حیثیت سے سارے ہندوستان میں مشہور ہیں۔

محشرستان، روپ متی اور باز بہادر، نام کے دو مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے بعض دیگر زبانوں کے افسانوں کا نہایت کامیاب ترجمہ کیا ہے۔

مرزا ظفر الحسن بی۔ اے (عثمانیہ) نے نفسیاتی کہانیاں لکھ کر اپنے لئے ایک بلند مقام حاصل کر لیا ہے۔ مرزا کو زبان اور کردار کی تخلیق پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ ہر نقاد تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

محبت کی چھاؤں :- اُن کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں نیازؔ صاحب کے الفاظ میں "ہلکا ہلکا مزاح اور رصافت "تنقید" کا ایک خوشگوار امتزاج ہے۔

سید اشفاق حسین ایم۔ اے (عثمانیہ) کے افسانے زندگی کی "دہائی" ہوتے ہیں۔ ان کے ہر افسانے میں زندگی کا ایک گہرا مشاہدہ ہوتا ہے اور پھر لطف یہ کہ رومان اور طنز کے لطیف اشارے پڑھنے والے کے دل میں ایک پھریری پیدا کر دیتے ہیں اشفاق اپنے افسانے کے کرداروں کا اس باریک بینی سے مطالعہ کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار اُن کے قلب میں بیٹھا ہوا دھڑکنوں کو محسوس کر کے کاغذ پر منتقل کرتا جا رہا ہے۔

اشفاق کا مشہور افسانہ " اختر کی ڈائری" پڑھئے اور اپنی روزمرہ کی زندگی اور ماحول کا جائزہ لیجئے۔ ایسے بہت سے " اختر" ہچکیاں لیتے ہوئے دکھائی دیں گے۔

ٹھوکریں :- اشفاق کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ اِن میں " ٹھوکریں" زیادہ ہیں اور افسانے کم!

علی احمد بی۔ اے (عثمانیہ) بھی انھیں کے ساتھ کے لکھنے والوں میں ہیں —

میں مخدوم نے ٹیگور کی زندگی، شاعری اور فلسفۂ حیات پر ایک اجمالی نظر ڈالی ہے۔

مخدوم محی الدین کا ذکر شعرائے عثمانی کے ساتھ کسی قدر تفصیل سے کیا جائے گا۔

امام غزالی کی کلامی خصوصیات :۔ محمد غوث ایم۔ اے (عثمانیہ) نے امام غزالی کی کلامی خصوصیات پر تبصرہ کیا ہے۔

اردو مرثیہ نگاری :۔ اس موضوع پر بہت کم کتابیں ہیں۔ میر سعادت علی رضوی ایم۔ اے (عثمانیہ) نے مرثیہ کی تاریخ کے ساتھ فنی بحث بھی کی ہے۔

دربار اودھ کا اثر لکھنوٴ شاعری پر :۔ محمد اعظم خاں (عثمانیہ) کی یہ کتاب اپنے موضوع پر بڑی ہی دلچسپ اور

شعرائے عثمانیہ :۔ یہ جامعہ عثمانیہ کے چھبیس شعرا کا تذکرہ ہے۔ جسے معین الدین قریشی ایم۔ اے (عثمانیہ) اور عبدالقیوم خاں باقی ایم۔ اے (عثمانیہ) نے مرتب کیا ہے۔

قریشی اور باقی صاحبان نے اردو ادب کا بڑی غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ دوسرے علوم پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ان دونوں حضرات کا ذکر آگے مقام پر زیادہ تفصیل سے کیا جائے گا۔

یوسف ہندی قید فرنگ میں :۔ اس کتاب میں محسن بن شبیر بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (عثمانیہ) غالب کے قید کے حالات لکھے ہیں۔

پروفیسر سید محمد ایم۔ اے (عثمانیہ)، مسلم ضیائی ایم۔ اے (عثمانیہ) وغیرہ۔ تاریخ ادب اردو پر کام کیا ہے۔

دیوان بہرام :۔ اس تذکرہ میں مسلم ضیائی نے بہرام نامی پارسی شاعر کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔

افسانے اور ڈرامے وغیرہ | پروفیسر عبدالقادر سروری نے فن افسانہ پر بعض قیمتی اور کتابیں تحریر فرمائیں ہیں۔ جن کا اس موقع پر ذکر نہایت ضروری ہے۔

دنیائے افسانہ :۔ فن افسانہ نگاری کے اصول و ضوابط پر پروفیسر صاحب کی یہ ایک پر مغز کتاب

کردار اور افسانہ :۔ اسی سلسلہ کی دوسری کتاب ہے۔ جس میں افسانہ میں "کردار نگاری" اہمیت سے بحث کی گئی ہے۔

ان کے علاوہ پروفیسر عبدالقادر سروری کے کئی افسانوں کے مجموعے شائع قبولیت عامہ حاصل کر چکے ہیں "رات کا بھولا اور دیگر افسانے"، "قدیم افسانے"، "جاپانی افسانے"، "انگریزی افسانے"، "فرانسیسی افسانے"، عبدالقادر صاحب کی

کیا ہے۔ (اشاعت کی ایک اور تصنیف "شیدخان کا انتقام" بھی شائع ہو چکی ہے)۔

آبا مرحوم :۔ مرزا ظفرالحسن بی۔ اے (عثمانیہ) کا مشہور مزاحیہ ڈرامہ ہے۔

ریڈیو کی بڑھتی ہوئی مانگ اور مقبولیت نے ڈرامہ نگاری کے پژمردہ شوق کو ایک آنچ سی دیدی ہے۔ گزشتہ چار پانچ سال میں ریڈیائی ڈرامے، فیچر، خاکے وغیرہ جس وافر تعداد میں لکھے گئے، اُن میں عثمانی کارنامے بھی شامل ہیں۔

صاحبزادہ میکش (عثمانیہ)، مرزا ظفرالحسن بی۔ اے (عثمانیہ)، اکبر وفاقانی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (عثمانیہ)، خشتر تماپدی بی۔ اے۔ ایم۔ ایس۔ سی (عثمانیہ) سید اشفاق حسین ایم۔ اے (عثمانیہ)، علی احمد بی اے (عثمانیہ) عاقل ایم اے (عثمانیہ) وغیرہ کے اکثر "ریڈیائی ڈرامے" دکن ریڈیو اور باہر کی نشرگاہوں سے نشر ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

فلسفہ و منطق میں ڈاکٹر میر ولی الدین (عثمانیہ) کی لکھی ہوئی کتابیں مستند درجہ رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ فلسفہ یاس (قنوطیت) اور کامیاب زندگی کا قرآنی تصور، موصوف کی غیر فانی تصانیف میں سے ہیں۔

معاشیات کے موضوع پر ناصر علی ایم۔ اے (عثمانیہ)، محمد احمد سبزواری ایم۔ اے (عثمانیہ) احمد خاں ایم۔ اے (عثمانیہ) بہت سے پُر از معلومات اور تحقیقی مقالے لکھ چکے ہیں۔ ناصر علی کی ایک کتاب "عام فہم معاشیات" بھی شائع ہو چکی ہے۔ سبزواری اور احمد خاں کے اکثر مقالے جامعہ (دہلی) میں مسلسل شائع ہوتے رہے ہیں۔

مذہبیات پر سید عبدالرزاق قادری ایم۔ اے (عثمانیہ) نے بعض اچھے اور اور معیاری مضامین لکھے ہیں۔

سائنس | جامعہ عثمانیہ کے لکھنے والوں نے شعبہ سائنس کے مختلف علوم پر بھی متعدد کتابیں اور تحقیقی مقالے تحریر کئے ہیں۔

ڈاکٹر حاجی غلام محمد ایم۔ ایس۔ سی (عثمانیہ) ڈی۔ ایس۔ سی نے "علم طبیعات" میں اپنے بعض تحقیقی کاموں کی وجہ سے یورپ کے ممالک میں بھی خاصی شہرت حاصل کی ہے۔

خلیل الرحمٰن ایم۔ ایس۔ سی (عثمانیہ) اور شاہ محمد خاں ایم۔ ایس۔ سی (عثمانیہ) نے بعض کیمیا کی کتابیں تالیف کی ہیں۔ جو مختلف جماعتوں کے نصاب میں داخل ہیں۔

"سلسلۂ داستان گو" کے مرتب کی حیثیت سے بہت سی اچھی کہانیاں اور بعض "کامیاب افسانہ نگار" پیش کر چکے ہیں۔

رشید قریشی ایم۔ اے (عثمانیہ) کے لکھے ہوئے افسانے بھی کافی مقبول ہیں۔

من کی دُنیا: - اُن کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے متعلق مولانا نیاز فتحپوری لکھتے ہیں کہ:-

"اس مجموعہ کا تعلق صرف دل کی دنیا سے ہے اور دل کی دنیا چونکہ بہ لحاظ تخیل بہت آزاد واقع ہوئی ہے۔ اس لئے یہ افسانے بڑی حد تک کھیل کھیلنے کی مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ انداز بیان میں ادبیت بھی ہے اور سلاست و روانی بھی"

ان کے علاوہ اور بیسیوں "عثمانین" ہیں جو افسانہ نویسی کا ایک خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے اُن کے ذکر کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

جامعہ عثمانیہ کی اس "ادبی پیداوار" میں ڈرامے کے بھی بعض اچھوتے اور دلکش نمونے پائے جاتے ہیں۔

اکبر وفا قانی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (عثمانیہ) صاحبزادہ میکش (عثمانیہ) مخدوم محی الدین ایم۔ اے (عثمانیہ) میر حسن ایم۔ اے (عثمانیہ) جلال الدین اشکؔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (عثمانیہ) پروفیسر محشر عابدی ایم۔ ایس۔ سی (عثمانیہ) مرزا ظفر الحسن بی۔ اے (عثمانیہ) ڈرامہ نگار کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں۔

پروفیسر محشر نے بعض مغربی ڈراموں کو اُردو کا لباس نہایت خوش اسلوبی سے پہنایا ہے۔ "انٹنی اور کلوپیٹرا" اس سلسلہ میں اُن کا مقبول ڈرامہ ہے۔

ہوش کے ناخن: - یہ میر حسن اور مخدوم کی ایک مشترک کوشش کا نتیجہ ہے۔ ہر لحاظ سے مقبول عام ہے۔ اسے کئی مرتبہ حیدرآباد میں کھیلا جا چکا ہے۔

کاغذ کی ناؤ: - صاحبزادہ میکش (عثمانیہ) کے ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ میکش کا دردمند دل ایک کامیاب شاعر اور حقیقت نگار ادیب بنانے میں اُس کے ہمیشہ ساتھ رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میکش کی ہر آواز اُس کی ہی نہیں بلکہ بیسیوں ناداروں اور مفلسوں کی ایک دردناک "پکار" ہوتی ہے۔ میکش کے دھڑکتے ہوئے دل کو اُس کی شاعری میں دیکھنے اور سننے کی کوشش کی جائے گی۔

سلک گوہریں: - جلال الدین اشک بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (عثمانیہ) نے ایک منظوم ڈرامہ

بھی شائع ہو چکی ہیں۔ جو اپنی علمیت، جامعیت اور فلسفیانہ نقطۂ نظر کے اعتبار سے واحد کتب ہیں۔
مترجمین کی فہرست میں میر حسن الدین بی۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (عثمانیہ) کا نام سب سے اوپر ہے۔ علامہ اقبال کی مشہور تصنیف The Development of Metaphysics in Persia کا ترجمہ کرنا، جس میں علامہ نے ایرانی مابعد الطبیعیات اور تصوف سے بحث کی ہے۔ جوئے شیر لانے سے کم نہیں، میر صاحب کے اس ترجمے کو اٹھا کر دیکھئے، کسی جگہ سے یہ مترشح نہیں ہوگا کہ یہ ترجمہ ہے بلکہ اصل کا دعویٰ کا ہی نہیں، یقین ہونے لگتا ہے۔ میر صاحب نے اس کے علاوہ اور کئی ترجمے بھی کئے ہیں۔ "فطرتِ انسانی" اُن کا انمٹ کارنامہ ہے۔
عزیز احمد، سید محمود علی، میر حسن، محمد امیر، شاہد حسین رزاقی وغیرہ بھی مترجمین کی حیثیت سے مشہور رہیں۔
شعراء اور خواتین کے تذکرہ سے قبل حیدرآباد کی صحافتی زندگی کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے چونکہ "اخبار" کو قوم کی رگِ احساس سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ آئینہ قومی شعور کی بیداری اور ذہنی کیفیات کی سچی ترجمانی کرتا ہے۔
حیدرآباد اور جنوبی ہند کا سب سے بڑا اور کثیر الاشاعت اردو روزنامہ رہبرِ دکن ہے۔ اس کے مدیر محمود وحید الدین جامعہ عثمانیہ کے بی۔اے ہیں۔ یہ اخبار اپنی بزرگی اور اپنی سیاسی مسلک کی وجہ سے ہندوستان کی صحافت میں بھی ایک خاص وقعت رکھتا ہے۔ وقت، ایک اور روزنامہ ہے جسے غالباً حیدرآباد میں سب سے زیادہ قبولیتِ عامہ حاصل ہے، چونکہ یہ عوام کی صدائے بازگشت ہے اس کے مدیر بھی عبد الرحمٰن رئیس (عثمانیہ) ہیں۔
روزنامہ نظام گزٹ کے موسس سید حبیب اللہ رشدی ایم۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (عثمانیہ) اور مدیر سید وقار احمد ایم۔اے۔ ایل۔ ایل (عثمانیہ) ہیں۔
روزنامے رعیت اور صبحِ دکن کے معاونین میں بھی جامعہ عثمانیہ کے سپوتوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔
ہفتہ وار اخبار مملکت کی ادارت میر حسن الدین بی۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (عثمانیہ) کے ہاتھ میں ہے۔ میر صاحب کے بارے میں اس سے قبل کسی جگہ لکھا جا چکا ہے۔

اِن کے علاوہ پروفیسر یونس وفا قانی نے ''لاسلکی'' پر۔ فیض محمد صدیقی ۔ ''پانی کی کہانی'' ''آب دوز اور سرنگ'' ''پرواز'' پر بہت ہی سلجھے ہو انداز میں بچوں کے لئے لکھا ہے۔ ''سائنس کے کرشمے'' مرتبہ میر حسن بھی اسی سلسلہ قابلِ ذکر ہے۔ سیّد علی شبر حاتمی بی۔ ایس۔ سی (عثمانیہ) نے بھی بعض سائنسی کتابیں لکھیں

حیاتیات میں ڈاکٹر قادر الدین ایم۔ ایس۔ سی (عثمانیہ) پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں۔ موصوف نے جامعہ لندن میں حشریات .... کے موضوع پر تحقیقاتی معیار قائم کرکے ایک نمایاں امتیاز حاصل کیا ہے۔

ڈاکٹر رحیم اللہ ایم۔ ایس۔ سی (عثمانیہ) ڈی۔ ایس۔ سی نے 'علم سمکیات (Fishery) پر قابلِ قدر تحقیقی کام کئے ہیں۔

پروفیسر محشر عابدی بی۔ اے۔ ایم۔ ایس۔ سی (عثمانیہ) بھی حیاتیات کے موضو پر اکثر لکھتے رہے ہیں۔ اِس مضمون پر ''حیات کیا ہے؟'' کے عنوان سے ایک کتاب بھی لکھ چکے

اِن کے علاوہ بعض اور عثمانین نے بھی چند کتابیں لکھی ہیں :۔

زہریلے پودے :۔ مصنفہ عبدالسلام ایم۔ ایس۔ سی (عثمانیہ)۔

پودوں کی بیماریاں :۔ مصنفہ عبدالباری ایم۔ ایس۔ سی (عثمانیہ)۔

زیرگی :۔ مصنفہ معین الدین ایم۔ ایس۔ سی (عثمانیہ)

جوہر کی ساخت :۔ مصنفہ ستیا نارائن راؤ ایم۔ ایس۔ سی (عثمانیہ)

مکھی :۔ مصنفہ مہدی علی ایم۔ ایس۔ سی (عثمانیہ)۔

جراثیم اور چیونٹی :۔ مصنفہ مہندراج سکسینہ ایم۔ ایس۔ سی (عثمانیہ)

اِس سلسلہ کو ختم کرنے سے قبل ایک اور ''عثمانی'' کا ذکر بھی نہایت ضرور اور میں نے عمداً اِس نام کو اس لئے ابتک نہیں لیا کہ یہ بین الاقوامی شہرت حاصل کر

ڈاکٹر رضی الدین (عثمانیہ) کے متعلق ایک لفظ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ کون جو اِس ''عثمانی'' سے ناواقف ہے جس نے آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت سمجھا اور لکھا ہے۔ اِس نظریہ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اِس کے سمجھنے والے د میں دو چار ہی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی دو کتابیں 'تعلیم کا مسئلہ' اور 'اقبال کا تصورِ زماں اور

درآبادی، محمد حمید اللہ۔ عمومیت کا سراب، خواجہ حمید احمد۔ اتحادِ عرب، خواجہ معین الدین۔
مملکتِ جدید میں ہمہ گیری رجحان، سید شاہ حسین۔ حکومت ہند اور والیانِ ریاست کے تعلقات،
محمد شہاب الدین۔ ٹیگور کے تمدنی اور سیاسی خیالات، محمد عاقل علی خاں۔ رفتارِ زمانہ اور
بلقان، عبدالحفیظ صدیقی۔ جدید معلومات، سید عبدالرحمن۔ ہند کے سیاسی مسلک کا نشو ونما،
عبدالستار۔ ہندوستان کی سیاسی فضا اور اس کا اثر دستور پر، خواجہ عیسیٰ احمد۔
سلطنتِ اودھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے تعلقات، محمد کاظم رضا۔ ہندوستان،
سید مہدی حسین۔ عہدِ عالم گیر میں دکن کی سیاسی اور تمدنی حالت، مرزا مختار الدین احمد۔
عہدِ معاونت ۱۷۹۸ء اور حیدرآباد، میر مخدوم علی خاں۔ برطانوی حکومت میں صوبہ جاتی
حکومت کا ارتقاء، ایشور چند، ودیا کر کراج۔ مہادیو سندھیا کے سیاسی منصوبے، وینکٹ راؤ۔
سلطان فیروز شاہ تغلق، میر احمد علی خاں۔ مشاہیر قندھار دکن، محمد اکبر الدین صدیقی۔
تاریخ بیدر، سید باسط علی۔ سلطان فیروز شاہ تغلق، بھارت چند کھنہ۔ تاناشاہ
کی حکومت میں مادنا کا حصہ، کے۔ وی۔ پال راؤ۔ علاء الدین محمد شاہ خلجی، سراج الدین۔
حجاج بن یوسف ثقفی، میر سعادت علی خاں۔ قصص القرآن تاریخی حیثیت سے، سید حسین۔
اورنگ زیب کی اہمیت بحیثیت صوبہ دار دکن، سید محمد حسن عسکری۔ ملک عنبر، شیخ چاند (مرحوم)
ابوالفیض فیضی، صفی الدین۔ سیاحت نامہ، نواب ظہیر یار جنگ بہادر۔
اورنگ زیب کا نظم ونسق دکن میں، عباس رضا زیدی۔ سلطان محمد عادل شاہ، عبدالنعم۔
تسخیر گولکنڈہ، محمد عبدالوہاب۔ تسخیر بیجاپور، سید علی محسن۔ حسن گنگو بہمنی، محمد احمد انصاری۔
گلدستۂ تاریخ ہند اور آصف جاہ ثانی، میر محمود علی۔ دورِ شاہجہانی کا تمدنی ارتقاء،
خواجہ منیر الدین۔ سلطان محمد تغلق، وحید اللہ خاں۔ حیدرآباد دکن اور ہندو مسلم زندگی، بنکٹیشور پرشاد۔
ہماری ریلیں اور سڑکیں، سید جعفر حسن۔ زرعی افلاس ہند، سید جعفر حسن۔
اسلام کے معاشی نظریئے، محمد یوسف الدین۔ مبادی فلسفہ، فلسفہ برگساں،
اور فلسفہ عجم، میر حسن الدین۔ آربندو گھوش کا فلسفہ، نارائن پرشاد۔ فلسفہ کی پہلی کتاب،
تاریخ فلسفہ اسلام، مقدمہ فلسفہ حاضرہ، قرآن کا فلسفہ مذہب، قرآن اور سیرت سازی،
مقدمہ مابعد الطبیعات، ڈاکٹر میر ولی الدین۔ اکبر الہ آبادی، شاہ ابرار احمد ذکی۔ میری تنویاں،
میر اشرف علی خاں۔ حیات بے نظیر، جدید تعلیمی تصورات اور چند اصلاحی تجاویز، محمد اعظم خاں۔

اخبار "سلطنت" کے مُدیر سید سعد اللہ قادری بھی جامعہ عثمانیہ کے پڑھے ہوئے ہیں۔
ماہناموں میں غلام محمد خاں ایم۔ اے (عثمانیہ) کا نام مدیر "ہندوستانی ادب" اور خواجہ حمید الدین شاہد بی۔ اے (عثمانیہ) کا نام مدیر "سب رس" کی حیثیت سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔
ان کے علاوہ سید علی شبر حاتمی بی۔ ایس۔ سی (عثمانیہ) "ہماری کتابیں" نامی ایک چھوٹا سا لیکن مفید رسالہ ہر ماہ نکالتے ہیں جس کی افادی حیثیت مسلمہ ہے۔ شبر حاتمی نے ایک "اشاعت گھر" بھی قائم کیا ہے۔ جو نہایت نیک نامی اور محنت سے لکھائی چھپائی کا کام کر رہا ہے۔
مجلۂ طیلسانین :۔ طیلسانین عثمانیہ کا یہ سہ ماہی رسالہ ہے جو معاشی اور دیگر مسائل پر نہایت سنجیدہ انداز میں بحث کرتا ہے۔ اس کے مُدیر محمد غوث ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (عثمانیہ) ہیں
اس سلسلہ میں "مجلۂ عثمانیہ" کا ذکر بھی ضروری ہے جو کسی نہ کسی "عثمانی" کے زیر ادارت سال میں دو، تین مرتبہ شائع ہوتا ہے۔
اورنگ آباد، ورنگل، گلبرگہ اور سٹی کالج (حیدرآباد) انٹرمیڈیٹ کالج سے بھی علٰحدہ علٰحدہ رسالے شائع کئے جاتے ہیں۔ جن میں نوجوان طالب علموں کے علاوہ ملک کے مشہور لکھنے والے بھی شریک ہوتے ہیں۔
"نقشِ نو" اسی طرح کا ایک رسالہ ہے جو سید اختر حسین ایم۔ اے (عثمانیہ) کی نگرانی میں چھپتا ہے۔ اس میں عثمانی طلباء کے ساتھ ساتھ بعض مشہور اہلِ قلم بھی لکھتے ہیں۔ "نقشِ نو" اختر صاحب کے سنجیدہ ذوق اور ستھرے مذاق کا ایک اچھا نمونہ ہوتا ہے۔
جامعہ عثمانیہ کے شعرا کا ذکر کرنے سے پہلے ہم اُن تالیفات اور تصنیفات کی ایک مختصر سی فہرست ذیل میں درج کرتے ہیں، جو عثمانین کی رہینِ منت ہیں اور اُن کا الگ الگ تذکرہ کرنا ایک نئی کتاب تالیف کرنے کے برابر ہوگا۔ موضوع اور مبحث خود کتاب کے نام سے ظاہر ہو جائے گا۔

'ہندوستانی ریاستیں اور وفاق ہند' احمد صدیقی۔ 'عہد معاونت اور اُس کے اثرات' نارائن داس چتر ویدی۔ 'وفاق اور ریاستیں' میر حسن الدین۔ 'رومی اور اسلامی ادارۂ غلامی'، 'عربوں کے تعلقات بیزنطی حکومت سے'، 'امام ابو حنیفہ کی تدوین قانون اسلامی

بحث پر لکھتے ہوں۔ مقام مسرت ہے کہ "انجمن ترقی اردو" نے اس کمی کا احساس کر کے 'معاشیات' کا اجرا کیا اور ایک بہت بڑی قومی ضرورت کو پورا کیا۔ مضامین کی ترتیب میں کافی محنت اور سلیقہ سے کام لیا گیا ہے۔ ایڈیٹر طفیل احمد خاں ایم۔ اے۔

ملنے کا پتہ :۔ انجمن ترقی اردو دہلی

ماہنامہ "رازِ ترقی" ایڈیٹر خاں بہادر شیخ عبداللہ صاحب ایڈوکیٹ۔ سکریٹری گرلس کالج علیگڑھ علامہ راشد الخیری مرحوم۔ اور سید امتیاز علی صاحب تاج مرحوم کی طرح شیخ عبداللہ صاحب کا بھی شمار طبقۂ نسواں کے محسنین میں ہے۔

عرصۂ دراز سے صاحب موصوف طبقۂ نسواں میں تعلیم جدید کی ترویج و اشاعت کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اب ان کی ہمتِ بلند نے ایک ماہوار رسالہ "رازِ ترقی" کے اجرا کی صورت میں ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ مضامین سب اچھے ہیں۔ بالخصوص قمر آزاد صاحبہ کا مضمون تعلیم یافتہ خواتین کے لئے درسِ عبرت کے بہت سے پہلو لئے ہوئے ہے

تعلیم بالغات کے سلسلہ میں علیگڑھ شہر میں کام کرنے سے ہمیں بھی ان تلخ حقائق کا بارہا مشاہدہ ہوا ہے۔ لیکن اعلیٰ طبقہ کی بیگمات کے اُن بگڑے ہوئے تیوروں نے جو عوام کا نام آتے ہی ان کی پیشانیوں پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ اظہارِ خیال کا موقع نہیں دیا۔ خدا کرے عزیزہ قمر آزاد اپنی عملی خدمات سے اس گہری خلیج کو پاٹنے میں کامیاب ہوں۔ جو اس وقت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور عام جاہل خواتین کے درمیان حائل ہے۔

ادب پارے از مولوی ضیاء الاسلام صاحب ایم۔ اے ڈپٹی کلکٹر۔ مصنف 'دامِ خیال' و "گلمسز آف ماڈرن اردو لٹریچر" ناشر حلقۂ ادب ۱۳ اسٹینلے روڈ الہ آباد۔ قیمت ۲ روپے

یہ کتاب جناب ضیاء الاسلام صاحب کی نثری تقاریر کا مجموعہ ہے۔ جس میں چند قدیم و جدید شعرا و نثر نگاروں پر ایک نظر اور چیدہ کتب پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ بالغ نظر نقاد نے جدید اصول تنقید سے کام لیکر موجودہ ادبی رجحانات پر بے لاگ اظہار رائے کیا ہے۔ ضیاء صاحب کو چونکہ اُردو ادب سے بیحد دلچسپی ہے۔ اس لئے اُن کی دلی تمنا ہے کہ ہماری زبان کے نظم و نثر نگار اپنی منزلت کے اعتبار سے ہی وہ درجہ پائیں جو زندہ قومیں اپنے اہل علم کے ساتھ روا رکھتی ہیں۔ تقریریں مختصر ہیں اسلئے موضوع تشنہ

'اردو رباعی' امیر محمد حنیف۔ 'چک بست اور ان کا کلام' بل بیر پرشاد۔ 'سر سید کے لکچر' سید رشید الحسن۔ 'گلشنِ رفتار' سید محمد۔ 'احوال و تصانیف نعمت خاں عالی' سید عباس حسین نقوی 'اردو غزل کے جدید رجحانات' عبدالحفیظ قتیل۔ 'میسور میں اردو' محمد عبدالخالق۔ 'سیرت و کردار' عبدالرحمن رئیس۔ 'جدید اردو افسانوں کا ارتقاء' عبدالرشید قریشی۔ 'ادبی تنقید کے چند اصول' 'عہدِ اکبری کے فارسی شعراء' عبدالقیوم خاں باقی۔ 'کالج کے دن اور فرانس کے افسانے' عزیز احمد 'شاعر کی دنیا' محمد حیدر آبادی 'عظیم الدین محبت۔ 'اردو ادب بیسویں صدی میں' علی حسین زیبا 'بیانات و کلام صائب' سید علی شاکر۔ 'سر سید کے مضامین' سید علی محسن نقوی۔ 'اردو افسانوں کے جدید رجحانات' عمر مہاجر۔ 'خواجہ میر درد دہلوی' غلام محمد خاں۔ 'ادبی تاثرات' مرزا قدرت اللہ بیگ۔ 'گذشتہ نصف صدی میں دکنی مرثیہ نگاری' مرزا محمد علی خاں۔ 'من کی بانسری' 'شیب و شباب' اور 'سلیم' محمد امیر۔ 'غالب' معین الدین قریشی۔ 'مومن کی شاعری' ندیم احسن۔ 'نظر کے دھوکے' اور 'یورپ کے تاثرات' بدرالدین خاں شکیب۔ 'معانی الاشارات' اور 'امام طحاوی' عبدالرزاق قادری۔

شاعروں کو زیرِ بحث لانے سے قبل مسز سروجنی نائیڈو کے اس فقرہ کو دہرانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ :۔

"حیدر آباد کے ہر چار پڑھے لکھے لوگوں میں تین شاعر ضرور ہوتے ہیں۔"

اس مبالغہ آمیز فقرہ میں گو صداقت کم ہے لیکن یہ ایک واقعہ ہے' اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حیدر آباد کی علمی دنیا میں جب کوئی بچہ آنکھ کھولتا ہے تو یہاں کا ماحول اپنے اثرات کو اس کی سرشت میں کچھ ایسے غیر شعوری انداز میں منتقل کرتا اور پھیلاتا ہے کہ ایک نہ ایک دن اس کی زبان کھل جاتی ہے اور اس کی فطرت اسے 'بولنے' پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس کے یہ 'بول' مناسب تربیت اور صحیح رہنمائی سے یا تو 'شعر' بن جاتے ہیں یا پھر فضا کے شور و شغب میں معدوم ہو جاتے ہیں۔

مخدوم محی الدین وہ پہلا عثمانی شاعر ہے جس نے حیدر آباد کی زمین میں انقلابی شاعری کا بیج بویا اور آج اس بیج میں جو متعدد انکھوے پھوٹتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں' وہ یقیناً مخدوم ہی کی رہینِ منت ہیں۔ بعض ناقدینِ شعر کا خیال ہے کہ "بہترین شعر وہ ہے جو جھوٹ سے بھرا ہوا ہو" لیکن عرب کا مشہور شاعر زہیر کہتا ہے کہ :۔

ایک ارمانِ مسرت، ایک ارمانِ قرار — جیسے بے پایاں سمندر کے کنارے جوئبار
جیسے ریگستان میں بھٹکی ہوئی موجِ بہار — جیسے وہموں کی پرستش، جیسے سایوں کا شکار
ارض پر جیسے فرشتے، شہر میں جیسے گنوار
کیا یہی ہے اضطرابِ آرزو ہندوستاں

ایک آہِ نارسا بے گانۂ ذوقِ سخن — جیسے پہلی شام کو مہتاب کی مدھم کرن
جیسے اک اندھی کنواری کا ادھورا بانکپن — جیسے مرجھائی ہوئی کلیوں میں روداد چمن
جیسے اک سوئے ہوئے کافر کی ابرو میں شکن
کیا یہی ہے قوتِ فریاد اے ہندوستان

میکش کا یہ مذاق گر آپ کو کچھ ناگوار گزرا ہو تو آئیے اس "دو آتشہ" سے کچھ منہ کا مزہ بدل ڈالئے: ؎

شرابِ ناب کو دو آتشہ بنا کے پلا — پلانے والے نظر سے نظر ملا کے پلا
چھلک رہا تھا تبسم بھی ساغرِ مے میں — پھر ایک بار اسی طرح مسکرا کے پلا
شرابِ نغمہ بھی بہتی رہے فضاؤں میں — کلامِ حافظ و خیام گنگنا کے پلا
ترا خیال ہے مجھ کو، کبھی نہ بہکوں گا — تری قسم مجھے سو بار آزما کے پلا
کچھ امتیاز نہ ہے میکدے میں میکش کا — لبوں سے اپنے ہر اک جام کو لگا کے پلا

میکش کی اس سرشاری اور مستی میں بھی ایک "امتیاز" ہے۔ اس خود فراموشی کے عالم میں بھی وہ بڑی لگتی ہوئی کہہ جاتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس کی ہنسی میں بھی غم آلود بیچارگی پنہاں ہوتی ہے: ؎

میری محویت کو گرما کر ہنسے — برق سی ہونٹوں پہ لہرا کر ہنسے
ہنس کے دیکھا، دیکھ کر تڑپا دیا — دیکھنے والے کو تڑپا کر ہنسے
کچھ تکلف سے گرائی برق بھی — جب ہنسی آئی تو شرما کر ہنسے
کہتے کہتے رک گئے کچھ جی کی بات — اپنے منہ تک ہاتھ لے جا کر ہنسے
رکتے رکتے مجھ سے وعدہ کر لیا — اپنے وعدہ پر قسم کھا کر ہنسے
میکشِ خاموش نے مانگی جو مے — دور سے ساغر کو دکھلا کر ہنسے

یہی "ہنسی"، تو ایک دن انسان کو خون کے آنسو رلواتی ہے۔ لیکن میکش کی غیور جوانی

ترے دل کی ٹھنڈک کو تاروں میں ڈھونڈا
ترے پھول کو مرغزاروں میں ڈھونڈا
ترے آنسوؤں کے چراغوں سے ڈھونڈا
ترے دل کے نوخیز داغوں سے ڈھونڈا
بہاروں کو لوٹانے والی ہوائیں
نہ تیری ہوائیں نہ میری ہوائیں
مُرادوں کو بر لانے والی دُعائیں
نہ تیری دُعائیں نہ میری دعائیں
نہ وہ اور نہ میں اور نہ تو جاودانی
ازل کے مصور کا ہر نقش فانی

زندگی کا یہ "پرسہ" اُس کے جذبات کو اُکسا کر انقلاب کے دَوراہے پر اُسے لا کھڑا کرتا ہے۔ اور وہ چلا چلا کر کہتا ہے کہ ع

گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

صاحبزادہ میکش (عثمانیہ) کے کلام میں ایک ایسا درد ہے جو ہلکے تبسم میں پوشیدہ ہو۔ ایک ایسی کسک ہے جو چہرہ کی سنجیدگی میں چھپی ہوئی ہو۔ ایک ایسی کھٹک ہے جو ناسور بننے کی آرزو میں پل رہی ہے، اور یہ سب کچھ اِس لئے ہے کہ اُن کے احساسات عمر سے پہلے بیدار ہو گئے ہیں۔ اُن کی جوانی بڑھاپے سے چہل کر تی رہی ہے۔ ایک موقع پر وہ اِس "بڑھوے" ہندوستان کا یوں مذاق اڑاتی ہے:۔

خار و خس کی جھونپڑی، مٹی کے بوسیدہ مکاں
جیسے اندھوں کے اشارے، جیسے گونگوں کی زباں
جس طرح اترے ہوئے چہرے پہ آنسو کے نشاں
جس طرح سوکھی ہوئی ٹہنی پہ اُجڑے آشیاں
داغ جن کے ساز و ساماں، درد جن کا پاسباں
کیا اِسی دُنیا میں تو پلتا ہے اے ہندوستاں

اک سسکتا سانس، اک ٹوٹا ہوا تارِ رباب
جیسے گہری سوچ میں پچھلے پہر کا ماہتاب
جیسے باسی پھول کی بو، جیسے پت جھڑ کا گلاب
جیسے دن میں چاند تارے، جیسے دریا میں حباب
جیسے دیوانے کی جنت، جیسے مفلس کا شباب
کیا اِسی کو زندگی کہتے ہیں اے ہندوستاں

موت کی پرچھائیوں میں پلنے والی زندگی
آندھیوں سے ٹمٹما کر جلنے والی زندگی
ظلمتوں میں اپنی آنکھیں ملنے والی زندگی
تھام کر لغزش کا دامن چلنے والی زندگی
غم کے سانچے میں مسلسل ڈھلنے والی زندگی
کیا اِسی کو زندگی کہتے ہیں اے ہندوستاں

۔۔ انقلاب کا خطاب ۔۔

حرکت و حیات، سکون و اضطراب، ماضی و حال، حال و قال، حقیقت و یقین، شباب،
شعر وغیرہ بعض نظموں پر بے اختیار کلامِ اقبال کا دھوکا ہو جاتا ہے۔ "نعت" تمام کہ بحر دی شعر
کھوئے ہوؤں کی جستجو:- میکش کی اُن نیم تاریخی نظموں کا مجموعہ ہے جو قطب شاہی حیدرآباد کی تصویر کشی
کرتی ہیں۔ اپنی نوعیت کی یہ پہلی چیز ہے۔
سکندر علی وجد بی۔ اے (عثمانیہ) کی شاعری میں شعر و موسیقی کا ایک حسین امتزاج
ہوتا ہے۔ یہ سامعہ نواز کیفیت وجد کی ہر نظم، ہر غزل میں پائی جاتی ہے۔ موضوع اور ماحول
کی مناسبت سے الفاظ کا انتخاب "پتھر" میں جان ڈال دیتا ہے:۔

اے بارگاہِ حسن ترا فیض عام ہے — دریائے مہر و لطف رواں صبح و شام ہے
تو کشتۂ وفا کا سہانا پیام ہے — فانی زمیں پہ نقش بقائے دوام ہے

جادو نگاہ عشق کا پتھر پہ چل گیا
الفت کا خواب قالبِ مرمر میں ڈھل گیا

الفت کا خواب قالبِ مرمر میں ڈھل گیا:۔ کیا تاج محل کی اس سے زیادہ دلچسپ کوئی شاعرانہ
تخیل ہو سکتی ہے۔:۔

بہزادِ عصر ہیں تری گلکاریوں پہ دنگ — منظر کشِ بہارِ چمن ہے جبینِ سنگ
کلیوں کا وہ نکھار وہ گلہائے رنگ رنگ — فانوس شمع کشتہ سے لپٹے ہوئے پتنگ

رنگینیاں ہیں جوہرِ اہلِ کمال کی
چھنتی ہے جالیوں سے نزاکت خیال کی

گلریز عکس خونِ دلِ حسن کار ہے — اس باغ بے خزاں میں ہمیشہ بہار ہے
پانی پہ عکس قلب صفت بے قرار ہے — جمنا ترے شباب کی آئینہ دار ہے

ہیبت سے تیری دلکشی بے پناہ کی
گنبد پہ کانپتی ہے کرن مہر و ماہ کی

یہ زرد و نرم دھوپ یہ پُرکیف وقتِ شام — کندن بنے ہوئے در و دیوار و سقف و بام
خورشید کر رہا ہے تجھے آخری سلام — وہ قلب شہر چھیڑ کے نکلا مہِ تمام

جوں ہی ردائے سفینۂ مہتاب آ گیا
تو موجِ حسن قلزمِ سیماب ہو گیا

میں اب سہنے کی تاب موجود ہے: ؎

ہم ہنسی میں دل کے صدمے سہہ گئے — ہنستے ہنستے قصۂ غم کہہ گئے
چند لمحے جو کٹے تھے ان کے ساتھ — وہ بھی دل کے داغ بنکر رہ گئے
زندگی ڈھونڈے گی ہم کو بعدِ مرگ — یہ بھی دیکھیں گے جو جیتے رہ گئے
مار ڈالا آرزوئے موت نے — ایسی موت آئی کہ جی کر رہ گئے
اپنی اور اُن کی تمناؤں کے راز — کچھ لبوں پر کچھ دلوں میں رہ گئے
اب سکونِ مرگ سے ہیں مضطرب — صدمۂ ہستی تو میکش سہہ گئے

لیکن سکون و اضطراب کی یہ متضاد کیفیات انسان کو "قرار" سے تھوڑی چھٹی دیتی ہیں

قرارِ بے قراریوں کا نام ہے شباب میں — سکونِ زیست پا رہا ہوں عہدِ اضطراب میں
عمل کے جام میں شرابِ علم پی رہا ہوں میں — کہ زندگی کو زندگی بنا کے جی رہا ہوں
نظر کی جستجو میں ہوں، دلوں کی آرزو میں ہوں — نویدِ زیست جس میں ہے وہ خواہشِ نمو میں
حیات کی بہار ہوں، شباب کی امنگ ہوں — میں غفلتوں کی موج کے لئے پیامِ جنگ
مرا شباب زندگی ہے کائنات کے لئے — عمل کا گیت ہوں میں مطرب حیات کے
مری حسین آرزو میں یاس کا گزر نہیں — بہارِ بے خزاں ہوں میں خزاں کا جھونکا
میں یادگارِ بود ہوں، میں کائناتِ ہست ہوں — شراب پی نہیں کبھی کہ بے پئے ہی مست ہوں
رکاوٹیں ہیں ہر قدم پہ پھر بھی چل رہا ہوں میں — کہ ظلمتوں میں شمعِ نور بن کے جل رہا ہوں

دکن پہ مجھ کو ناز ہے، دکن کے کام آؤں گا!!
کہ میں وطن پرست ہوں وطن کے کام آؤں گا!!

میکش کی یہ آرزو اُس کی شاعری کی جان ہے۔ اُس کی زندگی کا رس ہے۔ یہ ہمیشہ جئے گی اور شاعر کی زندگی ایک مستقل ہلچل بنی رہے گی۔

آج سے کئی سال قبل میکش کا مجموعہ کلام "گریہ و تبسم" شائع ہو چکا ہے۔ مولانا عبد الما لکھتے ہیں کہ:۔

"ادبی خدمت گزاروں کی شستہ و منتخب جماعت کے ایک رکن میکش صاحب ہیں جو مدت سے اپنے میخانہ سے شعر و ادب کے جام بھر بھر کر تقسیم کر رہے ہیں۔ گریہ و تبسم انھیں کے کلام کا مجموعہ ہے اور رنگا رنگ دلو کا ایک خوش منظر گلدستہ۔ کتاب کی تقسیم کئی حصوں پر ہے مثلاً

جگرداروں نے بنیادِ جہانِ نو اُستوار رکھ دی

ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے ۔ تراز دل ہی ہو جاتی ہے وہ تاثیر ڈالی ہے
اداؤں سے عیاں ہے لذتِ دردِ جگر دی ہے ۔ کھلیں گے راز اس ڈر سے دہن پر مُہر کر دی ہے

یہ تصویریں بظاہر گو یونہی خاموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کے راز کہتی ہیں

کرشمہ ہے یہ سب اہلِ جنوں کی سعیِ پیہم کا ۔ جنہیں احساس تک باقی نہ تھا کچھ شادی و غم کا
دلوں پر عکس کھینچ آیا تھا جن کے حسنِ عالم کا ۔ قلم کو نقش از بر ہو گیا تھا اسمِ اعظم کا

چٹانوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کر دیں

جہاں چھوڑا خوشی سے جاوداں پیغام کی خاطر ۔ خوشامد اہلِ دولت کی نہیں کی نام کی خاطر
نہ چھانی خاک در در کی کسی انعام کی خاطر ۔ جئے بھی کام کی خاطر مرے بھی نام کی خاطر

زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

آئیے اِس "سنگ و رنگ" کی دنیا سے نکل کر خیالات کی بستی میں جائیں اور "گل ڈنل" والی کچھ کہانی سُنیں :۔

یقیں مان جب وہ بیانی نہیں ہے ۔ یہ بپتا ہے ظالم کہانی نہیں ہے
گلوں کی طرح بلبلیں بھی جُدا ہیں ۔ کوئی عاشقوں کی نشانی نہیں ہے
ذرا اشک للہ پلکوں پہ تھم جا ۔ مجھے تیری قیمت گرانی نہیں ہے
سراسر خطا تھی نگاہِ تمنا ۔ گنہگار تیری جوانی نہیں ہے
مروت گراں ہے محبت گراں ہے ۔ یہاں دوستوں کی گرانی نہیں ہے[1]

ذرا سنئے تو! یہ دُور دھیمے دھیمے سروں میں ساز کون بجا رہا ہے۔ کبیر صمد رضوی ساز (بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی عثمانیہ) نہ ہوں۔ یہ ہمیشہ یوں ہی "تلاشِ سکون" میں پریشان رہتے ہیں :۔

مرا سکون یہ دُنیائے آب و ہوا میں نہیں ۔ جہانِ حسن کی امواجِ رنگ و بو میں نہیں
نہ جلوۂ سحری میں نہ آفتاب میں ہے ۔ نہ شام میں نہ شفق میں نہ ماہتاب میں ہے

---

[1] "لہو ترنگ" وحید کا مجموعۂ کلام بھی شائع ہو چکا ہے۔

تو نقشِ آرزو ہے مجسم زمین پر — آنکھوں نے تیرے حسن کی مے پی ہی بقدر
اک سرخوشی ہے قلب میں سرشار ہے نظر — بیٹھا ہوں پائے وقت کی آہٹ سے بےخبر
ارزاں قدم قدم پہ سکونِ حیات ہے
تیری حریمِ ناز میں دن ہے نہ رات ہے

وہ صرف پتھروں میں روح پھونکنے پر قادر نہیں ہے بلکہ اُس کی ترنم آمیز موسیقیت سے تصویریں تک بولنے لگتی ہیں :-

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہنر برسوں — جہاں گھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں — جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں
جہاں نغمے جنم لیتے ہیں۔ رنگینی برستی ہے!
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

شرابِ شعر کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں — بہارِ زندگی غلطاں ہے سبزے کی اداؤں میں
نوائے سرمدی آتی ہے جھرنوں کی صداؤں میں — بیاں ممکن نہیں وہ لطف آتا ہے دعاؤں میں
یہاں صدیوں سے رائج پُرسکوں شیریں مقالی ہے
یہاں کا ذرہ ذرہ مظہرِ شانِ جمالی ہے

در و دیوار پر ہیں نقشِ حسن و عشق کی گھاتیں — پیامِ زندگی دیتی ہیں شرمیلی ملاقاتیں
جواں برسات کے دن جان لیوا چاندنی راتیں — فضائیں گونجتی رہتی ہیں ہر دم دلنشیں باتیں
یہاں پیری پہ ہو جاتا ہے دھوکا نوجوانی کا
سبق دیتا ہے ہر چہرہ حیاتِ جاودانی کا

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقش لاثانی — تصدق جن کے ہر خط پر تحیر خانۂ مانی
مشکل سے ہے شباب و حسن میں تخیلِ انسانی — تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی
گلستانِ "اجنتا" پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

بہانہ مل گیا دستِ جنوں کو حسن کاری کا — اثاثہ لوٹ ڈالا شوق میں فصلِ بہاری کا
چٹانوں پر بنایا نقش دل کی بے قراری کا — سکھایا گر اُسے جذبات کی آئینہ داری کا
دلِ کہسار میں محفوظ اپنی داستاں رکھ دی

ہو گیا اب جو کچھ ہونا تھا
کھو دیا ہم نے جو کچھ کھونا تھا

رو ئیں گے قسمت میں رونا تھا
بھول نہ جانا عہدِ وفا کو

دل میں ہر دم ہوک اُٹھے گی
روتے روتے عمر کٹے گی

میری دُنیا خوب لٹے گی
بھول نہ جانا عہدِ وفا کو

دل کو تیرا احساس بہت ہے
چاہ کو تیری پاس بہت ہے

جینے کو یہ آس بہت ہے
بھول نہ جانا عہدِ وفا کو

ساز کو غالباً رومانیت سے ایک وابستگی سی رہی ہے اِسی لئے اُن کی شاعری میں کہیں کھلتی ہوئی کلیاں ہیں، کہیں مُرجھائے ہوئے پھول۔ دل اُن کی چٹاک سے کِھل جاتا ہے اور ان کی پژمردگی سے بجھ جاتا ہے۔ بہر حال دل ہے اور پھر شاعر کا!!

محمد شعیب حزیں (بی۔ اے عثمانیہ) کی طبیعت "غزل" کی رسیا ہے۔ "آشیاں و برق" کا تماشا دیکھنے میں انھیں کچھ عجیب مزہ ملتا ہے :-

بھری بہار میں گلشن کو آگ لگ جاتی
جو بجلیوں کی نظر میں نہ آشیاں ہوتا

ہمارے ذوقِ تباہی نے لاج رکھ لی ہے
یہ برق برق نہ ہوتی تو آشیاں ہوتا

حزیں کو اس "آگ کی ہولی" کھیلنے کا ایک خاص ملکہ ہے :-

اجازت ہو تو تیرا کھیل ہم اے آسماں کھیلیں
کہ آج اپنے آشیاں پر بجلیاں کھیلیں

تو جہ سارے گلشن سے ہٹا دی آشیانوں کی
یہ تنکے رکھ دیے ہیں تاکہ اُن سے بجلیاں کھیلیں

مری بربادیاں ممنون ہیں صرف اِس تمنا کی
کہ میرے ان بگولوں سے اور مجھ سے بجلیاں کھیلیں

نئی جیا ہے شاید شوقِ دل پورا یہ بھی ہو جائے
ہمارے آشیاں سے اور کچھ دن بجلیاں کھیلیں

لیکن جوانی میں "انگاروں" سے کھیلنا بلا وجہ نہیں ہوتا ہے :-

وہ وقت ڈھونڈتی ہیں پھر عشق کی ادائیں
میں کیوں دل سے کھیلوں اور آپ گنگنائیں

دل برق آشنا ہے سو بار جل چکا ہے
ہاں آپ مسکرائیں بے خوف مسکرائیں

پھر دل میں جیسے بجلی کروٹ بدل رہی ہے
کہہ دو کہ دونوں عالم اپنی حدیں بچائیں

اِس جان لیوا مسکراہٹ سے پہلے پہلے تو انسان غضب لطف اندوز ہوتا ہے! لیکن آخر کب تک؟! امید و یاس کی اِس کشاکش سے بیزار ہو کر وہ چیخ اُٹھتا ہے کہ :-

ہم اپنے آشیانہ کو خود ڈھونڈ لیتے ہیں
بیکار بجلیاں کیوں یہ زحمتیں اُٹھائیں

نہ سوز و ساز میں [illegible]   جہانِ شعر میں نئے کرب و اضطراب میں ہے

نہیں [illegible] فطرت کی دل نوازی میں
نہیں جہانِ حوادث کی کارسازی میں

ہزار بار لبِ جو کی سیر کی میں نے   بہارِ سبزہ و گل میں شراب پی میں نے
طلب کیا کبھی کہسار کی گھٹاؤں سے   کیا سوال کبھی صبح کی ہواؤں سے
عزیز دوست، خودی میں بھی آکے دیکھ لیا   کبھی تجھے کبھی خود کو بُلا کے دیکھ لیا
چمن چمن میں بہار و خزاں سے پوچھ لیا   کلی کلی سے، گُل و گلستاں سے پوچھ لیا
زمیں سے [illegible] لیا آسماں سے پوچھ لیا   غرض کہ سارے زمانے دونوں جہاں سے پوچھ لیا
مری تلاش پہ [illegible]   ترے جنونِ محبت کو آزمائے جا
سمجھ گیا جو مری [illegible]   مری حیات تری آرزو کا حاصل ہے

تری خوشی میں نہاں ہیں مسرتیں میری
سمٹ گئیں تری ہستی میں راحتیں میری

اِس ”روحانی اتصال“ کے بعد بھی ”وارداتِ قلب“ ملاحظہ ہوں : ؎

مرے حبیب یہ [illegible] ضبطِ غم کیسی   تجھے یہ فکرِ فراموشیٔ کرم کیسی
خیالِ ترکِ وفا ہی سے کانپ جاتا ہوں   سنبھال لے غمِ الفت کہ لڑکھڑاتا ہوں
بس ایک دشمن ہی [illegible] جاتا ہوں   ترا سکوتِ وفا آزمائے جاتا ہوں
یہ جانتا نہیں کس سمت جا رہا ہوں میں   ہے اتنا ہوش کہ تجھ کو بلا رہا ہوں میں
خدا لئے عشق کو اپنا بنا رہا ہوں میں   تو مجھ سے دُور ہے نزدیک آ رہا ہوں میں
رواں دواں ہوں کہیں اب [illegible] میں   یہ بیخودی مری پابندِ صبح و شام نہیں

جو اس کے سجدوں کو ملجائے پائے ناز ترا
خوشی سے جان ہی دیا ہے غریب ساز ترا

یہ بڑا اچھا ہوا کہ ”غریب ساز“ کو صرف ”ساز ہی“ بنا کے چھوڑ دیا گیا۔ ورنہ نظم میں یہ ’سوگوارانہ دلکشی‘ باقی نہ رہتی : ؎

ساز کو ’سازی‘ کہنے والے   غمِ الفت کا سہنے والے

[illegible]

آخری منظر ہے مارگریٹ "نیم دیوانگی کے عالم میں فاوسٹ کو پہچان کر....." کہہ رہی ہے:

یہ آخری سحر ہے مری عمرِ تلخ کی — اب ٹمٹما رہی ہے مری شمعِ زندگی
یہ دن مری حیات میں شادی کا روز تھا — یہ نور جاں نواز تھا، عشرت فروز تھا
دیدارِ یار دیکھ کسی سے بیاں نہ کر — یہ نقدِ زندگی ہے اسے رائیگاں نہ کر
اب بوستانِ حسن کے شرمائے ہیں پھول — وہ دیکھ میرے ہار کے مرجھائے ہیں پھول
اب وقتِ منتظم کی نوازش نہیں رہی — اب عشرتِ حیات کی خواہش نہیں رہی
وہ دیکھ اضطرابِ تماشا، وہ خلفشار — اہلِ جہاں کو موت کا میری ہے انتظار
اک چادرِ سیاہ مرے سر پہ ڈال کے — قاتل کھڑا ہوا ہے وہ آنکھیں نکال کے
مشکیں کسی ہوئی ہیں تو بازو اسیر ہیں — اعضا شکارِ معرکۂ دار و گیر ہیں
شمشیر تیز سر پہ مرے بے نیام ہے — اک جرم خاص کا یہ تماشائے عام ہے

آنسو نہیں، تپش نہیں، آہ و فغاں نہیں
خاموشیٔ عدم ہے فضائے جہاں نہیں!

اس مختصر سی ادبی صحبت میں جامعہ عثمانیہ کے تمام شعراء کا ذکر کرنا اور اُن کا نمونۂ کلام پیش کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے دو ہندو عثمانی شعراء کا کچھ کلام سُنانے کے بعد، شعرائے کے صرف نام بتانے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اس خصوص میں "شعرائے عثمانیہ" ادارۂ ادبیات اُردو کی مرتب کی ہوئی کتاب اپنی جگہ پر "عثمانی شاعری" کی سچی ترجمان ہے۔

مہندر راج سکسینہ ایم۔ ایس۔ سی (عثمانیہ) کی کچھ رباعیات ملاحظہ ہوں:

کیا شیخ کی سنتا ہے، ادھر آ پی لے — دو دن تو ملے ہیں زندگی کے جی لے
بجھنے کو ہے شرر کسی لمحے میں — دو گھونٹ سہی، دوا سمجھ کر پی لے

بڑھتا ہے مرا قدم، قدم کے آگے — جاتا ہوں میں حیطۂ عدم کے آگے
ہوتا نہیں واں شیخ و برہمن کا گزر — منزل ہے مری دیر و حرم کے آگے

جھگڑے میں ہیں کفر و دیں کے دنیا والے — بندوں کو لڑاتے ہیں اللہ والے
دنیا کو بنا چکے ہیں دوزخ لیکن — جنت کی تلاش میں ہیں عقبیٰ والے

حزیںؔ کا ذوقِ خلش "آشیاں بربادی" سے پہلے اُن تمام مقامات سے گزر چکا جو محبت اور عشق کے درمیان واقع ہیں:؎

چلو یوں ہی مرے ذوقِ خلش کی داد ملجائے — مجھے تڑپا کے کھیلا چاہتے ہیں دو جہاں کھیلا
حزیںؔ میں کھیلتا ہوا جوشِ طوفان و تلاطم سے — مری کشتی سے موجیں کھیلنا چاہیں تو ہاں کھیلا

محمد جلال الدین اشکؔ (بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی عثمانیہ) اشک پھر اشک ہیں۔ آنکھ سے ٹپکنے کے بعد "دل" کی گہرائیوں تک جا پہنچتے ہیں۔ اب یہ دل چاہے کسی "حسین دوشیزہ" ہی کیوں نہ ہو۔ اُس کے "تاثراتِ محبت" کو یہ اشک لے ہی کے اُٹھیں گے:؎

وہ بلاتے ہیں میں انکار کروں یا نہ کروں — سوچتی ہوں کہ انھیں پیار کروں یا نہ کروں
دیکھتے ہیں وہ میرے گیسوئے پیچاں کی طرف — ان کمندوں میں گرفتار کروں یا نہ کروں

. . . .

رات دن آتشِ فرقت میں جلا کرتی ہوں — حال سے ان کو خبردار کروں یا نہ کروں
ضبط کی تاب نہیں اب دلِ مضطر ہے مرے — آج اک آہِ شرربار کروں یا نہ کروں
اشک اُمڈے ہی چلے آتے ہیں طوفاں بہ کنار — دیدۂ تر کو گہربار کروں یا نہ کروں
دامنِ صبر مرا چاک ہوا جاتا ہے — ان کی الفت کا میں اقرار کروں یا نہ کروں
سوچتی ہوں کہ انھیں پیار کروں یا نہ کروں — جذبۂ عشق کا اظہار کروں یا نہ کروں۔

محبت کی کتنی سخت آزمائش ہے۔ ایک دوشیزہ کی نفسیاتی کیفیات کا کتنا سچا مرقع!

محمد عبدالقیوم خاں باقیؔ (ایم۔ اے عثمانیہ) جو کچھ کہتے ہیں بہت سوچ بچار کے بعد غائر نظر رکھتے ہوئے۔ مطالعہ وسیع ہے اس لئے باریک بین واقع ہوئے ہیں۔ کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

جلایا عشق نے جب بجلیوں کا نرمن بھی — لپٹ کے رونے لگیں میرے آشیانے سے۔
چراغِ شام کی یہ خوش نشانیاں ہے سے ہے — چمک رہی ہے فضا غم کے مسکرانے سے۔
شکستہ سازِ محبت یہ سوزِ عشق کیا کہنے — ستارے جھومتے ہیں میرے گنگنانے سے۔

مری حیات میں باقیؔ اُمید و یاس کہاں
مجھے ہے کام فقط قسمت آزمانے سے

باقیؔ صاحب کو منظوم ڈرامہ لکھنے میں یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ المانی زبان کے مشہور منظوم ڈرامہ
"[illegible]"

جامعہ عثمانیہ کی لکھنے والیاں ادبی، سماجی، سیاسی، معاشرتی مسائل پر ہمیشہ لکھتی رہی ہیں۔ اِس موقع پر صرف اُن کارناموں کا ذکر کیا جائے گا جو کسی صورت میں ترتیب پا چکے ہیں۔ اور اُن طالبات کو زیرِ بحث لایا جائے گا جو ادب کی کسی نہ کسی حیثیت سے خدمت کر رہی ہیں:۔

نذرِ ولی:۔ جہاں بانو بیگم نقوی، لطیف النساء بیگم، نعیم النساء بیگم، نجم النساء بیگم نے مل کر لکھی ہے۔ یہ چار مضامین جامعہ عثمانیہ کی ایم۔ اے ہیں۔ اپنی نوعیت کی یہ پہلی اور یقینی آخری کتاب ہے۔

اِس کتاب کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی رایوں کا اقتباس دینا نامناسب نہ ہوگا:۔

"چاروں مضامین جامعہ عثمانیہ کی طالبات کے ادبی ذوق اور علمی استعداد کا بہترین نمونہ ہیں۔ ہم نے سب مضامین بالاستیعاب دیکھے بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وسعتِ نظری اور ژرف نگاہی کے ساتھ ولی کی شاعری کا ایسا تفصیلی تجزیہ نہیں کیا گیا ہے۔ ہر مضمون اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت جامع اور مکمل ہے۔" معارف نومبر ۱۹۴۲ء

"ہر عنوان پر ایک ایک بانوئے محترم نے قلم اُٹھا کر تبصرہ نویسی کا حق ادا کر دیا ہے اور ایک تازہ شہادت اِس امر کی پہنچائی ہے کہ نور جہاں بیگم، جہاں آرا بیگم اور زیب النساء کے مذاق شعر و ادب کی بابت جو روایات و حکایات مشہور ہیں وہ افسانہ نہیں۔"
صدق یکم جنوری ۱۹۴۳ء

محمد حسین آزاد:۔ اِس کتاب میں جہاں بانو بیگم نقوی ایم۔ اے (عثمانیہ) نے آزاد کی انشا پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس موضوع پر یہ ایک گراں مایہ اضافہ ہے۔

ظفر اور اُن کا کلام:۔ تسنیم ربانی ایم۔ اے (عثمانیہ) نے ظفر کی شاعری پر مدلل بحث کی ہے۔

مرزا غالب:۔ سعیدہ مظہر بی۔ اے (عثمانیہ) نے غالب کی زندگی اور شاعری کو آسان زبان میں بچوں کے لئے لکھا ہے۔

شوکتِ اعظم:۔ سیدہ جعفری بی۔ اے (عثمانیہ) کی یہ مختصر کتاب بھی تاریخ کے انداز میں بچوں ہی کے واسطے لکھی گئی ہے۔

حیدرآباد:۔ رفیعہ سلطانہ بی۔ اے (عثمانیہ) نے اِس کتاب کو نہایت عام فہم زبان میں لکھا ہے جس کے مطالعے نہ صرف بچوں کے معلومات میں اضافہ ہوگا بلکہ دوسرے ناواقف لوگ بھی ایسے پڑھ کر حیدرآباد کو دیکھ سکتے ہیں۔

سرسید کی نثر:۔ نجم النساء بیگم ایم۔ اے (عثمانیہ) نے اِس کتاب میں ہندوستان کے انقلابی نثر نگار کے انشا پر بحث کی ہے۔

ڈاکٹر رگھو نندن راج ایم۔ بی۔ بی۔ ایس (عثمانیہ) کی ایک رُباعی اور سُن لیجئے:۔

مت پوچھ کبھی پھر جو گنہ مجھ سے ہوا | دل مجھ کو دیا جُرم یہ خود تجھ سے ہوا
لا۔ آج حساب اپنا بے باق کروں | کچھ تجھ سے ہوا سہو کچھ مجھ سے ہوا

عزیز احمد عزیز نے بہت سی انگریزی نظموں کا نہایت کامیاب ترجمہ کیا ہے۔ نظم اچھی لکھتے ہیں۔ ان کا مشہور ترجمہ عمر خیام اپنی سلاست و روانی میں جواب نہیں رکھتا۔
اِن کے علاوہ محمد امیر آمیر، سیدنبی الحسن شمیم، اکبر وفا قانی، حبیب اللہ رُشدی، قاضی آرام، ڈاکٹر بدرالدین بدر، بدرالدین خاں شکیب، سید علی حسنین زیبا، محمد ذکی، شنکر موہن لال اروال، برنی، ڈاکٹر زور وغیرہ کا ذکر بھی جامعہ عثمانیہ کے تذکرہ میں نہایت ضروری ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اِن حضرات کا طوالت کے خوف سے نہ تذکرہ کر سکے اور نہ اُن کے کلام پر کچھ روشنی ڈال سکے۔ بار زندہ صحبت باقی۔
یہ مضمون ادھورا رہ جاتا اگر ہم اُن طالبات کا ذکر نہ کریں جو ادب کی خاموش خدمت کے ساتھ ' مادرِ جامعہ ' کی نیک تعلیم اور صحیح تربیت کا پرچار کر رہی ہیں۔ " نیک تعلیم اور تربیت " پر ممکن ہے کہ لوگوں کے کان کھڑے ہوں۔ لیکن کیا کیا جائے اِس مغربی تعلیم کے اثرات اور احسانات کو، جن کے ' دباؤ ' نے ہندوستان کی نظروں کو نیچا کر دیا ہے۔ جامعہ کی پڑھی ہوئی لڑکیاں قومی روایت اور ملی عظمت کا تحفظ اپنا جزو ایمان سمجھتی ہیں۔ اپنے بزرگوں کی لاج رکھنا اُن کا منتہائے مقصودِ حیات ہے۔ وہ دقیانوسی نہیں، آزاد خیال ہیں۔ مگر آزادی کے برباد کُن راستہ پر دوڑنا ضروری نہیں سمجھتیں۔ وہ ترقی پسند ہیں لیکن ترقی پر تخریب کا بیج نہیں بوتیں اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے مادرِ جامعہ کی نیک تعلیم اور صحیح تربیت کا۔
کلیہ اناث اعلیحضرت حضور پُرنور نواب میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہٗ کے زریں کارناموں کی ایک ایسی یادگار ہے جسے بقائے دوام حاصل ہے۔ جامعہ عثمانیہ ابتدائی مدارج کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کو اعلیٰ امتحانات کے لئے بھی تیار کرتی ہے۔ کالج میں سائنس اور شعبہ فنون کے ہر علم کی تعلیم کا نہایت معقول انتظام ہے۔ اور اب تو پی۔ ایچ۔ ڈی کی تعلیم کا بھی بندوبست ہو گیا ہے۔ اور سب سے زیادہ لائق ستائش امر یہ ہے کہ تعلیم اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین ہی کی ہاتھوں انجام پاتی ہے۔

ایک افسانہ میں جہاں بانو بیگم اپنے نظریۂ حیات کو یوں واضح کرتی ہیں:-

''کامیابی زندگی کی موت ہے۔ وہ خواہش، وہ تمنا، وہ آرزو، وہ اُمید ہوشربا نہیں ہوسکتی جس کا انجام یاس والم نہ ہو۔ دل کے ٹوٹنے میں ایک زندگی ہے۔ آرزوں کی ناکامی میں ایک روحانیت و چہل پہل ہے۔ تمناؤں کی آن بان یاس و غمگینی کے پیمانہ میں اپنا اصل روپ دکھاتی ہے۔ خوشیوں، مسرتوں اور شادمانیوں کی گود میں پلنے والے ہجوم الم کی لذت سے آشنا نہیں ہوسکتے۔ زندگی کی حقیقی کامرانی زندگی کا ماتم ہے۔ اُن خواہشات کی سرخروئی نہیں ہوتی جن کی میت دھوم سے نکلے۔ یاس میں جو مٹھاس ہے وہ اس آرزو اور دل میں نہیں ...... ''

کامیابی زندگی کی موت ہے ——— دل کے ٹوٹنے میں ایک زندگی ہے ——— زندگی کی حقیقی کامرانی زندگی کا ماتم ہے ——— زندگی کے اس جنازہ میں اور کوئی نہیں لیکن آرزوئیں ضرور ساتھ رہتی ہوں گی۔ آرزوئیں جو دل میں پیدا ہوتی ہیں اور وہیں بجھ کے رہ جاتی ہیں، چونکہ اِن کی ''سرخروئی'' بھی تو زندگی کی موت ہے۔ دل کی خوشی بھی تو ''زندگی کا ماتم ہے''۔ زندگی دراصل وہ ہے جو ''دل کے ٹوٹنے'' سے بنتی ہے۔ لیکن یہ دل ٹوٹتا کیوں ہے؟

''مجھے ایک درد رہتا ہے۔ مگر مجھے خود نہیں معلوم کہ یہ درد کہاں ہوتا ہے اور اس کا درماں کیا ہے۔ میں دُنیا کو اس کی داستان سُنا کر مغموم کرنا بھی نہیں چاہتا اور نہ مجھے کسی ہمدردی کی ضرورت ہے۔ کبھی کبھی تو یہ درد اُٹھتے اُٹھتے سارے نظامِ عصبی کو تہہ بالا کر دیتا۔ اور مجھ پر بے ہوشی سی طاری ہو جاتی ہے۔ دُنیا کے چند لوگ میرے حال پر ہنستے تھے۔ دُنیا اگر ہمدردی نہیں کرسکتی تو چپ چاپ کسی تباہ حال کا حال تو دیکھ سکتی ہے۔ مگر نہیں۔ وہ اتنی متین، سنجیدہ اور اپنے مستقبل سے خبردار نہیں اس لئے اِس کو ہنسنے دیجئے۔ نہ جانے کس کی قسمت میں کیا کیا لکھا ہے ....''

بس، یہ ایک ایسی ہی نامعلوم سی بات ہے! کون سمجھے، کون جانے! جاننے اور سمجھنے کیلئے زندگی کی اُلجھنیں ہی کیا کم ہیں کہ اِن ''جزئیات'' پر غور کیا جائے۔ اِن کے ہونے نہ ہونے کا غم کھایا جائے۔ دراصل یہی ''جزئیات'' تو زندگی کے حاصل ہوتے ہیں۔ افسانہ نگارہ کا یہی تو کمال ہے کہ وہ اِن چھوٹی چھوٹی باتوں کے ذکر سے ایک ہلکا سا اشارہ دیتی ہوئی آگے

علامہ شبلی اور ان کی نثر: - نعیم النسا بیگم ایم۔ اے (عثمانیہ) کی یہ کتاب شبلی کے طرزِ انشا پر ایک محققانہ تبصرہ ہے۔

اُردو شاعری اور تصوف: - لطیف النسا بیگم ایم۔ اے (عثمانیہ) نے اپنے بحث کو دلنشیں انداز سے واضح کیا ہے۔

من کی بپتا: - اِسے لطیف النسا بیگم ایم۔ اے (عثمانیہ) نے لکھا ہے، مصنفہ کے احساسات شدید اور مشاہدات لطیف تر ہیں۔ وہ زندگی کو تلاش کرنے اِدھر اُدھر نہیں جاتیں بلکہ وہ اپنے ہی ماحول اور اسی فضا میں، جس میں کہ وہ سانس لیتی ہیں، زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ عورت کی سماجی صعوبتوں کو اُن کا دل بہت جلد "محسوس" کر لیتا ہے۔ وہ اُمید پرست ہیں اس لئے سماج کی دی ہوئی اِن صعوبتوں کو ہنستے ہوئے جھیل لیتی ہیں اور اپنی بہنوں کو بھی ہنس ہنس کر آنسوؤں کو پینے کی تلقین کرتی ہیں۔

من کی بپتا صرف من کی بپتا ہی نہیں ہے۔ زندگی ہے عورت کی، حس پر سے ایک مہین کھال اُتار لی گئی ہے تاکہ عورت اپنے آپ کو دیکھے، محسوس کرے اور سمجھنے کی کوشش کرے ——

اِس کتاب کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ:-

"یہ کتاب اِس قابل ہے کہ اِسے لڑکیوں کے نصابِ تعلیم میں داخل کیا جائے۔"

مولانا سید سلیمان ندوی	"کتاب اصلاحی نقطۂ نظر سے اِس قابل ہے کہ اِسے ہر شریف
مولانا عبد الماجد دریا بادی[1]	گھرانے میں ہونا چاہئے۔"

بربطِ ناہید: - اِنھیں چاہے افسانے کہہ لیجئے چاہے محسوسات۔ جہاں بانو بیگم نقوی ایم۔ اے (عثمانیہ) کی تحریریں سچ تو یہ ہے کہ افسانویت کم ہوتی اور واقعیت زیادہ۔ وہ دوسری بات ہے کہ زندگی کے قالب میں افسانوی روح "مضطرب" نظر آتی ہو۔ جہاں بانو بیگم کی کہانیاں ٹوٹے ہوئے دل کی ایک رُکی ہوئی آہ اور ایک نامکمل سی تمنا ہوتی ہے۔ اُن کے نزدیک زندگی اِسی ادھورے پن کا نام ہے۔ وہ شاید قنوطی تو نہیں ہیں لیکن اُمید کے ٹوٹ جانے سے جو ایک پُر حجاب نالہ پیدا ہوتا ہے وہ اُن کی ذہنی کیفیات کی غمازی کرتا ہے۔ یہ فسانہ نگاری کا معراج ہے کہ وہ اِسی شکستگی کو آغازِ حیات سمجھتی ہوئیں، ناکامیوں سے کھیلتی ہوئیں آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں تک زندگی تھک ہار کے اُن کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔

---

[1] اِن دو بزرگ ہستیوں کی رائے بار بار اِس لئے پیش کی جا رہی ہے کہ ہم نے شروع میں نیک تعلیم اور صحیح تربیت کا ذکر کیا ہے۔ ہمارے علمائے مسلمان لڑکیوں کی ادبی لغزش کا تحفظ جائز طور پر اپنا فرض سمجھتے ہیں اور جامعہ عثمانیہ کی طالبات [illegible]

کسک کے ساتھ! ''آتشِ خاموش'' اُن کا ایک ناقابلِ فراموش افسانہ ہے۔

اِن کے علاوہ رفیعہ سلطانہ بی۔اے (عثمانیہ) نے بھی بعض اچھے افسانے لکھے ہیں۔ اُنکا کوئی افسانہ اِس وقت ہمارے سامنے نہیں ہے ورنہ ہم اُن کی تحریر کا نمونہ پیش کرکے اُن کی افسانہ نگاری پر کسی قدر تفصیل سے تبصرہ کرتے۔

گلِ خنداں :- آصف جہاں بلگرامی (عثمانیہ) کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ جسے قبولیتِ عامہ حاصل ہو چکی ہے۔

ریڈیائی ڈرامے لکھنے میں جامعہ عثمانیہ کی اکثر خواتین نے بھی برابر کا حصہ لیا ہے۔ اِس خصوص میں صاحبزادی بیگم کا نام سب سے نمایاں ہے۔ جن کی ابتدائی تعلیم جامعہ عثمانیہ ہی کے نصاب سے شروع ہوئی ہے۔ اور اُن کو ''عثمانی جماعت'' میں شامل کرنا غیر واجبی نہیں ہے۔ صاحبزادی بیگم عثمانیہ کے بعض ڈرامے اور فیچرس اپنی افادیت اور مقبولیت میں بے مثل ہیں۔

غالباً اُن کے اِن ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ بھی شائع ہو رہا ہے۔ اِس لحاظ سے یہ ہندوستان کی پہلی خاتون ہوں گی۔

کچھ عثمانی شاعرات کے ذکر سے قبل شکیلہ بیگم مدیرہ ماہنامہ 'ارم' کا ذکر بھی نہایت ضروری ہے۔ شکیلہ بیگم کی ادارت میں یہ ماہنامہ نہایت کامیابی اور خوش سلیقگی سے شائع ہوتا ہے۔

لطیف النساء بیگم ایم۔اے (عثمانیہ)، نوشابہ خاتون بی۔اے (عثمانیہ)، افسر سلطانہ بیگم بی۔اے (عثمانیہ)، ناز بلگرامی (عثمانیہ) اچھا مذاقِ سخن رکھتی ہیں۔ 'شاعرہ' کی حیثیت سے یہ سب اچھی شہرت کی مالک ہیں۔

لطیف النساء بیگم (ایم۔اے عثمانیہ) کے کچھ شعر سنئے: ؎

تپ سوزِ غم سے جلا چاہتی ہوں — گناہوں کی اپنی سزا چاہتی ہوں
زمانے سے کھویا اسی چاہنے نے — میں اب کیا بتاؤں کہ کیا چاہتی ہوں
مرا ساری دنیا بُرا چاہتی ہے — میں سارے جہاں کا بھلا چاہتی ہوں
مصیبت ہو، راحت ہو، غم ہو کہ شادی — میں تیری رضا کبریا چاہتی ہوں
سدا اپنے دشمن کو بھی دوست جانا — بڑی ناسمجھ ہوں سزا چاہتی ہوں

اِس ''ناسمجھی'' کا انجام ملاحظہ ہو: ؎

شدتِ غم سے ہوا دل آب آب — سوزشِ پیہم کا یہ انجام ہے
زندگی کہتے ہیں جس کو ہم نشیں — اضطرابِ متصل کا نام ہے

بڑھ جاتی ہیں، پڑھنے والا "انجام" پر پہنچ کر مبہوت ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ کہنے
نے کیا کہا۔۔۔اور جب اُس کی قوت خیال، جذبات سے ہٹ کر اُس بات کا جائزہ لے
تو یہی جزئیات، زندگی کے جسد میں خون کی طرح دوڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

مکتوباتِ جمیل:۔ جہاں بانو کے ادبی اور افسانوی خطوط کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ رفتار
عرب اور عربستان، مصنفہ کی دوسری کتابیں ہیں۔

ناز بلگرامی (عثمانیہ) کے تخیلات کی دنیا بھی کچھ ایسی ہی سوگوار اور اداس ہے
لیکن اُن کی اس اُداسی کی سطح کے نیچے شعریت و اُلوہیت صاف جھلکتی ہوئی دکھائی
ہے ناز بلگرامی ہمیشہ جیسے کھوئی ہوئی سی کسی ایسی جستجو میں سرگرداں رہتی ہیں جس
متعلق وہ خود بھی نہیں جانتیں کہ کیا ہے؟ کیسی ہے؟ کیوں ہے؟

"آؤ میری امیدوں کی دُنیا بن کر آؤ۔۔۔۔۔۔ آؤ میرے نغمۂ زندگی بن کر آؤ"
ایسا راگ سناؤں گی جس میں تم غرق ہو کر رہ جاؤ۔۔۔۔۔۔ آؤ میرے دل کا دیوتا بن کر آ
آؤ میں تم کو سازِ فطرت کا ایک نغمہ سناؤں گی کہ جس سے پتھر کی جامد رگیں بھی جھوم اٹھیں
آؤ میری امیدوں کی دُنیا بن کر آؤ۔۔۔۔۔۔ آؤ میری دنیائے تمنا بن کر آؤ، میں تم کو ایسی
محبت دوں کہ جس کو جتنا پڑھا جائے وہ اتنا ہی کم سمجھ میں آئے۔۔۔۔۔ آؤ میرے دل
آکر اس طرح بس جاؤ جس طرح پھول میں خوشبو ہوتی ہے۔۔۔۔۔" پھول میں بسی ہوئی
جسے محسوس کیا جا سکتا ہے، دیکھا نہیں جا سکتا! کس قدر نازک اور لطیف تمنا ہے یہ
یہ تمنا صرف ایسے ہی قلب میں جاگزیں ہو سکتی ہے۔ جس کی دھڑکن بھی ایک خاص "
کے تابع ہو۔۔۔۔۔ حقیقی محبت اور ایک نامعلوم محبوب کا کیا اِس سے زیادہ اچھا کو
ہو سکتا ہے:۔

"محبت خدا کا ادبی نام ہے۔۔۔۔ محبت تمام پاکیزہ جذبات یہاں تک کہ عبا
بندگی سے بھی کہیں اعلیٰ و ارفع ہے۔۔۔۔ محبت ایک آسمانی پھول ہے۔۔۔۔۔۔۔
۔۔۔میں نے اس بات کو جان کر کہ بتوں کی پرستش سود مند نہیں، تمہاری پرستش کی
اور میں یہ جانتی ہوں کہ تم ایک بے حس مجسمہ ہو۔۔۔۔۔۔ شاید تمہاری یہ خاموشی میرے
بھی خاموش کر دے۔۔۔۔۔" ناز (بلگرامی) عثمانیہ ادبِ لطیف کے اچھے ہی چھوٹے
اور پر مغز فقرے لکھنے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ یہ افسانے بھی لکھتی ہیں، اسی خل

خودشناسی کی ضرورت اور مشکلات

(از جناب نصیر الحق صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) سب جج بھوپال)

بہ اعتبار مذہب نوع انسان دو گروہ میں تقسیم ہے اور پھر ان کی ضمنی تقسیمیں بے شمار ہیں۔ چند اہم حسب ذیل ہیں:۔

انسان

- اہل مذہب
  - موحدین
    - مسلم
    - اہل کتاب — جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ یعنی یہودی و عیسائی
  - مشرک
    - دیگر اہل کتاب — یا اپنے اپنے زمانہ میں خدا کے سچے پرستار۔ جن کا ذکر خاص طور پر قرآن مجید میں نہیں ہے۔
- لامذہب — دہریے۔ مادیین۔ کافر۔ بعض اہل سائنس جو خدا کے قائل نہیں۔ بعض فلسفی جو اخلاقیات ہی کو کافی سمجھتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

علم و عقل کے مدارج سے تقسیم کا فرق اہل مذہب ہی میں نہیں لا مذہبوں میں بھی یہی کیفیت ہے اور چونکہ انسان کا تخیل کبھی اعلیٰ اور کبھی پست ہوتا ہے اس لئے کبھی موحد۔ مشرک و کافر و لامذہب کے خیالات سے ٹکر کھانے لگتا ہے۔ کبھی مشرک یا کافر یا لامذہب یا سائنس والے یا اخلاقی فلسفی۔ اپنے دماغ میں روحانیات کی روشنی پاکر مذہب کے قائل ہونے کی طرف کھینچتا ہے۔ اور چونکہ مذہب نام ہے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو عبد اور مخلوق اور مجبور (مطلق یا ایک حد تک) سمجھنے کا اور ایک ذات برترین کو معبود۔ خالق۔ قادر و مختار مطلق ماننے کا۔ لہٰذا ہر مذہب اس ہر مادیت۔ ہر روحانیت۔ ہر سائنس۔ ہر فلسفہ۔ ہر اخلاقی تحقیق۔ ہر آزاد خیالی۔ ہر قال۔ ہر حال۔ ہر خیال کی قدر کرتا ہے جو بندے کو خدا سے ملانے میں امداد دے۔ مگر ایسا کہنے کے قابل ہم تیرہ چودہ سو برس سے ہی ہوئے ہیں۔ جب سے کہ قرآن [illegible]

اہلِ ظاہر موت کہتے ہیں جسے
اک سکونِ قلب ہے، آرام ہے

ہچکیاں لیتا ہے اب بیمارِ غم
زندگی لبریز تیرا جام ہے

لطیف النساء بیگم کی ایک رباعی اور سن لیجئے ؎

دنیا کی محبت میں امیری دیکھی
اسبابِ امارت میں فقیری دیکھی

سیکھی ہے مرے دل نے قناعت جب سے
بے مانگی میں شانِ امیری دیکھی

نوشابہ خاتون بی۔ اے عثمانیہ کے "نغمۂ حیات" پر اس صحبت کو پھر کسی آئندہ وقت کے لئے ملتوی کیا جاتا ہے ؎

ہے نوائے تلخ یارب سوز و سازِ زندگی
نغمۂ شیریں سنا بربطِ نوازِ زندگی

منتشر شیرازۂ اوراقِ ہستی جب ہوا
آشکارا ہو گیا دم بھر میں رازِ زندگی

ہے حجابِ زیست اک پردۂ دوئی کا پھر یہ کیوں
جستجو طولِ اجل کی، بے نیازِ زندگی

اپنی ہستی کو مٹا کر بن فروغِ انجمن
شمع سے کچھ سیکھ لے، سوز و گدازِ زندگی

ہے سکونِ موت سے بدتر سکونِ بے حسی
سعی و حرکت دہر میں ہے امتیازِ زندگی

انبساطِ روح ہے سرگرمیٔ ذوقِ عمل
دل کی حرکت جس طرح ہی جانوازِ زندگی

اعتمادِ نفس، استقلال و ایثار و کرم
عرصۂ فانی میں ہے اعلیٰ طرازِ زندگی

اظہر رضوی (عثمانیہ)

دوسروں کو سچا بندہ اور مردِ خدا بنانے کے لئے جس قدر خود شناسی ضروری ناگزیر ہے
اسی قدر یہ منزل بہت کٹھن ہے کیونکہ اس قابلیت کے حصول کا کوئی ایک مقررہ راستہ نہیں۔
قدیمی اسکول (طبقہ خیال) کہتا ہے کہ اپنے آپ کو اس قدر بے حیثیت سمجھو کہ کچھ بھی
نہیں جس قدر اپنے آپ کو گراؤ گے خدا کی عظمت کو دل میں ابھارو گے۔ اور دوسروں کے
کمال کی قدر بھی جب ہی کرو گے جب اپنے آپ کو سب سے کم سمجھو گے۔ خدمت۔ خلوص۔
خشوع و خضوع۔ اتقا۔ حلم۔ عفو۔ رواداری۔ مرنجاں مرنجی۔ تسلیم و رضا ادب بتمیز مراتب
اور ایسی ہی صفات اسی طریقۂ منفی یا مدافعانہ سے پیدا ہونی ممکن کہی جاتی ہیں۔
جدید اسکول کہتا ہے کہ جب تک ہم اپنے آپ کو سب کچھ اور سب کچھ کر سکنے والا
نہ سمجھیں گے ہم کچھ کر نہیں سکتے۔ ہم میں خود اعتمادی جب تک پیدا نہ ہوگی ہم کوئی اولوالعزمی
نہیں دکھا سکتے اولوالعزمی کے بغیر کوئی ترقی اور نمایاں کام نہیں کر سکتے۔ جو بندہ خود
صاحبِ عظمت ہو وہ خدا کی عظمت کا خیال اور زیادہ اچھی طرح پیدا کر سکتا اور قائم رکھ سکتا ہے۔
دوسروں کے کمال کی قدر جب ہی ہو سکتی ہے کہ ہم خود بھی صاحبِ کمال ہوں ورنہ تحسین ناشناسی
سے کیا فائدہ۔ جب تک ہم میں خودداری۔ ہمت۔ انتظامی مصلحت۔ صاف گوئی۔ راست بازی۔
تکبر شکنی۔ کارخانۂ قدرت کی سمجھ وغیرہ وغیرہ صفات کے حصول کو اسی مثبت یا جارحانہ
طریقہ سے ممکن بنایا جاتا ہے۔
غور سے دیکھیں تو دونوں طریقوں کے مجموعہ ہی کا نام دنیائے علم و عمل ہے، افراط و تفریط
کو سمجھے بغیر اعتدال سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا۔ شرک کی حدود سے واقفیت کے بغیر عبادتِ صحیحہ
پر قیام مشکل ہے۔

خود شناسی کے جو دو طریقے بیان ہوئے وہ زیادہ تر روحانی یا اخلاقی پہلو کے دو
مظاہرے ہیں مادی و جسمانی پہلو کے مظاہرے بے شمار ہیں، اور ان کل مظاہروں ہی کا دوسرا
نام وہ "خدا کی باتیں" ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ اگر تمام سمندروں کی سیاہی اور تمام
درختوں کے قلم بنائے جائیں تو بھی خدا کی باتیں یا بہ الفاظ دیگر اس کی قدرت کے مظاہرات
اور کمالات کا بیان پورا نہ ہو۔
انسان کو ذات الٰہی کا مظہر صورت۔ نائب۔ خلیفہ۔ حاملِ امانتِ الٰہی۔ اشرف المخلوقات کہا

لوگوں نے مذہب کے نام سے جس درشتی اور تنگ خیالی اور باہمی نفرت کو اپنا شعار بنا رکھا تھا کہاں وہ اور کہاں علمی و معقولی فضا۔ قرآن شریف نے ہی غیر مسلم سے رواداری کا سبق دیا ہے۔ تاکہ وہ مسلم کی طرف کھچ کشش پاکر سائنس، فلسفہ و اخلاق اور مادیت کو خالص مذہب سے مطلق بیگانہ نہ جان کر غور کرنے کے قابل ہو کر ان چیزوں سے بالاتر بھی اور کچھ ہے۔ جوں ہی انسان کے دل میں اس بالاتر کی کرید آئی اور اللہ سے قرب شروع ہے۔ اسی کا نام معرفت یا معرفت کی کوشش ہے۔ اور معرفت کا پہلا زینہ خود شناسی ہے

خود شناسی وہ مشترکہ پلیٹ فارم ہے جو قرآن مجید (خدا کے کلام) اور حدیث (رسولؐ خدا کے کلام اور افعال کی یادداشت) نے تیار کیا ہے کہ تبادلۂ خیال کے ذریعہ اہل مذہب مسلم ہر علم کا عالم اور صحیح اصولوں پر عامل بنے اور جو خوبیاں اور کمالات دوسروں میں ہوں انھیں اپنے اندر لے کر اپنے ہی عقیدہ کے سانچہ میں ڈھال کر ایک جان بنالے اور لا مذہب۔ اپنے تیقنات و ظنیات۔ تھیوری۔ پریکٹس۔ منطقی اگر مگر۔ اور ترقی پسندی کے زعم۔ مشاہدۂ تجربہ کے پشتارے۔ سب کو یہاں لاکر جمع کرے اور اپنے اونٹ کو اسلامیات کے پہاڑ کے نیچے لائے اور اس کی کل سیدھی کرے۔ اور نکیل اللہ کے ہاتھ میں دے، جو ہے تو پہلے ہی اس کے ہاتھ میں۔ لیکن تسلیم کرے کہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔

یہ پلیٹ فارم کس قدر مضبوط ہونا چاہئے کہ اس پر اتنے علمی و عقلی بوجھ مادی اور روحانی لادے جائیں اور قائم رہے؟ اور مسلمان پر ایسی تعمیری قابلیت حاصل کرنے کی کس قدر ذمہ داری ہے؟ کیا یہ ذمہ داری۔ اسی امانت الٰہی کی ادائیگی کی ذمہ داری کا دوسرا نام ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ پہاڑ تک اس کو برداشت کرنے کے قابل نہ ہوئے اور انسان نے اس امانت الٰہی کو پورا کرنے کا وعدہ کرلیا! کیا اسی مفہوم میں کہا جاتا ہے کہ ہر مسلمان پیدائشی مبلغ ہے، یا یہ کہ تمام علم و عقل کا سرمایہ اسی کا پیدائشی حق ہے! یا۔ علم حاصل کرو خواہ چین ہی میں ہو (کسی قدر دُور و دراز سفر اس کے لئے کرنا پڑے) یا تعلیم ہر مسلمان مرد و عورت کے لئے فرض ہے؟ یا حکمت مومن کا گم شدہ مال ہے۔ ان سوالوں کے جواب

اور کس حالت سے ترقی کرے۔

۲۔ وہ دیگر مخلوق سے کن کن اُمور میں اور کیوں ممتاز ہے۔ اس امتیاز سے اُس کے عمل میں کیا فرق لازم آتا ہے۔ اُس کے عقلی و جسمانی قویٰ کس مقصد کے لئے ہیں۔ تغیرات کیا اور اُنکے مدارج کیا ہیں۔

۳۔ کیا کوئی اور ظاہر یا پوشیدہ مخلوق۔ جاندار مثل فرشتہ یا جن یا شیطان یا بے جان مثل ستارہ۔ پتھر وغیرہ، انسان پر کسی طرح کوئی اثر ڈالتی ہے علم و عقل جبر و اختیار قسمت اور تقدیر کیا ہیں اور ان سے مخلوقات کہاں تک متاثر ہوتے ہیں۔ جادو۔ نظر بد۔ فال وغیرہ وغیرہ کی کچھ اصل ہے یا نہیں، اور ہے تو کیا؟

۴۔ روح یا جان کیا ہے۔ کب۔ کس طرح اور کیوں پیدا ہوئی۔ انسان اور غیر انسان کی جان کی نوعیت ایک ہی ہے یا کیا جان اور جسم کا تعلق۔ حرکت ارادۂ عمل کے اسباب۔ مردہ اور زندہ جسم میں فرق۔ کیا ہے اور کیوں ہے۔ موت کیا ہے۔ موت کے بعد روح کہاں چلی جاتی ہے۔ پھر واپس کب ملتی ہے یا ملے گی اور کس حالت میں۔

۵۔ انسانی دماغی مشین کے کل پُرزوں کی ماہیت اور اُن کے کام کے طریقے۔ نفسیات۔ خرق عادات و کرامات کا امکان تہذیب و تمدن کے مدارج۔ تربیت و صحبت اور وراثتِ نسلی کے اثرات۔

۶۔ اگر کوئی خالقِ کائنات و انسان وغیرہ ہے تو اُس کی ذات و صفات کا علم اور تعلق۔ عبادت کا مطلب۔

۷۔ کارخانۂ قدرت زمین۔ آسمان۔ سورج وغیرہ کی پیدائش۔ اور انسان سے تعلق۔ اشیا سے استفادہ۔ وغیرہ وغیرہ

غرض بے شمار امور ہیں جن کا جواب تنہا اپنے علم سے نہ کوئی ڈاکٹر دے سکتا ہے نہ سائنسدان، نہ ماہر نفسیات، نہ مورخ، نہ جغرافیہ دان، نہ نجومی وغیرہ۔ ڈاکٹروں اور سائنس دانوں کے نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ فلسفہ اور نفسیات والے کبھی اہل سائنس کا تتبع کرتے ہیں کبھی اُن کے پیش رو بن جاتے ہیں۔ مورخوں اور جغرافیہ والوں کی معلومات میں تو ہم نئے نئے کھدائیوں کی بدولت قطبین اور پہاڑوں کی چوٹیوں کی سیاحتوں وغیرہ سے ہوتی رہتی ہے۔

گیا ہے۔ تو خداشناسی کی باتوں کے ٹکٹ بھگ ہی اس عظمت والے انسان کی شناخت یا بہ الفاظ دیگر خودشناسی کی باتوں کا بیان (پورا پورا) ناممکن ہے۔ یعنی کوئی انسان چاہے کہ میں ہر اعتبار سے خودشناس ہو جاؤں ممکن نہیں۔ جس قدر جدا جدا علوم ہیں اُن میں سے ہر علم خودشناسی کے صرف ایک پہلو کی تکمیل یا اس کی کوشش کرتا ہے۔ ابھی بہت سے علوم کا انکشاف باقی ہے یعنی بہت سے عقدے حل طلب ہیں۔ مثلاً "روح" کا معاملہ۔

قلم جس قدر آگے چلتا جاتا ہے بدحواسیوں کے جنجال میں مبتلا ہوتا جاتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ ابھی تمہید ہی پوری نہیں ہوئی اور جبکہ انسان کے گرد نظامِ عالم مکڑی کے جال کی طرح تنا ہوا ہے ہر چیز اس سے اور وہ ہر چیز سے متعلق ہے کہتے ہیں کہ ہر چیز اُسی کے لئے بنائی گئی ہے تو پھر انسان خودشناسی میں کس چیز کی طرف سے آنکھ بند کر لے۔ اللہ کی ذات اور صفات میں اور اُن کے اپنی ذات وصفات سے تعلق ہونے میں اگر غور کرتا ہے تو کہاں تک۔ وہ تو بہت بڑی ذات ہے اُس کی ایک معمولی سی زیرِ پا افتادہ مخلوق یعنی زمین ہی کو لیتا ہے کہ اس میں کیا بات تھی جو انسان کو اس پر بسایا اور اس سے ابتدائی مادۂ پیدائش کی مٹی لی گئی اور کیوں لی گئی۔ کتنے عرصہ سے یہ موجود ہے وغیرہ وغیرہ تو اسی کے۔ اور اس کے انسان سے تعلق کے سمجھنے میں برسوں چاہئیں آسمان میں سے ایک نظامِ شمسی ہی کو لیتا ہے جس سے اُس کی زندگی اور نور اک وغیرہ کا تعلق کہا جاتا ہے تو بس اسی کا ہو رہا۔ حیوانی دنیا کے جس جنس۔ نوع۔ فرد کو لیتا ہے کہ وہ مسنگ لنک Mising link ڈارون والی کہاں گئی۔ تھی بھی یا نہیں۔ تھی تو کس حیوان سے مشابہ۔ تو تمام ارتقا کے سمندر کو کھنگالنا پڑتا ہے۔ پھر بھی نہ معلوم موتی ملے یا گھونگا۔

اوّل تو خودشناسی میں خدا اور اُس کے کارخانے سے بے تعلقی ممکن نہیں وہ تو ساتھ ساتھ بھگتنے پڑیں گے لیکن اگر ممکن بھی ہو تو خود انسان اکیلا ہی کیا کسی کے بس کا ہے چند سوالات یہ ہو سکتے ہیں :۔

۱۔ انسان کیا ہے۔ کون ہے۔ کہاں سے آیا۔ خود بخود نمودار ہوا یا کوئی لایا اور کس نے بنایا۔ کیسے بنا۔ کس مادہ سے بنا۔ کیوں بنایا گیا۔ ایک دم نئی جنس کی حیثیت سے بنا یا رفتہ رفتہ۔

گوشہ تنہائی اور سنجیدگی کے مواقع کم کرتے چلے جاتے ہیں، اور جنھیں یہ افکار کچھ موقع دے بھی دیتے ہیں تو ناول۔ افسانے۔ تھیٹر۔ سینما۔ اور لہو و لعب کے عام مذاق۔ وقت کو تنگ کر دیتے ہیں۔ حالانکہ تعلیم کے لئے جس قدر وقت ملے۔ علمی سوسائٹی جہاں اور جب ملے اُسے غنیمت سمجھنا چاہیے۔ جب ہی "خود شناسی" "معرفت"۔ "امانتِ الٰہی"۔ "اللہ کی باتیں" وغیرہ اصطلاحات کا مطلب سمجھ میں آ سکتا ہے۔

راقم مضمون نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں مذکورہ بالا سوالات اور متعلقات کو اپنی عقل ناچیز کے مطابق سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اُردو داں طبقہ کی عام بے توجہی اور دیگر وجوہ سے ابھی شائع کرانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ سر دست یہ شعر کافی ہے:

نہیں جاتی کہاں تک فکر انسانی نہیں جاتی
مگر اپنی حقیقت آپ پہچانی نہیں جاتی

نصیر الحق

اب رہے ماہر روحانیات اور عارف خدا رسید... اور اہل مذہب۔ تو ان کا معاملہ زیادہ تر حال اور ذوق و وجدان سے ہے جس کے لئے چھٹا حس بھی ضروری ہے محض حواس خمسہ کافی نہیں اور یہ چھٹا حس یعنی شئے لطیف کیاب ہے۔ پھر پیغمبروں تک نے اپنی عقل روحانیت، علم لدنی وغیرہ کمالات کے باوجود ایک درجہ تک پہنچنے کے بعد علم غیب میں اپنے آپ کو عاجز تسلیم کیا ہے یا مخاطبین کی عقل کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک حد تک سمجھانے کے بعد خاموشی اختیار کی ہے کہ کوزہ میں دریا کیسے بھرا جا سکتا ہے۔

یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرات صوفیائے کرام نے خودشناسی پر جس روحانی و اخلاقی مفہوم میں زور دیا ہے اُس کے سوائے دوسرا مادی پہلو بھی ہے کہتے ہیں کہ جسم کی صحت۔ دماغ کی صحت کے لئے لازمی ہے اس لئے صوفیائے کرام کی نصیحت پر عمل ہوشمندی سے جب ہی ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے مادی متعلقات کو بھی جہاں تک ہو سکے سمجھ لیں، جس طرح نماز سے پہلے وضو کرتے ہیں اور یہ طریقہ استدلال خدا تعالےٰ نے بھی صحیح سمجھا ہے کہ مادیات زمین۔ سورج چاند۔ بارش وغیرہ کا حوالہ دیتے ہوئے تخیل کو اپنی ذات واحد تک بلند کرنے کی دعوت دی ہے کہ پہلے حاضر کو دیکھو اور سمجھو پھر غائب پر غور کرو۔ اور اسی مفہوم میں یہ کہا گیا ہے کہ "پہلے خودشناس بنو خداشناس تو اس کے ساتھ بن جانا لازمی ہی ہے۔

ہم میں جو شخص تاجر ہے وہ اپنے متعلقہ کاروبار۔ نرخ اشیا اور اصول تجارت کی خبر رکھتا ہے۔ کاشتکار قسم زمین، موسم، تخم ریزی وغیرہ کی اطلاعیں رکھتا ہے۔ حاکم اور ماتحت اصول حکومت و ڈسپلن وغیرہ جانتے ہیں۔ غرض ہر شخص یہاں تک کہ گداگر بھی جیب سے کچھ نکلوانے کے فن میں مہارت رکھتا ہے اور جو شخص اپنے فرائض و حقوق جتنے زیادہ جانتا ہے اُتنا ہی بہتر اور کامل انسان سمجھا جاتا ہے پھر تعجب یہ ہے کہ انسان خود اپنے ہی متعلق کچھ نہ جانے کہ انسان۔ انسانیت اُس کے فرائض و حقوق اور متعلقات کیا ہیں۔

امانت الٰہی ادا کرنے کا وعدہ جب انسان کر آیا تو اس قرضہ کی بے باقی خودشناسی کے بغیر نہیں کر سکتا۔

لیکن بڑی مشکل یہ آپڑی ہے کہ تخیل کی بلندی کے لئے جس قدر علم۔ تربیت۔ صحت اور عقل کی ضرورت ہے اُس کے لئے ہائے روٹی ہائے پیٹ کے افکار۔ غور و فکر اور

مسئلۂ جہاد پر مباحث ہیں۔ جن میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کس طرح 'دارالحرب' سے 'دارالاسلام' ہوگیا۔ انگریزی عہد حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ ناانصافیوں کے عنوان سے قاضیوں اور مفتیوں کے عہدوں کی شکست اور شریعتِ اسلامی کے بتدریج ختم ہونے کی روئداد ہے۔ علاوہ ازیں موجودہ نظام تعلیم اور ۱۸۷۱ء میں مسلمانانِ بنگال کی تعلیمی حالت اور ملازمتوں میں اُن کے تناسب کے اعداد و شمار بھی دیے گئے ہیں۔ غرض کتاب مذکور سے بہت سی مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں اور جب اس کا مکمل ترجمہ شائع ہوگا تو اس سے ہماری زبان کے تاریخی ذخیرہ میں ایک قیمتی اضافہ ہوگا۔

سید الطاف علی بریلوی

گورنمنٹ نے تمام صوبۂ بنگال میں اسکولوں کا ایک جال بچھا دیا ہے۔ اور بنگال کے اکثر اضلاع میں صرف مسلمان ہی آباد ہیں لیکن اس پر بھی گورنمنٹ اسکول ایسے مسلمانوں کی جماعت تیار کرنے سے قاصر رہتے ہیں جو کامیابی کے ساتھ یونیورسٹی تک مقابلہ کرسکیں یا کسی پیشہ میں داخل ہوسکیں۔ یہی اسکول ہر سال ایک بڑی جماعت ایسے ہندو نوجوانوں کی بھیجتے ہیں جو اچھی طرح تعلیم یافتہ، ترقی پسند اور اہلِ قلم ہوتے ہیں اور جو یونیورسٹی میں بہ حیثیت نوعمر ہونے کے ہمیشہ ممتاز رہتے ہیں اور اس کے بعد کی زندگی میں دولت اور اعزاز کے ہر راستہ کے اجارہ دار بن جاتے ہیں۔

سچ یہ ہے کہ ہمارا وہ نظام تعلیم جس نے ہندوؤں کو صدیوں کی غفلت سے بیدار کردیا اور جس نے ان کی پست ذہنیت والے افراد میں ایک شریفانہ جذبۂ قومی پیدا کردیا۔ وہی نظام مسلمانوں کی روایات کے خلاف، اُن کی ضروریات کے لئے غیر مناسب اور اُن کے مذہب کے لئے قابلِ نفرت ہے۔ اسلامی حکومت میں بھی ہندوؤں نے بعینہٖ اسی طرح اپنی قسمت پہ صبر کرلیا تھا جیسا کہ اب کرلیا ہے۔ موجودہ وقت میں ترقی انگریزی جاننے پر ملتی ہے اور وہ لوگ انگریزی سے واقف ہیں۔ اس سے قبل ترقی کا انحصار فارسی جاننے پر تھا اور وہ لوگ اُس وقت فارسی سے خوب واقف تھے۔ ہم کو ۱۵۸۲ء سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اس زبان میں تصنیفات بھی شروع کردی تھیں۔ چنانچہ اس ابتدائی زمانہ کے ہندوؤں میں سے ایک شاعر کی نظمیں ابتک موجود ہیں۔ اور اس نے مسلمان نوجوانوں کے

سے

مسلمان کیوں علیحدہ رہے؟

"مسلمانانِ ہندوستان" مصنفہ ڈبلو۔ ڈبلو ہنٹر کے چند اوراق

مترجمہ

(جناب پیرزادہ عبدالباسط صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ پروفیسر علوم مشرقیہ اسلامیہ کالج لاہور)

کمیاب قلمی کتابوں کی طرح بکثرت ایسی مطبوعہ کتابیں بھی ہیں جن کے نسخے قریب قریب ناپید ہو چکے ہیں۔ اُن کے اقتباسات اور حوالے دوسری کتابوں میں ملتے ہیں لیکن اصل کتابیں لاپتہ ہیں۔ اسی قسم کی ایک کتاب "مسلمانانِ ہندوستان" مصنفہ ڈبلو۔ ڈبلو ہنٹر ہے جو سنہ ۱۸۷۱ء میں لندن سے شائع ہوئی تھی اور جس کا جواب سرسید علیہ الرحمۃ نے لکھا تھا۔ عرصہ کی مفقود الخبری کے بعد کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کے کام کے سلسلہ میں اس کا علم لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب کو ہوا، اُن سے یہ کتاب مولانا سید طفیل احمد صاحب کے ہاتھ میں پہونچی اور مولانا صاحب کی تحریک و ترغیب پر سنہ ۱۹۳۵ء میں ہمارے عزیز دوست پیرزادہ عبدالباسط صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ پروفیسر علوم مشرقیہ اسلامیہ کالج لاہور نے اُس کا اردو میں ترجمہ کیا۔

زیرِ نظر ترجمہ کیسا ہے؟ اس سے قطع نظر کرکے اصل کتاب کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ ہنٹر نے اُس میں مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ اور موجودہ ضروریات پر بحث کرکے حکومت برطانیہ کو اُن کی ذہنیت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

سب سے پہلے حضرت سید احمد صاحب بریلوی کی تحریک کے مفصل حالات اور سرحدی "وہابیوں" کی باغیانہ سازشوں کی مکمل داستان درج ہے۔ مسلمان مفتیوں کے فتووں اور

اپنی حکومت کے ابتدائی پچھتر سالوں میں ہم نے اس نظام کو برقرار رکھا تاکہ اس کے ماتحت ہماری حکومت کو چلانے والے افسر تربیت حاصل کر سکیں۔ لیکن اسی اثنا میں ہم نے خاص اپنا ایک نظام تعلیم بھی وضع کر دیا تھا اور جیسے ہی اس نظام کے تحت خاص آدمیوں کی ایک نسل تیار ہو گئی، ہم نے اس قدیم اسلامی نظام تعلیم کو الگ اٹھا کر پھینک دیا۔ اس وقت سے مسلمان نوجوانوں کو سرکاری ملازمتوں کا ہر ایک راستہ بند نظر آتا ہے۔ اگر مسلمان عقلمند ہوتے تو انھوں نے اس تبدیلی کا اندازہ لگا لیا ہوتا اور اپنی قسمت بنا لی ہوتی لیکن ایک قدیم فاتح قوم آسانی سے اپنی گزشتہ عظمت کی دیرینہ روایات کو یکلخت نہیں بھول سکتی۔ چنانچہ بنگال کے مسلمانوں نے اس نظام کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا جو ان کو ان لوگوں پر کسی قسم کی ترجیح نہیں دیتا تھا جن پر وہ پہلے حکومت کر چکے تھے۔ اور وہ ان کے نزدیک بت پرست ہونے اور نیز ایک ذلیل قوم سے تعلق رکھنے کی بنا پر قابل نفرت تھے[1] جیسا کہ عرصہ دراز تک یہ سوال قائم رہا کہ آیا کوئی مسلمان لڑکا اپنے ضمیر کو نقصان پہنچائے بغیر سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟ اگر ہم نے اپنے نظام کو انگریزی استادوں کے ذریعہ روشناس کیا ہوتا یا عدالتی زبان کو ذرا جرات و ہمت سے کام لے کر تبدیل کر کے اپنی زبان کو عدالتی زبان قرار دیا ہوتا تو ان پر ایک حیثیت سے مذہبی ذمہ داری ضرور کم ہو جاتی کیونکہ مسلمان اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ عیسائی مذہب خواہ اس میں وہ حقائق جن کا اظہار ان کے پیغمبر (علیہ السلام) نے کیا تھا بالکل ہی مفقود کیوں نہ ہوں لیکن پھر بھی وہ ایک آسمانی اور الہامی مذہب ہے۔ لیکن ہندوؤں کا مذہب ان کے لئے کئی حیثیتوں سے قابل نفرت ہے وہ بت پرستی اور شیطانوں کی عبادت والا مذہب ہے جس میں توحید کے علم کی

صفحہ ۱۶۷ کا نوٹ: یہ تاریخی حقیقت اس کے خلاف ہے۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہندوؤں نے حکومت میں بہت بڑے بڑے درجے حاصل کئے۔ مثلاً فوج کی اعلیٰ سپہ سالاری اور کابل کی گورنری وغیرہ (الطاف)

[1] انگریزی نظام تعلیم سے مسلمانوں کی علیحدگی کی یہ وجہ بالکل غلط ہے۔ کافی عرصہ تک چونکہ تعلیم متعصب عیسائی مشنریوں کے ہاتھ میں رہا اس لئے مسلمان مجبوراً اس سے کنارہ کش رہے۔ اسی قسم کا بے بنیاد و ذلیل اور قابل نفرت تاریخی لٹریچر آج ہندو مسلم نفاق کا باعث ہے۔ (الطاف)

معلم کے عہدہ تک ترقی حاصل کر لی تھی۔ علوم اسلامیہ کا ماہر بن گیا تھا اور اکبر بادشاہ کے عہدِ حکومت میں اِس روشن خیال بادشاہ کا اس نے بہت ساتھ دیا۔ پھر اُس نے فارسی زبان کا ایک مشہور شاعر پیدا کیا۔ لیکن جب سے فارسی علم ہندؤں کے لئے مالی فائدہ کا ذریعہ بنا تب ہی سے ان میں اس زبان کا رواج ہوا۔ سولھویں صدی کے آخر میں سلطنت کے وزیرِ اعظم نے جو کہ جو دبھی ہندو تھا حکم صادر کر دیا کہ تمام حسابات اس کے بعد سے فارسی میں لکھے جائیں۔ اسی وقت سے محکمہ مالیات کے ہندو کارندوں کے ایک ایک شخص نے فارسی زبان سیکھ ڈالی۔

جب ہم نے اپنے دفاتر میں انگریزی کو رائج کیا تو سلیم الطبع ہندوں نے وہ زبان سیکھ لی جو اُس کی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے لازمی تھی۔

پبلک کاروبار کی وہ زبان جو مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں رائج تھی اور وہ جدید زبان جو ہم نے اپنے عہد حکومت میں جاری کی دونوں زبانیں ہندؤں کے لئے غیر ملکی ہیں۔ اس لئے وہ ان دونوں زبانوں کے لئے یکساں طور پر غیر جانبدار تھے سوائے اس زبان کے جس کے ذریعہ ان کو ترجیح مل سکے۔ درحقیقت جب ہمارے اسکولوں نے اُن کو یہ طلسم زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا سکھایا جس کا نصف خرچ گورنمنٹ پر پڑتا تھا تو اُنھوں نے بڑی خوشی سے اِس جدید نظام کو اُس گزشتہ نظام کے بجائے قبول کر لیا۔

مسلمانوں کے لئے معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس ملک پر ہمارا قبضہ ہونے سے قبل مسلمان اِس ملک میں صرف سیاسی ہی اہمیت نہیں رکھتے تھے بلکہ اُن کی علمی بڑی زبردست حیثیت اور شان بھی تھی۔ ایک ہندوستانی ریاست داں کے الفاظ جو انھیں بخوبی جانتا ہے یہ ہیں کہ اُن کا وہ نظام تعلیم جو کہ اس نظام تعلیم سے جو ہم نے قائم کیا ہے خواہ کتنا ہی کم درجہ کا کیوں نہ ہو، دراصل کسی اعتبار سے بھی کم درجہ کا نہ تھا۔ اِس نظامِ تعلیم سے نہایت اعلیٰ تربیت اور اخلاقِ حمیدہ حاصل ہوتے تھے۔ وہ ایسے اصولوں پہ مبنی تھا جو سب کے سب ناکارہ نہ تھے۔ درآنحالیکہ وہ ایک نہایت قدیم انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ لیکن جو ناقابل انکار طور پر اس وقت کے نظام ہائے تعلیمات سے کہیں زیادہ بالاتر تھا۔ اس نظام کے ماتحت علمی اور مادی برتری حاصل ہو جاتی تھی اور جس کے ذریعہ سے ہندؤں کو اپنے ملک میں کم سے کم درجہ حکومت میں حاصل ہو سکتا تھا[1]۔

انگریزی سیکھنا اس غرض سے کہ کتابیں پڑھی جاسکیں، خطوط لکھے جاسکیں اور الفاظ کے پوشیدہ معانی و مطالب معلوم کیے جاسکیں، اس حد تک جائز ہے۔ کیونکہ زیدؓ بن ثابت نے عیسائیوں اور یہودیوں کی زبان اور اُن کی لغات کو سیکھا تھا اور یہ حکم خود پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیا تھا، تاکہ وہ اِن خطوط کو پڑھ سکیں اور اُن کا جواب دے سکیں جو یہودی اور عیسائی لوگ پیغمبر (علیہ السلام) کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ لیکن اگر کوئی شخص انگریزی محض دلچسپی کی خاطر یا انگریزوں سے راہ ورسم پیدا کرنے کی خاطر سیکھے تو وہ گنہگار ہے اور شریعت کے خلاف ہے۔ بالکل اس طرح جیسے کہ لوہے کا ہتھیار۔ اگر اس کو چوروں کے بھگانے یا انہیں گرفتار کرنے کے کام میں لایا جائے تو اُس کا بنانا ایک مقدس کام ہے لیکن اگر اس کو چوروں کی امداد یا ان کی حمایت کرنے کی خاطر بنایا جائے تو یہ ایک گناہ ہے۔"

متعصب اور جوشیلے مسلمانوں نے تو کبھی بھی ہمارے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کو شرعی حیثیت سے جائز نہیں سمجھا۔ مسلمانوں کا دنیادار طبقہ جس قدر ہمارے نظام کی طرف قدم بڑھاتا گیا اُتنا ہی متعصب طبقہ پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ گزشتہ چالیس[1] سال سے انھوں نے اپنے آپ کو ہندوؤں سے لباس، سلام کرنے کے طریقے اور دوسرے ایسے خارجی امور میں ممتاز رکھا، جن میں اپنے آپ کو ممتاز رکھنا وہ لوگ اپنے عہدِ حکومت میں چنداں ضروری نہیں خیال کرتے تھے۔ ۱۸۶۰ء تک ہمارے اسکولوں میں وسطی ہندو اور ایک مسلمان کا تناسب تھا۔ اگرچہ یہ تناسب اُس وقت سے اب بڑھ گیا ہے لیکن اس میں زیادتی کا سبب وہ مدارس ہیں جو گورنمنٹ سے مالی مدد پاتے ہیں نہ کہ وہ اسکول جو ضلع میں قائم ہیں۔ انگریزی اسکولوں میں حاضری میں اضافہ نہیں ہوا۔ وہ افسر جو کہ وہاں مقرراتِ کالج کا تھا اور جس کی بنیاد پر میں ان بیانات کو لکھ رہا ہوں اور جو مشرقی بنگال سے بہت ہی قریبی واقفیت بھی رکھتا ہے۔ اُس نے اعلان کیا ہے کہ مسلمان طلباء کی تعداد (مسلمان آبادی) سے کوئی بہتر تناسب نہیں رکھتی۔

سچ یہ ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم ایک مسلمان کے بڑے بڑے جذبات کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اس نظام کا ذریعہ تعلیم بنگالی ہے۔ جسے تعلیم یافتہ مسلمان بنظرِ نفرت دیکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس نظام میں کام کرنے والے استاد ہندو ہیں جن سے تمام مسلمان قوم نفرت کرتی ہے۔

---

[1] یہ صرف ہنٹر صاحب کی رائے ہے۔ (الطاف)

ذراسی جھلک بھی نہیں پائی جاتی[1]۔ علاقہ زیریں بنگال میں ہمارے اسکولوں کی زبان ہندی ہے اور استاد بھی تمام ہندو ہیں۔ لہذا مسلمانوں نے بُت پرستوں کی تعلیمات کو جو اُنکی زبان میں دیجاتی تھیں قابل نفرت سمجھا۔

رفتہ رفتہ یہ نفرت ضروریاتِ زندگی کے سامنے کم ہوتی چلی گئی۔ وہ عقیدہ جس نے ابتدا میں ہمارے اسکولوں سے نفرت کرنا سکھایا تھا وہ اب متزلزل ہوگیا۔ اس عہد کے تمام علماء میں سب سے زیادہ برگزیدہ عالم۔ آفتابِ ہند مولانا شاہ ولی اللہ صاحب ہیں جن کے فتووں کا اس کتاب میں کئی جگہ تذکرہ بھی آچکا ہے، ان کے ہی ایک فتوے سے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا جواز حاصل کیا گیا[2]۔ اس مشہور عالم نے انگریزوں کی ملازمت کے متعلق پہلے ہی فیصلہ کر دیا تھا۔ انھوں نے اس فتوے میں تحریر کیا ہے کہ "اس میں سے چند سرکاری پیشے اختیار کئے جاسکتے ہیں۔ بعض پیشے خلاف مذہب ہیں اور بعض ایسے ہیں جو گناہ کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ چنانچہ اگر انگریز مسلمانوں کو قابلِ تعریف ملازمتیں دیں جیسے کہ 'قاضی' جو شریعتِ اسلامی کے مطابق عمل کریں یا سڑکوں کی نگہبانی' یا غرباء و مساکین کے قیام کے لئے سراؤں کا انتظام' بحیثیت مال کے محافظ' اور چوروں سے حفاظت رکھنے کا کام سپرد کریں تو یہ پیشہ بہتر ہے۔ کیونکہ اس طرح حضرت یوسف (علیہ السلام) مصر کے کافر بادشاہ کے یہاں خزانچی اور محکمہ پولس کے افسر اعلیٰ کے عہدہ پر مامور رہے! اور اسی طرح حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی ماں نے فرعون کی ملازمت میں حضرت موسیٰؑ کو دودھ پلانیکی خدمت انجام دی۔ لیکن اگر اس ملازمت سے غرض کسی کو بے دین بنانا ہو تو جو مسلمان بھی اسکو قبول کرے گا وہ گناہ کا مرتکب ہوگا"۔

اسی طرح جب اُن کے شاگردوں نے دریافت کیا کہ آیا منطق پڑھنا یا انگریزی سیکھنا شریعت میں جائز ہے تو انھوں نے کہا کہ "نجات حاصل کرنے کے لئے منطق چنداں درکار نہیں لیکن صرف و نحو کی طرح یہ علم حاصل کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔ اگر کوئی شخص اسکو اس مقصد سے پڑھے کہ اس کی وجہ سے مذہب میں شکوک پیدا کرے گا تو وہ گنہگار ہوگا۔

---

[1] مذہبی اختلاف کے باوجود ہندو اور مسلمان الگ زمانہ تک متفق تھے اور عالمگیر جیسے مذہبی بادشاہ نے مندروں کو جاگیریں دیں۔

[2] اس عہد میں شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ اور انھوں نے ہی اپنے شاگرد مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی کو انگریزی ملازمت کی اجازت دی تھی۔ (الطاف)

یہ لکھا ہے کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ مسلمان ایک ایسے نظام سے جس میں ان کے عقائد مذہبی کے لئے کوئی رعایت نہ ہو اور جن امور کی ان کو ضرورت ہے ان کی اس میں گنجائش نہ ہو ہمیشہ سے الگ تھلگ ہیں۔ اور وہ نظام ان کے مفاد کے بالکل خلاف اور انکی تمدنی زندگی اور روایات کے بالکل خلاف بھی ہے۔

بہر حال بہت سے انگریز افسروں نے اپنے اپنے زمانۂ ملازمت میں مسلمانوں کے خلاف جذبات نفرت میں وقت گزارا ہے۔ کیونکہ وہ ان کی تعلیم کے اس نظام کو جس کو وہ گھر گھر رائج کرنا چاہتے تھے قبول کرنے سے انکار ہی کرتے رہے۔ بقیہ اقوام نے جس سہولت اور خاموشی سے اس نظام کو قبول کیا اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی شدید مخالفت اور بھی نمایاں طور پر محسوس ہوئی۔

سیدھے سادھے ہندو کو تو کوئی شک وشبہ نہیں پیدا ہوتا تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ان مسلمانوں کو کیوں اس سے تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ لیکن فی الحقیقت ہم نے ایک ایسے امتیاز کو نظر انداز کر دیا ہے جو اس قدر قدیم ہے جس قدر کہ انسان میں مذہب کا فطری جذبہ قدیم ہے۔ اور وہ امتیاز شرک اور توحید کا ہے اور جس میں ہر زمانہ اور ہر قوم میں ایک دوسرے سے بعد المشرقین رہا ہے۔ شرک اپنے متبعین کے مقاصد عبادت کی کثرت کی وجہ سے ان کے عقائد میں مختلف اقسام کے فرائض عائد کرتا ہے۔ گبن نے جو کچھ یونانیوں کے متعلق کہا تھا وہ آجکل حرف بحرف ہندوؤں پر صادق آتا ہے۔ یعنی بجائے ایک ناقابل تقسیم اور باضابطہ نظام کے جو کسی عقیدے والے کے دماغ پر مکمل طور پر مسلط ہو سکے یونانیوں کا عقیدۂ شرک ہزار ہا قابل تقسیم اجزا اور ایسے اصولوں پر مبنی تھا جن کو ہر پہلو سے توڑا مروڑا جا سکتا تھا۔ اور ان دیوتاؤں کے پجاری اپنے عقیدے کے اعتبار سے بالکل آزاد تھے کہ وہ جس طرح چاہیں اپنے مذہبی عقائد کا رتبہ اور درجہ متعین کر ڈالیں۔ لیکن مسلمانوں کو اس قسم کی آزادی ہرگز حاصل نہیں ہے۔ ان کا عقیدہ ایک مستحکم اور غیر متزلزل یقین چاہتا ہے۔ جس میں ایک خاص قسم کی زندگی کے اصول موجود ہیں۔ اس لئے ایسا نظام تعلیم جس میں ان کے مذہبی اصولوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہو کسی راسخ العقیدہ مسلمان کے لئے قابل اطمینان نہیں ہو سکتا۔

بہر حال یہ کہنا شک ممکن ہے کہ ہم مسلمان باشندگان سے اس معاملہ میں انصاف بھی

بنگالی اسکول ماسٹر یہی زبان بولتے ہیں اور کچھ تو فی ہو دلی اردو جس کو وہ اسی طرح سیکھ لیتے ہیں جیسے کہ ہم ۔ اس کے علاوہ وہ بزدل، سادہ لوح، مسلمان لڑکوں پر کوئی رعب قائم نہیں رکھ سکتے ۔ حال ہی میں ایک مسلمان کاشتکار نے ایک انگریز افسر سے یہ کہا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے مجبور نہیں کر سکتی کہ میں اپنے بیٹے کو ایک بنگالی اسکول ماسٹر سے پڑھنے کے لئے بھیجوں ۔ دوسرے یہ کہ ہمارے دیہاتی اسکول ایک مسلمان کو مشکل صرف وہ زبانیں سکھاتے ہیں جن کے ذریعہ زندگی میں اسے اچھی پوزیشن حاصل ہو سکے یا وہ اپنے مذہبی فرائض کو بخوبی ادا کر سکے ۔

ہر مسلمان شریف آدمی کو فارسی کا جاننا لازمی ہے ۔ اور فارسی ہی وہ زبان ہے جو ہمارے ضلع کے اسکولوں کے اعلیٰ درجوں تک میں نہیں پڑھائی جاتی ہے ۔

ہر مسلمان کو یعنی ایک کسان سے لے کر ایک شہزادے تک کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ اپنی نماز ان دو مقدس زبانوں یعنی فارسی یا عربی میں پڑھے[1] ۔ اور اس بات کی ہمارے اسکولوں نے پرواہ تک بھی نہیں کی ۔ حال ہی میں بڑے مستند دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کی کوئی نماز اس وقت تک قبول نہیں ہوتی جب تک کہ وہ ان زبانوں میں سے کسی ایک میں نہ پڑھی جائے ۔ تیسرے یہ کہ ہمارے نظام تعلیم میں مسلمان نوجوانوں کی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے ۔ ہمارے نظام تعلیم نے اس حقیقت کو پس پشت ڈال دیا ہے کہ عرصہ دراز سے ہندوؤں کی ایک بڑی طاقتور نسل نے بھی مسلمان بچوں کی تعلیم کے اس فرض کو ادا کیا ہے ۔ اور خود مسلمانوں میں بھی کوئی عہدہ مذہبی معلم کا نہیں ہے ۔ ہر گھرانے کے سربراہ کو یہ تصور کر لیا جاتا ہے کہ وہ خود تمام مذہبی فرائض سے واقف ہے اور وہی اپنے گھرانے اور خاندان کا مذہبی معلم بھی ہوتا ہے ۔ جماعت کی نمازیں مساجد میں ہوتی ہیں ۔ لیکن یہ اسلام کی ایک بڑی شاندار روایت ہے کہ اسلام کے فرائض خدا کی زمین کے ہر حصہ پر ادا کئے جا سکتے ہیں ۔

ہر قوم کے لئے ایک خاص قسم کا نظام تعلیم درکار ہوتا ہے ۔ چنانچہ بعض مفکرین کی رائے ہے کہ جس طرح ہمارا نظام تعلیم آئرلینڈ میں ناکام ثابت ہو چکا ہے اسی طرح بنگال کے جاہل اور متعصب مسلمانوں کے لئے بھی یہ بالکل نامناسب ہے ۔ اسی سلسلہ میں ایک بڑے افسر نے

---

[1] فارسی زبان میں نماز مسلمانوں نے کبھی نہیں پڑھی ۔ (الطاف)

بشرطیکہ وہ لگان آراضی کی رقم داخل خزانہ کرتا رہے۔ وہ لوگ اپنے اپنے مذہبی عقائد کے مطابق مسجدوں یا مندروں کے لئے کچھ آراضیات لاخراج وقف کر دیا کرتے تھے اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ان کی ظالمانہ اور بے رحمانہ طویل زندگی کے بعد یہ فیاضانہ اوقاف کے عطیات انکے سرِ مرگ پر تمام سابقہ گناہوں کو معاف کرا دیں گے۔

جب ہم نے صوبہ بنگال کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا، اُس وقت مسٹر جیمس گرانٹ نے جو قابل ترین مہتمم مالیات تھے یہ اندازہ لگایا تھا کہ صوبہ کا ایک چوتھائی حصہ ان لاخراج معافیات یا اوقاف میں نکل چکا ہے۔ ۱۷۷۲ء میں وارن ہسٹینگز نے بڑی چابازی سے کام نکالنے کی کوشش کی لیکن اوقات کو جاری رکھنے کے لئے جذبات اس قدر زور پر تھے کہ اس کے خلاف کوئی عملی اقدام کرنا ناممکن تھا۔ ۱۷۹۳ء میں لارڈ کارنوالس نے پھر نہایت زوردار طریقہ اور وسیع پیمانہ پر ان لاخراج اوقات کی آراضیات پر گورنمنٹ کا حق ثابت کرنا چاہا اور یہ ثبوت پیش کیا کہ اوقاف کے لئے کوئی باضابطہ اجازت حکومت وقت سے حاصل نہیں کی گئی تھی۔ لیکن اس وقت کی طاقتور حکومت بھی اِس اصول پر عملدرآمد کرنے کی جرات نہ کر سکی۔ چنانچہ تقریباً پچیس سال تک یہ معاملہ جوں کا توں رہا۔ ۱۸۱۹ء میں گورنمنٹ نے پھر ان اوقاف پر اپنا حق جمانا چاہا۔ لیکن کوئی عملی قدم پھر بھی نہ اٹھا سکی۔ بالآخر ۱۸۲۸ء میں لیجسلیٹو اور اگزیکیٹو کونسل نے مل کر متحدہ قوت سے ایک بار پھر زور لگایا۔ چنانچہ اسپیشل کورٹ اس مقصد کے لئے قائم کئے گئے اور اس کے بعد اٹھارہ سال تک تمام صوبہ میں اطلاع دینے والوں جھوٹے گواہوں، اور ایسے سخت گیر مُن گھڑت افسروں کی بھرمار رہی۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صوبہ میں آٹھ لاکھ پونڈ سالانہ کی زائد آمدنی اور اس کے علاوہ تین لاکھ پونڈ کی مزید اضافی آمدنی گورنمنٹ کو ملنا شروع ہو گئی۔ اس رقم کا بڑا حصہ اُن لاخراج آراضیات سے حاصل ہوا تھا جو مسلمانوں کے قبضہ میں تھیں یا وقف اور معافیات تھیں۔ اس کی وجہ سے جو جذبۂ تنفر اور انتشار دلوں میں پیدا ہوا اُس نے دیہاتیوں کے دلوں میں ایک مستقل اثر چھوڑا ہے۔ سیکڑوں قدیم خاندان تباہ کر دئے گئے اور مسلمانوں کا وہ نظام تعلیم جو تمام تر اُن ہی معافیات پر تھا وہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو گیا۔ مسلمانوں کے علمی طبقے اٹھارہ سال کے اخراجات مقدمات کے بعد بالکل تباہ اور برباد ہو چکے تھے۔ ہمارے قبضہ لینے والے حکام جذبۂ رحم سے قطعاً ناآشنا ہوتے تھے، وہ تو صرف قانون کا

کر سکیں اور ہم کو ایک عیسائی حکومت کی حیثیت سے کوئی قربانی بھی نہ کرنا پڑے اس کے متعلق تو میں بعد میں تحقیق کروں گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو موجودہ حالات میں بالکل بجا طور پر شکایت ہے کہ وہ رقومات جو ہم رعایا کے ہر طبقہ کے لوگوں سے سرکاری تعلیم کے نام سے وصول کرتے ہیں وہ صرف اُس نظامِ تعلیم پر صرف کردی جاتی ہیں جو صرف ہندوؤں کے لئے مفید مطلب ہے۔

لیکن بدقسمتی سے اُن کو صرف ایک یہی بہت بڑی شکایت ہمارے خلاف نہیں ہے بلکہ جب ہم نے ایسا نظامِ تعلیم جاری کیا جو قطعاً ان کی ضروریاتِ زندگی کے منافی تھا تو ساتھ ہی ساتھ ہم نے ان کے اس نظامِ مالیات کو بھی جس کے ذریعہ ان کا نظامِ تعلیم چلا کرتا تھا بالکل نیست نابود کر دیا۔ بنگال کے مسلمانوں کے ہر بڑے خاندان میں تعلیم کے لئے ایک مکتب ہوا کرتا تھا جہاں اس خاندان کے بچے اور اُس کے غریب پڑوسی بھائیوں کے بچے مفت تعلیم پایا کرتے تھے۔ جب صوبہ کے مسلمان گھرانوں پر ادبار آیا تو ان مکتبوں کی تعداد اور افادیت کم ہوتی چلی گئی۔ اپنی حکومت کی دوسری صدی سے ہم نے اپنے قانون کی اُس طاقت کو اُن کے خلاف کام میں لانا شروع کر دیا جس کا مقابلہ وہ نہیں کر سکتے تھے۔ عہد قدیم سے ہندوستان کے دیسی راجے اور نواب اس بات کے عادی تھے کہ وہ کچھ آراضیات اس مقصد کے لئے وقف کر دیا کرتے تھے کہ اس کی آمدنی سے رعایا کے بچوں کی تعلیم ہو سکے اور ان کے معبودوں کی پرستش کے مصارف میں خرچ کیا جا سکے۔ حکومتِ وقت کو ان اوقاف کی آمدنی پر پورا پورا اختیار حاصل ہوتا تھا کہ جس طرح چاہے خرچ کرے۔ مغلوں کی سلطنت کے اُس زمانے میں جبکہ وہ بے پرواہ ہو چکے تھے اور خانہ جنگی کی بدولت اُن کی حکومت چراغِ سحری تھی۔ یہ تمام اختیارات مرکزی حکومت سے منتقل ہو کر صوبہ کے حکومتوں میں پہنچ گئے تھے۔ یا ان صوبائی حکمرانوں اور اُن کے نائبوں نے خود ہی غصب کر لئے تھے۔ دہلی کی دُور دراز مرکزی حکومت کو کیا غرض پڑی تھی کہ وہ علاقۂ زیریں بنگال کے حالات پر غور کرنے کی زحمت گوارہ کرتی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس کو تو صرف اپنے مالیہ سے مطلب تھا کہ وہ صوبہ سے پورا پورا وصول ہوتا رہے۔ اسی طرح ڈھاکہ یا مرشد آباد کے عیش پسند اور عیاش طبع حاکم اپنے اضلاع کے اندرونی نظم و نسق کی تفصیلات سے بالکل بے گانہ رہتے تھے۔ چنانچہ ہر بڑا کسان یا بڑا جاگیردار اپنی متعلقہ آراضیات پر ہر طرح با اختیار ہوتا تھا اور جو چاہتا تھا کرتا تھا

الہلال کا پہلا مقالۂ افتتاحیہ

(از مولانا ابوالکلام آزاد صاحب مدظلہ)

مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات دنیائے ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ایک بلند پایہ مصنف اور جادو نگار انشا پرداز کی حیثیت سے وہ اپنی آپ مثال ہیں۔ اُن کے سیاسی افکار و نظریات سے لوگوں کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن تصنیف و تالیف اور خطابت و صحافت کے میدان میں انھیں جو مرتبہ حاصل ہے اُس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس میں مولانا کا نمایاں کارنامہ الہلال ہے جس کی سحر آفریں تحریروں اور لطیف طرز نگارش نے اردو ادب کا معیار اتنا اونچا کر دیا کہ اُن کی پیروی آج تک لوگوں کے لئے ناممکن ہے۔

الہلال کا پہلا پرچہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ سے شائع ہوا۔ اس پرچہ میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے جو مقالۂ افتتاحیہ تحریر فرمایا ہے وہ نہ صرف ادب و انشا کے لحاظ سے بلکہ خیالات کی رفعت و بلندی کے اعتبار سے بھی ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مضمون اُس زمانہ کی یادگار ہے جب کہ مولانا کی انشا پردازی کا عروج و شباب تھا۔ اس لئے اس نقشِ اولیں کو دستبردِ فنا سے بچانا اردو ادب کی ایک مفید خدمت ہے۔ لہٰذا ہم اس بادۂ کہن کو مصنف کے جامِ نو میں از سرِ نو پیش کرتے ہیں۔ تاکہ ناظرین اُس سے کیف و سرور حاصل کر سکیں۔

سید الطاف علی بریلوی

چگونہ مے بمیاں آورم دریں مجلس
کہ بادہ حوصلہ سوز ست و جملہ بدمستند

۱۹۰۶ء کی موسم سرما کی آخری راتیں تھیں جب امرتسر میں میری چشم بیداری نے ایک

نفاذ کرنا چاہتے تھے۔ اُس وقت کے خوف وہراس کی یاد اب تک لوگوں کے دلوں میں تازہ ہے اور اس نے ہمارے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت کا بیج بو دیا ہے۔ اسی زمانے سے بنگال میں ایک عالِم کے پیشہ کا وجود جو دیسی حکمرانوں کے عہد میں بڑا معزز وسیع اور فائدہ مند سمجھا جاتا تھا۔ مفقود ہو گیا۔ سب سے زیادہ زد مسلمانوں کے اوقاف پر پڑی کیونکہ ان کے وقف ناموں اور دوسری دستاویزوں کے بارے میں ہندوستان کے سابق حکمرانوں نے بڑی بے پروائی برتی تھی لیکن ہندوؤں کی چالاک اور ہوشیار قوم کو یہ دقت نہیں پیش آئی۔ ہم نے ان لاخراج معافیات کے ثبوت کے لئے کاغذات طلب کئے جن سے ان کی معافی داری ثابت ہو سکے لیکن وہ اپنی ذاتی مقبوضہ اور کرمائیداؤں کے متعلق بھی کوئی کاغذی ثبوت نہ پیش کر سکے پچھتر سال تک ہم اس بڑی دغابازی کو احتجاجی طور برداشت کرتے رہے لیکن اس سب کی مجموعی سزا صرف ایک قوم (مسلمان) کو بھگتنا پڑی۔ اس عرصہ میں موسمی تغیرات و حالات اور دیمک نے ان کی تمام دستاویزات اور سندات اور فرامین کا صفایا کر ڈالا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے دوبارہ قبضہ کر لینے کے احکامات سے ہم کو پورے طور پر وہ سب حقوق تو حاصل نہ ہو سکے جو غصب کر لئے گئے تھے لیکن پھر بھی ان اراضیات کے نکل جانے کی تاریخ سے ہی مسلمانوں کے نظام تعلیم کے تنزل کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ جو افسر اس وقت وہاں دیہاتیوں کو گرفتار کرنے پر مامور ہے اُس کے نزدیک بھی اراضیات پر قبضہ مسلمان قوم کے تنزل کا دوسرا سبب ہے۔

مترجم

عبدالباسط

دل کی وارستگی کو بڑھتا دیکھ کر اور زیادہ بھاری کر دی گئیں، جن افکار و ترددات کا تصور بھی طبیعت پر شاق تھا، زمانے کے حکم سے برسوں اس میں کاٹنے پڑے، صحت و تندرستی، جس کے بغیر حیاتِ جاوید کو بھی کوئی قبول نہ کرے، وہ روزِ اوّل ہی سے ایک لبِ مرگ اور سریع الفنا زندگی کے ساتھ دی گئی تھی، اور جتنی کچھ بھی تھی، اس نے بھی دائم المرضی سے غالباً ہمیشہ کے لئے جگہ بدل لی، پھر ان سب سے زیادہ اُمید و انتظار کے دو متضاد عنصروں کی آمیزش تھی، جن میں سے ہر ایک کا تقاضا دوسرے کا مخالف تھا، انسان کی ساری مصیبتیں اُس کی اُمید پرستی کا نتیجہ ہیں، اور فی الحقیقت یاس ہیں کامیابی سے بھی بڑھ کر سکون ہے، مشکل یہ تھی کہ اُمید کی روشنی بجھنے کی جگہ دھیمی کر دی جاتی تھی، اور یاس و بیم کے دامن کو ہوا دینے کی اجازت نہ تھی، منزلِ مقصود گو ہمیشہ دُور رہی مگر نظروں سے کبھی غائب نہ ہوئی، اور قافلہ گو نظر نہیں آیا، مگر صدائے جرس نے ہمیشہ اس کے وجود پر شہادت دی، میں اگر قافلہ و منزل کا ذکر کرتا تھا، تو غلط نہ تھا، لیکن رفیقان بے خبر ہنستے تھے کہ منزل کا نشان اور قافلے کا پیش خیمہ کہاں ہے؟

من گنگ خواب دیدہ و عالم تمام کر
من عاجزم زگفتن و خلق از شنیدنش

ومن اٰیٰتہٖ یریکم البرق خوفًا و طمعًا، وینزل من السماء ماءً فیحیی بہ الارض بعد موتہا، ان فی ذالک لاٰیاتٍ لقومٍ یعقلون۔ (۳۰-۲۶)

اگرچہ وہ تمام موانع، جن کا تعلق خود میری زندگی سے تھا، اب بھی بدستور قائم ہیں، اور شاید مشیتِ الٰہی یہی ہے کہ آخر تک قائم رہیں، لیکن الحمد للہ کہ کام کی مشکلات ایک حد تک ختم ہو چکی ہیں، اور اگر راہ کانٹوں سے خالی نہیں، تو پاؤں بھی اب زخموں اور آبلوں کے عادی ہو گئے ہیں، فرصت و جمعیت کا انتظار کب تک، اور عنقا کی جستجو میں صحرا نوردی تا کجے؟ برسوں اس تلاشِ محال میں صرف کر دیئے، اور ہمیشہ ناکامی کے ہاتھ کامیابی کو پیغام بھیجا ؎

این رسم در راہ تازہ ز حرمان عہد ماست
عنقا بروزگار کسے نامہ بر نبود

ہمارے وہ احباب، جن کو اس ارادے کا علم تھا مگر ہمارے حالات کا علم نہ تھا، ان گزشتہ سالوں کے اندر طرح طرح کے خیالات و ظنون سے طعنہ زن رہے، بعضوں نے اس مستقل تاخیر کو طبیعت کی بے استقلالی و تلون مزاجی کا نتیجہ سمجھا: بہتوں نے قوت ارادی کے ضعف سے لیے

خواب دیکھا انسان کے ارادوں اور منصوبوں کو جب تک ذہن وتخیل میں ہیں، عالم بیداری کا ایک خواب ہی سمجھنا چاہئے، کامل چھ برس اُس کی تعبیر کی عشق آمیز جستجو میں صرف ہوگئے، اُمیدوں کی خلش اور ولولوں کی شورش نے ہمیشہ مضطرب رکھا، اور یاس وقنوط کا ہجوم بارہا حوصلہ وعزم پر غالب آگیا، لیکن الحمدللہ کہ ارادے کا استحکام اور توفیق الٰہی کا اعتماد ہر حال میں طمانیت بخش تھا، یہاں تک کہ آج اس خوابِ عزیز کی تعبیر عالم وجود میں پیش نظر ہے، هٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِن قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا (۱۳ پارہ۔ آیت ۱۰۲)

❊ ❊ ❊

اگرچہ ایک ہفتہ وار اخبار کی اشاعت اردو پریس کی موجودہ حالت کے لحاظ سے اسقدر ارزاں اور سہل کام ہے، جس کے لئے چھ ہفتہ کا انتظار بھی شاید ضرورت سے زائد فرصت ہو، ایک روزنویس کاتب کا ارزاں وقت، چار پتھر، اور ایک کاٹھ کا دستی پریس، یہ تین ضروری اجزا ہیں، جن کے جمع کر لینے کے بعد اردو اخبار کا دفتر بالکل مکمل ہو جاتا ہے، لیکن ابتدائی خیال سے جو اعلیٰ پیمانہ پیش نظر تھا، طبیعت نے گوارا نہیں کیا کہ مشکلات سے شکست کھا کر اُسے بھلا دیا جائے، اگر پریس کی مشکلات کے علاوہ دیگر موانع پیش نہ آتے، تو غالباً پچھلے سال سے اخبار جاری ہو جاتا، اور اس وقت اپنی موجودہ جگہ سے بارہ مہینے کی راہ آگے ہوتا، لیکن مشیتِ الٰہی ہمارے مصالح کا ہم سے بہتر فیصلہ کرتی ہے، اور معرفتِ الٰہی کا ایک بڑا سبق انسانی عزائم کی شکست ہے، عرفت ربی بفسخ العزائم، یہ پورے چھ سال کا زمانہ جن واقعات و حوادث کے ساتھ گزرا، اس کی تفصیل ایک داستان طویل ہے، جس کا دُہرانا شاید بے نتیجہ نہو لیکن بے لطف تو ضرور ہے، اس الم کدۂ حیات میں ہر لمحہ جو گزرتا ہے، نہیں معلوم کتنی زندگیوں کے آلام ومصائب کی داستانیں اس میں ختم ہوتی ہیں، اور کتنی شروع ہوتی ہیں، کارخانۂ عالم کی محنت پسندی کا یہی قانون ہے، اور انسانی شکایتوں کی اُسے پرواہ نہیں، پھر ان لا تعد و لا تحصی زندگیوں میں سے صرف ایک بے اثر زندگی کی ناکامیوں کی کہانی سننے والوں کے لئے کیا دلچسپ ہو سکتی ہے؟

❊ ❊ ❊

زندگی کی مشکلات اور مصائب کا سلسلہ ہمیشہ غیر منقطع رہا، ناگہانی حوادث کے پیہم حملوں نے کبھی دم لینے کی مہلت نہ دی، علائق کی زنجیریں، جو پیشتر بھی کچھ کم وزنی نہ تھیں، شاید

دریا میں رہ کر دریا کے پار چلے جاتے ہیں، مگر دریا سے ڈرنے والوں کو کشتی کے اندر بھی چین نصیب نہیں ہوتا۔ مصائب حیات زندگی کے ساتھ ہیں، اور ساتھ ہی ختم بھی ہوں گے۔ پس کام کرنے والوں کو اُن پر ماتم کرنے کی جگہ، کوشش کرنی چاہئے کہ اُن کی دائمی رفاقت کو گوارا بنالیں۔ اور دریا سے نکلنے کی سعی بے سود کی جگہ، تیرنے کی کوشش کریں، ورنہ ساری عمر ہاتھ پاؤں مارنے میں ختم ہو جائے گی اور کنارے تک رسائی نصیب نہ ہوگی ؂

ہزار رخنہ بدام و مرا ز سادہ دلی
تمام عمر در اندیشۂ رہائی رفت

البتہ اُس خدائے حی و قیوم سے، جس کے کان فریادوں کے سننے کے لئے ہر وقت نیاز، اور نغمۂ امن یجیب المضطر اذا دعاہ سے عشق نواز ہر قلب مشتاق ہیں، اور جس کی آنکھیں کسی حال میں بے خبر نہیں، اور ہر آن ان ربک لبالمرصاد کی ٹکٹکی لگائے ہوئے ہیں۔ یہ آخری التجا ہے، کہ اگر وہ مجھ میں سچائی اور خلوص کی کوئی سرگرمی دیکھتا ہے، اگر اُس کی ملت مرحومہ اور اس کے کلمۂ حق کی خدمت کی کوئی سچی تپش میرے دل میں موجود ہے، اور اگر واقعی اُس کی راہ میں فدویت اور خود فروشی کی ایک آگ ہے، جس میں برسوں سے بغیر دھوئیں کے جل رہا ہوں، تو اپنے فضل و لطف سے مجھے اتنی مہلت عطا فرمائے کہ اپنے بعض مقاصد کے نتائج اپنے سامنے دیکھ سکوں۔ لیکن اگر یہ میرے تمام کام محض ایک تجارتی کاروبار اور ایک دکاندارانہ شغل ہیں۔ جن میں قومی خدمت اور ملت پرستی کے نام سے گرم بازاری پیدا کرنا چاہتا ہوں، تو قبل اس کے کہ میں اپنی جگہ پر سنبھل سکوں، وہ میری عمر کا خاتمہ کر دے، اور میرے تمام کاموں کو ایک دن بلکہ ایک لحظہ کے لئے بھی، کامیابی کی لذت چکھنے نہ دے۔ باغوں کے سرسبز و ثمردار درختوں کی حفاظت کیجاتی ہے، مگر جنگل کے خشک درختوں کو جلانا ہی چاہئے۔ جس دل میں خلوص اور صداقت کو جگہ نہیں ملی اس کو کامیابی کے لئے کیوں باقی رکھا جائے؟

ابوالکلام آزاد

منسوب کیا، اور بعض نے تو فیصلا ہی کر دیا کہ فکر و تصور سے زیادہ اس ارادے کی قسمت میں اور کچھ نہیں ہے لیکن :- وما لهم به من علم، ان يتبعون الا الظن، وان الظن لا يغني عن الحق شيئا، (۵۳-۲۸) ولو انهم صبروا حتى تخرج اليهم لكان خيرا لهم (۴۹-۵) ولكن اكثر الناس لا يعلمون (۸۴-۵۸)

گردید برائیم زگرداب بیندیشم
کاندر طلب گوہر نایاب نشستیم
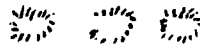
"الہلال" کی اشاعت ہمارے قدیمی ارادوں کے سفر کا آغاز ہے، اور فضل الٰہی سے امید ہے کہ اب بہت جلد اپنے ارادے کے اعمال مہمہ میں مصروف ہو سکیں گے، ایک اردو ہفتہ وار رسالے کی اشاعت کے لئے برقی طاقت سے چلنے والی مشینوں کی ضرورت نہ تھی، اور نہ کسی وسیع پریس کے متعلقات و آلات کی، اور نہ ایک اردو کا ہفتہ وار اخبار ملک کی موجودہ حالت کے لحاظ سے اتنی حیثیت پیدا کر سکتا ہے کہ کسی بڑے پریس کو اپنے اعتماد پر قائم رکھ سکے، پھر وہ خواہ کتنے ہی وسیع پیمانے پر جاری کیا جائے، لیکن کوئی ایسا مقصدِ زندگی نہیں ہو سکتا جس کا انتظار، شب ہائے امید کی بے چینیوں، اور روز ہائے تلاش کے اضطراب کا حق دار ہو، خدا کے بخشے ہوئے دل، و دماغ کی یہ ناقدری و تحقیر ہے، اگر اس کے مقاصد کا سدرۃ المنتہیٰ اس سے زیادہ بلند نہ ہو سکے۔ پس یہ جو کچھ کیا جا رہا ہے، درحقیقت چند عزائم عظیمہ ہیں، جن کی طرف بتدریج متوجہ ہونا ہے، اور میں نہیں جانتا کہ کل کیا ہو گا؟ وما تشاؤن الا ان یشاء الله ان الله کان علیماً حکیماً۔

اس وقت بھی، جبکہ یہ سطور لکھ رہا ہوں، وہ عالم السرائر، اور دانندۂ خفایائے قلوب دیکھ رہا ہے، کہ طرح طرح کی جان فرسا پریشانیوں کا محاصرہ میرے گرد و پیش ہے، اور آلام و مصائب کے ہجوم سے کاروبار حواس بالکل درہم برہم، اور ایک لمحہ کے لئے بھی جمعیتہ خاطر میسر نہیں، لیکن جو شے شاید ملنے والی نہیں، اس کے انتظار میں کب تک زندگی کو معطل رکھا جائے؟ انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ خود بخود ایک بے وجہ توقع قائم کر کے، پھر ناکامی کی شکایت میں عمر بسر کر دیتا ہے، حالانکہ یہ کیوں ضروری سمجھ لیا گیا ہے کہ زندگی کو سکون و طمانیت کے ساتھ کٹنا چاہیئے، اور اس کے لئے کیا امر مانع ہے کہ آلام و مصائب ہی ہمیشہ پیش نہ آئیں؟ پیدا کرنے والے

اور معین الفاظ میں محدود کرنا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مترادف الفاظ مختلف مقامات پر ایک دوسرے کی جگہ بدلتے رہیں۔

پوری کتاب میں اصطلاحوں کے ترجمے اور اکثر الفاظ نامانوس اور "دیر آشنا" ہیں۔ آئندہ اشاعت میں اس امر کا خاص لحاظ رکھا جائے تو مناسب ہے۔

غرض یہ کتاب مجموعی حیثیت سے اِس قابل ہے کہ نہ صرف طلبا امتحان پاس کرنے، بلکہ اور لوگ بھی معلومات حاصل کرنے کی غرض سے اسے پڑھ کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کتاب کی قیمت دو روپئے چار آنے اسلئے کچھ زیادہ ہے کہ یہ طالب علموں کے لئے لکھی گئی ہے۔

علم مدنیت یہ کتاب بھی ڈاکٹر عزیز احمد صاحب ہی کی مولفہ ہے جسے موصوف نے غالباً کم توجہ اور معمولی محنت سے لکھا ہے۔ مبتدی طالب علم کے لئے یہ کتاب سودمند ضرور ہے اور اسے پڑھکر وہ امتحان کی خلیج کو بھی عبور کر سکتا ہے لیکن اس "علم" پر اردو زبان میں ہم اس سے زیادہ اچھی کتاب کے متمنی ہیں۔

اِس لحاظ سے علم مدنیت یقینی ایک "اضافہ" ہے کہ یہ ایک پُر از معلومات مضمون ہے جو اپنے موضوع پر غالباً اردو میں پہلی کوشش ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اپنی اس کوشش میں وفاق ہند کا ساز اور اسلوب بیان پیدا کریں تاکہ اس سے صرف طالب علم ہی استفادہ حاصل نہ کر سکیں بلکہ اور دوسرے لوگوں کے لئے بھی یہ ایک کام کی چیز بن جائے۔ اسکی قیمت بھی ۱۲ ہے۔

آفتاب اس کتاب کے مرتب ملک حامد حسین صاحب صدر آفتاب مجلس (علی گڑھ) ہیں۔ اِس مجلس کا کام مختلف اہلِ علم کی اعانت سے کسی موضوع پر غالباً سال میں ایک مرتبہ آفتاب نامی کتاب شائع کرنا ہے۔ زیرِ نظر آفتاب میں "بیسویں صدی کے اردو ادب" سے بحث کی گئی ہے اور "اس کتاب کے شائع کرنے کی غرض وغایت یہ ہے کہ موجودہ ادب کے متعلق ہم اپنے یعنی اس جامعہ کے خیالات کو ظاہر کر سکیں" (مقدمہ مرتب) اِس لئے مضمون نگاروں میں صرف وہی حضرات ہیں جو کسی نہ کسی حیثیت سے جامعہ اسلامیہ علی گڑھ سے وابستہ ہیں۔ یا اِس ادارہ سے روحانی واسطہ رکھتے ہیں۔

آفتاب کُل نو مضامین پر مشتمل ہے۔

پہلا مضمون "ترقی پسند ادب" پر پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے تحریر فرمایا ہے اور یہی اِس کتاب کی جان ہے۔ چونکہ پوری کتاب میں یہی ایک ایسا مضمون ہے جسے بیسویں صدی

تبصرے

(از جناب سید اظہر حسین رضوی صاحب معاون مدیر اخبار سلطنت حیدرآباد)

وفاق ہند ڈاکٹر محمود عزیز صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (علیگ) پی ایچ۔ ڈی (علیگ) نے اس مختصر کتاب میں وفاق ہند جیسے پیچیدہ اور اہم مسئلہ پر نہایت سنجیدگی سے غور کیا ہے اور وفاق کی سیاسی ضرورت کو خوش اسلوبی سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے، اس مسئلہ کے ہر گوشہ پر نمایاں روشنی ڈالی ہے جس کے پڑھنے کے بعد ہندوستان اور وفاق کی اہمیت، اُس کے فوائد اور نقصانات اور دوسرے بیسیوں سیاسی نکات ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ کوشش اس لئے اور زیادہ لائق پذیرائی ہے کہ کتاب میں شروع سے آخیر تک کوئی "سیاسی جھکاؤ" نہیں ہے بلکہ تمام باتیں نہایت سچائی کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔

کتاب کا پس منظر ہندوستان کی سیاسی تاریخ اور سلطنت برطانیہ کا ہندوستان سے تعلق ہے۔ اِن دو باتوں کے علاوہ بعض ایسے مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں جو ملک کے سیاسی اور بدلتے ہوئے رجحانات کی وجہ سے کافی اہم ہوگئے ہیں۔ لائق مصنف نے موضوع کو سترہ ابواب پر تقسیم کرکے، ہر باب اور اُس باب کے ہر حصہ پر مدلل بحث کی ہے۔ جس سے مبحث کی تفہیم میں بڑی آسانی ہوگئی ہے۔ کتاب میں پہلے ۱۹۳۵ء سے قبل کے ہندوستان کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے اور اُس کے بعد اصل موضوع سے بحث کی گئی ہے۔

صفحہ ۱۲ پر ڈاکٹر صاحب نے وفاق کو اس طرح سمجھایا ہے:۔ "جب دو یا دو سے زیادہ ریاستیں معاہدہ کرتی ہیں تو اُس کی رو سے وہ ایک مرکزی حکومت قائم کرتی ہیں۔۔۔۔" لیکن صفحہ ۱۱۳ پر یوں لکھا ہے کہ "وفاق دو یا دو سے زیادہ سلطنتوں کے اتحاد کو کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔" ریاست، حکومت، مملکت کے فرق کو تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن ریاست یا حکومت یا مملکت کی بجائے "سلطنت" کا لفظ اُن کی جگہ لے کر مفہوم کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

دوسرے اگر یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ اس لفظ کے لکھ دینے سے کوئی نمایاں معنوی اور سیاسی فرق پیدا نہیں ہوتا تو یہ اعتراض بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ جب وفاق کے مفہوم کو کم سے کم

کے اردو ادب کی ہر کروٹ اور ہر تغیر کو محسوس کرتے ہوئے لکھا گیا ہے۔ پروفیسر صاحب نے اپنے اس مقالہ میں ترقی پسند ادب کی نفسیات کا بڑی گہری نظروں سے مطالعہ کیا ہے جو اپنے موضوع کو پوری طرح محیط کئے ہوئے ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے بڑی ہی متانت اور چابکدستی سے اِس نئے ادب کی پاک روح اور گھناؤنے قالب کا تجزیہ کیا ہے اور نہایت دردمندی کے ساتھ "ترقی پسندی" کے اُس پردے کو چاک کرنے کی سعی فرمائی ہے جس کے پیچھے بعض نئے لکھنے والے اپنی کمزوریوں اور عیوب کو ڈھانپنے کی کوشش کرتے ہیں اور بڑے دھڑلّے کے ساتھ اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ یہ "ناسور" اس سوسائٹی ہی کے ڈالے ہوئے ہیں، جس میں ہم نے پرورش پائی ہے۔ یہ "زخم" اس ماحول ہی کی "فضا" کا عطیہ ہیں جس میں ہم نے آنکھیں کھولیں ہیں اور ان زخموں کو کھرچنے کی ہم میں تاب نہیں۔ علاج سے ہم معذور!! اس لئے ہم مجبور، زخموں اور ان میں کلبلاتے ہوئے کیڑوں کو دکھا کر اس موجودہ زندگی سے تنفر کا ایک عام جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں اور بس!

اس مضمون کو اگر "آفتاب" میں سے نکال دیا جائے تو یہ کتاب ایک ایسی "دلہن" کی طرح رہ جائے گی جسے تمام "لوازماتِ عروس" سے تو سجا دیا گیا ہو لیکن ہاتھوں میں مہندی نہ رچائی گئی ہو۔ بڑا تعجب اس بات پر ہے کہ مرتب نے "جدید شاعری کے رجحانات" کو جو "موجودہ ادب" کا ایک اہم موضوع ہے، بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ رشید صاحب کے علاوہ جناب اختر انصاری کی "ادبی ڈائری" اور عبدالستار صاحب کے مضمون میں بھی اس نئی شاعری کے کچھ ہلکے ہلکے اشارے پائے جاتے ہیں۔ ان کے سوا نہ تو اِس موضوع پر کوئی الگ مضمون لکھوایا گیا اور نہ کسی فاضل مقالہ نگار نے اِس "بے جوڑ اور بے تکی" شاعری کی طرف توجہ فرمائی!

اِس کمی کے باوجود ملک حامد حسین صاحب کی یہ پیشکش لائق صد ستائش ہے کیونکہ ادب کی اس کساد بازاری میں تنقیدی ادب کا بالکل ہی فقدان ہے اور آفتاب تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ اختر انصاری صاحب کی "فن تنقید" پر تنقید اس قابل ہے کہ جانب دار دوست پرور اور نام نہاد "نقادانِ فن" پڑھیں اور پڑھ کر اپنے ضمیر سے محاسبہ کریں!!

اس کتاب کی قیمت دو روپیہ ہے اور اسے غالباً مرتب ہی سے منگوایا جا سکتا ہے۔

اظہر رضوی

مطبوعاتِ مجلسِ مصنفین علی گڑھ

مُصنّف

جلد ۲ | بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۴ء | نمبر ۸

ذکرِ ماضی

اور

فکرِ فردا

۲۵ر اگست ۴۴ء کو ہماری 'مجلس مصنفین' کو قائم ہوئے تین سال ہوگئے اس عرصہ میں
ئے ایک سے ایک بڑھکر شاندار اڑتالیس جلسے ہوئے اور اسکے آرگن 'مصنف' کی دو سالانہ جلدیں مکمل
ئیں 'مصنف' کی ان جلدوں میں قریب تیرہ سو (۱۳۰۰) صفحات کی ضخامت کے مختلف علوم و فنون پر نہایت
ند پایہ علمی و تحقیقی مقالات شایع ہوئے جن کا ہماری توقع سے زائد ہندوستان کی علمی دنیا میں
ر مقدم ہوا۔ لیکن افسوس ہے کہ کامیابی کے اس بہترین زمانہ ہی میں۔ ع

جب وہ چوکھ ہوئی روشن تو قضا بھی آئی

ر جون ۴۴ء کو کاغذ کے نئے قانون نے 'مجلس' اور 'مصنف' پر ایک کاری ضرب لگادی۔ اگر یہ قانون
د ختم نہ ہوا تو ہر قسم کا ایثار، اولوالعزمی اور جدوجہد بے نتیجہ رہے گی۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ
ے پاس کسقدر ہی روپیہ کیوں نہ ہو اور ہم چاہے کتنا ہی کاغذ کیوں نہ حاصل کرسکتے ہوں گزشتہ
ل کے خرچ کئے ہوئے کاغذ کا صرف تیس فیصدی صرف کرسکتے ہیں چنانچہ 'مصنف' جو ڈیڑھ سو سے دو سو صفحات
ب کا طبع ہوتا تھا۔ بالفعل اڑتالیس صفحات پر نکالا جارہا ہے۔

معزز ناظرین 'مصنف' سے التماس ہے کہ وہ اس وقتی افتاد سے بددل نہ ہوں۔ خدا نے چاہا تو
ز بردست احتجاج کی وجہ سے جو ملک کے طول و عرض میں اس قانون کے خلاف ہو رہا ہے یا تو وہ جلد منسوخ
جائیگا یا 'مصنف' کا 'کوٹا' مقرر ہو جائیگا جسکے لئے ہم امکانی کوشش کر رہے ہیں۔

دل پر بر چھی سی لگتی ہے۔ کاش سرسید کی کرامت نے سہیل کے معاملہ میں استاذی رشید احمد صاحب صدیقی کی بھی مدد کی ہوتی"

افسوس ہے کہ قلت گنجایش کی وجہ سے مصنف اٹھ کے بارے میں معزز آرا کا بھی صرف خلاصہ پیش کیا جا سکتا ہے:-

قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر ایٹ لاء پٹنہ "مصنف کے متعلق مفصل اظہار رائے نہ کرنے سے یہ نہ سمجھئے کہ میں اس کی قدر نہیں کرتا۔ اس کی بہت عزت میری نظر میں ہے۔"

رسالہ ہماری آواز الہ آباد "یہ رسالہ ہندوستان کے معیاری رسالوں سے بھی چند حیثیات سے افضل ہے۔ کسی خوش ذوق کے کتب خانہ کو 'مصنف' سے خالی نہ ہونا چاہئے۔"

سر سید رضا علی صاحب سید صاحب نے 'مصنف' میں اپنی خود نوشت سوانح حیات 'اعمال نامہ' پر سید اظہر حسین رضوی صاحب کا تبصرہ ملاحظہ کر کے اس میں زبان وغیرہ کی دس غلطیاں نہایت دھوم دھام کے ساتھ پکڑی ہیں اور لکھا ہے کہ اگر کتاب کا دوسرا حصہ میں نے ریویو کے لئے آپکے پاس بھیجا تو اس کی شرط یہ ہوگی کہ ریویو پشاور، چٹاگام۔ یا پورٹ بلیر (کالے پانی کے دار الحکومت) کے کسی صاحب سے لکھوایا جائے۔" اپنی زبان دانی پر اس طرح حرف آتے دیکھ کر اظہر رضوی صاحب کا یہ کہنا ہے کہ اگرچہ انکا خاندان عرصہ سے ریاست حیدر آباد میں ہے لیکن اصل میں وہ لکھنوی ہیں اور میر انیس کے نواسوں میں سے ہیں۔ اس جواب پر سید صاحب نے اظہر صاحب کو گویا بالکل ہی نیچ کر دیا اور لکھا کہ "وہ حضرت انیس کے نواسے ہیں۔ یہ بات مجھے معلوم نہ تھی۔ مجھ گنہگار نے دبیر کی اور ان کے کلام کی تعریف کی ہے۔" بہر حال اب فیصلہ اس پر ٹھیرا ہے کہ سید صاحب نے اکتوبر میں اظہر صاحب کو مراد آباد بلایا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ وہ "کس کینڈے کے آدمی ہیں۔" سید صاحب کی رائے کے برعکس مولانا سید طفیل احمد صاحب اظہر صاحب کے ریویو کے بہت مداح ہیں اور ان کے لٹریچر کو قابل تقلید اور بہت بلند پایہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح

قاضی احمد میاں اختر صاحب جونا گڑھی اپنے گرامی ناموں میں مسلسل اظہر صاحب کی شد و مد کے ساتھ تعریف لکھ رہے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں "اعمالنامہ کا پورا پورا حق تنقید ادا ہوا ہے اور ریویو کی ہر ہر سطر سے اتفاق کرتے ہوئے کہنا پڑا ہے

دیکھنا تنقید کی لذت کہ جو اس نے لکھا ۔۔۔ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

"کتاب مذکور کے متعدد تبصروں میں اس سے بہتر اور کوئی تبصرہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تبصرہ ایک ادبی تبصرہ جیسا چاہئے ایسا راست راست ہے کم دکاست تبصرہ شاید ہی کبھی دیکھنے میں آیا ہو۔ سید اظہر حسین صاحب تبصرہ نگاری کیلئے

بزمِ مصنف

مصنف نمبر ۳ بابتہ جون ۴۴ء میں اس عنوان کے تحت کچھ آراء چھپنے سے رہ گئی تھیں جن کے
خلاصے درج ذیل ہیں :-

ڈاکٹر سید حامد علی صاحب مدنی نگلوی حیدرآباد دکن مصنف برابر مل رہا ہے اس کا شکریہ۔ اس معاملہ میں آپ کی کاوش، کوشش اور محنت قابل تعریف ہے مجلس مصنفین بھی بہت اچھا کام
کر رہی ہے اللہ اُسکے مخلص کارکنوں میں اور زیادہ طاقت قوت اور شوق پیدا کرے تاکہ وہ اپنے مقاصد کے
مطابق کام کر سکے۔ خدا آپ کی ہمت اور مصنف کی عمر میں ترقی عطا فرمائے۔ ایک چک ارسال ہے۔

ڈاکٹر غلام محی الدین قادری زور صاحب زور صاحب نے شعبۂ اردو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ۱۰ اپریل ۴۴ء کو جبلپور میں صدارت کرتے ہوئے اپنے خطبۂ صدارت میں مجلس مصنفین علیگڑھ
اور رسالۂ 'مصنف' کی بہت تعریف کی اور لکھا کہ چونکہ یہ مجلس خلوص اور صحیح ذوق کے تحت کام کر رہی ہے
اسلئے یقین ہے کہ اردو ادب کی اجتماعی خدمات کی تاریخ میں اپنے لئے ایک نمایاں جگہ مخصوص کرلے
'مصنف' کی بابتہ تحریر فرمایا کہ وہ ادب و تاریخ کے بلند پایہ مقالوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

پروفیسر آغا سروش صاحب اورنگ آباد دکن آغا صاحب کا آجکل فارسی ادب میں بہت انہماک ہے۔ پھر بھی آپنے
نام مولوی عبدالحق صاحب کے نئے اردو میں ایک نظم 'اردو'
لکھی ہے جس میں حقیقت اور مجاز کا امتزاج قابل دید ہے انشاء اللہ یہ نظم 'مصنف' میں شایع ہوگی۔

مولوی انیس احمد صاحب امروہوی ایم۔ اے مولوی صاحب نے اخبار 'مخبر عالم' مرادآباد میں ایک مبسوط تبصرہ 'مصنف'
لکھا۔ ہر ایک مضمون پر علیحدہ علیحدہ رائے لکھتے ہوئے "ایران قدیم
دنیا کی پانچویں شہنشاہی" از مولانا سید طفیل احمد صاحب پر خصوصیت کے ساتھ اظہار خیال کیا۔ اور مولا
کے بعض نظریوں کے خلاف وزنی دلائل پیش کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انیس صاحب کو دنیا کی قدیم تا
سے گہری دلچسپی ہے۔ سید اظہر حسین رضوی صاحب کے مقالہ "جامعۂ عثمانیہ کی ادبی زندگی" کی شانِ نزول
ٹوکتے ہوئے رضوی صاحب لکھتے ہیں کہ آخر جامعہ عثمانیہ کی غیر ادبی نشوونما پر کس نے اعتراض کیا تھا جو اظہر صاحب
متعدد جزئیات اور تفصیلات میں جانے کی ضرورت پیش آئی۔ 'خط و خطاطی' از شیخ ممتاز حسین صاحب جونپوری کو بہ
دلچسپ اور پُر از معلومات بتایا ہے۔ 'مصنف' نمبر ۶ کے افتتاحیہ میں جس جگہ 'مصنف' کی ترقی کو سرسید کی کر
سے تعبیر کیا گیا تھا اُس پر تبصرہ کیا ہے کہ "سرسید کی روحانیت مسلّم لیکن جب کبھی مرحوم 'سہیل' یاد آجاتا ہے"

مقالے :-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ظفر کی شاعری

از مولوی حسن عبداللہ صاحب ایم - اے - ایل - ایل - بی (علیگ)

اس سے قبل میں "ادب اردو پر غدر ۱۸۵۷ء کے احسانات" کے عنوان سے آپ کی مجلس میں ایک مقالہ پڑھ چکا ہوں جو الطاف علی صاحب کی فرمائش پر قلم برداشتہ لکھا گیا تھا اور انھیں کی توجہ سے رسالہ "معنف" میں چھپا۔ ہندوستان کے متعدد اصحاب فہم اور ارباب نقد کی ہمت افزا تحسین نے میری رہی سہی خامہ فرسائی کی ہمت بھی زایل کر دی۔ اور میرے احساس کمتری نے مجھے یہی مشورہ دیا کہ اب آئندہ اس کی جرأت نہ کروں کہ کوئی مقالہ لکھوں کیونکہ اگر دوسرا مقالہ اسی معیار کا نہ ہوا تو بنی بات بگڑ جائے گی۔ لیکن بھائی محمد عزیر صاحب لیکچرر شعبۂ اردو نے سید الطاف علی صاحب کی وکالت کرتے ہوئے مجھ سے مقالہ تیار کرنے پر اصرار کیا۔ اور یہ اصرار اتنا بڑھا کہ چار و ناچار ع

ایک بیداد گر رنج فزا اور سہی

کہتا ہوا مجھے رضامندی دینی ہی پڑی۔ مقالہ کے لئے "ظفر کی شاعری" کا عنوان تجویز ہوا اور سید الطاف علی صاحب نے شرط یہ لگائی کہ غدر کے واقعات دہرائے نہ جائیں۔ میں نے عرض کیا کہ چبائے ہوئے نوالے کا چبانا کچھ مجھے بھی نہیں بھاتا۔ لیکن کیا کیا جائے کہ

بہت موزوں معلوم ہوتے ہیں ایسے بے لاگ نقاد اور تبصرہ نگار ہماری قوم میں آج مفقود ہیں ایک زمانہ تھا کہ ہمارے اسلاف رَحِمَ اللّٰہُ مَنْ ھَدَانِیْ اِلٰی عُیُوْبِیْ کی دعائیں دیتے تھے آج اُن کے اخلاف اپنے اعمال کی ذرہ بھر تنقید برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں ؎

صلاحِ کار کجا و من خراب کجا　　　ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا

"اعمال نامہ کا تبصرہ معارف میں بھی دیکھا مرنجاں مرنج مبصر (نقاد نہیں) اُن مقامات کی صرف تحسین (تنقید نہیں) کرتا ہوا گزر گیا ہے یہ بھی ایک خوشگوار اسلوب ہے لیکن وہ دقت نظر اور جامعیت کہاں جو مصنف کے نقاد کی تنقید صحیح میں پائی جاتی ہے اور یہی ہمارے نقاد کی بلندیٔ فطرت اور مذاقِ صحیح کا ثبوت ہے اگر سر سید رضا علی صاحب کی جگہ میں ہوتا تو اسکی دو دیوں دیتا کہ کتاب کے ہر نسخہ کیساتھ اسکو چھپوا کر تقسیم کرتا...... مگر یہ وصف تو کچھ انھیں جانبازوں کیساتھ مخصوص تھا جو قرونِ اُولیٰ کے خیر الامتہ میں گزرے ہیں۔ ہندی و مغربی ماحول نے تمدن و ثقافت کی ساتھ مذہب و اخلاق بھی چھین لیا۔ آہ۔ غالباً سودا ہیں ؎

دلِ ستم زدہ بے تابیوں نے لوٹ لیا　　　ہمارے قبلہ کو وہابیوں نے لوٹ لیا

مجلس کے جلسے

۱۵ر جولائی سے ۱۵ر اکتوبر ۴۶ء تک مسلم یونیورسٹی میں تعطیل کی وجہ سے آجکل مجلس مصنفین کے جلسوں کا سلسلہ بند ہے۔ اس سہ ماہی میں سینتالیسویں اور اڑتالیسویں صرف دو مجلسیں ہوسکیں۔

سینتالیسویں مجلس پروفیسر سید بشیر علی صاحب کی دعوت چائے پر ۲ر جولائی ۴۶ء کو موصوف کی کوٹھی حیا منزل میں زیر صدارت مولوی ابو یحیٰی امام خاں صاحب منعقد ہوئی جسمیں مولوی محمد عزیر صاحب ایم۔ اے نے اپنا مقالہ "نواب صدیق حسن خاں" پڑھا۔

اڑتالیسویں مجلس ۱۱ر جولائی ۴۶ء کو سات بجے شام زیر صدارت پروفیسر سید بشیر علی صاحب مولوی محمد عزیر صاحب کی دعوت پر منعقد ہوئی اور اس میں سید مقصود علی صاحب بی۔ ایس۔ سی ڈی۔ آئی۔ سی (لندن) اے۔ ایف۔ آر۔ اے۔ ای۔ ایس (لندن) سابق ایروڈروم انجینئر کراچی ایرپورٹ و ڈیزائنر ہندوستان ایرکرافٹ بنگلور۔ ریڈر مسلم یونیورسٹی انجینئرنگ کالج نے "ہوائی جہاز" پر مقالہ پڑھا اور مختلف قسم کے ہوائی جہازوں کی بکثرت تصاویر کو برقی لیمپ کے ذریعہ عکسی پردہ پر دکھایا۔ جناب ڈاکٹر رفیق احمد خاں صاحب چیرمین باٹنی ڈپارٹمنٹ نے ازراہ مہربانی اپنے ڈپارٹمنٹ کی مشین کو استعمال کرنیکی سہولت بہم پہنچائی۔

سید الطاف علی بریلوی
(مدیر رسالہ)

زیوروں سے آراستہ و پیراستہ تھا۔ بوئے نخوت و رعونت پاس ہو کر نہ گزری تھی۔ زہد و طہارت اور تقویٰ کی جانب مائل تھا۔ منہیات اور ممنوعاتِ شرعی سے احتراز کرتا تھا۔ آغازِ بلوغ ہی سے اپنی دینداری پرہیزگاری اور فیاضی کے باعث ہر دلعزیز تھا۔ مشہور ہے کہ اپنے خادموں کو کھلائے بغیر خود نہ کھاتا تھا۔ علما و فضلا کی صحبت سے خاص دلچسپی تھی اور ان کی خدمت اپنا فرض جانتا تھا۔ پیری مریدی کا سلسلہ بھی جاری تھا اور بیشتر مریدین کو مبلغ صہ پانچ روپیہ ماہوار تنخواہ دیجاتی تھی۔ خواہ اس طمع سے یا بادشاہ کی دینداری کے باعث مریدین کی تعداد روزافزوں تھی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کمپنی کے اہل کار مرید ہونے لگے اور جناب ریزیڈنٹ بہادر کو اندیشہ پیدا ہوگیا اور منادی کردی گئی کہ کوئی سرکاری فوج کا اہلکار مُرید نہیں ہو سکتا۔ باوجود اس کے ستر برس کی عمر میں ایک حسین مطربہ پر فریفتہ ہوئے اور اُسے شرفِ زوجیت بخشا۔

شاعری کی طرف ایامِ طفلی ہی سے میلانِ خاطر تھا۔ اس فنِ شریف میں پہلے شاہ نصیر سے اور پھر ان کے شاگرد میر کاظم حسین بیقرار سے اصلاح لیتے رہے۔ ۱۸۳۰ء میں جب بیقرار میر منشی ہو کر کلکتہ چلے گئے تو شیخ ابراہیم ذوقؔ "استادِ شہ" کے منصب پر فائز ہوئے اور جب ۱۸۵۴ء میں ذوقؔ کا انتقال ہوگیا تو یہ خدمت غالبؔ کے سپرد ہوئی۔

ہمیں اس وقت صرف ظفرؔ کی شاعری کا جائزہ لینا ہے اور ان کی شاعری پر نقد و تبصرہ کرنے سے قبل ہمیں اس ماحول کا بھی خاکہ پیشِ نظر رکھنا ہے جس میں ظفرؔ نے آنکھیں کھولیں اور جس میں اُنھوں نے آخری سانس لیا۔ کیونکہ ہر شاعر کے کلام پر اس کے ماحول کا بہت گہرا اثر ہونا ایک لازمی امر ہے۔

ظفرؔ نے اُس وقت آنکھ کھولی جب اردو شاعری منازلِ ارتقا کو تیزی کے ساتھ طے کر رہی تھی اور اس کا آفتاب پوری بلندی پر تھا۔ ظفرؔ کے دادا شاہ عالم ثانی سریرِ حکومت پر متمکن تھے۔ یہ خود اچھے شاعر تھے اور آفتاب تخلص کرتے تھے۔ اس وقت لکھنؤ میں خواجہ میر دردؔ۔ میرزا مظہر جانجاناں۔ میر تقی میرؔ۔ سوداؔ۔ مصحفیؔ۔ انشاؔ۔ جرأت وغیرہ جیسے مایۂ ناز شعرا اور دہلی میں شاہ نصیرؔ۔ احسانؔ۔ ممنونؔ۔ قاسم وغیرہ جیسے رطب اللسان ماہرینِ فن موجود تھے۔ اُدھر ہر طرف شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ ایسے ماحول میں آنکھیں کھول کر ظفرؔ کا میلانِ طبع اردو شاعری کی طرف نہ ہونا غیر ممکن تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے گرد و پیش کو

ایک شاعر کے کلام کا جائزہ بغیر اس کے ماحول کے پس منظر کے کچھ یونہی سی بات ہوگی، اجازت دیجئے کہ ظفر کے عہد کی تاریخ کا ایک سرسری خاکہ پیش کردوں۔ یہ عرض منظور ہوئی اور میں نے اللہ کا نام لے کر مقالہ لکھنے کی جرأت کی۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ جس طرح سہرے کی معذرت میں غالب نے لکھا ہے کہ

دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثالِ امر

اسی طرح اس مقالہ کی معذرت میں میری بھی یہی گزارش ہے کہ یہ مقالہ میں نے نہیں لکھا ہے بلکہ مجھ سے لکھوایا گیا ہے۔" (حسن عبداللہ)

خاندانِ تیموریہ کا یہ شاہزادہ جس کی قسمت میں سلطنتِ مغلیہ کا خاتمہ دیکھنا ازل سے تحریر ہوچکا تھا ۲۸ شعبان المعظم ۱۱۸۹ھ مطابق ۱۷۷۵ء بروز سہ شنبہ پیدا ہوا اور اس کا تاریخی نام "ابوظفر" رکھا گیا۔ اس کے والد میرزا اکبر شاہ فرمانروائے دہلی شاہ عالم کے دوسرے شاہزادے تھے اور والدہ ماجدہ کا نام لال بائی تھا۔

ابوظفر جب سنِ شعور کو پہنچے تو حافظ ابراہیم صاحب (جن کے پوتے شمس العلماء مولوی ذکاءاللہ تھے) اس کے اتالیق مقرر ہوئے۔ اور اس عہد کے مشہور قاری حافظ محمد خلیل صاحب نے قرآن کی تعلیم دی۔ مشہور خوشنویس سید جلال الدین حیدر "مرصع قلم" کے والد میر ابراہیم علی شاہ نے تحریر کی مشق کرائی۔ عربی اور فارسی ادب کی تکمیل کرنے کے علاوہ تیراندازی۔ شہسواری۔ تیغ زنی۔ نشانہ بازی اور فنِ بنوٹ میں ید طولیٰ حاصل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ آٹھ آدمیوں کے مقابل میں ہر ایک کا وار بیک وقت روکتے تھے اور سب بن اپنی چھوٹ چھوڑتے جاتے تھے اور شہسواری میں یہ کمال حاصل تھا کہ اس وقت ہندوستان میں ڈھائی سوار مشہور تھے۔ ایک یہ ایک ان کے بھائی جہانگیر اور آدھا کوئی اور۔ کبوتر بازی۔ بٹیر بازی اور مرغ بازی کا بھی شوق تھا اور اس کے بھی صاحبِ فن سمجھے جاتے تھے۔ آدابِ شاہی سے پوری واقفیت رکھتے تھے اور بزرگوں کی تعظیم۔ چھوٹوں پر شفقت۔ دوستوں سے اخلاص۔ خدا کا خوف اور شریعت کی پابندی آخری وقت تک برابر ملحوظ رہی اور یہ اسی ابتدائی تعلیم کے گہرے نقوش کا اثر تھا۔

ظفر جملہ مکارمِ اخلاق سے متصف تھا۔ عجز و انکسار۔ عفو و حلم۔ ترحم اور حسنِ خلق کے

قائم تھا۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کے جنرل آکٹر لونی نے مرہٹوں کو شکست دی اور شاہ عالم مرہٹوں سے نکل کر انگریزوں کی حفاظت میں آئے۔ عمال شاہی برطرف ہوئے اور نیا دور شروع ہوا جس میں خلق خدا کی۔ ملک بادشاہ کا اور حکم سرکار کمپنی بہادر کا۔

بادشاہ کی گزر بسر کے لئے ساٹھ ہزار روپیہ ماہوار مقرر ہوا۔ اس کے علاوہ جملہ اخراجات و وظائف کے لئے ۲۰،۵۰۰/= کی رقم ماہانہ قلعۂ معلےٰ میں پہنچ جاتی تھی جس میں ظفر کے والد اکبر شاہ ولیعہد کا وظیفہ دس ہزار روپیہ ماہوار شامل تھا۔ محرم۔ عیدین۔ نوروز اور دوسرے تیوہاروں کے لئے دس ہزار روپیہ سالانہ کی رقم معین تھی۔ ایک دیوان اور چند اہلکار مقرر کرنے کا اختیار بادشاہ کو تفویض ہوا۔ دہلی اور اس کے نواح میں شرع محمدی کا نفاذ ہوا اور اتنی رعایت اور ملحوظ ہوئی کہ بغیر بادشاہ سلامت کے استمزاج کے سزائے موت یا سزائے قید طویل عمل میں نہ آئے گی۔ بالآخر ۷ رمضان المبارک ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۰ر نومبر ۱۸۰۶ء کو مظلوم نابینا نام نہاد بادشاہ شاہ عالم ثانی داعیٔ اجل کو لبیک کہتا ہوا اس جہانِ پُر آشوب سے رخصت ہوا اور ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی مسند نشین اورنگ وظیفہ خواری ہوئے۔

یہ سارے انقلابات نوجوان شاہزادہ ابوظفر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک حساس طبیعت رکھتا تھا اور ہر واقعہ اس پر اپنا گہرا اثر ڈالتا تھا۔ تاہم ابتک شاہزادہ کی زندگی گونہ بے فکری کی زندگی تھی۔ خارجی ماحول کا پورا پورا اثر قبول کرتے رہنے کے باوجود وہ ہنوز بذاتِ خاص افکار و حوادث کا شکار نہ ہوا تھا۔ لیکن کوٹ قاسم کی جاگیر جو مرہٹوں نے ولیعہد کی جاگیر قرار دی تھی اور جس پر اکبر شاہ اپنے زمانۂ ولیعہدی میں برابر قابض و متصرف رہے اب شاہی املاک میں شامل ہوگئی اور اکبر شاہ ثانی نے اپنے دوسرے بیٹے جہانگیر کو ظفر پر ترجیح دیکر اپنا ولیعہد بنانا چاہا۔ انگریزوں نے اس بے انصافی سے باز رکھنا چاہا تو باپ نے بلا تکلف فرمادیا کہ "ابوظفر میرا بیٹا نہیں ہے۔" اس کس مپرسی کے عالم میں ظفر نے ایک مخمس لکھی تھی جس کا مطلع ہے ؎

ستم کرتا ہے بے مہری سے کیا کیا آسماں پیہم
کرونگا پر نہ شکوہ گرچہ ہونگے لاکھ غم پر غم

دل اُسکے ہاتھ سے پُردرد ہے اور چشم ہے پُرنم
کہے جاؤنگا میں ہر دم یہی جبتک ہے دم میں دم

خدا دارم چہ غم دارم۔ خدا دارم چہ غم دارم

ماحول کا اثر نہ لینا ممکن نہ تھا۔ سلطنتِ مغلیہ کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی روشنی مدھم ہوتی جاتی تھی اور یہ مردِ عاقل دانا اور بینا اس کا بچشمِ غور مطالعہ کر رہا تھا۔ آخر وہ کہاں تک اس کا اثر قبول نہ کرتا۔ چنانچہ ظفر ایک باکمال شاعر ہوا اور اس کی شاعری اس کے ماحول کے عین مطابق ہے اور اس کا ہر شعر اس کے ذہنی اور قلبی تاثرات کی ایک سچی تصویر ہے۔

جہانگیر اور عالمگیر کے تخت پر شاہ عالم ثانی جلوہ گر ضرور تھا جو آفتاب تخلص بھی کرتا تھا لیکن آفتابِ سلطنتِ مغلیہ زوال میں تھا۔ دہلی پر مرہٹوں اور جاٹوں کی یورش ہوئی شاہ عالم ثانی دلی سے بھاگے اور انگریزوں کی پناہ میں الٰہ آباد رہے۔ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو شکست دی، دلی فتح کی اور شاہ عالم ثانی کو بادشاہ تسلیم کیا۔ سات سال کے بعد بادشاہ دہلی واپس آیا اور وہ مادھوجی سندھیا کے ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے برائے نام بادشاہ کہلاتا رہا۔ ۱۷۸۸ء میں غلام قادر روہیلہ نے دلی پر چڑھائی کر دی ضعیف العمر بادشاہ قید ہوا۔ شاہی بیگمات کی بیدوں سے زد و کوب کی گئی اور شاہزادوں کو سخت ایذائیں پہنچائی گئیں اور غریب بادشاہ کی ایک آنکھ خود غلام قادر نے چھاتی پر چڑھ کر اپنے خنجر سے نکال لی اور دوسری آنکھ اس کے اشارہ پر اس کے ایک ساتھی نے نکال کر بادشاہ کے لئے دنیا اندھیری کر دی۔ اور اسی حالت میں بے بس بادشاہ کو سلیم گڑھ لے گئے۔ اس قیامت خیز ہنگامے کی پُردرد تصویر شاہ عالم ثانی نے الفاظ میں یوں کھینچی ہے؎

صرصرِ حادثہ برخواست پئے خواریٔ ما
داد بر باد سر و برگِ جہانداریٔ ما

آفتابِ فلکِ رفعت و شاہی بودیم
بُرد در شامِ ازل آہ سیہ کاریٔ ما

چشمِ ما کندہ شد از جورِ فلک بہتر شد
تا نہ بینیم کہ کند غیر جہانداریٔ ما

حالِ ما گشتہ تبہ ہمچو امامان ز یزید
کرد تقدیر ازل روزیٔ ما خواریٔ ما

بود جانکاہ زر و مالِ جہاں ہمچو مرض
دفع از فضلِ الٰہی شدہ بیماریٔ ما

سندھیا نے غلام قادر کو شکست دی اور قتل کر ڈالا۔ اور بادشاہ کو اس کے پنجۂ غضب سے نجات ملی اور وہ دہلی آیا۔ سندھیا مدارالمہام بنا اس نے بادشاہ کے اختیارات سلب کر لئے تاہم مراتبِ شاہی کی توقیر برقرار رکھی۔ مرہٹے کرتے تو وہی تھے جو چاہتے تھے لیکن احکام سب بادشاہ ہی کے نام سے جاری ہوتے تھے۔ سکہ بادشاہی کا رائج تھا اور شاہی رعب داب

سے خط کا آغاز کیا اور Yours most obediently پر اس کی تان توڑی۔ ظفر جیسے ذہین، حساس اور موقع شناس کے لئے یہ بھی ایک کاری ضرب تھی۔ چنانچہ اپنے ملال کا ایک شعر میں یوں اظہار کرتے ہیں ؎

اب جو لکھتا ہے وہ کاہے کو یہ لکھتا تھا کبھی
دیکھلو اُس بتِ بے پیر کا اگلا کاغذ

۱۸۵۶ء میں میرزا فخرو جو ولی عہد تھے ان کا انتقال ہوگیا۔ ولیعہدی کا قصہ پھر اُٹھا۔ بادشاہ نے شہزادہ جواں بخت کی ولیعہدی کے لئے باضابطہ مطالبہ کیا اور ایک محضرنامہ پیش کیا جس پر اُن کے آٹھوں بیٹوں کے دستخط تھے اور اس میں لکھا تھا کہ ہم سب برضا و رغبت جواں بخت کی ولیعہدی کے حامی ہیں لیکن دوسرے ہی دن سرکار کمپنی بہادر نے میرزا قویش سے جو بہادر شاہ کے بڑے بیٹے تھے یہ شرط منظور کرالی کہ بہادر شاہ کے بعد لقب شاہی موقوف کیا جائے گا، صرف خطاب شاہزادہ باقی رہجائے گا اور زرِ پیشگی جو اس وقت تک تقریباً سوالاکھ روپیہ ماہوار تھا صرف پندرہ ہزار ماہوار رہجائے گا۔ اور میرزا قویش کی ولیعہدی کا اعلان کردیا گیا۔ جب یہ خبر بوڑھے بادشاہ کو ملی تو اُس کے رنج و غم کی کوئی حد نہ رہی۔ ایک نہایت دردناک نظم اس موقع پر اُن کے دلی تاثرات کی ترجمانی کرتی ہی جس کا مطلع ہے ؎

اے ظفر اب ہی تجھی تک اِنتظامِ سلطنت
بعد تیرے نے ولیعہدی نہ نامِ سلطنت

لیکن ولیعہدی اور سلطنت دونوں کا خاتمہ ظفر کی زندگی ہی میں ہونا مقسوم تھا۔ ۱۸۵۷ء میں غدر نے قیامت برپا کردی۔ دلی پر باغیوں کا قبضہ ہوگیا، بادشاہ قید میں تھے۔ شہزادے اکثر باغی فوج کے سردار مقرر ہوئے۔ بادشاہ ہر طرح باغیوں سے الگ تھے لیکن ہر حکم جو باغی جاری کرتے تھے اُس پر بادشاہ کی مہر ثبت کردیتے تھے یا بہ جبر بادشاہ سے دستخط لے لیتے تھے۔ اُس وقت قلعہ میں جو بادشاہ کے نزلہ خوار ملازمین تھے اُن میں سے اکثر انگریزوں سے خفیہ نامہ و پیام کر رہے تھے اور دوراندیشی خبریں پہنچاتے تھے۔ میرزا الٰہی بخش اور احسن اللہ خاں جو پشتہا پشت سے بہادر شاہ کے خاندان کی روٹیوں پر پلے تھے اور اس خاندان کے ہمیشہ مرہونِ منت رہے تھے خاص طور پر مخبری کی خدمت انجام دیتے تھے۔

اس خمسہ کا پانچواں مصرع ہر بند میں ایک ہی ہے۔ کئی سال کی آزمائش میں جب یہ ثابت قدم رہا تو خدا کو بھی رحم آیا اور اس کی قناعت اور رضا و تسلیم کا صلہ یوں ملا کہ ۱۸۱۴ء میں بذلت و خواری جہانگیر مرزا انگریزوں کی قید میں بمقام الہ آباد قضا کر گئے اور سرکار کمپنی بہادر نے اعلان کر دیا کہ وہ سوائے میرزا ابوظفر کے کسی کو وارثِ تاج و تخت تسلیم نہ کرے گی۔ اُس وقت ظفر کے مغموم دل سے بے اختیار یہ شعر نکلا ہوگا ؎

کیسی تدبیر ظفر جب وہ کرے اپنا کرم
کام بگڑے ہوئے بنجائیں یونہی آپ سے آپ

خیر یہ تو ہوا لیکن جس تاج و تخت کا یہ وارث ہوا اس کی حالت روز بدسے بدتر ہوتی جاتی تھی اور ۱۸۳۲ء میں دلی صوبۂ مغربی و شمال میں شامل کر دیا گیا اور رہا سہا اشتباہ بھی باقی نہ رہا کہ بادشاہ سلامت کی ملکیت خود دہلی پر بھی برقرار نہیں ہے۔ گویا اب پورے طور پر بادشاہ کی معزولی کا اعلان ہو گیا۔ اور ۱۸۳۵ء میں سکہ بھی دلی اور نواحِ دلی میں سرکار کمپنی بہادر کا رائج ہو گیا۔

۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی نے بھی جنت کی راہ لی اور بہادر شاہ بادشاہ ظفر سریر آرائے اورنگِ سلطنت ہوئے۔ اُس وقت اُن کی عمر باسٹھ ۶۲ سال کی تھی۔ اور اُن کی قسمت میں اُس انقلابِ عظیم کا تتمہ دیکھنا لکھا تھا جو ایک عرصہ سے رونما ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ سلطنت کا اقتدار کم ہو تا گیا، یہاں تک کہ آگرہ کی عدالت العالیہ سے فیصلہ ہوا کہ قلعۂ دہلی کے باہر بادشاہ کو کسی قسم کا کوئی استحقاق حاصل نہیں ہے۔ ۱۸۵۲ء میں دلی کے ہندو مسلمانوں میں گاؤکشی کے معاملہ پر جھگڑا ہو گیا۔ بادشاہ نے جھگڑا رفع کرنا چاہا اور کچھ نیک مشورہ دینے کی غرض سے اپنی رائے لفٹنٹ گورنر بہادر صوبہ مغربی و شمالی کو لکھ کر بھیجی تو اُس نے جواب دیا کہ مقامی عہدہ داران جو قیامِ امن کے ذمہ دار ہیں اُن سے رجوع کیا جائے۔ القاب و آداب میں بھی فرق آگیا۔ پہلے جو خطوط لفٹنٹ گورنر بہادر کی طرف سے بادشاہ کے پاس جاتے تھے وہ May it Please Your majesty سے شروع ہوتے تھے اور Your majesty's Faithful Servant پر ختم ہوتے تھے۔ لیکن ۲۲ اگست ۱۸۵۲ء کو مسٹر کالون (Colvin) نے جو آگرہ کے لفٹنٹ گورنر تھے وہ انقلاب تحریر کیا جو ایک برابر کا دوست دوسرے دوست کو لکھتا ہے یعنی مائی ڈیر ظفر

ے لے کر ہنگامۂ غدر تک لُوٹتے رہے اور جنھیں یہ اپنی نظروں سے دیکھتے رہے۔ اس لئے بہت ضروری تھا کہ اس غم کے پتلے کے تاثرات کا کما حقہٗ اندازہ ہو سکے اور اس کی درد بھری کہانی جو شعر کے پیرایہ میں اس کے چار ضخیم دیوانوں میں بیان ہوئی ہے اچھی طرح سمجھی جا سکے۔ فرماتے ہیں ؎

ظفرؔ شعر و سخن سے رازِ دل کیونکر نہ ظاہر ہو   کہ یہ مضمون سارے دل کے اندر سے نکلتے ہیں

قبل اس کے کہ ہم ظفرؔ کے کلام کے متعلق اپنی آزاد رائے کا اظہار کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق مختلف تذکرہ نویسوں کی رائے کو یکجا کر دیں اور نیز حضرت آزادؔ کی اس ستم ظریفی پر سیر حاصل بحث کریں جو اُنھوں نے اس مظلوم کے ساتھ روا رکھی ہے۔

زندگی میں تو جو ظلم اس غریب بادشاہ پر اور اُس کے خاندان پر مرہٹوں۔ جاٹوں۔ روہیلوں اور انگریزوں کے ہاتھوں ہوئے ان کا اندازہ سطورِ بالا سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ ستم ظریفی یہ دیکھئے کہ مرنے کے بعد بھی وہ ایک اہلِ قلم کے مظالم کا شکار رہا۔ حضرت محمد حسین آزادؔ نے آبِ حیات میں یہ زہر اُگلا کہ ظفرؔ کے شاعر ہونے ہی سے یکسر انکار کر دیا۔ اور اس کی ساری عمر کی کمائی جو دستبردِ زمانہ سے بچ رہی تھی وہ بھی اس سے چھین لی۔ فرماتے ہیں:۔

"بادشاہ کے چار دیوان ہیں۔ پہلی کچھ غزلیں شاہ نصیرؔ کی اصلاحی ہیں اور کچھ کاظم حسین بیقرارؔ کی۔ غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سراپا حضرت مرحوم ذوقؔ کے ہیں۔ جن سنگلاخ زمینوں میں قلم کو چلنا مشکل ہے ان کا نظام اور سرانجام اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ دل شگفتہ ہوتے ہیں۔ والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بادشاہ تمہارا زمین کا بادشاہ ہے۔ طرحیں خوب نکالتا ہے مگر تم سرسبز کرتے ہو ورنہ شورزار ہو جائے۔ مسودۂ خاص میں کوئی شعر پورا۔ کوئی ڈیڑھ مصرع۔ کوئی ایک۔ کوئی آدھا مصرع۔ فقط بحر اور ردیف قافیہ معلوم ہو جاتا تھا۔ باقی بخیر۔ یہ ذوقؔ ان ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے۔"

شاعری ظفرؔ کے گھر کی لونڈی تھی اور خاندانی چیز تھی۔ جس زمانہ میں اُنھوں نے آنکھیں کھولیں وہ اُردو کی ترقی کا زمانہ تھا۔ ٹکسالی اردو قلعۂ معلّٰی کی زبان تھی۔ قلعۂ معلّٰی میں دن رات شعر و شاعری کی مجلسیں گرم رہتی تھیں۔ مشاعرے ہوتے تھے۔ دادِ سخن دی جاتی تھی۔ علومِ مشرقیہ میں خود ظفرؔ کو پورا کمال حاصل تھا۔ پھر اور کون سی چیز تھی جو ظفرؔ کو شاعر بنا دینے کیلئے

چنانچہ جب بہادر شاہ قلعہ سے بھاگ کر ہمایوں کے مقبرے میں پناہ گزیں تھے تو الٰہی بخش ہی کی مخبری پر اُن کی گرفتاری عمل میں آئی اور یہ آخری تاجدار دودمانِ تیموریہ سرکاری ملزم کی حیثیت سے پالکی پر سوار کر کے اور گوروں کے پہرے میں دلّی لایا گیا۔ زینت محل میں قید رکھا گیا اور اسے خوراک کے لئے ۵ روپیہ یومیہ ملتے تھے۔

انھیں نمک خواروں کی مخبری پر میرزا مغل اور خضر سلطان مقبرۂ ہمایوں میں قید ہوئے اور بیرحمی سے قتل کئے گئے۔ دہلی میں قتلِ عام شروع ہوا۔ شارعِ عام پر پھانسی گھر بنائے گئے۔ والپول خود لکھتا ہے کہ "انگریزوں نے فتح دلّی کے بعد جو لوٹ دلّی میں جائز رکھی وہ وحشی نادر شاہ نے بھی نہ مچائی تھی"۔ ہزاروں بے قصور مسلمان اور شہزادگان نے پھانسی پائی۔ ہنگامۂ غدر کسی طرح فرو ہوا اور ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو لال قلعہ میں فوجی عدالت کے سامنے مظلوم بادشاہ کا مقدمہ پیش ہوا۔ وکیل سرکار نے جو فردِ قرارداد جرم سنائی اُس میں باغیوں کو امداد دینا۔ ۴۹ انگریزوں کو قتل کرانا یا قتل کرانے میں حصہ لینا اور ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء سے یکم اکتوبر ۱۸۵۷ء تک شہر پر قبضہ کرنا اور باوجود انگریزی رعایا ہونے کے خود کو بادشاہ مشہور کرنا۔ یہ اُن الزامات میں سے چند الزامات تھے جو فہرست میں مذکور تھے اور سب ایسے ہی بے بنیاد تھے۔ بادشاہ نے اِن الزامات سے انکار کیا اور ایک بیان تحریری دستخطی "بہادر شاہ بادشاہ" اور پھر ایک تتمہ بیان تحریری وہ بھی دستخطی "بہادر شاہ بادشاہ" عدالت میں داخل کیا۔ نتیجہ پہلے ہی سے جو ہونا طے پاچکا تھا وہی ہوا اور بادشاہ کو جلاوطنی کا حکم سنا دیا گیا اور رنگون پہنچا دیا گیا۔ وہاں انھیں صرف چھ سو روپیہ ماہوار خوراک کے لئے ملتے تھے لیکن انھوں نے اُس کے لینے سے انکار کر دیا۔ چار سال نہایت عسرت میں بسر کر کے ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو اس دارالمحن سے جناتُ النعیم کی طرف کوچ کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ اور یہ کہتے گئے ؎

رہے پیری میں اس لئے جیتے ۔۔۔ دیکھنے کچھ عذاب کے دن تھے

بہادر شاہ ظفر کی پیدائش سے لے کر ان کی وفات تک کی داستان ضرورت سے زیادہ طویل ضرور ہو گئی ہے لیکن اُس ماحول کا بیان جس میں انھوں نے آنکھیں کھولیں اور آخری سانس لیا اور اُن حادثات اور مصائب کا ذکر جو مسلسل خاندانِ شاہی پر شاہ عالم ثانی

ظفر کے کلام کو ذوق کا کلام بتانا ایک بہتانِ عظیم ہے۔ ظفر کی زبان۔ اس کا لب و لہجہ اس کے خیالات اور ذہنیت ذوق سے بالکل مختلف ہیں۔ ذوق کی شاعری کا "کوبڑ" یا محور مبالغہ رعایاتِ لفظی۔ جوش و خروش اور لفاظی ہے۔ برخلاف اس کے ظفر کے کلام میں سوز و گداز اس کا طرۂ امتیاز ہے جو ذوق کو نصیب نہیں۔

سید عبدالحی مصنف "گُلِ رعنا" فرماتے ہیں کہ :۔

"لطف یہ ہے کہ چاروں دیوان اس بدنصیب بادشاہ کے چھپ چکے ہیں اور حضرت ذوق کا بھی تھوڑا بہت جو کچھ کلام مل سکا ہے وہ ایک دیوان کی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ دونوں کے اندازِ سخن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی حیثیتیں جداگانہ ہیں۔ ذوق پھر بھی ذوق ہیں ظفر کے استاد۔ ان کے کلام کی رنگینی، ترکیب کی چستی، مضمون کی بندش، جوش و خروش، ان کی باتیں ان کے ساتھ ہیں۔ ظفر کے یہاں جو سامان نظر آتا ہے وہ اس سے ملتا جلتا ہے اور ہونا بھی چاہئے کیونکہ استاد کا رنگ شاگرد میں ہونا ضرور ہے مگر پھر بھی وہ دوسری طرح کا ہے۔ محاورہ کی فراوانی یہاں زیادہ ملتی ہے مگر جوش و خروش کی جگہ دل و جگر کے ٹکڑے حروف و الفاظ بن کر آنسوؤں کی سیاہی اور آہ جگر دوز کے قلم کے لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ اب انھیں ظفر کا سمجھو یا ذوق کا۔"

ذوق کے انتقال کے بعد استادشہ کا منصب غالب کو عطا ہوا۔ حالی بجائے اس کے کہ آزاد کی تردید پیش کرتے۔ آزاد کے اس بہتان کو ناظر حسین مرزا کی زبانی دہرا کر یادگارِ غالب میں ظفر کے آخری حصۂ کلام کو غالب کا بتاتے ہیں۔ مگر غالب کے رنگ سے تو ظفر کے رنگ کو اتنی بھی مناسبت نہیں ہے جتنی ذوق کے رنگ سے ہے بھی۔ حالی کو گوارا نہ ہوا کہ ظفر کی لٹتی دولت انگریزوں اور ذوق کے تصرف میں اس طور پر آجائے کہ ان کے استاد غالب کو اس میں سے کچھ بھی نہ ملے۔ انھوں نے رہی سہی متاع غالب کے سپرد کر دی۔

ذوق کی رسائی دربار تک اس وقت ہوئی جب ان کی عمر ۱۹ یا ۲۰ سال کی تھی اور ظفر کی عمر اس وقت ۳۳ سال کی تھی۔ اور آزاد کو یہ تسلیم ہے کہ ذوق اس وقت نوجوان ولیعہد کے استاد مقرر ہوئے جب میر کاظم حسین بیقرار میر منشی ہو کر چلے گئے تھے ــــ یہ واقعہ ۱۸۰۸ء کا ہے جس کے مطابق سنِ ہجری ۱۲۲۳ھ تھا۔ اور ظفر کا پہلا دیوان ۱۲۲۳ھ میں شائع ہو چکا تھا۔ اس طور پر پہلے دیوان کا نصف تو در کنار ایک شعر بھی ذوق کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

ضروری ہوتی اور وہ موجود نہ تھی۔ ذوقؔ تو انیس ۱۹ سال کی عمر میں مشاعروں میں غیر اصلاحی غزلیں پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرلے اور بادشاہ کا استاد بننے کے قابل ہو جائے اور ظفر علم اور فطری میلانِ طبع کے ساتھ نوئے برس کی عمر تک باوجود مشق بیہم کے شعر کہنے کی استعداد نہ پیدا کر سکے!۔ اگر یہ آزاد کی صریح بے انصافی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ انھیں اپنے استاد ذوقؔ کی تعریف میں اتنا غلو ہے کہ جو قصیدہ انھوں نے اپنے استاد کی توصیف وثنا میں آبحیات میں پڑھا ہے وہ ایک ہجوِ ملیح ہو کر رہ گیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

بقول آزاد :۔ "ذوقؔ کی طبیعت حیوانات کی ایذا دہی سے بہت وحشت کرتی تھی۔ ایک نسخہ کے لئے چالیس چڑوں کا مغز درکار تھا۔ ذوقؔ نے انھیں پکڑا کر ایک پنجرے میں بند کیا اور پھر انھیں تڑپتا دیکھ کر نسخہ کا خیال ہی چھوڑ دیا اور چڑوں کو آزاد کر دیا۔

ذوقؔ کی دعا کا عجب انداز بتاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ دنیا بھر کی صحت و سلامت کی دعا مانگتے تھے۔ یہاں تک کہ ہمسایہ کے بیمار بیلوں کے لئے بھی کبھی کبھی دعائے خیر فرماتے تھے۔

ذوقؔ کے حافظہ کے متعلق فرماتے ہیں۔ کہ ان کو عالمِ شیر خواری میں ایک بلی کا لحاف میں گھس آنا اور اس واقعہ کا جو اثر خوف وہیبت کا ان پر ہوا تھا اس کی تمام کیفیت یاد تھی۔

ذوقؔ کے خوفِ خدا کا یہ عالم بیان فرماتے ہیں کہ انھوں نے تمام عمر کوئی جانور ذبح نہ کیا۔

ذوقؔ کو طب میں کافی مہارت تھی مگر اس میں خونِ ناحق نظر آنے لگا اسلئے کبھی مطب نہ کیا۔

فرماتے ہیں کہ ذوقؔ نے پہلا شعر حمد میں اور دوسرا نعت میں لکھا تھا۔"

اگر یہ صحیح ہے تو کیسے افسوس کی بات ہے کہ پھر انھوں نے ساری عمر درباد داری میں گزار دی اور دنیا کو مزرعِ آخرت نہ بنایا۔ اور مومنؔ خاں کو یہ جرأت ہوئی کہ انھوں نے ذوقؔ کو "سگِ جیفہ خوار" کہا۔

بہر حال حضرت آزاد کی یہ عادت ہے کہ ہر چیز کو لطیفہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور جس چیز کی یا جس شخص کی تعریف کرتے ہیں اسے حد سے آگے بڑھا دیتے ہیں۔ اور بقول غالبؔ نتیجہ یہ ہوتا ہے ؎

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

کاش وہ اسے سمجھتے تو ہرگز ظفرؔ اور معروفؔ کا سارا کلام ذوقؔ کو نہ بخشدیتے اور ذوقؔ پر نظمِ اردو کا خاتمہ نہ کر دیتے۔

اور نمکین کہتے تھے۔"

قصہ مختصر یہ ہے کہ یہ کسی طرح قابلِ تسلیم نہیں ہے کہ ظفر کا سرمایۂ سخن متاع بردہ ہے۔ اگر یونہی ہر شاگرد کے کلام کو اس کے استاد کی طرف منسوب کر دیا جائے تو دنیائے میں معدودے چند سخنوروں کے علاوہ کسی کا نام نظر ہی نہ آئے گا۔ اس میں کلام نہیں کہ ظفر کی شاعری کو ذوق کی اصلاح سے فروغ ہوا اور اس کا اعتراف خود ظفر نے ذوق کے مرنے کے بعد ذوق سے اظہارِ عقیدت کرتے ہوئے کیا ہے۔ مثلاً ؎

گیا لطفِ سخن تو ذوق ہی کے ساتھ دنیا سے	جو تھوڑا سا رہا ہے اے ظفر کچھ تو ہمیں تک ہے
بے ذوق ذرا لطف نہیں شعر و سخن میں	اس رمزِ نہانی کو کوئی پوچھے ظفر سے
تیرا مذاقِ شعر ظفر جانتا ہی کون	استاد ذوق تھا ترے واقف مزاج سے
بعد استادِ ذوق تیرے سوا	رکھتا فہمیدِ شعرِ تر ہے کون
لکھ اسی قافیے میں اور غزل	تجھ سے بہتر اب اے ظفر ہے کون

ذوق کے مرنے پر ظفر نے جشن ملتوی کر دیا اور قطعۂ ذیل اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا۔ یہ واقعہ "مخمخانۂ جاوید" میں مذکور ہے ؎ قطعہ

شبِ چارشنبہ بماہِ صفر	بحکم خداوند جاں داد ذوق
ظفر روے اور دبناخن زدغم	خراشید و فرمود "استاد ذوق" ۱۲۷۱ھ

۱۲ ۷ ۲

اس کے علاوہ ذوق کی قبر دلی میں موجود ہے اور قطعۂ ذیل مزار پر کندہ ہے ؎ قطعہ

طوطیٔ ہند حضرتِ استادِ ذوق نے	لی گلشنِ جہاں سے جو باغِ جناں کی راہ
سال وفات جو کوئی پوچھے تو اے ظفر	کہہ "ذوق جنتی" ز سرِ بخششِ الٰہ ۱۲۷۱ھ

۱۲۶۹ + ۲

حضرت آزاد نے ذوق کی ساری تاریخیں ظفر کو دیدیں اور انھیں بھی ذوق کی طرف منسوب کر دیا۔ مگر کیا یہ قطعات بھی ذوق لکھ کر ظفر کے پاس امانت چھوڑ گئے تھے کہ ذوق کے مرنے کے بعد ظفر اپنی طرف سے پیش کرتے۔ یا غالب نے لکھ کر ظفر کے حوالہ کر دئے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ خود ظفر میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ خود تاریخیں لکھ لے تو اس کی تاریخوں کو ذوق کا نتیجۂ فکر کہنا سراسر ظلم اور بے انصافی نہیں تو اور کیا ہے۔

اب اس ذیل میں چند تذکرہ نویسوں کی رائیں ملاحظہ فرمائیے:-

۱- منشی کریم الدین نے "طبقاتِ شعرائے ہند" موزخہ ۱۸۴۷ء میں ذوق کے متعلق لکھا ہے کہ "فنِ شعر میں ابتدائے عمر سے مصروف ہیں مگر حالتِ صبا سے آج تک یہ عادت طبیعت میں متمکن ہے کہ جو شعر کہتے ہیں کسی کو نہیں دیتے ہیں۔ بادشاہ کے استاد ہیں۔ اصلاح بادشاہ کو دیتے ہیں، پھر بھی بقول آزاد ساڑھے تین مسلّم دیوان بادشاہ کے نام سے چھپوا دیتے ہیں-!!

یہی منشی کریم الدین ظفر کے متعلق لکھتے ہیں" شعر ایسا کہتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں ان کے برابر کوئی نہیں کہہ سکتا- ابراہیم ذوق سے اصلاح لیتے ہیں...... ابتدا میں ولیعہد تھے ان ایام میں بھی ان کے شعر بہت اچھے ہوتے تھے...... ہر ایک قسم کے شعر ہیں"۔

۲- منشی احمد حسین سحر نے ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں تذکرہ "بہارِ بے خزاں" مرتب کیا- وہ لکھتے ہیں کہ "ظفر تخلص مرزا ابوظفر بادشاہ دہلی بر فنِ شعر میلے و مناسبتے وارد- ابراہیم ذوق از مخصوصانِ حضرتِ اوست و افکارِ ایشاں بہ اصلاحِ او چوں گوہر آبدار اند"۔

۳- نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے تذکرہ "گلشنِ بے خار" ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء میں تمام کیا- وہ لکھتے ہیں کہ "بہ اکثر صفاتِ موصوف و بہ محامدِ مکارم معروف- در اکثر خطوط دستے شائستہ وارد...... بہ ایں فن بسیار مالوف است- شیخ ابراہیم ذوق از مائدۂ نعمتش زُباد وظیفہ خوار است و افکارِ ایشاں نمک و اصلاح او درست و ہموار"۔

۴- ابوالنصر سید علی حسن خاں نے "بزمِ سخن" کے نام سے ایک تذکرہ ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں لکھا- اس میں لکھتے ہیں کہ "ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ...... در خطِ دستِ بلند داشت و در سخن پایۂ ارجمند- گفتارش اگرچہ سادہ، پر کار است اما ہمہ اش خاطر شکار است- محاورہ گوئی از آنِ اوست و معاملہ بندی زیرِ فرمانِ او...... چہار دیوان از نتائجِ فکرِ بلندِ اوست"۔

۵- میرزا قادر بخش کا تذکرہ "گلستانِ سخن" ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء میں شائع ہوا۔ رائے میں ظفر کا کلام پڑھئے تو "نفس شگفتگی الفاظ سے نسیم چمن اور نگاہ رنگی رقم سے رشتۂ بن جاتی ہے"۔

۶- عبدالغفور خاں نساخ کا تذکرہ "سخن شعرا" مرتبہ ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء ایک نہ دقیع کتاب ہے اور موصوف لکھتے ہیں کہ "ظفر اکثر خطوط کو اچھی طرح لکھتے تھے اور شعر نہایت

کا دامن قافیہ پیمائی کے میدان میں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ اور یہ برجستگی اور بے ساختگی حیرت انگیز اور سزاوار تحسین ہوتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تجھ بن شراب عیش کے پینے پہ چار حرف | اور اس طرح کے بے مزہ جینے پہ چار حرف
روز ازل سے نام محمدؐ کے اے ظفر | کندہ ہیں میرے دل کے نگینے پہ چار حرف

ظفر دنیائے فانی خواب کا سا ایک عالم ہے | مگر اس خواب میں دیکھا کچھ ایسا ہے کہ کیا کہئے
ہو گئے برسوں کی برسوں تم نہ آئے کیا سبب | آپ نے اچھا کیا وعدہ وفا اچھے تو ہو؟

۲۔ انکا عشق مجازی ہی معیار عشق بلند نہیں۔ اس رنگ میں وہ جرأت کے ہم قدم ہیں اور اکثر عریاں گوئی اور فحاشی پر اتر آتے ہیں۔ نمونہ مشتے از خروارے ملاحظہ ہو ؎

پیرہن سے تیرے بو آتی ہی خوشبو کی ظفر | ساتھ تو کون سے گل رو کے ہے سو کر آیا
آپ کا چوری سے جانا کھل گیا شاید ظفر | آج چرچا ہو رہا تھا انکے گھر والوں کے بیچ
منہ پر ہے تیرے لال دوپٹہ بوقت خواب | یا روئے مہر پر ہے شفق سے نقاب سرخ
یہ ہے ہنگام گرمی بے حجابانہ ذرا بیٹھو | قبا کے کھول دو بند اب نہ شرماؤ ہوا کھاؤ
گئے تھے کہاں دیکھے کس جا لگے ہیں | نیا کل کا اوڑھا دوشالہ بگاڑا
ہاتھ چھاتی پہ جونہی میں نے لگایا تو کہا | سخت کیا ہاتھ ہیں یہ تیرے نگوڑے پتھر
شب تو آدھی کٹ گئی خطرہ نہ لاؤ کون ہے | شوق سے آ کے پلنگ پر لیٹ جاؤ کون ہے

۳۔ محاورہ بندی میں یہ ذوق کو نہیں پاتے لیکن وہ اس میدان میں بھی عاجز نہیں ہیں۔ ذوق کا جوش وخروش اور اس کی پرکاری اور بازیگری ظفر کے پاس نہ سہی تاہم اس نے ہندی الفاظ کو اس خوبصورتی کے ساتھ برمحل استعمال کیا ہے کہ بول چال کے بے شمار الفاظ اور محاورات جو ادب العالیہ میں حقیر سمجھے جاتے تھے جزو زبان بنکر بے تکلف استعمال ہونے لگے۔ اور اس طرح ادب اردو میں بڑی وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہو گئی۔ ملاحظہ ہو ؎

الٰہی خیر ہو پکڑا گیا ہے واں قاصد | قبول دے نہ کہیں مار دھاڑ میں کاغذ
اڑ گئی صیاد اب دل سے ہوس پرواز کی | بٹھا رہنے دے قفس میں مجھکو پر چھانٹے ہوئے
مزا چکھا یا ہی کوہکن کو یہ عشق آیا جو امتحاں پر | کہ لایا تو جوئے شیر لیکن چھٹی کا دودھ آگیا زباں پر

ع۔ خون جسم ناتواں تل تل گھٹا تل تل بڑھا
رر۔ یہ وہ سودا ہے کہ ہرگز نہیں چکتا ہوگا

اب ہم اس طویل بحث کو یہاں ختم کرتے ہیں اور ظفر کی شاعری کو اسی کی جیز مسلّم طور پر
کرتے ہوئے متذکرہ بالا آرا کی روشنی میں کلام ظفر پر تبصرہ کرتے ہیں اور اس کے محاسن اور مع
کو نہایت آزادی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

خصوصیاتِ کلام ظفر

ا۔ شاہ نصیر اور ذوق دونوں ناسخ کی طرز کے دلدادہ تھے۔ ناسخ مخلوط خارجی تر
کا علمبردار تھا اور اس کا میدان فکر تخیلی تھا۔ ظاہری طمطراق۔ الفاظ کی بلند آہنگی۔ موشگا
پیچدار اور سنگلاخ زمینیں۔ کوہ کندن وکاہ برآوردن ناسخ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ ا
طویل غزلیں۔ دوغزلے سہ غزلے۔ نازک خیالی۔ اور صنایع و بدایع اور رعایاتِ لفظی کا التزا
اس کا طرۂ امتیاز۔ اظہارِ کمال کے لئے طرزِ ناسخ بہت موزوں تھی اور دہلی کے اہل کمال خو
خوب زورِ قلم دکھاتے تھے۔ ظفر کے کلام میں بھی یہ خصوصیت بہت نمایاں ہے۔ فرماتے ہیں۔

ظفر مشکل پسندی تیری سی اب کس کو آتی ہے
سخنور دیکھ کر یہ طرزِ مشکل ہاتھ ملتا ہے

چنانچہ بے لطف قافیے خشک اور طویل ردیفوں کے ساتھ نباہنے میں یہ کسی سے پیچھے نہیں رہے:

پیچ سے وہ کرتا ہے یاری بائیں اس کی پیچ کی ساری
نکلیں اس کے پیچ سے کیا ہم پیچ کے اوپر پیچ پڑا

عشق ظفر ہے گورکھ دھندا اس کے کھولے پیچ کوئی کیا
ایک کھلا تو دوسرا محکم پیچ کے اوپر پیچ پڑا

"دہن کا بوٹا" "چمن کا بوٹا" ——— "پوچھا کیا ہوا کیونکر ہوا"۔ "دیکھا کیا ہوا کیونکر ہوا
"کیونکر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر"۔ "ہاسکر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر" ——— "بھک پھر دیسی"
"پھڑک پھر دیسی ہے" ——— "نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں" ردیف اور "جا
خدائی" قافیہ۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ان مشکل ردیفوں کو ظفر ایسی استادی سے نہ نباہ سکے ہوں جس
ذوق اور شاہ نصیر نے نباہی ہیں تاہم یہ بھی مسلّم ہے کہ اکثر غزلوں میں باوجود قافیہ اور رد
کی بیحد دشواریوں کے ظفر نے نہایت بے تکلف سادہ اور صاف اشعار نکالے ہیں درحقیقت

ان کے دیوان میں تصوف پر بیشمار اشعار ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شعلہ ہے وہی شمع وہی ماہ وہی ہے | خورشید وہی نورِ سحرگاہ وہی ہے
خارا میں شرر ہے وہ ظفر لعل میں وہ رنگ | واللہ وہی سب میں ہے باللہ وہی ہے

زہے دولت بے قیاسِ فقیری | امیری ہے زیرِ لباسِ فقیری
سوال ان سے کر تو نہ دنیائے دوں کا | فقیروں سے کر التماسِ فقیری

ڈھونڈھتا ہے خدا کو تو زاہد | ہم کو قصدِ سراغ ہے اپنا

نہ دیکھا وہ کہیں جلوہ جو دیکھا خانہ دل میں | بہت مسجد میں سر مارا بہت سا ڈھونڈھا بتخانہ

وہ ہی یہاں ہے وہ ہی وہاں۔ وہ ہی عیاں ہے وہ ہی نہاں
رکھئے ہمیشہ وردِ زباں لا الٰہ الا اللہ

جدھر آنکھ پڑتی ہے تو روبرو ہے | ترا جلوہ سب میں ہے ہر جائے تو ہے
صدا پر وہ سازکی یہ نہیں ہے | کوئی پردے میں کر رہا گفتگو ہے
ظفر آپکو ڈھونڈھ مت ڈھونڈھ اسکو | وہ تجھ میں ہے جس کی تجھے جستجو ہے

اسی سلسلہ میں اُن کی ناصحانہ شان بھی قابل ذکر ہے۔ ظفر نے خاص طور پر نخوت و پندار۔ عیش و طرب اور بغض و کینہ وغیرہ کی مذمت کی ہے اور صلح و صفائی۔ عاقبت اندیشی اور عالی ہمتی و بلند حوصلگی کی تلقین کی ہے اس کے علاوہ یہ بھی بتایا ہے کہ دنیا بڑی بے اعتبار ہے اور معرفت الٰہی کا بڑا حجاب ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جو کہ ہو تجھ سے سوا تو اُسے حسرت سے نہ دیکھ | اور جو تجھ سے ہو کم اس کو حقارت سے نہ دیکھ
دیکھ تو ہمتِ عالی سے بشر کا رتبہ | مرتبہ اس کا بلندئ عمارت سے نہ دیکھ
دیکھوں کیا گلشنِ ہستی کو کہ کہتی ہے خزاں | تو بہار اس کی بہت مجھکو فرصت سے نہ دیکھ
زالِ دنیا تجھے سو جلوے عروسانہ دکھائے | ہے جوانمرد اگر تو اسے رغبت سے نہ دیکھ

دیکھ آئینہ صفت ساتھ صفائی کے ہمیں
روششِ کینہ و آئینِ کدورت سے نہ دیکھ

پھر گیا منہ ترا عقبیٰ سے کہ جب دُنیا نے | اک طمانچہ ہوسِ عیش و طرب کا مارا

ع۔ آج دھوکا دے کے مجھ کو کیا ہوا چمپت بنا
ظفر کی زبان کا لطف ذیل کے اشعار سے لیجئے ؎

صبح رو رو کے شام ہوتی ہے — شب تڑپ کر تمام ہوتی ہے
کوئی غنچہ کھلا کر بلبل کو — بے کلی زیرِ دام ہوتی ہے

بوسہ مانگا تو کہا بس چلو یاں سے نکلو — منہ لگایا تمہیں کیا تم تو ظفر چل نکلے

ہو گئے پتھر مرے نالوں کی بابی لے ظفر — اس کو کہتے ہیں اثر تاثیر اس کا نام ہے

کھلکھلا کر ہنسے گلشن میں ہزاروں غنچے — دل ہمارا خوش و خرم نہ ہوا پر نہ ہوا

نہ بزمِ غم سے غرض ہے نہ بزمِ شادی سے — جہاں میں کام ہے رونے سے شمع وار مجھے

اثنا نہ اپنے جامے سے باہر نکل کے چل — دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل

ہیں یہاں رنج کے آثار خوشی کے باعث — اشک آنکھوں سے ٹپکتے ہیں اسی کے باعث

تم جو غصہ ہو تو غصہ مرے سر آنکھوں پر — پر بشرطیکہ نہ ہو اور کسی کے باعث

۴۔ ظفر تصوف کی چاشنی سے بھی آشنا ہیں۔ اور ان کی پرہیزگاری اور دیندار کا اعتراف بعض ہم عصر شعرا نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ رند کہتا ہے ؎

ناغہ ہو جائے ذکر کیا ہے — قرآنِ ابو ظفر بہادر

غالب نے دیباچۂ مہر نیمروز میں لکھا ہے ؎

شبلی از منبر دہد آوازِ عشق — شاہِ ما بر تخت گوید رازِ عشق
شاہِ ما دارد بہم در رہروی — خرقۂ پیری و تاجِ قیصری
شاہی و درویشی اینجا باہم است — بادشاہِ عہد قطبِ عالم است

غالب نے ایک مشہور قطعہ تہنیت میں بھی ان کی دینداری کا اعتراف کیا ہے ؎

کیوں نہ ہو خلق کو خوشی غالب
شاہِ دیندار نے شفا پائی

ظفر مولانا قطب الدین رح خلفِ مولانا فخر الدین رح دہلوی کے مرید تھے اور تمام عمر اسلسلہ کی غلامی پر فخر کرتے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

مریدِ قطبِ دیں ہوں خاکِ پائے فخرِ دیں ہوں میں — اگرچہ شاہ ہوں ان کا غلامِ کمتریں ہوں میں
بہادر شاہ میرا نام ہے مشہور عالم میں — ولیکن اے ظفر ان کا گدائے رہ نشیں ہوں میں

یہ حسرت اُن کے دل کی دل ہی میں رہجائے گی اور اُن کے ساتھ جائے گی۔
مناجات کا یہ سادہ اور پُر خلوص انداز ملاحظہ ہو ؎

ظفرؔ کو باز رکھ اعمالِ بد سے   خطابخشا۔ گنہگارا۔ الٰہا
صرفت العمر فی لہو و لعب   فآھا۔ ثم آھا۔ ثم آھا

۶۔ ظفرؔ کے کلام میں افسردگی کا پہلو بہت نمایاں ہے تاہم اس کا وہ کلام جو فرطِ انبساط سے لبریز ہے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ظفرؔ نے خود اپنی زندگی کے تین ادوار قائم کیے ہیں قطعہ ؎

پڑھتا ہوں ایک مطلع و مقطع میں حسب حال   دیکھے تماشے میں نے جو ملکِ وجود کے
اک دن وہ تھا کہ ٹوٹے نہ تھے دانت دودھ کے   پھر یہ ہوا گزرنے لگی کھیل کود کے
اب حال یہ ہے عالم پیری میں اے ظفرؔ   باقی نہیں حواس ہیں گفت و شنود کے

پہلا دور یہاں قابلِ ذکر نہیں ہے۔ دوسرا دور شاید شاہ عالم ثانی کی حیات تک یا اس کے کچھ اور بعد تک قائم رہا ہو۔ ظفرؔ یوں تو دنیا کے انقلابات عالمِ طفولیت ہی سے مشاہدہ کر رہے تھے اور جاٹوں اور مرہٹوں وغیرہ کے ہاتھوں خاندان کی ناموس لٹی اور سلطنت کا وقار رخصت ہوتا دیکھ رہے تھے لیکن خود ان کے سر پر مصیبتوں کا نزول اس وقت سے شروع ہوا جب اکبر شاہ نے ان کو اپنی ولدیت سے خارج کر دیا اور ولیعہدی کا قصہ چھڑا ہوا تھا۔ اس قطعہ میں جس عالمِ پیری کا ذکر ظفرؔ نے کیا ہے وہ شاید چالیس سال کی عمر سے شروع ہو گیا تھا۔ یہاں جو عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ظفرؔ کے دوسرے دور کی شاعری نہایت شگفتہ اور افسردگی اور پژمردگی سے کوسوں دور نظر آتی ہے۔ مثلاً ؎

چمن میں ابر و گُل ہو پھر تو چلیں ہوں تماشہ ہو   نشے میں رشکِ گُل ہو پھر تو چلیں ہاں تماشہ ہو
کنارِ آب ہو۔ مہتاب ہو۔ ساغر ہو۔ مینا ہو   جو یہ سامانِ گُل ہو پھر تو چلیں ہوں تماشہ ہو
رباب و چنگ ہو۔ بزم طرب ہو اور مطرب ہو   دف سُنے ہو دُہل ہو پھر تو چلیں ہوں تماشہ ہو
بہیں گے اس قدر باہم نشے کو ہو رہے یہ عالم   حیا کا اپنی قتل ہو پھر تو چلیں ہوں تماشہ ہو

ہوا ٹھنڈی ہو۔ آدھی رات ہو۔ بادہ ہو یا ہم ہوں
چراغ اس وقت گُل ہو پھر تو چلیں ہوں تماشہ ہو

یا یہ دیکھیے ؎ کھوں کیا رنگ اس گُل کا اہاہا ہاہا ہا   ہوا رنگیں چمن سارا اہاہا ہا ہا ہا
ظفرؔ کیا خوب ہے عالم طبیعت کی روانی کا   ہے اک آمد ہوا دریا اہاہا ہا ہا ہا

آمانہ اپنے جامے سے باہر نکل کے چل ۔ دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل
کم ظرف پُر غرور ذرا اپنا ظرف دیکھ مانندِ جوشِ خُم نہ زیادہ اُبل کے چل
یہ غول وشس ہیں ان کو سمجھ تو نہ رہنما سایہ سے بچ کے اہلِ فریب و دغل کے چل
انساں کو کل کا پتلا بنایا ہے اس نے آپ اور آپ ہی وہ کہتا ہے پتلے کو کل کے چل

پھر آنکھیں بھی تو دی ہیں کہ رکھ دیکھ کر قدم
کہتا ہے کون تجھ سے نہ چل ۔ چل سنبھل کے چل

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

غافلو اس اپنی ہستی پر کہ ہے نقش بر آب موج کی مانند کیوں پھرتے ہو بل کھاتے ہوئے

۵۔ ظفر کی شاعری میں بہت سے اشعار ان کے مذہبی جذبات اور عقیدت پر بھی ملتے ہیں خود اس پر یوں ناز فرماتے ہیں ؎

ظفر مضمونِ حمد و نعت کے گلہائے رنگیں سے ورق میرے سر دیوان کا ہی اک باغ رضواں کا

لیکن مومن خاں کی طرح ظفر نے دوسروں کے معتقدات پر حملے نہیں کئے ہیں اور تعصب سے کام نہیں لیا ہے۔ بلکہ ان کے کلام میں صرف اپنے جوشِ عقیدت کا اظہار ہے۔ یہاں ظفر کے کلام کی اس مخصوص خصوصیت کو علحدہ کر کے بیان کرنے کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ ظفر کے زمانۂ حیات ہی میں یہ افواہ اڑا دی گئی تھی کہ وہ شیعہ ہو گئے ہیں اور انھوں نے نہایت پُر زور طریقہ پر اُس کی تردید کی تھی ۔ چنانچہ ایک ترجیع بند میں کہتے ہیں ؎

تھا ابو بکرؓ یارِ غارِ نبیؐ تھا عمرؓ گرم کاروبارِ نبیؐ
اور عثمانؓ جاں نثارِ نبیؐ اور علیؓ وہ کہ رازدارِ نبیؐ

میرا حامی ہے پیشوا ہے علیؓ
میرے ہر درد کی دوا ہے علیؓ

ایک جگہ اپنے جوشِ عقیدت میں یوں تمنا کرتے ہیں ؎

ہم جو کعبہ جائیں گے تو واں ہو کر لے ظفر پھر مدینے کو نجف کو کربلا کو جائیں گے

لیکن وہ کیا جانتے تھے کہ دہلی چھوڑیں گے تو بجائے مغرب کے مشرق کا سفر اختیار کریں گے اور رنگون میں جا کر بے کسی اور کس مپرسی کے عالم میں زندگی کے آخری دن بسر کر رہے ہوں گے ۔

اُس دَور کے اشعار دل کی گہرائیوں کے تاثرات کے آئینہ دار ہیں مگر پھر بھی اظہارِ غم و رنج کو یہ اپنے لئے کسرِ شان سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں ؎

شعرا فسردہ ظفر کے مت سناؤ بزم میں
عشق کے مارے ہوئے جتنے ہیں افسردہ سے ہیں

پھر دیکھئے ؎

ظفر کہتے ہو کیا دل کی حقیقت
کسی محرم سے جو گزرے سو گزرے

تاہم اُن کے اُس دَور کے اشعار میں کثرت سے ایسے اشعار ہیں جو جگ بیتی کے نہیں آپ بیتی کے ترجمان ہیں اور جن میں ایک اشارہ اور ایک کنایہ کا پہلو ہے جس پر غور کیا جائے تو ہر شعر عبرت کی ایک جیتی جاگتی تصویر اور دوستوں کی بے وفائی اور بدعہدی اور غداری کا نوحہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

دوست اپنے ہوئے ظفر دشمن
اس مصیبت کو کون پہچانے

ہیں لوگ دغاباز ہوئے گرد ہمارے
محفوظ خدا رکھے ظفر ان کی دغا سے

دیتے ہیں توڑ کے ٹکڑا سا مجھے صاف جواب
اے ظفر کھا کے پلے جو مرے گھر کے ٹکڑے

پیچھے سنتے کاش کیا کیا اے ظفر کہتے ہیں وہ
کرتے ہیں جو آ کے اظہارِ محبت روبرو

ظفر ڈر اُن سے کہ ہے جن کے شیطنت دل میں
اور ان کی باتیں بظاہر غریب کی سی ہیں

کسی کو لکھتے تھے خط وہ پلنگ پر بیٹھے
مجھے جو دیکھا چھپایا تو اطلس کا غذ

ہم سے ہر بات پہ اکھڑے ہی تو یوں اے ظالم
نہیں معلوم مجھے غیر نے کیا دل کر گا تھا

ملتے ہیں ہم سے پہ ہیں دل میں عداوت رکھتے
جانتے ہم تو نہ ایسوں سے محبت رکھتے

کیا جو تم نے میرے ساتھ اپنے دل سے وہ پوچھو
مجھے ہر چپ ہی تم اپنے دکھلاتے زباں کیوں ہو

اور ایک موقع پر تو ایک مسلسل قطعہ لکھ کر دل کی بھڑاس اچھی طرح نکالی ہے اور جلے پھپھولے توڑے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

جتنی جتنی لوگ جتاتے اپنی یاری منہ سے ہیں
اتنی ان کی ہم بھی کرتے خاطر داری منہ سے ہیں

منہ کے میٹھے دل کے کڑوے اہلِ دنیا دیکھ لئے
جھوٹی جھوٹی کرتے خوشامد آکے ہماری منہ سے ہیں

دل میں بھرے ہیں اِنکے لاکھوں بغض و عداوت کین و نفاق
کرتے ظاہر اپنی الفت اور غمخواری منہ سے ہیں

کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں ڈرتے رہئے ان سے ظفر
دشمن جاں ہیں دل سے کرتے ظاہر داری منہ سے تا بیا

ایک شعر یہ ہے ؎

عجب روش سے انھیں ہم گلے لگا کے ہنسے — کہ گل تمام گلستاں کے کھلکھلا کے ہنسے

اسی دور کی یادگار ان کی ایک غزل یہ بھی ہے ؎

جام ہے شیشہ ہے ساقی بھی ہے برسات بھی ہے — ان دنوں بادہ کشی دن بھی ہے اور رات بھی

کچھ تو ہے اپنی طرف سے طلب ساغر مے — اور ساقی کی کچھ امداد و مدارات بھی

شیشہ خالی ہو تو خم پاس دھرا ہے لبریز — خم جو خالی ہو تو نزدیک خرابات بھی

جوشش مستی بھی ہے ہنگام ہم آغوشی بھی — خواہش وصل بھی ہے جائے ملاقات بھی

ساز و مطرب بھی ہے نغمہ بھی ہے اور رقص بھی ہے — ساتھ ہر تار کے آنکھوں سے اشارات بھی،

وہ بھی سرمست ہے اور ہم بھی نشے میں سرشار — ہاتھ گردن میں ہے اور لطف و عنایات بھی

یار کے ہے ساتھ ظفر بوس و کنار

اور اگر چاہیئے کچھ بات تو وہ بات بھی ہے

اس کے علاوہ مرغ بازی اور بٹیر بازی کا بھی ذکر اکثر اشعار میں موجود ہے۔ مرغ با
چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

رہے ہے پر خلش دشمن دم جنگ — نہیں یہ مرغ لڑتا کھل کے کانٹے

ابھی ہونے کا نہیں لڑنے کو تیار عدو — پھڑکے یہ مرغ تو دو چار برس میں پھڑکے

موسم گل کی خبر سن کے قفس میں صیاد — آکے کریال میں ہر مرغ خوش آہنگ کھلا

بٹیر پر بھی متعدد اشعار ہیں اور ایک تو پورا قطعہ ہی بٹیر کی ردیف کے ساتھ لکھ دیا۔
جس کا مطلع ہے ؎

ایسے شاہین بھٹے ہیں مرے تیار بٹیر — ماریں شاہیں کو اڑا کر یہ جگر دار بٹیر

یہ وہ زمانہ تھا جو نسبتاً بے فکری اور خوشی کا زمانہ تھا۔ پھر وہ وقت آیا کہ فرمانے لگے ؎

بجز خون دل محزوں بجز چشم و دل پرخوں — نہ پاس اپنے مے گلگوں نہ ساغر ہی نہ صہبا ہی

ظفر میخانۂ عالم میں ہم کو ایک مدت سے — نہ مستی کی ہوس نے مے پرستی کی تمنا ہی

پیہم آلام و مصائب کا وہ تانتا بندھا کہ الامان الحفیظ۔ سلطنت کا دیا تو بتدریج گھٹتا ہی جاتا تھا
یہ نوبت آئی کہ تاج و تخت بھی گیا۔ قید ہوئے اور جلا وطن ہو کر رنگون بھیجے گئے۔ بقول غالب ؎

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل — انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

بلند رکھتا ہے اور کہتا ہے ؎

منزلِ عشق بہت دُور ہے اللہ اللہ　　ایک ہی گام میں تم تھک کے ظفرؔ بیٹھ گئے

جس کی مصیبتوں کی کوئی حد نہ رہی ہو اور جس کے حق میں یہ شعر بالکل صادق آتا ہو کہ ؎

بیاں کیجے اگر احوال اپنی شامِ غربت کا　　گریباں تا بدامن چاک ہو صبحِ قیامت کا

وہ اپنی ہمت اتنی بلند اور ارادہ اتنا قوی رکھے اور تسلیم و رضا سے منہ نہ موڑے اور اس کے قلم سے پھر بھی ایسے شعر نکلیں ؎

بلا سے جاہ و حشم ہو تو ہو نہ ہو تو نہ ہو　　نہیں ہے ہم کو بھی غم ہو تو ہو نہ ہو تو نہ ہو

اس کو افسردہ دل کہنا صریح ناانصافی ہے۔ اس کے اشعار سے یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ اظہارِ غم نہیں چاہتا اور کسی کے آگے اپنا قصۂ غم چھیڑنا بھی کسرِ شان سمجھتا ہے لیکن کیا وہ اپنے قلبی تاثرات دنیا کے سامنے پیش بھی نہ کرے اور دنیا والوں کو درسِ عبرت نہ دے۔ وہ اپنا دکھڑا نہیں روتا۔ وہ کسی سے چارۂ غم کی اپیل بھی نہیں کرتا لیکن وہ شاعر ہے اور جو اس پر گزرتی ہے اسے بے کم و کاست بیان کرتا ہے۔ اگر وہ بادشاہ نہ ہوتا تو صوفی ہوتا اور اس حیثیت سے بھی دنیا کی بے ثباتی اور بے اعتباری اور دوستوں کی بدعہدی اور بیوفائی سے دنیا والوں کو خبردار کرتا۔ لیکن وہ بادشاہ ہے اور پھر ایسا بادشاہ کہ ع

طبل و علم ہے پاس نہ اپنے نہ ملک و مال

اور اپنی اس حالت کو خود یوں بیان کرتا ہے ؎

مُہرۂ شطرنج شہ اپنی ظفرؔ ہے کیا بساط　　کرتا ہے وہ آپ پر دو مات اپنے ہاتھ سے

پھر اس کے قلم سے یہ قطعہ ملاحظہ ہو کس قدر حسبِ حال اور عبرت آموز ہے ؎

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا　　یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

خاکساری کے لئے گرچہ بنایا تھا مجھے　　کاش سنگِ درِ جانانہ بنایا ہوتا

تھا جلانا ہی اگر دُوریٔ ساقی سے مجھے　　تو چراغِ رہِ میخانہ بنایا ہوتا

صوفیوں کے جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے　　قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفرؔ

ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

یہ اشعار ایک مخصوص شخص کے حادثاتِ زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں اور انکا انحصار

انگریزوں کے ہاتھوں انھیں جو صدمات پہنچے اُن کے ذو معنی قول و پیماں اور اپنی بے
وغیرہ کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

اب جو لکھتا ہے وہ کاہے کو یہ لکھتا تھا کبھی
دیکھ لو اُس بتِ بے پیر کا اگلا کاغذ

بھیجتے تھے خط ہمیں پہلے وہ جس عنوان سے
اب تو اک مدت سے وہ عنوان بھی جاتا رہا

ہم ان کے گھر میں کیا جائیں اور ان کے پاس کیا بیٹھیں
نہ غمازی ہمیں آتی ہے نے جاسوسی آتی —

گزارا اے ظفر واں تو انھیں لوگوں کا ہوتا ہے
کہ جن کو چاپلوسی اور کانا پھوسی آتی —

جہاں چمن میں نشیمن تھے بلبلوں کے ظفر
ہزار حیف وہاں آشیانِ زاغ بنے

نہ تنگ کیوں ہمیں صیاد یوں قفس میں کرے
خدا کسی کو کسی کے یہاں نہ بس میں کرے

ایک بندِ شہر آشوب میں لکھتے ہیں ؎

جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھر یاں تھے
شغال اب ہیں جہاں بستے کبھی رہتے بشر یاں تھے

جہاں اب خاک پر ہیں نقش پائے آہوئے صحرا
کبھی محو تماشا دیدۂ اہل نظر یاں تھے

جہاں اٹھتے بگولے ہیں اڑاتے خاک صحرا میں
کبھی اڑتی تھی دولت رقص کرتے سیم بر یاں تھے

ظفر احوال عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا بیشتر یاں تھے

چند اشعار اور سنیے ؎

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

مرا عیش مجھ سے بچھڑ گیا۔ مرا رنگ روپ بگڑ گیا
جو چمن خزاں سے اجڑ گیا میں اسی کی فصلِ بہار ہوں

میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا مجھے سن کے کوئی کریگا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا کسی دل جلے کی پکار ہوں

اس تاریخی ماحول کے پیش نظر جس میں ظفر نے آنکھیں کھولیں اور آخری سانس لیا مندرجہ
اشعار میں سے ہر ایک شعر کسی نہ کسی خاص واقعۂ زندگی کی طرف اشارہ کرتا ہوا نظر آتا ہے اور اگر
اس خاص واقعہ کی روشنی میں اس شعر پر غور کیا جائے تو اس سوز و گداز کو جو اس شعر میں پایا
جاتا ہے ظفر کی افسردگی اور محض قنوطیت پر محمول کرنے کے بجائے یہ زیادہ مناسب ہوگا اگر اسے
اندرونی جذبات کا مرقع کہا جائے اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ غیر ممکن تھا کہ اتنے آلام اور مصائب کی
پیہم بارش کے بعد اس کے اشعار میں اس کی کیفیات دلی کا اظہار نہ ہوتا پھر بھی وہ اپنی ہمت

ایسی فاش غلطیاں اس میں ہرگز نہ ہوتیں۔

۲۔ معاملہ بندی اور وقوع گوئی میں ظفر ابتذال سے گزر کر فحاش گوئی تک پہنچ جاتے ہیں جیسا اوپر مثالوں کے ذریعہ واضح کیا جا چکا ہے۔ معاملہ بندی ذوق کے یہاں بھی ہے لیکن ابتذال فحاش گوئی اور عریانی سے ذوق کا کلام یکسر پاک ہے۔ یہ بھی ایک دلیل ہو سکتی ہے کہ ظفر کا کلام خود اپنا کلام ہے۔

۳۔ رعایتِ لفظی اور صنایع اور بدایع کا التزام ظفر کے دیوان میں بہت نمایاں ہے پھر بھی ظفر اس پر اتنا زور صرف نہیں کرتا جتنا ذوق کرتے ہیں اور یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ذوق کی بندش اکثر نہایت چست اور استادانہ ہوتی ہے اور ظفر کی بندشیں اکثر سست اور بعض بہت سست ہوتی ہیں اور ان سست بندشوں کو ذوق کی طرف منسوب کرنے سے بھی ذوق کی استادی اور اس کے کمالِ فن پر حرف آتا ہے۔

۴۔ ظفر کا کلام بوجہ بسیار گوئی اس عیب سے محفوظ نہ رہ سکا کہ اس میں رطب و یابس سبھی کچھ ہے۔ اگر ان کے چار ضخیم دیوانوں کا انتخاب کیا جائے تو غالباً نہیں یقیناً ایک ایسا دیوان تیار ہو سکتا ہے جو ظفر کے شایانِ شان ہو اور کلام الملوک ملوک الکلام کا مصداق ہو سکے۔

۵۔ گو وہ اکثر سنگلاخ زمینوں اور مشکل اور طویل ردیفوں کو ذوق اور شاہ نصیر سے اس اعتبار سے بہتر نباہتے ہیں کہ ان میں برجستگی اور بے ساختگی کی شان باقی رہے اور معنی کا بھی خون نہ ہو۔ تاہم کبھی کبھی وہ الفاظ سے بھی کھیلتے رہ جاتے ہیں۔ عامیانہ اور سوقیانہ انداز پیدا ہو جاتا ہے اور بندش بہت سست رہ جاتی ہے۔ مثلاً چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کبھی مژہ کی جو نخجتِ دل خراب میں سیخ	دکھائی دی وہ پرو دئی ہوئی کباب میں سیخ
کباب واسطے اس خوش دماغ کے نہ لگائے	نہ دھولے پہلے کبابی اگر گلاب میں سیخ
دیا نہ یار نے بوسہ ہمیں جو بے تکرار	ظفر نہ دل بھی اسے ہم نے بے جمیل دیا
نظر کیوں ہم سے اپنی کرکے وہ چھل بل چراتے ہیں	کہ زیر تیغ دم کب ہم سمِ مقتل چراتے ہیں
جفا کی آپ کی باعث وفا ہماری ہے	خطا تمہاری نہیں ہے خطا ہماری ہے

شاعر کی واردات قلبی پر ہے اور اس طرح یہ مرقعات غم ذوق کے جذبات غم سے بالکل الگ ہیں جن کے سینے میں بقول آزاد ایک آدمی کا دل نہ تھا ہزاروں آدمیوں کے دل تھے اور جو اپنے جذبات کی اور اپنے محسوسات کی ترجمانی کرنے کے بجائے ہزاروں آدمیوں کے دلوں کی کیفیات کی مصوری کیا کرتے تھے۔

ظفر کا مقصد ہندستوں کو رلانا نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف وہ باوجود انتہائی غم و آلام کا شکار ہونے کے اپنا سر اونچا رکھتے ہیں اور رضا و تسلیم کا درس دیتے ہیں اور یہ وہی کر سکتا ہے جو فطرۃً مردہ دل اور کم ہمت نہ ہو اور جس کی طبیعت پر غم و آلام کا غلبہ نہ ہو۔ اس مخصوص شاعری کا ظفر کے کلام میں نمایاں طور پر پایا جانا بھی اس امر کی ایک بین اور واضح دلیل ہے کہ ظفر بالخصوص اس انداز کی شاعری ظفر کی اپنی شاعری ہے اور یہ کلام ظفر کا اپنا کلام ہے اور اسے کسی عنوان ذوق یا کسی اور کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

ہم ظفر کی خصوصیات کلام پر سیر حاصل بحث تو نہ کر سکے تاہم جو کچھ کہا گیا ہے اس مختصر مبحث کے لئے کافی ہے۔ اب ہم اُس کے نقائص پر بھی ایک نظر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتے۔

نقائص کلام ظفر

۱۔ ظفر زبان قدیم اور متروکات پر اصرار کرتے ہیں اور ان کے دیوان میں اکثر الفاظ و محاورہ عام کے خلاف استعمال ہوتے ہیں سے

خوں جو آیا جوش پر بعد از شہادت کے مری
بن گیا سر آخر شس کو متصل دھڑ کے حباب

اِس تت کے امیروں سے ہو گا ہوا شیق
شاہجہان و شاہ جہانگیر کا خواص

کہنے بھی لگے اب شعر کہنے کیا تماشا ہے
کہ مضموں بندی اِن روزوں بہیر بندی لگی ہے

دیکھ روتے جو مجھے آیا ظفر رحم اسے
ہنس کے وہ میرے گلے زور ہنسن سے لپٹ

اس کے علاوہ تک۔ لوہو۔ گیلاس وغیرہ الفاظ کثرت سے استعمال کئے ہیں جن کی فہرست بہت طولانی ہو سکتی ہے اور یہ الفاظ خود ظفر کے معاصرین کے کلام میں خال خال استعمال ہوئے ہیں ـــ مومن اور غالب کے یہاں تو نظر ہی نہیں آتے۔ اور پھر اکثر الفاظ غلط استعمال ہوئے ہیں یہ کلام ظفر کا ایک بڑا نقص سہی تاہم یہ ظفر کے لئے اس طرح بہت مفید ہے کہ خود یہ امر اس کی ایک قوی دلیل ہو سکتا ہے کہ ظفر کا کلام متاع بردہ نہیں ہے کیونکہ اگر یہ کلام ذوق کا کلام ہوتا

کھولیں اور جب تک ظفر کی نگاہِ التفات اس کی طرف متوجہ نہ ہوئی یہ گوشۂ گمنامی میں رہا اور دنیا نے اسے نہ پہچانا۔ اِسی نیم روز کی ایک نگہِ التفات نے غالب کو چمکایا اور پھر ظفر کے خورشید اقبال کے زوال کے بعد سلطنتِ مغلیہ کا یہی آخری خوشہ چیں تھا جس نے اُردو شاعری کو چار چاند لگائے۔ اور نظم و نثر میں اپنی راہ الگ نکالی جو اپنے طرز کی انوکھی اور نرالی شان رکھتی تھی۔ اُردو شاعری کا یہ زرّیں عہد ظفر ہی کی سخن پروری سخن سنجی اور قدر دانی کا مرہونِ منت ہے۔

ظفر کے کلام کے محاسن اور معائب پر نظر کرتے ہوئے ہم نہایت انصاف سے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ظفر اُردو کا بہت اچھا شاعر تھا۔

ظفر کے دیوانوں میں ہر طرح کے اشعار ملتے ہیں۔ لیکن خاص بات جو قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ ان سب میں ایک طرح کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ رُباعی ہو۔ مرثیہ ہو۔ قصیدہ ہو۔ حمد ہو۔ نعت ہو۔ قطعہ ہو یا غزل ہو پھر خواہ وہ خمسہ ہو۔ مثلث ہو۔ ترجیع بند ہو یا مستزاد ہو کچھ بھی ہو۔ ظفر کی مخصوص شخصیت ہر انداز بیان میں نمایاں طور پر جھلکتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ذوق کی طرح اُس کا دیوان "ایک گلدستۂ گلہائے رنگا رنگ کا تھا" جس میں سے "بوقلموں آوازیں آتی تھیں"۔ حضرتِ آزاد کے نزدیک اِس سے ذوق کا کمال ظاہر ہوتا ہوگا اور اسکی قادرالکلامی کی سند ملتی ہوگی مگر ہمارے نزدیک اس ہر سو خرامی سے پختگی پر حرف آتا ہے۔ ہمارے خیال میں تو ظفر کی یکسانیت اس کی شاعری کی ایک اعلیٰ خصوصیت ہے اور اسکی پختہ کاری کا بیّن ثبوت ہے۔ بحیثیتِ مجموعی ہم ظفر کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ اگر بقائے دوام کے دربار میں اس کو ذوق سے زیادہ ممتاز جگہ پر کرسی دیجائے تو ظفر کے ساتھ کوئی رعایت نہیں عین انصاف ہوگا۔

(حسن عبداللہ)

ایک ضروری گزارش

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے "کانفرنس بک ڈپو" کے نام سے ایک شعبہ تجارتی کتب خانہ کا بھی قائم کیا ہے جس میں دورِ حاضرہ کے تقریباً تمام اُردو مصنفین کی کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ کانفرنس نے خود بھی بہت سی کتابیں تصنیف و تالیف کرائی ہیں۔ یہ کتابیں بھی اس شعبہ میں فروخت ہوتی ہیں۔ یہ شعبہ اس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ اس سے جس قدر آمدنی ہو وہ مسلمانوں کے تعلیمی اور علمی کاموں میں صَرف کی جائے۔ اس لئے اس شعبہ کو آپ کی سرپرستی کی ضرورت ہے۔ ان خصوص میں آپ ہمیشہ کانفرنس بک ڈپو کو یاد فرمایا کریں۔ فہرست کتب مفت طلب فرمائیے۔

منیجر کانفرنس بک ڈپو سلطان جہاں منزل علی گڑھ

ظفر بادشاہ تھا۔ صوفی تھا۔ اہلِ زبان تھا۔ پاکباز تھا۔ اور پہلو میں ایک دردمند دل رکھتا تھا اور اُس کی شخصیت کا ہر پہلو اس کے کلام میں نمایاں ہے۔ ظفر کے دیوانوں میں نعت اور سلام میں جو قصائد ہیں بہت خوب ہیں۔ علاوہ ایشیائی رسمی خوبیوں کے جو اِن میں کمال موجود ہیں ایک خوبی ایسی بھی پائی جاتی ہے جو ذوق کے قصائد میں ڈھونڈھے سے نہیں ملتی اور وہ خوبی "خلوص" ہے۔ ایک نعتیہ قصیدے کے چند اشعار نمونتہً ملاحظہ ہوں ؎

اے سرورِ دو کون۔ شہنشاہِ ذوی الکرم | سرخیلِ مرسلیں و شفاعت گر اُمم
تو واں سر براوجِ رسالت پہ جلوہ گر | آدم جہاں ہنوز پسِ پردۂ عدم
وَالّیل تیرے گیسوئے مشکیں کی ہے ثنا | والشمس تیرے روئے منور کی ہے قسم
محروم تیرے دستِ مبارک سے رہ گیا | کیونکر نہ چاک اپنا گریباں کرے قلم

ہوتا کبھی نہ قالبِ خاکی میں نفخِ رُوح
بھرتا اگر نہ دعویٰ محبت کا تیری دم

آخر میں دعائیہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تیری جنابِ پاک میں ہے یہ ظفر کی عرض | صدقے سے اپنی آل کے اے شاہِ محتشم
صیقل سے اپنے لطف و عنایت کے دُور کر | آئینۂ ضمیر سے میرے غبارِ غم
پہنچا نہ آستانِ مقدس کو تیرے میں | اس غم سے مثلِ چشمہ ہوئی میری چشم نم

ہر خاکِ آستاں کو تری اپنی چشم میں
کرتا ہوں سرمہ مثلِ تصوّر رہے دم بدم

یہ وہ قصیدہ ہے جسے منشی کریم الدین صاحب نے اس مرتبہ کا سمجھا تھا کہ اپنے مشہور تذکرہ "طبقاتِ شعرائے ہند" میں ظفر کا ذکر کرتے ہوئے درج کرنا مناسب تصور کیا تھا۔ اور موصوف نے اسے بہادر شاہ ظفر کا تصنیف کردہ قصیدہ کہہ کر پیش کیا ہے۔ اور اس کی تصنیف کا حق بھی ظفر محفوظ کرتے ہوئے اس قصیدے کے ذوق کی طرف منسوب کئے جانے کے جملہ در بند کر دیے ہیں۔

ظفر کا عہد اردو شاعری کا نصف النہار تھا۔ نصیر۔ ذوق۔ مومن وغیرہ جیسے درخشندہ ستارے اسی عہد میں طلوع ہوئے اور انھوں نے اپنی آب وتاب سے دنیائے شاعری کو منور کیا اور ظفر کے دیکھتے ہی دیکھتے غروب ہو گئے۔ غالب نے بھی ظفر ہی کے سایۂ عاطفت میں آ

ثابت ہوتا ہے کہ ضعفِ پیری کی وجہ سے غالب نے فارسی میں خط لکھنا ترک کر دیا تھا۔ اُردو میں پہلے پہل کب خط لکھا اور کیوں لکھا اس کے متعلق کسی نتیجے پر پہنچنے میں اس سے مطلق مدد نہیں ملتی۔ حالی کا یہ دعویٰ کہ اُردو میں خط لکھنا شروع کیا جب وہ مہرنیم روز کی تصنیف میں مصروف تھے محض قیاس پر مبنی ہے اور کوئی ایسی روایت جو اس کی مؤید ہو موجود نہیں۔ اس سے قطعِ نظر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب بہ ظاہر مہرنیم روز کی تصنیف اوائل[51] ۱۸۵۰ء سے شروع ہوئی تو حالی نے یہ کیوں لکھا کہ غالب غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اردو میں خط لکھنے لگے ہیں۔ یہ سوال بھی جواب طلب ہے کہ حالی کی ہمیشہ سے کیا مراد ہے۔ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ۱۸۵۰ء تک غالب نے کبھی اُردو میں خط لکھا ہی نہیں، یا ان کا یہ مطلب ہے کہ عموماً فارسی میں لیکن کبھی کبھی اُردو میں بھی لکھا کرتے تھے۔ حالی نے یادگارِ غالب میں ایک جگہ ہمیشہ[52] کو عموماً کے معنی میں استعمال کیا ہے، لیکن اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اس موقع پر بھی اُن کا یہی مطلب ہو۔ ایک بات اور بھی قابلِ توجہ ہے۔ اقتباس بالا میں شاید[53] ہی کوئی بات حالی نے قطعی طور پر کہی ہو۔ معلوم ہوتا ہے "غالباً" "قیاس چاہتا ہے" اور اس قسم کے دوسرے الفاظ جابجا ملتے ہیں۔

غلام رسول صاحب مہر کی رائے[54] ہیں "غالب ۱۸۵۰ء سے قبل اُردو میں خط و کتابت شروع کر چکے تھے لیکن چونکہ اُس زمانے میں اُردو نثر کو اہلِ علم بلند پایہ نہیں دیتے تھے، اس لئے وہ خط محفوظ نہ رہ سکے۔ لیکن جیسے جیسے اردو کا رواج بڑھتا گیا اور فارسی کا رواج کم ہوتا گیا،

---

[51] مہرنیم روز - کلیاتِ نثرِ غالب طبع اوّل صفحہ ۱۳۲

[52] "ان کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا۔ ہمیشہ کرائے کی کتابیں منگوا لیتے تھے اور اُن کو دیکھ کر واپس کر دیتے تھے" یادگارِ غالب شائع کردہ دائرۂ ادبیہ صفحہ ۹۶، اسی کتاب میں صفحہ ۱۹ پر "کبھی کوئی کتاب نہیں خریدتے تھے۔ الّا ماشاءاللہ"

[53] نادر خطوطِ غالب مرتبہ جناب رسا ہمدانی میں مرتب نے بدر دادا، کرامت کے نام کا ایک خط ہے۔ جناب رسا مقدمۂ نادر خطوط صفحہ ۱۲ تا ۱۵ میں لکھتے ہیں کہ یہ پہلا خط اردو کا ہے (یہ اور کرامت کے نام کے دوسرے خط جعلی ہیں۔ تبصرہ نادر خطوط نوشتۂ راقم جنوری ۱۹۴۳ء کے معاصر ندیم میں ملاحظہ ہو) بعد کو اپنے ایک مضمون میں جو اپریل ۱۹۴۴ء کے ندیم میں چھپا ہے، بغیر کسی ثبوت کے انھوں نے یہ لکھا ہے کہ یہ خط جو کہ جنوری ۱۸۴۸ء کا ہے، حالی کی نظر سے گزرا تھا اور حالی نے اسی کو دیکھ کر یادگارِ غالب میں تحریر کیا تھا کہ اردو میں خط و کتابت ۱۸۵۰ء کے بعد سے شروع ہوئی۔

[54] طبع ثانی میں مہر صاحب نے اپنی رائے میں ترمیم کی ہے۔

(از جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹرایٹ لا پٹنہ)

غالب نے اردو میں خط وکتابت کب سے شروع کی؟ اس سوال کا جواب سب سے پہلے حالی کی یادگارِ غالب' میں تلاش کرنا چاہئے۔ حالی لکھتے ہیں :-

''معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط وکتابت کرتے تھے۔ مگر سنہ مذکور میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کئے گئے اور ہمہ تن مہرنیم روز کے لکھنے میں معروف ہو گئے۔ اُس وقت بہ ضرورت اُن کو اردو میں خط وکتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثریں اور اکثر فارسی خطوط جن میں قوتِ متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے۔ نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب اُن کی ہمت مہرنیم روز کی ترتیب وانشا میں مصروف تھی، ضرور ہے کہ اُس وقت اُن کو فارسی زبان میں خط وکتابت کرنی اور وہ بھی اپنی طرزِ خاص میں شاق ہوئی ہوگی۔ اس لئے قیاس چاہتا ہے کہ انھوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اردو زبان میں خط لکھنے شروع کئے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ' زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہ رہی''۔''

حالی نے غالب کا جو قول نقل کیا ہے[۱] وہ غدر کے بعد کا ہے اور اس سے صرف اسی قدر

---

[۱] غالب کا قول ایک خط سے ماخوذ ہے جو شاگرد کے نام عود ہندی میں ہے۔ اس خط پر کوئی تاریخ ثبت نہیں لیکن شاگرد غالب غدر کے بعد غالب کے شاگرد ہوئے ہیں، اور اس خط میں 'شدت نسیان' اور 'جاں کنی کے خیالات' کا ذکر ہے۔ یہ باتیں غدر کے بعد کی ہیں۔

ہندوستان زبانِ دیگر را...... مسلم نداشتن وخود را بہ پندار زبان دانی افراشتن چہ معنی دارد۔ گویم نے گویم کہ نیائے من از مادر ا النہر بود و پدرم در دہلی پیکر پذیرفت و من در آگرہ منشور ہستی یافتم، حاشا کہ خود را از اہلِ زبان گیرم۔ زبان دانی من بر فرۂ سہ فرود ۂ خدا آفرید و سہ گوہر از ل آورد ست" (قاطع طبع ثانی ص۱۳۱)۔

فارسی غالب کی مادری زبان نہ تھی، اسے انھوں نے استاد ہی سے سیکھا تھا۔ اپنی تعلیم کی ابتدائی زمانے میں وہ لکھنا پڑھنا جاننے پر بھی فارسی سے ناواقف سے رہے ہوں گے۔ اور ایسا زمانہ بھی ہوگا جب وہ فارسی اتنی کم جانتے ہوں کہ اس زبان میں خط نہ لکھ سکتے ہوں۔ اُس زمانے کا کوئی خط موجود نہیں اور نہ اس کی شہادت پیش کی جا سکتی ہے کہ کسی کو خط لکھا، لیکن قیاس چاہتا ہے کہ خط لکھے ہوں اور وہ اُردو میں ہوں۔ غالب نے شعر بھی پہلے اردو میں کہے ہیں، پھر فارسی میں۔

۲۔ او اسطِ ۱۸۵۰ء تک

اِس دَور میں غالب نے رفتہ رفتہ فارسی پر قدرت حاصل کی اور کچھ مدت کی مشق کے بعد صاحب طرز انشا پرداز قرار پائے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس دَور کے آخر میں غالب کی عمر ۵۰ سے اوپر تھی، اور اُن کے قوائے جسمانی کا انحطاط شروع ہو چکا تھا۔ زمانے کی روش کے مطابق غالب نے عموماً فارسی میں خط لکھے ہوں گے، لیکن کبھی کبھی اُردو میں لکھنے کی بھی ضرورت پیش آئی ہوگی۔ اس کی دو وجہیں ہیں:۔

(۱) غالب سے سروکار رکھنے والوں میں ایسے لوگ جو لکھنا پڑھنا جاننے کے باوجود فارسی سے بالکل ناواقف ہوں یا اس سے کافی واقفیت نہ رکھتے ہوں ضرور رہے ہوں گے، اور وقتاً فوقتاً ایسے لوگوں سے مراسلت بھی ہوئی ہوگی۔ انھیں فارسی میں خط لکھنے کے معنی یہ ہوتے کہ خواہ مخواہ ترجمہ کرانے کی زحمت دی جائے۔ ناچار اُردو ہی میں خط لکھنا پڑا ہوگا۔ اسی طرح کبھی کبھی ناخواندہ لوگوں کو بھی خط لکھنے کی ضرورت پڑی ہوگی، اور انھیں بھی فارسی کی جگہ اُردو میں خط لکھا ہوگا۔ غالب کی زوجہ امراؤ بیگم[1] گمان غالب ہے کہ ناخواندہ ہوں۔ بنارس و کلکتہ سے جو خط غالب نے انھیں

---

[1] ایسی شریف خواتین جو بالکل پڑھی لکھی نہیں یا صرف قرآن مجید پڑھ سکتی ہیں اب بھی موجود ہیں، اور غالب کے زمانے میں آج کل کی بہ نسبت بہت زیادہ ہوں گی۔ غالب رام پور سے غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں "یہ تم کیا لکھتے ہو کہ گھر میں خط جلد جلد لکھا کرو۔ تم کو جو خط لکھتا ہوں گویا تمھاری استانی جی کو لکھتا ہوں۔ کیا تم سے اتنا نہیں ہوتا کہ جاؤ اور پڑھ کر سناؤ" (خط نمبر ۱۳) خط پڑھ کر سنا دینے کی ہدایت خط نمبر ۱۱ و ۱۹ میں بھی ہے۔ غالب کے نام کے

(بقیہ صفحہ ۳۶ دیکھیے)

غالب کی خط وکتابت فارسی کے بجائے اردو میں زیادہ ہوتی گئی" (غالب طبع اول ص
انھوں نے اردو کے ایک خط کا بھی ذکر کیا ہے جو اُن کے نزدیک یکم دسمبر ۱۸۴۵ء کے کچھ
لکھا گیا ہے۔ تاہم صاحب حالی کے اس نظریے کو کہ مہرنیم روز کی تصنیف میں معروفیت
میں خط وکتابت شروع کرنے کا باعث ہوئی تسلیم نہیں کرتے۔ مہرنیم روز کوئی ضخیم کتاب نہ
اور کئی سال کی مدت میں لکھی گئی ہے۔ غالب کے فارسی خطوط اردو کے خطوط کی طرح تکلف
سے عموماً آزاد ہیں، اور اُن کے لکھنے میں زیادہ کاوش نہیں کی گئی۔ اس کتاب کی تص
غالب سے "قادر الکلام اور مشاق نثر نگار" کو فارسی خط لکھنے سے مانع نہیں ہو
ص ۳۷ و ص ۳۰۔

امتیاز علی خاں صاحب عرشی اسے ناممکن نہیں سمجھتے کہ غالب نے ۱۸۵۰ء سے قبل
اردو میں مراسلت کی ہو، لیکن وہ اس کے قائل نہیں کہ اس سنہ سے قبل کا کوئی اردو خ
موجود ہے۔ یہ امکان بھی محض فلسفیانہ امکان ہے، ورنہ اُن کا اصلی خیال[۱] یہ معلوم ہوتا ہے
غالب نے ۱۸۵۰ء سے پہلے اردو میں کوئی خط لکھا ہی نہیں۔ مہرنیم روز کے معاملے میں وہ حا
کے ہم نوا ہیں۔ (دیباچہ مکاتیب غالب طبع ثانی ص ۱۳۸ و ص ۱۴۵)۔

مہیش پرشاد صاحب نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی، لیکن انھوں نے ایک خط کا
تحریر اگست ۱۸۴۹ء متعین کیا ہے (خطوط غالب ص ۲)۔

سوال زیر بحث کا تشفی بخش جواب حاصل کرنے کے لئے غالب کی زندگی کو تین اد
میں تقسیم کرنا مناسب ہوگا:۔

۱۔ تقریباً ۱۸۵۰ء تک غالب نے دو ایک جگہ تحریر[۲] لکھ دیا ہے کہ میری زبان فارسی ہے مگ
اُن کا اصلی خیال نہیں۔ فارسی سے اُن کا تعلق کس قسم کا ہے اس
بارے میں اُن کی حقیقی رائے قاطع برہان میں ملتی ہے:۔

"نیازمے آرم وپوزش مے گسترم تا مردم نگویند کہ خود ہندوستان زاد بود ن و

---

[۱] دیباچہ ص ۱۴۹ ... ۱۸۵۰ء ... تک۔ میرزا صاحب تقریباً اس زبان (یعنی فارسی) میں خامہ فرسائی کرتے
"تقریباً" سے عرشی صاحب کی کیا مراد ہے؟
[۲] تقریظ گلشن بے خار و نامۂ غالب

اردو خطوں اور اردو زبان کے متعلق غالب کی رائے "کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہو" (خطوط غالب صفحہ ۳) "میں اردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں؟ اس میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے؟" (خطوط صفحہ ۳۹۱)۔

اس دور کے اواخر میں اختلاط قویٰ کی وجہ سے اردو خطوں کی تعداد بڑھ گئی ہوگی اس زمانے کے کم از کم دو خط موجود بھی ہیں۔ پہلا خط اردوئے معلّٰی میں ہے مگر اس پر تاریخ ثبت نہیں۔ خطوط غالب (صفحہ ۲۱۰) میں مہیش پرشاد صاحب نے داخلی شہادت کی بنا پر اس کا زمانۂ تحریر اگست ۱۸۴۹ء بتایا ہے۔ تبصرۂ خطوط غالب میں جو معاصر نے شائع کیا تھا میں نے اس کے متعلق لکھا تھا "غالب نے دیوان تفتہ کا دیباچہ تحریر کیا تھا، تفتہ کو اپنی تعریف امید سے کم نظر آئی، غالب سے شکایت کی تو غالب نے دیباچے کا ایک فقرہ بدل دیا۔ خط ۱ میں اسی کی اطلاع ہے۔ اس کا زمانہ مرتب نے اسعد الاخبار، آگرہ کے ۲۰ اگست کے پرچے سے متعین کیا ہے" اس لئے کہ اس میں غالب کی تقریظ[۵۱] کا ذکر ہے" ذیل میں اسعد الاخبار کے دو اقتباس اور جناب عرشی کے خط کا ایک ٹکڑا نقل کیا جاتا ہے۔ ان سے جو نتائج نکلتے ہیں ان سے مرتب کے بتائے ہوئے زمانے کی قطعی طور پر تغلیط ہوتی ہے:-

(۱) دیوان[۵۲] تفتہ جو اس مطبع میں چھپا ہے ربع سے زیادہ چھپ چکا ہے وہ بھی اس موسم سرما میں انشاء اللہ تعالیٰ تمام ہوگا۔ اس کی ضخامت ۴۵ جزو کے قریب ہے اور قیمت چار روپیہ بعد اختتام کے پانچ ہو جائیں گے۔ اکثر شائقان سخن نے اس کی درخواست مع زرِ ثمن داخل مطبع کی ہے۔ کیونکہ وہ دیوان عجب فصاحت خیز اور لطف انگیز ہے۔ اکثر اشخاص اس کے طبع ہونے کی خبر سن کر بہت خوش ہوئے ہیں۔ خصوصاً اسد اللہ خاں غالب دہلوی تو اس کے بہت ثناخواں ہیں۔ اسعد الاخبار ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء مطابق ۲۹ رمضان ۱۲۶۵ھ

(۲) ان دنوں میں دیوان تفتہ سکندرآبادی اس مطبع میں چھپنا شروع ہوا ہے اور یہ وہی دیوان ہے جس کا اشتہار اخبار ہذا میں اواخر ۱۸۴۸ء میں دیا گیا تھا۔ بسبب عدیم الفرصتی

---

[۵۱] خط میں دیباچے کا ذکر ہے اور پنج آہنگ میں بھی دیباچہ ہی لکھا ہے۔ دیوان میں یہ دیباچہ تقریظ کے نام سے چھپا ہے۔ اگر اس طرف اشارہ کر دیا جاتا تو بہتر تھا۔

[۵۲] یہ اقتباس مرتب نے نقل نہیں کیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس میں تقریظ کا ذکر ہی نہیں۔

بھیجے تھے، اور جن کا ذکر چھجو مل[۵۱] کے نام کے خطوں میں ہے، وہ کس زبان میں ہوں گے؟

(۲) پنج آہنگ کے ڈیڑھ دو سو خطوں میں بہت کم خط ایسے ہیں جن میں غالب نے انشا پردازی کا کمال دکھانے کی کوشش نہ کی ہو۔ ایسے خط محنت پڑوہی اور جگر کاوی کے بغیر نہیں لکھے جا سکتے، کم از کم غالب کے لئے یہ ممکن نہ تھا اور اس کا خود انھیں اعتراف ہے۔ (خط بہ نام شاکر) ان کی زندگی میں ایسے لمحات جب وہ محنت سے گھبراتے ہوں ضرور ہوں گے۔ ایسی صورت میں اگر مراسلت ضرورت پیش آئی ہو تو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ یا تو 'سرسری' اور 'عامیانہ'[۵۲] فارسی میں خط لکھیں یا اردو کو نوازیں۔ پنج آہنگ میں ایسے[۵۳] خط جن میں 'شاعری کا عنصر' کم یا مفقود ہے ضرور ہیں، لیکن ایسے خط نہیں جو "قلم سنبھال کر" نہ لکھے گئے ہوں۔ 'سرسری' اور 'عامیانہ' فارسی پر غالب اردو کو ترجیح دینا بالکل قرینِ قیاس ہے۔ اس لئے کہ معمولی فارسی لکھنا اُن کے ادبی شکوہ کے منافی تھا، اور اردو ایسی زبان ہی نہ تھی جس میں کسی کو یہ امید ہو کہ غالب یا کوئی اور شخص انشا پردازی کا کمال دکھا سکے گا۔ غالب حسام الدین حیدر[۵۴] خاں نامی کو لکھتے ہیں:-

"جواب ایں نامہ سرسری باید نہ پہلوی و دری، و اگر خواہم کہ روش بگردانم ہر آئینہ ناتوِس سخن دری مرا زیاں دارد...... امید کہ ملازمان (؟) بندہ خود را دریں کشاکش نہ پسندند" (پنج آہنگ ص۱۱۴ - ص۱۱۵)

(سلسلہ صفحہ ۳۴) خط ۹ میں بھی یہی لکھا ہے۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ غالب کا یہ عام انداز تھا، خط ۱۰ بہ نام غلام نجف خاں میں عبارت ہے "لڑکے بہ خیر و عافیت ہیں۔ اپنی استانی سے کہہ دینا۔ میرزا شہاب الدین خاں کو دعا۔ نواب ضیاء الدین کو سلام۔ میرا رقعہ ان دونوں صاحبوں کو پڑھا دینا۔" اُمراؤ بیگم اگر خط پڑھ سکتیں تو اُن کے بارے میں بھی یہ خط پڑھوا دینا۔ اُمراؤ بیگم کے خطوط بہ نام کلب علی خاں خود امراؤ بیگم کے لکھے ہوئے نہیں (عرشی صاحب کا خط بنام

۵۱ پنج آہنگ ص۴۳...... ۵۲ عود ہندی الہ آباد ص

۵۳ شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن صاحب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے پاس غالب کے چند غیر مطبوعہ فارسی خطوط ہیں جن کی عبارت بالکل معمولی ہے۔

۵۴ نامی غالب سے فارسی میں ایک خط کا جواب لکھوانا چاہتے تھے۔ غالب کی طبیعت شاعرانہ نثر لکھنے پر اس وقت مائل نہ تھی انھوں نے بہانہ کر دیا کہ خط اس کا مستحق نہیں کہ اس کا جواب 'پہلوی و دری' میں دیا جائے۔ نثر کے بجائے ۴ رباعیاں بھیجتا ہوں۔ اپنی طرز خاص میں نثر لکھنے سے رباعیاں لکھنے میں زیادہ سہولت نظر آئی ہوگی۔ (عود ہندی

باوصف انواع موانع و عوائق در اوائل ۱۲۶۶ھ بہ اختتام رسید'

(۲) ۲۰ اگست کے اسعد الاخبار میں بظاہر تقریظ ہی کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ غالب کی پسندیدگی کا ذکر پہلی بار اواسط ۱۸۴۹ء میں ہوا، لازماً اس کا اظہار اُسی زمانے میں کیا گیا ہوگا۔ (یعنی یہ کہ تقریظ اسی زمانے کی لکھی ہوئی ہے)۔

(۳) غالب نے ۱۰ فروری ۱۸۴۹ء اور ۲۰ اگست سنہ مذکور ہی کی درمیانی مدت میں یہ تقریظ لکھی اس لئے کہ ۱۰ فروری ۱۸۴۹ء کو فارسی خط میں غالب نے تفتہ کو لکھا ہے:۔

'ازاں دو ہزار بیت کہ نوشتہ اند کہ در اکبرآباد گفتہ ام، ماہم در اوراقِ اخبار اکبرآباد غزلے مشاہدہ کردہ ایم، خوش گفتہ اند و براہے کہ ما سے خواستیم رفتہ اند'

۱۰ فروری تک غالب نے یہ دو ہزار اشعار نہیں دیکھے تھے۔ غالب اظہار رائے میں بڑے محتاط تھے۔ تفتہ نے اِن اشعار کی اصلاح کے بعد تقریظ کی درخواست کی ہوگی۔

(۴) تقریظ کی ترمیم اواخر ۱۸۵۱ء میں تقریظ کے چھاپے جانے سے کچھ قبل ہوئی۔ غالب اُس زمانے میں زیادہ تر اُردو میں خط لکھنے لگے تھے، ترمیم کی اطلاع اُردو خط کے ذریعہ دی۔

میری گزارش حسب ذیل ہے:۔

(۱) عرشی صاحب نے دیوان تفتہ کے متعلق جو خط مجھے لکھا تھا اس میں سرورق کا حال نہ تھا، ورنہ میں کبھی یہ دعویٰ نہ کرتا کہ تقریظ دیوان سے پہلے اواخر ۱۸۴۸ء میں چھپی تھی۔ سرورق کی عبارت سے صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تقریظ اواخر ۱۸۵۱ء میں طبع ہوئی، اور اس میں ترمیم اس سے قبل ہو چکی تھی۔ کس قدر قبل؟ اس پر یہ عبارت مطلق روشنی نہیں ڈالتی۔

(۲) دیوان تفتہ کا اشتہار اسعد الاخبار میں پہلی بار اواخر ۱۸۴۸ء میں چھپا تھا۔ میری نظر سے ۱۱ دسمبر ۱۸۴۸ء سے قبل کے پرچے نہیں گزرے، اس لئے مجھے علم نہیں کہ اشتہار اول میں غالب کے متعلق کچھ تھا یا نہیں۔ عرشی صاحب ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء کے پرچے میں جو اشتہار ہے اس کی بنا پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس سے پہلے تقریظ کی طرف اشارہ ہوا ہی نہیں۔ مزید تحقیق سے یہ ثابت بھی ہو جائے جب بھی یہ لازم نہیں کہ تقریظ کے دیکھتے ہی صاحب مطبع نے اس کا ذکر کر دیا ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ صاحب مطبع کو تقریظ کا علم ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء کو یا اس سے پہلے ہو چکا تھا۔ یہ تقریظ اصلی تھی یا ترمیم شدہ، اشتہار اس کے بارے میں ساکت ہے۔ یہ بھی قطعی نہیں کہ تقریظ ہی کی طرف اشارہ ہے، مگر قیاس یہی چاہتا ہے۔

کے اب تک ملتوی رہا۔ اب اس کی تدبیر کی گئی ہے۔ اسعد الاخبار ۱۰ دسمبر ۱۸۴۸ء مطابق ۱۲ محرم ۱۲۶۵ھ۔

(۳) "تفتہ کے دو[۱] دیوان ہیں۔ ان میں سے پہلے کے شروع میں میرزا صاحب کی تقریظ ہے۔ اس کا چھاپا اواخر ۱۲۶۵ھ میں شروع ہوا اور اوائل ۱۲۶۷ھ میں انجام کو پہنچا۔ تقریظ پر تاریخ نہیں دی۔ جس صفحے پر یہ ختم ہوتی ہے اس کی باقی ماندہ جگہ میں "حقیر کا قطعۂ آغاز طباعت ہے جس سے ۱۲۶۵ برآمد ہوتے ہیں"

اِن اقتباسات سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:—

۱۔ دیوان اور اُس کی تقریظ غالباً اواخر ۱۸۴۸ء ہی میں صاحب مطبع کے پاس پہنچ گئی تھی، اگر یہ قیاس صحیح ہے تو تقریظ ۱۸۴۸ء یا اس سے بھی قبل کی لکھی ہوئی ہے۔

۲۔ دیوان تفتہ کا چھاپا اوائل ۱۲۶۵ھ (اواخر ۱۸۴۸ء) میں شروع ہو گیا تھا۔ (جناب عرشی[۲] نے 'اواخر' سہواً لکھا ہے)۔

۳۔ ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء تک ۱۲ جز کے قریب چھپ چکا تھا۔

۴۔ تقریظ آغازِ دیوان میں ہے، اور اس کے آخری صفحے پر حقیر کا 'قطعۂ تاریخ' اس دیوان کا یہ حصہ سب سے پہلے چھپا، اور اس کا زمانۂ انطباع اواخر ۱۸۴۸ء ہے۔

یہ تحقیق ہو جانے کے بعد کہ تقریظ کا زمانۂ انطباع اواخر ۱۸۴۸ء ہے۔ یہ قطعی طور پر معلوم ہے کہ غالب نے اسے اواخر ۱۸۴۸ء سے پیشتر لکھا ہوگا۔ اس کے بعد یہ تسلیم کرنا ناممکن ہے کہ خط اگست ۱۸۴۹ء میں تحریر ہوا"

عرشی صاحب نے دیباچۂ مکاتیب غالب طبع ثانی میں (صفحہ ۱۴۱ تا صفحہ ۱۴۳) میرے بیان پر ناقدانہ نظر ڈالی اور خط زیر بحث کے زمانۂ کتابت کے متعلق بالکل مختلف رائے ظاہر کی ہے۔ عرشی صاحب کی تنقید کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) تقریظ سرورق کے دوسرے رخ سے شروع ہوتی ہے اور سرورق پر مہتمم مطبع نے لکھا ہے:

'این نسخہ ... دیوان تفتہ در مطبع اسعد الاخبار ... بہ اواخر ۱۲۶۵ھ شروع گردیدہ

---

[۱] دو نہیں، تین دیوان ہیں۔

[۲] سہو دراصل کارپردازانِ مطبع کا ہے۔ رمضان ۱۲۶۵ھ تک ایک ربع چھپ چکا تھا۔ یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اس کا چھاپا اواخر ۱۲۶۵ھ میں شروع ہوا؟ تقطیع بڑی تھی، ۱۶ صفحوں سے زیادہ ایک پتھر میں نہیں آتے ہوں گے۔ ایک ربع ۱۱ جز ہی ہوں تو ۴۴ پتھر کی ضرورت ہوئی ہوگی۔

ہیں 'بڑے محتاط' ہونے سے اگر عرشی صاحب کا یہ مطلب ہے کہ غالب جچی تلی 'بے لاگ رائے' ظاہر کیا کرتے تھے، تو اس سے اختلاف کی بہت کچھ گنجائش ہے۔ جہاں تک معاصرین کا تعلق ہے اُن کی ناقدانہ رائیں زیادہ تر مصلحتِ وقت کی تابع نظر آتی ہیں۔ مثالیں بہت دی جاسکتی ہیں، مگر طوالت کے خوف سے صرف چند پر اکتفا کیا جاتا ہے:۔

حیا کے متعلق لکھا ہے۔ "سخنش رائے زندگی سیمائے کلام الملوک ملوک الکلام است و

گوہرش را از رخشندگی فروغ جوہر الہام" پنج آہنگ ص ۳۲

امیر حسن خاں بسمل کو خاقانی پایہ، کہہ کر مخاطب کیا ہے " ص ۹۹

ذوقؔ کی شاعری کے متعلق لکھا ہے۔ "امیر خسروؔ و سعدیؔ و جامیؔ کی روش کو

سر حدِ کمال کو پہنچایا ہے" خطوط غالب ص ۱۵۲

شفقؔ۔ ہاشمیؔ اور عسکریؔ کی شاعری۔ "متاخرین یعنی صائبؔ و کلیمؔ و قدسیؔ کے انداز

کو آسمان پر لے گئے ہیں۔ ایضاً ص ۱۵۱

(۴) عرشی صاحب کی رائے میں تقریظ کی ترمیم اوائل ۱۸۵۰ء میں تقریظ کے چھپ جانے سے کچھ قبل ہوئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ تقریظ اگست ۱۸۴۹ء میں یا اس سے بھی کچھ پہلے تفتہ کے پاس پہنچ گئی، اور باوجود اس کے کہ وہ اس سے مطمئن نہ تھی، انھوں نے اسے بعض احباب کو دکھا بھی دیا، لیکن غالب سے ترمیم کی درخواست برس ڈیڑھ برس کے بعد کی۔ عرشی صاحب کے پاس اس کا ثبوت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ خط جس میں ترمیم کا ذکر ہے اردو میں ہے۔ یہ رائے کہ غالب ۱۸۵۰ء سے قبل اردو میں خط نہیں لکھتے تھے پہلے ہی قائم کرلی گئی تھی، خط زیرِ بحث کا زمانۂ تحریر ۱۸۵۰ء سے قبل قرار نہ دینا ناگزیر تھا۔ ترمیم جیسا کہ خود غالب نے لکھا ہے بہت کم تھی۔ غالب نے صرف ایک فقرہ بدل دیا تھا۔ میرے لئے یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ تقریظ کی ترمیم اس کی تصنیف کے برس ڈیڑھ برس بعد ہوئی۔ میری رائے میں تقریظ کی ترمیم اس کی تصنیف کے کچھ ہی بعد ہوئی، اور اسی زمانے میں خط بھی لکھا گیا۔ یہ زمانہ ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء سے قبل ہے لیکن یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ کس قدر قبل ہے۔[۱]

---

[۱] تفتہ کے نام کے خط ۲ (خطوط ص ۳۰۲) کا زمانۂ تحریر پیش پرشاد صاحب نے اگست ۱۸۵۸ء لکھا ہے۔ میں نے غالب کے ان الفاظ کی بنا پر کہ "جب تمہارا دیوان چھاپا جائے گا یہ قطعہ بھی چھپ جائے گا" یہ رائے ظاہر کی تھی کہ

(باقی صفحہ ۴۲ دیکھو)

(۳) اواخر ۱۸۴۷ء میں دیوان کا اشتہار چھپا تھا مگر دیوان اس وقت کس شکل میں تھا اس کا مطلق علم نہیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ مکمل ہو، اور اس میں زیادہ[۱] ردّ و بدل کی گنجائش نہ ہو۔ اس صورت میں یہ دو ہزار اشعار دیوان دوم میں داخل ہوئے ہوں گے۔ اس کے خلاف بھی ہو تو تقریظ ایسی نہیں کہ اس کے لکھنے سے قبل کل کلام کا مطالعہ ضروری ہو۔ تفتہ غالب کے شاگرد تھے، اور غالب اس سے واقف تھے کہ شاعری میں تفتہ کا کیا پایہ ہے۔ تقریظ کیلئے یہ بالکل کافی تھا۔ ذیل میں تقریظ کی وہ عبارت جس کا تعلق کلامِ تفتہ سے ہے نقل کیجاتی ہے:—

"رہ روراں بہ رہ گزارے مرغزارے درنظر آوردہ و در بیابانے بہ خیابانے درآوردہ اند کردراں تماشاگاہ تا بہ پویہ نیم گام زند موج سبزہ را بیند تا بہ کمر رسیدہ، و.... گوشۂ دستار را نگرد از گرانی بارِ گل خمیدہ...... ہمانا رہ گزارے کہ بہ سبزہ زارے انگشت نما شدہ و بیابانے کہ بہ خیابانے رہ شناس آمدہ ہمیں غالیہ اندودہ سواد مردمک مراد وہمیں ریحان رقم صحیفۂ مشکیں سواد است کہ درنظر داشتہ ایم و نی (؟) بے نوا را بہ دیباچہ نگاری آں گماشتہ۔ یارب این سخن پیوند دانش مند درفن فرزانگی یگانہ و در آئین یگانگی فرزانہ آسمانِ سخن را ماہِ دو ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ کہ ایں فہرست گنج خانۂ راز را رقم کردۂ اوست و ایں مجموعۂ سوز و گداز فراہم آوردۂ او، چہ مایہ دیدہ و دل باہم آمیختہ باشد تا ایں نقش بدیع انگیختہ باشد۔ سخن عشق و عشق سخن کلامِ حسن و حسن کلام را بہ یک دگر سرشتند تا چارآخشیج ہستی شیوا بیانی سرانجام یافت کہ از گرمی نفس و تشنگی جگر کہ درمن بہ سخن داشت بہ مناسبت برشتگی حسن گفتار تفتہ نام یافت۔ واو اشنا سان شناسند و اندازہ داناں دانند کہ باآں کہ خامہ در کف سخن وراز فراوانی آزو رزش سخن لاابالی پوے و بے پروا خرام است، سخن بہ نغزی و عجبی درروانی در نفس خویش تمام است۔ ...... لاجرم باچنیں دم گرم کہ ہیچ گہ دلش را از گفتار سرد نہ دارد و سینہ مست سے سخن تفتہ از خود درفتہ در سخن ہائے آمدہ ہم آوردہ نہ دارد۔ زیں بیش گزاردن حق ستایش خوبی سخن بہ دیدہ وراں نے گزارم۔" (پنج آہنگ صفحہ ۳۹، ۴۰)[۲]

تعریف یا تو بہت عام لفظوں میں ہے یا ایسی ہے کہ تفتہ کا کلام اس کا بالکل مستحق نہیں۔ غالب یہی الفاظ ہر اس شاعر کے لئے جسے وہ ناراض نہ کرنا چاہتے ہوں استعمال کر سکتے تھے۔ اظہار رائے

---

[۱] متفرقات سے بحث نہیں۔ [۲] پنج آہنگ اشاعت اوّل کسی صاحب کے پاس ہو تو بہ ازراہِ مہربانی یہ بتائیں کہ دیوان تفتہ کا دیباچہ اس میں ہے یا نہیں۔

طرح عیسوی اور ہجری تاریخوں اور سنین میں مطابقت ہوجاتی ہے۔ تمہر صاحب نے ۱۲۵۱ھ کلیات کی تیسری اشاعت میں دیکھا ہوگا۔ دونوں سنین کو بدلنے کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ اُن کا یہ قول کہ فارسی اور اردو خط لازماً ایک دوسرے سے قریب زمانے میں لکھے گئے ہیں البتہ قابلِ قبول ہے۔

عرشی صاحب کی رائے میں خط زیر بحث کا زمانہ تحریر کیا ہے، اس کا ٹھیک پتا نہیں ملتا اُن کا بیان حسب ذیل ہے :۔

"پنج آہنگ اور اردوئے معلّٰی میں چھ خط جوہر کے نام پائے جاتے ہیں۔ (اس کے بعد خطوں کی فہرست دی ہے۔) ..... ان میں سے پہلے اور تیسرے خط میں ساڑھے تین سال، چوتھے اور پانچویں میں آٹھ مہینے اور پانچویں اور چھٹے میں دس سال سے زیادہ کا فرق ہے۔ کم ترمدت تیسرے اور چوتھے مکتوب کے درمیان ہے جو تین ماہ ہوتی ہے۔ اب محولۂ بالا مکتوب... کی اصل عبارت ملاحظہ ہو....... 'کیوں صاحب وہ ہماری لُنگی اب تک کیوں نہیں آئی؟ بہت دن ہوئے جب تم نے لکھا تھا کہ اس ہفتے بھیجوں گا' اس عبارت کا جملہ 'بہت دن ہوئے' غور طلب ہے چونکہ میرزا صاحب کے فارسی خطوط نمبری ۲ اور ۳ میں یہ شکایت کی گئی ہے کہ بہت دنوں سے تمہارا خط نہیں آیا' جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جوہر خطوں کے جواب میں بے حد سست تھے اور ان کے نام کے خطوط کے درمیانی وقفے ہمیں معلوم ہیں۔ لہٰذا کچھ بعید نہیں ہے کہ انھوں نے لنگی بھیجنے میں ڈیڑھ دو برس گزار دیے ہوں۔

یہاں ایک اور امر قابل بیان ہے۔ جہاں تک میں نے جستجو کی ہے بہ استثنائے نواب فردوس مکاں ایسا کوئی مکتوب الیہ نہیں ہے جس کو میرزا صاحب فارسی میں خط لکھتے ہوں اور پھر فارسی مراسلت کے درمیان میں کوئی اردو خط اسے لکھا ہو۔ جب وہ کسی سے اردو میں مراسلت شروع کر دیتے ہیں تو اس کے بعد اُس کو فارسی خط نہیں لکھتے۔ جوہر کے نام ۱۸۴۷ء میں ایک اور اس کے بعد ۱۸۵۸ء میں دو فارسی خط لکھے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ درمیان میں اُردو کا خط کیوں تحریر کیا گیا۔

اس خط میں میرزا صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہیرا سنگھ نے بڑی کوشش سے بادشاہ کے ہاتھ کے قطعے مہیا کر لئے ہیں۔ اب ولیعہد کے دستخطی قطعات کی فکر میں ہے۔ میں بھی اس کی مدد کر رہا ہوں۔ میرے نزدیک ولیعہد سے مراد میرزا فتح الملک ہیں جو ۱۸۵۶ء میں دارالخلافت کے

دوسرا خط جواہر سنگھ جوہر خلف پلا لا چھج مل کے نام کا ہے۔ خطوط غالب میں جوہر کے نام سے جو تین خط ہیں ان میں یہ پہلا ہے۔ خط یہ ہے :-

خط تمہارا پہنچا..... قطعے جو تم کو مطلوب تھے اُس (کذا) کے حصول میں جو کوشش ہیرا سنگھ نے کی ہے میں تم سے نہیں کر سکتا...... پانچ پانچ اور چار چار رُپے اور دو روپے کو قطعے مول لئے اور بنوائے..... دوڑتا پھرا۔ حکیم صاحب پاس کئی بار جا کر حضور والا کا قطعہ لایا۔ ب دوڑ رہا ہے دلیعہد بہادر کے قطعہ کے واسطے۔ یقین ہے کہ دو چار دن میں وہ بھی ہاتھ آئے اور بعد اُس قطعے کے آنے کے وہ سب کو یکجا کر کے تمہارے پاس بھیج دے گا۔ مدد میں بھی اُس کی کر رہا ہوں، لیکن اُس نے بڑی مشقت کی..... کیوں صاحب وہ ہماری لنگی ابتک کیوں نہیں آئی؟ بہت دن ہوئے جب تم نے لکھا تھا کہ اسی ہفتے میں بھیجوں گا.....''

مہر صاحب نے غالب کے ایک فارسی خط کی مدد سے اس خط کا زمانہ کتابت ۱۸۴۵ء کے لگ بھگ مقرر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

''فارسی مکاتیب میں ایک خط..... جوہر کے نام ہے جس میں..... لنگی کی فرمایش کی ہے۔ اس خط کے آخر میں مطبوعہ پنج آہنگ میں یکم دسمبر ۱۸۴۸ء مطابق چہارم محرم ۱۲۱۵ھ ثبت ہے ہجری اور عیسوی تاریخ میں مطابقت نہیں ہوتی..... کم از کم ایک تاریخ ضرور غلط ہے۔ اگر تاریخ ہجری کو ۱۲۱۵ھ کی بجائے ۱۲۶۱ھ رکھا جائے تو عیسوی تاریخ ۱۸۴۵ء ہونی چاہئے میرا خیال ہے کہ یہی صحیح ہے۔ ان کے اردوئے معلّی کے ایک خط میں بھی..... لنگی کا تقاضا موجود ہے..... یہ دونوں خط لازماً ایک دوسرے سے قریب کے زمانے میں لکھے گئے ہوں گے۔''

(غالب طبع اوّل ص ۳۰۸)

پنج آہنگ غدر سے قبل دو بار طبع ہوئی تھی، لیکن غدر کے بعد کلیات نثر میں شامل کر لی گئی۔ کلیات پہلی بار غالب کی زندگی ہی میں شائع ہوا تھا۔ اس کی پہلی اشاعت میں ''آدینہ یکم دسمبر ۱۸۴۸ء چہارم محرم ۱۲۱۵ ہجری'' مرقوم ہے۔ ۱۲۱۵ھ دراصل ۱۲۶۵ھ ہے، اور اس

(سلسلہ صفحہ ۴۱ سے) عجب نہیں یہ خط ۱۸۵۰ء سے پہلے کا ہو۔ وحشی صاحب لکھتے ہیں کہ وہ قطعہ جس کا ذکر اس خط میں ہے دیوان نقشہ میں موجود ہے، اور ۱۸۵۰ء کا لکھا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ میش پرشاد صاحب کے قول کی صحت میں جو شبہ میں نے ظاہر کیا تھا اس کے لئے کوئی سبب نہیں۔

دنوں سے خط نہ آنے کی شکایت ہے۔ ذیل میں دونوں خطوں کی ضروری عبارتیں درج کیجاتی ہیں:۔

(۱) دیر است کہ ما را یاد نکردہ اند و ما جگر تشنۂ خود را بزلال خبرے کہ از کنار نامۂ موسومہ رائے چھجمل تراود تسکین مے دہیم (پنج آہنگ ص ۱۲۰)

(۲) نامۂ شما دیر است تا بمن رسیدہ است، پاسخ جو نہ بود، ور نہ دریں روز سیاہ نیز نبشتن نامہ دریغ نہ داشتمے (ایضاً ص ۱۲۰ و ص ۱۲۱)

پہلے خط میں جوہر کی شکایت ہے، لیکن دوسرے میں معاملہ برعکس ہے۔ غالب نے خود جواب نہ دینے کی معذرت پیش کی ہے۔ صرف اس بنا پر کہ ایک خط میں غالب نے دیر سے یاد کرنے کی شکایت کی ہے، عرشی صاحب یہ کہنے میں حق بجانب نہیں کہ "جوہر جواب میں بے حد سست تھے"۔ غالب نے اپنے لئے بھی وہی 'دیر' کا لفظ استعمال کیا ہے، کیا یہی حکم غالب پر بھی لگایا جا سکتا ہے؟ غالب اس کے زیادہ مستحق ہیں اس لئے کہ غالب جواب نہ دینے کے معترف ہیں اور جوہر کے بارے اور جوہر کے بارے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ خط لکھنے میں سبقت نہ کی۔ مزید یہ کہ اگر ایک خط میں یاد نہ کرنے کی شکایت ہے تو ایک میں جوہر کے متواتر خطوں کا ذکر ہے:۔

نامہ ہائے شما پیہم رسیدہ، پاسخ آں ہا[۵۱] نیز پیہم بہ پدر بزرگوار شما سپردہ شد۔ ایں نامہ کہ امروز مے نگارم و مے خواہم کہ بسبیل ڈاک رواں دارم بپاسخ دو صحیفہ باز پسین است نگاشتۂ ۲۲ نومبر در قم زدۂ ۲۹ نومبر کہ ہر دو بہ ہنگام خویش بمن رسیدہ نخستیں چوں شوقیہ بود جواب نخواہد دومیں را پاسخ از ایں است (پنج آہنگ ص ۱۲۰)

'بہت دن ہوئے' چند دنوں کے لئے بھی مستعمل ہو سکتا ہے، چند مہینوں کے لئے بھی اور چند برسوں کے لئے بھی۔ مجروح کے نام ایک خط ہے جس میں غالب نے اپنا اور میرن صاحب کا اصلی یا فرضی مکالمہ نقل کیا ہے، اس میں یہ الفاظ محض چند دنوں کے لئے آئے ہیں "اس کے (مجروح کے) خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں، وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے" "حضرت، وہ آپ کے فرزند ہیں، خفا کیا ہوں گے؟" خطوط ص ۲۶۹

خط زیر بحث میں کس مدت کے واسطے استعمال ہوا ہے اس کے فیصلے میں وہ خط جس میں لنگی کی فرمائش کی تھی مدد دے سکتا ہے۔ ضروری عبارت یہ ہے:۔

'کلہے از پوست بردہ بستم، حالیا آں را گرم مے ورزم و سرم بے کلاہ ماند۔ اگر چہ کلہ نمے جویم'

۵۱؎ یہ خط پنج آہنگ میں کہاں ہیں؟

انتقال کے بعد ولیعہد اور ۱۸۵۲ء میں میرزا صاحب کے شاگرد ہوئے تھے۔ اس لئے ان کے
مستقل قطعوں کی تعیین میں میرزا صاحب نے مدد دی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر تنگی کے تقاضے والے
اردو خط کو فارسی کے خط مورخہ اگست ۱۸۵۲ء کے بعد کا مانتا ہوں اور ایک دو اور
تقاضائی خطوں کو گم شدہ تصور کرتا ہوں" دیباچہ ص۱۱۱ تا ص۱۱۴

میں عرض کر چکا ہوں کہ خط زیر بحث کے زمانۂ تحریر کے متعلق عرشی صاحب کی اصلی رائے کا پتا نہیں ملتا۔ اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو:۔

عرشی صاحب فرماتے ہیں کہ جوہر نے لنگی بھیجنے میں ڈیڑھ دو برس گزار دیے ہوں گے۔ فارسی خط کی تاریخ تحریر یکم دسمبر ۱۸۴۸ء ہے۔ عرشی صاحب کے بتائے ہوئے حساب سے اردو خط کی آخری تاریخ ۱۲ مئی ۱۸۵۰ء ہو سکتی ہے، گو اس کا بھی امکان رہتا ہے کہ اس سے مہینوں قبل لکھا گیا ہو۔ اُن کے اس قول سے کہ غالب اردو خط لکھنے کے بعد فارسی خط نہیں لکھتے یہ نتیجہ نکلتا ہے اور خود انھوں نے نکالا بھی ہے کہ اردو خط اگست ۱۸۵۲ء والے فارسی خط کے بعد کا ہے۔ آخر میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ خط اس زمانے کا ہے جب غالب میرزا فتح الملک کے نوکر ہو چکے تھے۔ یہ مسلم ہے کہ ملازمت کا زمانہ ۱۸۵۴ء تا ۱۸۵۶ء ہے۔ خط کے زمانۂ کتابت کے متعلق اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے ظاہر ہے، گو خود انھوں نے صراحتہً نہیں لکھا کہ اس حساب سے خط کا زمانۂ تحریر کیا ہے۔

خطوں کے درمیانی وقفے اور جوہر کی کاہل قلمی کی نسبت جو کچھ عرشی صاحب نے لکھا ہے اس کے متعلق میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خطوں کے درمیانی وقفے محض مطبوعہ خطوں کی مدد سے ثابت نہیں کیے جا سکتے۔ مطبوعہ مجموعوں میں جو خط ملتے ہیں وہ اُن خطوں کے مقابلے میں جو شائع نہ ہو سکے بہت کم ہیں۔ جوہر کے والد غالب کے دوست، خود جوہر[۱۵] اُن کے "عزیز شاگرد" اور "مخصوصین میں تھے (یادگار ص۱ و ص۱۳۱) اور مدتوں دہلی سے باہر بھی رہے، غالب نے انھیں اس سے بہت زیادہ خط لکھے ہوں گے۔ ۱۸۴۸ء تا ۱۸۶۴ء کے کل خط ہیں کہاں کہ خطوں کے درمیانی وقفوں کا صحیح علم ہو سکے اور اس سے کوئی نتیجہ نکالا جا سکے؟ عرشی صاحب کا قول ہے کہ دو خطوں میں بہت

---

۱۵ جوہر اور کشن کے حق میں غالب کی رباعی کلیات نظم میں ہے، یادگار میں بھی نقل ہوئی ہے:۔

تا مے کشن و جوہر دو سخنور داریم — شان دگر و شوکت دیگر داریم
در میکدہ بریم کرے کشن از ماست — در معرکہ تیغ سیم کہ جوہر داریم

شکل نہیں ناممکن ہے۔

۳۔ تیسرا دور بادشاہ کی ملازمت یعنی جولائی ۱۸۵۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ مہرنیم روز کی تصنیف کا آغاز اس کے بعد ہی ہوا ہوگا۔ اس کی عبارتیں "قوتِ متخیلہ" کا عمل بہت زیادہ ہے' اور اس کی تصنیف میں مصروفیت ضرور رہی کہ اردو خطوط کی تعداد میں معتد بہ اضافے کا باعث ہوئی ہو۔ رفتہ رفتہ کس طرح فارسی کم اور اردو زیادہ ہوتی گئی اور آخر میں صرف اردو پر انحصار رہ گیا' اس کی تفصیلات کے لئے مکاتیب غالب طبع ثانی کا دیباچہ (ص ۱۴۳ تا ص ۱۴۵) ملاحظہ ہو۔ اس مبحث پر اس سے بہتر بیان میری نظر سے نہیں گزرا' خلاصۂ بحث یہ ہے :۔

(۱) قیاس چاہتا ہے کہ غالب نے فارسی سے پہلے اردو میں خط لکھے ہوں۔

(۲) غالب جس زمانے میں بالعموم فارسی میں مراسلت کرتے تھے کبھی کبھی اردو میں بھی خط لکھا کرتے تھے

(۳) کم از کم دو خط ۱۸۵۰ء سے قبل کے موجود ہیں۔

(قاضی عبدالوُدود)

اما لنگ ابریشمی چناں کہ در پٹنہ در و ملتان سازند داعیانِ آں قلمرو بہ سرپیچ بندند..... و غالب کہ در آں دیار ایں چنیں متاع ز ود و آساں بہ دست آید، بہ جویند و بہم رسانند و سوے من در ڈاک نہ داں دارند و قیمت آں بہ نگارند۔ تا بہانہ نخواہند نوشت نخواہم ستد..... در فرستادن لنگ در لنگ و نگاشتن قیمت تکلف نکنند.....'' (پنج آہنگ صفحہ ۱۲۰)

غالب کو لنگی کی ضرورت فوری استعمال کے لئے ہے، اسی لئے وہ ایک جگہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ جلد مل جائے گی اور دوسری جگہ جلد بھیجنے کی تاکید کرتے ہیں۔ لنگی کوئی نایاب چیز نہیں۔ غالب قیمت ادا کرنے کو تیار بلکہ اس پر مصر، غالب اور جوہر کے تعلقات بزرگانہ اور خوردانہ۔ یقین ہے کہ غالب کا خط ملتے ہی جوہر نے لکھا ہوگا کہ اسی ہفتے بھیجوں گا۔ کسی سبب سے وعدہ ایفا نہ ہوا تو غالب نے یاددہانی کی۔ میرے لئے یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ فرمایش اور یاددہانی کے درمیان برس ڈیڑھ برس کا وقفہ ہے۔ چند ہفتے بہت ہیں۔

عرشی صاحب کا یہ نظریہ کہ غالب کسی شخص سے اردو میں خط و کتابت شروع کرنے کے بعد اسے فارسی خط نہیں لکھتے تھے، غالب کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے قابل قبول نہیں۔ اس قسم کے خود ساختہ قاعدوں کی سختی کے ساتھ پابندی اُن سے بعید ہے۔ یوں بھی بے شمار فارسی خط غائب ہیں، غالب کے عمل کا پتا کیوں کر چلے؟ اس کا اعتراف خود عرشی صاحب کو ہے کہ اس کلیے کا استثنا موجود ہے۔ جہاں ایک مستثنیٰ ہے وہاں ایک اور سہی! غالب جب یوسف علی خاں کو اردو میں خط لکھنے کے بعد فارسی خط لکھ سکتے تھے، تو جوہر سے اس طرح مراسلت میں کونسا امر مانع ہو سکتا تھا؟

اب رہا قطعوں کا معاملہ۔ عرشی صاحب کے پاس کون سا ثبوت اس دعوے کا ہے کہ ولیعہد سے مرزا فتح الملک ہی مراد ہیں۔ دارالخت دارا بھی خطاب ملے (غم خانۂ جاوید جلد ۲ صفحہ ۱۰۱) ممکن ہے کہ انھیں کے قطعے کی تلاش ہو۔ مرزا فتح الملک ہوں جب بھی، یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ قطعے کی تلاش غالب کی نوکری کے بعد کا واقعہ ہے۔ میرے نزدیک تو غالب کی اعانت کو کسی خاص قطعے کی تلاش پر محدود کر دینا ہی صحیح نہیں۔ غالب نے اپنی مدد کا ذکر کیا ہے، اس کی تصریح نہیں کی کہ کسی خاص قطعے کے حصول میں مدد دے رہے ہیں۔

میری رائے میں جوہر کے نام کا اردو خط ان کے نام کے فارسی خط مورخہ یکم دسمبر ۱۸۴۳ء کے چند ہفتے بعد کا ہے۔ اس کا امکان بھی ہے کہ چند مہینے بعد کا ہو، لیکن میرے لئے یہ باور کرنا کہ لنگی کی فرمایش یا جوہر کے وعدے اور غالب کی یاددہانی میں پانچ چھ برس[۵۱] کا وقفہ ہے،

---

۵۱ بہ شرط ضرورت معاصرین کی شہادت پیش کی جا سکتی ہے۔

نواب آصف الدولہ کا اردو کلام

نواب یحییٰ خاں عرف مرزا امانی آصف الدولہ بہادر والی اودھ (۱۷۷۴ تا ۱۷۹۷ء) اردو کے بہت اچھے شاعر تھے، آصف تخلص فرماتے تھے۔ سادگی اور اثر آفرینی ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ یہی خوبی اُن کے اُستاد میر سوز کے کلام میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ آصف الدولہ کے عہد کے قریب قریب تمام باکمال شعرا۔ سودا۔ میر۔ سوز۔ انشا۔ جرأت اور مصحفی کے کلام سے تو دنیا اچھی طرح روشناس ہے لیکن افسوس ہے کہ اُن کے ولی نعمت کو اُن کے خاندان میں دولت و حکومت ختم ہونے کے بعد اقلیم سخن کی بادشاہت سے بھی محروم کر دیا گیا۔ اُن کا کلیات کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد دکن میں موجود ہے جو خود اُن کے ہات کا لکھا ہوا بتایا جاتا ہے۔ کہیں کہیں پرانے تذکروں میں بھی نمونۂ کلام دیکھنے میں آجاتا ہے۔ ذیل کی دو غزلیں تاریخ فرخ آباد (فارسی قلمی) مصنفہ مفتی ولی اللہ سے نقل کر کے نذرِ ناظرین کی جاتی ہیں۔

(سید الطاف علی)

حال تو آہ کہوں روز میں جا کر اپنا — لیکن اُس شوخ کو کہنا نہیں باور اپنا

اپنا بیگانہ سبھی یوں تو ہے دشمن لیکن — دشمنِ جان نہیں دل کی برابر اپنا

اور تو کون ہے جو عشق میں ہمسر ہو مرا — قیس و فرہاد کو گنتا نہیں ہمسر اپنا

باعثِ زندگی اُس کی ہے فقط آتشِ عشق — سینہ آتشکدہ اور دل ہے سمندر اپنا

کیا کروں میں تو نہ جاؤں کبھی اُس در پہ ولے — چین لیتا نہیں یک دم دلِ مضطر اپنا

عشق میں رونے سوا اور نہیں بن آئے ہے — زور چلتا ہے تو آنکھوں ہی کے اوپر اپنا

تیری بیداد کی فریاد کروں حشر میں گر — عین محشر میں جدا ایک ہو محشر اپنا

آصف الدولہ سوا دونوں جہاں میں واللہ
نہ کوئی دوست نہ کوئی یار نہ یاور اپنا

جبکہ ہم تیرے آستاں سے گئے — ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے

تیرے کوچہ میں نقشِ پا کی طرح — ایسے بیٹھے کہ پھر نہ یاں سے گئے

عشق ہاتھوں سے تیرے کیا کہئے — نام سے گزرے اور نشاں سے گئے

شمع کی طرح رفتہ رفتہ ہم — سو ایکدم کہ جسم و جاں سے گئے

ایک دن ہم نے یار سے یہ کہا — اب تو ہم طاقت و تواں سے گئے

ہنس کے بولا کہ سنتا ہے آصف
یوں ہی کہہ کہہ کے لاکھوں یاں سے گئے

ایجاز و حسنِ تحریر کے دو نادر نمونے

الفاظ کی باہمی مناسبت، مُراعات اور ایجاز و اختصار قدیم مصنفین اور اہلِ قلم حضرات کی ایک ممتاز خصوصیت تھی، چنانچہ اس کے بکثرت ایک سے ایک اعلیٰ نمونے دیکھنے میں آتے ہیں، فارسی کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ حافظ الملک حافظ رحمت خاں والی روہیلکھنڈ جب نواب شجاع الدولہ سے ۱۷۷۴ء کی جنگ روہیلکھنڈ سے پہلے مصالحت کی ہر کوشش میں ناکامیاب رہے تو جو آخری تحریر انھوں نے لکھکر بھیجی وہ یہ تھی:-

نواب صاحب مشفق مہربان قدر دانِ مخلصان سلمہ اللہ تعالیٰ۔

"اگر صلاحِ دولت یکشاں بہ صلح بہر نگ است بارک اللہ۔ دگر بہ ستیز و جنگ است بسم اللہ"

جواں مرداں نتابند از کسے رُوئے ہمیں میداں ہمیں چوگاں ہمیں گوئے

موجودہ زمانہ میں بہت کم لوگ ایسی انشاء پر قدرت رکھتے ہیں۔ الا نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی جیسے کہنہ مشق بزرگ جن کو لکھتے لکھتے جگ بیت گئے ہیں اور جن کا اشہبِ خامہ کسی میدان میں پیچھے نہیں رہتا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا تریپنواں سالانہ اجلاس ابھی حال میں جبلپور میں منعقد ہوا۔ مطبوعہ دعوت ناموں کے علاوہ خاص خاص لوگوں کو حسبِ معمول نواب صاحب اپنے قلم سے خطوط تحریر فرما رہے تھے۔ جب حیدرآباد دکن کے مشہور محقق و مورخ حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب کی باری آئی تو قلم برداشتہ حسبِ ذیل خط لکھا۔ ملاحظہ ہو:-

حکیم صاحب کرم فرما۔ السلام علیکم!

"آفتاب پہاڑوں کو منور و تابناک کرتا ہے۔ کیا بجا ہے اگر اپنے مہربان حکیم شمس اللہ قادری صاحب سے یہ تحریک ہو کہ جبلپور کو شرکت سے منور کیجئے۔ آئیے اور ضرور آئیے۔"

مخلص

صدر یار جنگ

[illegible]

ذکرِ ماضی

اور

فکرِ فردا

"سرسید اور اُن کے نورتن محسن الملک۔ وقار الملک۔ مولانا حالی۔ علامہ شبلی۔ مولوی سلیم پانی پتی۔ ڈاکٹر نذیر احمد۔ مولوی ذکاء اللہ۔ مولوی چراغ علی اور نواب عماد الملک نے ہندوستان کے سب سے بڑے تعلیمی و ثقافتی مرکز علی گڑھ کی ترقی پسند علمی و تحقیقی روایات کا آغاز کیا۔

عہدِ ثانی کے نورتن نواب صدر یار جنگ بہادر۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں۔ مولوی عبد الحق۔ مولانا طفیل احمد۔ مولانا ظفر علی خاں۔ سجاد حیدر یلدرم۔ مولوی عزیز مرزا اور مولوی عنایت اللہ نے روایات مذکورہ کو قائم و ترقی پذیر رکھا۔

تیسرے دَور کے نورتن۔ رشید احمد صدیقی۔ عبد الماجد دریابادی۔ خواجہ غلام السیدین۔ ڈاکٹر عابد حسین۔ ہاشمی فریدآبادی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ پروفیسر حبیب۔ قاضی تلمذ حسین اور پروفیسر الیاس برنی نے علی گڑھ کی علمی و ادبی رونق کو چار چاند لگا دیے۔

پہلی محفل کے نورتن اپنی اپنی آب و تاب دکھا کر رخصت ہو گئے۔ دُوسری مجلس کے بھی کچھ نورتن داغِ مفارقت دے گئے۔ عہدِ ثالث کے نورتن اپنی پوری درخشانی و تابانی کے ساتھ ہندوستان کی دُنیائے علم و ادب کو منوّر کئے ہوئے ہیں۔

اب چوتھے دَور کا آغاز ہے۔ سپیدۂ صبح نمودار ہو چکا ہے۔ نئی تزئین۔ اور نئے پھبن کے ساتھ ایک نیا دَربارِ علم و فن ترتیب دیا گیا ہے۔

دُوسرے اور تیسرے دَور کے بڑے بڑے ممتاز ارکان نمایاں نشستوں پر متمکن ہیں۔ مگر بیچ بیچ میں بہت سی کرسیاں خالی ہیں۔"

"سرسید علیہ الرحمہ نے ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو قائم کیا اور اُس کا سب سے بڑا مقصد اور نصب العین یہ رہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ہر ممکن اور مناسب طریقہ سے صحیح قسم کی تعلیم کو رائج کیا جائے۔ چنانچہ اُس نے گزشتہ اٹھاون سال کی مدت میں نہایت استقلال کے ساتھ تصنیف و تالیف و تراجم کے ذریعہ اسلامی لٹریچر اور تاریخ کی حفاظت۔ اُردو کی ترویج اور ترقی کے ذرائع کی بہم رسانی۔ معلومات تعلیمی کے لئے اعداد و شمار کی ترتیب و تدوین۔ اصلاحِ تمدن کے وسائل کی تحقیق و اشاعت۔ ضرورت مند طلبہ کو وظائف۔ مدارس و انجمن ہائے اسلامیہ کو امداد اور ملک کے طول و عرض میں صوبائی اور آل انڈیا تعلیمی کانفرنسوں کے انعقاد وغیرہ کی شاندار خدمات انجام دیں۔ لیکن ان کارناموں کے باوجود ہمارے گرد و پیش آجکل علمی تحقیق و تدقیق نیز تعلیمی۔ صنعتی اور اقتصادی تعمیر نو کی جو زبردست کوششیں جاری ہیں اُنکا اقتضا ہے کہ کانفرنس کے دائرۂ عمل میں مزید وسعت پیدا کیجائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر ۱۹۴۲ء کے سالانہ اجلاس کانفرنس بمقام کلکتہ۔ نواب کمال یار جنگ بہادر مرحوم مغفور کی فیاضی سے ایک تعلیمی تحقیقاتی کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا۔ کمیٹی مذکور نے جناب آنریبل سر عزیز الحق صاحب کامرس ممبر گورنمنٹ آف انڈیا کی قیادت میں ہندوستان کا طویل دورہ کرکے ایک رپورٹ تیار کی جو سالانہ اجلاس کانفرنس منعقدہ فروری ۴۳ء بمقام علیگڑھ منظور ہوئی۔

اس رپورٹ کی سب سے اہم اور مفید سفارش ایک "سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کا قیام ہے جس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے خان بہادر پروفیسر عبد المجید قریشی صاحب ایم۔ اے سکریٹری کمال یار جنگ ایجوکیشن کمیٹی و آنریری جوائنٹ سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے ایک مفصل اسکیم (بصورت رزولیوشن) ۱۱ر نومبر ۴۴ء کو میری تائید کے ساتھ کانفرنس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں پیش کی اور اجلاس مذکور نے بالاتفاق اُسے پاس کیا۔"

سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اغراض و مقاصد درج ذیل ہیں:-

(۱) اسلامی علوم اور اسلامیات کے وسیع مطالعہ اور اعلیٰ تحقیقات کے کام کی تنظیم۔

(۲) تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ لٹریچر جو یورپین اور مشرقی زبانوں میں موجود ہے اُس کا جائزہ۔

(۳) تاریخ۔ مذہب۔ فلسفہ۔ سائنس۔ ادب اور فنونِ اسلامیہ سے متعلق قدیم و جدید تحقیقات کے رجحانات کا مناسب تجزیہ۔

(۴) مسلم ہسٹری کی ایسی معیاری کتابوں کی تدوین اور اشاعت جو اسلام اور اُس کے کلچرل روایات کی تشریح کر سکیں اور جن کا مواد گہرے مطالعہ اور تحقیقات کا نتیجہ ہوں۔

(۵) ادبیات السنہ مشرقیہ اسلامیہ کی اشاعت و تحقیق کی ہمت افزائی۔

سر سید کے جانشین علمی اور "دربارِ علم کے "صدر الصدور" کا فرمان ہے کہ اُن کو پُر کیا جائے اور آج کے انعقادِ دربار کی یہی غایت ہے۔

کون کہاں بیٹھے اور کیا کام کرے، یہ فریضہ ایک "قریشی النسل حکیم و دانا" کو سپرد کیا گیا ہے۔

دربارِ علم کا نقیب حضرت "صدر الصدور" کے ایما پر اِس مُبارک کام کے افتتاح کی درخواست کرتا ہے

بیا کہ تازہ نوامی تراود از رگِ ساز ۔۔۔ مے کہ شیشہ گداز دبا غراندازیم

یہ تھا وہ "سپاس نامہ" جو جناب خان بہادر پروفیسر عبد المجید قریشی صاحب ایم۔ اے صدر شعبۂ ریاضی پروسٹ سرسید ہال۔ ممبر اگزیکیوٹو کونسل مسلم یونیورسٹی۔ ممبر ایجوکیشن بورڈ یو پی و آنریری جوائنٹ سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمت میں 'مجلس مصنفین' اور اُس کے سہ ماہی علمی رسالہ 'معنف' کے دفتر 'بیت المصنف' کی رسم افتتاح کے موقع پر، ۷ر نومبر ۱۹۴۴ء کو پیش کیا گیا۔ قریشی صاحب نے بھی تقریر فرمائی جو حد درجہ حکیمانہ اور ساتھ ہی پُر لطف تھی۔ 'معنف' کے صفحات کم ہونے کے باعث پوری تقریر نقل نہیں کیجا سکتی۔ البتہ وہ اشعار نذر ناظرین کئے جاتے ہیں جو موصوف نے مجھ ناچیز کے بارے میں ارشاد فرمائے ؎

ہر زماں یک تازہ جولاں گاہ میخواہم ازیں ۔۔۔ تا جنوں فرمائے من گوید دگر ویرانہ نیست

با چنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم ۔۔۔ در جنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

'بیت المصنف' کی رسم افتتاح کے ٹھیک چار روز بعد ۱۱ر نومبر ۱۹۴۴ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی میں جناب خان بہادر پروفیسر عبد المجید قریشی صاحب کی جانب سے "سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کے قیام کی اسکیم پیش ہو کر منظور ہوئی جسکی ملک کے اسلامی حلقوں میں آجکل دھوم ہے۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے قایم ہونے سے نہ صرف وقت کی ایک اہم ترین ضرورت پوری ہو گی۔ بلکہ مسلمانانِ ہند کے قدیم تعلیمی ادارہ کانفرنس کو بھی ایک نئی زندگی ملجائیگی۔ یہ ہے اُس خواب کی جاں نواز تعبیر جو راقم السطور نے متذکرۂ بالا سپاس نامہ سپردِ قلم کرتے وقت دیکھا تھا۔ ایک شاعرانہ اور موہوم تمنا کا اسقدر جلد بابِ اجابت تک پہنچ اور واقعہ کی شکل اختیار کر لینا ایسی عجیب و غریب خوش نصیبی ہے کہ اُس پر جسقدر بھی اظہارِ شکر کیا جائے کم ہے۔

ہمارے "دربارِ علم کے صدر الصدور" جناب ڈاکٹر الحاج مولوی محمد حبیب الرحمٰن خانصاحب شروانی آنریری سکریٹری کانفرنس نے سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی مجوزہ اسکیم کا تعارف کراتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:-

(ع) انسٹی ٹیوٹ بیرون جات کے علمی تحقیقات کرنے والے اصحاب کو بھی مالی امداد دے گا نیز اپنے اسٹاف اور لائبریری سے فائدہ اٹھانے کی سہولت بہم پہونچائے گا۔ ایسے تحقیقات کرنے والے لوگوں سے ان کے کام میں انسٹی ٹیوٹ اشتراکِ عمل بھی کرے گا، اگر ان کا کام انسٹی ٹیوٹ کے بنائے ہوئے پروگرام سے ہم آہنگ ہوگا۔

(ط) انسٹی ٹیوٹ اپنے اغراض و مقاصد اور اپنے علمی تحقیقاتی کام کو ہندوستان کی تمام تعلیم یافتہ مسلم آبادی میں مقبولیت حاصل کرانے کی غرض سے پروپگنڈے کے جدید وسائل مثلاً توسیعی تقریروں، تعلیمی نمائشوں اور آل انڈیا و صوبائی کانفرنسوں کے انعقاد کے طریقے بھی اختیار کرے گا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی مجلس منتظمہ نے ۱۳ دسمبر ۱۹۴۴ء کو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی اسکیم کی مشرح تفصیلات قلم بند کرنے آمد و خرچ کے پہلو پر غور کرنے اور اسکیم مذکور کو کانفرنس کے موجودہ نظامِ عمل میں مدغم کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی کا بھی با اختیار اضافہ تقرر کیا ہے جو اپنی سب کیٹیاں مقرر کرنے اور عہدہ دار منتخب کرنے کی مجاز ہوگی۔ نیز اپنی رپورٹ ورکنگ کمیٹی کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے آخر جنوری ۱۹۴۵ء تک پیش کرے گی۔

امید ہے کہ آخر جنوری تک کمیٹی کا کام ختم ہو نے اور فروری مارچ میں کانفرنس کا نیا سالانہ بجٹ منظور ہو جانے کے بعد اپریل ۱۹۴۵ء میں انسٹی ٹیوٹ قایم ہو جائیگا۔ انشاء اللہ!!

گزشتہ سرماہی کا پورا وقت پونا۔ بمبئی۔ اورنگ آباد اور حیدر آباد کے تعلیمی سفر۔ کانفرنس کے سالانہ انتخابات اور سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سلسلہ کی غیر معمولی مصروفیتوں میں کچھ اس طرح گزرا کہ "مجلس مصنفین" اور "مصنف" کی جانب بہت کم توجہ ہو سکی۔ اسی وجہ سے اس مرتبہ "بزم مصنف" بہت مختصر ہے۔ تاہم جیسی کچھ بھی ہے حاضر ہے۔

بزم مصنف

قاضی احمد میاں اختر صاحب جوناگڑھ "بیت المصنف" کا افتتاح مبارک ہو۔ سپاس نامہ ملگیا تھا۔ طرزِ نگارش کی ندرت کے کیا کہنے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ! "بیت المصنف" کے لئے عنقریب کتابیں جمع کرکے روانہ کروں گا۔ میری تصنیفات بھی اُس میں شامل ہونگی۔ کچھ دن اور انتظار کیجئے۔

(۶) اسلامیات سے متعلق ایک میوزیم اور ریسرچ لائبریری کا قیام جس میں قلمی کتابیں، نادر قطعات، فرامین، نقاشی کے نمونے، تعاویر اور ایسی چیزیں جمع کی جاویں جن سے اسلامی تاریخ اور کلچر کے مطالعہ میں مدد ملے اور ایسی چیزیں ہندوستان یا جس جگہ بھی موجود ہوں اُن کی فہرستیں تیار کرنا۔

(۷) ایک سہ ماہی انگریزی رسالہ موسومہ "اسلامک ریسرچ" جاری کرنا اور اُس میں مسلمان علماء اور محققین کی تحقیقات کے نتائج شائع کرنا۔

(۸) انسٹی ٹیوٹ کا ایک اپنا پریس قائم کرنا جس میں اُنکا رسالہ، کتابیں اور دوسرا اُردو کا کام چھاپا جاسکے۔

(۹) علمی تحقیقات کے دوسرے اداروں سے اتحاد عمل کرنا۔

(۱۰) انسٹی ٹیوٹ کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے کاموں کی ہمت افزائی کی غرض سے حسب ضرورت وظائف، انعامات اور مالی امداد دینا۔

(۱۱) ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون کی ترقی اور اشاعت کے لئے ایسے دوسرے طریقے اختیار کرنا جو وقتاً فوقتاً انسٹی ٹیوٹ کے مناسب حال ہوں۔

مذکور الصدر اغراض و مقاصد کی روشنی میں :-

(ا) "اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کا کام آٹھ سیکشنوں میں تقسیم ہوگا۔

(ب) ہر ایک سیکشن کا کام ایک ایک ممبر اسٹاف کے چارج میں ہوگا۔

(ج) ممبران اسٹاف اُن خاص مضامین میں جو اُن کو سپرد کئے جائیں گے اپنی اپنی تحقیقات کا کام جاری رکھیں گے۔

(د) ممبران اسٹاف ایک ایک سال کا اپنا پیشگی کام تجویز کریں گے اور انسٹی ٹیوٹ کا ڈائرکٹر اس کام کی نگرانی کرے گا اور اس کی مناسب تنظیم کرے گا۔

(ہ) ممبران اسٹاف اپنے اپنے مضامین کی تحقیقات کے موضوع کے انتخاب میں اس امر کا خاص لحاظ رکھیں گے کہ اُن سے بالکل نئی معلومات کا دروازہ کھلے یا وہ ایسی ہوں کہ اُن پر دوسرے لوگوں نے بہت ہی کم کام کیا ہو۔

(و) تاریخ اسلام اور ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ کے سیکشن کا یہ فرض ہوگا کہ علاوہ عام تحقیقاتی کاموں کے وہ تاریخ کی ایسی کتابیں تیار کریگا جو ہندوستان کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہوسکیں۔

(ز) ممبران اسٹاف انسٹی ٹیوٹ کے وظیفہ یاب ایسے ودو ریسرچ اسکالرس کی رہنمائی کا کام بھی انجام دیں گے جن کو مسلم یونیورسٹی کے مختلف شعبہ ہائے تعلیمی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریوں کیلئے مقالے تیار کرنے کے لئے داخل کیا ہو۔

مولوی سید عبدالحمید صاحب تاج محل جنرل سکریٹری بزم نظیر آگرہ | رسالہ "معنف ۳ء" موصول ہوا۔ مضمون "ظفر کی شاعری" جس خوبصورتی سے قلمبند کیا گیا ہے بالکل نیا طرز ہے۔ مختصر اور تاریخی نقطۂ نظر سے گراں مایہ ہے۔ میاں نظیر اکبرآبادی کو مورخین اور اہل قلم حضرات نے فراموش کر دیا ہے کاش آپکی توجہ ہو جائے تو بہت کام ہو۔ نظیر اکبر آباد کا آخری اور پہلا شاعر تھا۔

پروفیسر طاہر صاحب فاروقی آگرہ کالج آگرہ | معنف کا نیا شمارہ ملا۔ بقامت کہتر کے ساتھ بقیمت بہتر نکلا۔ مگر میں اس پر کوئی رائے نہیں لکھتا اس لئے کہ آپ رایوں کو چھاپ کر ہم لوگوں کی تشہیر کرنیکا خاص "ادبی شوق" رکھتے ہیں۔ پس آپ ٹھیرے خطرناک قسم کے آدمی اور ایسے حضرات سے دُور رہنا ہی اچھا ہے۔

ملاقات اور لطف صحبت کو عرصہ ہو گیا یہ آشتیٔ چشم و گوش تکلیف دہ ہوتی جا رہی ہے کیا آپ بھی میری طرح قطب بنتے جا رہے ہیں، مجھے تو احباب نے قطب کا خطاب دے ہی دیا ہے آپ بجائے قطب کے ابدال بنتے تو بہتر ہے تاکہ مدارج سلوک بہ آسانی طے ہوں۔ اور شہود و مشاہدہ کے اعلیٰ درجات تک ہم دونوں کی رسائی ہو جائے۔ "سیرت اقبال" کا نیا ایڈیشن اس کساد بازاری میں شائع ہوا ہے۔ میری درخواست پر ناشرین نے آپکو ایک جلد ارسال کی ہے قبول فرمائیے اور ممنون کیجئے۔

مجلس کے جلسے

اُنچاسواں جلسہ ۴۹ | مجلس معنفین کا ۴۹ واں جلسہ زیر صدارت مولوی ابرار حسین فاروقی صاحب ایم۔ اے .... سات نومبر ۴۴ء پانچ بجے شام کانفرنس لائبریری سلطان جہاں منزل علیگڑھ میں جناب مولوی ظہیر الدین علوی صاحب کی دعوت عصرانہ پر منعقد ہوا اور علوی صاحب ہی نے "اردو شاعری میں خمریات" کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ اسی جلسہ میں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا "بیت المعنف" کی رسم افتتاح ادا کی گئی۔

پچاسواں جلسہ ۵۰ | ۲۱ نومبر ۴۴ء کو زیر صدارت ڈاکٹر محمد رفیق احمد خانصاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی چیرمین شعبۂ نباتات مسلم یونیورسٹی ½۴ بجے شام کانفرنس لائبریری میں جناب مولانا ضیاء احمد صاحب ایم۔ اے اُستاد شعبۂ فارسی کی دعوت چائے پر منعقد ہوا۔ اور اس میں ڈاکٹر راجہ غلام سرور صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے اپنا مقالہ "کتب خانہ اُچ شریف گیلانی

حضرت نواب صدر یار جنگ بہادر قبلہ ہماری مجلس علم و ادب کے آخری صدر نشین ہیں اور اس تاریک ملک میں تیرہ بختوں کے روشن چراغ، اسلاف کے نام لیوا بزرگوں میں اس وقت انکی ذات اقدس مغتنمات سے ہی۔ آپنے حضرت موصوف کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہی وہ حرف بحرف صحیح اور اس سے مجھے کلی اتفاق ہے۔ اور میں آپ کی اُس دعائے خیر میں شریک ہونے کو اپنا اسلامی اور قومی فرض سمجھتا ہوں اور زور دروں سے آمین کہتا ہوں۔

پروفیسر محمد محفوظ الحق صاحب صدر شعبۂ عربی و فارسی پریسیڈنسی کالج کلکتہ رسالہ معنف کی دوسری جلد کا ملا آج سے پہلے آپ کا رسالہ میری نظر سے نہیں گزرا تھا اور افسوس کرتا ہوں کہ کیوں نہیں گزرا۔ اس نمبر کے مضامین علمی و تحقیقی ہیں۔ اور مجھے بیحد پسند ہیں۔ آپ کے رسالہ کا معیار بلند ہے اور ہمیشہ بلند رکھئے۔

مولوی ساجد علی صاحب مہتمم تعلیمات اورنگ آباد دکن معنف کا شکریہ رسالہ کے دونوں مضامین (ظفر کی شاعری اور غالب نے اردو خطوط نویسی کب سے شروع کی) اچھے ہیں، کاش میں معنف کے دوسرے پرچے بھی دیکھ سکتا۔ رسالہ میں مصنفین کی تصنیفات کا ذکر بھی کر دیا جایا کرے تو ان کی علمی حیثیت کا اندازہ ہونے میں مدد ملے۔

مولانا سید طفیل احمد صاحب ستمبر ۴۷ء کے معنف میں اپنے اظہر صاحب رضوی کے متعلق میری رائے کا تذکرہ فرمایا ہے، میں یقیناً رضوی صاحب کی تبصرہ نگاری اور انکے لٹریچر کا جو میں معنف میں پڑھتا ہوں بہت معترف ہوں مگر میری یہ رائے سر سید رضا علی کے اعمالنامے کے تبصرہ کے سلسلہ میں نہیں ہی۔ جو رضوی صاحب نے لکھا ہی اس وقت میری ذہن میں نہیں ہے کہ رضوی صاحب نے اعمالنامہ کے بارہ میں کیا لکھا ہے۔ اُنکی رائے جو کچھ بھی ہو مگر خود مجھ پر اعمالنامہ کی خوبیوں کا بڑا اثر ہے۔ سر سید رضا علی صاحب کی خدمت میں مجھے قدیم نیازمندی کا فخر حاصل ہی اور میں اُنکی اعلیٰ ذہنی اور اخلاقی خوبیوں، محبت، مروت، وضعداری اور انگریزی زبان دانی میں بلند مرتبہ کا ہمیشہ سے معترف رہا ہوں مگر اعمالنامہ کے مطالعہ سے قبل اُردو زبان میں اُن کی سحر بیانی کا اندازہ نہ تھا ایک بار تو اسکے سرسری مطالعہ سے متاثر ہو کر بے اختیار اسکا تبصرہ لکھنا شروع کیا مگر قبل اس کے کہ وہ مکمل ہو کتاب احباب میں گشت کرنے لگی اور جس کے ہاتھ پڑ جاتی ہے بمشکل چھوٹتی ہے۔ ایک میرے محترم دوست نے تو اسکی نسبت فرمایا ہی کہ میں نے اُردو زبان میں اسقدر دلکش اور دلفریب کتاب دیکھی ہی نہیں۔ بہرحال اسوقت تھی اعمالنامہ پر ریویو کرنا نہیں ہے صرف مختصر طور پر اُس دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب کے تاثرات کا اظہار کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نواب صدیق حسن خاںؒ

(از جناب مولوی محمد عزیز صاحب ایم۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی لکچرر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

صدیق حسن نام۔ والا جاہ امیر الملک نواب صدیق حسن خاں بہادر خطاب۔ حسینی سید تھے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے تعلق کا یہ شرف ۳۳ پشتوں سے قائم تھا۔

آپ کے دادا سید اولاد علی خاں کو ریاست حیدرآباد دکن سے نواب انور جنگ بہادر کا خطاب اور پانچ لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر ملی تھی۔ اس کے علاوہ ہزار سوار و پیادہ کی افسری اور گولکنڈہ کی قلعہ داری کی عزت بھی حاصل تھی۔ ۱۲۱۸ھ میں نواب انور جنگ نے حیدرآباد میں وفات پائی۔ انھوں نے نواب شمس الامرا بہادر کی بہن بیگم کے خاندان میں جو پھوپھی کے لقب سے مشہور تھیں، ایک عقد کر لیا تھا مگر اُس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اپنے اصلی وطن قنوج میں جو شادی کی تھی اُس سے ایک لڑکا سید اولاد حسن اور ایک لڑکی منوں بی بی اُن کی وفات کے وقت موجود تھیں۔ اُن کے انتقال کے بعد سید اولاد حسن بحیثیت وارث اصلی حیدرآباد طلب کیے گئے۔ مگر یہ اپنا آبائی مذہب امامیہ ترک کر کے اہل سنت والجماعت کے زمرہ میں شامل ہو چکے تھے۔ ان کے زہد و اتقا نے ترکۂ پدری کو ہاتھ لگانا گوارا نہ کیا۔

سید اولاد حسن کی ولادت ۱۱۸۵ھ میں قنوج میں ہوئی۔ اُن کے والد نواب انور جنگ بہادر نے حیدرآباد سے تعلق قائم ہو جانے کے بعد وطن سے رشتہ توڑ دیا تھا۔ اس لئے بچپن ہی سے یہ باپ کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے اور محض اپنے ذوق سلیم کی رہنمائی میں علم حاصل کرنا شروع کیا۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم کے بعد شیخ عبدالقادر قنوجی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے جن کا شمار اُس زمانہ کے نامور علماء و مشائخ میں تھا۔ علم کی پیاس اُنھیں قنوج سے لکھنؤ اور پھر لکھنؤ سے دہلی لے گئی۔ جہاں خاندان ولی اللٰہی کے فیض کا چشمہ جاری تھا۔ شاہ رفیع الدین صاحبؒ اور

ریاست بھاولپور" پڑھا۔

اس جلسہ میں ریاست حیدرآباد دکن کے مشہور آرٹسٹ مسٹر افضل حسینی بھی شریک ہوئے اور ختم مقالہ کے بعد موصوف نے نہ صرف اپنی نادر تصاویر دکھائیں۔ بلکہ ہندوستان کی غریبی اور مغرب زدگی پر ایک پُر اثر تقریر بھی فرمائی۔

رسالہ کا کوٹا ہمارے معاونین کو اس اطلاع سے ایک گونہ اطمینان ہوگا کہ 'معنف' کے لئے بقدر اُس کی نصف ضخامت کے کاغذ کا کوٹا مقرر ہوگیا۔ جس کی وجہ سے اس مرتبہ ہم ۴۸ صفحات کے بجائے ۷۲ صفحات کا پرچہ شایع کر رہے ہیں، خدا سے دعا ہے کہ بقیہ نصف کی بھی جلد از جلد اجازت حاصل ہوجائے اور ہم بدستور ڈیڑھ سو سے دو سو صفحات کا 'معنف' شایع کرسکیں۔

ضخامت کی کمی کے باعث جس طرح 'تاریخی نوادر' اور اردو نثر کے بہترین نمونوں کا سلسلہ رُکا ہوا ہے۔ اُسی طرح موصولہ کتابوں پر ہمارے مستقل تبصرہ نگار سید اظہر حسین رضوی صاحب کے تبصروں کی اشاعت بھی بند ہوگئی ہے۔ ضخامت میں اضافہ ہوتے ہی انشاءاللہ اظہر صاحب کے تبصرے پیش کئے جائیں گے۔

وفیات ۱۶ مارچ ۴۴ء کو میری ایک ہی حقیقی ہمشیر کے انتقال کے بعد ۲۱ ستمبر ۴۴ء کو ایک جوان العمر بھتیجی داغِ مفارقت دے گئی جسے اُس کے والدین کے انتقال ہوجانے کی وجہ سے میں نے اپنی لڑکی کی طرح پالا تھا اور ابھی دو سال ہوئے شادی کی تھی۔

مخدومی مولانا سید طفیل احمد صاحب قبلہ میرے سب سے بڑے غمگسار تھے کہ خود اُن کے یہاں ۸ دسمبر ۴۴ء کو اُنکے بڑے بھتیجے برادرم خلیل احمد کاظمی سینیر مارکٹنگ انسپکٹر لکھنؤ کا اچانک قلب کی حرکت بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ اسی سہ ماہی میں ایک اور سانحۂ ارتحال ہوا وہ بھی قلب کی حرکت بند ہونے سے ۲۶ ستمبر ۴۴ء کو جناب مولوی نصیر الحق صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) سب جج بھوپال کا ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون مرحوم کے دو عالمانہ مقالات "خودشناسی کی ضرورت اور مشکلات" نیز "قیامت اور سائنس" معنف ۹ بابتہ مئی ۴۴ء اور معنف ۱۰ بابتہ جون ۴۴ء میں ناظرین کرام نے ملاحظہ فرمائے ہوں گے!!

نہ دے نامہ کو اتنا طول غالب مختصر لکھدے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جُدائی کا

سید الطاف علی بریلوی
مدیر رسالہ

"میں یتیم تھا۔ کوئی مرد میرے اقربا میں ایسا نہ تھا کہ وہ مجھ کو پرورش کرتا۔ ہم دو بھائی تین خواہر نے کنار مادر میں تربیت پائی۔ ظاہر میں کوئی ذریعہ رزق کا نہ تھا۔ محض اللہ تعالیٰ نے ہم کو خزانۂ غیب سے پالا۔ مریدین والد مرحوم اگرچہ کثرت سے تھے خصوصاً اہلِ حرفہ جن کی اولاد ابتک باقی ہے۔ لیکن کوئی متکفل معاشں کا نہ تھا۔ محض اللہ تعالیٰ پر توکل تھا۔ والدہ مغفورہ مرحومہ نے بعد والد مرحوم کے معلم مقرر کر کے قرآن شریف و گلستاں و بوستاں وغیرہ پڑھوائی سید احمد حسن برادر کلاں ذہین شخص تھے اور دو برس مجھ سے بڑے تھے۔ وہ جلد فارسی سیکھ کر عربی پڑھنے لگے۔ گھر میں کتاب خانہ والد مرحوم کا تھا۔ جب شیخ حسینی خادم والد مرحوم کتابوں کو دھوپ دیتے ہمارا کھیل یہی تھا کہ ہم ایک ایک کتاب کھول کر ہر جگہ سے دیکھتے پڑھتے۔ کوئی جگہ سمجھ میں آتی کوئی نہ آتی۔ محض ورق گردانی کی برکت سے شوق علم کا دل میں پیدا ہو گیا۔ پھر سید محمد علی مرحوم ساکن فرخ آباد بوجہ ارادت والد مرحوم مجھ کو اپنے گھر لے گئے۔ چند ماہ بدفعات وہاں رہ کر کچھ عربی پڑھی مگر حالت بے نیازی اور غفلت میں۔ پھر بعض مریدین واسطے طلب علم کے کانپور لے گئے۔ یہاں بھی کچھ کچھ پڑھا۔"[۵۱]

ایک دیندار ماں کی آغوش میں جیسی تربیت پائی اُس کا حال بھی اُنھیں کی زبانِ قلم سے سُنئے۔ فرماتے ہیں :۔

"میں سات برس کا بچہ تھا۔ میرے گھر کے دروازہ پر مسجد تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ وقت صبح سوتا ہوتا تھا۔ بجز دادا ان کے والدہ مرحومہ مجھ کو اُٹھا کر وضو کرا کر مسجد میں بھیج دیتی تھیں۔ کبھی گھر میں نماز پڑھنے نہ دیتیں۔ اگر نیند کی سستی سے نہ اُٹھتا منھ پر پانی ڈال دیتیں۔ اس سبب سے عادت نماز کی لڑکپن سے برابر رہی۔ پھر دس برس کی عمر میں شاید روزہ رکھوایا۔ تب سے عادت صوم کی پڑی۔"[۵۲]

اکیس سال کی عمر میں تحصیل علم کی غرض سے دہلی گئے اور وہاں کے ارباب کمال کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ قیام دہلی کا ذکر یوں کرتے ہیں :۔

"کانپور سے قاضی کو ساکن چھپرا مئو مجھ کو شوق دلا کر دہلی لے گئے۔ قریب دو برس کے

---

[۵۱] ابقاء المنن بالقاء المحن ۔ مطبع شاہ جہانی، بھوپال، ۱۲۹۰ھ ۔ ص ۱۲

[۵۲] " " " " " " " ص ۱۳

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے فقہ، حدیث اور تفسیر پڑھی اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی مجلسوں میں بیٹھنے کی سعادت حاصل کی۔ اس کے بعد حضرت سیّد احمد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کے ہاتھ پر بیعت کی اور جب سیّد صاحبؒ نے سکھوں سے جہاد کے لئے پنجاب اور سرحد کا سفر اختیار کیا تو یہ بھی ہمرکاب رہے۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد سندِ خلافت لے کر سیّد صاحب کے ارشاد کے بموجب وطن لوٹ آئے اور آخر عمر تک نہایت سرگرمی کے ساتھ تبلیغ و ہدایت کی خدمت انجام دیتے رہے۔ سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اُن سے بڑی محبت تھی، اور ہمیشہ "سیّد برادر" کے لفظ سے مخاطب فرماتے تھے۔ آپ کے دوسرے خلفا کی طرح سیّد اولاد حسن صاحب کی ہدایت و ارشاد میں بھی اللہ تعالیٰ نے بڑی تاثیر دی تھی۔ چنانچہ قنوج اور نواحِ قنوج کے دس ہزار آدمیوں سے زیادہ مُرید ہو کر بدعت سے تائب اور سنّت کے پابند ہوگئے اور کئی ہزار ہندو اسلام سے مشرف ہوئے[51]۔ ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۲ء میں انتقال فرمایا۔

سیّد صدیق حسن ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۸۳۲ء اپنی ننھیال بانس بریلی میں پیدا ہوئے۔ اِن کی والدہ مفتی محمد عوض صاحب مرحوم کی صاحبزادی تھیں جو علم و فضل اور زہد و توکّل میں ممتاز اور بریلی کے مفتیِ اسلام مشہور تھے۔ استغنا کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ نواب آصف الدولہ بہادر بریلی آئے تو مفتی صاحب سے ملنے گئے اور زرِ نقد و جواہر مع سند جاگیر نذر میں پیش کیا مگر آپ نے قبول نہ فرمایا اور معذرت کر کے واپس کر دیا۔

صدیق حسن خاں کی عمر پانچ سال کی تھی کہ یتیم ہوگئے۔ بڑے بھائی سیّد احمد حسن بھی جو عمر میں صرف دو سال بڑے تھے ابھی لڑکے تھے۔ چونکہ سیّد اولاد حسن مرحوم نے تبدیلِ مذہب کی وجہ سے تمام رشتہ داروں سے جو شیعہ تھے قطع تعلق کر لیا تھا اس لئے اقربا میں بھی ان یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہ تھا۔ ترکۂ پدری میں ایک مختصر کتب خانہ، دو تین باغ، کسی قدر زمین اور ایک مکان ہاتھ آیا تھا۔ حیدرآباد کی جائداد سے سیّد اولاد حسن مرحوم پہلے ہی دست بردار ہوگئے تھے۔ ان بچّوں کی کفالت اور تعلیم و تربیت کی ساری ذمہ داری والدہ ماجدہ پر عائد ہوئی۔ نواب صاحب مرحوم اپنی خود نوشت سوانح عمری ابقاء المنن بالقاء المحن میں اپنے ابتدائی حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

---

51 مآثرِ صدیقی مؤلفہ نواب علی حسن خاں مرحوم۔ حصہ اول ص ۵۴-۵۵

ختم ہوا۔ ایک کرایہ کے مکان میں اُترے۔ بھوپال میں کوئی ایسا شناسا نہ تھا جو نواب سکندر بیگم کی خدمت میں اِن کی سفارش کرتا۔ اتفاق سے شیخ علی عباس صاحب مرحوم چریا کوٹی وہاں موجود تھے۔ وہ غالباً ان کے والد مرحوم سے واقف تھے۔ بڑی ہمدردی فرمائی اور مدار المہام ریاست منشی محمد جمال الدین خاں بہادر سے اِن کی سفارش کی۔ مدار المہام صاحب مرحوم دولت و اقتدار کے باوجود نہایت خدا پرست، علم دوست، قدر شناس اور وسیع الخلق بزرگ تھے۔ انھوں نے اِس غریب الوطن کی سرگزشت بیگم حاجہ کے گوش گزار کی۔ اُنھوں نے فوراً نقیب بھیج کر طلب فرمایا اور بڑے اخلاق سے پیش آئیں اور ان سے گفتگو کر کے بہت خوش ہوئیں۔ مدار المہام صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا "یہ تو اس قابل تھے کہ ان کو اپنے سایۂ عاطفت یعنی دامادی میں لیتی مگر مجبوری یہ ہے کہ میں اِن سے قبل ایک صاحب کو نواب شاہ جہاں بیگم سے منسوب کر چکی ہوں اور حسب قرارداد صدر (گورنمنٹ آف انڈیا) وہ نامزد ہو چکے ہیں"۔ [۵۱]

دوسرے روز پھر طلب فرمایا اور اب کی بار پہلی مرتبہ سے بھی زیادہ التفات فرمایا اور یکم رمضان سنہ ۱۲۷۱ھ سے آستانۂ خاص کے ملازموں میں منشی گیری کی خدمت پر بعوض بیس روپئے ماہوار مقرر کیا۔ چند مہینوں کے بعد ریاست کی میر دبیری خالصہ کی خدمت خالی ہوئی تو اس پر پہلے چالیس روپئے اور پھر پچاس روپئے ماہوار مشاہرہ پر مقرر کیا۔ اس کے بعد سرکار سے میر دبیری کا خلعت بھی عنایت ہوا۔ جس کی مجموعی قیمت ایک سو پندرہ روپئے تھی۔ بدقسمتی سے وہ خلعت کوئی چُرا لے گیا۔ یہ امر غالباً بیگم حاجہ کو ناگوار خاطر ہوا۔ اسی سال کے آخر میں سابق میر دبیر منشی عبد العلی خاں (جو مشہور شاعر میاں مسکین کے بیٹے تھے) اپنے عہدہ پر واپس بلا لئے گئے۔ نواب سکندر بیگم نے عبد العلی خاں کی تقصیرات معاف کر دیں اور صدیق حسن خاں کو میر دبیری کی جگہ خالی کرنی پڑی۔ دوسری بدقسمتی یہ کہ اِسی زمانہ میں مولانا علی عباس صاحب مرحوم سے حقہ کی اباحت اور کراہت کے متعلق مناظرہ ہوا۔ صدیق حسن خاں اس کی اباحت کے قائل تھے اور مولانا کراہت کے۔ مناظرہ نے مناقشہ کی صورت پکڑی اور مناقشہ سرکاری خدمت سے معزولی کا سبب ہوا۔ خود لکھتے ہیں:۔

"بے فائدہ باں یار عزیز طرف شدم و محسن قدیم را کہ باعث ایں ملازمت بود بر سر اساءت آوردم صحبت باہم گیر ایں فساد۔ نوبت ایں ناخوشی بعزل من کشید۔ بیکار شدم"۔ [۵۲]

---

۵۱ ماثر صدیقی حصہ دوم ص ۲۰

۵۲ " " " ص ۲۲-۲۳

وہاں رہنا ہوا۔ مولوی بشیر الدین قنوجی بن ناظم کریم الدین مرحوم وہاں وارد تھے۔ دو تین روز انھوں نے مہمان رکھا۔ پھر مفتی محمد صدر الدین خاں صاحب مجھ کو آکر لے گئے اور مکان نواب مصطفیٰ خاں مرحوم میں ٹھیرایا۔ یہ مکان متصل چتلی قبر کے تھا۔ پھر مفتی صاحب سے سبق شروع کیا۔ کتب علوم آلیہ مرتب پڑھی۔ اس جگہ مولوی نوازش علی واعظ اور خواجہ ضیاء الدین واعظ شاگرد مولوی قطب الدین مرحوم اور مولوی عبد الخالق اور مولوی حفیظ اللہ واعظ اور مولوی عبد الکریم اور مولوی محبوب علی اور مولوی قطب الدین مترجم مشکوٰۃ شریف اور مولوی سید نذیر حسین صاحب اور ہر گروہ کے علمائے موجودین کو دیکھا۔ اگرچہ زیادہ صحبت کسی عالم کی نہیں ہوئی اور مولوی نصیر الدین واعظ جامع مسجد کو بھی دیکھا۔ یہ زمرۂ سید احمد صاحب میں سے تھے۔ اور طلبہ مستعدین میں مولوی فیض الحسن سہارن پوری اور رفقاء نواب صاحب مقیم حال مکہ معظمہ کو پایا اور مولوی فضل حق خیر آبادی کو دیکھا۔ پھر اُن کے فرزند مولوی عبد الحق سے بارہا گر جلسۂ قیصریہ میں بمقام دہلی ملاقات ہوئی۔ اور خانقاہ مرزا مظہر جانجاناں قدس سرہٗ میں شاہ احمد سعید و شاہ عبد الغنی کو پایا۔ شعراء میں مرزا غالب دہلوی اور شیخ ابراہیم ذوقؔ و امام بخش صہبائی اُس وقت تک زندہ تھے۔ اُمراء میں نواب مصطفیٰ خاں مرحوم اور نواب امین الدین خاں .... ضیاء الدین خاں اور اُن کی اولاد کو پایا۔ نواب امین الدین خاں نے چاہا تھا کہ مجھ سے نکاح اپنی دختر کا کر دیں۔ مفتی صاحب کے ذریعہ سے تحریک بھی کی تھی مگر وہ مغل تھے اس لئے میں نے منظور نہ کیا۔ زمانۂ قیام دہلی میں اندرِ قلعہ کے بہادر شاہ اور اُن کے ولی عہد مرزا فخر الدین وغیرہ شاہزادگان کو پایا۔ حکماء میں حکیم امام الدین خاں و حکیم احسان اللہ خاں کو دیکھا۔ یہ تو سب کچھ ہوا مگر کوئی ایسا نہ ملا جو دُنیا سے دست بردار ہو اور تعالےٰ کا خدمتگار ہو ؎

در مسجد و خانقہ بسے گردیدم | بس شیخ و مرید را کہ پا بوسیدم
نے یک ساعت ز ہستی خود رستم | نے آنکہ ز خویش رستہ باشد دیدم "[۵۱]

علوم متداول سے فراغت حاصل کرنے کے بعد مفتی صاحب سے وطن واپس جانے کا قصد ظاہر کیا۔ اُنھوں نے اجازت کے ساتھ سند تکمیل تعلیم بھی عنایت کی۔ گھر پہونچے تو فکرِ معاش دامنگیر ہوئی۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں کے قیام کے بعد قسمت آزمائی کے لئے بھوپال کا رُخ کیا۔ چھبیس[۲۶] روز میں یہ سفر

۵۱۔ ابقاء المنن بالقاء المحن۔ مطبع شاہجہانی، بھوپال، ۱۳۰۵ھ۔ ص ۱۴

شی جمال الدین خاں بہادر سے ملے اور اپنی سرگزشت بیان کی۔ انھوں نے بڑی ہمدردی
ہائی اور نواب سکندر بیگم سے سب حال عرض کیا۔ چونکہ فرمان کو صادر ہوئے عرصہ ہو گیا تھا اور
ں غرض نے تاخیر سے فائدہ اُٹھا کر بیگم صاحبہ کو صدیق حسن خاں کی طرف سے برگشتہ کر دیا تھا
س لئے اُنھوں نے نہ صرف ملازم رکھنے سے انکار کر دیا بلکہ اُن کے شہر سے چلے جانے کا حکم
ی جاری کیا۔ ہندوستانی ریاستوں کے ارکان کی دراندازیاں اور اُن کے فرمانرواؤں کی
نیتیں اکثر حیرت انگیز ثابت ہوئی ہیں۔ صدیق حسن خاں نے یہ شعر پڑھا اور بھوپال سے روانہ ہو گئے ؎

تا از بھوپال گزشتیم تو دل شاد نشیں
قفل بر در مزن و خار بہ دیوار منہ

یسی میں ریاست ٹونک پہونچے۔ چونکہ وہاں کے والی نواب وزیر الدولہ مرحوم حضرت سید احمد صاحب رح
ے مرید تھے انھوں نے صدیق حسن خاں کو بڑے اصرار سے روکا اور پچاس روپیہ ماہانہ مشاہرہ
رر کر دیا۔ آٹھ مہینے یہ ٹونک میں رہے۔ وہاں اُن کی بڑی دلجوئی اور خاطر داری کیجاتی تھی مگر
ز معاشرت کی ناموافقت سے ہمیشہ برداشتہ خاطر رہتے تھے۔ آخر ملازمت ترک کرنے کے ارادہ
ے چار مہینے کی رخصت کی درخواست نواب صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ ابھی اس پر کوئی حکم نہیں
ا تھا کہ سکندر بیگم کی جانب سے منشی جمال الدین خاں بہادر کا ایک فرمان ان کی طلبی کے لئے پہونچا۔
تراپرداز وں کی تمام کوششوں کے باوجود یہ بار بار طلب کیا جانا صاف اشارہ تھا کہ دستِ قضا
نے بھوپال کی ریاست ان کے نام کے سامنے لکھدی ہے۔ چنانچہ ۱۰ محرم ۱۲۷۶ھ ۱۸۵۹ء کو تیسری بار
یاست کی تاریخ نگاری کی خدمت تفویض ہوئی اور پچھتر روپئے ماہوار مشاہرہ مقرر ہوا۔ بیگم صاحبہ
ی یہ عنایت دیکھ کر ٹونک کی ملازمت سے استعفےٰ دیدیا۔

مدار المہام صاحب مرحوم پہلی ہی ملاقات سے صدیق حسن خاں کے علم و فضل اور خدا پرستی کے
ر شناس تھے اور ان سے محبت کرتے تھے۔ اس محبت کو مستحکم کرنے کی غرض سے اُنھوں نے چاہا
کہ اپنی صاحبزادی زکیہ بیگم کا نکاح ان کے ساتھ کر دیں۔ یہ صاحبزادی بیوہ تھیں۔ مدار المہام صاحب مرحوم
ہایت پابند شرع بزرگ تھے اور آیۂ کریمہ فَانْکِحُوا الْاَیَامیٰ مِنْکُمْ کے مطابق ان کے نکاح ثانی
ی فکر میں تھے۔ صدیق حسن خاں نے اس رشتہ کو مبارک خیال کیا۔ چنانچہ ۲۵ شعبان ۱۲۷۷ھ کو
ہر فاطمی پر نکاح ہو گیا۔

اب سے (ستر) برس پہلے نکاح ثانی شرفا میں نہایت معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ یہ صرف

سلسلۂ ملازمت منقطع ہوگیا تو وطن واپس ہوئے مگر روزگار کی فکر نے پھر گھر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ کانپور پہونچے۔ یہاں آئے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ وہ ہنگامۂ انقلاب شروع ہوا جسے .... ہم ۱۸۵۷ء کے غدر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مستورات کی تنہائی کے خیال سے مجبوراً قنوج لوٹنا پڑا۔ وہاں فرخ آباد کے ایک رئیس کا فوجی دستہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ اُس سے انگریزی فوج کی جھڑپ ہوگئی۔ اس لڑائی میں قنوج کے تمام مکانات مسمار اور کھیتیاں برباد ہوگئیں۔ دوسرے روز قتل عام کی افواہ اور مارشل لا جاری ہونے کی گرم خبر نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ ہر طرف بھاگڑ مچ گئی اور جس کو جہاں موقع ملا نکل کھڑا ہوا۔ نواب صاحب مرحوم لکھتے ہیں :-

> "افواج سرکاری نے بوجہ بغاوت رئیس فرخ آباد قنوج کو تاراج کیا تو میرا گھر بار بھی بالکل دست بُرد غنیمت ہوگیا۔ سوائے چند کتب کے کوئی چیز اثاث البیت سے باقی نہ رہی۔ تب میں بلگرام گیا اور تا فرو ہونے ہنگامۂ غارتگری کے وہاں رہا۔"[۵۱]

بلگرام کے قیام کا زمانہ نہایت تکلیف میں بسر ہوا۔ نواب صاحب مرحوم کے صاحبزادے میر علی حسن خاں **ماثر صدیقی** میں لکھتے ہیں :-

> "والا جاہ کو کئی مہینے تک صرف ایک سیاہ جامۂ خشن اور نان خشک شبینہ پر وقت گذاری کرنا پڑی۔ جب کپڑا پھٹ جاتا اپنے ہاتھ سے سی لیتے۔ جب میلا ہو جاتا خود دریا پر جا کر دھولاتے۔ متعلقین کا بھی اس سے زیادہ بہتر حال نہ تھا۔ مگر باوجود اس تہی دستی اور فاقہ مستی کے کبھی سے کبھی قرض لیا نہ کسی کے سامنے دستِ سوال پھیلایا اور اپنی حالتِ بے مایگی پر صابر و قانع رہے۔"[۵۲]

جب حکومت کی آتشِ انتقام فرو ہونا شروع ہوئی تو خانماں خرابوں کو گھر یاد آیا۔ صدیق حسن خاں بھی اپنے عزیزوں کے ساتھ قنوج واپس آئے۔ فکرِ معاش بھی ساتھ آئی۔ مجبوراً پھر رختِ سفر باندھا۔ فتح پور اور الہ آباد ہوتے ہوئے مرزا پور پہونچے اور اکبر علی خاں سوداگر شاہ جہاں پوری کے ہاں معرفت سابقہ کی بنا پر مہمان ہوئے۔ اُنھوں نے بڑی خاطر داری کی۔ وہیں ریاست بھوپال سے نواب سکندر بیگم کا فرمان طلبی کے لئے صادر ہوا۔ ۳ محرم ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۸ء کو مرزا پور سے روانہ ہوئے۔ کثرتِ بارش کی وجہ سے بیس روز جبلپور میں رُکنا پڑا۔ ۱۴ صفر ۱۲۷۵ھ کو بھوپال پہونچے۔ پہلے

---

[۵۱] ابقاء المنن ص ۹۰۔ [۵۲] ماثر صدیقی حصہ دوم ص ۲۹

یکم شعبان ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۶ر نومبر ۱۸۶۸ء کو نواب شاہ جہاں بیگم تخت ریاست پر متمکن ہوئیں۔ نواب سکندر بیگم مرحومہ کے آخر عہد حکومت ہی میں صدیق حسن خاں حج کا ارادہ کر چکے تھے مگر بیگم صاحبہ کی علالت کی وجہ سے سفر نہ کر سکے۔ اب شاہ جہاں بیگم کی مسند نشینی کے بعد انھوں نے پھر درخواست کی جو منظور ہو گئی اور یہ ۲۷ر شعبان ۱۲۸۵ھ کو بھوپال سے روانہ ہو گئے۔ بیگم صاحبہ نے چند صندوق قیمتی کپڑوں اور دوسری گراں بہا اشیاء کے ساتھ کر دئے تھے کہ مکہ معظمہ پہنچ کر فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیں۔ حج و زیارت سے فارغ ہو کر ربیع الاول ۱۲۸۶ھ میں بخیریت بھوپال پہنچ گئے۔ مکہ معظمہ میں چار مہینے سے زیادہ ٹھہرنے کا موقع ملا۔ یہاں بہت سی کتابیں تفسیر و حدیث وغیرہ کی خریدیں اور بعض رسائل اپنے ہاتھ سے نقل کئے۔ تبرکاً محدثین حرمین کے سامنے قرأت حدیث بھی کی۔ مکہ معظمہ ہی میں ایک روز نواب تجمل حسین خاں مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ جن کی شان میں مرزا غالب نے یہ اشعار لکھے تھے ؎

دیا ہے اور کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے	بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے
زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا	کہ میری نطق نے بوسے مری زباں کے لئے
زمانہ عہد میں اُس کے ہے محوِ آرائش	بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد نواب صاحب مرحوم ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے اور زندگی کے بقیہ ایام خانۂ خدا کے زیر سایہ شکستہ حالی اور فقر و فاقہ میں گزار دی۔ صدیق حسن خاں نے اُن کو جس حالت میں دیکھا وہ حوادثِ روزگار کی ایک زندہ تصویر تھی۔

حج سے واپسی کے بعد نواب شاہ جہاں بیگم نے صدیق حسن خاں کو تاریخ نگاری کی خدمت سے سبکدوش کر کے سررشتۂ تعلیمات کا افسر مقرر کیا۔ یہ خدمت ایک ایسے شخص کے لئے جس کی زندگی کا مقصد احیاء کتاب و سنت اور خدمتِ علم تھا نہایت موزوں تھی اور اُنھوں نے اِسے بڑی مسرت کے ساتھ قبول کیا۔ ایک سال کے بعد جب ریاست کی میر دبیری کی جگہ خالی ہوئی تو بیگم صاحبہ نے دربار مسند نشینی کے موقع پر مسند "امیر الانشائی" خطاب "خانی" اور خلعت سے سرفراز فرمایا اور مشاہرہ دو سو (۲۰۰) روپئے ماہوار مقرر کیا۔

نواب شاہ جہاں بیگم کو عنانِ حکومت ہاتھ میں لئے ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ انتظام مملکت کی ذمہ داریوں اور پیش نظر وسیع اصلاحات کی اہمیت کا تقاضا یہ ہوا کہ کسی قابل، متدین، شریف اور مخلص فرد کو ہمدم اور مشیر بنایا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ بیگم صاحبہ کے دل میں عقد ثانی کی خواہش بھی

حضرت سید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تبلیغ کا فیض تھا کہ ہندوستان میں یہ سنت پھر جاری ہو گئی۔ سکھوں کے خلاف جہاد کرنے میں سید صاحب اور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہما نے جو حیرت انگیز جد و جہد کی اور بالآخر اسی راہ میں اپنے کو قربان کر دیا اس کی عظمت میں کسے شک ہو سکتا ہے، لیکن رد بدعت اور ترویج سنت میں ان بزرگوں کے کارنامے اسلامی ہند کی تاریخ میں ہمیشہ درخشاں رہیں گے، اور ان کی روشنی سے آج بھی ہماری آنکھیں منور ہیں۔ مسلمانوں نے ہندوستان کو اپنی تلوار سے فتح کیا تھا مگر ہندوؤں نے اپنے مشرکانہ خیالات اور رسم و رواج کے افسوں سے ان فاتحوں کی روح کو اسیر کر لیا۔ شرک و بدعت کی سیکڑوں باتیں مسلمانوں میں رائج ہو گئیں اور جزو دین سمجھی جانے لگیں۔ اس بے دینی کے خلاف پہلی آواز جو ہندوستان میں بلند ہوئی وہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی، جبکہ اکبر اور جہاں گیر کے مصالح ملکی اور اُن کی غیر اسلامی روش سے اسلامی تہذیب و تمدن کی صورت اس ملک میں مسخ ہو کر رہ گئی تھی اور مشرکانہ رسوم کی آمیزش سے دین تمام تر آلودہ ہو چکا تھا۔ دو صدیوں کے بعد دوسری آواز آپ ہی کے ہم نام حضرت سید احمد صاحب بریلویؒ کی بلند ہوئی جس کی گونج سو (۱۰۰) سال سے زیادہ گزرنے پر بھی آج ہمیں سنائی دے رہی ہے۔ توحید خالص کا عقیدہ اور کتاب و سنت کی جس قدر پابندی آج ہندوستانی مسلمانوں میں پائی جاتی ہے وہ زیادہ تر اسی بزرگ اور اس کے خلفا کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ فجزاھم اللہ جزاءً حسنًا۔

کچھ دنوں کے بعد تاریخ نگاری کے علاوہ ریاست کے دستور العمل کی ترتیب کی خدمت بھی صدیق حسن خاں کو سپرد ہوئی اور تنخواہ بجائے پچیس کے سو روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ نو سال تک انہی دونوں خدمتوں پر مامور رہے اور اپنے فرائض نہایت پابندی اور دیانتداری کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ نواب سکندر بیگم بھی قدر دانی فرماتیں۔ صاحب مآثر صدیقی لکھتے ہیں :-

"حالانکہ رئیسہ معظمہ نہایت تمکنت مزاج تھیں اور امور ریاست میں سختی کے ساتھ اصول ریاست کو عمل میں لاتی تھیں۔ باایں ہمہ کبھی اُنھوں نے والاجاہ کے ساتھ ناملائم سلوک نہیں کیا نہ کبھی سختی اور درشتی سے پیش آئیں بلکہ اپنی روشِ مزاج کے خلاف سرِ دربار جشنِ عیدین میں سرو قد کھڑی ہو کر تعظیم دیا کرتی تھیں اور سلام و کلام میں تقدیم کرتی تھیں۔ خصوصاً جب سے وہ قنوج ہو کر مراجعت فرمائے وطن ہوئی تھیں اور اُن کو والاجاہ کے خاندانی حالات کا علم ہو گیا تھا اُس وقت سے بہت کچھ اُن کی مراعات و خاطر رہا کرتی تھی۔" ؎۱

اس کے بعد نواب صاحب سے معانقہ کرکے ستر ضرب توپوں کی سلامی کی مبارک باد دی۔ ۱۲۹۵ھ میں سلطان عبدالحمید خاں مرحوم نے اُس امداد کے صلہ میں جو جنگ رُوم و رُوس کے دوران میں ریاست بھوپال نے کی تھی نیز نواب صدیق حسن خاں کی تفسیر فتح البیان کے مطالعہ سے محظوظ ہوکر بیگم صاحبہ کے لئے تمغۂ شفقت اور نواب صاحب کے لئے تمغۂ مجیدی درجہ دوم اور منشی جمال الدین خاں بہادر کے لئے تمغۂ مجیدی درجہ سوم اپنے فرامین کے ساتھ روانہ کیا۔

ان تمام اعزازات کے باوجود نواب شاہ جہاں بیگم کے ساتھ یہ ازدواجی تعلق مبارک نہیں ثابت ہوا۔ بلکہ جیسا کہ مؤلف مآثر صدیقی نے لکھا ہے "جس تاریخ سے رئیسۂ عالیہ خلد مکاں نے اپنا نکاح ثانی اُن سے کیا اور اُن کو اپنا معاون و مددگار نظم و نسق ریاست میں بنایا اُسی وقت سے اسباب مخالفت فراہم ہونا شروع ہوئے۔" مخالفت کے مختلف اسباب تھے۔ نواب صاحب کو کتاب و سنت کی پابندی اور اصلاح دینی میں جو غیر معمولی انہماک تھا اُس نے قدرۃً اہلِ بدعت کو برانگیختہ کیا۔ ریاست کی تنظیم اور تجدید قواعد و قوانین کے سلسلہ میں اُن عمال کو شکایت پیدا ہوئی جو بدنظمی سے فائدہ اُٹھا کر اپنی جیبیں بھر رہے تھے۔ بعض لوگ بیگم صاحبہ تک رسوخ حاصل کرنے میں نواب صاحب کے وجود کو سنگِ راہ محسوس کرنے لگے۔ غالباً ملکی اور غیر ملکی کا جذبہ بھی کسی حد تک کارفرما تھا۔ بہرحال اس عام برہمی کی ابتدا یوں ہوئی کہ بیگم صاحبہ کے پاس نواب صاحب کے متعلق شکایتی خطوط آنا شروع ہوئے۔ جب اِن کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوا تو خود نواب صاحب کے نام گمنام تحریریں آنے لگیں جن میں قتل کی دھمکی اور گالیاں ہوتی تھیں۔ جب اِن سے بھی کام نہ چلا تو اخباروں کے ذریعہ بدنام کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن جب یہ تدبیر بھی ناکام رہی تو قصبہ دیوری میں جو بھوپال کے مشرقی ضلع میں واقع ہے دورۂ ریاست کے موقع پر نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کو بعض متوسلین ریاست نے کھانے میں زہر دلوا دیا۔ نواب صاحب اِس واقعہ کی نسبت لکھتے ہیں:—

"زمانہ ابتدائے عقد نکاح میں ساتھ رئیسہ کے مجھ کو اور اُن کو اندر طعام چاشت کے زہر دیا گیا تھا۔ عین حالت تناول غذا میں مجھ کو اور اُن کو قے و دست شروع ہو گئے۔ ایک دو دن تک بالکل بے خبری رہی۔ تیسرے دن جب سب مادہ سمیت بتقدیر اللہ تعالےٰ خارج ہو گیا تب ہوش آیا۔ یہ علاج بھی خود از طبیب سے ہوا سہ

ور قتل ما کمر و کمی انتظار تو … گر تا ہمی کہ بود ز عمر دراز بود"[۵۱]

۵۱
القاء المنن
ص ۱۱۹

پیدا ہوئی۔ اُن کا پہلا نکاح نواب نظیر الدولہ بخشی باقی محمد خاں بہادر کے ساتھ ۱۲۷۱ھ میں ہوا تھا۔ نواب صاحب مرحوم قوم افغان سے تھے۔ نکاح کے بارہ سال بعد صفر ۱۲۸۴ھ میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ اُن کی وفات کے پانچ مہینے بعد بیگم صاحبہ مسندِ ریاست پر بیٹھیں۔ انصرامِ حکومت میں مدد دینے کے لئے نظرِ انتخاب جس شخص پر پڑی تھی وُہی نکاحِ ثانی کے لئے بھی پسند آیا۔ چنانچہ ۸ شوال ۱۲۸۸ھ کو اُنھوں نے سادہ طریقہ پر بعوض پچیس ہزار روپئے دین مہر صدیق حسن خاں کے ساتھ عقد کر لیا۔ حکومت ہند سے مشورہ پہلے سے کر لیا گیا تھا۔ اور اس تجویز کی منظوری باضابطہ آگئی تھی۔ صدیق حسن خاں ابتک امیر الانشائی کے منصب پر مامور تھے۔ ۱۲ ربیع الثانی ۱۲۸۹ھ (۱۰ جولائی ۱۸۷۲ء) کو بیگم صاحبہ نے ایک دربار عام منعقد کر کے خلعت نہ پارچہ مع پنج عدد جواہر و چتر آفتابی و چنور و اسپ و فیل و پالکی نیز مُہر و خطاب معتمد المہام بہادر نائب دوم ریاست سے معزز فرمایا اور بجائے معاش امیر الانشائی جس کی مقدار چار ہزار تین سو اکتیس ۴۳۳۱ روپئے دس آنہ سالانہ تھی منصب معتمد المہامی کی جاگیر چوبیس (۲۴۰۰۰) ہزار روپئے سالانہ کی مرحمت فرمائی[۵۱] اس کے بعد بیگم صاحبہ کی تحریک سے خطاب نواب والا جاہ امیر الملک بہادر بھی حکومت ہند کی طرف سے مل گیا۔ ۱۷ اکتوبر ۱۸۷۲ء کو پولیٹکل ایجنٹ منجانب گورنر جنرل سند خطاب اور خلعتِ فاخرہ لیکر بھوپال آئے اور دوسرے روز ایک شاندار دربار منعقد ہوا جس میں یہ اعزازات دئے گئے۔ یکم شعبان ۱۲۸۹ھ سے بیگم صاحبہ نے چھیتر ہزار (۷۶۰۰۰) چار سو بہتر (۴۷۲) روپئے سالانہ کی جاگیر تا حینِ حیات عنایت فرمائی۔

نکاح کے بعد بیگم صاحبہ نے نواب صدیق حسن خاں کو اپنا مشیر خاص بنا کر وسیع اختیارات دیئے تھے اور اس بات کی بھی خواہش کی تھی کہ حکومت ہند کی منظوری حاصل کر کے اُنھیں تا حیات مستقل مختار ریاست بنا دیں۔ مگر خود نواب صاحب نے کوشش کر کے اُنھیں اس ارادہ سے باز رکھا۔[۵۲]

یکم جنوری ۱۸۷۷ء کے دہلی دربار میں جب ملکہ وکٹوریہ کے نام کے ساتھ قیصرۂ ہند کے خطاب کے اضافہ کا اعلان کیا گیا۔ نواب شاہ جہاں بیگم بھی مدعو کی گئیں۔ نواب صدیق حسن خاں بھی اُن کے ساتھ دربار میں شریک ہوئے اور جب بیگم صاحبہ وائسرائے سے ملنے تشریف لے گئیں تو نواب صاحب بھی ساتھ گئے۔ لارڈ لٹن نے بیگم صاحبہ کو "قیصر ہند" کا طلائی تمغہ دینے کے بعد کہا کہ "خاص آپ کے شوہر کے لئے سترہ ۱۷ ضرب سلامی تمام قلمرو دولتِ انگلشیہ میں ہمیشہ کے لئے مقرر کی گئی۔"

---

[۵۱] مآثر صدیقی حصہ دوم صفحہ ۔ ابقاء المنن صفحہ ۔ [۵۲] ابقاء المنن صفحہ ۱۱۲ ۔

بانیان اور سید عبداللہ بن عبدالباری یمنی کے رسالہ سیف تبار کا ترجمہ اور اسی طرح دوسرے علماء متقدمین کے اقوال اور تحریروں کو بھی جمع کر دیا ہے اور بعض مقامات پر ان کا حوالہ بھی دیدیا ہے مگر ساتھ ہی اس کے انھیں کتابوں میں بطور قول فیصل اپنی رائے مسئلہ جہاد اور زمانۂ غدر ہندوستان کی نسبت مختلف مضامین میں ظاہر کر کے گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ بپابندیٔ شرع شریف ایفائے عہد و وفاداری پر ثابت قدمی اختیار کرنے پر زور دیا ہے۔ مخالفین نے نہایت دلیری اور چالاکی سے والا جاہ کی تحریروں کو دانستہ نظر انداز کر کے تحریرات و مضامین منقولہ کو بطور دستاویز اثباتِ جرم گورنمنٹ کے سامنے پیش کیا اور مسئلۂ جہاد کی محض نقل و بیان گورنمنٹ کی مخالفت اور بغاوت کا مرادف ٹھہرایا اور کتاب ہدایت السائل۔ ترجمان وہابیہ اقتراب الساعۃ اور موعظہ حسنہ یعنی مجموعہ خطب جس میں اتفاقاً مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کا وہ خطبہ بھی جو سکھوں سے جہاد کرنے پر مبنی تھا چھپ گیا تھا، اُن کو اپنے دعوے کی دلیل قرار دے کر حکام کے سامنے پیش کیا.........."[۵۱]

اس بیان سے ترغیب جہاد کے الزام کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ مسئلۂ جہاد اسلام کا ایسا مہتم بالشان مسئلہ ہے کہ اس کی تفصیلات سے قرآن کریم اور احادیث نبویؐ کے مجلدات پُر ہیں۔ اور اسلام کے متعلق وہ کونسی قابلِ ذکر کتاب لکھی گئی ہے جس میں یہ مسئلہ بیان نہیں کیا گیا۔ پھر نواب صدیق حسن خاں کی کتابوں کی کیا خصوصیت تھی اور وہ بھی اس صورت میں جب کہ وہ اپنی کتابوں میں حکومت کے ساتھ پوری وفاداری برتنے کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کے والد حضرت سید احمد بریلوی کے خلفاء میں تھے اور سکھوں کے خلاف سرحد کی مہم میں بھی کچھ دنوں شریک رہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اُنھوں نے تقویٰ کی بنا پر پانچ لاکھ کی جاگیر سے جو ترکۂ پدری میں مل رہی تھی ہاتھ اُٹھا لیا اور ساری عمر اعلاءِ کلمۃ اللہ کی خاطر عسرت اور تنگدستی میں گزار دی۔ مگر نواب صدیق حسن خاں تو نواب شاہجہاں بیگم کے شوہر تھے جن کا شمار حکومت برطانیہ کے مخصوص ترین وفاداروں میں تھا۔ خود اُن کو بھی حکومت ہند کی طرف سے خطاب و اعزاز سے سرفراز کیا گیا تھا اور تمام مملکتِ انگلشیہ میں سترہ ضرب توپ کی سلامی اُن کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ جو غریب ان سنہری زنجیروں میں سر سے پاؤں تک جکڑا ہوا ہو اُس سے کارزار جہاد کی سرفروشی کی

---

[۵۱] مآثر صدیقی حصہ سوم ص۱۳۱ -

جب یہ مہلک وار بھی خالی گیا تو بیگم صاحبہ کو بعض مستورات کے ذریعہ عقیم دوائیں استعمال کرائی گئیں۔ اِس کے بعد حملہ کا محاذ بدل دیا گیا اور نواب صاحب پر مختلف انتظامی اور مذہبی الزامات قائم کرکے انگریز حکام تک پہونچانا شروع کئے گئے۔ اتفاق سے اُسی زمانہ میں سر ہنری ڈیلی ریزیڈنٹ سنٹرل انڈیا مقرر ہو کر اندور آئے تھے۔ اس کے بعد پہلی مرتبہ جب وہ بھوپال آئے تو بیگم صاحبہ کسی خاص عذر سے دستور ریاست کے مطابق اُن کے استقبال کو نہ جاسکیں اور اپنے بجائے نواب ولی عہد صاحبہ کو بھیج دیا۔ یہ بات ریزیڈنٹ صاحب کی ناخوشی کا باعث ہوئی۔ اُنھوں نے انتقاماً یہ حکم صادر فرمایا کہ آئندہ سے پہلی ملاقات ریزیڈنٹ کی فرودگاہ یعنی جہانگیرآباد کی کوٹھی پر ہُوا کرے اس کے بعد وہ بازدید کے لئے سرکاری محل پر جائیں گے۔[۱]

ریزیڈنٹ کی ناراضی سے فائدہ اُٹھا کر دشمنوں نے نواب صاحب کے خلاف طرح طرح کے الزامات تراشنا شروع کئے اور اُن کو تحریریں اُس کے پاس بھیجنے لگے۔ "مثلاً نواب شاہ جہاں بیگم کو پردہ نشین بناکر ریاست کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لینا، بعض اشخاص کی جاگیریں بلا وجہ ضبط کر لینا، انتظام ریاست میں ضرورت سے زیادہ سختی برتنا، نواب شاہ جہاں بیگم اور ولیعہد نواب سلطان جہاں بیگم میں ناموافقت پیدا کرانا۔" صاحب بہادر آنکھ بند کرکے وہ تمام عرایض حکومت ہند میں روانہ فرماتے رہے۔ لیکن حکومت نے اِن عرایض پر کوئی مخالفانہ کارروائی کرنی مناسب نہیں سمجھی۔ اس کے بعد جب سر لیپل گریفن کابل سے عہدۂ ریزیڈنسی پر اندور آئے تو اُنھوں نے وہ یادداشتیں دیکھیں جو سر ہنری ڈیلی نواب صاحب کے متعلق چھوڑ گئے تھے۔ ساتھ ہی سازش کرنے والوں نے یہ دیکھ کر کہ ذاتی اور انتظامی شکایتیں کارگر نہیں ہوتیں تو جہاد اور بغاوت کے اتہام سے نواب صاحب کو حکومت کی نظر میں خطرناک ثابت کرنے کی کوشش کی۔ یہ وہ طلسمی الفاظ ہیں کہ اِن کے سنتے ہی حکومت کا دماغی توازن کبھی کبھی درہم برہم ہو جاتا ہے اور غور و فکر کی صلاحیت متاثر ہو جاتی ہے۔ دشمنوں کی یہ آخری تدبیر پوری طرح کامیاب ہوئی۔ ترغیب جہاد کے متعلق جو الزام لگایا گیا تھا اُسکے متعلق مؤلف مآثر صدیقی لکھتے ہیں:۔

"والاجاہ مرحوم نے اپنی بعض کتابوں میں مسائل شرعیہ کے ذیل میں جامعیت کے شوق اور وسعت معلومات کے لحاظ سے مسئلۂ جہاد کے متعلق علامہ سید حسن بن جلال یمنی کے رسالہ

---

[۱] مآثر صدیقی جلد سوم ص۱۲۵

اور وہابیت اور بغاوت مترادف الفاظ ہیں۔ کتاب کے عنوان میں اُنھوں نے یہ فقرہ لکھا تھا:-

"کیا ہمارے ہندوستان کے مسلمانوں پر از روئے ایمان ملکہ معظمہ سے بغاوت کرنا فرض ہے؟"

یہ کتاب خاص طور پر بنگال کے مسلمانوں کے متعلق لکھی گئی تھی۔ اُنہی پر وہابیت کے جرم میں مقدمات قایم کئے جارہے تھے اور بہتوں کے لئے قید اور عبور دریائے شور کی سزائیں تجویز ہورہی تھیں، مگر کتاب کا مضمون ہندوستان کے تمام مسلمانوں پر منطبق ہوتا تھا اور حکومت نے وہابیت اور بغاوت کو عملاً ہم معنی سمجھ لیا تھا۔ سرسید مرحوم نے ہنٹر کی رُسوائے عالم کتاب پر ایک مفصل تبصرہ لکھ کر اخبار پائنیر کے کئی نمبروں میں شایع کرایا اور مصنف کے کذب و افترا کا پردہ چاک کیا۔ پھر اس ریویو کو حافظ احمد حسن صاحب مرحوم نے ایک مستقل رسالہ کی حیثیت سے اُردو۔ انگریزی دونوں زبانوں میں لندن میں چھپوا کر شایع کیا۔ اس طرح سرسید اور بعض دوسرے بزرگوں کی کوشش سے وہابیت کے جو خطرناک معنی حکومت نے اپنے ذہن میں قایم کرلئے تھے وہ دُور ہوگئے۔ دوسری طرف ہندوستان کی جماعت اہلِ حدیث نے اپنے لئے اس لفظ کا انتساب توہین کا باعث سمجھا۔ جو لوگ صرف کتاب و سنت کے اتباع کے مدعی تھے اور ائمہ اربعہؒ کے اجتہاد کو بھی تسلیم نہیں کرتے تھے وہ عبدالوہاب نجدی کی پیروی کا ننگ و عار کیونکر برداشت کرسکتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے متعلق لفظ وہابی کے استعمال کے خلاف حکومت ہند میں سخت ناراضی کا اظہار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی ہند میں جماعت اہلِ حدیث کے نام کے ساتھ لفظ وہابی کا استعمال حکومت نے ممنوع قرار دیدیا اور جو لوگ محض وہابیت کے جرم میں قید کر دئے گئے تھے وہ رہا کر دئے گئے۔ (۱۸۸۸ء)

یہ سب کچھ ہوا مگر نواب صدیق حسن خاں پر جو الزامات عاید کئے گئے تھے وہ بدستور قایم رہے۔ جب حکومت ہند کے سامنے اُن کا مقدمہ باضابطہ پیش ہوا اور مخالفین کی طرف سے جن میں سر لیپل گریفن ایجنٹ گورنر جنرل بھی شامل تھے سزائے سخت کا مطالبہ ہوا تو حکومت نے بپاسِ خاطر سر لیپل نواب صاحب کے انتزاع خطاب و اختیارات کی سزا تجویز کی۔ چنانچہ ۲۷ اگست ۱۸۸۵ء کو گریفن نے شوکت محل میں بیگم صاحبہ سے ملاقات کی اور نواب صاحب کو مختلف الزامات کا مورد قرار دے کر انتزاعِ خطاب اور سترہ ضرب سلامی کی منسوخی کا اعلان عام کیا۔ اس کے بعد ۲۶ اکتوبر ۱۸۸۵ء کو انھیں ریاست کے معاملات میں دخل دینے کی بھی ممانعت کردی گئی۔ نہ صرف یہ بلکہ آٹھ مہینے تک اُن کو بیگم صاحبہ سے علٰحدہ نور محل میں قیام کرنا پڑا۔ صرف شب میں وہ تاج محل چلے جاتے تھے

توقع کرنا اُنہی دماغوں کا کام ہو سکتا ہے جن پر اس لفظِ جہاد کے معنی کا بوس کی طرح مسلط ہوں۔ تاہم اس معاملہ میں ہم حکومت ہند کو ایک حد تک معذور خیال کرتے ہیں ؎

بہ بد مستی سزد گر متہم سازد مرا ساقی
ہنوز از بادۂ دوشینہ ام پیمانہ بو دارد

۱۸۵۷ء کے واقعات کی یاد ابھی تازہ تھی۔ سرحد پر سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی باقی ماندہ جماعت سے آویزش کا سلسلہ اس کے بعد بھی کئی سال تک قایم رہا اور حکومت کو متعدد شکستیں اُٹھانا پڑیں۔ اُس نے اپنا غصہ ہندوستان کے اُن سر برآوردہ مسلمانوں پر اُتارا جن کا کچھ بھی تعلق سرحد کی تحریک جہاد سے پایا گیا۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء میں مولوی محمد جعفر صاحب رئیس تھانیسر، مولانا یحییٰ علی صاحب عظیم آبادی، مولانا عبدالرحیم صاحب عظیم آبادی، محمد شفیع صاحب سوداگر لاہور، مولانا احمداللہ صاحب رئیس پٹنہ وغیرہ آٹھ آدمیوں پر سازش کا مقدمہ قائم کیا گیا اور ان سب کو پھانسی کی سزا تجویز ہوئی جو بعد میں حبس دوام بعبور دریائے شور میں تبدیل کر دی گئی۔ یہ تبدیلی کسی رعایت کی بنا پر نہ تھی بلکہ محض شدت انتقام کے تقاضے سے تھی۔ کیونکہ پھانسی کے حکم نے ملزمین کو درجۂ شہادت کا مژدہ سنایا تھا اور وہ جلد سے جلد دار و رسن کے ذریعہ اس رتبۂ بلند کو حاصل کرنے کے لئے بے قرار تھے۔ حکومت نے تو اپنی دانست میں انتہائی سزا تجویز کی تھی مگر جب یہ دیکھا کہ اس سے یہ "مذہبی دیوانے" اور خوش نظر آتے ہیں تو بجائے پھانسی دینے کے سب کو کالے پانی روانہ کر دیا کہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مریں[۱] اُسے کیا معلوم تھا کہ جس راہ میں اِن دیوانوں نے دُنیا کے تمام عیش و آرام کو ٹھکرا کر قدم رکھا ہے اُس کی ہر سختی نفس مطمئنہ کے لئے مسرت و شادمانی کا ایک تازہ پیام لاتی ہے ؎

تفاوت است میان شنیدن من و تو
تو بستن در و من فتح باب می شنوم

ترغیب جہاد کے بعد دوسرا بڑا الزام تبلیغ وہابیت کا تھا۔ وہابیت بھی اُس زمانہ میں جہاد سے کم خطرناک نہیں سمجھی جاتی تھی اس لئے کہ ڈاکٹر ہنٹر صاحب نے اپنی محققانہ تصنیف "ہندوستانی مسلمان" میں بزعم خود یہ ثابت کر دیا تھا کہ حکومت سے لڑنا مسلمان اپنا مذہبی فرض جانتے ہیں

---

[۱] سیرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ۔ مؤلفہ سید ابوالحسن علی ندوی۔ ص ۹۳-۲۰۲۔

نہیں ہوئی۔ جب اُن کو کسی خادم پر بہت غیظ وغضب آتا تو اُن کی زبان سے جو سخت سے سخت
دشنام نکلتی وہ یہ تھی کہ اُس کو کاٹ کا احمق کہہ کر خطاب کرتے تھے اور دورانِ غضب میں
پیشانی پر ہاتھ رکھ کر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا کرتے تھے۔ عیدین اور جمعہ کو جب وہ عیدگاہ یا مسجد کے
دروازہ پر پہونچتے تو اپنا جوتا خود اُٹھاتے اور جھاڑتے تھے۔ اگر کوئی خادم سر پر آفتاب گیر لگانا چاہتا
تو فوراً روک دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ اِس دھوپ سے آفتابِ محشر کی گرمی بہت زیادہ ہوگی
اُس سے کون بچائے گا۔" [۵۱]

"قبل امارت وقتاً اور بعد امارت وقتاً فوقتاً کبھی کوئی مکان ذاتی انھوں نے اپنے لئے بنایا اور
نہ مصارف ذاتی میں کبھی انھوں نے اپنی استطاعت سے باہر قدم رکھا۔ بعد نکاح رئیسۂ عالیہ تو
اُن کا ذاتی صرف نہایت قلیل واقل تھا۔ رئیسۂ عالیہ کے محل میں اُن کا قیام تھا اور تمام اُن کے
مصارف کا بار رئیسۂ عالیہ کی ذات پر تھا۔ صرف بوقت ضرورت وہ کاغذ وقلم ودوات اور خطوط
وغیرہ کا معمولی خرچ اپنی جیب خاص سے کیا کرتے تھے۔ البتہ ہزاروں روپیہ سالانہ وہ اپنی جاگیر
سے صلۂ ارحام، مراعات اہلِ حقوق، امداد مساکین وبیوگان اور یتامیٰ اور اہلِ حاجت اور غربائے
وطن پر صرف کیا کرتے تھے جس کی صحیح تعداد کا علم خود ہم لوگوں کو بھی باوجود اُن کی اولاد ہونے
کے نہ تھا۔ بعد وفات اُن کے جب باشندگانِ قنوج اور اہلِ حاجت کی درخواستیں آنا
شروع ہوئیں اور اُن کی فہرست اسماء مرتب ہوئی اُس وقت علم ہوا۔ اُن میں سے بعض لوگوں
کی امداد تو ہم لوگوں نے بدستور جاری رکھی اور جو باقی بچے اُن کا وظیفہ رئیسۂ عالیہ نے مراحم شاہانہ
سے اپنی ڈیوڑھی خاص سے مقرر فرمایا۔ جَزَاہَا اللّٰہُ خَیْرًا۔" [۵۲]

اپنے مذہب کے متعلق نواب صاحب مرحوم خود لکھتے ہیں:-

"رجماً بالغیب مجھ پر یہ طوفان باندھا گیا کہ میں خدانخواستہ حق میں ائمۂ اربعہ کے عموماً اور
حق میں امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے خصوصاً بے ادب نامہذب ہوں، حالانکہ یہ نرا افتراء ہے
اس کی تکذیب کے لئے میرا رسالہ جلبُ المنفعۃ نام بس کرتا ہے۔ اگر میں ایسا ہوتا تو اپنی
کتب فقہ میں ہرگز کسی مسئلۂ حنفی کی ترجیح نہ کرتا، حالانکہ مسک الختام وشروح تحریرات
صحیحین وغیرہا میں بہت جگہ مذہب امام عالی مقام کو میں نے راجح لکھا ہے اور دوسرے مذہب کو

---

۵۱ مآثر صدیقی حصہ چہارم ص۱۶۔
۵۲ " " حصہ چہارم ص۲۴۔

بالآخر بیگم صاحبہ کلکتہ تشریف لیجاکر وائسرائے سے ملیں اور خانگی تعلقات میں اِس مداخلت بیجا کے خلاف احتجاج کیا۔ لارڈ ڈفرن نے نواب صاحب کو تاج محل میں رہنے کی اجازت دی۔ اور معاملات ریاست پر بھی غور کرنے کا وعدہ کیا۔

جو الزامات نواب صاحب مرحوم پر قائم کئے گئے تھے اور جن کی بنا پر یہ سزا ملی تھی اُن کا مرافعہ حکومت میں کردیا گیا تھا، لیکن ابھی اُس کا فیصلہ نہیں ہونے پایا تھا کہ فریاد رسی کے شہنشاہ حقیقی کے دربار سے طلبی کا فرمان صادر ہوا، اور چند ماہ مرض استسقا میں مبتلا رہ کر ۲۹ر جمادی الثانی ۱۳۰۷ھ مطابق ۲۰ر فروری ۱۸۹۰ء کو اُنسٹھ سال تین مہینے کی عمر میں تہجد کے وقت قیدِ حیات اور بندِ غم دونوں سے ایک ساتھ رہائی پائی۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

جس وقت اِس سانحۂ ارتحال کی خبر حکومت ہند کو پہونچی اُسی وقت ایک تار مسٹر الیف ہنوی ایجنٹ گورنر جنرل نے حکومت کی طرف سے بیگم صاحبہ کے پاس بھیجا کہ مرحوم کی نعش کے ساتھ شاہی عمل میں لایا جائے۔ مگر چونکہ نواب صاحب مغفور کی وصیت کے مطابق مراسم تجہیز و تکفین بپابندِ سنتِ مطہرہ نہایت سادہ طریقہ پر ادا کردئے گئے تھے اِس لئے اعزازِ شاہی سے گرانبار ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ اِس کے بعد ۱۲ر اگست ۱۸۹۰ء کو مسٹر ہنوی نے ایک باضابطہ مراسلہ اِس مضمون کا بھیجا کہ حکومت ہند نے بیگم صاحبہ کی درخواست منظور فرمائی کہ "آں عالیہ کے شوہر عالی مقدار سرکاری مراسلت میں اور تحریرات میں نواب صاحب بہادر مرحوم شوہر رئیسہ کے خطاب سے یاد کئے جائیں"۔[۵۱]

صاحب مآثر صدیقی اپنے والد بزرگوار کے حُلیہ و اخلاق و شمائل کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"میانہ سڈول موزوں قد، نہ طویل نہ قصیر، کھلتا ہوا گیہواں رنگ مائل بہ صباحت۔ بھرے ہوئے رُخسار۔ سیدھی سُتواں ناک، کشادہ پیشانی۔ کتابی خوبصورت چہرہ۔ میانہ سر، گردن و ساقین۔ چوڑا سینہ۔ مختصر ریش۔ متناسب اندام۔

نہایت خوش خلق، شیریں کلام، کم سخن، ظریف الطبع، آزاد و بے پروا مزاج، لطیفہ سنج، کثیر الحلم، قلیل الغضب، منکسر و متواضع، سب و شتم سے کبھی اُن کی زبان آلودہ اور آشنا

---

[۵۱] مآثر صدیقی حصہ سوم۔ صفحہ ۲۰۲

کتابیں لکھی ہیں جن کے مضامین تفسیر، حدیث، فقہ، اخلاق، تصوف، تاریخ، شعر و ادب، لغت، عروض، تذکرۂ شعرا، سیاست اور انساب وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ بعض اہل نظر کی رائے میں ان کتابوں کا اکثر حصہ مصنفین سلف کی تالیفات سے منقول ہے۔ نواب صاحب مرحوم اس کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ صاف الفاظ میں خود اعتراف کرتے ہیں کہ :-

"غالب تالیفات میرے نقول آثار سلف اور تراجم مؤلفات علمائے راسخین ہیں۔ جو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ یا نقل ہو کر آئے ہیں۔ وہ علم درحقیقت علمائے سابقین و ائمۂ امت کا علم ہے نہ میرا علم و اجتہاد۔ میں فقط اُن کا حمال و نقال ہوں۔ معہذا میں نے اُس حمل و نقل کو امانت و دیانت کے ساتھ ادا کیا ہے، نہ سرقت و خیانت کے ساتھ، اور حتی الامکان اس امر کا التزام رکھا ہے کہ قول راجح کو نقل کروں اور مذہب قوی کو بتاؤں اور موافقت کتاب و حدیث کو ملحوظ رکھوں اور رائے بحث سے تحرز کروں اور کسی جگہ بھی مذاہب فرقِ ناجیہ سے خارج نہ ہوں۔"[1]

ممکن ہے کہ بعض مقامات پر ماخذ کا حوالہ نہ دیا ہو لیکن یہ فروگزاشت اِس عام اعتراف کے بعد جو اوپر نقل کیا گیا کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتی۔ اور اُن کی تالیفات کی افادی حیثیت سے تو اُن کے بڑے سے بڑے مخالف کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً تفسیر، حدیث اور فقہ میں جو کتابیں لکھی ہیں وہ حد درجہ نافع اور کتاب و سنت کی صحیح تعلیمات سے پُر ہیں۔ کتابوں کی خریداری اور اپنی مذہبی تالیفات کو مفت تقسیم کرنے میں ہزاروں روپے بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ ابقاء المنن میں لکھتے ہیں:-

"ایک منت اللہ تعالیٰ کی مجھ پر یہ ہے کہ جب اُس نے مجھ کو علم کتاب و سنت عطا کیا اور سب علوم متداولہ و فنون رسمیہ سے نفرت بخشی تو اپنے خزائن کرم سے وہ کتب علمائے سلف و ائمت کی عنایت فرمائی جو اس زمانۂ آفت نشانہ میں نہایت کمیاب عزیز الوجود ہیں۔ کچھ تو میری کشش و کوشش سے میسر ہوئی اور میں نے اُن کو خاطر خواہ بالائے قیمت دیگر جوب و عجم سے حاصل کیا جیسے فتح الباری کا کامل نسخہ اُس کا اقلیم ہند میں دیکھا سُنا نہ گیا تھا، چھ سو (۶۰۰) روپیہ کلدار کو مدینہ سے خرید کیا۔ وہ قلمی ابن علان کا ہے۔ پھر اُسی نسخہ سے بصرف پنجاہ ہزار (۵۰۰۰۰) روپیہ دوسرا نسخہ بلدۂ مصر مطبع بولاق میں طبع کرایا۔ اب نسخۂ مطبوعہ تفرقہ معاملہ اہل ہند میں

---

[1] ابقاء المنن ص۔

مجروح یا ضعیف یا مردود قرار دیا ہے، اور کسی کتاب میں کوئی لفظ طعن یا تشنیع کا حق میں مقلدین مذاہب کے زبانِ قلم سے نہیں نکلا۔ چہ جائے حضرت ائمۂ اربعہ کے۔ سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ۔ میرا اعتقاد حق میں ان چاروں امام فقہ کے اور حق میں جمیع محدثین اور جملہ علمائے پاک دین کے ویسا ہی ہے جیسا کہ حق میں صحابہ و تابعین و تبع تابعین اور تمام سلف صالحین کے ہے، اگرچہ مجھ کو اُن کے تفاضل درجات پر نزدیک خدا کے آگاہی حاصل نہیں ہے۔ میں ان سب کے حق میں بے ادبی کرنے کو سم قاتل و زہر ہلاہل جانتا ہوں میں بحمد و تعالےٰ اُن لوگوں میں نہیں ہوں کہ دُنیا کے کتوں سے ڈر کر تقیہ کروں۔ اگر میں ایسا ہوتا تو کیوں یہ آفات مجھ پر کیوں آتے، اور نہ میں ریاکار ہوں اس لئے کہ ریا واسطے تحصیل مال و جاہ و عزت کے ہوتی ہے سو اللہ نے مجھ کو میرے حوصلہ و ہمت سے بہت زیادہ دیا ہے۔ مجھ کو اس تحصیل حاصل سے کیا نفع۔ بے شبہ میں کسی کی رائے مجرد و اجتہاد کا مقلد نہیں ہوں جب تک کہ اُس کو موافق دلیل و سنت کے نہ کرلوں خواہ وہ علم ظاہر سے علاقہ رکھتا ہو یا علم باطن سے۔ یہ طریقہ مسائل حلت و حرمت میں مطرد ہے اور اصول عقائد میں متحد۔ رہے وہ اُمور جن کو کچھ تعلق ان دونوں اقسام سے نہیں ہے وہاں میں معانی آیات و احادیث میں جملہ علماء اکابر و صلحاء و ائمۂ سلف کے اقوال و اصول پر اعتماد کرتا ہوں خواہ علمائے حنفیہ ہوں یا شافعیہ یا حنابلہ یا مالکیہ یا علماء صوفیہ و مشائخ طریقت۔"[1]

طریقت میں سلسلۂ نقشبندیہ کے پیرو تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"اگرچہ میں جملہ طرائق صوفیہ رحمہم اللہ تعالےٰ کو موصل الی اللہ جانتا ہوں اور مشائخ جملہ طرق کو مانتا ہوں لیکن طریقہ میرے آباء و اساتذہ و مشائخ کا نقشبندیہ ہے گو اور طرائق کی بھی اجازت حاصل تھی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے قول جمیل میں سب طرائق کے اشغال و اذکار لکھے ہیں۔ وہ نہایت مختصر و مرغوب و محبوب و مطلوب ہیں۔ میرے والد ماجد مرحوم نقشبندی تھے اور میرے شیخ سنت قاضی محمد بن علی شوکانی یمنی بھی اسی طریقۂ نقشبندیہ میں تھے۔"[2]

نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی شہرت نہ صرف تمام ہندوستان بلکہ دُنیائے اسلام کے تقریباً ہر حصہ میں اُن کی تصانیف کے پردوں پر پہونچی۔ انھوں نے عربی، فارسی اور اردو میں دو سو بائیس

---

[1] ابقاء المنن ص ۱۱۹

[2] ابقاء المنن ص ۹۲

تاریخ سلاطین گجرات کے عربی مآخذ

(از جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی)

صوبۂ گجرات پر جس کو اورنگ زیب نے "زیب و زینت ہندوستان" کہا ہے۔ گجراتی سلاطین کے خاندان نے ۱۸۵ برس تک حکمرانی کی ہے۔ اِن کی تاریخ گویا چھوٹے پیمانے پر تمام اسلامی ہند کی تاریخ ہے جو ان کی ملک گیری، حمیتِ اسلامی، خداترسی اور علمی سرپرستی کے لحاظ سے بیحد نتیجہ خیز اور دلچسپ ہے، مگر ابتک اس پر کامل توجہ نہیں کی گئی جس کی یہ صحیح طور سے مستحق ہے گجرات کے اسلامی عہد کے تاریخی واقعات ہندوستانی مؤرخین کی لکھی ہوئی ہندوستان کی عام تاریخوں میں قلمبند کئے گئے ہیں جنکے اقتباسات اِلیَٹ نے اپنی تاریخ ہند میں ترجمہ کرکے درج کئے ہیں، لیکن مستقل طور پر تاریخ گجرات پر فارسی میں لکھی ہوئی کم و بیش ایک درجن[۱] کتابوں میں سے ابتک صرف تین چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں، کچھ گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی ہیں، اور کچھ یورپ اور ہندوستان کے کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔

---

[۱] کتب ذیل فارسی زبان میں مستقلاً سلاطین گجرات پر لکھی گئی ہیں۔ (۱) تاریخ مظفر شاہی۔ مظفر شاہ اوّل پر۔ اس کا کوئی نسخہ نہیں ملتا۔ (۲) تاریخ احمد شاہی۔ احمد شاہ اوّل پر مصنفہ حلوی شیرازی منظوم اسکا کوئی مخطوطہ نہیں معلوم ہوا۔ (۳) طبقات محمود شاہی۔ محمود اوّل (دیگرھ) پر اس کا مخطوطہ برٹش میوزیم (فہرست ج ۳ ص ۹۶۶) میں موجود ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ پشاور میں کسی صاحب کے پاس ہے۔ (۴) تاریخ مظفر شاہی۔ مظفر ثانی پر۔ مولوی ابوظفر ندوی نے اسکو مع گجراتی ترجمہ شائع کردیا ہے۔ (۵) تاریخ بہادر شاہی۔ اس کا کوئی مخطوطہ نہیں ملا۔ مابعد کی تاریخوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں۔ (۶) مآثر محمود شاہی۔ محمود دوم پر۔ بعض کا یہ خیال کہ طبقات محمود شاہی اور یہ دونوں ایک ہی کتاب ہیں۔ صحیح نہیں۔ (۷) مرآۃ سکندری چھپ گئی ہے۔ انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ (۸) تاریخ گجرات از میر ابوتراب ولی کلکتہ ایشیاٹک سوسائٹی نے شائع کی ہے۔ (۹) تحفۃ السادات از آرام کشمیری۔ کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔ (۱۰) تاریخ مظفر شاہی۔ مظفر ثالث پر۔ کوئی نسخہ نہیں ملا۔ (۱۱) تاریخ گجرات از محمود بن ہلال منور الملک بخاری ایک طرح کی ڈائری ہے جو ۹۲۴ھ کے بعد لکھی گئی ہے۔ بوڈلین لائبریری میں ایک مخطوطہ موجود ہے۔ (۱۲) مرآۃ احمدی مشہور ہے اور چھپ گئی ہے بعض حصص کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

کتاب مذکور پھر جا بجا طبع ہو رہی ہے۔ اور ابن کثیر کو مع فتح البیان چھپوایا۔ یہ طبع ثانی ہے بعد نظر ثانی کے وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ......" ۱؎

"ایک منت خدا کی مجھ پر یہ ہے کہ میرا اکثر مال اشاعت کتب علوم کتاب وسنت میں صرف ہوا ہر کتاب کے ایک ہزار نسخے طبع ہو کر بلاد قریب وبعید واقالیم دور و دست میں تقسیم کئے گئے کسی سے قیمت کسی کتاب کی نہیں لی گئی، مصارف انطباع کو جب دیکھا جاتا ہے تو آلاف الوف تک پہونچتے ہیں۔" ۲؎

پچاس سال سے زیادہ ہوئے کہ والاجاہ امیر الملک نواب سید محمد صدیق حسن خاں بہادر انتقال ہو گیا۔ لیکن سید صدیق حسن شائع کتاب وسنت آج بھی زندہ ہے، اور جب تک علوم دینیہ کے پیاسے قرآن وحدیث کے سرچشموں سے اپنی پیاس بجھاتے رہیں گے اس کی تالیفات کا فیض بھی بدستور جاری رہے گا۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ "علم"
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

۱؎ ابقاء المنن ص ۲۱-۲۲
۲؎ " " ص ۲۵

محمد عزیر

محمد ابن حجر الہیثمی مشہور عالم و فقیہ (المتوفی ۹۷۴ھ)۔ ۹۴۲ھ میں سلطان بہادر شاہ نے مغل بادشاہ ہمایوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کا خطرہ محسوس کیا تو اُس نے اپنے حرم کو مع اپنے قیمتی خزانے کے اپنے وزیر آصف خاں کے ہمراہ مکۂ معظمہ کو روانہ کر دیا۔ آصف خاں ۱۲ سال تک مکہ میں رہے اور ۹۵۵ھ میں احمد آباد واپس آئے۔ خود بہت بڑے عالم و فاضل شخص تھے اس لئے افاضل و علماء مکہ کے ساتھ ان کے گہرے تعلقات قائم ہو گئے تھے جن میں ایک علامہ ابن حجر ہیثمی بھی تھے جو آصف خاں کے علم و فضل کے بڑے مداح تھے۔ انھوں نے آصف خاں کے حالات میں یہ رسالہ لکھا ہے۔ اس کتاب کے مخطوطات لیڈن اور برلن کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں[۱] ظفر الوالہ[۲] میں اس کتاب کا متن (ملخص) منقول ہے۔

۴۔ مرأۃ الممالک۔ مصنفہ علی بن حسین معروف بہ سیدی علی رئیس قپو دان (کپتان)[۳] مشہور ترک عالم بحریات ادیب و شاعر۔ یہ سلیمان اعظم سلطان ترکی کے جنگی بیڑے کے کپتان تھے سلطان نے ان کو پندرہ ترکی جہازوں کا بیڑا بصرہ سے خلیج فارس وہاں سے بحر عرب ہوتے ہوئے نہر سویز کو لیجانیکا حکم دیا تھا۔ مگر وہ ساحل بحر ہند کے بحری طوفان سے ناواقف تھے اس لئے راستہ بھول بیٹھے اور ساتھ ہی اپنا بیڑا بھی غرق کر دیا۔ وہ خشکی پر اپنا سفر کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ چنانچہ سواحل گجرات سے بالائی ہندوستان، سندھ، کھوٹان، توران، خراسان، خوارزم اور ایشیائے کوچک ہوتے ہوئے قسطنطنیہ پہونچ گئے۔ اپنی اس کتاب کے چوتھے باب میں اُنھوں نے اپنے وقائع سفر ہندوستان اور باب پنجم میں سفر گجرات کے حالات قلبند کئے ہیں۔ ۹۶۱ھ میں وہ احمد آباد میں تھے جہاں اُنھوں نے بحریات پر اپنی معرکۃ الآرا کتاب "محیط" ختم کی۔ وہ شاعر تھے اور کاتبی تخلص کرتے تھے۔ وہ احمد شاہ (۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء - ۹۶۹ھ/۱۵۶۱ء) کے عہد میں گجرات آئے تھے اور اُنھوں نے اُس زمانے میں جو واقعات دیکھے یا سُنے وہ اس کتاب میں بیان کئے ہیں۔ یہ کتاب ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۷ء میں قسطنطنیہ میں چھپ گئی ہے۔ کئی یورپین زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ پروفیسر ومبری نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا ہے جو ۱۸۹۹ء میں لنڈن سے شائع ہوا ہے۔

۵۔ البرق الیمانی فی فتح العثمانی۔ مصنفہ علامہ قطب الدین محمد بن قاضی خاں

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ [۲] جلد اوّل ص ۳۳۳ تا ص ۳۹۰

[۳] 〃 〃 جلد ا ص ۲۱۔ ص ۲۵۔ کمسریٹ کی تاریخ گجرات ص ۳۷۔ ص ۳۹

عرب جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں کی کتابوں میں گجرات سے متعلق بہت کچھ تاریخی مواد موجود ہے جو "عربی حوالہ جات" (Arab References) کے نام سے جمع کیا گیا اور شائع ہو چکا مگر چونکہ اس کا تعلق تمام تر گجرات کے ہندو عہد سے ہی اس لئے ان کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ عربی میں سلاطین گجرات کی تاریخ پر صرف ایک مستقل کتاب ظفر الوالہ بمظفر و آلہ موجود ہے جو خوش قسمتی سے تین ۳ جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ عربی کی بعض تاریخ و سیر کی کتابوں میں جو نویں اور دسویں صدی ہجری میں لکھی گئی ہیں، "سلطنت گجرات" کی تاریخ سے متعلق بعض مفید معلومات پائی جاتی ہیں جو اس عہد کی تاریخ کے بعض تاریک گوشوں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے سوائے دو تین کے اب تک عربی ماخذ کا استعمال نہیں کیا گیا، حالانکہ ان میں جو معلومات ملتی ہیں وہ سلطنت گجرات کی تحقیق و مطالعہ میں بڑی کارآمد اور مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ سرڈینیسن راس بھی اسکے قائل ہیں کہ:-

> "وہ عربی تواریخ جو حجاز، یمن، عدن اور فتح مصر اور اس کے ساتھ ہی بحر قلزم پر عثمانلی ترکوں کے قابض ہونے پر لکھی گئی ہیں ان سے بھی اس کام (تاریخ گجرات) میں مدد لینی چاہئے گو ان میں سے اکثر کتابیں مؤرخین عرصہ ہوا معلوم کر چکے ہیں، لیکن بعض کا نام تو صرف ان کے حوالوں سے ہی ہم جانتے ہیں۔"[۲]

عربی مصادر

۱۔ الضوء اللامع فی اھل القرن التاسع - مصنفہ شمس الدین محمد بن عبد الرحمن السخاوی (المتوفی سنہ ۹۰۲ھ)۔ اس میں احمد آباد، گجرات، اسکے سلاطین اور اُن علمائکے حالات ملتے ہیں جو نویں صدی ہجری میں گزرے ہیں۔ یہ کتاب سنہ ۹۴ھ میں مصر میں ۱۲ جلدوں میں شایع ہو گئی ہے۔

۲۔ بدائع الزھور فی وقائع الدھور - مصنفہ احمد ابن ایاس المصری (المتوفی ۳۱ ...) یہ کتاب تاریخ مصر پر ۳ جلدوں میں مصر میں شایع ہو چکی ہے۔ اس کا تکملہ جو سنہ ۹۰۶ھ تا سنہ ۹۲۱ھ کی تاریخ مصر پر مشتمل ہے اس کو ریٹر Ritter جرمنی نے استانبول سے دو جلدوں میں شایع کر دیا۔ اس میں سلاطین غوری اور ترکی کے حالات کے ضمن میں سلاطین گجرات سے ان کے تعلقات اور پرتگیز کے مقابلہ میں ان کی امداد سے متعلق بعض اہم معلومات ملتی ہیں۔

۳۔ ریاض الرضوان فی مآثر المسند العالی آصف خان - عبد اللہ آصف خاں وزیر سلطان بہادر شاہ و محمود شاہ ثانی کے حالات و سوانح۔ مصنفہ شہاب الدین احمد

---

[۱] منشی فضل اللہ فریدی مترجم مرآۃ سکندری نے یہ اقتباسات جمع کئے ہیں۔ جو بمبئی گزیٹیر جلد اوّل حصہ دوم میں شامل ہیں
[۲] ... [illegible]

چھپ جانے کے باوجود یہ کتاب اب نایاب ہوگئی ہے۔ اس مسودہ مفصل کتاب کا اُردو میں ترجمہ یا خلاصہ لکھنے کی ضرورت ہے تاکہ غیر عربی داں بھی اس سے مستفید ہوسکیں۔

۸۔ **السنا الباهر** :۔ مصنفہ محمد بن ابی بکر الشلی (گیارہویں صدی ہجری) یہ انور السافر (نمبر ۵) کا ذیل ہے۔ اس میں سلاطین گجرات اور پرتگیزوں کی لڑائیوں کا ذکر ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ مصر میں امیر احمد تیمور پاشا کے کتب خانے میں نمبر ۳۴۰۳ پر شعبۂ تاریخ میں موجود ہے۔

۹۔ **نزهة الجليس ومنية الاديب الانيس** :۔ مصنفہ العباس بن علی بن نور الدین المکی الموسوی۔ یہ کتاب سنہ ۱۱۴۸ھ میں لکھی گئی ہے اور سنہ ۱۲۹۳ھ میں مصر کے مطبع وھبیہ سے دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ یہ مصنف کی سیاحت مصر، فلسطین، ایران، ہندوستان اور یمن کے حالات میں بطور روزنامچہ کے لکھی گئی ہے۔ ضمناً اکثر عربی ادبیات وغیرہ کی غیر متعلق بحثوں کی طرف مصنف نے گریز کی ہے۔ اگرچہ یہ کتاب سلطنت گجرات کے خاتمہ کے بعد اور گجرات بعہد مغول کے آخری دور میں لکھی گئی ہے تاہم یہ اس عہد میں گجرات سے متعلق بعض کارآمد معلومات پر مشتمل ہے، اس لئے اس کا ذکر یہاں ضروری سمجھا گیا۔ مصنف نے اپنی سیاحتوں کے دوران میں سیاحت گجرات[۵۲] (سنہ ۱۱۳۱ھ تا سنہ ۱۱۳۶ھ) کا مختصر حال لکھا ہے جس سے اس زمانہ کی ملک گجرات کی پُرآشوب سیاسی حالات پر روشنی پڑتی ہے، جبکہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ گجرات اور اس کے علاقے مرکزی حکومت کے ہاتھ سے نکلتے جارہے تھے، اور مرہٹوں کی تاخت و تاراج نے ملک میں بدنظمی اور انتشار پیدا کر رکھا تھا۔ مصنف نے مرہٹوں کی سازشوں اور صوبہ داری گجرات کے دو امیدواروں کے مابین چپقلش اور انکی خونریز لڑائیوں کے واقعات چشم دید لکھے ہیں۔ لیکن اس نے اپنے سفرنامۂ گجرات کو دوسرے ممالک کی روداد سفر کے ساتھ ایسا مدغم کر دیا ہے کہ اس کے بیانات کو مسلسل پڑھنا بہت دشوار ہے تاوقتیکہ پوری کتاب نہ پڑھی جائے۔ ہمارے فاضل اور محترم دوست علامہ عبدالعزیز میمن (پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے ان تمام عبارتوں کو جو گجرات سے متعلق ہیں یکجا جمع کر کے ان کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا جو سنہ ۱۹۲۶ء میں رسالہ زبان (مانگرول) میں شائع ہوچکا ہے۔

مندرجۂ بالا تصانیف کے علاوہ ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں بھی گجرات سے متعلق بعض بیانات

---

[۵۱] اسی مصنف کی ایک کتاب المشرع الروی فی مناقب آل باعلوی چھپ گئی ہے۔ اسمیں گجرات کے بعض بزرگوں کے حالات ملتے ہیں۔ [۵۲] دیکھو کتاب مذکور، جلد اول صفحہ ۲۶۷، ۳۴۹، ۲۸۵، ۳۸۹، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۶، جلد دوم صفحہ ۱۷، ۲۰، ۲۲، ۲۸، ۵۰، ۵۱، ۶۳، ۶۵، ۹۲، ۹۳، ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۳۵۔

محمو د النہروالی (المتوفی سنہ ۹۹۰ھ) مکہ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد جو ہندوستان کے ایک علمی خاندان سے تھے، نہر والہ پٹن سے ہجرت کر گئے تھے اور اسی نسبت سے یہ النہر والی کے مشہور ہیں[۵۱] اس کتاب میں پرتگیزوں کے ساتھ سلطان بہادر شاہ کی لڑائیوں اور سلیمانی تو کا ذکر ہے جو سلطان سلیم بن سلیمان نے پرتگیزوں کے مقابلہ کے لئے مصر سے سلیمان بادشاہ کے بیٹے کے ہمراہ ۹۴۵ھ ۱۵۳۸ء میں سلطان بہادر شاہ کو بھیجی تھیں۔ اصل میں یہ کتاب یمن میں حکومت ۹۰۰ھ تا ۹۸۲ھ تک کی تاریخ ہے۔ اس کتاب کے قلمی نسخے لیڈن، پیرس، اسکو اور کتب خانۂ خدیویہ میں پائے جاتے ہیں۔[۵۲]

۶۔ النور السافر فی اخبار القرن العاشر۔ مصنفہ محی الدین عبدالقادر بن بن عبداللہ العیدروسی (م ۱۰۳۷ھ)۔ مصنف کا خاندان یمن سے آیا تھا۔ ان کے والد ہندوستان آئے اور گجرات میں رہ پڑے۔ مصنف خود احمد آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں انھوں نے وفات پائی چنانچہ ان کا مزار بھی وہیں ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ان علما و مشاہیر گجرات کا ذکر کیا جو دسویں صدی ہجری میں گزرے ہیں۔ اس کے ضمن میں مصنف نے اس صدی میں گجرات اور سے متعلق بعض واقعات بیان کئے ہیں۔ چونکہ وہ احمد آباد میں پیدا ہوئے اور مدۃ العمر وہیں رہے کئی واقعات انھوں نے چشم دید لکھے ہیں۔ یہ کتاب سنہ ۱۰۱۲ھ میں لکھی گئی ہے، اور بغداد میں ۱۳۵۳ھ[۵۳] میں طبع ہو چکی ہے۔

۷۔ ظفر الوالہ بمظفر وآلہ۔ مصنفہ عبداللہ بن محمد بن عمر المکی الآصفی الغخانی معروف حاجی الدبیر۔ مصنف سنہ ۱۰۲۰ھ تک زندہ تھا۔ اس نے یہ کتاب سنہ ۱۰۱۵ھ۔ سنہ ۱۰۲۰ھ کے مابین لکھی یہ سلطنت گجرات کی تاریخ سے متعلق معلومات کا ایک خزانہ ہے اس میں بیسیوں عربی فارسی کتابوں کے حوالے دئے گئے ہیں جن میں سے اکثر کا آج کہیں پتہ نہیں ہے۔ اس کا آخری حصہ مصنف کے چشم دید حالات وواقعات پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک واحد قلمی نسخہ سر ڈینیسن راس کو کلکتہ کے مدرسہ عالیہ کے کتب خانے میں ہاتھ لگا اور انھوں نے اس کو تین جلدوں میں سنہ ۱۹۱۰ء۔ سنہ ۱۹۳۱ء اور سنہ ۲۸ علی الترتیب شائع کیا۔ اس وقت سے لیکر اب تک بہت کم مصنفین نے اس سے فائدہ اٹھایا۔

---

۵۱ ان کے حالات وتصانیف کے لئے دیکھو النور السافر ص ۳۰۳ ؛ عقد المنظوم بحاشیہ ابن خلکان جلد ۲ ص ۳۶۵۔
۵۲ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد ۳ ص ۳۴۴ ؛ اسی مصنف کی ایک کتاب الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام چھپ گئی ہے جس میں گجرات سے متعلق بعض اشارات پائے جاتے ہیں۔

یہ بھی اس موضوع پر ہماری معلومات کا ایک اچھا ذریعہ ہے اور ہماری ثقافتی اور دماغی میراث کا صحیح اندازہ کرنے میں بہت مفید ثابت ہوگا۔

آخر میں ہم امید کرتے ہیں کہ تاریخ گجرات کے "عہد سلطنت" کی تمام حیثیات پر تحقیقات کو مکمل کرنے کی غرض سے مندرجہ بالا عربی ماخذ کا خاص طور سے مطالعہ کیا جائیگا جس سے تاریخ گجرات کی بعض گم شدہ کڑیوں کا پتہ لگانے میں بڑی مدد ملے گی۔

اُردو کا حق

(از پروفیسر آغا سروش صاحب اورنگ آباد دکن)

اے وطن کے جاں نثار اے ساکنِ ہندوستاں — مٹ رہے ہیں رفتہ رفتہ تیری عظمت کے نشاں
اگلے وقتوں کی نشانی ہے جو اک اُردو زباں — اس کا دشمن ہو رہا ہے بے سبب سارا جہاں
باپ دادا کی کمائی ہاتھ سے جانے لگی
حد یہ ہے تیری زباں کو تجھ سے شرم آنے لگی

تھیں اسی دن کے لئے ضرب المثل کی شوخیاں — آج سچ مچ پھنس گئی بتیس[۳۲] دانتوں میں زباں
مشکلوں پر مشکلیں اور گتھیوں میں گتھیاں — آگے آگے دیکھئے ہوتے ہیں کتنے امتحاں
آج تو بچ جائیں گے تلوے خلش سے خار کی
کل تجھے چلنا پڑے گا دھار پر تلوار کی

کام چل جائے زباں ہی سے اگر شمشیر کا، — کارگر ہو جائے کوئی چست فقرہ تیر کا،
پھر تو کیا کہنا تری ہنستی ہوئی تقدیر کا — آنکھ میں پھر جائے نقشہ دورِ عالمگیر کا،
اس مہم کو ہے زباں آور سپاہی کی تلاش
ہو اسی اجڑی ہوئی دلی میں جس کی بود و باش

قوم کی بے اعتنائی کا گلہ کرتا نہیں، — نام اس کی سعیٔ ناقص پہ کبھی دھرتا نہیں
ان کے الزام اپنے سر لینے سے بھی ڈرتا نہیں — مشکلوں کا سامنا کرنے سے جی بھرتا نہیں،
تا کہ ہندوستان سے مٹ جائے قوموں کا بگاڑ
اس ضعیفی میں اُٹھایا سر پہ اُردو کا پہاڑ

پائے جاتے ہیں جو سلاطین گجرات سے پہلے کے فرمانروا یا ان خاندان تعلق سے تعلق رکھتے ہیں۔
ازیں انگریزی اور اُردو میں اُن کے تراجم بھی ہو چکے ہیں اور موجودہ زمانہ کے مورخین نے ا
استعمال بھی کیا ہے۔[1]

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ گجرات اور کاٹھیاواڑ کے مختلف مقامات پر خصوصاً احمد
بے شمار عربی کتبات پائے جاتے ہیں جن کو عربی مصادر میں شمار کرنا چاہیئے۔ اگرچہ ان کی ایک
تعداد شائع ہو چکی ہے[2] تاہم ان کتبات کی روشنی میں تاریخ گجرات کا مطالعہ کرنے کی ابتک
اور باضابطہ کوشش نہیں کی گئی۔ بہرحال یہ امر اطمینان بخش ہے کہ ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر
چغتائی (دکن کالج پونہ) نے اس سمت میں آغازِ کار کیا ہے۔ اور احمد آباد کے آثارِ قدیمہ کے تمام عر
کتبات پر ایک مختصر کتاب[3] لکھ کر احمد آباد کی تاریخ کو ان کتبات کی روشنی میں مطالعہ کرنے کا دروا
دیا ہے۔ اسی طرح بمبئی کے مشہور پارسی مورخ پروفیسر کمسریٹ (سابق پروفیسر گجرات کالج)
تاریخ گجرات کا ذکر کئے بغیر ہم نہیں رہ سکتے۔ تاریخ گجرات کے اسلامی عہد پر یہ ایک جامع تاریخ
جو مدتوں کی تحقیق و تدقیق کے بعد لکھی گئی ہے۔ اور مصنف کی براہ راست عربی مصادر سے واقف
نہ ہونے پر بھی اس نے اپنی کتاب میں بعض کا استعمال کیا ہے، اور بعض جگہ عربی کتبات سے
فائدہ اٹھایا ہے۔ خصوصاً ابن بطوطہ اور سیدی علی رئیس پر اس کتاب کے ابواب بہت دلچسپ
قابلِ مطالعہ ہیں۔ اسی طرح ظفر الوالہ کے بعض حوالے بھی اس میں پائے جاتے ہیں۔

یہاں یہ امر بھی لائقِ توجہ ہے کہ احمد آباد میں حضرت پیر محمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی درگ
کے کتب خانہ میں عربی کی قلمی کتابوں کا ایک معتدبہ ذخیرہ موجود ہے، اس کے مخطوطات میں
اکثر نسخوں کے اول یا ابد میں سادہ کاغذ پر یا سرورق پر مختلف قسم کی تحریرات اور مہریں پائی ج
جن میں سے اکثر مشہور علمائے گجرات کی دستی تحریریں ہونے کے لحاظ سے قابلِ قدر ہیں، نیز
تحریروں میں تاریخ سوانح ادب اور ثقافتِ گجرات سے متعلق بعض معلومات پائی جاتی ہیں، جن
نے بلس فہرستِ کتب میں درج کر دیا ہے جو اس نے کتب خانۂ مذکور کی کمیٹی کے ایما پر تیار

---

[1] تاریخ گجرات از کمسریٹ ص۲۱۱۔ [2] یہ کتاب برجلیس اور دیگر ماہرین آثار قدیمہ نے شائع کر دیئے ہیں۔ رسالہ
اپیگرافیا انڈو مسلیمکا اور بھاؤ نگر کے مجموعہ کتبات عربی و فارسی میں بھی کاٹھیاواڑ کے اکثر کتبات متعلق سلاطین گجرات مو
[3] The Muslim Monuments of Ahmadabad.

گورنمنٹ کالج کٹک میں تاریخ کے پروفیسر ہو گئے۔ ابھی اس عہدہ پر پہونچے ہوئے ایک سال سے زیادہ مدّت نہ گزری تھی کہ سرکارِ آصفیہ میں ناظم تعلیمات کا عہدہ خالی ہوا اور وہ ۱۹۱۵ء میں حیدرآباد بُلا لئے گئے۔

ظاہر ہے کہ ان کی تربیت ایسے ماحول میں ہوئی تھی کہ انھیں مشرقی علوم میں دستگاہ حاصل کرنیکا موقع نہ ملا تھا۔ البتہ انگریزی زبان اور اس کے ادب پر ان کو ایسی قدرت حاصل تھی کہ اچھے اچھے انگریز ادیب اُن پر رشک کرتے تھے، وہ فرانسیسی زبان بھی خوب جانتے تھے۔

ولایت کے دورانِ قیام میں ہی ان کو باوجود اس کے کہ اردو، فارسی کے ادب میں ان کی پُوری تعلیم نہ ہوئی تھی، اُردو اساتذہ کے کلام پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ ولایت میں جب وہ کالج کی چھٹیوں میں وہاں کے سبزہ زاروں اور پُرلطف مناظر کی سیر کرنے کے لئے شہر کی آبادی سے باہر جاتے تھے اپنے انگریز دوستوں کو "زہرِ عشق" کے وہ اشعار جو بے ثباتیٔ دنیا پر شاعر نے لکھے ہیں، سُنایا کرتے تھے اور انگریزی میں ان کا مطلب سمجھا کر داد حاصل کرتے تھے۔

ہندوستان پہونچکر انھوں نے اُردو اساتذہ کے دیوانوں کو بالاستیعاب پڑھنا شروع کر دیا اور نہ صرف شعراء کے کلام کو پڑھتے تھے بلکہ اُردو ادب کی نثر کی مشہور اور مستند کتابوں کا بھی مطالعہ کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے مستند شعراء اور نثر نگاروں کی تصانیف سے ایک انتخاب "نصابِ اُردو" کے نام سے تالیف کیا، جس میں نظم و نثر کے مستند اُردو ادب کے نمونے جمع کئے ہیں" اور جس سے اُردو ادب کے ساتھ ان کی گہری دلچسپی کا پتہ چلتا ہے، یہ مجموعہ ۱۹۱۶ء میں نظامی پریس بدایوں سے چھپ کر شائع ہوا اور عرصہ تک کلکتہ یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں داخل رہا۔ ۱۹۳۴ء میں اس مجموعہ کا دوسرا اڈیشن "مستند اُردو کے نمونے" کے نام سے نظامی پریس بدایوں نے شائع کیا ہے۔

۱۹۱۳ء میں ان کی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ قابلِ ذکر ہے جس نے اُردو ادب کی عملی خدمت پر اُن کو آمادہ کیا۔ اُن دنوں وہ پٹنہ سے دہلی گئے ہوئے تھے کہ اُن کی ملاقات اپنے ایک فرانسیسی دوست سے جو سیاحت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے، ہوئی۔ باتوں باتوں میں اُن سے اُردو ادب کے متعلق گفتگو چھڑ گئی اور مرزا غالب کا ذکر آ گیا، اور یہی وہ گھڑی تھی کہ مرحوم کو یہ دُھن لگ گئی کہ اُردو اساتذہ کے کلام کے نفیس اور پاکیزہ ایڈیشن

سر راس مسعود

اور

اردو ادب

(از مولانا نظامی صاحب بدایونی مولف قاموس المشاہیر)

سر راس مسعود کل ہند انجمن ترقی اُردو کے عرصہ تک صدر رہے ہیں - انجمن کے نامور معتمد
اعزازی ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے جنھیں بجا طور پر کچھ دنوں سے اخبار والوں نے "بابائے
اردو" کہنا شروع کر دیا ہے - اکتوبر ۱۹۳۷ء رسالہ اردو مسعود نمبر کے نام سے شائع کیا تھا
اس رسالہ میں "بابائے اردو" نے جو مضمون خود سر مسعود پر لکھا تھا، اُس کو ماہ دسمبر کے
"معنف" میں نقل کر کے مدیر "مصنف" نے سر مسعود کی یاد کو تازہ کر دیا، اس کو پڑھ کر میرا
دل چاہا کہ "سر راس مسعود اور اردو ادب" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھ کر مرحوم کی اس دلچسپی
اور جد وجہد کو جو وہ اردو ادب سے رکھتے تھے اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر "مصنف" کے صفحات
کے ذریعہ سے پیش کر دوں -

میں نے مرحوم کو سب سے پہلے ۱۸۹۴ء کے آل انڈیا مسلم تعلیمی کانفرنس کے اجلاس
میں جو کانفرنس کا نواں اجلاس تھا، علی گڑھ میں دیکھا تھا. اُس وقت اُن کی عمر پانچ سال
قریب تھی، اس کے بعد ان کی طالب علمی کا زمانہ شروع ہو گیا - علی گڑھ میں اُن کی تعلیم
تربیت سر سید کی وفات کے بعد سر تھیوڈر مارلیسن کی نگرانی میں ہوئی. میٹرک پاس کرنے کے
تھوڑے عرصہ کے بعد وہ ولایت بھیج دیئے گئے اور آکسفورڈ کے مشہور نیو کالج میں داخل
ہو گئے، وہاں سے انھوں نے بی. اے کی ڈگری حاصل کی اور بیرسٹری کا امتحان بھی
پاس کیا. ۱۹۱۲ء میں پٹنہ میں وکالت شروع کی، لیکن وکالت کے پیشہ کا ماحول اُن
طبیعت کی افتاد کے ناموافق تھا اس لئے وہ تھوڑے دنوں کے بعد پٹنہ ہی کے
گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹری کے عہدہ پر مقرر ہو گئے، اور وہاں سے ترقی پا

نامور طابع اور ناشر ہی نہ تھے بلکہ وہ اُردو کے ایک اچھے ادیب اور جرنلسٹ بھی تھے اور مجھے ۱۸۹۰ء میں جب میں اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ان کے اخبار "عالم تصویر" کی نامہ نگاری کرتا تھا، ان کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا تھا۔ وہ میرے مضامین کو اپنی اصلاح کے بعد اخبار میں درج کرتے اور اصلاح شدہ اصل مضمون میرے پاس یہ لکھ کر واپس کر دیتے کہ "صاحبزادے غلطیوں کی اصلاح کو غور سے دیکھو" ان کے اس شفقت آمیز برتاؤ نے ۱۹۰۳ء میں مجھے سچ مچ اخبار نویس بنا دیا۔ جس کی وجہ سے ۱۹۰۵ء میں اپنا مطبع "نظامی پریس" کے نام سے جاری کرنا پڑا، پریس کے انتظام میں جب مشکلات پیش آئیں تو منشی صاحب مرحوم کے مشوروں سے مجھے مدد ملتی رہی۔ ۱۹۱۳ء کی ملاقات بھی اسی سلسلہ میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات کے بعد جب میں رخصت ہونے لگا تو اثنائے گفتگو میں فرمایا:۔

"میاں صاحبزادے ایک چیز اور لیتے جاؤ جو تمہارے لئے میں نے محفوظ رکھی ہے"

بکس کھول کر ایک خط نکالا جو اُردو میں لکھا ہوا تھا اور یہ وہی خط تھا جو راس مسعود مرحوم نے ان کو دیوان غالب کی طباعت کے متعلق لکھا تھا۔ فرمایا "کیا تم ان سے واقف ہو جن کا یہ خط ہے؟" میں نے کہا کہ "یہ خط سر سید مرحوم کے پوتے مسعود کا ہے۔ میں نے ان کو ۱۸۹۴ء میں اُن کی بسم اللہ کے دن دیکھا تھا" فرمایا کہ "تم نے جس بچہ کو آج سے بیس سال پہلے دیکھا تھا اب وہ بڑا آدمی ہے۔ اس کا یہ خط لیتے جاؤ اور اس کے منشا کو پورا کرو۔ وہ اُردو ادب کا دلدادہ ہے اور تمہارا بھی یہی مذاق بلکہ یہی پیشہ ہے"

میں نے بدایوں آکر دیوان غالب کی طباعت کے متعلق مسعود مرحوم سے مراسلت کا سلسلہ شروع کر دیا، انھوں نے لکھا کہ مجھ سے مراد آباد آکر اس بارہ میں سید محمد علی کی کوٹھی پر مل لو۔ سید محمد علی مرحوم اس وقت وہاں ڈسٹرکٹ جج تھے۔ میں تو مراد پہونچا لیکن اسی روز وہ ایک فروری تار پہونچنے پر علی گڑھ چلے گئے۔ مراد آباد میں تو ملاقات نہ ہو سکی لیکن پہلی ملاقات اُن سے کچھ دنوں بعد علی گڑھ میں ہوئی اور دیوان غالب کی طباعت کو دلکش اور دلچسپ بنانے کے متعلق انھوں نے ایسے ایسے مفید مشورے دیئے کہ میں حیران رہ گیا۔ کہ اس عمر میں اُن کی نظر حسن طباعت اور ترتیب و تصحیح کے متعلق کیسی وسیع ہے، سب سے پہلی بات تو انھوں نے یہ بتائی کہ جو نسخہ چھپے وہ بہترین کاغذ پر جلی قلم سے نہایت خوشخط ہو۔ صحت کا خاص خیال رکھا جائے اور اشارات املائی سے بھی مزین ہو۔ فرمایا کہ اس سے

شائع ہوں۔ فرانسیسی دوست کی اِس گفتگو کا اُن کے دل پر کیا اثر ہوا، اِس کا اندازہ اُن کے مندرجہ ذیل الفاظ سے بخوبی ہوتا ہے جو انھوں نے بہ حیثیت صدر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۳ء میں بنارس کے اجلاس میں فرمائے تھے، آپ نے فرمایا :۔

"میں اپنی ایک دفعہ کی ذلت کو کبھی نہیں بھول سکتا جب میں اتفاقاً اپنے ایک فرانسیسی دوست کے ساتھ دہلی جا نکلا۔ ان کے لئے دیوانِ غالب کی ایک جلد خریدنے کا ذمہ لیا اور اِس غیر فانی شاعر کے کلام کی ایک ستھری جلد کی تلاش میں دلّی کی گلیوں میں مارا مارا پھرا لیکن جو بہتر سے بہتر نسخہ دستیاب ہوا وہ اِس سستے زرد رنگ کے کاغذ پر چھپا ہوا تھا جس سے یورپ میں لوگ اپنے بوٹ بھی نہ صاف کرنا چاہیں گے۔ جب میں نے یہ کتاب اپنے فرانسیسی دوست کے ہاتھ میں دی اُس وقت اُس کے چہرہ سے تعجب اور حیرت کے جو آثار نمودار ہوئے ان کے تصور سے میں اب تک کانپ جاتا ہوں۔ اُسے کبھی یقین نہ آتا تھا کہ میری مادری زبان کے سب سے بڑے شاعر کے کلام کا یہ بہترین نسخہ تھا جو خود اس شاعر کے وطنِ عزیز میں دستیاب ہوا۔"

مرحوم کو دیوانِ غالب کے بہترین نسخہ کے تلاش میں جس وقت سے ناکامی ہوئی اُسی وقت سے انھیں یہ فکر پیدا ہو گئی کہ کوئی صورت ایسی ہو کہ اُردو شعراء کے دیوان بھی اسی شان اور نفاست کے ساتھ چھپ کر نکلیں۔ جس طرح سے کہ انگلستان اور فرانس جیسے مہذب ممالک میں وہاں کے شعراء کے مجموعے شائع ہوتے ہیں۔

اِس خدمت کو انجام دینے کے لئے انھوں نے ہندوستان کے مطابع پر نظر ڈالی تو ان کی سب سے پہلی نگاہ منشی رحمت اللہ رعد مرحوم کے نامی پریس "کانپور پرنٹنگ" پر پڑی، جس نے دیوانِ حافظ، مثنوی مولانا روم، آثار الصنادید، مسدسِ حالی وغیرہ کے نفیس ایڈیشن شائع کر کے اُردو، فارسی کی کتابوں کے دلفریب اور دلکش نسخے شائع کئے تھے اور اِس زمانے میں نام پیدا کیا تھا۔ فرانسیسی دوست کی ملاقات کے تھوڑے ہی دنوں بعد انھوں نے منشی رحمت اللہ رعد مرحوم کو ایک خط لکھا جس میں فرانسیسی دوست کی ملاقات کے حوالہ سے استدعا کی کہ وہ "اُردو کے اساتذہ کے کلام کے خوشنما ایڈیشن چھاپنے کا انتظام کریں۔"

مئی یا اپریل ۱۹۱۳ء میں جب کہ راس مسعود کا مذکورہ بالا خط منشی صاحب مرحوم کے پاس پہنچ چکا تھا مجھ سے منشی صاحب سے کانپور میں ملاقات ہوئی۔ منشی صاحب مرحوم ہمارے ملک کی

حیدر آباد پہنچتے ہی اعلیٰ حضرت حضور نظام کی حکومت کی یہ تجویز کہ اعلیٰ تعلیم کو ملکی زبان میں دینے کے لئے ایک یونیورسٹی قائم کی جائے، مسعود صاحب کے سامنے آئی انھیں اردو ادب سے طبعی دلچسپی تھی اور وہ اس مسئلہ پر عرصہ سے غور کر رہے تھے۔ اب ارکین سلطنت آصفیہ سے تبادلۂ خیال کرنے کے بعد انھیں کامل یقین ہو گیا کہ بدنصیب ہندوستان دوسری مہذب ممالک کی طرح اُس وقت تک تعلیم یافتہ نہیں بن سکتا اور نہ اس کے چہرہ پر سے جہالت اور ناخواندگی کا بدنما داغ دور ہوگا جب تک کہ ملکی زبان میں اعلیٰ تعلیم نہ دی جائے گی۔ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم پا کر جب لوگ نکلیں گے تو عوام میں علمی خیالات کی لہر خود بخود دوڑ جائے گی اور اس طرح سے ہندوستان میں عام ناخواندگی کا جو دور دورہ ہے وہ دُور ہو جائے گا۔ موجودہ تعلیم کی مذمت جو غیر ملکی زبان میں دیجاتی ہے وہ بلاخوفِ لومتہ لائم اکثر پبلک جلسوں میں کیا کرتے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں سینٹ ہاؤس کلکتہ میں آپ نے فرمایا تھا:۔

> "جن لوگوں نے ہمارے نظام تعلیم کو مرتب کیا ہے وہ اس میں ایک ایسے اصول پر عمل کرنے کے مجرم ہوئے ہیں جس کی زبانی تبلیغ بھی وہ اپنے ملک میں نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے اس بدیہی بات کی طرف توجہ نہیں کی کہ ہر شخص اپنی مادری زبان ہی کو سہولت کے ساتھ سمجھ سکتا ہے اور اگر کسی کو بغیر وقت ضائع کئے کوئی علم حاصل کرنا ہے تو اس مقصد کے لئے مادری زبان کا استعمال لازم ہے"

حیدر آباد کی نظامت تعلیم کے فرائض کے ساتھ ساتھ انھیں نواب عماد الملک بہادر کے انتقال کے بعد انجمن ترقی اردو کا صدر منتخب کیا گیا۔ اردو ادب کے وہ ہمیشہ سے حامی تھے اب ان کو اس شعبۂ اردو ادب کی عملی خدمت کرنے کا موقع ملا۔ اس انجمن کے لئے انھوں نے انگریزوں تک سے چندے وصول کئے اور نہ صرف انگریزوں سے بلکہ جاپانی قوم کے علم دوست لوگوں کو جاپان کے قیام کے زمانہ میں انجمن کا ممبر بنایا۔ جاپان کے نظام تعلیم کے متعلق جاپان سے واپس آکر انھوں نے جو رپورٹ سرکار نظام کو دی تھی اُس کا اردو ترجمہ "جاپان کا تعلیمی نظم و نسق" کے نام سے انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جاپانی قوم کے علمی اور صنعتی ترقی کے راز کو معلوم کر لیا تھا۔

یہ فائدہ ہوگا کہ اشاراتِ املائی شعر کے مطلب کو بڑی حد تک حل کر دیں گے۔ چنانچہ پہلا ان کی ہدایتوں کے مطابق ۱۹۱۴ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ اس کی پہلی کاپی ان کے پاس اس روز پہونچی تھی جب علی گڑھ میں ان کی شادی کا جشن رچا ہوا تھا۔ انھوں نے اس کی رسید میں جو خط بھیجا اس میں لکھا کہ "اس نسخہ کو دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی اور شادی کی خوشی دوبالا ہوگئی"۔

اسی زمانہ میں آپ نے ادب اُردو کی ترقی کے لئے ایک اسکیم بنائی اور اس کو عملی صورت دینے کے لئے نظامی پریس بدایوں کا انتخاب کیا۔ اس کے متعلق اپنے احباب کے نام جنھیں آپ نے اُردو ادب کی ترقی کا حامی خیال کیا۔ ایک گشتی خط جاری کیا اُس میں آپ نے اس اسکیم کو اپنے ان تاثرات کا مرہون منت بتایا تھا جو ان کے قلب پر اپنے فرانسیسی دوست کے لئے 'دیوان غالب' کے بہترین اور خوشنما نسخہ کے حصول کی ناکامی کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ اس اسکیم کے تحت میں جب دیوان غالب کا دوسرا ایڈیشن مشرح نکلا تو ان کی سفارش پر اعلیٰ حضرت تاجدار دکن نے اس کی سرپرستی قبول فرمائی اور جو کتابیں اس سلسلہ میں شائع ہوں ان کو 'سلسلہ آصفیہ' کے نام سے موسوم کرنے کی اجازت فرمائی۔ دیوان غالب کے کئی ایڈیشن میر انیس کے تمام مراثی تین جلدوں میں، مولانا طباطبائی کے مدون کئے ہوئے اور خواجہ میر درد کا دیوان نواب صدر یار جنگ کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا۔ مگر ان کتابوں کی نکاسی کی رفتار خلاف توقع سست رہی، جس کا تذکرہ انھوں نے بنارس کے خطبہ صدارت میں مندرجہ ذیل الفاظ میں افسوس کے ساتھ کیا :۔

> "اُردو شعراء کا کلام جس ذلیل حالت میں شائع ہوتا ہے اس کی ذلت کو دور کرنیکے خیال سے چند سال ہوئے کہ دوستوں کی مدد سے میں نے اپنے ایسے بڑے بڑے شعراء کے کلام کو جیسے کہ میر اور انیس عمدہ چھپے ہوئے نسخوں میں شائع کرنا شروع کیا۔ لیکن مجھے بہت جلد معلوم ہوگیا کہ میرے ہم وطن اس کیلئے تو تیار ہیں کہ ردی ناولوں پر جو تیسرے درجہ کی انگریزی میں لکھے گئے ہوں سات روپیہ خرچ کر دیں لیکن خود اپنے بڑے مصنفوں کی تصانیف کے دیدہ زیب نسخوں پر چار روپیہ بھی خرچ کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ ہم دوسروں سے یہ توقع کرنیکا کیا حق رکھتے ہیں کہ وہ ہمارا احترام کریں جب کہ ہم خود اپنی چیز کا احترام کرنے کیلئے تیار نہ ہوں"۔

جنوری ۱۹۲۲ء میں مسعود نے تالیف کیا تھا اور جو مولوی عبداللہ جان صاحب وکیل سہارنپور کے مقدمہ کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوئی۔ مقدمہ نگار مرحوم نے بالکل صحیح لکھا ہے:-

"اگر سید راس مسعود ان مکتوبات کے جمع کرنے اور اُن کے چھپوانے کا اہتمام نہ کرتے تو بلاشبہ مزید مدت گزرنے پر سید اعظم رحمۃ اللہ کی اُن تحریرات کے بیش بہا ذخیرہ کا وجود بھی دنیا میں قائم نہ رہتا اور ملک اُس کے استفادہ سے ہمیشہ کو محروم رہ جاتا............

سید راس مسعود کا یہ ساری قوم کے سر پر احسان ہے کہ انھوں نے اس ضروری کام کا بوجھ اپنے کندھوں پر لیکر قوم کو اس کے اخلاقی فرض سے سبکدوش کر دیا۔"

مسعود مرحوم کا ذاتی کتب خانہ جس میں ہر زبان کی کتابیں موجود تھیں، نہایت نفیس تھا۔ صرف یہی نہیں کہ کتابیں الماریوں کی زیب و زینت بنی ہوئی ہوں بلکہ ان کے مطالعہ سے اُن کے دماغ میں اُن کے مضامین کا بڑا حصہ موجود تھا۔ بات بات پر وہ مشہور مصنفین کے اقوال کے حوالے دیتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ اُن کی مجالست ہر ادبی ذوق والے کے لئے ایک پر لطف صحبت ہوتی تھی۔ خواجہ غلام السیدین نے جنھیں علی گڑھ میں اُن کی وائس چانسلری کے زمانہ میں اُن کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ ایک مضمون میں بہت صحیح لکھا تھا:-

"طلباء جو کم از کم خیالات اور جذبات کی دنیا میں بلندی اور پاکیزگی اور خلوص کے جویا ہوتے ہیں یکیں؟ فطرت ادب میں اپنے ذوقِ جمال کی تسکین چاہتے ہیں اُنکی (سر راس مسعود کی) صحبت کو ایک ادبی نعمت تصور کرتے تھے۔"

واقعہ یہ ہے کہ اردو ادب کی ترقی کی بہت سی اسکیمیں مرحوم کے انتقال سے عالم خیال میں رہ گئیں اور اردو ادب کو ان کی رحلت سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا

یہ اسکیمیں کیا تھیں اس کی تفصیل مشکل ہے کیونکہ مجھے اُن کی زندگی کے آخری دو تین سالوں میں جبکہ وہ بھوپال رہے اُن سے ملاقات کا موقع نہ ملا۔ وہ اپنی اسکیموں کا ذکر اپنے گردوپیش کے لوگوں سے اُسی وقت کرتے تھے جبکہ کوئی نتیجہ اُنکے دماغ میں آ چکی تھی۔ انتقال سے تقریباً ایک سال پہلے غالباً ۱۹۳۶ء کے آخر میں انھوں نے مجھے لکھا تھا کہ "مجھ سے بھوپال آکر ملو میں نے اردو کے متعلق ایک نئی اسکیم سوچی ہے اُس کا حال زبانی کہوں گا" صرف خط ہی نہیں لکھا بلکہ بدایوں کے ایک معتمد کے سبب اُن سے بھوپال جا کر ملے تو اُن کے ذریعہ سے زبانی پیغام بھی بھیجا لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ میں خود علیل تھا اس لئے ملاقات کی نوبت نہ آئی یہاں تک کہ ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء کو وہ اردو ادب کی محبت اور اس کی ترقی کی اسکیموں کو دماغ میں لئے ہوئے ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔

میں ابھی یہ مضمون ختم نہ کر چکا تھا کہ انجمن ترقی اردو بھوپال کے معتمد حضرت مائل نقوی کا ایک مضمون زمانہ میں نظر سے گزرا جس میں انھوں نے سر راس مسعود کی اُن دلچسپیوں کا ذکر کیا ہے جو بھوپال کی ادبی فضا میں اُن سے ظہور میں آئیں انھوں نے لکھا ہے کہ مرحوم نے اپنے ذاتی صرف سے وہاں دار التصنیف کی بنیاد ڈالی تھی اور راس ادارہ کو وہ بڑے پیمانہ پر عملی صورت اس طرح دینا چاہتے تھے کہ کسی پر فضا بلند مقام پر ایک وسیع کوٹھیاں تعمیر کرائی جائیں اور ہر کوٹھی کو علم و ادب کے کسی شعبہ سے منسوب کر کے اسے جملہ لوازمات سے مکمل کر دیا جائے پھر ہر فن کے ماہر کی خدمات کم از کم ڈھائی سو روپیہ ماہانہ پر حاصل کی جائیں اور اُن سے یہ معاہدہ کر لیا جائے کہ ہر سال چھ ماہ تمام علائق سے منقطع ہو کر کوٹھی میں قیام کریں اور تین سال کے بعد اپنے فن پر ایک رسالہ تیار کر دیا کریں انھوں نے اس اسکیم کو عملی صورت دینے کے لئے دو لاکھ روپیہ کا تخمینہ کیا تھا اور فرمایا تھا کہ وہ اس رقم کو آسانی سے جمع کر لیں گے۔ جگہ کا بھی انتخاب کر لیا تھا جس کا اظہار نہیں کیا تھا یہ بھی کہا تھا "میری زندگی کا یہ [illegible] ... مائل صاحب [illegible]

اُردو شعرا کے تذکرہ سے ملتا ہے جو انھوں نے ۱۹۲۱ء میں "انتخاب زریں" کے نام سے لکھا تھا اور دہ نظامی پریس بدایوں نے شائع کیا ہے۔ اس تذکرہ کی تمہید میں اُردو شاعری کی نسبت انھوں نے لکھا ہے :-

"یہ مجموعہ انتخاب زریں کے نام سے جو آج پیش کیا جاتا ہے نہ صرف ناظرین کے تفنن طبع کا سبب ہوگا بلکہ ان لوگوں کو جو اُردو نظم کی خوبیوں کے ایک گونہ منکر ہیں ثابت کر دے گا کہ وہ اس معاملہ میں غلطی پر تھے اور اس مجموعہ کے مطالعہ سے ظاہر ہو جائے گا کہ اگر اردو شاعری کے بہترین حصہ کا کسی دوسری قوم کی اچھی سے اچھی نظم سے مقابلہ کیا جائے تو اول الذکر کا درجہ گرا ہوا نہ ہوگا اور حقیقت جب اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ اُردو وہ زبان ہے جس کا شمار زمانۂ حال کی نوزائیدہ زبانوں میں ہے تو یہ ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قدر قلیل مدت میں اُردو نظم کو وہ جلا دی گئی جو مہذب اور شستہ خیالات کے لئے اہل الاصول ہو"

ایڈورڈ مارگن مارسٹر جو ایک مشہور انگریزی ناول نویس ہیں مسعود مرحوم کے انتقال کے بعد ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔ "یہ نکتہ فراموش نہیں ہونا چاہئے کہ روحانی طور پر مسعود شاعر تھے۔" اس انگریز ادیب نے یہ جو کچھ لکھا ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مرحوم کو فارسی، اُردو، انگریزی، اور عربی شعرا کے ہزاروں بلکہ لاکھوں اشعار زبانی یاد تھے اور وہ انھیں نہایت شوق، جوش اور برجستگی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ لیکن میں نے ایک دفعہ اُن سے سوال کیا کہ "جب شعر و سخن سے آپ کو اس قدر دلچسپی ہے تو آپ شعر کیوں نہیں کہتے؟" فرمایا "میں نے ایک دفعہ چند فارسی اشعار کا انگریزی نظم میں ترجمہ کرنے کی ضرور کوشش کی تھی لیکن میری طبیعت شاعری کی پابندیوں کی زحمت اٹھانے کی متحمل نہیں ہوئی۔ اس لئے میں نے اس طرف کبھی توجہ نہیں کی۔" اس میں شک نہیں کہ اشعار کو زبانی یاد رکھنے میں اُن کا حافظہ اسقدر قوی تھا کہ لوگ تعجب کرتے تھے۔ مولانا حالی کی صد سالہ جوبلی کے موقع پر ایک پرائیویٹ صحبت میں سر اقبال کی موجودگی میں جب ان کے اشعار مسعود نے زبانی سنانا شروع کئے تو ایسا تار بندھا کہ سر اقبال کو یہ کہنا پڑا کہ "آپ کو میرا اتنا کلام یاد ہے کہ خود مجھے بھی اتنا زبانی یاد نہیں"

رائٹ آنریبل ایچ۔ اے۔ ایل۔ فشر انگریزی کے ایک مشہور ادیب نے اِن کے ادبی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا "سچ یہ ہے کہ ایسی نمایاں قوت اور ایسے دلکشی والے انسان سے ٹھیک ٹھیک ایسے ہی کارناموں کی توقع ہونی چاہئے تھی۔"

اگر مسعود مرحوم کی ایک دوسری تالیف کا جس نے اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے اس مضمون میں ذکر نہ کیا جائے تو نا انصافی ہوگی۔

معلوم ہوتے ہیں۔ اس مسلک میں وہ کبھی کبھی معمولی واقعات میں تخیل کی رنگ آمیزی سے بھی
کام لیتا ہے۔ طامس ہارڈی بھی انسان کی مصیبتوں پر غور کرتے کرتے اُس کے خالق پر بھی
سوچنے لگتا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ انسان کا احساس اور اس کی فکر اُس کے حق میں
مصیبت ہیں کیونکہ یہی اُس کے مصائب کا سرچشمہ ہیں۔ ہاؤس مین کا انداز اُس سے مختلف ہے
وہ قانونِ الٰہی یا انسان کے ساختہ قوانین پر بحث نہیں کرتا بلکہ زندگی سے گھبرا کر اور مایوس
ہو کر دیہاتی سکون میں پناہ ڈھونڈھتا ہے۔

اس Decadent زوال آمادہ دبستان کے اثرات دوسری صورتوں میں بھی نمودار
ہوئے اخلاق، مذہب اور آرٹ کی مستقل قدریں اپنا اقتدار کھو بیٹھیں، چنانچہ وائلڈ
(Wilde) اور اُس کے ساتھیوں نے (Baudelaire) اور
سوئن برن (Swinburne) کی مثالوں کو سامنے رکھ کر عجیب عجیب رواج اور
اعمالِ خبیثہ کا مطالعہ کیا۔

یہی زمانہ ہنلے (Henley) نے پایا۔ اُس نے شاعری میں انقلاب کی ضرورت
کو محسوس کیا، اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہمارے ماحول میں معمولی معمولی چیزیں ایسے نقوش پیدا
کر سکتی ہیں جو شاعری کا موضوع بن سکیں، اُس نے غیر مقفی نظمیں لکھیں اور چند نئے پیمانے
رائج کئے، (W. W. Gibson) نے مزدوروں کے طبقہ کو موضوعِ شاعری
بنایا، اور کانوں، کارخانوں اور جہازوں میں کام کرنے والے ادنیٰ مزدوروں کی عورتوں
کو اپنی شاعری میں نمایاں کیا، اُس نے بڑی دلخراش حالتیں بیان کیں، بے سر و سامانی میں
بچوں کا پیدا ہونا، بیماریاں، موت اور حادثات، ان نظموں میں اُس کا خاص موضوع ہیں۔
اُس کی ایک نظم میں ایک مزدور برفباری کے طوفان میں محنت کر رہا ہے ایک اور نظم میں
ایک مزدور ایک کان میں کام کرتے کرتے ختم ہو جاتا ہے۔ ایک نظم کا موضوع ایک ایسی
سادہ مزدور لڑکی ہے جو بے یار و بے مددگار ہے۔ ایک دوسری نظم میں ایک مزدور کے
دل میں محبت کے خوابیدہ احساسات بیدار ہو رہے ہیں ۔۔۔ یہی ہیں Gibson
کے لئے موضوعات (W. H. Davies) بھی افلاس کے شدید مصائب سے
متاثر نظر آتا ہے لیکن وہ دور سے کھڑے ہو کر اُن مناظر کو دیکھتا اور ششدر رہ جاتا ہے
آخر میں وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ احساسات کو بیدار کرنے اور اُن میں شدت پیدا

(از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی)

اگر آپ اپنی پرانی تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ پچھلے ۵۰ سال کا زمانہ ذہنی، معاشرتی، مذہبی اور اقتصادی اعتبار سے بڑا پُر آشوب گزرا ہے۔ پُرانی قدروں کے ایوان میں زلزلے کے سے جھٹکے محسوس ہوئے ہیں نئے تصورات کی بنیادوں پر زندگی کی نئی تعمیر شروع کی گئی ہے۔ اگرچہ آنے والی صبح کے آثار ابھی دھندلے ہیں لیکن یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ تاریک رات کا بڑا حصہ گزر چکا ہے۔ انقلاب کی جس درخشاں صبح سے ہماری امیدیں وابستہ ہیں ادب اس کا ایک پہلو ہے۔

یہ سنکر آپ کو غالباً بالکل تعجب نہ ہوگا کہ ہمارے ملک کے علاوہ اور ملکوں کا ادب بھی تجربہ اور انقلاب کی آزمائش سے گزرا ہے اور گزر رہا ہے۔ یہاں میں مختصر طور پر ان تجربوں کا ذکر کروں گا جو انگریزی شعر و ادب میں کئے گئے اور جن سے شعوری یا غیر شعوری طور پر ہمارے نوجوان شعرا متاثر ہوئے ہیں اس طور پر آپ کے سامنے وہ پس منظر آجائیگا جس میں ہمیں اردو کی موجودہ ترقی پسند شاعری کو دیکھنا ہے۔ یہی شاعری آج آپ سے میرے کلام کا موضوع ہے۔

پچھلے چالیس سال کی مختصر مدت میں انگریزی شاعری میں کئی مستقل رجحانات ملتے ہیں۔ ابتدائی وکٹوریائی عہد کے شعرا کے کلام کا ایک نمایاں عنصر اُن کی رجائیت تھی لیکن اس عہد کے آخری شعرا بالخصوص جیمس تامسن (James Thomson) تامس ہارڈی [illegible] اور اے۔ ای۔ ہاؤس مین (A. E. Housman) کے یہاں ایک قنوطی زاویہ نگاہ نمایاں ہے۔ جیمس تامسن زندگی کے آلام اور مصائب کو محسوس کرکے بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے، معمولی مناظر مثلاً شہر میں اُسے ایک ایسی دنیا میں جس کا خالق کوئی نہ ہو تنہائی کے اشارے

Richard Aldington بھی اسی عہد کا ایک مشہور شاعر ہے وہ بھی حالات کا جائزہ لے کر انسانیت اور خود اپنے آپ سے متنفر ہو جاتا ہے آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ ن۔م۔ راشد اور چند دوسرے ترقی پسند اردو شعرا کا بھی یہی انجام ہوا ہے۔

یہ شاعر اپنے تجربے کر رہے تھے کہ جنگ کا آغاز ہو گیا، اور اس کا اثر شاعری پر بھی پڑا جنگ کی وجہ سے سوسائٹی کی قدریں بدل گئیں اور سوسائٹی کی ضروریات کا احساس اور شدید ہو گیا، نئے اور پرانے اصولوں میں تصادم ہوا اور ایک تذبذب کی کیفیت پیدا ہو گئی امن اور استقلال قائم کرنے کی کوشش ایک فطری امر تھا، اس کی بھی دو صورتیں ہو سکتی تھیں یا تو عہد ماضی میں پناہ لی جائے اور پرانی تہذیب قدیم معاشرت اور آبائی تصورات دوبارہ رائج کئے جائیں یا ایک نئی دنیا بنا لی جائے۔ انگریزی شاعری میں دونوں کے نمونے ملتے ہیں۔

ان حالات میں ایک اور جماعت شعرا کی آگے بڑھی۔ اسے Sitwell group کہتے ہیں۔ یہ سب لوگ شہر سے نفرت کرتے ہیں لیکن بعض متقدمین کی طرح فطرت کے دامن میں بھی انھیں پناہ نہیں ملتی، اس لئے وہ آخر کار خود زندگی کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں، جنگ نے تقریباً ایسا ہی اثر موجودہ اردو شعرا پر کیا ہے۔ زندگی سے نفرت، فرار اور آخر خودکشی پر انجام انھیں رجحانات کے آئینہ دار ہیں۔ Sitwell group کے شعرا اس حقیقی دنیا سے فرار اختیار کر کے اپنے خیالات کی ایک شاعرانہ دنیا الگ بناتے ہیں اسی لئے اُن کے کلام میں مبہم تلمیحات اور ناتمام کہانیاں بہت ہیں۔ آگے چل کر آپ سمجھیں گے کہ ہماری موجودہ اردو شاعری بھی بڑی حد تک اسی دور سے گزر رہی ہے۔ جس طرح Miss Sitwell کی شاعری میں "موت" کی ہیبت جاری و ساری ہے اور ہر ہر قدم پر زندگی کے عبث ہونے کا احساس شدید نظر آتا ہے اسی طرح ہمارے شاعر آلام روزگار سہتے سہتے زندگی کو ہی وبال اور عبث سمجھنے لگے ہیں۔ Sitwell group کا ایک خاص کارنامہ قابل غور ہے۔ انگریزی شعرا میں Miss Sitwell پہلی مرتبہ نظم کو جدید موسیقی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ہمارے یہاں بھی موجودہ دور میں گیتوں کا عام رواج اسی قسم کی تحریک کہا جا سکتا ہے

کرنے کے لئے انسان کو فطرت سے لگاؤ پیدا کرنے کی ضرورت ہے Rupert Brooke معمولی مناظر سے شدید احساس پیدا کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ شاعری میں جمالیاتی شعور ضرور ہو۔

ٹکنیک کے اعتبار سے جس دور کی (یعنی Georgian) شاعری کا میں اس وقت ذکر کر رہا ہوں بہت اہم ہے۔ نظم کی پرانی بندشوں کو توڑ کر یہ کوشش کی گئی کہ نظم روانی اور بیان میں عام گفتگو سے زیادہ سے زیادہ قریب آجائے

اس کے بعد کے شاعر اپنے خاص رجحانات کی بنا پر (Imagist) کہے جاتے ہیں جن میں F. S. Flint T. E. Hume Hilda Doolittle، Ezra pound Richard Aldington اور Amy Lowell زیادہ ممتاز ہیں۔ ان کے چار اصول تھے۔

(۱) موضوع براہ راست بیان (۲) مختصر الفاظ (۳) خاص تصورات (Images) سے مدد لینا (۴) فطری وزن کا استعمال، اسی زمانہ میں انگریزی شاعری نے جاپانی اور چینی شاعری سے بعض چیزیں اخذ کیں اور آزاد نظم عام طور پر رائج ہو گئی، اس تحریک سے متاثر ہونے والوں میں... T. E. Hume بھی تھا، اس کا بھی یہی خیال تھا کہ عصر حاضر کی زندگی نے انسان اور فطرت کی ہم آہنگی کو بالکل برباد کر دیا۔ T. E. Hume بھی تشبیہ اور استعارہ سے کام لیتا ہے لیکن ہر موقع پر اس کا بیان صاف رہتا ہے۔ Georgian شعرا کی طرح اس کے بیان غیر مربوط اشاروں کا سلسلہ نہیں ملتا ہے۔ Imagist اظہار کے صاف اور فطری انداز کو پسند کرتے تھے۔ چنانچہ قوافی کے اصولوں کی سختی کو انھوں نے ترک کرنا چاہا لیکن قبل اس کے کہ یہ تحریک عام طور پر اپنی خوبیوں کو ظاہر کر سکے کچھ نو مشق شاعروں نے اسے اختیار کر لیا اور اسے نیم پختہ اور بے ربط خیالات کے اظہار کا آسان ذریعہ سمجھ کر استعمال کرنے لگے۔ اگر آپ موجودہ اردو ترقی پسند شاعری پر نظر ڈالیں تو ایک متوازی کیفیت نظر آئے گی، بعض شعرا نے آزاد نظم کو اصولی طور پر اختیار کیا ہے لیکن اکثر لوگوں نے جن میں پابند شعر کہنے کی صلاحیت موجود نہیں تھی جن کے خیالات خام اور جذبات غیر مربوط تھے اسے محض آسان سمجھ کر اختیار کر لیا ہے۔

ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ بڑھتا ہے اور حالات ساز گار نہ ہوں تو مر بھی سکتا ہے۔ اپنی زندگی کی ہر منزل میں اسکی وضع قطع تراش خراش علیحدہ ہوتی ہے۔ یہی ادب میں ترقی ہے۔

پچھلی جنگ عظیم ہم میں سے اکثر کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے لیکن جنھیں بطور واقعہ یاد نہیں اُس کے اثرات جو کم و بیش اِس دوسری عالمگیر جنگ کے آغاز تک باقی تھے انھوں نے بھی ضرور محسوس کئے ہیں، اگرچہ اُس عہد کے ادب کے نمونے اب ہمارے یہاں out of date یعنی سال خوردہ کہلاتے ہیں تاہم چکبست کا کلام ابھی تک زندہ ہے۔ اُس کی شاعری اس اعتبار سے ادب کی اس زندگی کی پہلی آواز ہے جو ۱۹۱۴ء کے بعد شروع ہوتی ہے۔ چکبست کا ذکر کرنے سے پہلے اُس کے پس منظر کو دیکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ جدید کی تعمیر قدیم کی بنیادوں پر ہی ہو سکتی ہے۔ دراصل حالی سے ہی اردو شاعری نئے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اور حالی کی شاعری اس دور میں عبوری ادب کا ایک اچھا نمونہ ہے، ایک طرف ان کے دل کی رام کہانی ہے جو وہ اس وقت تک سناتے رہے جب تک ان کا دل زندہ رہا، دوسری طرف ان کی وہ شاعری ہے جس میں زندگی کا احساس ایک کروٹ لیتا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حالی چونکہ خود پہلے دور کی پیداوار تھے اور ذہنی تصورات و محسوسات کے ساتھ شعری پیمانے بھی انھیں وہی پسند تھے جو وہ بچپن سے دیکھتے چلے آئے تھے اس لئے وہ اس نئے ادب کے دور کی صرف ایک ہلکی سی جھلک دکھا سکے، یہ انکی ناکامی ہے یا کامیابی اُس کا فیصلہ کرنا آج بہت مشکل ہے۔ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت حالی نے جو کیا اس سے زیادہ کرنا کسی اور کے بس کی بات نہ تھی، حالی میں کتنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ ان لوگوں میں رہ کر جو "سرگشتۂ خمار رسوم و قیود" تھے انھوں نے بڑی جرات سے کام لیا اور اُن پابندیوں کو توڑنے کا پہلا اعلان کیا، اسوقت تک ہماری شاعری کا فن یا ٹکنیک جیسا دقیق اور اصولی بن چکا تھا۔ اُس کا اعادہ ضروری نہیں۔ وزن، ردیف، قافیہ ایسے پیمانے تھے جن کے سوا اور پیمانوں میں شراب سخن چھلکائی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ مقدمہ شعر و شاعری میں جس دن حالی نے یہ اعلان کیا کہ وزن شعر کے لئے ایک ضروری شرط نہیں۔ اور قافیہ بھی اگرچہ شعر کے حسن میں اضافہ کر دیتا ہے۔ لیکن اس کے لوازم میں نہیں، بلکہ اچھے شعر میں صرف سادگی اصلیت اور جوش کا ہونا کافی ہے۔ اس دن گویا قدیم شاعری کے قصر کو جس میں اردو شعرا کی تین سو سالہ تعمیری کوششیں شامل تھیں

آخر میں میں صرف تین انگریز شاعروں کا اور ذکر کروں گا جن میں سے کم از کم ایک نے ہمارے چند ترقی پسند شعرا کو متاثر کیا ہے۔ میرا مطلب Herbert Read، T.S. Elliot اور D.H. Lawrence سے ہے ہربرٹ ریڈ جنگ سے متاثر ہے۔ دنیا سے بیزار ہے، محبت پر بھی اُسے اعتبار نہیں کیونکہ اُس کے نزدیک اکثر محبت کا انجام نفرت پر ہوتا ہے، اسی لئے وہ ایک اپنی دنیا بناتا ہے جو خوابوں کی دنیا کہی جا سکتی ہے۔ ہمارے شاعروں کا بھی یہی محبوب مشغلہ ہے۔ چنانچہ آگے چل کر آپ اس کی تفصیل اور تشریح سنیں گے، D.H. Lawrence کی تین خصوصیات قابل لحاظ ہیں :۔

(۱) اشاریت اور ابہام (۲) جنسیات (۳) موجودہ نظام سے بیزاری اور اس کی اصلاح یا یہ ممکن نہ ہو تو ایک نئے نظام کی تعمیر اس نظام میں وہ بالعموم مرد عورت اور اس کے جنسی تعلقات کا ذکر کرتا ہے۔ پہلے لارنس نے پابند نظمیں لکھیں بعد میں آزاد نظمیں کہنے لگا۔ اُس کے تصورات اُس کا تفکر اُسے 'خودکشی' تک پہنچاتے ہیں۔ اردو شعرا میں جنسیت اور ابہام اسی طرح ہے جس طرح Lawrence کے یہاں ملتا ہے۔ لارنس کی بعض چیزیں جو زیادہ قابل اعتراض تھیں سرکاری حکم سے ممنوع قرار دی گئیں اور اُن کی اشاعت قانوناً بند ہے۔ اردو شاعروں میں راشد کے یہاں کچھ کچھ Lawrence کی جھلک ملتی ہے لیکن D.S. Lawrence کی عظمت ابھی راشد کو حاصل نہیں۔ اس تمہید کے بعد میں مقالہ کے اصل موضوع یعنی ترقی پسند شاعری پر آتا ہوں۔

ادب برائے ادب ہو یا ادب برائے زندگی، غالباً یہ ماننے میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ ہر صورت میں ادب حیات سے متعلق بلکہ اس کا ترجمان رہتا ہے۔ ادب کا وہ دورِ قدیم جو ادب برائے ادب کا جمالیاتی دور کہا جاتا ہے اُس میں بھی اُس عہد کی تہذیب، اُس کی معاشرت کی دھڑکنیں اور زندگی کی قدریں صاف موجود ہیں، مثال کے لئے صرف میر کے کلام کو دیکھئے اور اب جبکہ ادب برائے زندگی کا تصور ایک تحریک سے گزر کر اصول بن چکا ہے اب بھی ادب ہماری پُر آشوب حیات، ہمارے پیچیدہ احساسات اور تفکرات کا مجموعہ ہے، زندگی ہمیشہ زندگی رہی ہے صرف اس کی قدریں بدلتی رہی ہیں۔ اسی طرح ادب کے موضوعات اور سانچے ہیں، زندگی کی طرح ادب بھی جاندار اور ارتقا پذیری سے پیدا ہوتا ہے۔

نہ بچ سکے، انھوں نے شعر العجم میں جہاں شاعری کی ماہیت سے بحث کی ہے وہاں انھیں خیالات کا اعادہ کیا ہے جو حالی کے یہاں ملتے ہیں یعنی وزن اور قافیہ کو شعر کی ضروری شرط قرار نہیں دیا ہے، اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ سب ترقی پسندی کے آثار ہیں لیکن عملاً ترقی پسند شاعری اس کے بہت بعد شروع ہوئی عظمت اللہ خاں مرحوم بھی نئی شاعری کے نقیب تھے انھوں نے اُردو عروض کو ہندی پنگل سے قریب تر کرنے کی سعی کی۔ گیت لکھے اور بعض نئے شعری پیمانے انھیں رائج کئے۔ اُن کی تصنیف میں سُریلے بول اسی نئی تحریک کی ایک آواز ہے۔

ترقی پسند شاعری کا ذکر آتے ہی ہمارا ذہن اس تحریک کی طرف منتقل ہوتا ہے جو ۱۹۳۶ء میں چند نوجوانوں نے ترقی پسند ادب کے نام سے شروع کی تھی، اِس تحریک کا پہلا ادبی اعلان وہ مشہور بدنام مجموعہ ہے جو "انگارے" کے نام سے موسوم تھا، اس تحریک میں پہلے پہلے سجاد ظہیر احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں وغیرہ کے نام نمایاں رہے، احمد علی کا مجموعہ 'شعلے' بھی اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی ہے 'انگارے' کا جو حشر ہوا وہ آپ کو معلوم ہے، پُرانی چال کے ایک صاحب نے اس کا جواب لکھا۔ رجعت پسندوں نے بڑی لے دے کی اور آخر کار کتاب سرکار نے ضبط کر لی۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۳ء تک اس تحریک نے اپنی عمر کے سات سال گزارے لیکن اس میں زیادہ تر نام اُن لوگوں کے ہیں جن کی ادبی زندگی ۱۹۳۶ء سے پہلے شروع ہو چکی تھی ۱۹۳۶ء میں یہ ہوا کہ وہ لوگ جو منتشر طور پر علیٰحدہ علیٰحدہ تجربے کر رہے تھے انھیں ایک زاویہ اور ایک پلیٹ فارم مل گیا لیکن اس کے باوجود جو مدّت ترقی پسند ادب کے تجربے کو گزری ہے بہت کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود ترقی پسند مصنفین اپنے اس دور کو 'بحران' کا دور کہتے ہیں اور وہ خود نہیں جانتے کہ ان کا مستقبل کیا ہوگا۔ تاہم پچھلے چند سالوں کے نظم و نثر کے مجموعہ کا مطالعہ کیا جائے تو موضوعات اور ان کے اظہار کے بعض اسالیب خاص رجحانات کی صورت میں نظر آتے ہیں، یہی میرے خیال میں ترقی پسندی کے عام رجحانات ہیں۔

اِن عام رجحانات کا جائزہ لینے کے لئے دو چیزیں سامنے رکھنا کافی ہیں۔ ادبی رسالے اور نظموں کے مجموعے۔ رسالوں میں ادبی دنیا (لاہور) ادب لطیف (لاہور) ساقی (دہلی) ہمایوں (لاہور) بیشتر اور نگار (لکھنؤ) جامعہ (دہلی) کمتر ترقی پسند شاعری کی اشاعت کے لئے ذمّہ دار ہیں۔ کلام کے مجموعوں میں جوشؔ کے کئی مجموعے ہیں۔

تخریب کے زلزلے کا پہلا جھٹکا محسوس ہوا جس سے اُس میں بعض شگاف پیدا ہو گئے او
انھیں شگافوں میں سے مستقبل کی شاعری کا نور چھن چھن کر آنے لگا، لیکن پوری عمارت
گرانے کے لئے اور زلزلوں کی ضرورت تھی اور نئی عمارت کی تعمیر ابھی نئے معماروں کے انتظ
میں تھی۔ ان نئے معماروں میں معمارِ اعظم اقبال تھا۔

اقبال کے مفکرانہ نظریئے اور ان کی اسلامی شاعری بھی لوگوں کو اُن کے اہم ترین
کارنامے نظر آتے ہیں لیکن ادب کی تاریخ میں ان کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ صحیح معنوں میں
انقلابی اور ترقی پسند تھے۔ بیداریٔ جمہور کی خاطر وہ ہر نقشِ کہن مٹانے کو تیار رہتے۔ اُن سے
پہلے شاعری نفیِ حیات اور ہزیمت خوردہ ذہنیت کی شاعری تھی، انھوں نے اثباتِ حیات
اور رجائیت کی شاعری کا آغاز کیا، اُن سے پہلے شعروادب میں فرشتے اور سلاطین ہی
انھوں نے شیطان اور مزدور کو بھی ایوانِ شاعری میں داخل ہونے کی اجازت دی اور ا
سب باتوں میں وہ کسی کے مقلد نہ تھے نہ اُن کے جذبات ہنگامی تھے اسی لئے اُن کے
کلام میں گہرائی اور ابدیت ہے، لیکن اقبال اس انقلاب کے صرف نقیب تھے جو آگے آنیوالا
ان کی ترقی پسندی اُن کے موضوعات اور تصورات تک محدود رہی، وہ خود اپنی شاعری میں
مروجہ اور سکہ بند اصناف سے آزادی حاصل نہ کر سکے، یہ آزادی اُن کے لئے دشوار بھی تھا
شاعری کی ابتدا کی تو داغ کے شاگرد ہوئے جو غزل کے بادشاہ تھے۔ غزل اصنافِ سخن میں
قاعدوں اور اصولوں کی پابندی کی ایک انتہائی شکل ہے، اقبال نے مدتوں اسی پیمانے
مشق کی، آخر میں غزلیں کم ہو گئیں، ان کی جگہ مکمل اور مسلسل نظمیں زیادہ آگئیں لیکن قافیہ اور
کی احتیاط جو قدامت سے ورثہ میں ملی تھی قائم رہی۔

تکنیک میں پہلے ترقی پسندوں میں عبدالحلیم شرر اور اسمٰعیل میرٹھی کے نام زیادہ مشہور
۔ ان دونوں نے اُردو میں پہلی مرتبہ غیر مقفیٰ نظم لکھنے کی کوشش کی اور چند نمونے پیش
لیکن ان دونوں میں اتنی صلاحیت نہ تھی کہ وہ اسے ایک تحریک بنا سکیں، انھوں نے ایک
تجربہ کیا اور بس، یہ تجربہ ایک تحریک تو کیا ایک ہیجان بھی نہ بن سکا۔ کیونکہ شرر اور اسمٰعیل
لیکر عرصہ تک لوگوں نے اس طرف بالکل توجہ نہیں کی، البتہ اتنا اثر ضرور نظر آتا ہے کہ حالی
لیکر اسمٰعیل تک لوگوں کے خیالات آنیوالے دور کے لئے تیار ہوتے گئے۔ چنانچہ مولانا شبلیؔ
جو پرانی وضع کے بزرگ تھے اور خود اپنی شاعری میں متقدمین کی تقلید کرتے تھے اس سے

(اعجاز بٹالوی) ساتھی (مجید امجد) ایک عورت (سلام مچھلی شہری) کی دیکھ سکتے ہیں۔

دوسرے رجحان یعنی سیاسی، انقلابی یا اشتراکی کی ترجمانی ان نظموں میں ملتی ہے
۱۹۴۱ء میں (۱) انتباہ (فیض احمد فیض)۔ (۲) تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے (مطلبی)
(۳) نقش پا (اختر الایمان)

۱۹۴۲ء میں (۱) اندھیر نگری (شاد عارفی)۔ (۲) دوراہا (ڈاکٹر تاثیر) سیاسی لیڈر کے نام (فیض احمد فیض)۔

الہامی رجحان دونوں سالوں میں ایک دو شاعروں کو چھوڑ کر سب کے یہاں ملتا ہے۔ اس کے نمونے راشد کی خودکشی، زنجیر، میراجی کی رخصت اور دھوبی کا گھاٹ راجہ مہدی علی خاں جنت کی سیر، مخدوم محی الدین کی اندھیرا، سلام مچھلی شہری کی اندیشہ اور سات رنگ میں ملتے ہیں۔

فاحشانہ رنگ میں مخمور جالندھری کی دو نظمیں انوکھا بیوپاری، اور تالاب، راشد کی نظم انتقام، شریف کنجاہی نظم پسپائی، سلام مچھلی شہری کی ڈرائنگ روم، دیکھنے سے اس تحریک کا یہ پہلو نمایاں ہو جاتا ہے، ترقی پسند شعرا میں جوش کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ اُن کے کلام کا ابتدائی حصہ اگرچہ اپنی صورت کے اعتبار سے نظم کی پُرانے اور مسلمہ اصولوں کی پابندی میں نظر آتا ہے لیکن شروع سے ان کی توجہ غزل سے زیادہ نظم پر رہی۔ نظم کے موضوعات میں اُن کے ہاں بڑا تنوع ہے۔

مناظر فطرت سے وابستگی کا اظہار، رومان اور انقلاب اُن کی نظموں کے تین اہم عناصر ہیں۔ انقلاب کے پہلے نقیبوں میں جوش بھی ہیں، اُن کے یہاں یہ انقلاب سیاسی، ذہنی، اقتصادی اور مذہبی بیک وقت ہے لیکن اُن کے ہاں اس کی شدت رفتہ رفتہ ہی آئی ہے اب تک اُن کے یہاں ایک کہنہ مشق استاد کی پختگی اور توازن نمایاں ہے ایک چیز جو جوش کو ترقی پسند شاعروں میں بڑا مرتبہ دلاتی ہے ان کی "شعریت" ہے۔ اگر رومان اور شعریت جوش کی شاعری کے ترکیبی عناصر نہ ہوتے تو شاید ان کا ذکر اس سلسلہ میں سب سے پہلے نہ آتا، اُن کے یہاں الہام یا اشاریت جو اکثر ترقی پسند اپنا طرۂ امتیاز بنائے ہوئے ہیں بالکل نہیں۔ عریانی بھی جوش کے یہاں مقصود بالذات نہیں، البتہ مذہب اور اس کے متعلقات میں جوش نے ایک رندِ لاابالی کی بیباکی اور جسارت کا اظہار کیا ہے۔

احسان دانش کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

ن۔م۔ راشد کی ماورا، فیض احمد فیض کی نقش فریادی (دو ایڈیشن) مجاز کی آہنگ (دو ایڈیشن) احمد ندیم قاسمی کی دھڑکنیں، جان نثار اختر کی سلاسل، اخترالایمان کا گرداب، میراجی کے گیت، ان رجحانات کے ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں۔ دو مجموعے ایسے ہیں جن میں بہترین ترقی پسند شاعری کے منتخبات ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق لاہور کا شائع کردہ مجموعہ ۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں، مکتبہ اردو لاہور کا شائع کردہ مجموعہ ۱۹۴۲ء کی منتخب نظمیں اسی ذیل میں آتی ہیں۔

۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء کے منتخبات پر نظر ڈالنے سے ۴ خاص رجحانات محسوس ہوتے ہیں۔ نظموں کا بڑا حصہ رومانی یا شاعرانہ ہے، جہاں شاعر زندگی سے فرار اختیار کر کے رومان میں پناہ لیتا ہے، دوسرا حصہ سیاسی اور انقلابی جس میں ذہنی۔ سیاسی۔ معاشرتی اور اقتصادی نظام کو درہم برہم کرنے کے جذبات اشتراکی تصورات کے پس منظر میں ملتے ہیں۔ تیسرا رنگ فاحشانہ نظموں کا ہے۔ جن میں سے اکثر میں فحاشی مقصود بالذات ہے اور چند میں عریانی سے کوئی اور مقصد ہے۔ چوتھا رجحان اشاریت یا ابہام کا ہے یعنی ایسے تصورات اور نقوش اشاروں اور کنایوں کی شاعری جس میں شاعر کی دنیا اس دنیا سے ہٹ کر وہ اس کی زبان ایک اجنبی کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ کہیں کہیں ایک آدھ نظم ایسی بھی ملتی ہے جس میں فکر کی گہرائی ہے لیکن یہ اس تحریک کے خاص رجحانات میں نہیں آتی کیونکہ اس کے نمونے نایاب ہیں۔

ان رجحانات کے مطالعہ کے لئے آپ پہلی قسم یعنی رومانی نظموں میں رات کی بات (مختار صدیقی) نفسیات (عظیم قریشی) تو اگر واپس نہ آتی (جوش) جواب تغافل (عدم) برات (مقبول حسین) ننھا قاصد (اختر شیرانی) دسہرا اشنان (شاد عارفی) حسینہ کی موت سعید احمد اعجاز) رقص (یوسف ظفر) ۱۹۴۱ء کی نظموں میں دیکھ سکتے ہیں۔ ۱۹۴۲ء کی نظموں میں اس قسم کی نظمیں "میں کون ہوں" (ظفر پرویز) نومیدی جاوید (زاہد مہدی علیخاں) سعی خام (سعید احمد اعجاز) مہمان (مجاز) تصور کے دھندلکے میں (احتشام) بیزار نگاہیں (جذبی) گلاب (ضیاء جالندھری) آخری سجدہ (احمد ندیم شوق) ولولے (یوسف ظفر) یہ کیا (مقبول حسین احمد پوری) طوائف (جذبی) تفاوت راہ

جاری وہ صحیح معنوں میں مزدوروں کا کامریڈ ہے اُس نے مزدوروں کے ساتھ کام کیا ہے، اُن کے دکھ درد میں شریک ہوا ہے اس لئے اس کے خیالات کارل مارکس، لینن اور اسٹالن کی بحثوں سے پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ اُن کا منبع خود اس کا تجربہ احساس اور تجزیہ ہے اس لئے خلوص کی جو بُو باس اس کے یہاں ہے وہ اُس کے معاصرین میں سے اور کسی کو نصیب نہیں اِس اعتبار سے میرے خیال میں ترقی پسند شاعری کے اشتراکی پہلو کا سب سے اچھا ترجمان احسان ہے۔ وہ بہت سے عیبوں سے بھی پاک ہے۔ اس کے یہاں دیوانگی کی حد تک پہونچی ہوئی شدت نہیں، اُس کے خیالات سطحی اور جذبات ہنگامی نہیں، اُس کی شاعری اُس کے شدید احساس کی پیداوار ہے، اُس کے یہاں عریانی نہیں۔ زندگی سے فرار نہیں وہ ٹکنیک کے نئے اور پرانے کے جھگڑے میں نہیں پڑتا نہ اپنے کلام کو مبہم اشاروں اور دور از کار کنایوں سے چیتان بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی شاعری اُس کی شدید قوت حاسہ کا آزادانہ اور برجستہ اظہار ہے۔

اب بعض اور ترقی پسندوں کو لیجئے۔ پہلا نام فیض کا سامنے آتا ہے۔ وہ ترقی پسندی کی رو میں غیر ارادی طور پر نہیں بہہ گیا ہے بلکہ اس نے شاعری کے موضوعات اور ٹکنیک پر غور و فکر کرنے کی کوشش کی ہے اسی لئے اس کے کلام میں بعض ایسی چیزیں ہیں جو سطحی ہیجانات یا وقتی جذبات کی بجائے گہرے احساسات سے وابستہ ہیں اور اسی لئے انہیں دیرپا ہونے کی صلاحیت ہے۔ فیض کی ابتدائی شاعری میں رومان اور ٹکنیک میں پابندی نظر آتی ہے لیکن بہت جلد وہ زندگی کی الجھنوں میں گرفتار نظر آتا ہے، اس کے رومان کی دنیا ویران ہوتی معلوم ہوتی ہے لیکن محبت کا اب بھی اس پر غلبہ ہے، ایک مشہور نظم کا عنوان "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" ہے ؎

تو ہے تو درخشاں ہے حیات،	تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے!
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات	تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

لیکن تلخ حقائق رومان کی دنیا میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے وہ دنیا جس میں ؎

جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم	خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے	پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

چنانچہ فیض کا موضوع سخن محبت کے سوا اور چیزوں پر بھی احاطہ کرتا ہے، موضوع سخن

اللہ تعالیٰ سے شوخی اقبال کے یہاں بھی ملتی ہے لیکن اُس سے اقبال کا مقصد انسا
برتری اور اُس کی خودی کی عظمت کا احساس ہے۔ جوش کے یہاں تضحیک اور لامت
ہے، لیکن جوش کی ابتدائی شاعری میں یہ عناصر نہیں ملتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی
ماحول اور اُن کے متوسلین نے اِس بارہ میں انھیں زیادہ متاثر کیا ہے، جو
یوں بھی اپنی عمر کی اُس منزل پر پہونچ گئے ہیں جہاں قوت ارادی ضعیف ہو
ہے۔ کیا تعجب ہے کہ جوش کا یہ رنگ بھی اسی کمزوری کی علامت ہو یا زیادہ
زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ علی الرسم زمانہ ہے۔ جوش کی شاعری انقلابی؟
کے باوجود شعر و ادب میں متقدمین کی عظمت کی قائل ہے۔ اگر نوجوان ترقی
اس پیر مغاں سے قدامت کی عظمت بھی سیکھ لیں تو ان کی بہت سی خامیہ
دُور ہو جائیں۔

پنجاب کے رسالوں اور شاعروں کا ذکر آنے سے آپ نے محسوس کر لیا ہو
ترقی پسند شاعری میں زندہ دلانِ پنجاب کا بڑا حصّہ ہے۔ پنجاب میں جو نام اس
میں سب سے پہلے ملتے ہیں وہ تاثیر اور عابد علی کے ہیں۔ تاثیر پہلے غزلیں کہتے تھے،
کہنے لگے، گیتوں میں محبت کے راگ کے ساتھ روٹی اور بھوک کے مسائل بھی آنے لگ
دہقان کا مستقبل، مزدور کا گیت اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ محبت کے گیتوں میں "تم بھی
کرو تو جانو" اور "مان بھی جاؤ جانے بھی دو" اچھے رومانی گیت ہیں، لیکن شاعری
تکنیک میں تاثیر نے اُس وقت کوئی خاص اضافہ نہیں کیا، اور غالباً ۱۹۳۰ء یا
تک نظم غیر مقفیٰ اور آزاد نظم کا رواج عام نہ ہو سکا، کارواں کے سالناموں میں
پہلی مرتبہ اس قسم کے بعض تجربے پھر نظر آئے۔

بعض اور نوجوان ترقی پسند شاعروں کا ذکر کرنے سے پہلے میں احسان دانش سے
متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں، اشتراکی شاعری ترقی پسند شاعری کا سب سے نمایاں پہلو
ہے۔ احسان بھی بڑی حد تک اشتراکی شاعر ہے لیکن اس کی اشتراکیت "ڈرائنگ روم
اشتراکیت" نہیں، نہ وہ اُس کے یہاں زمانے کے فیشن یا ترقی پسندی کے نشان کے طور
ہے، وہ ایک مزدور تھا اور اگرچہ اپنی جد و جہد سے اس نے اپنی زندگی کو ہموار بنانے
میں کچھ کامیابی حاصل کر لی ہے، تاہم اُس کی کشمکش جماعت کی کشمکش کیساتھ اب تک

اُس کی نظم 'رقاصہ' کو دیکھئے ؎

لے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے	زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو	رقص گہ کے چور دروازے سے آکر زندگی
ڈھونڈ کر مجھ کو نشاں پالے مرا	اور جرمِ عیش کرتے دیکھ لے

لے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی میرے لئے ایک خونیں بھیڑئیے سے کم نہیں

راشد کی ابتدائی نظموں میں 'انسان' پہلا سانیٹ ہے جس میں اشتراکی خیالات کی جھلک ملتی ہے ؎

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں
غریبوں، جاہلوں، مُردوں کی، بیماروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں
ہماری زندگی اک داستاں ہے ناتوانی کی
بنالی اے خدا اپنے لئے تقدیر بھی تو نے
اور انسانوں سے لے لی جراُتِ تدبیر بھی تو نے
یہ داد اچھی ملی ہے ہم کو اپنی بے زبانی کی

دوسرے سانیٹ کا عنوان خواب کی بستی ہے ؎

مرے محبوب جانے دے مجھے اُس پار جانے دے
مرے محبوب، میرے دوست اب جانے بھی دے مجھ کو
بس اب جانے بھی دے اس ارضِ بے آباد سے مجھ کو

تیسرے سانیٹ کا عنوان 'ستارہ' ہے۔ اس کا آخری شعر یہ ہے ؎

کبھی یہ خاکداں گہوارۂ حسن و لطافت ہو	کبھی انسان اپنی گم شدہ جنت کو پھر پالے

اس ذہنی کشمکش اور اضطراب میں گھبرا کر راشد مذہب کے تصورات کی زنجیروں کو بھی توڑ دیتا ہے اس ذہنیت کے ترجمان چند شعر یہ ہیں ؎

اسی مینار کے سایے تلے کچھ یاد بھی ہے	اپنے بیکار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں	ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
ایک عفریت ——— اُداس	(دو بجے کے قریب)

کے عنوان سے فیض نے ایک نظم لکھی ہے ؎

آج تک سرخ و سیاہ صدیوں کے سائے کے تلے | آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے !
موت اور زیست کی روزآنہ صف آرائی میں | ہم پہ کیا گزرے گی اجداد پہ کیا گزری ہے

دنیا کے ان آلام اور مصائب سے گھبرا کر فیض محبت کے دامن میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ انگریزی شاعروں میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ اکثر نے یہی راہ فرار اختیار کی ہے لیکن فیض کے لئے غم روزگار کی تلخی وہاں بھی کم نہیں ہوتی، وہ سوچتا اور غور کرتا ہے اور طامس ہارڈی کے بقول یہی اُس کے آلام کی بنیاد ہے۔ سوچ کے عنوان سے فیض نے لکھا ہے ؎

تو گر میری بھی ہو جائے | دنیا کے غم یونہی رہیں گے
پاپ کے پھندے ظلم کے بندھن | اپنے کہے سے کٹ نہ سکیں گے

ٹکنیک کے اعتبار سے اب فیض میں تبدیلی آتی جا رہی ہے۔ غیر مقفیٰ اور آزاد نظموں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اس ٹکڑے سے آپ اُس کے موجودہ موضوعات اور ٹکنیک دونوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں:-

سیاسی لیڈر کے نام:-

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ | رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرم ستیز | جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے
اور اب رات کے رنگین و سیہ سینے میں | اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جابجا نور نے اک جال سا بُن رکھا ہے | دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

ظلمت شب میں امید کی کرن کا یہ وہی فلسفہ ہے جسکی پہلی جھلک اقبال نے دکھائی تھی یہی ایک اور نظم "انتباہ" میں بھی فیض اسی نتیجہ پر پہونچتے ہیں ؎

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں | ہم کو رہنا ہے پر یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھ کا بے نام گراں بار ستم | آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

فیض کا یہ رنگ اپنے ساتھی راشد سے مختلف ہے، جس کے یہاں انجام کار خودکشی پر ختم ہوتا ہے۔ فیض کے ساتھ راشد کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، وہ ترقی پسندوں میں سب سے بڑا ترقی پسند ہے کیونکہ موجودہ نظام سے بیزاری اُس کی شاعری کی روح ہے۔ اسی نظام کا بدولت وہ بھی فیض کی طرح رومان میں پناہ ڈھونڈتا ہے لیکن زندگی کا کھٹکا وہاں بھی لگا رہتا ہے۔

ہے یہ نظم یہ ہے

اس کا چہرہ اس کے خد و خال یاد آتے نہیں
ایک شبستاں یاد ہے
اک برہنہ جسم آتشداں کے پاس
فرش پر قالین، قالینوں پہ سیج
دھات اور پتھر کے بت

. . . .

اس کا چہرہ اس کے خد و خال یاد آتے نہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام

اس ذہنی خلفشار کا نتیجہ ظاہر ہے۔ جب شراب اور عورت بھی شاعر کے غم کو بھلا نہیں سکی تو وہ خودکشی پر آمادہ ہوتا ہے "خودکشی" ان کے مجموعہ میں آخری نظم ہے ۔

کر چکا ہوں آج عزم آخریں
شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوک زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند

. . . .

میرا عزم آخری یہ ہے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج
آج میں نے پالیا ہے زندگی کو بے نقاب
جی میں آئی ہے لگا دوں ایک بیباکانہ جست
اس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئے و بام کو

تین سو سال کی ذلت کا نشاں ہے	ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی

"گناہ" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس کے آخری دو مصرعے یہ ہیں ؎

کون جانے کہ وہ شیطان نہ تھا	بے بسی میرے خداوند کی تھی

جن حضرات نے اقبال کی نظم "مکالمۂ جبریل و ابلیس" یا "ابلیس کی مجلس شوریٰ" پڑھی ہے وہ اس کا مقابلہ راشد کے ان مصرعوں سے کریں، صرف یہی ایک نکتہ راشد کا مقام متعین کرنے کیلئے کافی ہے۔ ایک اور نظم "انتقام" ہے۔ اس کے دو مصرعے یہ ہیں ؎

شبنمی گھاس پہ دو پیکر یخ بستہ ملیں	اور خدا ہے تو پشیماں ہو جائے

یا "انسان" کے عنوان والی نظم میں ؎

کسی سے دُور یہ اندوہ پنہاں ہو نہیں سکتا
خدا سے بھی علاج دردِ انساں ہو نہیں سکتا

مذہب کے بارہ میں اپنے ان خیالات کی وضاحت راشد نے اپنے الفاظ میں اس طرح کی ہے:-

"دوسرا سبب ہمارا مذہب ہے جس نے ہمیں کافی بالذات ہونا سکھایا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہے کہ اس سے ہماری انفرادیت کی نشوونما بہت حد تک مفلوج ہو گئی ہے کیونکہ ہر مذہبی خاندان کا بچہ اپنے جسم اور رُوح پر ایک ایسی مُہر لے کر پیدا ہوتا ہے جو عمر بھر اسے ایک مخصوص گروہ سے وابستہ اور ہم آہنگ کئے رکھتی ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے تصورات پر خارجی اثرات قبول کرنے کے قائل ہی نہیں رہتے اور جہاں کسی خارجی تحریک کا نشان پاتے ہیں، محتاط ہو کر مدافعت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے مذہب کی تخفیف مقصود نہیں لیکن یہ کہے بغیر بھی چارہ نہیں کہ ہمارے مذہب نے ہماری انفرادیت کو غیر ضروری حد تک صدمہ پہنچایا ہے اور خود نگری کے اس نایاب جوہر، جو ادبیات اور تہذیب کے فروغ اور ترقی کے لئے ضروری ہے آہستہ آہستہ محدود کر دیا ہے۔"

جیسا کہ ابھی بیان ہوا ہر طرف سے بیزار ہو کر راشد فرار اختیار کرتے ہیں، اور دو چیزوں میں پناہ لیتے ہیں۔ "شراب" اور "عورت"۔ "مے سے غرض نشاط" متقدمین کو بھی نہ تھی وہ اسے "ایک گونہ بیخودی" کے لئے ہی چاہتے تھے، "عورت" البتہ ان کے اعصاب پر سوار رہتی۔ راشد کی جن نظموں میں "عورت" سوار ہے وہ خاص طور پر یہ ہیں۔ (۱) ہونٹوں کا لمس (۲) ایک رات (۳) دریچے کے قریب (۴) رقص (۵) انتقام (۶) آخر الذکر نظم میں ایک نیا فلسفہ

اک مجمعِ رنگیں میں وہ گھبرائی ہوئی سی ۔ بیٹھی ہے عجب ناز سے شرمائی ہوئی سی
آنکھوں میں حیا لب پہ ہنسی آئی ہوئی سی

ہونٹوں پہ فدا روحِ بہارِ گل و نسریں ۔ آنکھوں کی چمک رونقِ بزمِ مہ و پرویں
پیراہنِ زرتار میں اک پیکرِ سیمیں

لہریں سی وہ لیتا ہوا اک پھول کا سہرا ۔ سہرے میں جھلکتا ہوا اک چاند سا چہرا
اک رنگ سا رُخ پر کبھی ہلکا کبھی گہرا

ہر سانس میں احساس فراواں کی کہانی ۔ خاموشیٔ محجوب میں اک سیلِ معانی
جذبات کے طوفاں میں یہ دوشیزہ جوانی

'نرس نورا' اُس کی مشہور نظموں میں ہے ؎

وہ ارضِ کلیسا کی اک ماہ پارا ۔ وہ دیر و حرم کے لئے اک شرارہ
وہ فردوسِ مریم کا اک غنچۂ تر ۔ وہ تثلیث کی دخترِ نیک اختر
جوانی سے طفلی گلے مل رہی تھی ۔ ہوا چل رہی تھی کلی کھل رہی تھی
وہ پُر رعب تیور وہ شاداب چہرہ ۔ متاعِ جوانی پہ فطرت کا پہرہ
مری حکمرانی ہے اہلِ زمیں پر ۔ یہ تحریر تھا صاف اس کی جبیں پر
مجھے لیٹے لیٹے شرارت کی سوجھی ۔ جو سوجھی بھی تو کس قیامت کی سوجھی
ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جھکا لی
لبِ لعل افشاں سے اک شے چُرا لی

مجاز کا یہ رنگ اُس کی غزلوں میں بھی نمایاں ہے۔ ترقی پسندوں میں مجاز اُن چند شاعروں میں ہے جو ابھی تک غزل کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔

ترقی پسندی کے عام رجحانات بھی مجاز کے یہاں ملتے ہیں، مثلاً خانہ بدوش میں ؎

بیزار زندگی سے ہیں پیر و جواں سبھی ۔ الطافِ شہر یار کے ہیں نوحہ خواں سبھی
پیسہ اگر ملے تو حمیت بھی بیچ دیں ۔ روٹی کا آسرا ہو تو عزت بھی بیچ دیں
اب کیوں شریکِ حلقۂ نوعِ بشر نہیں
انساں ہیں آخر اس پہ کوئی جانور نہیں

شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
آج تو آخر ہم آغوشِ زمیں ہو جائے گی

تکنیک کے بارہ میں راشد نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بھی کم اہم نہیں۔ 'ماوری' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

(۱) "میری رائے میں جہاں تک تکنیک کی قیود کی متعصبانہ حمایت ایک فرسودہ قدامت پرستی کی دلیل ہے وہاں اس کے خلاف مجنونانہ احتجاج بہت بڑی حد تک بے راہ روی کے مترادف ہے۔ جو لوگ شدید اور فوری انقلاب چاہتے ہیں وہ ندرت پرستی کے جوش میں نہ صرف قوانی اور بحور کی تعمیری حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں بلکہ اُن کو منسوخ کر کے اُن کے نقصان کی تلافی کسی بہتر یا نئی چیز سے کرنا بھی نہیں جانتے......... قدیم اسلوب بیان کا ادنیٰ ثانی ہونے کے باوجود میرے نزدیک یہ اعتراض قابل پذیرائی نہیں کہ بحروں اور قافیوں کی پابندی شاعری کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے......... اجتہاد کا جواز صرف یہ نہیں کہ اس سے کسی حد تک قدیم اصولوں کی تخریب عمل میں آئی بلکہ یہ کہ آیا تعمیری ادب اس میں سے کسی نئی صبح کی طرح نمودار ہوتا ہے یا نہیں اگر یہ نہ ہو تو اجتہاد بیکار رہے۔"

اس حیثیت سے راشد کے مجموعے کو دیکھا جائے تو اس میں باقاعدہ نظمیں، سانیٹ اور غیر مقفیٰ سب شامل ہیں لیکن بالکل آزاد اور بے اصولی کے اصول کی مثالیں راشد کے یہاں نہیں ملتیں۔ اسی لئے اُس کا ایک تکنیک ہے جو اس کا اپنا ہے اور جس میں عام نوجوان ترقی پسندوں کی بے راہ روی نہیں ہے جو غیر مقفیٰ اور آزاد نظم کو اظہار کا ایک سستا اور آسان ذریعہ سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے، اگر نئی شاعری میں کچھ جاندار چیزیں ہیں تو وہ فیض اور راشد ہی کے یہاں ہیں۔

فیض اور راشد کے بعد مجاز کو لیجئے، اُن کے یہاں بھی پہلے رومان اور خالص رومان ہے۔ رفتہ رفتہ اشتراکی خیالات آئے ہیں۔ لیکن رومان اب بھی جوش کی طرح مجاز کی شاعری کی جان ہے 'نذرِ دل' 'مجبوریاں' 'کس سے محبت ہے' 'ایک غمگین یاد' 'اُن کا جشنِ سالگرہ' 'نورا نرس کی چارہ گری' 'ننھی پجارن' 'آج کی رات' 'بتانِ حرم اصنامِ عشق' اسی قسم کی نظمیں ہیں 'اُن کا جشنِ سالگرہ' ان میں اچھی نظم ہے

میرے خیال میں "جواری" اختر کی اچھی نظموں میں ہے، اس میں جذبات کی شدت اور اشاریت کے باوجود ابہام نہیں۔ اس کا آخری ٹکڑا یہ ہے ؂

ہم تو اپنی سی کر ہارے، کوئی بھی تعمیر نہ ٹوٹی
سب ہی جواری، سب ہی لٹیرے، کون کس سے بازی جیتے
بیت گئی جیسی بیتی، باقی چاہے جیسی بیتے
شام و سحر کی رنگ و نظر کی پاؤں سے زنجیر نہ ٹوٹی

'وداع' اور 'پگڈنڈی' بھی اچھی نظمیں ہیں۔

قیوم نظر کی نظموں میں 'حسنِ آوارہ' (ساقی اکتوبر ۱۹۴۲ء) 'برسات کی رات'، 'یہ اور وہ' رومانی نظمیں ہیں۔ "التجا" میں اپنے درد سے خطاب ہے۔ ؂

مجھ کو دے کے موت، زندگی کو مار دے

'جنگ' میں قیوم نظر جنگ کی تباہ کاریوں کو بیان کرتا ہے۔ 'جوانی' بھی انھیں خیالات کی حامل ہے، جہاں قیوم نظر اس پر نوحہ کرنے لگتا ہے کہ موجودہ عالمگیر جنگ میں نسل انسانی کے جوان کس طرح بھینٹ چڑھ رہے ہیں۔ 'بنی آدم' میں 'اشاریت' نے ابہام پیدا کر دیا ہے۔

سلام مچھلی شہری کے خیالات بالکل سطحی اور انداز بیان خام ہے۔ اُن کے کلام میں سٹرک بن رہی ہے۔ مجھ کو آپ سے شکوہ ہے۔ 'اندیشہ'، 'ڈرائنگ روم' اُن کے ملے جلے انداز کو ظاہر کرتی ہیں، اشتراکیت سے ہمدردی رومان اور ابہام سب موجود ہے۔ 'ڈرائنگ روم' میں وہی انداز ہے جو راشد کی نظم 'انتقام' میں ہے۔ یہاں سلام ایک مفلس عورت کو اپنے 'ڈرائنگ روم' کی سیر کراتا ہے اور پھر اس سے سیہ کاری کا ارتکاب کرتا ہے، کیونکہ وہ مفلس ہے۔

اس مختصر جائزہ سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہمارے نوجوان شعرا کیا سوچ رہے ہیں اور کس طرح اس کا اظہار کر رہے ہیں، ان رجحانات پر بحث کرنے سے پہلے ایک بات کا ذہن نشین کر لینا نہایت ضروری ہے۔ یہ مسلمہ ہے کہ یہ ترقی پسند شاعری ایک تجربہ ہے اور ہمارے نوجوان شاعر گویا ایک بحرانی کیفیت سے گزر رہے ہیں، اس لئے اُن کے متعلق کوئی قطعی رائے دینے میں

یا دُوسری نظم آوارہ میں ؎

مُفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے — اے غمِ دل کیا کروں۔ اے وحشتِ دل کیا کروں
لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھکر توڑ دوں — اے غمِ دل کیا کروں۔ اے وحشتِ دل کیا کروں

'اندھیری رات کا مسافر' 'ایک سفید پوش رنگریز' 'نوجوان سے' 'سرمایہ داری' 'انقلاب' 'ہمارا جھنڈا' 'ایک جلا وطن کی واپسی پر' 'خوابِ سحر' 'مزدوروں کا گیت' 'مہمان' اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ آخری نظم میں نئی شاعری کی اشاریت کی جھلک بھی موجود ہے۔ 'رات' اور 'ریل' بھی اچھی نظم ہے۔

مجاز زیادہ تر پابند نظمیں لکھتے ہیں۔ الفاظ کی کمی جو اور ترقی پسندوں کے یہاں صاف محسوس ہوتی ہے مجاز کے یہاں نہیں۔

احمد ندیم قاسمی پُرانے کہنے والوں میں ہیں۔ اُن کا خاص کلام رومانی ہے۔ ریت کے میدان اور کھجوروں کے درخت ندیم قاسمی کی رومانی دنیا کے نشان ہیں۔ اُس کی محبوبہ گانوں کی ایک الھڑ بھولی بھالی دوشیزہ ہے ؎

کھجوروں کی اندھیری کانپتی شاخوں کے پردوں سے
رسیلا چاند۔ ٹھنڈی ریت پر چاندی بچھاتا ہے
وہ ٹیلوں سے پرے۔ ٹوٹی ہوئی کٹیا کی چوٹی پر
اُفق کے پاس اک مدھم سا تارا ٹمٹماتا ہے
پھلا کر اپنا ننھا سا گلا' چشمے پہ اک پنچھی
نہ جانے کس نشے میں دُکھ بھری تانیں اُڑاتا ہے
مری آنکھوں میں خوں آلود آنسو تیر آئے ہیں
مرا دل اے صبوحی تیری خاطر ڈوبا جاتا ہے
یہی منظر تھا جب دو دل دھڑکتے تھے مسرّت سے
مجھے اُجڑی محبت کا زمانہ یاد آتا ہے

بھوک کے مسئلہ کے ساتھ بھوک کی شاعری بھی ختم ہو جائے۔ میں اِس شاعری کو بیکار نہیں سمجھتا بلکہ میرے نزدیک بعض شاعروں نے اسی موضوع پر اچھی شاعری کے نمونے بھی پیش کئے ہیں پھر بھی یہ بڑی شاعری نہیں۔ اس میں کسی ہمہ گیر، ازلی اور ابدی جذبہ کی تسکین کا سامان نہیں اسی لئے اس میں بڑائی نہیں۔

اس بھوک کے مسئلہ نے شاعری میں کئی عناصر کا دخل کر دیا ہے۔ مثلاً بعض لوگ جو شدید اور فوری انقلاب چاہتے ہیں وہ موجودہ اقتصادی نظام کے ساتھ ساتھ زندگی کی بعض مستقل قدروں مثلاً مذہب اور اخلاق کے بنیادی تصورات کو بھی ایک کہنہ نظام کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ بھوک کا مسئلہ بغیر مذہب کی تضحیک اور استہزا کے بھی حل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ بعض ترقی پسند ایسے ہیں جو اشتراکی خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن اُن کا آخری سہارا خدا ہی ہے۔ مثلاً احمد ندیم قاسمی کا یہی رنگ ہے۔ انجام سے مایوسی اور خودکشی اسی کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ انسان جب کوئی سہارا نہیں پاتا تب ہی وہ خودکشی پر آمادہ ہوتا ہے۔

ممکن ہے مجھے یا آپ کو اشتراکیت کے بعض پہلوؤں سے اختلاف اور بعض سے اتفاق ہو لیکن جس طرح ادب پر سرمایہ داروں، سلاطین اور فرشتوں کا اجارہ نہیں اسی طرح ادب کو مزدوروں، غریبوں اور شیطانوں کی ملکیت سمجھنا بھی غلط ہے، اشتراکی شاعری موجودہ شاعری کا ایک شعبہ تو ہو سکتی ہے اور وہ بھی صرف اُن کے لئے جو واقعی مزدوروں کے کامریڈ اور اُن کے درد دکھ کے شریک ہیں۔ لیکن یہ شاعری تمام شاعری نہیں ہو سکتی، یہ کرنا گویا شاعری سے اُس کی ہمہ گیری چھین لینا ہے، پھر ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر قوم میں کچھ لوگ ایسے بھی ملتے ہیں جو پیٹ کی بھوک اور جنسی خواہش کے ساتھ ایک روحانی بھوک بھی محسوس کرتے ہیں۔ اگر شاعری اُن کی تسکین کا سامان بہم نہیں پہونچا سکتی تو یہ اس کی بڑی محرومی ہے۔ ترقی پسند شاعروں نے اِس محرومی کو ہی کامیابی سمجھا ہے۔

اگرچہ ادب میں احتساب کا میں قائل نہیں لیکن انسانیت کے ابتدائی اصول کسی اقتصادی مسئلہ کے حل کے لئے قربان نہیں کئے جا سکتے، اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام لینے کا جذبہ بے شک قابلِ ستائش ہے لیکن راشد کی نظم میرے نزدیک شاعری سے زیادہ خرافات کے تحت میں آتی ہے۔ ایک اجنبی برہنہ عورت کے ہونٹوں سے رات بھر اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام لینا یہاں گویا تسکینِ ہوس کی ایک آڑ ہے جس کا اندازِ بیان

بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، ان میں ابھی بہت سی خامیاں ہیں جو ہر نئے انقلاب کے ساتھ آتی ہیں، بعض چیزیں اب بھی مہمل اور مبہم ہیں، لیکن شاعری کی تاریخ میں یہ بھی کوئی عجیب واقعہ نہیں، پہلے چیزیں ایسی ہی نظر آتی ہیں لیکن وقت اور تجربہ انھیں ان الائشوں سے پاک کر دیتا ہے ممکن ہے بعض چیزیں اس نئے تجربے میں جاندار ثابت ہوں اور انقلاب کا طوفان رُک جانے پر ہمارے شعر وادب کا جزو بن جائیں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ وقت صرف دیکھنے کا نہیں سوچنے کا بھی ہے۔ اس لئے اس نئی شاعری پر غور کرنا ہمارے اور ترقی پسند شاعروں کے لئے یکساں طور پر ضروری ہے، اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ اس نئی شاعری کے صرف دو مرکز یا محور ہیں۔ 'انقلاب' اور عورت، یہ صحیح ہے کہ زندگی کے اکثر پہلو انہی دونوں سے وابستہ ہیں۔ لیکن جس طرح متقدمین کی شاعری اپنی حدود سے باہر نہیں نکلتی تھی اسی طرح ان شاعروں نے بھی اپنی دُنیا تنگ کر لی ہے۔ اس فیصلہ پر نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔

دُوسرے یہ کہ بعض اصول اور مسلمات ایسے ہیں جو ازلی اور ابدی ہیں، بعض قدریں ہماری زندگی میں اضافی نہیں مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح شعر وادب میں بعض ابدی عناصر موجود ہیں جن میں زمان و مکان کے انقلابات سے کوئی تغیر یا تبدیلی نہیں ہوسکتی، ہر شاعری اچھی یا بُری ہوسکتی ہے لیکن بڑی شاعری (Great poetry) ہر اچھی شاعری کو نہیں کہا جاسکتا۔

شعر کی اچھائی یا بُرائی کا تصوّر زمانہ کے ساتھ بدلتا رہا ہے لیکن دنیا کی ہر زبان میں بعض نام ایسے نظر آتے ہیں جنھیں حیاتِ ابدی اور قبول دوام حاصل ہو چکا ہے یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے زندگانی کے ابدی حقائق کو بے نقاب کیا ہے اور ان کی شاعری کا یہی وہ حصہ ہے جو زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہا ہے۔ اس پہلو سے جدید شاعری پر نظر ڈالئے تو صاف معلوم ہوگا کہ اس کا بڑا حصہ وقتی یا ہنگامی ہے، مثلاً بھوک کا مسئلہ، اس وقت بیشک یہ ہماری زندگی کے اہم ترین مسائل میں ہے لیکن یہ صرف ایک اقتصادی مسئلہ ہے جس سے ہر کسی کو ہمدردی ہے، مسئلہ دولت کی غلط تقسیم۔ حکومت کے غلط طریقے اور بعض طبقوں کے اقتدار سے پیدا ہوگیا ہے، حیاتِ انسانی میں یا نظامِ عالم میں اس کی حیثیت مستقل یا ابدی نہیں۔ اگر آج یہ مسئلہ حل ہو جائے اور اشتراکیوں کو اپنی فردوسِ گم گشتہ دوبارہ مل جائے تو آج ہی

احمد ندیم مختصر قطعے لکھتے ہیں جو زیادہ تر اسی رومانی رنگ میں ہوتے ہیں لیکن گاؤں کی پُرسکون فضا میں بھی کبھی کبھی ہنگامے پیدا ہو جاتے ہیں۔ قطعات:۔

ہے رقصِ طوائف کا زمیندار کے گھر پر پردیس سے آئے ہیں کئی یار پُرانے (محرومِ عیش)
وہ چند غریبوں کو گریباں سے پکڑ کر بھیجا ہے زمیندار نے بیگار پہ تھانے

محتاج کسی کی بھی نہیں میری جوانی مزدور ہوں کھاتا ہوں پسینے کی کمائی
اے ریشم و کمخواب میں لپٹے ہوئے کوڑھی کیوں تو نے مجھے دیکھ کے یوں ناک چڑھائی

افق پر دور برفانی پہاڑوں سے اٹھی بدلی۔ گزر کر میرے ویراں کھیت پر سے دور جا برسی
کچھ ایسے میں نے دیکھا اس طرف جیسے کوئی مفلس امیروں کی نگاہِ تند میں ڈھونڈے خدا ترسی

محلوں کے سایے'' روشنی اور سایے'' بھوکوں کے ووٹ'' تہذیب کی معراج'' مشینوں کا زمانہ'' بے چارگی'' مجبور مفلس'' نوجوان بھکارن'' اسی قسم کے قطعات ہیں۔
'گم کردہ راہ'' دنیائے خام' 'کفرانِ نعمت' نسبتاً طویل نظمیں ہیں جہاں دنیا کے آلام اور مصائب انقلاب کی خواہش ناکامی کا احساس موجود ہے۔ ندیم مذہب کے تصور سے بیزار نہیں نہ اُس کے یہاں عریانی اور ابہام ہے۔

ایک اور ترقی پسند میراجی ہیں۔ یہ بہت کچھ لکھتے ہیں اور اِن کا کلام ادبی دنیا۔ ہمایوں۔ ساقی اور ادبِ لطیف میں اکثر شائع ہوتا رہا ہے لیکن میرے خیال میں یہ راشد اور فیض سے بہت پیچھے ہیں۔ اول تو یہ کہ ان کے یہاں وہ ابہام اور اشاریت زیادہ ہے جو اس دور کے ترقی پسندوں کی ایک عام خامی ہے۔ لیکن میراجی کی یہ خامی ہی اُن کے نزدیک اُن کا فن ہے۔ سُنا گیا ہے کہ میراجی پہلے اپنی نظم لکھ لیتے ہیں اور پھر ہفتوں اپنے اشاروں کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ 'کالا کلوٹا کوا'' ساون کا گرگٹ'' دھوبی کا گھاٹ' اسی قسم کے اشارے ہیں۔ 'دھوبی کے گھاٹ' کا نمونہ یہ ہے:

جس شخص کے ملبوس کی قسمت میں لکھی ہو
کرنوں کی تمازت
رشک آتا ہے مجھ کو
بس اس پر

ہمارے واسوختوں سے کچھ زیادہ ہی فحش اور عریاں ہے۔ اسی طرح سلام مچھلی شہری کی نظم "ڈرائنگ روم" یا مخمور جالندھری کی "تالاب" ادبی خرافات ہیں۔ آخرالذکر کا نمونہ ملاحظہ ہو ؂

ابھی کل ہی کا قصہ ہے کہ اک نادار دوشیزہ
سڑے تالاب کی سخت اور گندی کھال کی چھلی
پھٹے کپڑوں میں لپٹی، میل سے چکٹی، نزاکت سے
لگی ہنس ہنس کے میرے پاس آکر ہاتھ پھیلانے
اُدھر وہ رحم کی طالب، اِدھر میں سوچ میں گم تھا
بُری کیا ہے، اگر اک رات اِس کے ساتھ کٹ جائے

حقیقت نگاری شاعر کا فرض سہی لیکن کیا یہ حقائق اسی طرح منظرعام پر عمل میں بھی لائے جاسکتے ہیں۔ اگر نہیں تو ان کا بیان کس طرح سندجواز حاصل کرسکتا ہے۔

ترقی پسند شاعری کے تکنیک کے سلسلہ میں بہت کم کہنے کی ضرورت ہے۔ راشد کے بقول اجتہاد صرف یہ نہیں کہ ہر پُرانی چیز کو ترک کر دیا جائے۔ اجتہاد جب ہی اجتہاد ہو سکتا ہے جب پُرانی چیزوں کی تلافی بہتر بدل سے کر دی جائے۔ وزن، ردیف، اور قافیئے کے پُرانے قانون واقعی دقیانوسی ہیں اور ان پر نظرثانی کی ضرورت ہے، لیکن ہر قانون سے آزادی صرف اپنے عجز اور کمزوری کی دلیل ہوسکتی ہے۔ مثلاً وزن کے قانون سے آزاد ہونا شاعر کے بس میں نہیں۔ وزن انسانی توجہ کے لئے بڑا زبردست محرک ہے اسی وجہ سے ہم نثر کے مقابلہ میں نظم زیادہ آسانی سے یاد رکھ سکتے ہیں، اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ اٹلی کی وہ شاعر جنھوں نے غیر مقفیٰ اور آزاد نظموں کا پہلا تجربہ کیا تھا گمنامی کی آغوش میں پہنچ چکے ہیں۔ پھر وہ نظم جو گائی نہ جاسکے یوں بھی ابدیت سے محروم ہے۔ اِس اعتبار سے ترقی پسند شاعری کے دو حصہ ہوسکتے ہیں۔ ایک کتابی شاعری اور ایک شاعرانہ شاعری، آزاد نظمیں کتابی شاعری کے تحت میں ہیں۔ گیت، سانیٹ، پابند غیر مقفیٰ نظمیں گائی جاسکتی ہیں اور شاعرانہ شاعری میں داخل ہیں۔

اِسی شاعری کا ایک اور غور طلب پہلو اشاریت اور اس سے پیدا ہونیوالا ابہام ہے۔ ابہام متقدمین کے یہاں بھی ملتا ہے بلکہ لوگوں نے آخر عمر میں چیستان اور معمہ گوئی بھی اختیار کی ہے۔

مجلس مصنفین علیگڑھ کا ششماہی علمی رسالہ

کیوں صرف اچھوتا

انجان انوکھا

اک خواب ہے خلوت

کیوں صرف تصوّر

بہلاتا ہے مجھ کو

کیوں صبح شبِ عیش کا جھونکا

بن کر

سہلاتا ہے مجھ کو

کیوں خوابِ فسوں گر کی قبا چاک نہیں ہے

کیوں گیسوئے پیچیدہ و رقصاں

نمناک نہیں ہے

کیوں لمس کی حسرت کے جنوں سے

ملتی نہیں مجھ کو

بے قید رہائی

جنسیات میں بھی میراجی کا یہی رنگ ہے۔ کسی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں میراجی کی ایک نظم کی تشریح کرتے ہوئے لکھا تھا کہ گوری کو اشنان کرتا دیکھ کر اس کی حسِ شعری اس کے جسم کے کسی متناسب حصہ سے بیدار نہیں ہوتی بلکہ وہ سب سے پہلے یہی سوچتا ہے کہ وہ آج بھلا کیوں نہائی؟ ایک اور نظم کا آخری ٹکڑا یہ ہے ؎

سنتا ہوں شہر کے ایک محلے میں

نفس کی پوجا کرنے والی ایک آوارہ عورت ہے

اور سستا ہے اُس کا کرایہ، ہاں سستے ہیں اس کے دام

اشتراکی خیالات میراجی کے یہاں بھی ملتے ہیں لیکن راشد یا فیض کی طرح فکر و کاوش یا ندیم کی سادگی، یا جوش یا مجاز کی شعریت بالکل نہیں مثلاً نادار ؎

اک میز ہے ایک ہی کرسی ہے اک الماری

اُس میز پہ کاغذ بکھرے ہیں اور میری چند کتابیں

ماہنامہ ... دہلی

مُصنّف

جلد ۳	بابت ماہ مارچ ۱۹۴۵ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	ذکرِ ماضی اور فکرِ فردا	سیّد الطاف علی بریلوی (مدیر)	۲ تا ۸
۲	اُردو شاعری میں خمریات	مولوی ظہیر الدین علوی صاحب ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ بی (علیگ)	۹ تا ۲۹
۳	کتب خانہ اُچ شریف گیلانی بہاولپور	ڈاکٹر راجہ غلام سرور صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ	۳۰ تا ۴۲
۴	مخالفین اُردو سے خطاب (نظم)	حضرتِ دُمار ڈبائیوی (نگم گوالیاری)	۴۳ تا ۴۴
۵	قدیم دکھنی شاعری کے موضوعات	نصیر الدین ہاشمی صاحب حیدرآباد دکن	۴۵ تا ۵۳
۶	ہم لقب حکمرانانِ اسلام	مولانا ابرار حسین فاروقی صاحب ایم۔ اے فاضلِ مصر	۵۴ تا ۷۲
۷	نباتاتی تنفس	ڈاکٹر رفیق احمد خانصاحب ایم۔ ایس۔ سی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۷۳ تا ۸۵
۸	نقد و نظر:- اوراقِ گل، [illegible]، [illegible]	سیّد الطاف علی بریلوی	۸۶ تا ۸۸

جاتا ہو جو اخباروں میں کسی نہ کسی ادارہ تصنیف و تالیف، انجمن علمی یا انسٹی ٹیوٹ اور اکیڈیمی کے قیام کی اطلاع نہ آتی ہو۔

اخبارات و رسائل کا معیار بھی بلند سے بلند تر ہو رہا ہے اور اگر کاغذ کی کمیابی و گرانی نہ ہوتی تو ہمارے ملک کے جرائد کی تعداد اشاعت بھی انگلستان اور امریکہ کے لگ بھگ پہونچ جاتی۔ اسی طرح ہر قسم کی کتابیں نہایت بہتات کے ساتھ بازار میں آ رہی ہیں اور ہمارے اہل ملک جو کبھی اچھی سے اچھی کتاب کو کم سے کم داموں میں نہ خریدتے تھے اب بے دریغ دوگنی اور چوگنی قیمت پر کتابیں لے رہے ہیں۔ نمائشوں اور بازاروں میں جس قدر بھیڑ مٹھائی کی دوکانوں پر ہوا کرتی تھی اُس سے اب کچھ زیادہ مجمع کتاب والوں کی دوکانوں پر ہوتا ہے۔ کتابوں کا لکھنا۔ چھاپنا اور بیچنا اور اخبارات و رسائل کی ایڈیٹری جو ہندوستان میں نحوست بھرے پیشے تھے، اب خوشحالی و مرفّہ الحالی کے روزگار ہو گئے ہیں۔ جنگ کے خاتمہ کا انتظار ہے، اس کے ختم ہوتے ہی آپ دیکھیں گے کہ لوگ کس قدر کثرت سے ان پیشوں کو اختیار کرتے ہیں۔ اور اُن کے ذریعہ کس سُرعت کے ساتھ ملک میں سیاسی بیداری اور خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

لیکن ضرورت ہے کہ جس طرح دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں عنقریب ختم ہونے والی جنگ سے پیدا ہونے والے حالات کی تیاری ہو رہی ہے اور آیندہ تعمیر ہونے والی عمارات قومی کی سائنٹفک اصولوں پر داغ بیل ڈالی جا رہی ہے صحافت۔ علمی تحقیق و تدقیق اور تصنیف و تالیف کے میدان میں ترقی کے جو امکانات ہیں اُن کا بھی ابھی سے جائزہ لیا جائے اور کسی بدنیتی کو دخل دئے بغیر ایمانداری کے ساتھ اُن تمام ذرائع اور وسائل کو کام میں لایا جائے جن سے کہ ہمارا ملک بھی ذہنی اور علمی اعتبار سے دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش کھڑا ہو سکے۔

صحیفہ نگاروں۔ اور مصنفین کی بے کسی۔ اور مفلوک الحالی دور ہو۔ اور ہر ایک لکھنے والے کو اس کی استعداد و قابلیت کے مطابق دنیوی ترقی کا موقع نصیب ہو۔ اس ملک کے تمام علمی خزانے جو دوسرے ممالک اور خود ہندوستان میں صدیوں سے دفن پڑے ہیں اُن کو روشنی میں لایا جائے اور ان سب کوششوں کے نتیجہ میں ہمارے زندہ اور مرحوم صاحبانِ علم و فن کی جو بھی حیثیت متعین ہو گئی ہو اُسے بلا امتیاز آزادی و غلامی اور رنگ و نسل تسلیم کر لیا جائے۔

آل انڈیا [illegible] کانفرنس جس کا صدر دفتر ہندوستان کے سب سے بڑے علمی و ثقافتی

ذکرِ ماضی

اور

فکرِ فردا

زیں تنگنائے خلوتم خاطر بہ صحرا میکشد
کز بوستاں بادِ سحر خوش میدہد پیغام را

جنگ ایک طرف دُنیا اور اُس میں رہنے بسنے والوں کے لئے تباہی و بربادی کا باعث ہے تو دوسری طرف اُس کی ترقی کا بھی پیش خیمہ ہے۔ انسانی جوہر مشکلات میں پڑنے سے کھلتے ہیں۔ اور خفتہ صلاحیتیں کشمکش ہی سے بیدار ہوتی ہیں۔

ساڑھے پانچ سال کی مہیب اور عالمگیر جنگ نے ہماری طبائع کے ایسے ایسے پُرانے زنگ دُور کئے اور ہمارے دماغوں میں ایسی ایسی نمو جودت اور جولانی پیدا کی جو جنگ کے بغیر پچیس سال میں بھی نہ ہوتی۔ صنعتی۔ تجارتی۔ زراعتی۔ معاشی اور سیاسی نظریوں میں جو نکھار پیدا ہوئے اُن سے قطع نظر کرکے تعلیمی اور علمی میدانوں میں بھی اِس وقت زبردست جدّ و جہد جاری ہے۔ ایک خاص جوش و ولولہ اور عزم و استقامت کی برقی رَو دوڑی ہوئی نظر آرہی ہے۔

راقم السطور کی طرح جو لوگ محدود آمدنی اور زیادتیٔ مصارف کا شدت سے شکار رہیں وہ بھی اپنے ناکارہ وجود میں سرورِ فاقہ مستی محسوس کرتے ہیں اور ایک شاندار مستقبل کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

ہمارے گرد و پیش کیا ہو رہا ہے اور آیندہ کیا ہونے والا ہے اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ ہر شخص خواہ کسی مرتبہ اور مکتبِ خیال کا ہو بھاگ دوڑ میں لگا ہوا ہے۔ علما اور مفکرین جن کو بالطبع علیل بے عمل اور تنہائی پسند کہا جاتا ہے ان میں بھی اجتماعی جدّ و جہد کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔

---

۵ اگست [illegible] کو ہماری مجلس [illegible]

مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتاب خانہ رام پور

"مصنف" کا پچھلا شمارہ میں نے دیکھا۔ گرمی قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر پٹنہ کا مضمون (غالب نے اردو خطوط نویسی کب سے شروع کی) بالاختصار پہلے ہی دیکھ چکا تھا اور میری ہی فرمائش پر انھوں نے اُسے 'مصنف' میں بھیجا تھا۔ وہ اِس وقت اپنے مذاق کے یکتا عالم اردو ہیں۔ ایسی دقتِ نظر سے کام کرنے والے ہندوستان میں انگلیوں پر گنتے کے برابر ہیں۔

افضل العلماء خان بہادر عبدالحق صاحب پرنسپل گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس

مجلس مصنفین علی گڑھ کی مساعی واقعی قابل قدر ہیں اور اس کے رسالہ 'مصنف' کی اشاعت سے ایک بڑی اہم خدمت پوری ہو رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ مصنفین کا ایک مرکزی ادارہ ہو تاکہ مصنفین اور اُن کی تصانیف کے متعلق ضروری معلومات مہیا کی جا سکیں اور ایک ہی عنوان اور مضمون پر ایک سے زیادہ 'مصنف' بیک وقت کام نہ کیا کریں۔ اس مجلس کی یہ خدمت نہایت ہی مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔

مولوی محمد امین صاحب زبیری حال مقیم حیدرآباد دکن

آج 'مصنف' ملا۔ شکریہ۔ 'بیت المصنف' کا افتتاح! خدا مصنفین کو مبارک کرے۔ اور آپ کی اُمیدیں پوری ہوں۔ میں بھی کچھ کتابیں پیش کروں گا۔ در حقیقت یہ عزم و حوصلہ ایثار و انہماک قابل مثال ہے۔ کام کرنے والے یوں ہی کام کیا کرتے ہیں۔

پروفیسر حمید الدین خاں صاحب ایم اے گورنمنٹ کالج جھانسی

یاد آوری اور رسالہ 'مصنف' کا بہت بہت شکریہ۔ نہایت ہی بلند معیار اور دیدہ زیب پرچہ ہے۔ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر آر۔ ای۔ ایم۔ وہیلر ڈائرکٹر جنرل محکمۂ آثارِ قدیمہ ہند

اسلامی علم کتبات پر خصوصی توجہ کرنے کے لئے آپ کا میں بہت شکر گزار ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کی اہمیت و ضرورت کے بارے میں مجھ سے زیادہ کوئی [illegible] اس سلسلے میں گورنمنٹ آف انڈیا سے موثر کارروائی کی ہے۔

مرکز علی گڑھ میں قائم ہے اپنے سالہا سال کے تجربات میں ہمیشہ ملک کی بروقت خدمات
اسی لئے اب وہ سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی اسکیم بروئے کار لاکر سب
میدانِ عمل میں آئی ہے۔ کانفرنس کی ایک کمیٹی کا جلسہ زیر صدارت جناب ڈاکٹر نواب صدر
۲۶ جنوری ۴۵ء کو آفتاب لائبریری میں منعقد ہوا۔ طے کیا گیا کہ اسکیم کے عمل پیرا کرنے
کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی ماہرین فن کی بنادی جائے۔ چنانچہ یہ کام ہوا اس
سب کمیٹی مذکور کا جلسہ ۱۰ اور ۱۱ مارچ ۴۵ء کو آنریبل ڈاکٹر سر محمد عزیز الحق صاحب
پر بمقام دہلی منعقد ہوا۔

خان بہادر پروفیسر عبدالمجید صاحب قریشی۔ خان بہادر میاں افضل حسین صاحب
اشتیاق حسین صاحب قریشی۔ پروفیسر ابو بکر احمد حلیم صاحب۔ پروفیسر ہارون خاں صاحب
اور ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی نے بحیثیت ممبر اور راقم السطور نے بطور پیشکار شرکت کی
کمیٹی میں یہ طے ہوا کہ اس کی رپورٹ انسٹی ٹیوٹ کی بڑی کمیٹی اور کانفرنس ورکنگ کمیٹی
ہونے کے بعد زیادہ سے زیادہ جون ۴۵ء سے اسکیم کو عملی جامہ پہنا دیا جائے۔

مرتبہ اسکیم کی رُو سے ایک آل انڈیا ریسرچ بورڈ ہوگا۔ جس کے چند ذیلی بورڈ
ان بورڈوں کے ماتحت علی گڑھ۔ لاہور۔ اجمیر۔ حیدرآباد۔ بمبئی اور کلکتہ میں
انسٹی ٹیوٹ۔ قلمی و مطبوعہ کتابوں کے میوزیم اور چھاپے خانے وغیرہ قائم کئے جائیں۔
پورے ملک میں تصنیفی کام کی موثر تنظیم کی جائے گی۔

خدا سے دعا ہے کہ آخر جون ۴۶ء میں جب 'معنف' کا اگلا شمارہ نذر ناظرین
خوشخبری سنا سکیں کہ اسکیم منظورہ و مذکورہ کے تحت ابتدائے کار کے طور پر
کا انسٹی ٹیوٹ قائم ہو گیا۔

چہ تربیت شنوم یا چہ مصلحت بینم
مرا کہ چشم بہ ساقی و گوش بر چنگ است

میرے خیال کے لئے ایک مسلم ماہر علم کتابیات سے قرآن کی [illegible] حاصل ہو [illegible]
مناسب شخص کا عنقریب انتخاب عمل میں آئے گا۔ مسلم ماہر علم کتابیات [illegible] ماہر [illegible]
بھی مناسب وقت پر مستحق ہوگا۔ اس معاملہ میں آپ نے جو دلچسپی اور ہمت افزائی [illegible]
اُس کے لئے دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مولوی صلاح الدین صاحب ایڈیٹر ادبی دُنیا لاہور

آپ کی کتاب "مسلمان کی دُنیا" بہت [illegible] ہے۔ انشاء اللہ ختم کرنے کے بعد کچھ عرض [illegible]
'مصنف' مل رہا ہے۔ ماشاء اللہ خوب چل رہا ہے۔ میں اور 'ادبی دُنیا' کے ناظرین
سے استفادہ کرتے ہیں۔

قاضی احمد میاں اختر صاحب جوناگڑھی

معاف فرمائے۔ یا بایں شوراشوری یا بایں بے نمکی [illegible]
العلوٰۃ اور تلاوتِ مصحف کے لئے دلی مبارکباد
خدا استقامت بخشے پردہ کے حامی آپ نہ ہوں گے تو کون ہوگا۔ حکم تو عام ہے۔ مگر بعض
صرف "اہلِ بیت" کے لئے یہ حکم تھا۔ اس لحاظ سے حجاب اور قرار فی البیت کے مؤکد
لوگ ہیں۔ "حال وقال" کا یہ تناقض بھی خوب ہے۔ ع

منکرے بودن وہم رنگِ مستاں زیستن

میں بھی حافظ کی طرح نہ کہہ دوں ؎

رازِ درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس ۔۔۔ کیں حال نیست صوفیِ عالی مقام را

ہاں تو یہ کہئے جناب پچھلے کرم نامے میں آپ نے جو گل کھلائے تھے وہ تمام تر [illegible]
فرمائے اناالحق کہنے میں کیا دیر ہے۔

کانفرنس کے سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی کمیٹی کے جلسے کا جو نقشہ آ[illegible]
بہت خوب ہے۔ لیکن میرے خیال میں تو سیدالقوم شروانی (مستغنا الیہ المسلمین)
کی قیادت اور آمریت کافی تھی نہ کہ اس کے لئے کسی کمیٹی یا سب کمیٹی اور گراں بار اخراجات [illegible]
یہ انوکھی طریقے ہیں وقت اور روپیہ ضائع کرنے کے لئے۔ واللّٰہ یھدی القوم المسلمین
مصنف پہونچا کتابت میں ترقی ہوئی تو کاغذ کا رونا پڑ گیا خدا اس جنگ کو ملت کرے [illegible]
مشاق باغباں کی صنعت کاری کا بہترین نمونہ ہے۔ ہر لوب [illegible] ہے [illegible]
تو غنچہ کم نہ دمیدہ ۔۔۔ در دل کشا بچمن در [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُردو شاعری میں خمریات

از جناب مولوی ظہیر الدین علوی صاحب ایم۔ اے، ایل، ایل، بی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شعر و شاعری کی بزم رنگیں حسن و عشق اور بادہ و ساغر کی ہمیشہ منت کش رہی ہے۔ ہر مہذب
قوم کے ادب میں شراب کا ذکر نہایت ذوق و شوق سے کیا جاتا ہے۔ یونانی شاعری میں
شراب پر کوئی مکمل نظم نہیں ملتی لیکن وہاں ایک دیوتا کا وجود ملتا ہے جس کو (Bacaus)
کہتے تھے۔ سقراط کے زندگی کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ سال میں ایک دن ایک میلا لگتا
تھا جس میں ناؤ نوش کی محفلیں گرم ہوتی تھیں اور خدائے میخانہ کی تعریف میں قصیدے پڑھے
جاتے تھے۔ ہومر کی شاعری میں بھی ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ
شراب کی تندی و تیزی سے خوب واقف تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس کے تمام ہیرو
شرابی ہیں۔ وہ ایک جگہ شراب کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے "مردہ روحوں کے لئے شراب
باعث زندگی ہے"۔ روم میں ورجل کے زمانے میں افسردگی کے خاص طریقے رائج تھے۔
مصر کی ممیوں کے تابوت میں اکثر شراب نکلی ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اہل مصر کو شراب
سے محبت تھی۔ انگریزی ادب میں بن جانسن اور شیکسپیئر کے یہاں ایک خاص قسم کی شراب کا
[illegible] استعمال ہوتی تھی
[illegible] کے کلام میں شراب کا ذکر نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو

ری شراب کی تعریف میں کہتا ہے :-

آرا سئے ۔ دل آرا سئے ۔ غم افزائے ۔ غم انجاسئے
نکوروئے ۔ نکوروئے ۔ بہ حسن اندر جہاں سرور

منوچہری کا ایک مکمل قصیدہ شراب کی تعریف میں موجود ہے ۔ اور انگور کے پھلنے سے
ب بیننے تک کا حال ایک حکایت میں بیان کیا ہے ۔ انگور کی بیل کو ایک عورت تصور کیا ہے ،
روں کو اس کی بیٹیاں مانا ۔ انگور والا جنہیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے ، اتفاق سے ان بیٹیوں
چھوڑ کر اُسے کچھ عرصہ کے لئے مسافرت کرنی پڑی ، واپس آنے پر کیا دیکھا کہ اُن کے سرخ
رے سیاہ ہو گئے ہیں اور وہ حاملہ ہو گئی ہیں ۔ اس کو سخت صدمہ ہوا کہ یہ لڑکیاں بدکار نکلیں ،
کیوں نے عذر کیا لیکن اس نے ایک نہ مانی اور سب کے سر تن سے جدا کر دیئے ۔

فارسی شاعری کے ہر دور میں مستی اور جوش کے نمونے ملتے ہیں لیکن جو نشہ حافظ اور
م پر چھایا ہوا ہے وہ کسی پر نہیں ۔ یہ لوگ واقعی غرق جام شراب تھے ۔

اِس مختصر خاکے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاعری اور شراب میں کوئی گہرا تعلق ضرور ہے ۔

یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہو جاتا ہے کہ شراب میں وہ کیا شئے ہے جو شاعر کو اپنی طرف
ھینچتی ہے ۔ ایک عامی کے لئے شراب سرخ رنگ کا پانی ہے لیکن کسی رند سے پوچھئے تو
وہ اِس چھوٹے سے پیمانے میں عجائبات عالم دیکھتا ہے ۔ اس میں وہ بوسہ ہائے اولیں کا
ہ اور شہد کی شیرینی محسوس کرتا ہے ۔ اس کی زندگی اپنے اصلی رنگ میں اس کے سامنے
اتی ہے ، بقول مولانا شبلیؔ وہ مزے میں آکر پکارتا ہے کہ مجھکو ننگ و نام کی پرواہ نہیں ۔ ساقی
لے پر پیالہ دیئے جا اور کسی سے نہ ڈر ۔ زاہد کیا جانتا ہے کہ جام میں کیا گوناگوں عالم نظر آتے ہیں
رب سے کہو کہ یہ نغمہ گائے کہ تمام عالم پر میری حکومت ہے ، کل خاک میں جانا ہے ، آج کیوں نہ
ست ہو کر تمام عالم میں غلغلہ ڈالدوں ۔ تم مجھے حقیر سمجھتے ہو ، شراب خانے میں آؤ تو میں تمہیں اپنی
تیر دکھاؤں ، میرے ہاتھ میں جو پیالہ ہے وہ جمشید کو بھی نصیب نہ ہو گا "

شراب کا سب سے بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ جذبات کو تیز اور شدید تر کر دیتی ہے ۔ شاعر
ست کی طرف سے ایک خاص دل لیکر آتا ہے اور ذرا ذرا سی باتوں سے متاثر ہوتا ہے
ذبات کی تیزی اور مستی مل کر ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتی ہیں اور اسی عالم میں شعر نازل
تا ہے [illegible] ایک پردوں کو چیر دیتی ہے اور پھر وہ نغمے نکلتے ہیں جو شاعر

بہت کم لیکن اس کی کیفیت اُن پر مسلط ہے۔ ایک نقاد کا خیال ہے کہ انیسویں صدی
شاعری آلام روزگار سے بریت چاہتی ہے ... Poetry of 19th Century
The poetry of escape. جس کے لئے شراب سے بہتر اور
ہو سکتی ہے۔ سنسکرت میں بھی شراب کے متعلق بہت کچھ مواد موجود ہے۔ کالیداس نے
کا ایک مشہور شاعر تھا شراب کی دعوت دی ہے اور اپنے کلام میں پینے پلانے کا ذکر
انداز میں کیا ہے۔ اہل عرب شراب کے معاملہ میں بڑے فراخدل تھے۔ اسلام کی
عرب کا ہر گھر ایک میخانہ بنا ہوا تھا اور شراب اِس کثرت سے رائج تھی کہ نہ پینے و
بیوقوف کہا جاتا تھا۔ اسلام نے شراب کو مذہباً ممنوع قرار دیا، چنانچہ مذہبی ر
بعض نے جام و صراحی توڑ ڈالے لیکن کچھ نیت کے کمزور ثابت ہوئے اور چھپ چھ
رہے۔ ابو نواس جسے علامہ شبلی نے جاندادۂ شراب کا لقب دیا ہے، شراب کے
تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

" سونے کی زمین پر موتی کے خذف پڑے ہیں "

ایران کی سرزمین شاعری کے لئے نہایت زرخیز اور شراب کے معاملہ
کم نہیں ہے بلکہ زیادہ چھان بین کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شراب کے مضامین جو
شاعری میں ہیں مشکل ہی سے کسی دوسری زبان کی شاعری میں ملیں گے۔

میرا عنوان چوں کہ ' اردو شاعری میں خمریات ' ہے اور اُردو شاعری نے
فارسی شاعری کا تتبع کیا ہے اِس لئے نفسِ مضمون پر آنے سے پہلے فارسی شاعری
پر ذرا تفصیلی نگاہ ڈالنا پڑے گی۔

خمریات کے مضامین فارسی شاعری کی ابتدا ہی سے پائے جاتے ہیں۔ رودکی

رودکی چند بر گرفت و نواخت	بادہ انداز کو سرود انداخت
آن عقیقین مے کہ ہر کہ بدید	از عقیقہ گداختہ بشناخت
ہر دو یک گوہر اند لیک بالطبع	ایں بفسرد و آن دگر بگداخت
نا بسودہ دو دست رنگین کرد	ناچشیدہ بتارک اندر تاخت

اور کبھی جوش میں بتا اُٹھتا ہے ...

مقدم [illegible] ۔ حافظ کا مشہور شعر ہے ؎

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزل ہا

جب مولویوں نے دیکھا کہ ایسے ایسے بزرگ اشخاص اس آبِ ممنوعہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں تو اُن کی مذہبی رگ بھڑک اٹھی اور صوفیوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ حکومت نے بھی مولویوں کو ساتھ دیا اور چپہ چپہ پر پہرہ دار بٹھا دیئے اور شغل شراب کو حرام قرار دیدیا گیا۔ شاعر چوں کہ فطرتاً آزاد ہوتا ہے اور کسی قید و بند سے نہیں ڈرتا بلکہ اس قسم کی قیود اُس کی آگ کو اور بھی مشتعل کر دیتی ہیں۔ ان ظاہر پرستوں کی ضد میں شراب کا راگ اور بھی زوروں کے ساتھ الاپنے لگا، اور مولویوں اور واعظوں کی ایسی قلعی کھولی کہ انہیں اپنی پگڑی سنبھالنا مشکل ہو گئی۔ حافظ اِس گروہ کے قائد ہیں۔ اُن کے یہاں شراب معرفت اپنے شباب پر ہے، مولانا شبلی اُن کے متعلق لکھتے ہیں :—

"خواجہ پر رندی اور مستی کا جذبہ غالب تھا۔ اُن کے کلام میں یہ جذبہ اس جوش اور زور کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ فارسی شاعری کی ہزار سالہ زندگی میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی" ثبوت میں چند اشعار پیش کرتا ہوں ؎

ساقی بہ نورِ بادہ بر افروز جامِ ما ؎ مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکامِ ما
ما در پیالہ عکسِ رُخِ یار دیدہ ایم ؎ اے بے خبر ز لذتِ شربِ دوامِ ما

ساقیا برخیز و دردہ جام را ؎ خاک بر سر کن غمِ ایام را

سرِ خدا کہ عارفِ سالک بکس نہ گفت ؎ در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

دوسری تحریک جو فارسی شاعری میں ملتی ہے وہ خالص رندانہ ہے۔ اُس میں شراب سے یہی انگوری شراب، ساقی سے گوشت و پوست کا وہی نازک بدن جس کا ایک جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی ہے۔ مراد ہے، ساغر، پیمانہ، خم سے مادی اشیاء مراد ہوتی ہیں۔ اِس قافلہ کا میر کارواں خیام [illegible] سلیمان ندوی صاحب کو اس سے اختلاف ہے، کیوں کہ اُن کا خیال ہے کہ [illegible] حسن کی شراب کو دوست و دشمن یہی بھٹی والی شراب

اور ساتھیں دونوں کو دیدیں دستے ہیں۔ جذبات و رجحانات میں بڑی روشنی [illegible]

سے زیادہ اور کوئی نسخہ کارگر نہیں۔ دنیا میں بعض انسان ایسے ہیں جو غم روزگار کو غم جاناں بنا لیتے ہیں۔ لیکن بعض ہستیاں ایسی بھی ہیں جن کا دل کسی طرح نہیں بہلتا۔ جب اُن کی سعیٔ التفات بھی رائگاں جاتی ہے تو شراب ہی اُن کی مدد کرتی ہے اور اسی سے وہ غم سے چھٹکارا پاتے ہیں۔

شاعری میں عموماً جس شراب کا ذکر کیا جاتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک شراب انگوری جو خیام کی رباعیوں میں جھلکتی ہے، اور دوسری شراب معرفت جو حافظ اور عطار کے کلام بلوریں جام میں نظر آتی ہے۔ شراب انگوری کے متعلق تحقیق سے نہیں کہا جا سکتا کہ کس زمانے دریافت ہوئی۔ بعض کا خیال ہے کہ حضرت نوح کو معلوم تھی، ایرانی علماء کہتے ہیں کہ خسرو جمشید کی طبعزاد ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ جس بزرگ نے بھی یہ ایجاد کی ہو شاعر دل فکر فردا سے بچنے کے لئے نہایت مستند نسخہ ہے۔ شراب معرفت کی تاریخ متعین کرنے میں کوئی د[قت] نہیں۔ یہ شراب صوفیانہ شاعری میں پائی جاتی ہے، جس وقت کہ مذہب کی بندشیں سخ[ت] تھیں، زاہدوں اور شیخوں کا ستارہ عروج پر تھا۔ صوفی خدا کی حمد و ثنا میں مصروف رہتے جن کا زیادہ وقت محبوب (خدا) سے قریب تر پہونچنے کی کوشش میں صرف ہوتا تھا۔ صوفیہ نے شراب کو ایک خاص معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ان کی شراب انگوری نہ تھی بلکہ اس سے کوثر والی شراب مراد تھی یا محبوب کے دیدار کی گرمی اور مستی مقصود تھی۔ لیکن زاہدوں اور قا[ضیوں] کی سطحی نگاہیں اس گہرائی تک نہ پہونچ سکیں اور وہ صوفیوں پر شبہ کرنے لگے۔ صوفیوں کی [اصطلاح] میں ساقی۔ میکدہ۔ جام و سبو۔ صراحی۔ نقل۔ گزک۔ نشہ۔ خمار۔ مستی وغیرہ سب سے عرفان کے بڑے بڑے واردات اور مدارج مراد ہیں اور ان اصطلاحات کے ذریعہ سے تصوف کے اہم مسائل اور دقیق اسرار بیان کئے جاتے ہیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی شعرالہند میں [لکھتے] ہیں:- "تصوف کا یہ اعجاز تھا کہ وہ الفاظ جو رندی اور عیاشی کے لئے خاص تھے، حقائق و اسرار کے ترجمان بن گئے، ساقی کا لفظ ہر زبان میں اُس مہوش شخص کے لئے وضع کیا گیا جس کی بدولت سیکڑوں آدمی لباس تقویٰ سے عاری ہو جاتے ہیں اور [illegible] [illegible] نذر میں شامل کئے جاتے ہیں لیکن تصوف میں یہ شخص مرشد کامل [illegible] [illegible] سے فروتر سے برتر کوئی شخص ہو سکتا ہے لیکن تصوف کی [illegible]

یا پیمانہ ایسا ہو جس میں اس کا رنگ چمک کر آنکھوں کو خیرہ کردے اور محبوب پہلو میں ہو۔ شراب کے حسن میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ میخانہ۔ ساقی۔ صراحی۔ جام۔ خم۔ کدو وغیرہ شراب کے جزو لاینفک ہیں، شراب کی محلفیں سنجیدہ اور خشک لوگوں کی نگاہ میں کھٹکتی ہیں فرامین شاہی کے ذریعہ سے فاقہ مستوں کی گیر و دار ہونے لگی اور اس کام کے لئے محتسب مقرر ہوئے، زاہدوں اور واعظوں نے شراب کے عیوب بیان کرنے پر کمر باندھی۔ نتیجہ ہوا کہ شعراء اور ان کے درمیان ایک کشمکش اور محاذ قائم ہو گیا۔ شعراء نے زاہدوں کی ظاہری پرہیزگاری اور باطنی سیاہ کاری کو خوب خوب بیان کیا۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند   چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

غلام ہمت دردے کشائے یک رنگم   نہ زاں گروہ کہ ازرق لباس و دل سیہ اند

حافظا مے خور و رندی کن و خوش باش ولے   دام تزویر مکن چوں دگراں قرآں را،

انھیں بزرگوں کے لئے خیام کی ایک رباعی ملاحظہ ہو:۔

قومے ز گزاف در غرور افتادند   قومے ز پئے حور و قصور افتادند

معلوم شود چو پردہ ہا بردارند   کز کوئے تو دور دور افتادند

واعظ یا شیخ کی ظاہری تقریر ایک صاحب نے حسب ذیل الفاظ میں کھینچی ہے:۔

"مقدس صورت نورانی چہرہ، سیدھی وضع، سادی پوشاک، دلدہی کرکے سمجھانا، ملائم و نرم الفاظ سے خطاب کرنا، آیتوں کی تفسیر، جنت کی ترغیب، حوروں کی تمنا، شراب طہور کا شوق دلانا، عسل مصفیٰ کے بیان پر چٹخارے بھرنا اور آتش دوزخ کے شعلوں کے ذکر سے کانپ اٹھنا۔"

شعراء نے ان کی ہجو صرف الفاظ ہی تک محدود نہیں رکھی بلکہ اکثر شعراء نے زاہد یا واعظ کو میخانہ کے دروازہ پر پکڑا بھی ہے۔ جہاں وہ چھپ چھپ کر جایا کرتا تھا اور کبھی بیچارے کا ایمان پرکھنے کے لئے اس کے حجرے میں بوتل رکھدی ہے۔ مگر چونکہ ان کی پشت پناہی میں جابر حکومت ہوا کرتی تھی اس لئے باہمت شاعر ہی کھلم کھلا ہجو گوئی کی ہمت کرسکتے۔ سب سے پہلے خیام نے جرأت کی اس کے بعد سعدی نے دبی زبان سے کام لیا۔ مگر حافظ نے بڑی دلیری اور آزادی سے اس فرض کو ادا کیا ہے یہ انھیں کا حصہ

سمجھتے ہیں، اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ وہ تمام رباعیاں جن کا مضمون بجز ... کے اور کسی شراب پر منطبق نہیں ہو سکتا، خیّام کی نہیں بلکہ الحاقی ہیں۔ چونکہ نفسِ مضمون سے بالکل جدا ہے اس لئے اس سے گریز کیا جاتا ہے۔ بہر حال خیا... رباعیاں پیش کرتا ہوں، جن سے ناظرین خود اندازہ لگائیں گے۔

من بے مئے ناب زیستن نتوانم — بے جام کشیدہ بارِ تن نتوانم
من بندۂ آں دمم کہ ساقی گوید — یک جام دگر بگیر و من نتوانم

مے خوردن من از برائے طرب است — نے بہر فساد و ترک دین و ادب ...
خواہم کہ بہ بیخودی بر آرم نفسے — مے خوردن و مست بودنم این سبب

در نائے ترا بہ قلقل مے چہ خوش است — آواز سماع و نالۂ نے بہ خوش اس...
در بربتِ دلفریب و در سرِ مئے ناب — فارغ زغمِ زمانہ ہے ہے چہ خوش ...

ساقی مئے کہنہ یار دیرین من است — بے دختر رز عشق نہ آئین من است
گویند کہ بادہ خوار را دینے نیست — من بادہ خورم کہ بادہ خود دین من اس...

خیّام کی عالمگیر مقبولیت کی وجہ ہی اس کی رباعیات ہیں جن میں شراب کا عنصر ... مگر وہ شراب میں آپے سے باہر ہو جانے کی تعلیم نہیں دیتا، کہتا ہے :-

چوں بادہ خوری زعقل بیگانہ مشو — مدہوش مباش و جہل را خانہ مشو
خواہی کہ مئے لعل حلالت باشد — آزار کسے مجوے و دیوانہ مشو،

زاہد و واعظ کی لعنتوں کا جواب وہ ایک شعر میں یوں دیتا ہے :-

تو فخر ہمی کنی کہ خود مے نخوری — صدکار ہمیں کنی کہ مے غلام است ...

اور نشے کی تیزی میں یہ بھی کہہ جاتے ہیں :-

ما ئیم خریدارِ مئے کہنہ و نو — وانگاہ فروشندۂ عالم ...

شراب کا ذکر بغیر اس کے لوازمات کے ادھورا رہ جاتا ہے۔ ... شراب ...

[illegible] کی محفلوں جلسوں اور کوچہ و بازار میں اُن کے اشعار لوگوں کی زبان پر تھے
ولی ایک آلا دخش سیر و سیاحت کے شوقین اور رنگین مزاج شاعر تھے۔ ان کی کلیات میں
خمریات کے کافی اشعار موجود ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

بزمِ عشرت میں جام لب سوں پیا — مے پلاتا نہیں ہزار افسوس
ساقی و مطرب آج ہیں ہم رنگ — نشۂ وبجودی دو بالا ہے
شراب شوق سوں سرشار ہیں ہم — کبھو بیخود کبھو ہوشیار ہیں ہم

لیکن ولی شراب سے اتنا متاثر نہیں ہیں جتنا کسی کی آنکھ میں شراب کی مستی دیکھ کر۔
چند شعر ملاحظہ ہوں :-

یک جام میں دو جگ کو کرے مست و بیخبر — انکھیاں کا تیری عکس پڑے گر شراب میں
یک نگہ سوں کیا ہے مست مجھے — اُس کی انکھیاں میں کیا خماری ہے
نشہ بخشِ عاشقاں وہ ساقیٔ گلفام ہے — جسکی انکھیاں کا تصور بے خودی کا جام ہے
جو کیفیت سیہ مستی کی تجھ انکھیاں میں ہے ظالم — نہیں وہ رنگ مستی کا شراب پرتگالی میں
بے منتِ شراب ہوں سرشار انبساط — تجھ نین کا خیال مجھے جام جم ہوا

قلقلِ مینا سے کیا مراد لی ہے :-

ہُوا ہے قلقلِ مینا سوں مجھکو یہ ظاہر — کہ مے پرست کے سینے میں ہے شمار خدا

زاہدوں کی تضحیک اور محتسب پر فقرے ولی کے کلام میں موجود ہیں، مثال :-

آسماں اُوپر نہ پوچھو چادرِ ابرِ سفید — جانماز زاہد عزلت نشیں بر باد ہے
آلودہ کیوں نہ ہوئے دامانِ پاک زاہد — جب دستِ نازنیں میں جامِ شراب ہوئے
ترے ابرو کی پہونچے گر خبر مسجد میں زاہد کو — تماشہ دیکھنے آوے ترا محراب سے اٹھ کر
کہو زاہد سے جاوے اُس گلی میں — اگر مشتاق فردوس بریں ہے

قلی قطب شاہ سے لیکر ولی کے زمانہ تک خمریات میں ایک خاص بات جو ملتی ہے وہ یہ
شعرا شراب کی گرمی سے اتنے متاثر نظر نہیں آتے جتنا آنکھ کے خمار اور شراب کے
نشے کی کرتی ہے۔

[illegible] شاعری کی ابتدا ولی کے کلام سے ہوئی اور اسی لئے اُن
[illegible] شعراء ایہام کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے

اُردو جیسا کہ مولانا آزاد کا خیال ہے فارسی کے پیروں پر اُٹھی۔ اس میں بہت سی فارسی زبان کی اصطلاحیں آگئیں۔ مثلاً گل و بلبل۔ لیلیٰ مجنوں۔ دشنہ و خنجر۔ بادہ و ساغر۔ جام و میخانہ۔ ساقی و پیرِ مغاں۔ زاہد و تسبیح۔ جبہ و عمامہ۔ وغیرہ، اور یہ اصطلاحیں رفتہ رفتہ اُردو کی روزمرہ بن گئیں اور جو بطور مہمان کے اُردو میں داخل ہوئیں تھیں اب خود میزبان بن گئیں۔ خمریات بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس صنف کو ہمارے شعراء نے حتی المقدور فروغ دیا۔ شراب اور اُس کی تعریف۔ ساقی۔ میخانہ۔ رند۔ واعظ۔ مستی و مدہوشی کے مضامین قریب قریب ہر دور کی شاعری میں ملتے ہیں۔

اُردو شاعری کی ابتدا دکن میں ہوئی۔ شمالی ہند میں وہاں سے کئی سو سال بعد شعر و شاعری کی بزم رنگیں منعقد ہوئی۔ سلطان قلی قطب شاہ پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ یہ ایک رنگیلا بادشاہ تھا۔ طبیعت بھی شاعرانہ تھی۔ اُس کے دربار میں عیش و عشرت کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ ساقی و مطرب کی خاطر و مدارات بھی ہوتی تھی۔ اُس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

اب مست اچھے دایم ہمیں مست لچھے کا ہنگام ہے ساقی صراحی نقل ہور پیالے سے ہمنا کام ہے
عاشق اوّل تے ہیں ہمیں سرمست ازل تے ہیں ہمیں تا آج کل تے ہیں ہمیں، زاہد کو کیں یہ نام ہے
روز یدگر عید آنے میں تک شیر خرما کھانے میں صوفی چلے میخانے میں تسبیح ہات اب جام ہے
ساقی پیالہ مج پلا پیالا پیتے ہوتا دلا، اُس پیوں کوں تو لیکر چلا جس پیوستے مج آرام ہے

اسی بادشاہ کے دربار میں ایک شاعر ملا وجہی گزرا ہے جو اپنی نثر کی کتاب "سب رس" کی بنا پر زیادہ مشہور ہوا۔ اس کتاب میں اُس نے شراب کی تعریف کی ہے اور یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ بادشاہ یا دیگر امراء کے لئے شراب ضروری ہے، اس نثری کارنامہ کے علاوہ ایک مثنوی 'قطب مشتری' بھی لکھی جس میں قلی قطب شاہ کی داستانِ عشق کا بیان ہے۔ اسی مثنوی میں وجہی نے محفلِ نشاط اور شغلِ شراب و کباب کا ذکر نہایت خوبی سے کیا ہے۔ دکنی شاعری میں بہت سے شعرا ایسے ہیں جنھوں نے خمریات کو اپنے کلام کا جزو بنایا ہے لیکن چونکہ ہمارے کان اُس پرانی زبان سے آشنا نہیں اس لئے انھیں دو شعروں پر اکتفا کرتا ہوں۔

ولی

ولی کی شاعری سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا [illegible]
[illegible]

اور محتسب پر فقرے چست کئے ہیں :-

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانہ میں جبّہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی، مستی میں انعام کیا

سے بُرے مغبچو کے تیور لیک شیخ میخانہ سے بھلا کھسکا

منت آبروئے زاہد علامہ لے گیا اِک مغبچہ اتار کے عمامہ لے گیا

میر کے دیوان میں پوری پوری غزلیں شراب کی دعوت، شیشے کی سرگزشت اور حالت نشہ کی کیفیت کے بیان میں ملتی ہیں۔ اُن کی بہت مشہور غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے :-

شیخ جی آؤ مصلّی گرو ئے جام کرو جنس تقویٰ کے تئیں صرف مئے جام کرو

بعض اشعار نہایت عمدہ ہیں جن میں خمریات کا مضمون انوکھے پیرایہ سے باندھا ہے، مثال :-

شراب عشق میسّر ہوئی ہے جسے اِک شب پھر اس کو روز قیامت تلک خمار رہا

واں تو وہ اپنے گھر سے پی کر شراب نکلا یاں شرم کے عرق میں ڈوب آفتاب نکلا

خورشید سا پیالۂ مے بے طلب دیا پیرِ مغاں سے رات کرامات ہو گئی

مصطبۂ بیخودی ہے یہ جہاں جلد خبردار ہوا چاہئے

سودا | میر کے بعد سودا کا نام قابل ذکر ہے۔ ان کے کلام میں بھی شراب کی اکثر کیفیتوں کا ذکر ہے۔ وہ بھی آنکھوں کی مستی سے بے قابو ہو جاتے ہیں، اُن کا وہ "عیشِ جہاں" کا نقشہ جو "صحبتِ مستاں" کو مدنظر رکھ کر کھینچا ہے، دیدہ زیب ہے۔ وہ دنیا میں شراب و شاعری کے علاوہ اور کسی شے سے سروکار رکھنا نہیں چاہتے، کہتے ہیں :-

صحبت شعر، بکف جام، صراحی در دست اس سوا سودا کو کچھ کام نہیں دنیا میں

یہ خیال عام ہے کہ سودا کے یہاں صرف "واہ" ہے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ اُنکی شاعری میں کہیں کہیں دل ہلا دینے والی آہ کے نمونے ملتے ہیں، اس کی وجہ اُن کا ماحول تھا احمد شاہ ابدالی کے جہاد اور مرہٹوں کی غارتگری کا خود انھوں نے مشاہدہ کیا تھا۔ وہ ساقی جو اپنی دریا دلی کے لئے مشہور تھے، اس دار و گیر میں ایسے لٹے کہ نان شبینہ کو محتاج ہو گئے میخانہ تباہ ہوا، شراب لٹی اور عجیب افراتفری پڑ گئی۔ ایسی فضا میں اگر وہ ایسے اشعار نہ کہتے تو عجب تھا۔ سودا کا فطری میلان رجائیت کی طرف تھا اور اسی وجہ سے ان کے اشعار میں رنگینی [illegible] سودا درباری شاعر تھے، انھوں نے عیش و نشاط کی محفلوں کا حظ اٹھایا تھا اس [illegible] مسرت [illegible]، اُن کا ایک مشہور شعر ہے ؎

[illegible] ہی وجہ ہے چند ہستیاں خمریات بن گرا ئیں ۔ انہیں سے سبب [illegible] ہے ۔ اُن کی قادرالکلامی اور استادی میں کسے شبہ ہو سکتا ہے ۔ گو اُن کی شاعری یاس حرماں سے لبریز ہے پھر بھی اُن کے یہاں خمریات کے مضامین اکثر و بیشتر ملتے ہیں :-

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں سارے مستی شراب کی سی ہے

ساقی کے انتظار میں ساری رات بے خبری سے کاٹ دیتے ہیں :-

ساقی کے جو آنے کی خبر تھی گذری ہمیں ساری بے خبر رات

ایک جگہ شراب کی تاثیر یوں بیان کی ہے :-

نہ آتی دارو پی ظالم کہ اس خمار میں ہوں مزاج گرم ہے پھر اور یہ ہوا ہے گرم

میخانہ کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں :-

نئے طرزوں سے میخانے میں رنگ مے جھلکتا تھا گلابی روتی تھی واں جام ہنس ہنس کر چھلکتا تھا

اور اپنی مستی کا زور یوں دکھاتے ہیں :-

پھوٹا کئے پیالے لُنڈھتا پھرا قرابا مستی میں میری تھا یاں اک شور اور شرابا

محبوب کی آنکھ سے شراب کا تعلق یوں ظاہر کرتے ہیں :-

رات اُس کی چشم میگوں خواب میں دیکھی تھی میں صبح سوتے سے اٹھا تو سامنے پیمانہ تھا

بکھری ہیں منھ پر زلفیں آنکھ نہیں کھل سکتی ہے کیونکہ چھپے میخواری شب جب رات کرلیے

ابر و بہار میں توبہ کس انداز سے توڑتے ہیں :-

سبزہ و لالہ و گل ابر و ہوا ہے مے دے ساقی ہم توبہ کے کرنے سے پشیمان ہوے

آخر میں رہنِ میکدہ ہونے کی تعلیم دیتے ہیں، کیونکہ تمام چیزوں سے چھٹکارا مل جائے گا -

چلو میکدے میں بسر کریں کہ رہی ہے کچھ برکت وہیں
لب نان واں کا کباب ہے، دم آب واں کا شراب

بہار کی آمد کو بھی اسی رنگ میں دکھاتے ہیں :-

بہار آئی ہے غنچہ گل کے نکلے ہیں گلابی سے نہال سبز جھومے ہیں گلستاں میں شرابی سے

یاسیات میں بھی خمریات موجود ہے :-

دل پُر خوں کی اک گلابی تو [illegible]

میرؔ کی خمریات کا سب سے [illegible]

ان سب اشعار میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ اس بات کو مندرجۂ ذیل شعر میں اور صاف کر دیا ہے ؎

جانیے کس واسطے اے ہمدمو میخانے کے بیچ
اور ہی مستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ

محتسب پر ان کے یہاں بھی اچھی چوٹیں کی گئی ہیں لیکن مندرجہ ذیل شعر سب پر بھاری ہے۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دوں تو فرشتے وضو کریں

میر درد کے بعد آتش و ناسخ کے یہاں بھی خمریات کے اشعار ملتے ہیں، لیکن اُن میں رسمی انداز زیادہ اور ذوقِ مستی کم ہے۔ یہ لوگ نہ تو اتنے بزرگ تھے کہ تصوف سے لگاتے اور نہ اتنے پھکڑ کہ رندِ شاہد باز کہلاتے۔ ان کے یہاں شراب کے الفاظ بزرگوں کی تقلید میں باندھے گئے ہیں۔ خمریات کے اشعار زندگی کے ایک محبوب مشغلے کے بجائے ایک علامت ایک اشارہ یا ایک موضوع یا عنوان کی حیثیت اختیار کر چکے تھے، اور شعراء اس عنوان پر صرف اس وجہ سے بھی طبع آزمائی کرتے تھے کہ اُن کے کمالِ فن کا پورا اثر پڑے۔ رعایت لفظی ان لوگوں کے غزل کی جان تھی۔ جذبات پر اتنا زور نہیں دیا جاتا تھا جتنا الفاظ کی خوبصورتی پر، شراب چوں کہ جذبات پر ایک خاص اثر کرتی ہے اِس لئے اُن کے یہاں نشہ و خمار کے اشعار سطحی معلوم ہوتے ہیں یا بھرتی کے، نمونے ملاحظہ ہوں:-

(ناسخ) :- زاہد وہ بادہ کش ہوں کہ مانگوں اگر دعا
اٹھیں ابھی شراب سے بادل بھرے ہوئے

حشر تک جی میں ہے بیہوش رہوں اے ساقی
کاش سے بھر دے مرے عمر کے پیمانے میں

آبِ حیواں پیوں بجائے شراب
ایسی اے خضر مجھکو پیاس نہیں

آیا مہ صیام علی الرغم محتسب
روزہ شراب سے سرِ بازار توڑیئے

صباح عید ہوئی ساقیا شراب چلے
نہ بیشتر کہیں ساغر سے آفتاب چلے

ہر طرف معروف زاہد ہیں نمازِ صبح میں
گردنِ مینا کو بھی لازم ہے اب خم کیجئے

عشق وصل میں ہے دورِ شراب آخر شب
ساقیا مرغِ سحر کے ہوں کباب آخر شب

(آتش) ان کے یہاں تھوڑی تصوف کی چاشنی بھی ملتی ہے:-

کام ہے مجھ سے ہم کو اور ساغر سے غرض
مست رہتے ہیں شراب روح پرور سے غرض

[illegible]
ساقی رہے، سبزہ و آبِ رواں درکار ہے

[illegible]
ایسا گھر سے کہ پھر نہ کبھی ابرِ تر کھلے

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا   ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

بعض بغیر دوست کے پیا ہی نہیں جاتے۔

پیتا ہوں یاد دوست میں ہر صبح و شام جام   بے یاد دوست مجھ کو ہے پینا حرام جام

ساقی سے طلب میں عجلت:۔

ساقی ہے اک تبسم گل فرصت بہار   ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

ان کے یہاں بھی شراب کی تیزی سے زیادہ نشۂ چشم محبوب پُر اثر اور مخمور کن ہے،

کہتے ہیں:۔

کیا کروں گا لے کے واعظ ہاتھ سے حوروں کے جام   ہوں میں ساغر کش کسی کی نرگسِ مخمور کا

واعظ اور ناصح پر انھوں نے بھی کافی فقرے چست کئے ہیں:۔

عمامہ کو اتار کے پڑھیو نماز شیخ ،،   سجدہ سے ورنہ سر کو اٹھایا نہ جائے گا

تقوٰی کا اس کے موسم گل نے کیا یہ رنگ   زاہد کو خانقاہ سے میخانے لے گیا

سودا کے یہاں پوری پوری غزلیں ایسی ملتی ہیں جن میں شراب کی جزئیات کی تعریف ہے،

بلکہ شعر میں شراب پینے کی ایسی تفصیل لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پکے شرابی تھے کہتے ہیں:۔

سودا تھا وقتِ نزع بھی سکتے کا منتظر   جنبش لبوں کی دیکھی تو کہتا تھا جام جام

درد — سودا کے بعد درد کے یہاں خمریات کا عنصر نمایاں ہے۔ تمام تذکرہ نویس اس پر متفق ہیں کہ یہ بزرگ منش تھے اور انھیں تصوف ورثہ میں ملا تھا جس سے انھیں عشق تھا، اس لئے ان کے کلام میں شراب معرفت جھلک رہی ہے اور حافظ کا رنگ نمایاں ہے۔ کلام میں پائے بوسی خم اور دست بوسی سبو جیسی تراکیب ملتی ہیں، مثال:۔

کبھی خوش بھی کیا ہے دل کسی رند شرابی کا   بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

کہاں کا ساقی اور مینا کدھر کا جام و میخانہ   مثال زندگی بھر لے اب اپنا آپ پیمانہ

ہے تنگ ظرفوں کو بے جا مے کشی   جام سے کب ہو سکے جام حباب

ساقی ہے کدھر کو کشتی مے   اب کے کیسے میں پا رہے ہیں ہم

ساقی پاس وقت کو غنیمت جان   پھر نہ میں ہوں نہ تو نہ یہ گلشن

بس ساقی [illegible] سے [illegible]   [illegible]

[illegible]

اب اُن کے وہ اشعار ملاحظہ کیجئے جن میں اُن کا خاص رنگ جھلکتا ہے :-

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل — انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں — گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ — ہے یوں کہ مجھے دردِ تہِ جام بہت ہے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے — پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں — رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار — یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے!

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری — موجِ مے کی آج رگِ مینا کی گردن میں نہیں

ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیٔ صہبا — یک بار لگا دو خمِ مے میرے لبوں سے

صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ — وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگامِ بیخودی، — رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب — گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

مۓ عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجئے — لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

مجھ تک کب اسکی بزم میں آتا تھا دورِ جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

مختلف اشعار کے علاوہ غالب کے فارسی اور اُردو دونوں کلاموں میں شراب کے بیان میں پُوری پُوری غزلیں ملتی ہیں، واعظ پر طعن و تشنیع بھی موجود ہے :-

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ — پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

داغ

شراب کے معاملے میں داغ بھی غالب کے ہم مشرب ہیں، وہ بھی خوب پیتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ انھیں قرض کی نہیں پینی پڑتی اور نہ محتسب کا کھٹکا ہے۔ ساقی بھی اُن سے نفرت نہیں کرتا، وہ انھیں جام پیش کرتا ہے اور کبھی زبردستی پلا دیتا ہے ؎

[illegible] کشتی نے مجھے کیا مزا دیا — سینے پہ چڑھ کے اس نے خمِ مے پلا دیا

انھیں [illegible] وہ ساقی کی خوشامد نہیں کرتے بلکہ اُس کو بھی چھیڑتے ہیں۔

سب بنے تجھ سے ہے ابرِ جام گل معمور — ٹپکتا ہے شراب ابر کو بھاری سے

ساقی نہ قطع سلسلۂ دورِ جام ہو — مطرب نہ تار ٹوٹے اب آوازِ چنگ کا

ساقی ہے مے ہے یار ہے بزمِ نشاط ہے — چھیڑے نہ اب جو ساز تو مطرب کو چھیڑیے

غالب خمریات میں جو درجہ عربی میں ابونواس کا اور فارسی میں حافظ و خیام کا ہے۔ اردو میں وہی درجہ غالب کا ہے۔ میر، سودا اور درد کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ واقعی شراب پیتے تھے یا نہیں لیکن غالب پیتے تھے اور ڈنکے کی چوٹ پیتے تھے۔ وہ قرض کی بھی پیتے تھے اور جام۔ پیمانہ یا پیالہ نہ ہونے پر اوک سے بھی پینے میں انھیں عار نہ تھا۔ اُن کو بہشت و دوزخ سے کچھ سروکار نہ تھا، وہ اس نو بہار ناز کی آرزو کرتے تھے جس کا چہرہ فروغِ مے سے ہے گلستاں ہو۔ اُن کے یہاں نہ تصوف کی چاشنی ہے نہ ساغرِ مے میں آلامِ روزگار کی نوحہ خوانی۔ اُن کے کلام میں شراب پرتگالی ہے اور وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ یہ شراب کی تیزی ہی تھی جس نے انھیں یہ کہنے پر مجبور کر دیا:۔

"آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے"

مرتے دم تک اُن سے شراب نہیں چھٹی۔ حالت غیر ہے اُٹھنے بیٹھنے کی سکت نہیں۔ سارا دم کھنچ کر آنکھوں میں آگیا ہے، لیکن واہ ری ذوقِ میکشی اُس وقت بھی ارشاد ہوتا ہے ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

غالب کے کلام میں سے خمریات کے مضامین نکالنا آسان نہیں اور اُن پر رائے زنی کرنا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ کیوں کہ اُن کی شراب کہیں کہیں خالی شراب نہیں رہتی بلکہ [...]ص معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ اُن کی خمریات میں جہاں اور خوبیاں ہیں وہاں اُن کا [ذو]قِ میکشی بھی شریک ہے، ذوقِ میکشی کی وجہ کی طرف ان کے کلام میں خود ہی جابجا اشارے [کر]تے ہیں۔ غالب کی زندگی کے اول سات سال نہایت رنگ رلیوں میں گزرے، دن عید [او]ر رات شب برات منائی، لیکن بعد میں انھیں اکثر شدید تکالیف کا سامنا کرنا پڑا جس کی [وج]ہ سے انھیں زندگی اجیرن ہو گئی، لہٰذا خود کو بھلا دینے کی اس سے بہتر ترکیب نظر نہ آئی، [جی]سے وہ خود بتاتے ہیں:۔

[illegible] ہے پھر کیوں نہ میں پیتا جاؤں — غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو — [illegible]

[illegible] کر! — شراب کہنہ ساقی اس پرانے کے لئے

[illegible] کسی طرح — زاہد شکست توبہ شکست سبو نہ ہو

جاتے تھے منہ چھپائے ہوئے میکدے کو ہم — آتے ہوئے ادھر سے کئی پارسا ملے

اگرچہ بادہ کشی تھا گناہ اے زاہد — جو تجھ سے چھین کے پیا تو کچھ گناہ نہ تھا

کل چھڑا لیں گے زاہد آج تو ساقی کے ہاتھ — رہن اک چلو میں میں نے توبہ کو تو رکھدیا

ان اشعار میں داغ کے کلام کی سب خصوصیات ملتی ہیں، شوخی بھی ہے۔ طرز بیان کی شگفتگی بھی چٹخارے بھی اور نازک اشارے بھی، انھیں چیزوں کو دیکھ کر ایک نقاد کی رائے یہ ہو سکتی ہے کہ داغ کی خوشی رندانہ قسم کی ہے، داغ کی خمریات میں تمام دیگر عناصر کے علاوہ زبان کی چاشنی اور صفائی پائی جاتی ہے۔ محاروں کی چستی کی وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ داغ خمریات کے ایک کامیاب شاعر ہیں :-

امیر امیر۔ داغ کے معصر اور حریف تھے۔ انھوں نے بھی خمریات کے مضامین باندھے ہیں، لیکن داغ کی خمریات کا رنگ جھیکا ہے۔ امیر کے یہاں وہ جوش و مستی نہیں ہے۔ اُنکا ایک نہایت مشہور شعر ہے ؎

انگور میں تھی یہ مے پانی کی چار بوندیں — جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

ریاض امیر کی کمی کو ان کے شاگرد ریاض نے بدرجہ اتم پورا کیا۔ ریاض کی طبیعت میں ایک غیر معمولی شوخی تھی جو کسی کو طفلانہ اور کسی کو جوش جوانی معلوم ہوتی تھی، اور یہی وجہ ہے جس نے ریاض کو بوڑھاپے میں بھی جوان رکھا۔ ایک نقاد کا خیال ہے کہ شراب کے اشعار کیف سے خالی ہیں اور سرشاری سے معرا۔ شراب اُن کے یہاں معصومانہ لہو ولعب کی چیز ہے۔ لیکن یہ خیال زیادہ وقیع نہیں جیسا کہ اُن کے نمونۂ کلام سے ظاہر ہوگا۔ ریاض نے لکھنؤ میں اپنی جوانی گزاری تھی، اُس وقت جب کہ لکھنؤ پر بھی شباب تھا اور ایسی صورت میں وہ خمریات کے اشعار نہ کہتے تو تعجب تھا، اشعار ملاحظہ ہوں :-

ہاں [illegible] ٹھے ہوش رہا تھا — اس وقت مجھے ہوش نہیں شکر خدا کا

[illegible] ہیں! — سر سبو پہ ہاتھ ساغر پہ پڑا

[illegible] — یہی جلسے یہی ساغر یہی مینا ہوگا

[illegible] — اٹھتا مزار سے وہ کسی بادہ خوار کا

داغ کی خاص شوخی جو اُن کے کلام کا حصہ ہے زندانہ مضامین میں اور بھی چمک [illegible] اُن کی شاعری کا وہ خاص جوہر جس کی بنا پر حکیمت نے ان کی شاعری کو حیا شادیتا یا خمریات میں اور بھی نمایاں ہے۔ داغ کی زبان کوثر کی دُھلی ہے۔ اُن کے محاورے اور بھی خوبی اور چمک پیدا کر دیتے ہیں، سرمستی اور سرشاری کا عالم ملاحظہ ہو:۔

مجھ سے میکش کو کہاں صبر کہاں کی توبہ
لے لیا دوڑ کے جب سامنے ساغر آیا

میخانہ ہے اور داغ ہے اور نشہ مے ہے
سوتا ہے رکھے خشتِ خم بادہ سرہانے

ساقیا مجھ سے بادہ کش کو سرور
ایک ہی جام سے تو آنے گا

توبہ کے بعد بھی خالی نہیں دیکھا جاتا
دور رہتا ہے بھرا شیشہ و ساغر اپنا

مے تو حلال ہے جو پیئے ڈھب سے بادہ نوش
میں توبہ کرکے اور پشیمان ہو گیا

اپنے حصے کی بچا لیتے ہیں پینے والے
نہ بھرا ساقیٔ کم ظرف نے ساغر پورا

آیا ہے جھوم جھوم کے ابر بہار آج
توبہ کو خشتِ خم سے کروں سنگسار آج

وہ چشم مست پھر اُس پردہ پنجۂ مژگاں
کہ جیسے ہاتھ کسی نازنیں کا ساغر پر

کوئی جنت کا خواہاں ہے کوئی کوثر کا خواہاں ہے
اُڑا کرتی ہے بے پر کی ہمیشہ بادہ خواروں میں

یہ بجا ہے منع ہوگا رمضاں میں آب و دانہ
یہ غضب کہ تیس دن تک نہ ملے شراب ہرگز

روح کس مست کی پیاسی گئی میخانے سے
مے اڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے

ایک چلو میں بہت داغ بہک اُٹھے تھے
آج سنتے ہیں نکالے گئے میخانے سے

یوں تو لے ابر پتا بھی نہیں لگتا تیرا
توبہ کرتے ہی جھلکتی ہے سیاہی تیری

آتا تھا کوئی نشۂ صہبا میں ڈوب کر
ملتے ہی آنکھ رنگ میں اپنے ڈبو گیا

کچھ زہر نہ تھی شراب انگور
کیا چیز حرام ہو گئی ہے

انکار اور اک جرعۂ صہبا سے بھی انکار
ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی

واعظ، زاہد اور محتسب کی بھی داغ نے کافی خبر لی ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں سے

صبر لے زاہد نا فہم نہ میخواروں کا
بخشنے والا بھی دیکھا ہے گنہگاروں کا

تعریف سے کوثر کی سمجھے خوب ملا جی
کیا بات ہے [illegible]

سے [illegible]
[illegible]

[illegible] شراب ہی پیجیے — یہ کیا کیا کہ گنہ تو کیے شراب نہ پی

[illegible] ریاض ایک جوان مست خرام — نہ پیے اور جھومتا جائے

کچھ کلام نہیں مے سے کہ عشق ہو اس شے سے — ہیں رند ریاض لیے دامن بھی نہ تر دیکھا

بہرحال وہ پیتے تھے یا نہیں لیکن اُن کی خمریات نہایت مکمل ہے، اگر نہ پی کر ایسے مضامین باندھے ہیں تو یہ اُن کے کمالِ فن پر دال ہے۔

ریاض کے بعد جن شعراء کا ذکر آتا ہے انھوں نے خوب پی ہے، اُن کی رندی کے واقعات کانوں سے صرف سُنے ہی نہیں بلکہ آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ جگر اور جوش غالب اور داغ کی برادری میں شامل ہیں۔ اُن کا نظریہ غرقِ جامِ شراب ہونا ہے، اور اُن کا خیال ہے کہ جو پی کر بہک نہ جائے وہ رند کہلانے کا مستحق نہیں۔ جگر نے شراب کی مستی کے قصے اس کی تلخی محسوس کرکے لکھے ہیں، وہ ساقی سے زیادہ صہبا پر زور دیتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب چند سال سے یہ کافر منہ سے لگی ہوئی چھُٹ گئی ہے لیکن اسی اعتبار سے کلام کی رنگینی میں بھی فرق آگیا ہے، نمونہ ملاحظہ ہو:-

غرقِ موجِ بادۂ کوثر ساقیا — تا کجا ہیں اور دُنیائے خراب

ہوش سے پھر مائل فرزانگی، — لا شراب او مست ساقی لا شراب

جب تک شبابِ عشق مکمل شباب ہے — پانی بھی ہے شراب ہوا بھی شراب ہے

وہی ہستی جو ساقی ہی نہ تھی عالم میں ! — غرق یک ساغرِ پُر جوش ہوئی جاتی ہے

جگر یہ مئے ارغوانی نہیں ہے — ارے آگ ہے آگ پانی نہیں ہے

مل گئیں نظروں سے نظریں اور مل کر رہ گئیں — چشمِ ساقی دیکھ کر کیا جام و ساغر دیکھئے

پھر وہی حسرت ہے ساقی پھر اُسی انداز سے — پھر سوا ساغر کے سب کچھ غرقِ ساغر دیکھئے

جگر کی بادہ کشی ان دنوں معاذ اللہ — جب آپ دیکھیں گے غرقِ شراب دیکھیں گے

بس جام آخری تو پیا ہے اور ساقی — اب دستِ شوق کانپے یا پاؤں لڑکھڑائیں

واعظ داغ کی تضحیک بھی عجب انداز سے کرتے ہیں:-

ہو گیا کیا مرید سے زاہد — اب تو چہرے پہ نور رہتا ہے

[illegible] — جو اٹھ سکے تو مرا ساغرِ شراب اٹھا

[illegible] — [illegible] محتسب تھوڑی سی آج پی سکے دیکھ

[illegible] | [illegible]
چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی | تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی
[illegible] مے آشام بھی ریاضؔ | میکدے میں بھی تو شورِ قلقلِ مینا ہوا
میخانے میں کیوں یادِ خدا ہوتی ہے اکثر | مسجد میں تو ذکرِ مے و مینا نہیں ہوتا
توبہ کرتے ہوئے آتا ہے یہ رہ رہ کے خیال | منہ مرا دیکھ کے رہ جائیگا ساغر میرا
رحمت کو یہ ادا مری شاید پسند آئے | ڈر ڈر کے کانپ کانپ کے پینا شراب کا
توبہ کرکے آج پھر پی لی ریاضؔ | کیا کیا کمبخت تو نے کیا کیا
نزع تک قلقل سے رکھی یاد اللہ اس لئے | بڑھ کے قُل بخشیگی ہمکو قلقلِ مینا ثواب
بھر گیا آنکھ میں شراب کا رنگ | اُف رے ظالم ترے شباب کا رنگ
مل جائے تو شراب کے دریا بہائیں ہم | اللہ دے اگر تو پئیں اور پلائیں ہم

ایک چھوٹی بحر کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

اچھی پی لی، خراب پی لی | جیسی پائی شراب پی لی
پی لی ہم نے شراب پی لی | تھی آگ مثالِ آب پی لی
عادت سی ہے نشہ ہے نہ کیف | پانی نہ پیا شراب پی لی

واعظ و زاہد پر تضحیک بھی ریاضؔ کے کلام میں کافی ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:-

لگا کے دھوکے سے منہ شیخ پھر نہ چھوڑ سکا | پکارتا ہی رہا میں ارے شراب شراب
تھی ظرفِ وضو میں کوئی شے پی گئے کیا آپ | اے شیخ یہاں کون ہے میں چور ہوں یا آپ
شب کو میخانے میں کیوں پہنچے تو بولے حضرت شیخ | کہئے اچھی تو کٹی قبلۂ حاجات کی رات

ریاضؔ کے یہاں شراب جوانی کی شراب معلوم ہوتی ہے۔ جس میں خمار اور سرور کے لطف کے ساتھ ساتھ ایک تلخی بھی ہے جو زندگی کی تلخ کامی کو دبا دیتی ہے، ریاضؔ کی دُنیا غم و رنج سے آزاد ہے۔ انھیں ہر شے جوان رنگین اور پُر لطف معلوم ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی خمریات میں لطف اور رنگینی نمایاں ہیں۔ اور شوخیاں داغؔ کی یاد دلاتی ہیں۔ یہ مسئلہ کہ واقعی وہ رند مشرب تھے یا نہیں نفسِ مضمون سے علیحدہ ہے۔ [illegible] شہادت [illegible] کی حد نہ پینے کے تھے، بعض حضرات [illegible] وہ خود کہتے ہیں:-

[illegible] ہے آج — صہبا کی ایک بوند میں کون و مکاں ہے آج
[illegible] زمیں ہے قبضہ میں آسماں — آفاق پر حکومت کون و مکاں ہے آج
[illegible] زیست کا ملے جو عیش زمانے میں علاج — جز مے کہنہ و معشوق جواں کچھ بھی نہیں
گردن میں ہیں وہ باہیں گردش میں ہیں پیمانے — کیا دین ہے کیا دنیا شاعر کی بلا جانے

غزلوں اور نظموں کے علاوہ بعض مثنویاں بھی ذکر شراب میں موجود ہیں اور ساقی نامہ تو نظم کی ایک مستقل صنف کا حکم رکھتا ہے، ساقی نامے اکثر شعراء نے نہایت کامیاب لکھے ہیں۔ اقبال نے ساقی نامہ میں بادہ و ساغر کے پردے میں فلسفۂ خودی کے اسرار نہایت خوبی سے پیش کئے ہیں۔ مضمون کی طوالت مزید تشریح کی مانع ہے۔

موجودہ اُردو ادب ایک نئے دور سے گزر رہا ہے، آئے دن نت نئے تجربے ہو رہے ہیں، دیکھیں ہمارے زندہ دل نوجوان شعراء خمریات کے مضامین کو کوثر و تسنیم۔ ساقی و پیمانہ۔ مستی و بیخودی تک ہی محدود رکھتے ہیں یا وہسکی و برانڈی، پیگ اور بار میڈ (Bar Maid) بدمستی اور بدکرداری سے ہم آغوش کر دیتے ہیں۔ [1]

(ظہیر الدین علوی)

---

[1] علوی صاحب کے مندرجہ بالا فاضلانہ مضمون میں قدیم و جدید شعرائے کرام نے ستائش شراب میں جیسی جیسی مضمون آفرینی کی ہے اس سے ہمارے نوجوانوں کو اس غلط فہمی میں نہ مبتلا ہونا چاہئے کہ وہ بادۂ گلرنگ کے شیفتہ تھے، بلکہ ان میں سے اکثر و بیشتر ایسے تھے جنہوں نے کبھی اس کی صورت بھی نہ دیکھی تھی، تاہم یہ لوگ بے وجہ خود گنہگار اور دوسروں کی ترغیب کا باعث ہوئے، مسرت ہے کہ جس طرح موجودہ زمانہ میں بہت سے مضامین جو قدیم شاعری میں زیب و زینت کا باعث تھے وہ ترک کر دیئے گئے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے مفید مضامین پر شعراء طبع آزمائی کرتے ہیں، اسی طرح شراب کی مدح و ستائش کا فرسودہ مضمون بھی ہماری شاعری کے عناصر سے یکسر خارج کر دیا جائے۔ اسلام نے شراب خوری کو رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ یعنی ایک ناپاک اور شیطانی فعل قرار دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ شراب کی مذمت اس سے زیادہ بہتر الفاظ میں نہیں ہو سکتی۔ شراب نہ صرف انسان کو خدا اور مذہب سے غافل کر دیتی ہے بلکہ [illegible] روزمرہ کے فرائض میں خلل انداز ہو کر زندگی اور ترقی کے [illegible] نظام کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ اگر مسلمان اپنے پچھلے قومی نقصانات کی تلافی کرنا چاہتے ہیں اور اپنی زندگی کو [illegible] ملک و ملت کی ترقی چاہتے ہیں تو انہیں اس ناپاک شیطانی عمل کے ذکر سے اپنے سارے نثر و نظم کے [illegible] کرنا چاہئے کیونکہ اس قسم کے اذکار نوجوانوں میں گنہگاری کی تحریک اور سیہ کاری کی ترغیب پیدا کرتے [illegible]

سید الطاف علی بریلوی

ان کا اندازِ مستی دیکھنے کے لیے "شکستِ توبہ" کا یہ [illegible] ملاحظہ ہو:

ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا
لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا

بے کیفیوں کے کیف سے گھبرا کے پی گیا
توبہ کو توڑ تاڑ کے تھرا کے پی گیا

سر مستیِ ازل مجھے جب یاد آ گئی
دنیائے اعتبار کو ٹھکرا کے پی گیا

سلطانِ رحمت تمام مری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

جوشؔ کے کلام میں بھی خمریات کا عنصر بہت نمایاں ہے، غزلوں کے اشعار پر شراب کے عنوان سے نظمیں موجود ہیں۔ ان کے یہاں شراب کی مستی صرف شراب ہی کی ہے اس کا خمار انھیں کسی کی چشمِ نیم باز کی یاد نہیں دلاتا بلکہ وہ اس نظریہ کے ماتحت شراب پیتے ہیں کہ "این دفتر بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ"

وہ شراب کو لذت بڑھانے والی شے سمجھتے ہیں۔ اس کی گرمی سے یا تنا متاثر نہیں اس کے نشے سے، جوشؔ اس دنیا میں پیرِ مغاں کی حکومت دیکھنا چاہتے ہیں۔ "چند جرعے" ایک کامیاب نظم ہے، اس میں انھوں نے ایک میخوار کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے، شراب گرم ہے۔ پہلا جرعہ پیتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ اندر سے دل گھبرا رہا ہے، خون میں تیزی رگوں میں ہلچل مچ گئی۔ خود پر بھروسہ ہوا اور اپنے اشعار کی داد خواہی ہونے لگی۔ دوسرا جرعہ پر وہ کیفیت طاری ہوئی کہ ہر شے جوان معلوم ہونے لگی۔ وہ عمر جو تیزی سے گزر چلی جا رہی تھی اک مرکز پر ٹھہرتی ہوئی معلوم ہوئی اور آہستہ آہستہ عقل کی وہ زنجیریں جس کشمکش میں اسیر کر رکھا تھا کچھ ڈھیلی پڑنے لگیں۔ بیہوشی اور ہوش میں ایک مستقل جنگ چھڑ گئی کبھی دنیا روشن معلوم ہوتی تھی اور کبھی تاریک۔ اب تیسرا جرعہ چڑھایا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک اُمنڈتا ہوا میخانہ کی طرف جا رہا ہے۔ شراب میں جوش پیدا ہو گیا۔ ہر قطرہ آفتاب معلوم ہونے لگا۔ زندگی کی میعاد بڑھ گئی اور موت کا خیال دل سے نکل گیا۔ مذہب کے خلاف بغاوت کی دوڑ گئی، اُس وقت نعوذ باللہ انسان خود خدا بن گیا۔ چوتھا جرعہ پیتے ہی آسمان نے زمین پر [illegible] شروع کر دیا۔ ہر شے رقصاں معلوم ہونے لگی۔ اسی کیفیت میں پانچواں جرعہ پی گئے تو [illegible] شکست سے خوشی حاصل ہوئی۔ طاقت کا یہ عالم ہوا کہ زمین و آسمان کو ایک [illegible] چلا اور آہستہ آہستہ جب شراب نے اپنا پورا قبضہ جما لیا تو یہ عالم ہوا کہ [illegible] [illegible] باقی [illegible]

مقبول حسین قریشی صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ (علیگ) وزیر داخلہ دولتِ خداداد بہاولپور کے سر
ہے۔ دربار بہاولپور اور ریاست بہاولپور میں جو شہرت اور مقبولیت جناب کرنل صاحب موصوف کو
حاصل ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔ اور گزشتہ چند سال میں آپ نے درگاہِ عالیہ قادریہ اُچ شریف
گیلانی کے سلسلہ میں جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں وہ کسی تعریف کی محتاج نہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ
جب آپ وہاں تشریف لے گئے اور جب اس علمی دولت کو کس مپرسی اور بربادی کی حالت میں
دیکھا تو آپ نے اس متاعِ بے بہا کو اس بربادی سے بچانے کا تہیہ کیا اور عالی مرتبت جناب صدر
اعظم دولتِ بہاولپور کی توجہ اس طرف منعطف کی۔ چنانچہ گزشتہ مارچ میں جب جناب ڈاکٹر
سید ہادی حسن صاحب صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، بہاولپور تشریف لے گئے تو جناب
کرنل صاحب موصوف کی کوشش اور عالی مرتبت جناب صدر اعظم کی خواہش پر آپ نے کتب خانۂ
مذکورہ کا معائنہ فرمایا اور اپنے ملاحظات ایک رپورٹ کی صورت میں پیش کئے۔ جس کے نتیجہ میں اُن
نسخوں کی تفصیلی فہرست مرتب کرنے کا کام راقم حروف کے سپرد کیا گیا۔ چنانچہ گزشتہ اگست اور
ستمبر میں میں نے وہاں جو کام کیا اُس کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

پیشتر ازیں کہ اس کتب خانہ کے متعلق کچھ عرض کیا جائے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اُچ شریف
گیلانی اور صاحبِ اُچ شریف گیلانی کے نامور خاندان کا مختصر تذکرہ بھی پیش کیا جائے، کیوں کہ
اس کے بغیر اس کتب خانے کی اصلیت اور اہمیت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

قصبہ اُچ شہر بہاولپور سے جنوب مغرب کی جانب پچاس میل کے فاصلے پر اُس مقام پر واقع
ہے جہاں سے اب دریائے گھارا سات میل کے فاصلہ پر بہتا ہے، اور پنجاب کے پانچ دریاؤں کا
باہم اتصال جو "پنج ند" کے نام سے موسوم ہے، اُچ سے سات میل کے فاصلہ پر ہے۔ زمانۂ قدیم
میں دریائے گھارا اُچ کے متصل بہتا تھا، البتہ ۱۲۳۳ھ میں دریائے گھارا میں جو طغیانی آئی، اُس نے
اُچ کی قابلِ دید عمارات کو تباہ کیا اور وہ تباہ شدہ عمارات آج بھی اُس طغیانی کی یاد دلا رہی ہیں
زمانۂ قدیم میں تو اس قصبہ کا نام صرف "اُچ" تھا لیکن اب اس کے تین نام اور تین حصّے ہیں۔

(۱) اُچ شریف بخاری (۲) اُچ شریف گیلانی اور (۳) اُچ موغلہ

(۱) اُچ شریف بخاری کی نسبت حضرت سید جلال الدین بخاری سے ہے جو ۶۴۱ھ میں وارد
اُچ ہوئے [illegible] اسلام میں گزار کر ۶۹۰ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کی
اولاد میں [illegible] اہل اللہ میں شمار ہوتے ہیں، مثال کے طور پر

کتب خانہ اُچ شریف گیلانی بہاولپور

از جناب ڈاکٹر راجہ غلام سرور صاحب ایم۔اے، پی ایچ ڈی، مسلم یونیورسٹی علی [illegible]
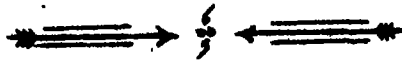
انقلابِ زمانہ سے جہاں ہمارے ہاتھ سے سلطنت کی دولت گئی وہاں علم کی دولت نے [illegible]
ہم سے رُوگردانی اختیار کی، اِس علمی دولت سے میری مراد عربی اور فارسی کے وہ قلمی نسخے [illegible]
جن میں سے بعض نسخوں کی تکمیل پر کاتبوں کی پوری پوری زندگیاں صرف ہوگئی ہیں اور [illegible]
یورپ کے متعدد کتب خانوں کے زینت بنے ہوئے ہیں، بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہو [illegible]
کے بعض کتب خانے انہی کی بدولت وجود میں آئے ہیں، اِسی متاعِ گراں بہا کے [illegible]
متعلق حضرت علامہ اقبال مرحوم و مغفور نے بھی اپنی ایک نظم میں اشارہ کیا ہے ؎

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی — ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے [illegible]
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اِک عارضی شے تھی — نہیں دنیا کے آئینِ مُسلّم سے کوئی [illegible]
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی — جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے [illegible]
غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن — کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا [illegible]

جو قلمی نسخے باہر والوں کی لوٹ سے بچے، اُن میں سے کچھ تو دستبردِ زمانہ کی [illegible]
ہو گئے، البتہ کچھ علم دوست اصحاب کی نظرِ عنایت سے برباد ہونے سے بچ گئے اور کچھ
بچا ہیں جو ابھی تک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔
کتب خانہ اُچ شریف گیلانی کے قلمی نسخے بھی جن کی ایک کثیر تعداد [illegible]
ابھی تک اہلِ علم کی نظروں سے پوشیدہ رہے، اُن کو گوشۂ گمنامی سے [illegible]
اور برباد ہونے سے بچایا گیا ہے، مرتب [illegible]

وسیع کاروبار [illegible] اور قابلیت کے ساتھ سنبھالے ہوئے ہیں۔ ابوالفضل مولوی محمد فقیر اللہ صاحب فاضل دیوبند، امام مسجد جامع اور صدر مدرس مدرسۂ عالیۂ قادریہ، کتب خانہ کے مہتمم ہیں، آپ کی ذاتِ گرامی کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ ریاست بہاولپور کے اس علاقہ میں جہاں کے باشندے بالعموم نورِ علم سے بے بہرہ ہیں، آپ کی مثال اس چراغ کی سی ہے جو تنہا ایک صحرا میں روشن ہو اور جس کے نور سے اس مقام کے اطراف منور ہوں۔ درگاہ عالیۂ قادریہ کے محاسب اعلیٰ مولوی بقا محمد صاحب کا شمار وہاں کے پرانے بزرگوں میں سے ہے۔ آپ کو فارسی زبان میں کافی دسترس ہے گفتگو عاقلانہ اور مدبرانہ ہے۔ نہایت قابل اور مردم شناس انسان ہیں۔

قطعی طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ کتب خانۂ اُچ شریف گیلانی کی بنیاد کب پڑی، لیکن قیاساً اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس کی بنیاد بھی بانیٔ اُچ شریف گیلانی نے رکھی ہوگی۔ کیونکہ وہ پہلے بزرگ تھے جنھوں نے اپنے سن ورود یعنی [illegible] کے بعد وہاں پر ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا اور اس جہالت کی تاریکی میں علم کی روشنی کو پھیلانا شروع کیا، اس سلسلہ میں اُن کو کتابوں کی ضرورت بھی یقیناً پیش آئی ہوگی اور انھوں نے قلمی نسخے فراہم کئے ہوں گے، لیکن افسوس ہے کہ اس زمانے کا کوئی نسخہ اب اس کتب خانہ میں موجود نہیں، چوں کہ بیشتر نسخے ضائع ہو چکے ہیں اس لئے اس بات کا قوی امکان ہے کہ اُس وقت کے نسخے بھی ضائع ہوگئے ہوں۔

جس طرح کہ رفتہ رفتہ مدرسہ نے ترقی کی اسی طرح کتب خانہ میں بھی کتابوں کا اضافہ ہوتا گیا اس امر کی شہادت اس بات سے ملتی ہے کہ مخدوم صاحبان نہ صرف یہ کہ خود اہلِ علم تھے، بلکہ اہلِ علم کے قدردان بھی تھے۔ اور اُن کے ہاں کاتب بحیثیت مستقل ملازمین کے بھی رہتے تھے، کیونکہ اب بھی ایسے متعدد نسخے موجود ہیں جو مختلف اوقات میں مختلف مخدوم صاحبان کے لئے لکھے گئے اور جن کے آخر میں خود کاتبوں کے قلم سے ایسی تحریریں ملتی ہیں جو میرے اس بیان کی شاہد ہیں، لیکن افسوس کہ جو دولت صدیوں میں جمع ہوئی تھی اُس کا ایک بڑا حصہ ضائع ہو چکا ہے اور اب جو نسخے موجود ہیں، اُنکی مجموعی تعداد پانچ سو کے قریب ہے۔ ان کے علاوہ اس کتب خانہ میں مطبوعہ کتابیں بھی ہیں جن کی تعداد ... کے قریب ہے۔

اب ہم ایک نہایت ہی اہم واقعہ کا ذکر کرتے ہیں جس کا اثر اس کتب خانہ پر پڑا۔ نواب امیر محمد [illegible] بہاولپور کے عہدِ حکومت ([illegible] تا [illegible]) میں اُچ شریف گیلانی [illegible] تھے، غلام شاہ کلہوڑہ والیٔ سندھ نے جو

حضرت شیخ جلال الدین جہانیاں جہانگیر جہاں گشت کا نام پیش کیا جاسکتا ہے۔ حضرت [illegible] کی سیاحت کی بدولت "جہانگیر جہاں گشت" کا لقب پایا۔ ان کے سیاحت نامہ کا قلمی نسخہ اُچ شریف گیلانی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اور [illegible]ھ میں انتقال فرمایا۔ اُچ ہی میں مدفون ہیں۔ ان دو بزرگوں کے مزارات زیارت گاہ خاص و عام ہیں، آپکی اولاد ابھی تک وہیں مقیم ہے۔

(۲) اُچ شریف گیلانی، کی نسبت حضرت شیخ محمد غوث قادری گیلانی سے ہے جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے تھے۔ [illegible]ھ میں اُچ میں وارد ہوئے۔ انھوں نے بھی اپنی تمام زندگی تبلیغ اسلام میں بسر کی اور ۹۲۳ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار بھی مرجع خلائق ہے۔ آپ کی اولاد اب تک وہیں قائم ہے۔

(۳) اُچ مغلہ کی نسبت سلاطین مغلیہ کے اُن حکام سے ہے جو اپنے اپنے عہد حکومت میں وہاں مقیم رہے۔

ہمارا تعلق "اُچ شریف گیلانی" سے ہے۔ حضرت شیخ محمد غوث قادری گیلانی، بانیٔ اُچ شریف گیلانی (جن کا ذکر اُوپر ہوچکا ہے) کے انتقال پر آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت سید عبدالقادر ثانی سجادہ نشین ہوئے اور اپنی تمام عمر خدمت اسلام میں گزاری۔ آپ کا شمار بھی اپنے زمانے کے مشہور اولیا اللہ میں سے تھا۔ ۹۴۰ھ میں وفات پائی اور اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔

موجودہ سجادہ نشین حضرت مخدوم حامد محمد شمس الدین عبدالقادر ثامن بانیٔ اُچ شریف گیلانی کے بیسویں سجادہ نشین ہیں۔ باوجود نوجوان ہونے کے پابند صوم و صلوٰۃ ہیں۔ نہایت خوش اخلاق عالی حوصلہ اور وسیع النظر انسان ہیں۔ ابھی کمسن ہی تھے کہ والد بزرگوار حضرت مخدوم حامد محمد گنج بخش سابع کے سایۂ عاطفت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئے۔ ابتدائی تعلیم عالی جناب خان بہادر کرنل مقبول حسن صاحب قریشی (جن کا ذکر اُوپر ہوچکا ہے) کی نگرانی میں حاصل کی۔ اب بھی جب کہ آپ کی عمر پچیس ۲۵ سال کی ہے، انگریزی زبان اور علوم متداولہ کے حصول کا شوق رکھتے ہیں، لیکن سجادگی اور خانہ داری کا کام اتنا زیادہ ہے کہ اِس شوق کا پورا ہونا مشکل نظر آتا ہے۔

میاں محمد ابراہیم خان صاحب برق بی۔ اے۔ [illegible]

نہایت زیرک [illegible]

بجا و پھر [illegible] زبان میں شعر کہتے تھے اور "سید" تخلص کرتے تھے۔ ایک دیوان اور چند کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ عمر کا اکثر حصہ گوشہ نشینی میں گزرا اور عمر بھر ریاضت، مطالعہ و تصنیف میں مشغول رہے۔ [illegible] میں وفات پائی، ان کی وفات پر ان کے تینوں بیٹے یکے بعد دیگرے سجادہ نشین ہوئے۔ تیسرے بیٹے حضرت مخدوم حامد محمد گنج بخش سابع عالم جوانی میں فوت ہوئے اور ایک کمسن بچہ اپنی یادگار چھوڑا، جو حضرت مخدوم حامد محمد شمس الدین عبدالقادر ثامن کے لقب سے سجادہ نشین ہوئے۔ جن کا ذکرِ خیر اُوپر ہو چکا ہے۔ کمسنی کی وجہ سے اُن کی وسیع جائیداد کا انتظام جناب کرنل مقبول حسن صاحب قریشی کی کوشش سے کورٹ آف وارڈس کے تحت میں آیا، لیکن کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ مختلف اوقات میں جو مدار المہام جائیداد کے انتظام کے لئے مقرر ہوتے رہے اُن میں سے کسی ایک نے بھی کتب خانے کی طرف توجہ نہیں کی اور یہ علمی دولت ایک بند کمرے میں کس مپرسی کے عالم میں پڑی رہی اور ایک عرصۂ دراز کے بعد جب جناب کرنل مقبول حسن صاحب قریشی کی نکتہ رس نگاہیں اِس دفینہ پر پڑیں تو انھوں نے اس کو وہاں سے نکلوا کر ایک ہوا دار کمرے میں رکھوا دیا۔ چنانچہ حضرت مخدوم صاحب کا بیان ہے کہ جب کتابیں اُس بند کمرے سے نکال کر دوسرے کمرے میں منتقل کی گئیں تو اُن کتابوں کی تعداد جو اُس وقت تک دیمک کی نذر ہو چکی تھیں اتنی زیادہ تھی کہ اُن کو ایک بڑی لاری میں بھرا گیا اور وہاں سے سات میل کے فاصلہ پر لے جا کر دریائے گھارا کی آغوش میں سونپ دیا گیا۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ جو دولت حضرت مخدوم صاحب کے بزرگوں نے کئی سو سال میں جمع کی تھی اُس کا خاتمہ چند برسوں میں کچھ اس طرح سے ہوا کہ آج صرف اُس کا ایک قلیل حصہ باقی رہ ہے۔ ع

قیاس کُن ز گلستانِ من بہارِ مرا

حضرت مخدوم صاحب نے جوان ہو کر جب اپنی جائیداد کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تو انھوں نے کتب خانہ پر بھی مہربانی کی نگاہیں ڈالیں اور چند الماریاں بنوا کر ان باقی ماندہ کتابوں اور بزرگوں کے تبرکات کو اُن میں کسی حد تک محفوظ کیا۔ لیکن چُوں کہ موجودہ کتب خانہ کا فرش بھی کچا ہے اس لئے یہ کتابیں اب بھی پُورے طور پر محفوظ نہیں ہیں۔ اگرچہ اب جناب کرنل صاحب موصوف کی ہدایت پر حضرت مخدوم صاحب نے اُن کی حفاظت کے لئے لوہے کی ایسی الماریاں مہیا [illegible] کیا ہے جن کے اندر کتابیں قطعی طور پر محفوظ رہ سکتی ہیں۔ لیکن جنگ کی وجہ سے ایسی [illegible] آسان نہیں

حضرت مخدوم صاحب کا ہم زلف اور والئی بہاولپور کا مخالف تھا، حضرت مخدوم صاحب کو والئی بہاولپور کے خلاف بھڑکایا، جس کے نتیجہ میں حضرت مخدوم صاحب نے سنہ ۱۱۵۰ھ میں اُچ شریف گیلانی کے گرد ایک مضبوط فصیل تیار کر وا کر قصبۂ مذکورہ کو ایک قلعہ کی صورت میں بدل دیا اور بہت سا سامان جنگ بھی فراہم کیا، اس قلعہ کے ایک دروازہ پر جو "ہاتھی دروازہ" کے نام سے موسوم ہے، ایک قطعہ کندہ ہے جس کے آخری مصرعہ سے "سن تعمیر" نکلتا ہے۔

لیکن باوجود اس قدر استحکام اور دوسرے انتظامات کے فرمانروائے رسوم بہاولپور کے عہد میں فریقین کے مابین کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ ان کے بعد نواب محمد بہاول خان عباسی ثانی والی چہارم بہاولپور کے عہد حکومت (سنہ ۱۱۸۶ھ تا سنہ ۱۲۲۴ھ) میں جب کہ حضرت مخدوم حامد محمد گنج بخش رابع معروف بہ "جنگ آور" اُچ شریف گیلانی کے سجادہ نشین تھے۔ طرفین میں پھر مخالفت کا شعلہ بلند ہوا اور سنہ ۱۲۱۴ھ میں فریقین کے درمیان ایک زبردست لڑائی ہوئی جس کا فیصلہ والئی بہاولپور کے حق میں ہوا اور حضرت جنگ آور اپنے شکست خوردہ مریدوں کے ساتھ سندھ میں چلے گئے اور سنہ ۱۲۲۱ھ میں بمقام گھوٹکی وفات پائی۔ البتہ ریاست کی فاتح فوجیں اُچ شریف گیلانی پر حملہ آور ہوئیں اور اس مقام کو فتح کرنے کے بعد فصیل کو گرا دیا۔ اگرچہ "ہاتھی دروازہ" اب تک باقی ہے، اس کے علاوہ حضرت جنگ آور کے محلات بھی اس حملہ سے نہ بچ سکے۔ اس وقت کی تباہ شدہ عمارات آج بھی اس واقعہ کی شہادت دے رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس حملہ کے سلسلہ میں کتب خانہ کو بھی نقصان پہونچا ہوگا اور اس ہنگامۂ گیر و دار میں بہت سے قیمتی نسخے یہاں سے غائب بھی ہو گئے ہوں گے۔

اِس واقعہ کے بعد سنہ ۱۲۳۰ھ تک یہ کتب خانہ کس مپرسی کی حالت میں رہا اور سنہ ۱۲۳۰ھ میں جب کہ حضرت مخدوم حامد محمد گنج بخش خامس ابن مخدوم حامد محمد شمس الدین خامس ابن حضرت جنگ آور سرکار بہاولپور کی اجازت سے اُچ شریف گیلانی تشریف لائے اور اپنے بزرگوں کی نعشوں کے صندوق بھی بانئ اُچ شریف گیلانی کے پہلو میں دفن کئے۔ انھوں نے از سر نو مکانات تعمیر کئے اور من جملہ دیگر اشیا کے اپنے آبا و اجداد کی اس علمی دولت کو بھی سنبھالا اور چون سال کی سجادگی کے بعد سنہ ۱۲۸۴ھ میں انتقال فرمایا۔

ان کے بعد ان کے بیٹے مخدوم حامد محمد شمس الدین سادس سجادہ نشین ہوئے [illegible]
چند کتابوں کے مصنف ہونے کے علاوہ [illegible] اور

نہیں بتا سکتے کہ تبرکات کے لحاظ سے کون کون سے نسخے نادر ہیں، کون کون سے کم یاب اور کون کون سے نایاب ہیں۔ اس کا فیصلہ تمام فہرست کے خاتمہ پر ہوگا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو اس کے متعلق ایک اور مقالہ آئندہ کسی صحبت میں آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔

(۱) سب سے پہلے ہم ایک ایسے قرآنِ پاک کا ذکر کرتے ہیں جو وہاں کے تبرکات میں شامل ہے، یہ کلامِ پاک کا ایک حصہ ہے جو خطِ کوفی میں لکھا ہوا ہے۔ صفحۂ اوّل پر ایک کاغذ کا ٹکڑا چسپاں ہے جس پر یہ لکھا ہوا ہے کہ یہ کلامِ پاک حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا ہے اوراق کی تعداد ۹۹ ہے، تقطیع میانہ ہے۔

(۲) کلامِ پاک کا ایک پُرانا اور بہت خوبصورت نسخہ ہے۔ تمام کلامِ پاک دوہرے سنہری حاشیہ کے اندر نہایت ہی اچھے خط میں لکھا ہوا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس قیمتی نسخے کے دو پارے شروع سے اور دو پارے اخیر سے افتادہ ہیں۔ اس کے اندر کئی اوراق پر بہترین سنہری نقاشی کی ہوئی ہے۔ اوراق کی تعداد ۱۰۶ ہے۔

(۳) کلامِ پاک کا ایک نہایت نفیس نسخہ ہے۔ تمام کلامِ پاک دوہرے سنہری حاشیہ کے اندر نہایت خوبصورت خط میں لکھا ہوا ہے۔ اس نسخہ کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ کاتب نے جس کا نام عبدالباقی ابن جان محمد خواہرزادۂ حاجی محمد حسین اللاہوری ہے۔ ایک پارہ ایک ورق پر ختم کیا ہے گویا تیس پارے تیس اوراق پر لکھے ہوئے ہیں، ہر صفحہ پر اکتالیس سطریں ہیں۔ خط اگرچہ خفی ہے لیکن صاف پڑھا جاتا ہے۔ سنِ کتابت درج نہیں۔ بارھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

(۴) کلامِ پاک کا ایک نہایت قیمتی نسخہ ہے، جو سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ چھوٹی تقطیع ہے اور ہر صفحہ پر گیارہ سطریں ہیں۔ تمام کلامِ پاک دوہرے سنہری حاشیہ میں نہایت پاکیزہ خط میں لکھا ہوا، پہلے اور آخری ورق پر بہترین سنہری اور رنگین نقاشی کی ہوئی ہے۔ اوراق کی تعداد ۰۰۰ ہے، کاتب کا نام محمد مراد اور سنِ کتابت ۱۱۴۰ ہجری ہے۔

(۵) کلامِ پاک کا ایک نہایت پاکیزہ نسخہ ہے، چھوٹی تقطیع ہے اور ہر صفحہ پر گیارہ سطریں ہیں، اس نسخہ کی خاص صفت یہ ہے کہ ہر صفحہ کا وہ حصہ جہاں اصل عبارت ہے تمام سنہری ہے، سطروں کے درمیان فارسی [illegible] ترجمہ سرخ روشنائی سے نہایت باریک خط میں لکھا ہوا ہے۔ تمام کلامِ پاک کے حاشیہ [illegible] رنگین گل کاری ہے۔ پہلے اور آخری ورق کے علاوہ سات اور اوراق پر بہترین [illegible] کی ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ باوجود اس انتہائی محنت کے نہ کاتب نے

بہتر ہے کہ آپ کی خدمت میں تفصیلی فہرست کی ترتیب اور چند قیمتی اور نادر قلمی نسخوں کا بیان
پیش کیا جائے یہ بیان کرنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ وہاں پہونچ کر میں نے کتابوں کو کس حالت میں پایا
کیونکہ اس کے بغیر آپ کو اس بات کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ اس سلسلہ میں مجھے ہی شدید گرمی کے
موسم میں کس قدر محنت کرنی پڑی اور کس مشکل سے میں نے یہ اہم کام سرانجام دیا۔ پروردگار عالم کی یہ
عین عنایت ہے کہ اس نے اپنے ایک ناچیز بندہ کو یہ علمی اور فنی کام کرنے کی ہمت عطا فرمائی۔

سب سے پہلا صبر آزما کام یہ تھا کہ قلمی اور مطبوعہ کتابوں کو الگ الگ کیا جائے۔ چنانچہ جب
یہ کام شروع کیا گیا تو عجیب عجیب چیزیں نظر سے گذریں۔ بہت سے نسخے تو غیر مجلد تھے۔ لیکن جو
نسخے مجلد تھے اُن کی جلد بندی میں کسی جلد ساز نے جو جو کرشمے دکھائے ہیں اُن کا بیان بھی دلچسپی
سے خالی نہیں۔ مثلاً ایک جلد میں اگر ایک قلمی نسخہ تاریخ کے متعلق ہے تو اس کے ساتھ نامی پریس
کانپور کی مطبوعہ جنتری باندھ دی گئی ہے۔ اگر ایک جلد میں ایک قلمی نسخہ تصوف کے متعلق ہے تو
اس کے ساتھ دہلی کے کسی دواخانہ کی فہرست ادویات جلد کی ہوئی ہے۔ اگر ایک جلد میں ایک قلمی
نسخہ مذہب کے متعلق ہے تو اس کے ساتھ لاہور کا کوئی مطبوعہ رسالہ جلد کر دیا گیا ہے۔ اسی سلسلہ میں
جب حضرت مخدوم صاحب کے روزانہ وظیفہ کا "دلائل الخیرات" کا نہایت ہی قیمتی قلمی نسخہ میری نظر
سے گزرا تو یہ دیکھ کر مجھے ہرگز تعجب نہیں ہوا کہ اس کے آخر میں شیخ فریدالدین عطار کی "تذکرۃ الاولیاء"
کے پہلے آٹھ اوراق سی دیئے گئے ہیں، غرضکہ اس قسم کی مثالیں بکثرت تھیں۔ یہ سب کچھ آخر کیوں تھا،
اس لئے کہ بے چارے جلد ساز کو جو جاہل مطلق تھا، کیا علم تھا کہ جلد بندی میں بھی کسی عقل و نظر کی ضرورت
ہوتی ہے، اُسے تو بس جن کتابوں کی تقطیع ایک سی نظر آئی، اُن کو ایک ہی جلد میں رکھ دیا۔ کتابیں
خواہ قلمی ہوں یا مطبوعہ، تاریخ کی ہوں یا تصوف کی، منظوم ہوں یا منثور، اُسے اس سے کچھ مطلب
نہیں، اس کو تو صرف جلد باندھنا ہے اور ایک ہی تقطیع کی ایک دو نہیں بلکہ تین چار کتابوں کو
یکجا کرنا ہے۔

اس مشکل سے رہائی پانے کے بعد دوسرا کام یہ تھا کہ عربی، فارسی، اُردو اور پنجابی یا ملتانی
زبان کے قلمی نسخوں کو علیحدہ علیحدہ کیا جائے اور پھر ہر زبان کے نسخوں کو مضمون وار تقسیم کرنے کے بعد
تفصیلی فہرست کی ترتیب شروع کی جائے۔ چنانچہ یہ کام بھی بخیر و خوبی انجام پایا۔

اب ہم اُن چند قلمی نسخوں کا ذکر کرتے ہیں جو فن کتابت اور [illegible]
[illegible] تمام کتابیں [illegible]

شاہزادوں کا استاد تھا۔ جنھوں نے خطِ نسخ کی تعلیم اس سے حاصل کی۔ چوں کہ کلامِ پاک کا یہ نسخہ خطِ جلی کا ایک بہترین نمونہ ہے اور عبدالباقی "یاقوت رقم" خطِ خفی میں مہارت رکھتا تھا اس لئے میرا خیال ہے کہ یہ نسخہ محمد عارف "یاقوت رقم خان" کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک خاص بات کا ذکر نامناسب نہ ہوگا کہ نہ صرف یہی ایک نسخہ ہے جس کے آخر میں کاتب کا نام اور سنِ کتابت درج نہیں بلکہ کلامِ پاک کے بعض اور بھی ایسے قیمتی نسخے ہیں جن پر نہ کاتب کا نام درج ہے اور نہ سنِ کتابت۔ تو کیا اس بات سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ ان کے کاتب باوجود اس جاں کاہ اور جاں سوز محنت کے اپنے نام کو پوشیدہ رکھ کر دنیاوی نام و نمود کے خواہاں نہیں تھے۔ اور وہ اس جاں گداز محنت کا معاوضہ صرف کلامِ پاک کے مالکِ حقیقی سے چاہتے تھے، جس نے اُن کو ایسے بے نظیر نسخوں کی کتابت کی طاقت بخشی اور تذہیب کا حوصلہ عطا فرمایا۔ میرے نزدیک یہ ایک حیرت انگیز امر ہے، جو گذشتہ زمانے کے مسلمان کاتبوں کی عالی ظرفی اور بے نیازی کی بہترین دلیل ہے۔ خدائے پاک اُن کو جزائے خیر دے۔

(۷) حدیث شریف کی مشہور کتاب "مشکوٰۃ المصابیح" کا نہایت اعلیٰ نسخہ ہے، جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ "مشکوٰۃ المصابیح" کے جامع کا نام شیخ ولی الدین ابوعبداللہ محمد ابن عبداللہ خطیب تبریزی ہے۔ جنھوں نے ۷۳۷ھ میں اس کی تکمیل کی۔ یہ نسخہ دوہرے سنہرے حاشیہ کے اندر دو قسم کے بہترین خطوں میں لکھا ہوا ہے، حاشیہ پر بہترین خفی خط میں شرح لکھی ہوئی ہے۔ پہلے ورق پر نہایت اعلیٰ سنہری اور رنگین نقاشی کی ہوئی ہے۔ ابواب کے عنوانات سُرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں، نسخہ کے آخر میں نہ کاتب کا نام ہے نہ سنِ کتابت، گیارہویں صدی ہجری کی معلوم ہوتی ہے۔ اوراق کی تعداد ۱۳۰۵ ہے۔

(۸) اس چھوٹے سے پاکیزہ نسخہ میں تین رسالے ہیں، جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:۔

(۱) چہل حدیث:۔ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چالیس حدیثیں ہیں جن کا ترجمہ فارسی نظم میں دیا گیا ہے۔ مختصر سا دیباچہ بھی فارسی میں ہے۔ اصل اور ترجمہ دوہرے سنہری اور رنگین حاشیہ کے اندر بہترین نستعلیق خط میں لکھا ہوا ہے۔ حدیثوں کی کتابت میں کاتب نے [illegible] کا خیال رکھا ہے کہ ایک حدیث سنہری ہے تو دوسری رنگین،

اپنا نام دیا ہے اور نہ سنِ کتابت۔ بارھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

(۶) اس کتب خانہ میں کلام پاک کا یہ ایک بہترین اور نہایت ہی بیش قیمت نسخہ ہے اس کا طول سوا اکیس انچ اور عرض ساڑھے تیرہ انچ ہے۔ تمام کلام پاک تین سنہری اور رنگین حاشیوں کے اندر جلی خط میں لکھا ہوا ہے۔ سطروں کے درمیان فارسی لفظی ترجمہ سرخ روشنائی سے لکھا ہوا ہے، اور حاشیہ پر حسین الواعظ کاشفی (متوفی ۹۱۰ھ) کی "تفسیر حسینی" لکھی ہوئی ہے جو ۸۹۷ھ میں میر علی شیر نوائی صدر اعظم ابو الغازی سلطان حسین میرزا تیموری والیٔ خراسان کے لیئے لکھی گئی تھی۔ پہلے اور آخری ورق پر اپنی قسم کی نہایت ہی خوبصورت سنہری اور رنگین نقاشی کی ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ تمام کلام پاک میں ہر صفحہ پر سنہری اور رنگین گلکاری ہے۔ یہ نسخہ کاتب اور نقاش کی کتابت اور نقاشی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ لیکن سخت افسوس ہے کہ اس بے نظیر نسخہ کا کچھ حصہ دیمک کی نذر ہو گیا ہے، کاتب اور نقاش، جس نے اپنی پوری زندگی اس پر صرف کی ہوگی، نہ اپنا نام دیا ہے نہ سنِ کتابت۔ البتہ صفحہ اوّل پر ایک کاغذ کا ٹکڑا چپاں ہے، جس پر یہ لکھا ہوا ہے کہ یہ نسخہ عالمگیری عہد کا ہے اس کا کاتب "یاقوت رقم" ہے۔ اور اس کا ہدیہ دس ہزار روپیہ ہے۔ اوراق کی تعداد ۲۴۲ ہے اور ہر صفحہ پر چودہ سطریں ہیں۔ "یاقوت رقم" کی تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ اس "خطاب" کے حامل دو شخص تھے:۔

پہلا شخص عبد الباقی المعروف بہ حدّاد و المخاطب بہ "یاقوت رقم" شاہجہانی حکومت کے آخری دور میں شاہزادہ اورنگ زیب کی دعوت پر ایران سے ہندوستان آیا اور یہاں پہونچکر اس نے اپنی خوشنویسی کے بہت سے اعلیٰ نمونے شاہزادے کی خدمت میں پیش کیئے۔ جس کے صلہ میں اسکو "یاقوت رقم" کا خطاب عطا کیا گیا۔ خوشنویسی کے مذکورہ نمونہ جات میں ایک کلام پاک کا نسخہ بھی تھا جو خطِ خفی میں تیس اوراق پر لکھا ہوا تھا۔ اس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ خطِ خفی میں بے نظیر تھا۔ اگرچہ عبد الباقی ایران واپس چلا گیا لیکن اپنے پیچھے ایسے بہت سے شاگرد چھوڑ گیا جنھوں نے اس کی طرزِ تحریر کو ایک عرصہ تک ہندوستان میں قائم رکھا۔

دوسرا شخص محمد عارف المخاطب بہ "یاقوت رقم خان" ہرات کا باشندہ تھا اور عبد الباقی کے شاگردوں میں سب سے بہتر تھا۔ عالمگیر کے زمانہ میں [illegible]

(۹) ایک چھوٹے سے خوبصورت نسخے میں عربی کا مشہور قصیدہ جو شرف الدین ابو عبداللہ محمد ابن سعید بصیری (متوفی ۶۹۴ھ یا ۶۹۶ھ) نے رسول مقبول کی مدح میں لکھا ہے۔ تمام قصیدہ دوہرے سنہری اور رنگین حاشیہ کے اندر بہترین خط میں لکھا ہوا ہے۔ پہلے ورق پر عمدہ سنہری اور رنگین نقاشی کی گئی ہے۔ اس نسخہ پر چار مہریں ہیں جن میں "سید حسن بخش حسینی ۱۱۹۲" لکھا ہوا ہے۔ اوراق کی تعداد ۱۹ ہے۔

(۱۰) بڑی تقطیع کا ایک نہایت ہی پاکیزہ نسخہ ہے۔ اس میں اسماء الہٰی، اسماء رسول مقبول، ایک منظوم عربی دعا، فارسی زبان میں رسول مقبول کا حلیۂ مبارک، اسماء حضرت علی ابن ابی طالب، اسماء حضرت فاطمۃ الزہرا، اسماء حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، اور تنبیہ الانام مصنفہ ابو محمد عبدالجلیل عظوم ابن شیخ محمد عظوم کا پہلا ربع۔ تمام نسخہ دوہرے سنہری اور رنگین حاشیہ میں بہترین جلی خط میں لکھا ہوا ہے۔ پہلے ورق پر نہایت اعلیٰ سنہری اور رنگین نقاشی کی ہوئی ہے۔ حاشیہ پر سنہری اور رنگین گلکاری ہے۔ افسوس ہے کہ اس بہترین نسخہ کے آخر میں بھی کاتب کا نام اور سن کتابت درج نہیں۔ بارھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔ اوراق کی تعداد ۵۸ ہے۔

(۱۱) بڑی تقطیع کا ایک بہت ہی پاکیزہ نسخہ ہے جس میں دعائیں لکھی ہوئی ہیں۔ اس نسخہ کی کتابت اور نقاشی بعینہ مذکورہ نسخہ کے مطابق ہے۔ کاتب کا نام اور سن کتابت درج نہیں۔ بارھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔ اوراق کی تعداد ۴۰ ہے۔ اس نسخہ پر دو مہریں ہیں، جن میں "سید حسن بخش حسینی ۱۱۹۲" لکھا ہوا ہے۔

(۱۲) ابو عبداللہ محمد ابن سلیمان الجزولی (متوفی ۸۷۰ھ) کی مشہور تصنیف "دلائل الخیرات" کا نہایت خوبصورت نسخہ ہے۔ اس نسخہ کا دیباچہ اور مصنف کی مختصر سوانح حیات فارسی میں لکھی ہوئی ہے۔ تمام نسخہ دوہرے سنہری حاشیہ کے اندر بہترین خط میں لکھا ہوا ہے، اور حاشیہ پر فارسی میں مختصر شرح دی ہوئی ہے۔ پہلے ورق پر نہایت خوبصورت سنہری اور رنگین نقاشی کی ہوئی ہے۔ کاتب کا نام اور سن کتابت درج نہیں، تیرھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔ اوراق کی تعداد ۱۳ ہے۔

(۱۳) بہت چھوٹی تقطیع کا ایک خوبصورت نسخہ ہے جس میں ابوالحسن علی ابن عثمان ابن علی [illegible] المعروف بہ داتا گنج بخش (متوفی ۴۶۵ھ) کی مشہور تصنیف

پہلے ورق پر بہت خوبصورت سنہری اور رنگین نقاشی کی گئی ہے۔

(ب) صد کلمہ :۔ حضرت علی ابن ابی طالب کے ایک سو کلمات حکیمانہ ہیں جن کا ترجمہ فارسی نظم میں دیا گیا ہے۔ اس کا مختصر دیباچہ بھی فارسی میں ہے۔ اس حصّہ کی کتابت اور نقاشی بھی اُن ہی اصولوں پر کی گئی ہے جن پر کہ حصّہ اوّل کی۔ مترجم کا نام محمد ابن عبد الجلیل العمری الرّشید الکاتب المعروف بوطواط ہے، جو اتسز خوارزم شاہ کا کاتب تھا۔

رشید الدین کے متعلق ایک لطیفہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ چوں کہ یہ شخص بہت ہی مختصر قد و قامت کا تھا اس لئے "وطواط" یعنی ابابیل کے نام سے مشہور ہوا۔ لیکن باوجود اس بہت ہی مختصر قد و قامت کے اُس کی زبان بہت تیز تھی، اور اُس کی تیزیٔ زبان کی وجہ سے بہت سے لوگ اُس کے دشمن ہوگئے تھے۔ ایک مرتبہ پادشاہ کے دربار میں کسی مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی، حضرتِ "وطواط" نے بھی جب زور زور سے چہکنا شروع کیا تو پادشاہ نے جس کے سامنے ایک بڑا قلم دان رکھا تھا اور جس کے پیچھے سے "وطواط" اُس کو نظر نہیں آتا تھا، مزاح کے طور پر کہا "یہ قلم دان میرے سامنے سے اُٹھا دو تاکہ یہ معلوم ہو کہ کون بول رہا ہے"۔ رشید الدین فی الفور کھڑا ہوگیا اور یہ جواب دیا۔ "آدمی اپنے جسم کے دو بہت ہی چھوٹے حصّوں کی بدولت آدمی ہے، یعنی اُس کا دِل اور اُس کی زبان"۔ یہ جواب سُن کر پادشاہ بہت خوش ہوا۔

اِس حصّہ کے آخر میں حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے ہیں :۔

تمت کلمۂ متبرکہ بدرالمحفوظِ سمرقند بتاریخ نہصد و ہفتاد و ہشت "

جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کاتب نے یہ نسخہ ۹۷۸ھ میں سمرقند میں لکھا۔ مذکورہ دونوں حصّوں کا کاتب ایک ہی ہے۔

(ج) چہل حدیث :۔ رسول مقبول کی چالیس حدیثیں ہیں، جن کا لفظی ترجمہ فارسی نثر میں دیا گیا ہے۔ اصل اور ترجمہ دوہرے اور سنہری اور رنگین حاشیہ کے اندر اچھے خط میں لکھا ہوا ہے، پہلے ورق پر درمیانہ درجے کی سنہری اور رنگین نقاشی کی گئی ہے۔ کاتب کا نام اور سن کتابت درج نہیں ہے، گیارھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔ کل اوراق کی تعداد ۲۱ ہے۔

مخالفینِ اُردو سے خطاب

ہند سے مٹ جائیگی اُردو خیالِ خام ہے!

(از حضرتِ دُعا ڈبائیوی)

ہندی ہیں، اُن کا، آپ کا، سب کا وطن خوبیٔ تقدیر سے پایا ہے کیا اچھا وطن
ساری دُنیا سے نرالا افضل و اعلیٰ وطن جس کی حسرت میں تڑپتا ہو جہاں ایسا وطن

جس نے دُنیا کا کُل مقصد سے دامن بھر دیا
انتہا یہ ہے کہ خود کو بھی حوالے کر دیا

جب سریر آرائے ملکِ ہند تھا شاہ جہاں اور کہا جاتا تھا یہ ہندوستاں جنت نشاں
غم نظر آتا نہ تھا ہر ایک دل تھا شادماں ہر مکاں گویا تھا اپنے دیس کا رشکِ جناں

افتراقِ باہمی گو اک قلم معدوم تھا،
مختلف سب کی زبانیں تھیں جدا مفہوم تھا

ایک کی بولی سمجھنی دوسرے کو تھی محال کاروبارِ زندگی مشکل تھا تا حدِ کمال
تاجدارِ ہند کو اس وقت یہ آیا خیال وہ زباں ایجاد ہو جس کی نہ ہو کوئی مثال

سہل ہو جس کا سمجھنا، بولنا آسان ہو
اس قدر سادہ ہو جس پر سادگی قربان ہو

کچھ لئے الفاظِ ہندی، کچھ مدد بھاشا سے لی کچھ تتبع فارسی کا، کچھ عرب کی پیروی
خوشہ چینی اس نے دُنیا کی ہر اک خرمن سے کی جس کا اُردو نام ہے وہ اس طریقے سے بنی

اس کو ہم سب نے بنایا یہ زباں ہے عام کی
مشترک تھے پر نہیں تخصیص کچھ اسلام کی

[illegible] اہلِ وطن اتنی وحشت کس لئے اُردو سے اے اہلِ وطن

کشف المحجوب" کا انتخاب ہے۔ کشف المحجوب تصوف کی سب سے پہلی کتاب ہے جس میں تصوف
کے علمی و عملی مسائل کو باقاعدگی کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ یہ نسخہ باریک نستعلیق خط میں لکھا ہوا ہے،
مرتب اور کاتب کا نام درج نہیں۔ آخری چند اوراق افتادہ ہیں۔ اس وجہ سے سنِ کتابت
معلوم نہیں ہو سکتا۔ گیارھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے، عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے
ہوئے ہیں۔ اوراق کی تعداد ۱۹۱ ہے۔ قدرے کرم خوردہ ہے۔

(۱۴) مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی (متوفی ۸۹۸ھ) کی مشہور تصنیف "شواہد النبوۃ" کا
بے نظیر نسخہ ہے۔ تمام نسخہ دوہرے سنہری اور رنگین حاشیہ کے اندر نہایت ہی اعلیٰ باریک نستعلیق
خط میں لکھا ہوا ہے۔ عنوانات اور عربی فقرے یا جملے نہایت ہی پاکیزہ خطِ نسخ میں لکھے ہوئے ہیں۔
کاتب نے ان کی کتابت میں اس اصول کو مدنظر رکھا ہے کہ ایک سنہری ہے تو دوسرا رنگین۔ حاشیہ
پر کہیں کہیں باریک خطِ نستعلیق میں کچھ شرح بھی تھی جو جلد ساز کی نظرِ عنایت سے نہیں بچ سکی اور
جلدبندی کے وقت کٹ گئی۔ اس بے نظیر نسخے کے آخر میں بھی کاتب کا نام اور سنِ کتابت درج نہیں
دسویں صدی ہجری کی معلوم ہوتی ہے۔ آخری صفحہ پر ایک تحریر ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ
یہ نسخہ شیخ فیضی فیاضی ملک الشعرائے دربارِ اکبری کے کتب خانہ میں تھا، اور اسی جگہ سن ۹۹۰ ہجری کا
بھی دیا ہوا ہے۔ فیضی کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اس کے کتب خانہ میں ۴۶۰۰ بہترین قلمی نسخے
تھے۔ اوراق کی تعداد ۲۶۷ ہے۔

(۱۵) مذکورہ بالا نسخہ کی طرح یہ بھی ایک نہایت اعلیٰ نسخہ ہے۔ اس نسخہ میں مولانا جامی
کی "شواہد النبوۃ" کا باب ششم جس میں ائمہ معصومین کی مختصر سوانح حیات ہیں، درج ہے۔ اس نسخہ
کا دیباچہ شواہد النبوۃ کے دیباچے سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اور صرف ایک دو مقام پر فرق ہے۔
معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی مولانا جامی کی ایک مستقل تصنیف ہے۔ یہ نسخہ بھی بہترین خطِ نستعلیق
میں لکھا ہوا ہے، عنوانات سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں، پہلا ورق غائب ہے، آخر کا
کچھ حصہ دیمک کی نذر ہو گیا ہے، لیکن آخری ورق موجود ہے جس پر کچھ تحریر تھا جو بعد میں کسی نے
سرخ روشنائی سے مٹا دیا ہے، ممکن ہے کہ اس مٹی ہوئی تحریر میں کاتب کا نام و سنِ کتابت
یا اس نسخہ کے متعلق کوئی اور خاص بات درج ہو [illegible]
[illegible] ممکن ہے
کہ [illegible]

سرور

قدیم دکھنی شاعری کے موضوعات

(از جناب نصیر الدین ہاشمی صاحب حیدرآباد دکنی)

اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ اُردو شاعری کے موضوعات پر حرف گیری کی جائے اور اُس کی تہی مائگی پر حقارت کی نظر ڈالی جائے، یا اس کو صرف عشقیہ شاعری کے باعث قابلِ اعتراض قرار دیا جائے، لیکن اب بھی ایک بڑے گروہ کی رائے یہ ہے کہ جدید موضوعات پر اُردو شاعری میں جو فکر کی جانے لگی وہ صرف مغربی خیالات کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

یہ خیال اس شاعری کے متعلق دُرست ہو سکتا ہے جو میرؔ کے زمانہ میں شروع اور حالیؔ کا دَور آنے سے قبل ختم ہوئی۔ مگر یہ تصور کر لینا کہ اُردو شاعری کی ابتدا ہی سے اس میں سوائے حسن و عشق کی داستانوں۔ گل و بلبل کے افسانوں۔ شاہد و ساقی کے تذکروں۔ ہجر و وصال کے قصّوں۔ معشوق کی بے وفائی۔ رقیب روسیاہ کے گلہ شکووں اور جھوٹی مبالغہ آمیز مدح و ستایش کے سوا کچھ نہیں تھا تو یہ دعویٰ حق بجانب نہیں ہو سکتا۔ قدیم اُردو یا دکھنی زبان کی شاعری کے جو شہ کار اب گوشۂ گمنامی سے باہر آرہے ہیں ان سے اب اس مفروضہ کی قطعی تردید اور اس خیال کا پورا ابطال ہوتا ہے۔

اس کو ثابت کرنے کے لئے آج سے تین چار سو سال پہلے کی اُردو شاعری کے موضوعات کا ایک مجمل تذکرہ مناسب متصور ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ اُردو شاعری کو اپنے موضوعات کے لحاظ سے کسی دوسری زبان سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

اُردو شاعری کی ابتدا

برسبیلِ تذکرہ اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ گو چند دکھنی نوجوانوں کی ہمت و سعی سے دکھنی ادب کا ایک بہت قابلِ قدر حصہ اب عام دسترس میں آگیا ہے مگر پھر بھی یہ امر بھی افسوسناک ہے کہ ہنوز اُردو زبان کی قدیم تاریخ پوری [illegible] اس لئے اب تک تحقیق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُردو شاعری کی [illegible] پہلا شاعر کون تھا اس وقت تک زبان و ادب کے جو نمونے دستیاب

[illegible]ِ نفرت کس نے اُردو سے اہلِ وطن ۔ ترکِ اُلفت کس لئے اُردو سے اے اہلِ وطن

جب خود اپنی ہی زبان کو ٹھکرا دو گے تم
پھر تمہارا کیا بھروسا کس کے کام آؤ گے تم

مسلم و ہندو کا جھگڑا کیوں ہے اس کے درمیاں جس کو سب سمجھیں وہی ہے ہند کی واحد زباں
ہر طرف چرچا ہے اس کا ہر جگہ اس کا بیاں ہیں زبانیں اور بھی لیکن کشش ایسی کہاں

تیرے صدقے موہنی بخشی ہے کیا یا رب اسے
اتنی نفرت ہے مگر پھر بولتے ہیں سب اسے

اے وطن والو تمہاری وہ شرافت کیا ہوئی پاس داری وہ کہاں ہے وہ حمیت کیا ہوئی
[illegible]کو دعویٰ تھا محبت کا محبت کیا ہوئی وہ نگاہِ مہر وہ چشمِ مروت کیا ہوئی

ہند سے مٹ جائے گی اُردو خیالِ خام ہے
اتنی نفرت پر بھی یہ مقبولِ خاص و عام ہے

چھوڑ دو اس سے تم اب نفرت نصیحت مان لو خوبیاں جو اس میں ہیں اچھی طرح پہچان لو
ہند کی واحد زباں اُردو ہے اس کو جان لو خوب اسے تحقیق کر لو خوب اس کو چھان لو

ہو نہیں سکتی تمہاری آرزو پوری کبھی
تم مٹا دو بھی تو اُردو مٹ نہیں سکتی کبھی

مرحبا اے میری اُردو اے سعلے مرحبا جن کی آنکھیں بند ہیں خوبی تری دیکھیں گے کیا
اس مپرسی کے خیالوں میں نہ ہو تو مبتلا تیرے سر پر ہے یقیناً سایۂ فضلِ خدا

ایک دن واحد زبانِ ہند تو ہونے کو ہے
آج اگر ناکام ہے کل سرخرو ہونے کو ہے

کاروبارِ زندگی میں ہر طرف تیرا ہے نام تیرے ہاتھوں ہے گھریلو زندگی کا انصرام
خدمت تو پھر بھی بہت ہیں دشمنی کی بھی آئی ہے کام انتہا یہ ہے کہ تجھ کو بولتے ہیں خاص و عام

تو حقیقت میں ہمارے جیتے جی کے ساتھ ہے
مختصر یہ ہے ہماری زندگی کے ساتھ ہے

[illegible] دکنی شاعروں کی نظم نگاری میں ان کا اثر صاف طور سے نمایاں ہونے لگا۔ خیالات خواہ کہیں باہر سے دکن آئے ہوں لیکن تاریخ اسلام کے ہر دور کی خصوصیت کے طور پر اسلام کی بنیادی تعلیمات اور عوام تک اس کے دل نشین اور سحر انگیز پیام کو پہنچانے کا کام بوریہ نشین مشائخ طریقت اور صاحبان حال و درویشوں نے پورا کیا ہے۔ اس لئے ناگزیر تھا کہ عوام کی زبان ہی کو وہ اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بناتے۔

ان وجوہ سے کئی دکھنی شعراء نے تصوف و سلوک کو اپنی نظم نگاری کا موضوع بنایا۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز۔ میراں جی شمس العشاق، شاہ برہان الدین جانم، شاہ برہان الدین اعلیٰ، قادر وغیرہ وہ پہلی ہستیاں ہیں جنھوں نے اس میدان میں کام کرنے کی بنیاد ڈالی۔ اور دکھنی زبان میں معرفت اور حقائقِ الٰہیہ کے نکات بیان کئے، ان کے بعد آنے والوں نے پہلی بنیاد پر پوری عمارت کھڑی کر دی۔ بحری، وجدی، امین وغیرہ کی مثنویوں میں تصوف و سلوک کا گویا پورا الف بیان ہو گیا ہے۔ اور اس کو خود تصوف کے ادبیات کا ایک قیمتی حصہ قرار دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ قدیم شعراء کے غزلوں کے دواوین میں بھی تصوف کا رنگ صاف صاف نظر آتا ہے۔ سلطان محمد قلی کی اکثر غزلوں میں بادۂ حافظ کی ہی دو آتشہ جھلکتی ہے۔ ولی اور سراج، باقر آگاہ شاہ ندیم اللہ وغیرہ کے دواوین میں بھی یہ روح برابر کارفرما ہے۔

رزمیہ شاعری

شہنامہ کے نقشِ قدم پر مابعد کی فارسی رزمیہ مثنویاں۔ خاورنامہ، سکندرنامہ وغیرہ مرتب ہوئیں۔ خاورنامہ کے مصنف ابنِ حسام کو فردوسی ثانی اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے شہنامہ کے جواب میں خاورنامہ مرتب کیا تھا۔

یہ مثنویاں دکھنی شاعروں کے لئے ایک اچھا ماڈل ثابت ہوئیں۔ اور انھوں نے اس موضوع میں بھی اپنی ذہانت کی خوب داد دی ہے۔ دکھنی شاعری میں رزمیہ مثنوی کی ابتداء خاورنامہ دکھنی سے ہوئی ہے۔ بیجاپور میں رستمی نے ۱۰۵۹ھ میں خدیجہ سلطان شہربانو کے حکم سے خاورنامہ ابن حسام کا ترجمہ دکھنی نظم میں کیا ہے۔ جو چوبیس ہزار شعر کی مثنوی ہے، کوئی شبہ نہیں [illegible] کا نام دست رس میں آ جائے تو کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر رستمی کو بھی [illegible] ہو جائے۔

[illegible] کی جنگی مہمات اور وہ شوقی نے تلی کوٹہ کے معرکہ

[illegible] کلیات [illegible] کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

نیچرل شاعری

نیچرل شاعری کے موضوع پر شمالی ہند کے قدیم اساتذہ نے بہت کم توجہ کی ہے جو حقیقت میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ قدما کے دور میں نہ تو میر اور مرزا سودا نے اور نہ مصحفی اور انشا نے توجہ کی۔ اور نہ ناسخ اور آتش کو اس کا کوئی ذوق تھا۔ ذوق، مومن، داغ، امیر کی شاعری بھی صرف غزل سرائی کا دوسرا نام ہے۔ اس طور پر عام طور سے یہ خیال قائم ہو گیا کہ جدید اردو شاعری میں نیچرل شاعری کی بنیاد خالص مغربی اثرات اور مغربی کلام کے مدنظر عالم وجود میں آئی ہے۔

یہ خیال اس حد تک بالکل درست ہے کہ شمالی ہند کی اردو شاعری میں نیچرل شاعری کا سُر مغربی مضراب کا رہینِ منت ہے۔ لیکن یہ خیال دکھنی شاعری کی حد تک صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قدیم دکھنی شعرا صرف غزلوں کی پامال زمین اور زلف و گیسو میں اُلجھ کر عشق و عاشقی کے فرسودہ خیالات کی ترجمانی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ انھوں نے نیچرل شاعری کے میدان میں بھی جولانی کی ہے۔ ان کے کلام ایسے بیسیوں نمونے پیش کئے جا سکتے ہیں جو بہتر سے بہتر انداز میں نیچر کی ترجمانی کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہم صرف سلطان محمد قلی کے کلیات کا تذکرہ کرتے ہیں جس میں کئی ایسے عنوان ہیں جو نیچرل شاعری کے تحت بیان کئے جا سکتے ہیں۔ اس میں بارش اور موسم سرما پر کئی نظمیں ہیں۔ موسم بہار، نوروز، بسنت پر سلطان نے کئی نظموں میں اپنی بلند خیالی کی داد دی ہے۔ باغوں کی سر سبزی اور شادابی۔ تالابوں اور نہروں کے صاف شفاف پانی نے اس کے تخیل کو ایک سے زیادہ وقت اُبھارا ہے۔ میوؤں۔ ترکاریوں کی تر و تازگی نے اس سے شعر کہلوائے ہیں اس کے ساتھ ہی اُس نے غریبوں کی زندگی عوام کے معتقدات، کھیل تماشوں اور بازارات وغیرہ جیسے عام شرقی امور کو بھی شعر کہنے کا موضوع بنایا ہے۔

سلطان محمد قلی کے علاوہ دوسرے شعرا نے بھی اپنے کلام میں نیچر کے موضوع کے کئی عنوانوں پر شعر کہے ہیں۔ سلطان علی عادل شاہ نے علی و اد محل، اس کے باغ اور حوض کی تعریف میں ایک [illegible] قصیدہ لکھا ہے۔ جس میں باغ کی سر سبزی اور شادابی اور انواع و اقسام کے پھولوں [illegible] کے پھلوں کی فراوانی، حوضوں میں پانی کی روانی کی جو دلکش روداد لکھی [illegible]

[illegible] موسم سرما پر جو قصیدہ لکھا ہے وہ اپنے زورِ بیان کے لحاظ

کی روئداد رزمیہ مثنویوں میں لکھی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ فوجوں کی روانگی، ان کی ترتیب، واقعاتِ جنگ، صف آرائی کا حال، حملے کے طریقے، لڑائی کا سماں، بہادروں کا مقابلہ، سورماؤں کی جنگ، باجوں کی آواز، توپوں کی گرج، ہتیاروں کی جھنکار، شب خونی حملہ کی صراحت، دشمن کی فراری، لوٹ مار، قلعہ پر چڑھائی، اس کا محاصرہ، سپاہیوں کی گرفتاری، وغیرہ امور کی کتھا اس انداز میں لکھی ہے کہ گویا بیان ہو۔

غرضکہ رستمی کا خاور نامہ، نصرتی کا علی نامہ، شوقی کا فتح نامہ، نظام شاہ غضنفر کا جنگ نامہ عالم علی خاں وغیرہ رزمیہ مثنویوں کے شہ کار ہیں۔ ان کے علاوہ ظفر نامہ لطیف، جنگ نامہ سیوک وغیرہ بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ غواصی اور ابن نشاطی وغیرہ نے بھی اپنی عشقیہ مثنویوں میں برسبیلِ تذکرہ رزمیہ حالات نظم کئے ہیں۔

اس موقع پر سلطان علی عادل شاہ شاہی کی مثنوی "خیبر نامہ" [illegible] ذکر بھی ضروری ہے سلطان نے جنگِ خیبر کے صحیح حالات نہایت عمدگی سے نظم کئے ہیں۔ اس کی یہ مثنوی کلیات میں شامل ہے۔ حضرت علی اور مرحب کی لڑائی کا حال دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ مرحب کا لڑائی کے لئے تیار ہونا، ہتیاروں سے آراستہ ہونا، جنگ کے لئے نکلنا، دو زبردست بہادروں کے مقابلہ کرنے کا حال دلکش انداز میں لکھا ہے۔

تاریخی موضوع

تاریخ اور سوانح کے لئے نظم سے زیادہ نثر موزوں ثابت ہوئی ہے لیکن موزوں طبع اس کو بھی نظم میں بیان کر کے لذت گیر ہوتی ہے۔ ہماری دکنی شاعری میں اس قسم کا ذخیرہ بھی موجود ہے۔

نصرتی کا علی نامہ اور تاریخ اسکندری۔ مومن کا اسرارِ عشق اور رشیدائی اعجاز احمد، باقر آگاہ کی ہشت بہشت وغیرہ اس عنوان کی مثنویاں ہیں۔

نصرتی نے علی نامہ میں تاریخ اور ادب کو جس طرح آمیز کیا ہے وہ اس کی سحر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ تاریخ اسکندری میں سکندر عادل شاہ کی سوانح بیان کی گئی ہے [illegible]

[illegible] سید [illegible] کے حالات نظم کئے ہیں [illegible]

نے [illegible]

[illegible]

شاعری

[illegible] دکنی شاعری [illegible] فقیروں اور صاحب حال درویشوں کے حجروں اور خانقاہوں میں پرورش پاتی رہی اور اس کی وجہ سے تصوف اور اخلاق ہماری شاعری کا ایک اہم موضوع بن گیا اور اسی طرح وہ پادشاہوں اور امیروں کے بلند و بالا قصروں، ذی شوکت نشت ایوانوں میں بھی پروان چڑھتی رہی۔ اس لئے ناگزیر تھا کہ مدحیہ شاعری وجود میں نہ آتی۔ دکنی پادشاہ نہ صرف بلند پایہ اور نازک خیال شاعر ہوئے ہیں بلکہ انھوں نے اپنی داد و دہش سے شعرائے اردو کی سرپرستی بھی فرمائی ہے۔ اس سے قطع نظر جہاں بادشاہت اپنے پورے لوازم کے ساتھ حکمرانی اور کامرانی کا ڈنکہ بجائے۔ وہاں بادشاہ کو خوش کرنے والوں یا یہی بات یہ کہ خوشامد کرنے والوں کا وجود بھی ضروری ہے۔ اس طرح اور جگہ کی مانند دکنی شعرا نے بھی قصیدہ گوئی میں پوری مہارت دکھائی ہے۔

سلطان محمد قلی، سلطان عبداللہ، سلطان علی عادل شاہ، ظاہر ہے کہ اپنی تعریف آپ نہیں لکھ سکتے تھے۔ اس لئے انھوں نے پیغمبر آخرالزماں علیہ السلام اور امام اعلیٰ مقام کی مدح و منقبت میں اپنے تخیل کی پرواز دکھائی ہے۔ نصرتی نے بادشاہ کی تعریف کا حق ادا کیا ہے۔ یہ قصائد نہ صرف خوبی تمہید، حسن گریز، مدح حسن اور دعائے خیر پر ختم ہوتے ہیں بلکہ ان میں واقعہ نگاری کا بھی اچھا خاصہ حق ادا کیا گیا ہے۔ خصوصاً نصرتی کے قصیدے واقعہ نگاری کے عمدہ مرقع ہیں۔ نصرتی نے اپنے قصیدوں میں بادشاہ کی مدح ہی نہیں کی ہے بلکہ واقعاتِ جنگ کو بھی حسن و خوبی اور عمدگی سے بیان کیا ہے اور بلاشبہ حقیقت نگاری کی ہے۔

قصیدوں میں تشبیہ کی ندرت، استعاروں کی جدت، خیالات کی بلندی، مضامین کا طمطراق، الفاظ کی شوکت، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو زندگیٔ جاوید کی مستحق ہیں۔

افسوس ہے کہ دوسرے دکنی شعرا کے قصیدے اب تک نہیں ملے ہیں، متداول تاریخوں سے تو پتہ چلتا ہے کہ وجہی۔ غواصی۔ رستمی۔ شوقی وغیرہ سب نے بیسیوں قصیدے لکھے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ اب سب ناپید ہیں۔ زمانۂ مابعد میں جو قصیدے دکن میں لکھے گئے ہیں ان کے متعلق ہم نے تفصیل سے ایک علحدہ مضمون میں روشنی ڈالی ہے جو مقالاتِ ہاشمی میں شایع ہو چکا ہے۔

نثر

[illegible] دکنی نثر کے سلسلے میں ہمارے کئی مضمون مقالاتِ ہاشمی میں شامل ہیں جن میں [illegible] اس موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے یہاں صرف اس قدر بتانا کافی ہے کہ جس [illegible] نے قصیدہ کی صورت اختیار کی وہاں ان سے

سے خاص حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے اپنی مثنوی قطب مشتری میں منظر نگاری کا جو اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے وہ تعریف کے لائق ہے۔

روزمرہ معاشرت

عصر حاضر میں روزمرہ معاشرت پر بھی شعرا کا اظہار خیال کرنا ایک مسلمہ امر ہے۔ اور یہ بھی جدید مغربی خیالات کا پرتو سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نیچرل شاعری کی طرح روزمرہ معاشرت پر بھی قدیم دکھنی شاعری میں اچھی اچھی نظمیں مل سکتی ہیں۔

اگر ہم صرف سلطان محمد قلی کے ہی کلام کو لیں تو ہم کو روزمرہ معاشرت کے کئی عنوانوں پر نظمیں دستیاب ہوتی ہیں۔ ہر عنوان پر نئے نئے انداز میں سلطان نے شعر نہیں کہے ہیں کہہ اقتباس نی ہے۔ مثلاً سالگرہ، عید میلاد النبیؐ، عید بعثت نبیؐ، مجلس شب معراج، عید مولود علیؑ، عید غدیر، محفل شب برات، عید الفطر، عید الضحیٰ، شادی، بیاہ، رسومات شادی، شاہی قصر و ایوان وغیرہ۔

سلطان محمد قلی کے علاوہ ظل اللہ، علی عادل شاہ، نصرتی، ابن نشاطی، شوقی وغیرہم نے کامیابی سے روزمرہ پیش آنے والے واقعات اور حالات پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے شعرا نے جو عشقیہ مثنویاں لکھی ہیں ان میں بھی شادی بیاہ، ضیافت وغیرہ کے عنوانوں پر اپنی نزاکتِ فکر، نزاکت خیال اور لطافت بیان کو پوری طرح نمایاں کیا ہے۔

اخلاقی شاعری

اخلاق اور موعظت کا میدان بھی فارسی شاعری میں ایک سیر حاصل موضوع ثابت ہوا ہے۔ گلستان، بوستان، حدیقہ سنائی وغیرہ جیسے شاہکار دکھنی شعرا کے لئے ایک اچھا نمونہ ثابت ہوئے۔

دکھنی شعرا میں رازی کی مثنوی تحفہ ۱۰۴۵ھ تا حال معلوم شدہ اخلاقی مثنویوں کا پہلا نمونہ ہے۔ اسی زمانہ کی دوسری مثنوی پند نامہ شغلی ہے۔ ان مستقل مثنویوں کے علاوہ اخلاقی عنوانوں پر بیسیوں نظمیں مل سکتی ہیں۔ مثلاً صبر و شکر، قدر دوست، احسان مندی، ایفائے عہد، نیکی و بدی، وفاداری، مضرت غرور و فکر، حب وطن، حسن سلوک، وغیرہ ایسے عنوان ہیں جن پر ہاشمی، قطبی، عیشی، غواصی، طبعی، نصرتی، ولی، وغیرہ نے کافی طور سے خیال آرائی کی ہے۔

اس کے علاوہ دکھنی شعرا کے دواوین میں اخلاقی ابواب [illegible] راستی، توکل، قناعت [illegible] [illegible]

[illegible]

طبعی کی [illegible] عصمت علی کی عبادت، مشفقی کا قصہ تمیم انصاری وغیرہ نظر انداز نہیں کیجا سکتی۔

ان غزلوں کے علاوہ بہ حسن و عشق کی پر کیف و سرور داستانیں ہیں۔ دکھنی شعرائنے غزلوں کا میدان بھی اچھوتا نہیں چھوڑا تھا۔ اگرچہ موجودہ ذخیرہ کے لحاظ سے ولی کے پہلے غزلوں کا سرمایہ مثنویوں کے مقابل نہایت قلیل ہے لیکن جو کچھ ذخیرہ ملا ہے اس سے اس امر کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دکھنی شاعروں نے اظہار عشق میں بھی کمی نہیں کی۔ اردو کے شعرا نے جو سرمایہ غزل گوئی کا عام طور سے فراہم کیا ہے اس کے مدنظر یہ خیال درست ہے کہ شعرائے اردو کا معشوق فرضی ہوتا ہے اور پھر اس کی مبالغہ آمیز طور سے جو تعریف کیجاتی ہے وہ حقیقت سے دور اور اصلیت کے منافی ہوتی ہے۔

لیکن دکھنی شعرائنے جو غزل سرائی کی ہے اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اصلیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ظاہر ہے کہ سلاطین کے محل سراؤں اور شاہی قصر و ایوان میں محبوبی اور رعنائی کے مجسم پیکروں کی کمی نہیں تھی۔ خصوصاً سلطان محمد قلی، اور علی عادل شاہ کی رنگین مزاجی اور عاشقانہ طبیعت کے باعث نہ صرف شاہی کوشک و ایوان بلکہ خود شہر گولکنڈہ اور بیجاپور حسن و رعنائی کے مرکز بن گئے تھے اس لئے شعراء کو اپنی غزلوں میں حقیقت نگاری کیلئے فرضی معشوق پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

خاتمہ

المختصر دکھنی شعرائنے مختلف نہج پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی شاعری کے موضوع ہمہ گیر رہے ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو کی تصویر کھینچی ہے۔ اگر عشق کی روئداد میں حسن و رعنائی کا اظہار کیا ہے تو وہیں میدان جنگ کی دار و گیر کا صحیح نقشہ اور مرقع بھی پیش کر دیا ہے۔ اگر ان کے کلام میں تصوف اور عرفان جلوہ گر ہے تو وہیں انھوں نے فلسفہ کو بھی نہیں چھوڑا ہے۔ گھریلو زندگی کی روزمرہ واقعات کی حکایت بیان کی ہے تو مناظر قدرت کی دل نواز سحر طرازیاں بھی ان کے یہاں ملتی ہیں۔ تاریخ و سوانح پر بھی انھوں نے اظہار خیال کیا ہے پھر اخلاق و پند میں بھی اپنے کلام کو یادگار بنا ڈالا ہے۔

دکھنی شعرائنے اپنی دو تین سو سال کی محنت و کاوش کا جو عظیم الشان ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ اس کی حفاظت اور ان سے کام لینا اب آپ کا کام ہے۔ ان کی شاعری میں ایسے ایسے جواہر پارے موجود ہیں جن کا آجکل کی شاعری میں ملنا دشوار ہے۔ ان کے خیالات کو لینا اور موجودہ زبان میں ان کو تبدیل کر کے اہل ملک کے سامنے پیش کرنا آپ کا کام ہے۔ آپ نئی دنیا اور پرانی دنیا کو ملا کر ایک ایسی دنیا بنا سکتے ہیں جس کی اس وقت سب کو ضرورت ہے۔ فقط

نصیر الدین ہاشمی

جذبات حسرت وغم نے مرثیہ کی صورت اختیار کی۔ قدیم دکنی شعرا میں صرف مرثیہ گو شعرا موجود ہیں جنھوں نے سوا مرثیہ کے کسی اور موضوع پر طبع آزمائی نہیں کی بلکہ دوسرے شعرا نے بھی اس عنوان پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے۔

اول الذکر گروہ میں مرزا، ہاشم علی، امامی، کاظم وغیرہ کے نام پیش پیش ہیں۔ اور آخر الذکر میں سلطان قلی، وجہی، غواصی، سلطان عبداللہ، نصرتی، لطیف وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں ان کے کلام میں بہتر سے بہتر مرثیے ملتے ہیں ان شاعروں نے مختلف عنوانوں پر مرثیے لکھے ہیں مثلاً اصغر کا ماتم، قاسم کی شادی، شہربانو کا الم، بے کسی زینب، مسافر قیدی، ظلم دشت کربلا، اصغر کی ماں، الوداع وغیرہ ہاشم علی، غلامی، مرزا، ذوقی، رضی ندیم، اشرف، ذوحی، نظر وغیرہ کے مرثیے اپنے سوز وگداز رنج والم کے لحاظ سے قابل قدر ہیں۔

ان مرثیوں کے علاوہ دکنی شاعروں نے شہادت کے موضوع پر مستقل شہادت نامے بھی لکھے ہیں۔ مثلاً ولی ویلوری کا روضۃ الشہدا۔ عبداللہ کینہ کی در مجالس۔ عطا کی دہ مجلس وغیرہ دہ مجلس کے نام سے تو کئی مثنویاں لکھی گئی ہیں جن میں واقعاتِ کربلا کو نظمایا گیا ہے۔

عشقیہ شاعری

بالآخر مجھے عشقیہ شاعری پر بھی کچھ لکھنا ضروری ہے۔ جس وقت دکن میں اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ اس وقت فارسی شعرا کے تین طبقے گزر چکے تھے۔ رودکی، اسدطوسی، فردوسی، خاقانی، انوری، نظامی، سعدی، اور حافظ کا دور ختم ہوچکا تھا۔ ان کی مثنویاں اور غزلیں ایران سے نکل کر ہندوستان اور دکن تک پہونچ گئی تھیں اور خود ہندوستان میں خسرو، حسن، ظہوری اور کلیم کی زمزمہ خوانی فضا میں گونج رہی تھی۔ ان لوگوں کے کلام نے جو حسن وعشق کی روئداد سے لبریز اور محبت والفت کی داستان سے مملو تھا۔ شاعرانِ دکن کے لئے ایک رہبر اور رہنما کا کام دیا۔ اسی کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے اپنی اپنی مثنویاں لکھیں اور پھر فارسی مثنویوں کو دکنی قالب میں بدل کر اس عمدگی سے پیش کیا کہ وہ گویا ان کی اپنی تصنیف ہو گئی۔

اچھی مثنویوں میں دکنی عہد کے نظامی کی مثنوی کے بعد بیجاپور اور گولکنڈہ میں [illegible] کی قطب مشتری، [illegible] کی چندر بدن ومہیار، جنیدی کی ماہ پیکر، خاص طور سے قابل ذکر ہیں [illegible] اردو میں رنجک کی [illegible] مثنوی [illegible] غواصی کی سیف الملوک [illegible]
[illegible]

دیا ہوا تھا۔ اس [illegible] لقب اختیار کرنے کا دستور ہوا۔ چنانچہ ہر خلیفہ کا لقب کچھ نہ کچھ رہا۔ البتہ از منۂ سابقہ کے مقابلہ میں ایک فرق یہ رہا کہ ہر خلیفہ کا لقب ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ دوسرے ہر لقب میں نسبت یا تو خدا سے رہتی تھی یا دین سے۔ اس میں اغلباً خدا کی خوشنودی اور برکت مقصود ہوگی۔ تاکہ خدمتِ خلافت کے دینی اہمیت میں اور اضافہ ہو جائے۔ نسبت کی اس اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اگر یہ سوال کیا جائے کہ خلافت کے منصب کو اصلی صورت و شکل میں کس نے پیش کیا تو یقیناً عمر بن عبد العزیز خلیفۂ دمشق کے علاوہ اور کوئی مثال نہیں مل سکتی ہے۔ فی الحقیقت منصب خلافت ملوکیت اور شہنشاہیت سے بالاتر چیز تھی۔ چنانچہ حضرت سلمان فارسی سے روایت منقول ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفۂ دوم نے نے سوال کیا "آیا میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ" حضرت سلمانؓ نے جواب دیا کہ "اگر آپ مسلمانوں سے مالگزاری وصول کر کے غیر حق پر صرف کر دیتے ہیں تو آپ بادشاہ ہیں، ورنہ خلیفہ" اسی زمرہ کی دوسری روایت حضرت سفیانؓ بن ابو العوجا سے منقول ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "واللہ میں نہیں سمجھتا ہوں کہ میں خلیفہ ہوں یا بادشاہ۔ پس اگر میں بادشاہ ہوں تو یہ بہت سخت بات ہے" جواب دیا گیا کہ "اے امیر المومنین دونوں میں فرق ہے۔ فرمایا" وہ کیا" عرض کیا گیا "خلیفہ حق کے خلاف نہ لیتا ہے اور نہ دیتا ہے اور آپ بحمد اللہ ایسے ہی ہیں۔ بادشاہ لوگوں کو مجبور کرتا رہتا ہے اور ایک سے لیکر دوسرے کو دے دیتا ہے"۔

بہر حال خلفاء عباسیہ نے بھی مامون کے عہد تک نہ خود کوئی لقب اختیار کیا اور نہ دوسرے امیروں یا وزیروں کو کوئی خطاب یا لقب دیا۔ ۲۱۸ھ میں مامون کے مرنے پر جب اس کا بھائی ابو اسحٰق محمد بن ہارون الرشید تخت خلافت پر بیٹھا تو اس نے سب سے پہلے معتصم باللہ کا لقب اپنے لئے اختیار کیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ایسا چلا کہ نہ صرف خلفاء بنو عباس نے اپنے لئے نئے نئے بامعنی القاب اختیار کئے بلکہ بحیثیت خلیفۃ المسلمین کے دوسرے ملکوں کے اسلامی بادشاہوں اور امراء کو بھی خطابات سے مالا مال کیا جو ان بادشاہوں اور امیروں نے نسلاً بعد نسل [illegible] صرف یہی نہیں بلکہ بنو عباس کی تقلید میں اندلس کے بنو امیہ، مصر کے [illegible] مغرب [illegible] کے بربری قبائل کے خود مختار امراء و سلاطین نے امیر المومنین

از مولانا محمد ابرار حسین صاحب فاروقی ایم۔ اے (علیگ)

تمہید بادشاہوں کا لقب اختیار کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ چنانچہ ہر ملک اور ہر قوم کی تاریخ اس بات کو بتاتی ہے کہ ان کے بادشاہوں نے نہ صرف اپنے لئے القاب تجویز کئے بلکہ ان کو اپنے گھرانے کے لئے مخصوص کر گئے۔ مثلاً ایران میں کسریٰ۔ مصر میں فرعون۔ روم میں قیصر حبش میں نجاشی [illegible] میں زار۔ چین میں فغفور۔ جاپان میں میکاڈو ہی حکمران رہے۔ اور جہاں جہاں وہی گھرانا اب تک حکمراں ہے یہی لقب چل رہا ہے۔

یہ القاب کیوں؟ اور کب سے تصنیف ہوئے؟ اور ان کے معنی کیا ہیں؟ یہ ایک طویل بحث ہے جس پر کسی آئندہ موقع پر روشنی ڈالی جائے گی۔ لیکن لفظ قیصر کے لئے ایک تاریخی لطیفہ کا اظہار خالی از دلچسپی نہیں ہے۔ چنانچہ بقول ابو الفداء:۔[1]

"اگسٹس شہنشاہ روم (اٹلی) کو قیصر لقب دیا گیا۔ اس کے معنی "پھٹے ہوئے" کے ہیں۔ اس لئے کہ یہ خود نہیں پیدا ہوا تھا۔ بلکہ مرنے کے بعد اس کی ماں کا پیٹ چاک کر کے اس کو نکالا گیا۔ اسی لئے اس کا لقب قیصر ہوا۔ جو بعد میں تمام شاہانِ روم کا لقب ہوا۔"

اسی طرح سے جاپانی لفظ میکاڈو کے لفظی معنی "بابِ عالی" کے ہیں۔ جس میں اظہار بلندی مقصود ہے۔ بہرحال یہ وہ دستور ہے جو ماقبل التاریخ سے چلا آ رہا ہے۔

اسلامی سلطنتوں کے وجود میں آنے کے بعد دمشق بنو امیہ اور متاخرین میں خلفائے آلِ عثمان نے سوائے اپنے خاندانی اور قبائلی ناموں کے اور کوئی شاہانہ لقب اختیار نہیں کیا۔ البتہ بنو عباس نے لقب اختیار کرنے شروع کئے۔ ان میں سے بھی ابتدائی خلفاء مثل السفاح وغیرہ صرف خلیفۃ المسلمین یا امیر المومنین کے لقب پر اکتفا کیا جاتا [illegible] [illegible]

[1] ابو الفداء جلد اول مطبوعہ مصر صفحہ [illegible]

اور جس طرح سے بنو امیہ کے پریشان روزگار اور بے یار و مددگار شہزادے عباسیوں کے چنگل سے بچ کر دور دراز ممالک میں پہونچے جو آخر کار اندلس میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے، اسی طرح سے بنو عباس کے شہزادے بھی مصر میں پہونچے اور انھوں نے ایک حد تک بنو عباس کی خلافت کا احیا کیا۔ مگر دونوں صورتوں میں فرق یہ رہا کہ بنو امیہ کے بچے ہوئے افراد نے اپنی قوت کا مظاہرہ کر کے حکومت یا خلافت کا احیا کیا۔ اور بنو عباس کے بچے ہوئے افراد خلافت کی احیاء میں، دوسرے طاقتور حکمرانوں کے محتاج اور زیر بار منت رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گو مصر میں بنو عباس کی خلافت دوبارہ زندہ ضرور ہوئی۔ مگر اس کا اقتدار بیسویں صدی عیسوی کے پوپ سے زیادہ مصر اور بیرون مصر میں نہ ہو سکا۔ یہی وجہ تھی کہ والئی مصر کے ادنیٰ اشارہ پر خلافت اور خلیفہ کی زندگی کا انحصار تھا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک خلیفہ کو تین بار معزول کیا گیا، اور تین بار پھر اس کو خلیفہ بنایا گیا۔ بخلاف اندلس کے کہ وہاں خلافت اور سلطنت دو جدا چیزیں نہیں تھیں۔

۶۵۶ھ کا بغداد تباہی کا ایسا منظر تھا کہ شاید اس کی مثال موجودہ زمانہ کی ظالمانہ بمباری بھی نہ پیش کر سکے۔ کیونکہ اس قدر قتل و خون کسی فاتح نے بالخصوص کسی مقبوضہ شہر پر کبھی نہیں کیا تھا۔ جیسا کہ ہلاکو نے کیا۔ اسی زمانہ میں بنو عباس کے باقیات الصالحات۔ جس میں مستعصم مرحوم کا چچا ابو القاسم بن احمد بن ظاہر بامر اللہ بھی تھا۔ مصر میں جا کر پناہ گزیں ہوئے۔ سلطان ملک الظاہر والئی مصر نے جو مستعصم باللہ شہید کی طرف سے حکمراں تھا۔ اور جس کو مستعصم نے "قسیم امیر المؤمنین" کا لقب دیا تھا۔ ان سب کی آؤ بھگت کی اور اس کے ساتھ ہی ابو القاسم کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس کے مستنصر باللہ ہونے کا اعلان بھی کر دیا۔ اور فوجی امداد دے کر تاتاریوں کے مقابلے کے لئے پوری پوری تیاری کے ساتھ روانہ کر دیا۔ ممکن ہے کہ سلطان نے دولت عباسیہ کے احیاء کے خاطر مدد دی ہو۔ کیونکہ وہ اسی دولت کا ساختہ و پرداختہ تھا۔ اور اسی لئے بیعت بھی کی ہو تاکہ اس نزاع کے جملہ مسلم حکمراں اس طرف رجوع کر کے نہ صرف تاتاری یلغار کی روک تھام کریں۔ بلکہ اسلامی مرکز (جو صدیوں سے بغداد تھا) کی تباہی کی تلافی بھی کریں۔ مگر یہ امداد کارآمد نہ ثابت ہوئی۔ مستنصر اس معرکہ میں کام آگیا۔ اور ہزیمت خوردہ فوجیں مصر واپس آگئیں۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ خلیفہ یا خلافت یا دولت کا مفہوم سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ محض ایک [illegible] اور حکومت کوئی اور کرے۔ بالفاظ دیگر خلیفہ گر کی ماتحتی میں محکوم رہ کر

[illegible] کا اعلان کرنے کے بعد قریب قریب وہی القاب یا خطابات بلکہ بجنسہ اپنی نسلوں کے لئے منتخب کئے جو بنو عباس نے اپنے لئے منتخب کئے تھے۔ البتہ آل عثمان نے باوجود بنو عباس کی جانشینی کے ان القاب کو اختیار نہیں کیا۔

متاخرین بنو عباس کے زمانہ میں بہت سے باجگزار امراء ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر خود مختار ہو گئے تھے اس لئے انھوں نے بالخصوص بنو عباسی لقب اختیار کئے جو اغلباً ادعاء جانشینی کی خاطر ہوں گے یا یہ خیال ہوگا کہ ان خطابات یا القاب کے اختیار کرنے سے انکا دائرۂ اثر بھی اتنا ہی وسیع ہو جائے گا جیسا کہ بنو عباس کا تھا۔ فی الحقیقت یہ القاب وسعت دائرہ یا اثر کے سبب سے نہیں تھے بلکہ یہ دائرہ یا اثر ان القاب کا سبب تھا۔ سبب کی ناسمجھی نے القاب کی بے تکی تقلید ان سے کرائی کیونکہ ہر امیر کو خلیفہ بننے کا جنون تھا۔ بہر حال چونکہ ایک ہی قسم کے بنو عباسی لقب کے سلاطین مختلف خطوں اور زمانوں میں بہت سے ہوئے ہیں۔ اس لئے مختلف ملکوں کے خلفاء کی فہرست کے علاوہ ہم لقب حکمرانوں کی ایک فہرست مع نام ملک و زمانہ حکومت ذیل میں دیجاتی ہے تاکہ متعلمین تاریخ کو بعض اوقات جو ہم لقبی سے غلط فہمی ہوتی ہے وہ نہ ہو سکے۔ اور وہ آسانی سے معلوم کر سکیں کہ یہ کس گھرانے اور کس ملک کا بادشاہ یا خلیفہ تھا۔

بنو عباس اور ان کے بعد آل عثمان میں جانشینی کا طریق وہ نہیں تھا جو اور سلاطین یا امراء میں تھا۔ بلکہ خاندان کا بڑا وارث تخت و تاج ہوتا تھا۔ اور تخت بڑے بیٹے ہی کے لئے مخصوص نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ذیل کی مثالوں سے واضح ہوگا کہ بنو عباس کے گھرانے میں اگر ایک خلیفہ کے ۴ لڑکے تھے تو ان چاروں کو یکے بعد دیگرے حکمرانی کا موقع ملا۔ دونوں بھائی السفاح اور المنصور یکے بعد دیگرے حکمراں ہوئے۔ اسی طرح سے ہادی و ہارون الرشید۔ ابناء مہدی۔ امین۔ مامون اور معتصم ابناء ہارون الرشید۔ واثق و متوکل ابناء معتصم۔ مکتفی۔ مقتدر۔ قاہر۔ ابناء معتضد راضی۔ متقی۔ مطیع ابناء مقتدر۔ مسترشد و مقتفی۔ ابناء مستظہر یکے بعد دیگرے خلفاء ہوئے۔ بنو امیہ میں اس قسم کی ایک مثال صرف عبد الملک بن مروان کی اولاد میں ملتی ہے۔ جس کے چاروں لڑکے ولید۔ سلیمان۔ یزید۔ ہشام یکے بعد دیگرے حکمراں ہوئے۔ آل عثمان میں بھی قریب قریب یہی طریق رائج تھا۔

دولت عباسیہ کی تباہی کے بعد ہلاکو کے ہاتھ [illegible] کا [illegible] تھی [illegible]

[illegible] میں سوا [illegible] ہو کر آیا کرے۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی نو اولادیں ہوئیں جن میں سے بعض اس کے سامنے ہی مر گئیں۔ ان میں سے پانچ لڑکے وقتاً فوقتاً خلیفہ بھی ہوئے۔ ایسی کہیں اور مثال نہیں ملتی ہے۔ اکثر اس کے بھائی بھی خلیفہ ہوئے جن میں سے چار کا ذکر ہو چکا ہے۔ اور اتفاق متوکل دوبار معزول ہونے کے بعد خلیفہ ہوا۔ ایسا سوائے مقتدر کے اور کسی کے لئے نہیں ہوا۔

جیسی ہی صورت چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں اندلس میں ہو گئی تھی۔ اور وہاں کے امراء و وزراء ہر روز گویا خلافت سے کھیلا کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سرزمین سے خلافت کا ایسا جنازہ اٹھا کہ نہ خلافت رہی اور نہ خلیفہ گری رہے۔ اسی خلافت گردی یا خلیفہ گری ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ جب اہل قرطبہ نے جن کو اس کھیل کی عادت ہو چکی تھی ۴۲۲ھ میں تخت خلافت عبدالرحمٰن نامی کے گھرانے کے ایک شخص امیہ نامی کو پیش کیا تو اس نے زندگی کو موت پر جس کا نام ان لوگوں نے خلافت رکھ دیا تھا۔ ترجیح دی اور یہ جواب دے کر [5]

"آج تم میرے ہاتھ پر بیعت کرو گے اور کل تم مجھ کو مار ڈالو گے"

ایسا غائب ہوا کہ پھر پتہ نہ چلا۔

مصر کے آخری عباسی خلفاء میں صرف مستعین باللہ وہ خوش نصیب خلیفہ ہوا جس کو خلافت کے ساتھ حکومت بھی ملی اور جس نے آٹھ سال کی حکمرانی کے بعد بعض سیاسی مصالح کی بنا پر کنارہ کشی اختیار کر کے باقی ماندہ عمر اسکندریہ میں گزاری۔

منسلکہ جدولوں کی چھ قسمیں ہیں:-

پہلی جدول میں خلفاءِ عباسیہ بغداد ہیں۔ دوسری میں بنو امیہ دمشق۔
تیسری میں بنو فاطمہ مصر۔ چوتھی میں بنو امیہ اندلس۔
پانچویں میں بنو عباسیہ مصر ہیں۔ چھٹی جدول وہ ہے جس میں اہم لقب خلفاء اور حکمرانوں کے [illegible] اقتباسات اور حتی الامکان سال ہائے وفات کو لکھ دیا گیا ہے۔

میری ناقص رائے میں متعلم و معلمین تاریخ دونوں کے لئے یہ جداول معاون و مفید ثابت ہوں گے۔

---

[5] [illegible] مطبوعہ مصر۔

زندگی بسر کرے۔ غرضیکہ اسی اصول حکمرانی کے تحت مصر کے حکمران [illegible] تھا
کو اپنا دست نگر رکھا۔ اور حسب مرضی جس کو چاہتے خلیفہ بناتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک ہی خلیفہ کو کئی
بار معزول کیا گیا اور کئی بار پھر خلیفہ بنایا گیا۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے مصری حکمرانوں کے اختیار
عزل و نصب کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قطع نظر اس کے کہ انھوں نے کسی ایک کو خلیفہ بنا کر چند روز یا چند
مہینوں کے بعد اس کو معزول کیا اور اس کے بعد دوسرا بنا لیا۔ ایسا بھی ہوا کہ عزل و نصب میں
کافی وقفہ بھی رہا کیونکہ بنانے کے لئے سوچنے کی ضرورت لاحق ہوئی اور جب حسب مرضی انتخاب
کر لیا تو اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور گویا خلیفہ بنا دیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہوا کہ ایک ہی مدت میں
کسی ایک کو خلیفہ بنایا گیا اور اس کے چند روز بعد اس کو معزول کر کے دوسرا بنا لیا گیا تھوڑے
دنوں کے بعد اپنے کئے پر وہ حکمراں گویا نادم ہوا اور اس نے اس کو معزول کر کے پھر سابقہ معزول
شدہ کو خلیفہ بنا دیا۔ خلیفہ کیا تھا فی الحقیقت ایک کھلونا تھا جس سے امرائے وقت کھیلا کرتے تھے
اور اُس کو خلیفہ کہتے تھے۔ چنانچہ اس طرح معتصم باللہ اور متوکل علی اللہ دُو بار معزول کئے گئے اور
دُو بار خلیفہ بنائے گئے۔ بغداد کے با اختیار خلفاء میں صرف ایک اس قسم کی مثال ملتی ہے کہ
مقتدر باللہ کو پہلے خلافت ملی لیکن چونکہ بعض دیانت دار امراء و وزراء محض اس کی کمسنی کی وجہ سے
اس انتخاب کے مخالف تھے لہٰذا پھر ایک انقلاب ہوا اور بہترین اور فاضل تر خلیفہ عبداللہ
بن المعتز کا انتخاب عمل میں آیا۔ مگر خود غرض عنصر جیسا کہ سلطنتوں میں دستور رہا اور ہے۔
ایسا غالب تھا کہ آخر کار اس کی کوششیں اور سازشیں بار آور ہوئیں۔ اور عبداللہ بن المعتز
نہ صرف معزول ہوا بلکہ قتل بھی کر دیا گیا تاکہ انقلاب در انقلاب کا تخیل ہی باقی نہ رہے۔ اور
کمسن مقتدر کو پھر تخت خلافت پر بٹھا دیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اعمال با اثر امراء و وزراء ہی
کے تھے۔ لیکن یہ اقتدار انتخاب ہی تک رہتا تھا اس کے بعد خلیفہ خود مقتدر ہوتا تھا۔ لیکن مصر کے
خلافت کی نوعیت بالکل بدلی ہوئی تھی، یہاں کا خلیفہ ہر وقت مصر کے حکمراں کا محتاج رہتا تھا۔ جو
حکمراں کی اطاعت بیعت لے کر خرید تا نہیں تھا بلکہ اپنی اطاعت اور رضامندی کے صلے میں اس
کے ہاتھ بیچ دیتا تھا۔ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے مقریزی کے حوالے سے متوکل علی اللہ کی
خلافت کے متعلق لکھا ہے:۔[۵۳]

سلطان نے اس کے لئے قلعہ میں ایک مکان بنوایا [illegible]

[illegible]

نمبر	نام خلیفہ	لقب	دار الخلافت	مدت حکومت	عمر وقت وفات	سن وفات	کیفیت
۱۵	ابو العباس احمد بن متوکل	معتمد علی اللہ	بغداد	۲۳ سال	۵۰ سال	۲۷۹ھ	اس کا بھائی موفق باللہ اس پر اسقدر حاوی تھا کہ فی الحقیقت وہی خلافت کرتا تھا۔ اور یہ محض مجبور تھا یہانتک کہ ایکبار اسکو ۳۰۰ دینار کی ضرورت ہوئی تو ہوقت اسکو نہ مل سکے اسوقت اُس نے یہ دو شعر کہے ؎ الیس من العجائب ان مثلی یری ما قل ممتنعا علیہ وتوخذ باسمہ الدنیا جمیعا وما من ذاک شیء فی یدیہ (ابو الفداء۔ جلد دوم۔ صفحہ ۵۶)
۱۶	ابو العباس احمد بن موفق بن متوکل	معتضد باللہ	”	۹ سال ۹ ماہ ۱۳ یوم	۴۴ سال	۲۸۹ھ	بقضاء الٰہی فوت ہوا۔ عیاشی کی وجہ سے تندرستی خراب ہو گئی تھی۔
۱۷	ابو محمد علی بن احمد موفق	مکتفی باللہ	”	۶ سال ۶ ماہ	۱۸ سال	۲۹۵ھ	بقضاء الٰہی فوت ہوا۔
۱۸	ابو الفضل جعفر بن معتضد	مقتدر باللہ	”	۴ ماہ	۱۳ سال		۱۳ سال کی عمر میں خلیفہ ہوا کمسنی کی وجہ سے بعض امرا نے ۲۹۶ھ میں معزول کر دیا تھا۔
۱۹	ابو العباس عبد اللہ بن المعتز	[illegible]	”	ایک یوم	۴۹ سال	۲۹۶ھ	معزول کر کے قتل کیا گیا۔
۲۰	ابو الفضل جعفر بن معتضد	مقتدر باللہ	”	۲۴ سال ۱۱ ماہ ۱۶ یوم	۳۸ سال	۳۲۰ھ	ابن معتز کے بعد پھر اسکو خلیفہ کیا گیا۔ قتل کیا گیا۔
۲۱	محمد بن معتضد	قاہر باللہ	”	۱ سال ۶ ماہ	۵۳ سال	۳۳۹ھ	معزول کر کے اندھا کیا گیا بقضاء الٰہی فوت ہوا۔
۲۱	محمد بن مقتدر	راضی باللہ	”	۶ سال ۱۰ ماہ	۳۲ سال	۳۲۸ھ	بقضاء الٰہی فوت ہوا۔
۲۲	ابو اسحاق ابراہیم بن مقتدر	متقی باللہ	”	۳ سال ۵ ماہ ۲۰ یوم	۶۰ سال	۳۵۷ھ	۳۳۳ھ میں معزول کیا گیا اور اندھا کیا گیا قید میں مرا۔ واقعی متقی و پرہیزگار تھا۔
۲۴	ابو القاسم عبد اللہ [illegible]	مستکفی [illegible]	”	۱ سال ۴ ماہ	۴۶ سال	۳۳۸ھ	۳۳۴ھ میں معزول اور اندھا کیا گیا بقضاء الٰہی فوت ہوا ۳۳۸ھ۔ احمد بن بویہ دیلمی شیعی کو معز الدولہ کا خطاب دیا اسی نے یہ سلوک کیا۔

(۱) فہرست خلفاء بنو عباس بغداد

سال حکومت ۵۲۰

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	دارالخلافہ	مدت حکومت	عمر وقت وفات	سن وفات	کیفیت
۱	ابو العباس عبداللہ بن محمد	السفاح	بغداد	۴ سال ۸ ماہ	۳۳ سال	سنہ ۱۳۶ھ	بہ قضائے الٰہی فوت ہوئے۔
۲	ابو جعفر عبداللہ بن محمد	المنصور	″	۲۲ ″ ۳ ″ کچھ یوم	۶۳ ″	سنہ ۱۵۸ھ	بیر میمونہ میں احرام باندھے ہوئے مرا۔ عجیب اتفاق ہے کہ بقول اس کے خود ذی الحجہ میں پیدا ہوا، ذی الحجہ میں خلیفہ ہوا، اور ذی الحجہ ہی میں بہ دوران حج اس کا انتقال ہوا۔ (ابوالفداء۔ جلد ۲۔ صہ)
۳	ابو عبداللہ محمد بن منصور	مہدی	″	۱۰ سال ۱ ماہ	۴۳ سال	سنہ ۱۶۹ھ	بقضائے الٰہی فوت ہوا۔
۴	موسیٰ بن مہدی	ہادی	″	۱ سال ۳ ماہ	۲۶ سال	سنہ ۱۷۰ھ	″ ″ ″
۵	ہارون بن مہدی	رشید	″	۲۳ سال ۲ ماہ ۱۸ یوم	۴۷ سال ۵ ماہ ۵ یوم	سنہ ۱۹۳ھ	″ ″ ″
۶	امین بن ہارون	امین	″	۴ سال ۸ ماہ	۲۸ سال	سنہ ۱۹۸ھ	عیاش و شرابی تھا۔ طاہر بن حسن [illegible] نے اسکو شکست دیکر قتل کیا۔
۷	ابو العباس مامون بن ہارون	مامون	″	۲۰ سال ۵ ماہ [illegible] یوم	۴۸ سال	سنہ ۲۱۸ھ	بہ قضائے الٰہی فوت ہوا۔
۸	ابو اسحٰق محمد بن ہارون الرشید	معتصم باللہ	″	۸ سال ۸ ماہ	۴۷ سال	سنہ ۲۲۷ھ	بنو عباس کا آٹھواں خلیفہ بقضائے الٰہی فوت ہوا۔
۹	ہارون بن معتصم	واثق باللہ	″	۵ سال ۹ ماہ	۳۲ سال	سنہ ۲۳۲ھ	عیاش تھا۔ شیر کے گوشت کھانے سے مختلف امراض میں مبتلا ہو کر مر گیا۔
۱۰	جعفر بن معتصم	متوکل علی اللہ	″	۱۴ سال ۱۰ ماہ ۳ یوم	۴۰ سال	سنہ ۲۴۷ھ	بیٹے نے قتل کرایا۔
۱۱	محمد بن جعفر متوکل	منتصر باللہ	″	۶ ماہ [illegible] یوم	۲۵ سال ۶ ماہ	سنہ ۲۴۸ھ	زہر دیا گیا۔
۱۲	احمد بن محمد معتصم	مستعین باللہ	″	۳ سال ۹ ماہ	۳۳ سال	سنہ ۲۵۲ھ	معزول ہونے کے بعد قتل کر دیا گیا۔
۱۳	محمد بن متوکل	معتز باللہ	″	۴ سال [illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۱۴	[illegible] محمد واثق	مہتدی باللہ	″	۱ سال	[illegible]	[illegible]	[illegible]

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	دار الخلافت	دور حکومت	عمر وقت وفات	سن وفات	کیفیت
۳۸	ابو جعفر منصور بن ظاہر	مستنصر باللہ	بغداد	۱۷ سال	۵۲ سال	سنہ ۶۴۰ھ	بقضاءِ الٰہی فوت ہوا سب سے زیادہ مدارس اسی نے بنوائے۔
۳۹	ابو احمد عبد اللہ بن مستنصر	مستعصم باللہ	”	۱۶ سال		سنہ ۶۵۶ھ	کم سمجھ اور نرم تھا وزیر مؤید الدین بن علقمی شیعہ نے ہلاکو سے سازش کرکے نہ صرف اسکو قتل کرایا بلکہ بغداد کو بھی تباہ و غارت کرایا اور اس طرح دولت عباسیہ کا خاتمہ کیا۔

(۲) خلفاءِ بنو اُمیّہ (دمشق)

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	دار الخلافت	دور حکومت	عمر وقت وفات	سن وفات	کیفیت
۱	حضرت امیر معاویہ رض	امیر المؤمنین	دمشق	۱۹ سال ۳ ماہ ۲۷ یوم	۷۵ سال	سنہ ۶۰ھ	
۲	یزید بن معاویہ		”	۳ سال ۹ ماہ	۳۸ سال	سنہ ۶۴ھ	
۳	معاویہ بن یزید		”	۴۰ روز	۲۱ سال	سنہ ۶۴ھ	نہایت دیندار اور پاکباطن تھا خلافت کا خواہشمند نہیں تھا چنانچہ جس روز اسکو خلیفہ کیا گیا اسی کے چند روز بعد اس نے لوگوں کو جمع کرکے دستبرداری کا اعلان کیا۔ "تم اپنے معاملہ کو خوب سمجھتے ہو جسکو چاہو امیر بناؤ" اسکے بعد گھر میں چلا گیا اور مر کر باہر نکلا۔
۴	مروان بن حکم		”	۹ ماہ ۱۸ روز	۶۳ سال	سنہ ۶۵ھ	یزید کی اولاد کی موجودگی میں یہ حکمران ہوا خالد بن یزید کی ماں سے اس نے نکاح کر لیا تھا۔ اس نے ایک روز اس کا گلا گھونٹ دیا۔
۵	عبد الملک بن مروان		”	۲۱ سال ۴ ماہ	۶۰ سال	سنہ ۸۶ھ	عالم اور فقیہ تھا لیکن حکومت نے علمی خوبیاں ختم کر دی تھیں۔
۶	ولید بن عبد الملک		”	۹ سال ۷ ماہ	۴۲ سال ۶ ماہ	سنہ ۹۶ھ	طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر کا مغربی کارنامہ اسی کے عہد کا زریں کارنامہ ہے مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخریٰ وغیرہ کی موجودہ شکلیں اسی کی رہین منت ہیں کیونکہ عمارتوں کا بہت ہی دلدادہ تھا۔

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	پایۂ تخت یا دار الحکومت	مدت حکومت	عمر وقت وفات	سنہ وفات	کیفیت
۲	ابوالقاسم محمد بن مہدی	قائم بامر اللہ	علاقہ (افریقہ) مہدیہ	۱۲ سال	۵۰ سال	سنہ ۳۳۴ھ	
۳	ابوطاہر اسمٰعیل بن محمد	منصور باللہ	"	۷ سال ۱۶ یوم	۳۹ سال	سنہ ۳۴۱ھ	
۴	ابوتمیم محمد بن اسمٰعیل	المعز لدین اللہ	قاہرہ و مصر	۲۵ سال	۴۵ سال ۶ ماہ	سنہ ۳۶۵ھ	اس کے زمانہ میں بحیرۂ روم میں بہت فتوحات ہوئیں تقریباً بیشتر مغرب اقصیٰ فتح ہوا عبدالرحمن ناصر خلیفہ اندلس سے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ ابوالحسن جوہر نے جو اس کے باپ کا غلام تھا اور جو بڑھتے بڑھتے وزیر اور سپہ سالار ہوا۔ مغرب اقصیٰ کا بیشتر علاقہ اور اس کے علاوہ مصر بھی فتح کیا اور قاہرہ کی بنیاد ڈال کر اسی نے سب سے پہلے جامع ازہر بنوائی جو آج تک ہے۔ قاہرہ کی فتح کے بعد معز نے پایۂ تخت بدلا اور قاہرہ کو پایۂ تخت قرار دیکر ۳۶۲ھ میں وہاں حکومت منتقل کر دی۔
۵	ابومنصور نزار بن المعز	عزیز باللہ	مصر	۲۱ سال	۴۲ سال	سنہ ۳۸۶ھ	
۶	منصور بن عزیز	حاکم بامر اللہ	"	۲۵ سال	۳۶ سال	سنہ ۴۱۱ھ	منصور بن عزیز اپنے زمانہ کا فرعون گزرا ہے جو تلون مزاج اور ظالم تھا جب اس نے بہن پر کچھ تہمت لگائی تو دو غلاموں کے ذریعہ سے قتل کرا دیا۔
۷	ابوالحسن علی بن حاکم	ظاہر لاعزاز دین اللہ	"	۱۶ سال		سنہ ۴۲۷ھ	نہایت نیک تھا۔
۸	ابوتمیم محمد بن ظاہر	مستنصر باللہ	"	۶۰ سال ۴ ماہ	۶۸ سال	سنہ ۴۸۷ھ	اتنی طویل حکومت کسی اسلامی بادشاہ یا خلیفہ نے نہیں کی۔
۹	ابوالقاسم احمد بن مستنصر	المستعلی باللہ	"	۷ سال ۲ ماہ	۲۸ سال	سنہ ۴۹۵ھ	
۱۰	[illegible] مستعلی	[illegible] اللہ	"	۲۹ سال ۵ ماہ ۱۵ یوم	۳۴ سال	سنہ ۵۲۴ھ	قتل ہوا۔
۱۱	[illegible]	[illegible]	"	۱۹ سال ۷ ماہ	۷۷ سال	سنہ ۵۴۴ھ	بدسیرت تھا۔ لاولد تھا۔
۱۲	[illegible]	[illegible]	"	۵ سال	۲۲ سال	سنہ ۵۴۹ھ	قتل کیا گیا۔

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	کیفیت
۷	سلیمان بن عبدالملک		دمشق	۲ سال ۸ ماہ	۴۵ سال	سنہ ۹۹ھ	تخمہ سے مرا۔
۸	عمر بن عبدالعزیز		″	۲ سال ۵ ماہ	۴۰ سال	سنہ ۱۰۱ھ	شہید کیا گیا۔
۹	یزید بن عبدالملک		″	۴ سال ۱ ماہ	″	سنہ ۱۰۵ھ	عیاش تھا۔
۱۰	ہشام بن عبدالملک		″	۱۹ سال ۹ ماہ	۵۵ سال	سنہ ۱۲۵ھ	
۱۱	ولید بن یزید بن عبدالملک		″	۱ سال ۳ ماہ	۴۲ سال	سنہ ۱۲۶ھ	عیاش تھا۔ بیٹے نے قتل کیا۔
۱۲	یزید بن ولید		″	۵ ماہ ۱۲ یوم	۴۶ سال	″	باپ سے مقابلہ و مقاتلہ کیا تھا جس میں باپ کام آیا تھا۔
۱۳	ابراہیم بن ولید		″	تقریباً ۴ ماہ			انتقال کا حال معلوم نہ ہوا۔
۱۴	ابو عبدالملک مروان بن محمد	الحمار	″	۵ سال ۱۰ ماہ ۱۵ یوم	۶۲ سال	سنہ ۱۳۲ھ	بمقام (مصر) بنو عباس کے مقابلہ میں قتل ہوا چونکہ صدی کے آخر کا خلیفہ تھا اس لئے الحمار کا لقب دیا کیونکہ عربی میں صدی کے آخر کو حمار کہتے ہیں۔ اسکے علاوہ گدھے کی طرح سے جفاکش بھی تھا۔

(۳) امراء عبیدی علوی المعروف بہ خلفاء بنو فاطمہ (مصر)

(۲۴۵ سال حکمراں رہے)

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	کیفیت
۱	عبداللہ بن محمد	المہدی	رقادہ (افریقیہ) مہدیہ	۲۴ سال ۱ ماہ ۲۰ یوم	۶۳ سال	سنہ ۳۲۲ھ	اس نے مہدیہ ساحلی شہر بنوا کر اپنی حکومت کا اس کو پایۂ تخت بنایا ۳۰۲ھ میں اپنے بیٹے کو لشکر جرار دے کر مصر پر حملے کیلئے روانہ کیا جہاں اس کو [illegible] [illegible] تھا بلکہ عبید بن حسین [illegible] [illegible] [illegible]

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	[illegible]	مدت خلافت	[illegible]	سنہ وفات	کیفیت
۱۱	سلیمان بن حکم بن سلیمان بن ناصر	مستعین باللہ	قرطبہ (اندلس)	۴ سال		سنہ ۴۰۷ھ	
۱۲	عبدالرحمن بن محمد بن عبدالملک بن ناصر	مرتضیٰ باللہ	"				چند ماہ برائے نام خلیفہ رہا۔
۱۳	عبدالرحمن بن ہشام بن عبدالجبار بن ناصر	مستظہر باللہ	"	۲ ماہ		سنہ ۴۱۴ھ	سنہ ۴۱۴ھ میں قتل ہوا۔
۱۴	محمد بن عبدالرحمن بن عبیداللہ بن ناصر	مستکفی باللہ	"	۱ سال ۴ ماہ			سنہ ۴۱۶ھ میں معزول ہوا اور زہر دیا گیا۔
۱۵	ہشام بن محمد بن عبدالملک بن ناصر	معتد باللہ	"	۱۲ سال		سنہ ۴۲۸ھ	سنہ ۴۲۸ھ میں معزول ہوا اور اسی سال مرگیا۔

(۵) خلفاءِ بنو عبّاس (مصر)

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	[illegible]	مدت خلافت	[illegible]	سنہ وفات	کیفیت
۱	ابوالقاسم احمد بن ظاہر عباسی	مستنصر باللہ	مصر	۶ ماہ		سنہ ۶۶۰ھ	مستعصم باللہ آخری خلیفہ بغداد کا چچا تھا سنہ ۶۵۹ھ میں بھاگ کر مصر چلا آیا تھا سلطان ملک ظاہر والی مصر نے بیعت کرکے خلیفہ بنایا اور تاتاریوں کے مقابلہ کیلئے روانہ کیا جہاں وہ قتل ہوگیا۔
۲	ابوالعباس احمد بن ابوبکر بن امیر ابو علی حسن عباسی	حاکم بامر اللہ	"	۴۰ سال		سنہ ۷۰۱ھ	مستعصم کے چچا مستنصر کے قتل کے بعد ایک سال تک کوئی خلیفہ نہیں ہوا سنہ ۶۶۱ھ میں ملک ظاہر نے اسکو خلیفہ بنایا۔
۳	ابوالربیع سلیمان بن حاکم	المستکفی باللہ	قوص (مصر)	۳۹ سال	۵۲ سال	سنہ ۷۴۰ھ	بجائے قاہرہ کے قوص میں دارالخلافہ رہا بقضائے الٰہی فوت ہوا۔
۴	ابراہیم بن ابو عبداللہ محمد بن حاکم	واثق باللہ	"	۱ سال			سنہ ۷۴۲ھ میں ایک سال کی خلافت کے بعد معزول کیا گیا۔
۵	ابوالعباس احمد بن مستکفی	حاکم بامر اللہ	"	۱۱ سال		سنہ ۷۵۳ھ	سنہ ۷۴۲ھ میں اپنے باپ ملک الناصر [illegible] کے بعد ملک منصور نے بیعت کی تھی۔ طاعون میں مبتلا ہوکر وفات پاگیا۔
۶	ابوالفتح ابوبکر بن مستکفی	معتضد باللہ	"	۱۰ سال	—	سنہ ۷۶۳ھ	
۷	[illegible]	[illegible]	"				
۸	[illegible]	[illegible]	"	[illegible]			

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	دارالخلافہ	مدت خلافت	عمر	سنہ وفات	کیفیت
۱۳	ابوالقاسم عیسیٰ بن ظاہر	فائز بنصر اللہ	مصر	۶ سال ۷ ماہ	۱۱ سال	۵۵۶ھ	مرگی سے مرا۔
۱۴	ابو محمد عبداللہ بن یوسف بن حافظ	عاضد لدین اللہ	″	۱۱ سال	۲۱ سال	۵۶۷ھ	

نوٹ۔ مستنصر باللہ کے عہد سے خلافت برائے نام تھی۔ وزراء مختار کل تھے جو اپنے تئیں ملوک سے ملقب کرتے تھے یہی صورت بنو بویہ کے قبضہ کے بعد بغداد کے خلفاء کی ہو گئی تھی۔

(۴) خلفاء بنو امیہ (اندلس)

نمبر شمار	نام خلیفہ	لقب	دارالخلافہ	مدت خلافت	عمر	سنہ وفات	کیفیت
۱	عبدالرحمٰن بن معاویہ اموی	داخل	قرطبہ (اندلس)	۳۳ سال	۵۷ سال	۱۷۱ھ	عبدالملک بن مروان کا پوتا تھا۔
۲	ابو ولید ہشام بن عبدالرحمٰن		″	۷ سال ۷ ماہ ۸ یوم	۳۹ سال	۱۸۰ھ	
۳	حکم بن ہشام		″	۲۶ سال	۵۲ سال	۲۰۶ھ	۱۹ لڑکے تھے۔
۴	عبدالرحمٰن بن حکم		″	۳۱ سال ۳ ماہ	۶۲ سال	۲۳۸ھ	۴۵ لڑکے تھے۔
۵	محمد بن عبدالرحمٰن		″	۳۴ سال ۱۱ ماہ	۶۵ سال	۲۷۳ھ	۳۲ لڑکے تھے۔
۶	منذر بن محمد بن عبدالرحمٰن		″	۱ سال ۱۱ ماہ	۴۶ سال	۲۷۵ھ	
۷	عبداللہ بن محمد بن عبدالرحمٰن		″	۲۵ سال	۷۲ سال	۳۰۰ھ	۱۱ لڑکے تھے اس نے اپنے بیٹے محمد پر شرعی حد لگا کر اس کو قتل کیا تھا۔
۸	ابوالمظفر عبدالرحمٰن بن محمد مقتول بن عبداللہ	الناصر لدین اللہ	″	۵۰ سال ۶ ماہ	۷۳ سال	۳۵۰ھ	خلافت اور امیر المومنین کا لقب اختیار کیا۔ ۱۱ لڑکے تھے ۳۲۵ھ میں اسی نے مشہور محل "الزہرا" بنوایا جس کی لمبائی شرقاً و غرباً دو ہزار سات سو گز اور چوڑائی شمالاً و جنوباً ایک ہزار پانچ سو گز اور دروازے ۱۵ تھے۔
۹	حکم بن عبدالرحمٰن ناصر	مستنصر باللہ	″	۱۵ سال ۵ ماہ	۶۳ سال	۳۶۶ھ	عالم اور فقیہ تھا۔
۱۰	ہشام بن حکم بن ناصر	مؤید باللہ	″	۳۲ سال	۴۷ سال	۴۰۳ھ	[illegible]

(۲۶) ہم لقب خلفاء و حکمرانان اسلام

نمبر		لقب	خاندان	مقام حکومت	سال وفات	کیفیت
۱	۱	المنصور	عباسی	بغداد	۱۵۸ھ	
	۲	؍؍	عبیدی علوی	مہدیہ (مغرب)	۳۴۱ھ	
	۳	المنصور باللہ	مومنی (موحدی)	مغرب و تونس	۵۹۵ھ	یہ عبدالمومن کا پوتا تھا۔ اسکا نام ابو یوسف یعقوب تھا ۱۵ سال حکومت کی ۴۱ سال کی عمر میں مرا۔
	۴	المنصور	ایوبی کردی	حماۃ (شام)	۶۱۷ھ	ناصر الدین محمد نام تھا سلطان صلاح الدین کے مرنے کے بعد حماۃ کا امیر ہوا تھا۔
	۵	المنصور (لاجین)	ترکی	مصر		۶۵۷ھ میں معزول ہوا اسکا نام علی نور الدین تھا اسکا باپ معز الدین ایبک ترکمانی الملقب بہ ملک المعز سب سے پہلا ترک وہاں کا حاکم ہوا بعمر ۱۵ سال ۸ ماہ معزول ہوا تھا۔
	۶	؍؍	؍؍	؍؍	۶۹۸ھ	حسام الدین لاجین قتل کیا گیا۔
	۷	المنصور	ایوبی	حمص (شام)		
	۸	؍؍	ترکمانی	ماردین	۶۳۶ھ	ناصر الدین ارتق ارسلان بن ایلغازی نام تھا۔
	۹	؍؍	تاتاری	؍؍	۷۱۲ھ	نجم الدین غازی بن قزل ارسلان نام تھا۔
	۱۰	؍؍	عرب	یمن	۶۴۷ھ	عمر دین علی بن رسول نام تھا۔ قتل کیا گیا۔
	۱۱		ترک	مصر		
۲	۱	الرشید	عباسی	بغداد	۱۹۳ھ	
	۲	[illegible]	[illegible] موحدی	مغرب و تونس	۶۴۰ھ	
۳	۱	المامون	عباسی	بغداد	۲۱۸ھ	
	۲	[illegible]	علوی	قرطبہ	۴۳۱ھ	علی بن حمود کا بھائی تھا ۴ سال کی حکمرانی کے بعد [illegible] کا غلبہ ہوا اور یہ قید کر دیا گیا۔ اور اسی حالت میں مرا۔

نمبر شمار		خطاب	خاندان	پایۂ تخت	سال جلوس	کیفیت
	۳	مامون	حفصی (موحدین)	تونس	[illegible]	ابو العلاء ادریس بن یعقوب الملقب بہ مامون حکمران تھا ۹ سال حکمراں رہا۔
۴	۱	معتصم باللہ	عباسی	بغداد	سنہ ۲۲۷ھ	
	۲	"	"	مصر	سنہ ۸۵۰ھ	
۵	۱	واثق باللہ	"	بغداد	سنہ ۲۳۲ھ	
	۲	"	ابو حفص ہنتانی	تونس	سنہ ۶۷۸ھ	یحیٰی بن محمد بن ابوزکریا نام تھا اپنے چچا ابو ابراہیم سے مغلوب ہو کر معزول ہوا اپنے بنو عم کے ہاتھوں قتل ہوا۔
	۳	"	حفصی (موحدین)	مراکش و تونس	سنہ ۶۶۵ھ	ابو دبوس کے نام سے مشہور تھا۔ ۳ سال سلطنت کی۔
	۴	"	عباسی	مصر	سنہ ۸۴۲ھ	میں معزول کیا گیا۔
	۵	"	"	"	سنہ ۷۸۸ھ	
۶	۱	معتمد علی اللہ	"	بغداد	سنہ ۲۶۹ھ	
	۲	"	لخمی	اشبیلیہ	سنہ ۴۸۴ھ	
	۳	"	عباسی	مصر		صرف ولیعہد رہا۔
۷	۱	معتضد باللہ	"	بغداد	سنہ ۲۸۹ھ	
	۲	"	لخمی	اشبیلیہ	سنہ ۴۶۴ھ	نہایت ظالم اور عیاش تھا۔
	۳	"	عباسی	مصر	سنہ ۷۹۳ھ	
	۴	"	"	"	سنہ ۸۴۵ھ	
	۵	"	موحدین (موحدین)	مراکش و تونس	سنہ ۶۴۶ھ	علی بن ادریس نام تھا۔
۸	۱	راضی باللہ	عباسی	بغداد	[illegible]	عبداللہ بن المقتدر نام تھا۔
	۲	"	"	"	سنہ ۳۲۹ھ	
۹	۱	مرتضیٰ باللہ	"	"	[illegible]	عبداللہ بن معتز لقب تھا۔
	۲	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

نباتاتی تنفس

(از جناب ڈاکٹر رفیق احمد خاں صاحب ایم-ایس-سی-پی ایچ ڈی چیرمین شعبۂ نباتات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

سبز پودا آفتاب کی روشنی میں ہوا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ (۱) اور زمین سے پانی حاصل کرکے مختلف اقسام کی شکر تیار کرتا اور آکسیجن (۲) چھوڑتا ہے۔ یہ عمل جو بالعموم پتّوں کے اندر واقع ہوتا ہے ترکیب شعاعی کہلاتا ہے۔ پتّوں کے اس حیرت انگیز فعل پر عالم ذیحیات کا قیام ہے۔ اگر پتّوں کی یہ عجیب و غریب خصوصیت مفقود ہو جائے تو نہ صرف پودے بلکہ حیوانات بھی غذا نہ ملنے کی وجہ سے سطح زمین سے بالکل معدوم ہو جائیں۔ اکثر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ پودہ اور حیوان کی خوراک میں قطبین کا فرق ہے۔ یعنی اوّل الذکر کی خوراک کی نوعیت غیر نامیاتی ہے۔ مثلاً پانی کاربن ڈائی آکسائڈ اور نمکیات برعکس اس کے حیوان کی غذا کا بہت بڑا حصہ مندرجہ ذیل تین قسم کی نامیاتی اشیا پر مشتمل ہے۔ اوّل۔ شکریات اور نشاستہ۔ دوم انڈہ اور گوشت کے مخصوص اجزا۔ یعنی لحمیات جو ترکاری۔ دال اور پھل وغیرہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ سوم روغنیات۔ مثلاً چربی، مکھن اور گھی وغیرہ۔ درحقیقت پودہ اور حیوان کی خوراک میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں۔ اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ پودا ایک معصوم مزدور کی مانند پتّوں اور جڑوں کے ذریعہ معمولی غیر نامیاتی اشیاء جذب کرکے شکریات اور نشاستہ لحمیات اور روغنیات تیار کرتا ہے۔ اور پھر ان کو بطور غذا استعمال میں لاتا ہے۔ لیکن حیوان ایک متکبر سرمایہ دار کی طرح غریب پودہ کی محنت و مشقت سے پیدا کردہ کمائی کو سمیٹ کر اپنا پیٹ بھرتا ہے۔ بہرحال جہاں تک کیمیائی قابلیت کا تعلق ہے پودے کا درجہ حیوان سے بہت بلند ہے۔ اس دلچسپ موضوع پر انشاء اللہ پھر کبھی مقالہ پیش کیا جائے گا۔ یہاں پر صرف یہ بتلانا کافی ہوگا کہ روشنی کی

نوٹ (۱) ... کاربن ڈائی آکسائیڈ کو ... کاربونک ایسڈ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ گیس جلنے کے فعل سے قدرتی طور پر ... سانس لینے ... ہوا ... ہے اس میں یہ گیس تقریباً ۰۴ء فیصدی تک پائی جاتی ہے ... ہوتی ہے۔ سانس کے لئے یہ گیس نہایت ضروری ہے۔

[illegible] ... میں دھوپ سے ... [illegible]
سے حاصل کی ہوئی حرارت کی شکل میں خارج ہوتی ہے"

[illegible] نے اپنے دوست ملکینڈ سے کہا وہ بالکل صحیح ہے۔ درحقیقت نہ صرف انجن بلکہ ہماری دنیا کے کارخانے کا ہر پرزہ سورج کی تپش کی وجہ سے متحرک اور زندہ ہے۔ یہاں پر یہ بیان کرنا بے موقع نہ ہو گا کہ مادی دنیا کے دو بڑے حصے ہیں۔ اوّل عالم غیر ذیحیات جو تین طبقات میں منقسم ہے یعنی جمادی۔ آبی اور ہوائی۔ دوسرا عالم ذیحیات جو نباتات اور حیوانات پر مشتمل ہے۔ رب العالمین نے اپنے خاص فیض و کرم سے انسان کو زمین کی خلافت بخشی تھی مگر تنگ نظر اور احسان فراموش انسان نے جمادی۔ آبی۔ ہوائی۔ نباتی اور حیوانی طبقات کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ چنانچہ پربت۔ دریا۔ آگ۔ درخت اور جانور کی پرستش میں مبتلا ہو کر تمام کائنات میں اپنے آپ کو ذہنی طور پر حقیر ترین ثابت کر دیا۔ البتہ سورج کی پوجا کسی قدر حق بجانب تسلیم کی جا سکتی ہے۔ اگر نظر عمیق سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ سطح زمین پر جو کچھ رونق ہے اس کا سبب بہت حد تک آفتاب ہے۔ شان و شوکت سے چمکنے والے اس آسمانی چراغ کی بدولت دنیا میں ہلچل جاری ہے۔ باد و باراں کا شور۔ بحری موجوں کی گرج۔ ندی نالوں کی تڑپ۔ نہروں اور دریاؤں کا اضطراب اور پہاڑی آبشاروں کی گونج۔ شمسی تپش کے کرشمے ہیں۔ اسی طرح پھولوں کی رنگینی اور نزاکت۔ پھلوں کی شیرینی اور لطافت۔ طیور کی پرواز اور نغمہ سرائی۔ چوپاؤں کی تگ و دو اور کرخت صدائی۔ درندوں کی خوفناک حرکتیں اور دہشتناک آوازیں۔ انسانی اقوام کی کشمکش اور خونریز لڑائیاں۔ حسن کی شوخیاں اور عشق کی مستیاں۔ شعر و سخن کی مجلسیں اور سرود و رقص کی محفلیں۔

الغرض یہ سب آفتاب کی شعاعی قوت کے عجیب و غریب مظاہرے ہیں۔ اگر اس قوت کو خواہ وہ اصلی حالت میں ہو یا تبدیل شدہ شکل میں۔ کچھ مدت کے لئے نیست نابود کر دیا جائے تو تمام دنیا بے جان اور ساکت ہو جائے۔ اگرچہ زندگی اور حرکت کا قیام آفتاب کی زبردست طاقت پر منحصر ہے تاہم آتش پرستوں کا ناری دیوتا ایک عظیم الشان نورانی ہستی کا ادنیٰ غلام ہے۔

[illegible] میں اس امر کی مختصر تشریح کی گئی ہے کہ سبز پتے شمسی نور سے فیض یاب ہو کر سادہ [illegible] سے مختلف اقسام کی غذا بناتا ہے۔ یہ غیر مرئی کل پتوں کے چھوٹے چھوٹے نازک [illegible] ... [illegible]
[illegible]

موجودگی میں پودے کے جسم کے اندر ترکیب ضیائی کے عمل سے طاقت پیدا ہوتی [illegible]
خالص کیمیائی عملیات کے ذریعہ نشاستہ اور پھر لحمیات اور روغنیات پیدا ہوتے ہیں مگر بعض سبز
پودے ایسے بھی ہیں جن میں حسب معمول نشاستہ بنانے کی طاقت نہیں ہوتی۔ اس لئے ان پودوں کے
برگی خلیوں میں نشاستہ کے بجائے صرف شکریات موجود ہوتی ہیں۔ مثلاً سوسن پیاز وغیرہ۔
سائنس کی موجودہ ترقی کے باعث صنعتی ممالک میں طرح طرح کے کیمیائی مرکبات مصنوعی طریقوں
سے تیار کئے جاتے ہیں۔ سیکڑوں کارخانوں میں بڑی بڑی بھٹیاں آتشکدوں کی مانند شب و روز
گرم رہتی ہیں اور لاکھوں مزدور شہد کی مکھیوں کی طرح نہایت انہماک سے کام کرتے ہیں۔ ان صنعتی
کارخانوں میں مرکبات بنانے کے لئے معدنی کوئلہ یا بجلی سے طاقت مہیا کی جاتی ہے۔ اب سوال پیدا
ہوتا ہے کہ بیچارہ بے دست و پا پودہ سادہ غیر نامیاتی اشیاء سے پیچیدہ نامیاتی مرکبات تعمیر کرنے
کے لئے قوت کہاں سے حاصل کرتا ہے؟ اس سلسلہ میں مختصراً یہ بیان کرنا کافی ہوگا کہ کیمیائی ترکیب
دینے کے لئے سبز پودا سورج کی کرنوں سے وہی کام لیتا ہے جو انسان کوئلہ یا بجلی سے۔ چنانچہ شعاعی
توانائی پودے کے تیار کردہ مرکبات کے اندر غیر مرئی روپ میں مضمر رہتی ہے۔ جب کبھی ان مرکبات کا
کیمیائی انتشار ہوتا ہے تو فوراً توانائی رہا ہو جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک اتوار کو صبح کے وقت جبکہ انجینئر سٹفنسن اور پروفیسر بکلینڈ (ماہر ارضیات)
گرجا سے باہر نکل رہے تھے۔ ان کو دور سے دھواں اڑاتی ہوئی متحرک ریل گاڑی دکھائی دی۔ انگلستان
کے یہ دونوں مایۂ ناز سائنسداں نو ایجاد ریل گاڑی کا دلچسپ نظارہ دیکھنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔
کچھ دیر کے بعد سٹفنسن نے بکلینڈ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "بکلینڈ میرے ایک سوال کا جواب
دیجئے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کیا طاقت ہے جو اس ریل گاڑی کو حرکت دے رہی ہے؟" پروفیسر
نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ کونسا مشکل سوال ہے۔ بیشک ریل کو انجن کھینچ رہا ہے۔" سٹفنسن
نے دوبارہ استفسار کیا "مگر یہ بتلائیے کہ انجن کو کیا چیز دھکیل رہی ہے؟" بکلینڈ بولے "اس میں
بھلا شبہ کی بات نہیں کہ انجن کو آپ کے شہر کا کوئی مستری چلا رہا ہے۔" سٹفنسن نے جواب دیا "نہیں
انجن کو آفتاب کی روشنی حرکت دے رہی ہے۔" بکلینڈ نے متعجب ہو کر دریافت کیا۔ "بھلا یہ کیسے ہو
سکتا ہے؟" سٹفنسن نے اس معمہ کی تشریح کرتے ہوئے کہا "آپ بخوبی واقف ہیں کہ [illegible]
درختوں کے جنگل کے جنگل زمانہ کی آغوش میں دفن ہو کر دباؤ گرمی اور کیمیائی [illegible]
میں منتقل ہو گئے تھے۔ اب کوئلہ زمین سے نکال کر [illegible]
[illegible]

[illegible] ہے جو جسم میں [illegible] سے [illegible]
[illegible] میں [illegible] شکل میں ان کے جلنے کے لئے آکسیجن کا موجود ہونا ضروری ہے
[illegible] پودہ یا حیوان کے جسم کے اندر غذائی اشیا کے مکمل تجزیہ کے واسطے اس گیس کی موجودگی لازمی
ہے۔ غرضیکہ دونوں صورتوں میں آکسیجن جذب ہوتی ہے اور کاربن ڈائی آکسائڈ چھوٹتی ہے نیز توانائی
کی کثیر مقدار کسی نہ کسی شکل میں نجات پاتی ہے۔ پہلے عمل کو احتراق اور دوسرے کو تنفس کہتے ہیں۔
اگرچہ سطحی طور پر ان دونوں تخریبی عملیات میں مشابہت پائی جاتی ہے تاہم ان کی نوعیت
ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

تنفس تمام جاندار اجسام کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ کوئی حیوان یا پودہ ایسا نہیں جو مسلسل
سانس نہ لیتا ہو جب تک جان باقی ہے ہر ذی روح کے جسم میں آکسیجن کا انجذاب اور کاربن ڈائی آکسائڈ
کا اخراج متواتر جاری ہے۔ مگر جوں ہی موت آتی ہے یہ عمل ختم ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ تنفس زندگی کی علامت
ہے اور عدم تنفس موت کا ثبوت۔

پودوں میں کوئی مخصوص تنفسی اعضا نہیں ہوتے۔ اس لئے وہ اپنے تمام حصوں سے آکسیجن
جذب کرتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائڈ باہر نکالتے ہیں۔ بعض غیر معمولی حالات میں پودے آکسیجن حاصل
کئے بغیر بھی کاربن ڈائی آکسائڈ خارج کرتے ہیں۔ چونکہ یہ عمل تخمیر سے مطابقت رکھتا ہے اسلئے اگر اسکو
تخمیری تنفس کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ دراصل نباتاتی تنفس کی دو شکلیں ہیں۔ اول۔ آکسیجنی تنفس
جس میں آکسیجن کی موجودگی کی وجہ سے شکر یا تی غذا مکمل طور پر کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی میں منتقل
ہوکر مذکور توانائی کی رہائی کا باعث ہوتی ہے۔ اس امر کی پہلے تشریح کیجا چکی ہے کہ سبز پودہ کاربن
ڈائی آکسائڈ پانی اور شعاعی توانائی سے شکر تعمیر کرتا ہے۔ لہذا جب شکر کا تجزیہ عمل میں آتا ہے تو یہ
تینوں اجزا الگ ہوکر منتشر ہو جاتے ہیں۔ دوم۔ تخمیری تنفس جس میں شکر کی تحلیل نامکمل رہنے کی وجہ
سے الکحل بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں نہ صرف توانائی کا نکاس بلکہ کاربن ڈائی آکسائڈ کا اخراج بھی
آکسیجنی تنفس کی نسبت بہت کم ہوتا ہے۔ اکثر حضرات نے اس بات کا مشاہدہ کیا ہوگا کہ لکڑی پوری
طرح سے جلنے کے بعد راکھ بن جاتی ہے۔ اگر احتراق یعنی جلنے کا عمل پورا نہ ہو تو لکڑی کوئلہ میں تبدیل
ہو جاتی ہے۔ [illegible] صورت میں توانائی کا [illegible] اور حرارت کی شکلوں میں نازل ہوتا ہے
[illegible] توانائی کی کثیر مقدار [illegible] ہے [illegible] کھی تنفس
اور [illegible] نہیں ہے

[illegible] ہر حال میں شکر [illegible]
ہے یعنی اگر وہ شکر کسی مجزے کے ذریعہ اکٹھی کر کے ایک جگہ جمع کر دی جائے [illegible]
چوڑی اور چاروں طرف سے ایک میل اونچی شکر کی پہاڑی کھڑی کی جا سکتی ہے۔ [illegible]
غذا پتوں کے باکمال کارخانوں سے نکل کر باریک شریانوں کے ذریعہ پودے کے مختلف حصوں میں
پہنچتی ہے۔ اگر پودا یا حیوان کے جسم کے اندر غذا کی تقسیم کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ
دولت کی تقسیم کے قدرتی قوانین کس قدر مکمل اور صحیح ہیں۔ اس امر کی وضاحت کسی تندرست انسان
کے جسم کو پیش نظر رکھ کر زیادہ آسانی اور خوبی کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔

انسان کا وجود مثل ایک بڑی قوم کے ہے جس کے لاتعداد خلیے ایک دوسرے سے منسلک
ہیں۔ ان خلیوں کی مختلف جماعتیں ہیں۔ مثلاً دل۔ دماغ۔ جگر۔ پھیپھڑے۔ بازو۔ ہاتھ اور پاؤں وغیرہ
ان سب کو خون کے ذریعہ خوراک ملتی ہے۔ چنانچہ غذا کی دولت سے بھرا ہوا خون لہریں مارتا ہوا جسم
کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ خلیہ کے قریب پہنچتا ہے۔ مگر کسی خلیہ یا خلیوں کی کسی جماعت کی مجال نہیں کہ ضرورت
سے زیادہ خوراک غصب کر کے خود فربہ ہو جائے۔ حسد و ہوس۔ خود غرضی۔ بددیانتی۔ لالچ و ریاکاری
کا کہیں نشان نہیں۔ سب ایک کڑے نظام کے اندر اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہمہ تن مصروف
ہیں اگرچہ کام اور خوراک کے لحاظ سے ان کی حیثیت جداگانہ ہے تاہم مساوات اور اخوت کا یہ عالم
ہے کہ اگر کہیں پاؤں کی انگلی میں کانٹا چبھ جائے تو سارا جسم تکلیف کے مارے بیتاب ہو کر تڑپنے لگتا
ہے۔ کیا اعضاءِ رئیسہ اور کیا اعضاءِ غیر رئیسہ۔ سب کے سب جسم کے مجروح حصہ کی طرف متوجہ
ہو جاتے ہیں۔ صحت ہو یا بیماری۔ راحت ہو یا تکلیف۔ خوشی ہو یا غم۔ ہر حالت میں تمام خلیے انفرادی
اور اجتماعی حیثیت سے ایک دوسرے کے شریک ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی جسم کے
بعض حصے خوراک کا خزانہ بالعموم چربی کی شکل میں محفوظ رکھتے ہیں۔ مگر ان کی حیثیت وہ نہیں جو
بدقسمتی سے ہمارے خود پسند دولتمندوں کی ہوا کرتی ہے۔ جب کبھی انسان کو باہر سے کافی خوراک
نہیں ملتی تو اس کے اندرونی سرمایہ دار مذکورہ جسم کی تندرستی و طاقت بحال رکھنے کے لئے جمع کردہ
غذائی دولت کے خزانوں کو بلاتامل نثار کر دیتے ہیں۔ دیگر حیوانات اور پودوں کے اجسام میں بھی غذا
کی تقسیم کا اسی قسم کا کامل اور بے عیب طریقہ پایا جاتا ہے۔

اس مضمون پر [illegible] کی تفصیلی بحث کی جائے [illegible]
[illegible]

[illegible] سانس لیتا ہے۔ [illegible] پژمردگی اور سستی [illegible]
[illegible] ہے نیز قدرت اس کے ڈھلتے ہوئے جسم کو مختلف اقسام کے عطریات سے معطر کرتی ہے
زندگی کے اس دور میں داخل ہو کر سیب کے تنفس کی رفتار یک بیک بڑھنے لگتی ہے۔ بیچارہ مصور سیب کے
[illegible] رنگ و روپ سے متاثر ہو کر اس کی شکل و صورت کی تصویر کھینچتا ہے۔ وہ نہیں سوچتا کہ بیچارہ
سیب اپنی ڈھلتی ہوئی جوانی کا احساس کر کے پریشان اور ہراساں ہے۔ اور نہایت اضطراب اور
گھبراہٹ سے لمبے لمبے سانس لیتا ہے۔ نیز رنگین طبع عاشق اپنی نوعمر معشوق کے خوبصورت رخسار کو
خوش رنگ سیب سے تشبیہ دیتا ہے۔ مگر وہ بھی نہیں سمجھتا کہ سیب کو عشق و محبت کی داستان سے
کچھ دلچسپی نہیں۔ اس کا جوش اور ولولہ قریب الاختتام ہے اور وہ بیتابی کے ساتھ اپنی زندگی کی آخری
گھڑیاں گن رہا ہے۔ اس لئے اگر سیب کو کسی متوسط عمر کی شیریں مزاج خاتون کے نورانی چہرے سے مشابہت
دی جائے تو بعید از عقل نہ ہوگا۔

ممکن ہے کہ بعض حاسد مردوں کے دلوں میں یہ اعتراض پیدا ہو کہ راقم الحروف نے مرد کو
یہ عزت کیوں نہیں دی۔ درحقیقت واقعہ یہ ہے کہ نباتاتی دنیا میں پھل کسی حد تک وہی فرائض ادا کرتا
ہے جو حیوانی دنیا میں مادہ سر انجام دیتی ہے۔ بہرحال مذکورہ بالا منزل سے گزرنے کے بعد سیب بڑھاپے
مغلوب ہو کر نڈھال ہو جاتا ہے۔ اس کی نرم جلد پر جھریاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔
اور ضعف اور ناتوانی کی وجہ سے سانس کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔ اس کمزوری اور بیچارگی کی حالت میں
مختلف اقسام کے جراثیم چیلوں۔ کووں اور گدھوں کی مانند اس کے نیم مردہ جسم کو کھانے لگتے ہیں۔
آخر کار ان مصیبتوں کو خاموشی سے برداشت کرنے کے بعد بے بس سیب ایک ہلکا سانس لے کر
ہمیشہ کے لئے بے جان ہو جاتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ سیب لقمۂ اجل ہونے سے
پہلے بالعموم لقمۂ دہان بن جاتا ہے۔

جب مکمل ہرا سیب درخت سے توڑ کر علیحدہ کیا جاتا ہے اس وقت اس کے اندر ان خاص
شکریات کا کافی ذخیرہ موجود ہوتا ہے جو تنفس کے لئے براہ راست استعمال میں آتی ہیں۔ اس لئے تنفس
کسی قدر تیز ہوتا ہے۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا ہے اس قسم کی شکریات کی مقدار بتدریج کم ہونے کی
وجہ سے تنفس بھی آہستہ آہستہ گھٹ جاتا ہے۔ جب سیب پکنا شروع ہوتا ہے تو اس زمانہ میں نشاستہ کا
[illegible] شکریات اور تحلیل پیدا کرنے والی اشیا
[illegible] شکریات کے تجزیہ کی رفتار [illegible]

[illegible] نے عام طور پر آکسیجن کی عدم موجودگی [illegible] تنفس کہا جاتا ہے۔

علم النباتات کی بعض کتابوں میں تجزیری تنفس کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ اگر سبز پودوں کو آکسیجن نہ ملے تو وہ جلد مر جاتے ہیں۔ راقم الحروف کی رائے میں یہ بیان سراسر غلط ہے۔ تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ نباتاتی اجسام آکسیجن کے بغیر بہت دیر تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایسی حالت میں بعض اوقات ان کی صحت پر مضر اثر پڑتا ہے۔ تقریباً پندرہ سال گزرے کہ کیمبرج یونیورسٹی کے کہنہ مشق محقق ڈاکٹر بلیک مین اور ہندوستان کے مشہور ماہر نباتیات پروفیسر پریجا نے انگلستان کی شاہی انجمن کے سامنے ایک مشترک مقالہ پڑھا تھا جس میں انھوں نے اپنے تجربات کی بنا پر اس بات کا اعلان کیا تھا کہ کچھ عرصہ آکسیجن میسر نہ ہونے کے بعد سیب کا تنفس معمولی ہوا میں کسی قدر مدھم پڑ جاتا ہے مگر چند گھنٹے میں آہستہ آہستہ وہ پھر اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کچے سیب کے تنفس پر عدم آکسیجن کا تقریباً ستر گھنٹے کے بعد بھی کوئی مضر اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ اگر وہ نیم پختہ ہو تو وہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے جس کو ڈاکٹر بلیک مین اور پروفیسر پریجا نے دریافت کیا تھا۔ البتہ پختگی مکمل ہونے کے بعد سیب اتنا کمزور اور حساس ہو جاتا ہے کہ اس میں آکسیجن کی غیر موجودگی کے ضرر رساں اثرات کو برداشت کرنے کی طاقت باقی نہیں رہتی اس لئے صرف تین یا چار گھنٹے تک بلا آکسیجن رہنے کے بعد ہی اس کے تنفس کی رفتار ہمیشہ کے لئے کم ہو جاتی ہے۔

جدید تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ ہر پودہ کے مختلف حصوں کے تنفس میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ مثلاً کلیوں میں پتوں کی نسبت سانس کی رفتار تیز ہوتی ہے۔ نیز پتوں کے مقابلہ میں ٹہنیوں اور جڑوں کا تنفس کمزور ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں پودہ کا ہر حصہ اپنی عمر کے مطابق کبھی آہستگی اور کبھی سرعت کے ساتھ سانس لیتا ہے۔ اس امر کی مفصل تشریح ذیل میں کی جائے گی۔ یہاں پر یہ بتلانا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ عالم نباتات میں بھی تذکیر و تانیث کا سلسلہ موجود ہے جہاں تک سانس کا تعلق ہے نر کو مادہ پر فوقیت [illegible] نر پودہ کا کوئی حصہ مادہ کے اسی حصہ کی نسبت کسیقدر تیزی سے سانس لیتا ہے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ پودوں کے مختلف اعضا کی عمر کا ان کے تنفس پر بہت اثر پڑتا ہے اس [illegible] وضاحت کرنے کے لئے پھل سب سے بہتر شے ہے۔ کسی کامل مگر کچے سیب کا امتحان [illegible]
[illegible] بآسانی معلوم ہو سکتی ہے کہ [illegible] کے مراحل [illegible]
[illegible]
[illegible]

ایک دوسری نظم کا عنوان "قومی لیڈر" ہے اِس میں ان کے مخاطب وہ ابن الوقت لیڈر ہیں جن کی رہنمائی کا انحصار اخبارات کو بیانات دیدینے اور جلسوں میں دامن بچا بچا کر تقریر کر دینے پر ہے ؎

تفنگ و تیر و شمشیر و تبر سے ان کو کیا نسبت
یہ فاتح کاغذی دُنیا کے ہیں مردِ صحافت ہیں

ایک اور نظم "بیدارئ اسلام" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

گرمِ جہاد بن کر پھر سخت کوش بن جا | پھر بت شکن نظر آ پھر سر فروش بن جا
اے تیغ مردِ مومن اس طرح موجزن ہو | یہ لاش اکثریت ایک جسم بے کفن ہو

اگر نکہت صاحب نے اسی سلامت روی کے ساتھ جیسی کہ ان سے توقع ہے شعر و ادب کی خدمت جاری رکھی تو آیندہ ان کا شمار ملک کے مشہور قومی شعرا میں ہوگا۔ "چمن زار" ملنے کا پتہ علی بھائی ۳۷۳ رحمت اللہ روڈ بمبئی۔ قیمت تین روپیہ چار آنہ۔ ۴/۳ ؎

نگار کا انتقاد نمبر جناب نیاز فتحپوری ملک کے اُن مایۂ ناز ادیبوں میں سے ہیں جو بلا شبہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

دُنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان کے دَورِ ارتقا کی تاریخ پر نظر ڈالو، ادیب اور تنقید نگار شانہ بشانہ دکھائی دیں گے۔ درحقیقت زبان کو معراجِ ترقی پر پہنچا دینے کا کام ادیب سے زیادہ تنقید نگار نے کیا۔ وہ ایک ایسی کسوٹی ہیں جس پر سونا کندن بنتا ہے۔ اُردو میں اس موضوع پر اب تک اس قدر کم لکھا گیا ہے کہ جو کچھ ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے اُردو کی اسی کمی پر کہا تھا۔ ع

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے

نیاز صاحب اپنی دوسری ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ فنِ تنقید پر بہترین مواد نگار کے ذریعہ پیش کر رہے ہیں مستقبل میں انھیں کی بنائی ہوئی شاہراہوں پر چل کر ہماری نوخیز نسلیں اُردو کو دنیا کی ترقی یافتہ زبان بنا سکیں گی۔

ماہنامہ معاشیات معاشیات اور اقتصادیات جیسے اہم اور ضروری موضوع پر اُردو میں بہت کم ہی رسالے ہوں گے جو ... خاص توجہ نہیں ہے۔ یہی وہ ... وہ داں طبقہ کی کمی ...

کی وجہ سے تنفس میں زیادتی ہو جاتی ہے لیکن کچھ عرصہ کے بعد مخصوص تغیرات کے ذخیرہ میں کمی واقع ہونے کے باعث تنفس کی رفتار پھر آہستہ ہو جاتی ہے۔

بیرونی حالات کا زندہ نباتاتی اجسام کے تنفس پر نمایاں اثر پڑتا ہے۔ مثلاً آکسیجن کی مقدار بڑھانے یا گھٹانے سے تنفس علی الترتیب تیز یا سست ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر بلیک مین نے تجربات سے معلوم کیا تھا کہ سیب کا تنفس ۵ تا ۹ فیصدی آکسیجن میں کم سے کم درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح بنارس یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر سنگھ نے ڈاکٹر بلیک مین کی نقالی کرتے ہوئے دریافت کیا تھا کہ لنگڑا آم کا تنفس ۹ فیصدی آکسیجن میں حد درجہ تک گر جاتا ہے۔ راقم الحروف کی رائے میں ان دونوں ماہرین سائنس کے تجربات کے نتائج کسی قدر نامکمل ہیں۔ اصل میں واقعہ یہ ہے کہ پختگی شروع ہونے کے وقت سیب کو کم از کم سانس لینے کے لئے صرف ڈیڑھ فیصدی آکسیجن درکار ہوتی ہے۔ اس کے بعد جوں جوں اس کی عمر بڑھتی ہے اسی طرح سانس کو حد درجہ تک گھٹانے کے لئے زیادہ آکسیجن کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ ڈھلے ہوئے سیب میں مذکورہ بالا کیفیت پیدا کرنے کے لئے بعض اوقات ۱۲ فیصدی سے بھی زیادہ آکسیجن استعمال کی جاتی ہے۔ اگر بنارس یونیورسٹی کے پروفیسر سنگھ مختلف عمر کے لنگڑا آم لیکر تجربات کرتے تو ان کو اپنی غلطی کا خود احساس ہو جاتا۔

ایک مرتبہ پھلوں کے تنفس پر تجربہ کرتے ہوئے چند تندرست اور تر و تازہ سیبوں کو ایک موٹے آہنی صندوقچے کے اندر بند کر کے آلات کے ذریعہ اُن پر خالص آکسیجن کا دباؤ ڈالا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دباؤ کی شدت کی وجہ سے سیبوں نے اچانک سانس لینا چھوڑ دیا۔ اگرچہ سیبوں کی شکل و صورت اور ذائقہ میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ مگر اُن میں زندگی کا کوئی نشان باقی نہیں تھا۔ چنانچہ ایک یا دو روز تک کمرہ میں بلوری ڈھکن کے اندر رکھا رہنے کے بعد ان کے مردہ جسم جانوروں کی لاشوں کی مانند سڑنا شروع ہو گئے۔ یہ ایسا معمہ ہے جس کے متعلق وثوق کے ساتھ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

آکسیجن کی مانند حرارت کی کمی و بیشی سے بھی تنفس بڑھتا یا گھٹتا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہر متنفس کی حیات کا طول معین ہے۔ مگر یوگ کے ماہرین کا خیال ہے کہ ہر شخص کے سانس کی مقدار مقرر ہے۔ اس لئے تیز سانس لینے سے عمر گھٹتی اور آہستہ سانس لینے سے عمر بڑھتی ہے۔ جہاں تک نباتاتی اجسام کا تعلق ہے یوگیوں کا دعویٰ کسی قدر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ جدید تحقیقات سے ظاہر ہوا ہے کہ درخت سے علٰحدہ ہونے کے بعد پھل کے جسم سے کاربن ڈائی آکسائڈ کی جو مقدار [illegible] کا وزن فطرت کے رجسٹر میں غالباً پہلے سے درج ہوتا ہے۔ اگر پھل کسی [illegible] وقت [illegible]

تو وہ بھی چست ہو کر تیزی سے سانس لینے لگتا ہے۔

تجربات سے معلوم ہوا ہے کہ پودہ کا ہر نازک حصّہ نہایت حسّاس ہوتا ہے۔ اگر کسی تندرست پتّہ کو انگلی سے چھُوا جائے تو اس کے تنفّس کی رفتار فوراً تیز ہو جاتی ہے۔ دراصل کمسنی اور نوجوانی کے زمانہ میں پتّہ ذکی الحس اور نازک طبع ہوتا ہے۔ جوں جوں عمر بڑھتی ہے اُسی نسبت سے اُس کی خواص کمزور ہو جاتے ہیں۔ یہی کیفیت پھلوں کی ہے۔ اگر کچّے پھل کی جلد کو نشتر سے کاٹا جائے تو کچھ عرصہ کے بعد شگاف مندمل ہو کر خشک ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے پکّے پھل کی جلد پر اس قسم کا معمولی جرّاحی عمل کرنے کے بعد زخم کبھی درست نہیں ہوتا بلکہ سڑنے لگتا ہے۔

اکثر حضرات نے دیکھا ہوگا کہ بدنصیب شرابی وِہسکی کا پہلا جام پیتے ہی بے حجاب ہو کر بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ قہقہہ لگاتا ہے۔ گاتا ہے اور بعض اوقات ناچتا ہے۔ دوسرا پیالہ خالی کرنے کے بعد اس کی آنکھیں سُرخ ہو جاتی ہیں۔ آواز بدل جاتی ہے۔ جسم میں طاقت نہیں رہتی اور ٹانگیں لڑکھڑانے لگتی ہیں۔ تیسرا دَور ختم کرتے ہی روسیاہ شرابی بیہوش ہو کر فرش پر گر پڑتا ہے۔ اگر کہیں بہت زیادہ چڑھا لے تو پھر موت سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ کم و بیش یہی حال نباتاتی اجسام کا ہے۔ اگر پتّہ کے نازک جسم میں ہلکی شراب داخل کیجائے تو وہ مسرور ہو کر سرعت کے ساتھ سانس لینا شروع کرتا ہے۔ شراب زیادہ مقدار میں پہنچانے کے بعد اس کا تنفّس بڑھتی ہوئی بدمستی کی وجہ سے بتدریج کم ہونے لگتا ہے۔ آخر کار بے گناہ پتّہ اِس تباہ کُن شے کے زہریلے اثر سے مغلوب ہو کر بالکل مردہ ہو جاتا ہے۔

افیون اور اس قسم کے دوسرے مرکبات کا اثر بھی نباتاتی تنفّس پر یہی ہوتا ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے اس امر کی چند الفاظ میں تشریح کرنا ضروری ہے کہ تنفّس کی رفتار درحقیقت نباتاتی جسم کے تخریبی عملیات کی شدّت کو ظاہر کرتی ہے یعنی تنفّس کا تیز یا سُست ہونا تخریبی عملیات کی زیادتی یا آہستگی کا ظاہرہ ثبوت ہے۔ اگر کسی وجہ سے سانس کی رفتار بڑھتی ہے تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ نباتاتی جسم کے اندر غذائی اشیاء کی کیمیائی ٹوٹ پھوٹ سُرعت کے ساتھ ہونے لگتی ہے۔

گزشتہ موسم گرما میں ایک دن صبح سویرے راقم الحروف چہل قدمی کرتا ہوا نقوی پارک کی طرف نکل گیا۔ اُس وقت عجیب و غریب منظر تھا۔ موذّن کی درد بھری آواز۔ کوئل کی جگرسوز فریاد اور پپیہے کی فلک شگاف صدا سے فضا گونج رہی تھی۔ بادِ سحری کے ہلکے ہلکے جھونکے دِرختوں کی

اپنی غلطی کا احساس ہوا تو خوف زدہ ہو کر اس نے سب سے پہلے گیس کی ٹونٹی بند کی اور پھر کمرہ کی ہوا صاف کرنے کی غرض سے تمام کھڑکیاں کھول دیں۔ چونکہ باہر ہوا تیز چل رہی تھی اس لئے تھوڑی دیر کے بعد کمرہ کی فضا بہت حد تک صاف ہو گئی۔ غرضیکہ اس دلچسپ حادثہ نے یہ بات منکشف کر دی کہ نباتاتی تنفس پر کوئلہ کی گیس کا غیر معمولی اثر پڑتا ہے۔ مزید تحقیقات کے بعد ہر کلانس نے معلوم کر لیا کہ کوئلہ کی گیس کے جزویات میں سے زیادہ تر ایتھیلین گیس کی وجہ سے نباتاتی اجسام بےچین ہو کر سرگرمی سے سانس لینے لگتے ہیں۔

حال ہی میں یہ بات دریافت ہوئی ہے کہ قدرت خود پکتے ہوئے پھل کے اندر ایتھیلین گیس نہایت قلیل مقدار میں پیدا کرتی ہے۔ اس لئے اگر کسی تیار پھل کو گدرے پھل کے ساتھ ایک چھوٹے بکس میں بند کر دیا جائے تو پختہ پھل کی بیرانہ صحبت سے متاثر ہو کر خام پھل بھی جلدی پکنے لگتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پکے ہوئے پھل کے جسم سے گیس نکل کر کچے پھل میں داخل ہوتی ہے اور اس کے تنفس کی رفتار کو تیز کر دیتی ہے۔ غرضیکہ خربوزہ کا خربوزہ کو دیکھ کر رنگ بدلنا ایسی حقیقت ہے جس سے اب کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

بہت مدت ہوئی کہ بعض سائنسدانوں نے معلوم کیا تھا کہ کچھ دیر روشنی میں رکھا رہنے کے بعد سبز پتہ کے تنفس میں زیادتی ہو جاتی ہے۔ دراصل روشنی کے اثر کی وجہ سے ترکیب شعاعی عمل میں آتی ہے۔ اور شکریات کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ چونکہ تنفس کی رفتار کسی حد تک شکریات کی مقدار پر منحصر ہوتی ہے اس لئے روشنی کے بالواسطہ اثر سے سبز پتہ کا تنفس تیز ہو جاتا ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ نباتیات کے صدر پروفیسر نسری رنجن نے وسیع پیمانہ پر تجربات کرنے کے بعد ثابت کیا ہے کہ روشنی براہ راست اثر پذیر ہو کر تنفس میں اضافہ کر دیتی ہے۔ اگرچہ راقم الحروف کو پروفیسر موصوف کے اس نتیجہ سے کلیتاً اختلاف نہیں مگر اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اس پیچیدہ مسئلہ کو مکمل طور پر حل کرنے کے لئے مزید تحقیقات کی کافی گنجائش ہے۔

آجکل تعلیمیافتہ لوگ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ بیمار اور کمزور اشخاص کے لئے ڈاکٹر بالعموم انگوری شکر تجویز کیا کرتے ہیں۔ اس شکر کے کھاتے ہی جسم میں کچھ عرصہ کے لئے طاقت محسوس ہونے لگتی ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے ایک تجربہ کار اور قابل معلم جن کا جسم کسی قدر لاغر ہے ٹینس کھیلنے سے پہلے کبھی کبھی انگوری شکر کھایا کرتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اس کے استعمال سے جسم میں طاقت آ جاتی ہے۔ اسی طرح اگر پودہ کے کسی جاندار عضو میں شہد یا انگوری شکر کا ہلکا شربت پچکاری کے ذریعہ داخل کیا جائے

مہر بلب ہے۔ صرف ترجمانِ فطرت ہی تیرا راز دار ہے۔ وہ تیرے تنفس کی رفتار کا امتحان کر کے تیری اصلی کیفیت کا صحیح اندازہ لگا سکتا ہے۔ تو معصوم ہے مگر ذلیل نہیں۔ خاموش ہے مگر بے حس نہیں۔ اپنی عمر کا بہترین حصہ محنت و مشقت اور بے لوث خدمت میں صرف کر کے آخر کار خزاں کے موسم میں جو گیا کفنی اوڑھکر دم توڑتا ہوا مادرِ وطن سے علیحدہ ہوتا ہے۔ اور تھوڑی دیر ہوا میں منڈلا کر زمین پر گرتا ہے اور ہمیشہ کے لئے پیوست خاک ہو جاتا ہے۔ تیری معصومیت، بے غرضی اور بے نیازی عدیم المثال ہے۔

اے سبز پوش برگ! شباب ہو یا پیری۔ گرمی ہو یا سردی۔ ہر حالت اور ہر موسم میں تو اپنے فرائض کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتا ہے۔ تیرا علی الصباح بیدار ہو کر مصروفِ کار ہونا اور پھر دن بھر آفتاب کی روشنی میں سادہ اشیاء سے شکریات۔ نشاستہ اور دیگر مرکبات تیار کرنا ایسا عقدہ ہے جس کو شہرۂ آفاق ماہرینِ سائنس بھی سالہا سال کی کاوش کے بعد حل نہ کر سکے۔ تیرے کرشمات دیکھکر وہ آج تک محوِ حیرت ہیں۔ مگر تو ہے کہ ان کمالات کے باوجود عجز و انکساری کا مجسمہ ہے۔ تیری ہی مسلسل محنت و مزدوری پر عالمِ ذی روح کا انحصار ہے اور تو ہی عالمِ ذیحیات کا پیٹ پالتا ہے۔ بیشک تو رزق کا فرشتہ ہے۔ بد طینت اور بد کردار انسان اشرف الکائنات ہو یا نہ ہو مگر بالیقیں تو رازق المخلوقات ہے[۱]۔

رفیق احمد

---

[۱] یہ مقالہ ۹ فروری ۱۹۴۲ء کو مجلس مصنفین علی گڑھ کے ترپنویں (۵۳) اجلاس میں زیر صدارت ڈاکٹر نواب ناظر یار جنگ بہادر پڑھا گیا۔

نازک ڈالیوں سے اٹھکھیلیاں کر رہے تھے۔ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ مگر مشرق کی جانب ارض و سما اپنے چہروں سے سیاہ نقاب اُٹھتا دیکھ کر شرم کی وجہ سے گلابی رُو ہو چکے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی قدر اُجالا ہو گیا اور ہر شے دکھلائی دینے لگی۔ اس وقت راقم الحروف کی نظر ایک تنہا پتہ پر پڑی جو ایک لمبی اور پتلی شاخ کے سرے پر ٹھنڈی ہوا میں جھوم جھوم کر اپنے خالق کی حمد و ثنا کر رہا تھا۔ راقم الحروف نے دل ہی دل میں پتہ سے مخاطب ہو کر جو کچھ کہا وہ ذیل میں درج ہے۔ درا صل یہ مختصر خطاب آج کے مقالہ کا خلاصہ ہے۔

اے نازک برگِ سبز! کیا تجھے معلوم ہے کہ خود غرض اور مغرور انسان تیری اصلیت سے نا آشنا ہے۔ وہ تیری دلفریب رنگینی اور خوشنما شکل دیکھ کر محظوظ ہوتا ہے مگر تیری حقیقت سے غافل ہے۔ وہ اپنی عظمت کے نشہ میں تجھے کائنات کا صرف زمردی زیور تصور کرتا ہے۔ اُس کو کیا خبر کہ تیرے نازک جسم کا ہر رگ و ریشہ خالقِ دوعالم کی حیرت انگیز صنعت اور کاریگری کا شاہد ہے۔ اور تیری ادنیٰ ہستی میں قدرت کے عظیم الشان راز پنہاں ہیں۔ اسے کیا علم کہ تو قانون فطرت کی یک ورقہ کتاب ہے۔ وہ نہیں سمجھتا کہ تیری زندگی کا ہر فعل اِس کے لئے سبق آموز ہے۔ تو ہر لحہ پروردگارِ عالم کے قانون پر پابند ہے۔ تجھے "اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ" کے پیغام کی ضرورت نہیں۔ یہ منادی صرف خوابیدہ اور راحت پسند لوگوں کے لئے ہے۔ تجھے غسل و وضو کی ضرورت نہیں۔ تو مستقل طور پر پاک اور صاف ہے۔ نماز اور روزہ تجھ پر فرض نہیں۔ تیرا ہر فعل بذاتِ خود عبادتِ الٰہی ہے۔ غرضیکہ تو اپنے معبود کا فرمانبردار بندہ ہے۔

اے ہری پوشاک والے! تیری رگوں میں خون نہیں مگر تیرے جسم کا ہر خلیّہ زندگی کا مسکن ہے۔ تیرے پہلو میں قلب نہیں مگر تیرے سینہ میں احساسات کا دریا موجزن ہے۔ تو شگفتہ ہو یا پژمُردہ۔ مسرور ہو یا رنجور۔ ہر حالت میں

اور تقریب ایک درجن لڑکوں اور لڑکیوں کے ہائی اسکول ہیں لیکن وہاں آج تک اُردو کی کتابوں کا کوئی قابل ذکر کتب خانہ موجود نہ تھا۔ اس کمی کو ایک باہمت اور ذوقِ سلیم رکھنے والے عزیز منشی خلیل الرحمٰن نے پورا کیا اور اُن کا قایم کردہ "قومی کتب خانہ" روزافزوں ترقی کر رہا ہے۔ اس کتب خانہ میں ہندستان کی قریب قریب تمام جدید مطبوعاتِ اردو فروخت ہوتی ہیں۔

خلیل الرحمٰن صاحب نے خود اپنی کتابیں شایع کرنے کا بھی سلسلہ شروع کیا ہے۔ "شاعراتِ اُردو" سلسلۂ مذکور کی پہلی کتاب ہے۔ کتاب کیا ہے اُردو زبان کی ترقی میں خواتین نے جو حصّہ لیا ہے اُس کی مکمل قاموس اور ایک سیر حاصل جائزہ (سَروے) ہے۔

لائق مؤلف محمد جمیل احمد ایم۔ اے بریلوی نے تاریخ ادبیاتِ اُردو کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے نہایت قیمتی مواد فراہم کر دیا ہے جس کی امداد سے آیندہ کام کرنیوالوں کی مفید رہنمائی ہوگی۔

"تذکرۂ شاعراتِ اردو" ہر اردو داں گھر میں موجود رہنا چاہئے تاکہ اُس کے مطالعہ سے ہماری خواتین میں ذوقِ ادب پیدا ہو۔ اس کتاب کی قیمت پچیس روپے بھی کم ہوتی لیکن صرف صہ۱۲ میں ملتی ہے۔ (سید الطاف علی بریلوی)

سنٹرل دواخانہ دہلی

یہ دواخانہ فی الحقیقت باصطلاحِ عام "دواخانہ" نہیں ہے بلکہ "دواسازی کا کارخانہ" ہے جس کے لئے یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ باندازِ کیمیاوی یونانی دواسازی کا دہلی کیا بلکہ ہندوستان میں یہ پہلا کارخانہ ہے جس نے صحیح معنوں میں دواسازی کی رہنمائی کی۔ حکیم سید انوار احمد صاحب اشرف تھلوی نے۔ جو اب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اس فن کو۔ جو الکیمیا اس لئے موروثی فن ہے کہ اس فن کے امام حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ تھے۔ بامِ عروج پر پہنچا کر طب یونانی میں چار چاند لگا دئے۔ اپنی محنت اور تحقیقات دواسازی کا یہ ثمرہ ہے کہ آج اس کو شاہِ دکن کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں دو فرمان جن کا عکس فہرست زیر نظر میں شایع کیا گیا ہے۔ اس اعتماد کی شہادت دے رہے ہیں جو اس دواخانہ کو جو اس کو دواسازی کی دنیا میں حاصل ہے۔ اور جو بالخصوص شاہِ دکن کو ہے۔ مرحوم و مغفور حکیم اجمل خاں بہادر کے اعتماد کے متعلق صرف یہ لکھدینا کافی ہے کہ وہ میر صاحب کو اپنے وقت کا "جابر بن حیان" سمجھتے تھے جو دوسری صدی ہجری کا امام الکیمیا گزرا ہے۔

غرضکہ حکیم سید انوار احمد صاحب اشرف کا یہ دواخانہ کم و بیش ساٹھ سال سے وہ انسانی خدمات انجام دے رہا ہے جس کی مثال ملتی دنیا میں مشکل سے ملتی ہے۔ فقط (مینجر)

مُصنّف

جلد ۳ | بابت ماہ جون سنہ ۴۵ء | نمبر ۱۱

فہرست مضامین

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	ذکرِ ماضی اور فکرِ فردا . . .	سید الطاف علی بریلوی (مُدیر)	۲ تا ۸
۲	تسخیرِ امراض یا فنِ طب کی تاریخ اور اُس کا تدریجی ارتقاء . .	مولانا سید طفیل احمد صاحب (علیگ)	۹ ″ ۲۹
۳	اُزبکستان کی علمی سرگرمیاں . .	ل۔ احمد صاحب اکبرآبادی	۳۰ ″ ۳۷
۴	زاہدہ خاتون نزہت	صاحبزادہ ممتاز علی خاں صاحب بی۔ اے (علیگ)	۳۸ ″ ۴۷
۵	ذوقِ عمل (نظم)	علامہ سلیم پانی پتی مرحوم	۴۷
۶	دار المصنفین اعظم گڑھ	پروفیسر محمد عُزیر صاحب ایم۔ اے	۴۸ ″ ۶۰
۷	تمہیں سے اے مجاہدو! جہاں کا ثبات ہے (نظم)	مولانا عبد المجید سالک صاحب مُدیر انقلاب لاہور	۶۰
۸	مسلمان اور سائنس	سید لطیف حسین ادیب بریلوی	۶۱ ″ ۶۷
۹	جنرل بخت خاں روہیلہ	سیدہ انیس فاطمہ (بیگم الطاف علی بریلوی) .	۶۸ ″ ۸۶
۱۰	معاونین "مصنف"	. . . .	۸۷ ″ ۸۸

ہوگا۔ اور اس کے شائع ہونے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ جس جس علم و فن پر جس قدر کام ہو چکا ہے ان کی کمیت و کیفیت نگاہ میں آجائے گی۔

مولانا مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی نے اس اہم کام میں مدد دینے کے لئے اپنی قریب قریب مستقل سکونت 'بیت المصنف' میں اختیار کر لی ہے۔

حکیم شریف الزماں صاحب اکبرآبادی نے بنگش پٹھانوں کی مشہور کتاب "تاریخ فرخ آباد" مولفہ مفتی ولی اللہ صاحب کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ مکمل کر دیا یہ ۳۰-۱۸۲۹ء کی نہایت اہم تالیف ہے۔ تقریباً چار سو صفحات کی کتاب ہوگی۔

خاندان نواب نجیب الدولہ کے حالات میں مرزا نصیر الدین برلاس مرحوم کی قیمتی کتاب 'نجیب التواریخ' جو ۱۸۶۴ء میں تصنیف ہوئی تھی۔ اس کی ایک نقل 'بیت المصنف' کے لئے کرالی گئی ہے اور زیادہ تر اسی سے حاصل شدہ مواد کی بنا پر "غلام قادر روہیلہ" کی تائید و حمایت میں راقم السطور کا مقالہ اخبار 'ڈان' کی اشاعت ۲۵ فروری اور ۴ و ۱۱ مارچ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ مولوی سراج الحق قریشی صاحب بی۔ اے۔ نے اس مقالہ کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا ہے جو انشاء اللہ 'مصنف' کے اگلے شمارہ میں شائع ہوگا۔

مولانا ابرار حسین فاروقی صاحب ایم۔ اے جب سے حیدرآباد سے علیگڑھ تشریف لائے 'بیت المصنف' سے وابستہ ہیں۔ اس عرصہ میں آپ کی بھی تین کتابیں "مرقع افغان" یا لودیوں کا ہندوستان" "تاریخ خاندان والاجاہی کوپاموی" الموسوم بہ "تحفۃ الابرار" اور "بزم رس" یعنی مسدس ہندی حضرت وجہہ شاہ صاحب تیار ہوگئیں۔ ثانی الذکر کی تیاری میں مولانا صاحب کو اپنے خاندانی ذخیرہ کے علاوہ کانفرنس لائبریری کی قلمی کتاب "تحفۃ الاخبار" سے بھی بہت مدد ملی۔ جو کرناٹک کی از ابتدائے نظامت تا نواب والاجاہ اوّل۔ دوم۔ سوم اور عہد ایسٹ انڈیا کمپنی کی مبسوط تاریخ ہے۔

ایک اور قیمتی قلمی کتاب "سرگزشت طہماس مسکین" جس سے اٹھارویں صدی عیسوی کے تاریخی واقعات بالخصوص نواب معین الملک عرف میر منّو گورنر پنجاب جنہوں نے دو مرتبہ احمد شاہ درّانی کے حملوں کو روکا اور سکھوں کے خلاف زبردست جہاد کیا پر بالکل نئی روشنی پڑتی ہے۔ کتاب خانہ حبیب گنج سے حاصل کی گئی اور اس کا اُردو ترجمہ جناب مولوی معین الدین صاحب نے مکمل کر دیا

متذکرہ بالا جملہ کتابیں کاغذ کی سہولت ہوتے ہی انشاء اللہ زیور طبع سے آراستہ ہوں گی۔ اور مجلس مصنفین یا شرما منظور کی ریسرچ اکیڈیمی کی طرف سے شائع کی جائیں گی۔

علمی کام کرنے کا ایک چھوٹا سا مرکز قائم ہو جانے کی وجہ سے علیگڑھ تشریف لانے والے بعض اہل علم حضرات 'بیت المصنف' میں بھی قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ سہ ماہی میں جناب افضل العلما، خان بہادر ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب پرنسپل محمڈن کالج مدراس۔ نجیب اشرف صاحب ندوی۔ پروفیسر اسمٰعیل اندھیری کالج بمبئی۔ مولوی محمود احمد عباسی صاحب امروہہ۔ مولانا نظام الدین حسن صاحب نظامی بدایونی۔ راجہ میر احمد علیخاں بہادر آف محمود آباد۔ مولانا ابن حسن صاحب جارچوی۔ مولانا ظفر الملک علوی صاحب۔ قاضی عبد الغفار صاحب ایڈیٹر پیام۔ اور پروفیسر طاہر فاروقی ایم۔ اے وغیرہم نے اپنی تشریف آوری سے 'بیت المصنف' کو مفتخر فرمایا۔

مجلس مصنفین۔ رسالہ "مصنف" اور "بیت المصنف" کے سب کاموں کو بالکل اُسی طرح چلایا جاتا ہے جس طرح کبھی مولانا حسرت موہانی ڈھائی آنے یومیہ میں 'بغرافت' بمبئی میں گزر اوقات کرتے تھے۔ ع

"خدا خود میر سامان است ارباب توکل را"

پر ہمارا ایمان ہے اور بفضلہ ہم مطمئن ہیں۔

'بیت المصنف' میں کتابوں کا بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ حال میں جناب مولوی محمد امین زبیری صاحب نے تبرکات بہت مرحمت فرمائی ہیں۔ جناب قاضی احمد میاں اختر صاحب جوناگڑھی کا موعودہ کتابوں کا ایک بڑا صندوق بھی عنقریب آنے والا ہے۔

> ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بجنے کا
> کیا بے تاب کاں میں جنبش جوہر نے آہن کو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ذکرِ ماضی اور فکرِ فردا

غالبؔ ترا احوال سنا دیں گے ہم اُن کو
وہ سُن کے بُلا لیں! یہ اجارہ نہیں کرتے

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی "سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" یا "انڈین اکیڈیمی آف اسلامک ریسرچ" کی تحریک تیز رفتاری کے ساتھ چل رہی ہے۔ دہلی میں منعقد شدہ سب کمیٹی کی رپورٹ ۱۵ اپریل ۱۹۴۳ء کو چھ بجے شام صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ میں بڑی کمیٹی کے جلسہ میں پیش ہوئی۔ مقامی ماہرانِ علم و فن کے علاوہ بیرونی حضرات میں آنریبل ڈاکٹر سر محمد عزیز الحق صاحب۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب۔ اور آنریبل خواجہ غلام السیدین صاحب شریک ہوئے۔ کانفرنس کی جانب سے پر تکلف دعوتِ عصرانہ کالج زیرِ انتظام خان بہادر پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب اہتمام کیا گیا تھا۔ جلسہ کا آغاز جناب ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر کے ایک بصیرت افروز پیغام سے ہوا۔ کافی بحث و گفتگو اور غور و خوض کے بعد متذکرہ بالا سب کمیٹی کی رپورٹ منظور کی گئی۔

اس جلسہ کی خاص کامیابی یہ تھی کہ اس میں پہلی مرتبہ جناب لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب رونق افروز ہوئے اور بحیثیت صدر آپ نے جلسہ کو کامیاب بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے اظہارِ دلچسپی سے قیام "ریسرچ اکیڈیمی" کا کام قرین کامیابی ہو گیا ہے اور یقین ہے کہ اُن کی مخلصانہ ہمدردی سے بہت کچھ مشکلات کا خاتمہ ہو جائیگا۔

---

۱۰ مئی ۱۹۴۳ء کو اکیڈیمی کی اسکیم کانفرنس ورکنگ کمیٹی میں پیش ہو کر منظور ہوئی اور اب عنقریب کانفرنس سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کی منظوری سے مجوزہ ادارہ کی مختلف جماعت ہائے انتظامی و عہدہ داران کا انتخاب اور اسٹاف وغیرہ کا تقرر عمل میں آ جائیگا۔

چونکہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور مجلس مصنفین علیگڑھ کے کارکن مشترک ہیں۔ اس لئے اولی الذکر مستطیع اور ذی اثر جماعت کے زیر سرپرستی وقت کی اہم قومی ضرورت۔ انڈین اکیڈیمی آف اسلامک ریسرچ کے قیام کا سامان بہم ہوتے دیکھا گیا تو مجلس مصنفین علیگڑھ کو زیادہ وسعت دینے کا خیال بالفعل ترک کر دیا گیا۔ اگرچہ

داشتہ آید بکار

کے حکیمانہ قول کے مطابق اس کی موجودہ حیثیت کو ضرور برقرار رکھا جائیگا۔ مجلس کے جلسے ہوتے رہیں گے اور اس کا علمی رسالہ مصنّف بھی بدستور جاری رہے گا۔

کانفرنس کی ریسرچ اکیڈیمی۔ مشاہیر علماء، مقتدر ماہرانِ فن اور صاحبِ ثروت۔ بزرگانِ ملت کی سرپرستی میں بلند و بالا عمارت۔ اعلیٰ درجہ کی لائبریری و میوزیم۔ فاضل اسٹاف اور دوسرے عمدہ ساز و سامان کے ساتھ قایم ہو کر دن دونی رات چوگنی ترقی کے منازل طے کرے گی۔ اور مجلس مصنّفین بالکل 'بے ضابطہ' اور 'بے قاعدہ' اپنے قدیم "خانقاہی" اصول پر اُس غریب بڑھیا کے جھونپڑے کی طرح قایم رہیگی۔ جس کے قریب نوشیروانِ 'عادل' کا شاندار محل تعمیر ہو گیا تھا۔

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جُدا جُدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

ناظرینِ مصنّف "بیت المصنّف" سے متعارف ہو چکے ہیں۔ جس کی عمر اگرچہ عملاً چار سال ہے لیکن حقیقی عمر اس کی صرف سات ماہ کی ہے۔ 'مجلس مصنفین' کے علمی و تحقیقی مقالات کے ساتھ ہی ساتھ جو مصنّف میں شائع ہوئے ہیں۔ 'بیت المصنّف' میں کتابوں کی تصنیف و تالیف اور تراجم کا سلسلہ بھی مختصر پیمانہ پر جاری ہے۔

سب سے اہم کام کتابیاتِ اُردو کی تدوین کا ہے۔ جو ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کی فرمایش پر ہو رہا ہے۔ کتابیات مذکور میں ابتدا سے اس وقت تک کی تقریباً پچیس ہزار مطبوعہ کتابوں کا احوال باعتبار مضمون اور مصنّف درج

مضامین کی وجہ سے اُردو کے معیاری رسالوں میں کافی بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ اس کے لئے اہل ملک کو آپ کا ممنون ہونا چاہئے خصوصًا اہالیانِ حیدرآباد آپ کی محنت و کوشش کے ممنون احسان ہیں۔

نواب زادہ مشتاق علیخاں صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل بی بھوپال

جن خیالات کا آپنے اظہار کیا ہے اور جو الفاظ میرے متعلق آپنے لکھے ہیں اُن کے لئے تہ دل سے ممنون ہوں۔ یہ سب علیگڑھ کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے۔ 'معتقف' تو اُسی زمانہ میں معرضِ وجود میں آگیا تھا جب میں زیرِ تعلیم تھا۔ اور احباب میں اِس کی ضرورت کے چرچے ہوئے تھے۔ دعائے خیر میں یاد رکھئے۔

پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی ایم۔ اے (بمبئی)

میں نے بمبئی یونیورسٹی اور اسمٰعیل اندھیری کالج میں خریداریِ 'معتقف' کی تحریک کی ہے عنقریب یہ کام ہو جائیگا۔ اپنا چندہ بذریعہ چک روانہ کرتا ہوں۔ اِدھر پھر کب آنا ہوگا۔ یہاں کی خشک تجارتی فضا سے دل پریشان رہتا ہے۔ (علیگڑھ آنے کی تمنا ہے)

مولوی خصلت حسین صابری صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر آف پولیس جھانسی

تحسین ناشناسی سے ڈرتا ہوں، مگر 'خمریات' علوی صاحب کے مقالہ کے تحت جو حاشیہ آپنے (مذمتِ شراب میں) ثبت فرمایا ہے اُسے دیکھکر جی نہ مانا اور لکھنے کی جرأت ہوئی ؎

ملتی ہے وہ ساقیِ کوثر سے یہ خدمت
اس طرح کوئی پیرِ مغاں ہو نہیں سکتا

یہ تو ہمارے ریاض صاحب نے کہا ہے جنہیں میں نے خود بھی برتا ہے اور یقین ہے کہ وہ آپ کے (علوی صاحب) کی "مے" سے مبرا تھے۔ ہے داغ نہ غالب ایسے میخوار بھی ہم جیسے زاہد (خشک) سے بہت پاکیزہ۔ بقولِ غالب ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

یا یہ کہا ہے! داغ نے ؎

مبرلے زاہد نا فہم نہ مے خواروں کا
بخشنے والا بھی دیکھا ہے گنہگاروں کا

آپ کا یہ لکھنا "تاہم یہ لوگ بے وجہ خود گنہگار اور دوسروں کی ترغیب کا باعث ہوئے"۔ کہاں تک ان بے گناہوں کے لئے روح افزا ہوگا۔ اور پھر یہ ہدایت "اگر مسلمان اپنے پچھلے قومی نقصانات کی تلافی کرنا چاہتے ہیں اور اپنی زندگی کو منظم و کامد بنا کر ملک و ملت کی ترقی چاہتے ہیں تو انھیں اس ناپاک شیطانی عمل کے ذکر سے اپنے سارے نثر و نظم کے لٹریچر کو پاک کر دینا چاہئے۔"

ہر چیز ظاہر و باطن رکھتی ہے ہم لوگ ظاہر سے تو مسلوک اور بے خود۔ مگر ایک غریب جو مئے وحدت سے چور و مخمور ہو وہ گنہگار! سچ ہے تعلیم بھی اب ظاہر کی رہ گئی ہے۔ ہر قدم پر ہم اور ہمارے نوجوان لغزش کر رہے ہیں۔ مگر ایک شرابی جو بظاہر صرف ہماری نظر میں ایک گناہ کا مرتکب نظر آتا ہے اور ساتھ ہی احساسِ گناہ بھی رکھتا ہے بلکہ اپنی عادات و اطوار سے اس کا اظہار بھی کرتا ہے اُسے روسیاہ و خطاکار بتلایا جاتا ہے اور سب سے بڑے گناہ کا مجرم۔

اسلام "جام وحدت" پر مبنی اور "ساقی کوثر" کی نظر پر منحصر ہے۔ ع

در عمل کوش ہر چہ خواہی پوش

مولوی سلطان حیدر جوش صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر علیگڑھ

پیر نما اس تحریر سے چیں بجبیں نہ ہو جیے۔ "نیک خصلت" اپنی طینت سے مجبور ہے اور آپ اپنی عادت سے معذور! لکھنے والے بہت کچھ لکھ چکے ہیں مگر ہٹ دھرمی کے 'مولا بخش' کا بول بالا رہتا ہے۔ مناسب ہو کہ آپ اس شعر کی تشریح بھی کر دیں ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

بہتر ہے کہ اس کو ردی کی ٹوکری میں ڈالکر ایک ڈکار لے لیجئے۔

الجواب

مشہور ہے کہ خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ مئی اور جون کے مہینوں میں جبکہ راقم السطور کی طرح اللہ کے نیک بندے کشمیر۔ شملہ۔ مسوری۔ اور نینی تال بھیجے جارہے ہیں۔ ہمارے (برعکس نہند نام زنگی کافور) "نیک خصلت" بزرگ کا تائید شراب نوشی کی پاداش میں علیگڑھ سے جھانسی جیسے ہندملکھنڈی جہنم میں تبادلہ ہوا ہے۔ بہ تعرف خفی بقول حضرت مضطر خیرآبادی ؎

جہنم کا دَر ہے یہ زندانِ جھانسی
عجب پُرخطر ہے یہ ایوانِ جھانسی

اب گزشتہ سہ ماہی کی ڈاک

بزمِ مصنف

ملاحظہ ہو:-

مولانا مسعود عالم ندوی صاحب جماعت اسلامی کے ساتھ میری وابستگی کا علم تو آپ کو ہوگا ہی اس سلسلہ میں بہار سے منتقل ہو کر پنجاب (دار العروبیہ دانشمند جالندھر) چلا آیا ہوں۔ رسالہ ترجمان القرآن کو اوڈٹ تو مولانا مودودی صاحب ہی کرتے ہیں البتہ جنگ کے اختتام کے بعد ایک عربی مجلہ نکالنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ جس کے ذریعہ عربی دنیا کو خطاب کیا جائیگا اور "تحریک" سے متعلق عربی زبان میں ترجمہ و تالیف کا کام بھی ہوگا جس کا آغاز ہو چکا ہے۔ ترجمان کی اشاعت بابت ماہ رجب و شعبان میں اپنی اسکیم کے متعلق میں خود ہی اظہارِ خیال کر چکا ہوں۔ اگر کہیں دستیاب ہوں تو ملاحظہ فرمالیں۔ تحریک اسلامی کی نوعیت اور رجحانات سے بے خبر رہنا شاید یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ آپ جیسے باخبر حضرات کے لئے روا نہیں ہے۔ "تحریک سوانحیات" پر میں نے ایک کتاب مرتب کر لی ہے جو انشاء اللہ مستقل قریب میں شائع ہو جائے گی عجلت میں یہ چند سطور لکھ رہا بلکہ لکھوا رہا ہوں تفصیلات پھر کبھی عرض کی جائیں گی۔

مولوی عبد السلام خاں صاحب جلال مدیر افغان دہلی آپ کا محققانہ مضمون "غلام قادر روہیلہ" جو انگریزی اخبار ڈان میں شائع ہو کر نظر سے گزرا اکثر صاحبانِ علم نے اُسے بہت پسند کیا۔ ادارہ 'افغان' کا خیال ہے کہ اس کا ترجمہ 'افغان' میں شائع کیا جائے۔ اس میں چونکہ آپ سے استصواب ضروری ہے۔ اس لئے مکلف خدمت والا ہوں کہ رائے گرامی سے مطلع فرمائیں۔

ادارے کی استدعا ہے کہ شیر شاہ سوری نے قلعۂ رہتاس پر جو حملہ کیا اگر وہ اُس میں حق بجانب تھا تو اُس پر بھی اسی طرح محققانہ روشنی ڈالی جائے۔ ادارہ آپ کا ممنونِ کرم ہوگا۔

اسلامک کلچر حیدر آباد دکن مجلس مصنفین علیگڑھ نے جو مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ اور اہل علم حضرات کا ایک جدید قایم شدہ علمی مرکز ہے۔ کافی تعداد میں بہت دلچسپ اور معتدل قدر مطبوعات اور رسائل شائع کئے ہیں۔ مجلس مذکور مسلم یونیورسٹی اور بیرونجات کے ماہرانِ علم و فن کو اپنے وقتاً فوقتاً منعقد ہونے والے جلسوں میں مدعو کر کے اُن سے مقالے پڑھواتی ہے۔ جن پر بحث و گفتگو ہوتی ہے اور جن کو بصورت پمفلٹ یا مجلس کے آرگن مصنف میں شائع کیا جاتا ہے۔ مجلس کے جلسوں میں پڑھے ہوئے اور شائع شدہ کچھ مقالات حسب ذیل ہیں۔

'انیسویں صدی میں اُردو صحافت' 'لٹن لائبریری کے چند اُردو مخطوطات' اور 'میر حسن اور اُن کا غیر مطبوعہ کلام' از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی لکچرر شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی۔ 'جدید فارسی شاعری کے رجحانات' اور 'کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے؟' از پروفیسر ضیا احمد ایم۔ اے لکچرر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی۔ 'اکبر اور سر سید' از پروفیسر آل احمد سرور صاحب لکچرر شعبۂ اُردو۔ 'علم معیشت پر ایک فلسفیانہ تنقید' از پروفیسر میاں محمد شریف صاحب ایم۔ اے (آکسن) ریڈر شعبۂ فلسفی۔ 'ترکی صحافت جمہوریت سے پہلے' از مولوی محمد عزیز صاحب ایم۔ اے۔ 'مصر قدیم میں دنیا کی پہلی شہنشاہی' از مولانا سید طفیل احمد صاحب وائس پریسیڈنٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ۔ 'نواب دوندے خاں' اور 'صوبۂ متحدہ میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم' از سید الطاف علی بریلوی۔ 'شعرائے اُردو اور ہندی شاعری' از مولوی ظہیر الدین علوی صاحب ایم۔ اے۔

مجلس کا ایک سہ ماہی رسالہ (مصنف) بھی ہے۔ جس کے حصہ میں دو مقالے ہیں۔ 'بہادر شاہ ظفر کی شاعری' از مولوی حسن عبد اللہ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) اور 'غالب نے اُردو خطوط نویسی کب سے شروع کی؟' از قاضی عبد الودود صاحب بیرسٹر ایٹ لا پٹنہ۔

خان بہادر حکیم معظم علی خاں صاحب رئیس آنولہ (بریلی) آپ مطمئن رہیں چندہ ماروں گا نہیں۔ حالانکہ اب مضامین ویسے نہیں ہوتے ہیں جیسے کہ ابتدا میں مصنف نے دیے۔

(لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید۔ ایڈیٹر)

مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب حیدر آباد دکن 'مصنف' ۴۵ء بابتہ مارچ بہت بہت شکریہ قبول فرمائیے۔ جملہ مضامین دلچسپ اور معلومات افزا پائے گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رسالہ مصنف اپنی نوعیت ...

پنجابی سیندوں کا کوئی ٹھکانا موجود ہے؟ میرے ایک بزرگ بارھویں صدی ہجری کے دوسرے نصف میں وہاں گئے تھے اور پھر نہیں آئے۔ سنا کرتے ہیں اُن سے ایک شاخ وہاں ملحق ہے۔ محمد علی اُن کا اسم شریف تھا۔ اور ۱۹۱۱ء تک نواب روشن جو سرکار سنہر ندسے اُن دنوں متعلق تھا مقیم تھے۔ غالباً ان کی کوشش یا کشش انھیں اُدھر لے گئی۔

نواب دوند سے خاں کے بارے میں آپ نے لکھا ہے کہ "مزار شریف نصف بیع ہو چکا ہے" موجودہ قانون کی نگاہ میں ایسا بیع کالعدم ہے بشرطیکہ کوئی پیروی کرے۔

قاضی احمد میاں اختر صاحب جوناگڑھی

پرسوں مفتعت بھرہ نواز ہوا۔ مگر بیوگی کے لباس میں۔ خط اور رسالہ میں آپ کے پورے خط و خال پیش نظر ہو جاتے ہیں اور میں دیر تک محو تماشا رہتا ہوں۔ ۳ مارچ کی نیاز نامہ کی پذیرائی کا شکریہ ؎

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

متواتر علالتوں کے دورے گزر رہا ہوں۔ آشوب چشم۔ اُس کے بعد درد گردہ۔ پھر اسہال اور...... ایک مرگ ناگہانی اور ہے۔ لیکن اس سے پیشتر ایک مرتبہ علیگڑھ آکر ملاقات کرنے کی تمنا ہے۔ مقالۂ دلی کا حسن طلب بین تو نہیں خوب رہا۔ آدمی میں کہ ہے کم اتنی لطافت تو ہو۔ اظہر میاں سے کہئے کہ قفل خموشی توڑیں۔ امتحانات کی مصروفیتیں ختم ہو گئی ہوں تو کچھ قلم کے جوہر دکھائیں۔

ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر بنام قاضی صاحب موصوف

کانفرنس کے ہیڈ اسسٹنٹ سید الطاف علی صاحب کو ادبی خدمات لینے میں کمال حاصل ہے۔ مجھ سے ایک خط آپ کے نام لکھوانا چاہتے تھے۔ قلب اور قلم دونوں کو گرم کرنے کے لئے آپ کا کارڈ مجھ کو دکھلایا جو آپ نے اُن کو لکھا تھا۔ یقین فرمائیے کہ نقوش تحریر نے پرانے نقوش نیازمندی کو اُبھار دیا۔ کیا کیا یاد آگیا۔ کیا کیا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ اسی ہیجانِ شوق میں مومن کا شعر پڑھا۔

بے چارے مومن کی بے کسی پر رحم آیا۔ معاً دل نے کہا:۔
"کیا نصیبا ہے"!!

لے خوشا طالع کہ ہوں اختر شناس
آسماں بھی ہے 'کرم ایجاد' کیا؟

مومن اپنا شعر کہہ کر محو تاسف رہے ہوں گے۔ میں پیام دل سنکر محو فخر و مسرت ہو گیا۔ ایک ادیب ادیب سے بربط قدیم و شناسائی دلنواز بلکہ دل افروز نہیں نور بخش ہے۔ پھر کیونکر فخر و مسرت اُس کی تجدید سے حاصل نہ ہوتی۔ یہی معراج 'اختر شناسی' ہے۔

آپ علیگڑھ آنے کی تمنا میں ہیں۔ علیگڑھ خود حاضر ہوکر جوناگڑھ میں سلام کا مشتاق ہے۔ ملفوف خط سے مدعا ظاہر ہوگا۔

قاضی اختر صاحب کا جواب الجواب

عطوفت نامہ نے سرفراز فرمایا یعنی:۔ ع

کلاہ گوشۂ اختر بآفتاب رسید

جس طرح اور جن محبت بھرے الفاظ میں آنمحترم نے یاد فرمایا ہے وہ میرے لئے باعث صد فخر و مسرت ہے اس خوش بختی پر جس قدر بھی نازاں ہوں کم ہے !؎

یوں تو میرا انجم بخت اوج پہ مدّت سے تھا
آج ہوا ہے مگر نقطۂ وسط السما

شکریہ آنمحترم کی اختر شناسی اور دلنوازی کا، نہیں اس ذرہ نوازی، بندہ پروری کا۔

خوشا طالع! مومن کے شعر کے تصرف پر خود مومن کو حسرت ہوتی۔ مرد مومن کی یہی معراج ہے! آرزو ئے لقا تو نیاز آگیں دل میں مدتوں سے جاگزیں ہے، کہیں سے یہ 'حسرت' نکلے! کاش علی گڑھ اور جوناگڑھ کی یکجائی شوق دیدار کو پورا کر سکے۔ اور دیدارِ 'حبیب' سے آنکھیں روشن ہوں۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔

معلوم ہوا ہے کہ کتب خانۂ حبیب گنج میں سلوتر نامی سنسکرت کتاب کا ترجمہ، از عبداللہ بن صفی بعہد احمد شاہ بہمنی موجود ہے۔ اس ترجمہ کا تھوڑا سا حال ضروری اپنے ایک مقالہ 'سنسکرت اور مسلمان' کے لئے درکار ہے۔ اگر خازنِ کتب کو حکم فرمائیں تو عین نوازش اور معارف پروری ہوگی۔

سلام علی نجد ومن حل فی النجد !!!

مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ

اگر آپ کی یاد دل میں کبھی کبھی آمد و رفت باقی رکھے ہوئے ہے لیکن اسوقت آپ کو اخبار 'منشور' کی ایک مطبوعہ رپورٹ پڑھ کر لکھ رہا ہوں۔

بطلانِ حق پر مزید اصرار ہوا تو برسات شروع ہونے پر چراپونجی اور جاڑے میں لندن تشریف روانہ فرما دیئے جائیں گے۔

رہی جوش صاحب کی 'ہوائی' تو اللہ کا 'احسان' ہے کہ آپ بروقت بچ گئے اور اب آپ کے اوقات عزیز ع

بمقتضائے 'چوں پیر شود.......'

مطالعہ قرآن و تفسیر میں بسر ہوتے ہیں۔ رہا خط تو وہ عہد سرخوشی کا شاہکار ہے۔

حضرت علامہ کیفی چریاکوٹی صاحب

آپ کی دُوری اب بہت ستاتی ہے۔ مگر مجبوری ہے۔ اہل گورکھپور کا اصرار حد سے بڑھ چکا ہے۔ اخبار کا کام ہے۔ امتحاناً کام شروع کردونگا۔ جی لگ گیا تو رہ جاؤں گا۔ گورکھپور وطن سے قریب ہے اور اخبار دل کے پھپولے توڑنے کا ذریعہ۔ قلم میں زنگ لگ گیا ہے اور طبیعت جمود میں۔ اب شاید کوئی مفید کام ہو سکے۔ انشاء اللہ تعالیٰ صحافت کو فن کی صورت میں نئے انداز میں پیش کرنا چاہتا ہوں شاید پرانا تجربہ کام دے جائے۔

مشیر احمد علوی المخاطب ناظر کاکوروی بی، اے (علیگ)

عرصہ دراز کے بعد آپ سے آج ملاقات کی نوبت آئی۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے سوتے سوتے آنکھیں کھولیں۔ مصنف نے یہ صورت نکالی مارچ ۴۴ء کے بنا سے دل خوش ہوگیا۔ ڈاکٹر راجہ غلام سرور صاحب کا مقالہ (کتب خانہ اُچ شریف گیلانی) بہت عجیب اور پُراز معلومات ہے۔ آپ اُن کو میری طرف سے مبارکباد دیدیجئے۔ مسٹر ظہیر الدین علوی کا مضمون (اردو شاعری میں خمریات) بھی اچھا ہے۔ مولانا ابرار حسین فاروقی صاحب نے بھی اپنے مقالہ (ہم لقب حکمرانانِ اسلام) میں کافی محنت کی ہے۔ مضامین کی کہاں تک تعریف کی جائے ہر مضمون محنت سے لکھا گیا ہے۔ اور اس قابل ہے کہ بار بار پڑھا جائے۔ خدا آپ کی بلند توقعات کو پورا کرنے کے جمیع سامان مہیا کرے۔ آمین۔ یہ بھی دل چاہتا ہے کہ آپ کی علمی برادری میں شرکت کروں۔ اس سال کسی نہ کسی حیثیت سے اس آرزو کو ضرور پورا کروں گا۔

سید لطیف حسین ادیب بریلوی

رسالہ 'مصنف' اپنی نوعیت کے لحاظ سے یکتا ہے۔ اہل قلم حضرات نے خوب خوب جدت طرازیاں کی ہیں۔ معلومات کے دریا بہائے ہیں۔ اس پر صاف اور سلیس عبارت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ خصوصاً مولوی ظہیر الدین علوی صاحب کا مضمون مصنف کا ایک درخشاں ستارہ ہے۔ اس پُر آشوب زمانہ میں 'مصنف' کی کامیابی پر جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے۔

ان چند باتوں کے علاوہ جو اوپر عرض کی گئیں۔ میں 'مصنف' کا ایک اور اہم وجہ سے بھی مرہونِ منت ہوں۔ ابھی تک میرا دماغ رزم گاہ بنا ہوا تھا۔ ایک طرف مولانا حالی اور مولانا شبلی کی علمی۔ اخلاقی اور ادبی مضامین صف آرا تھے۔ دوسری طرف جناب شوکت تھانوی اور مولانا نیاز فتحپوری کے افسانے۔ آستین چڑھائے مقابلہ پر ڈٹے ہوئے تھے۔ لیکن 'مصنف' نے قطعی فیصلہ کر دیا۔ اور اِن 'دو' انیسویں صدی کی باہوش بزرگوں کی فتح ہوگئی! اس فیصلہ سے پہلے میں بالکل اپاہج سا ہوگیا تھا۔ قلم اٹھاتا تھا لیکن یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ علمی موضوع پر کاوش ذہنی کروں یا افسانہ پر طبع آزمائی کروں۔ مگر آج افسانوں کے بے بنیاد اور جھوٹے جذبات سے پُر ہونے کا قطعی ثبوت مل گیا۔ چنانچہ تائب ہوتا ہوں اور اپنا پہلا ناچیز مضمون "مسلمان اور سائنس" پیش کرتا ہوں۔

سید محسن علی ترمذی صاحب ایل ایل ایم آرس
پی سی ایس سب جج گڑھ شنکر ہوشیار پور

مجھے سال بھر سے آپ کی کتاب "حیاتِ حافظ رحمت خاں" کی تلاش ہے۔ لاہور کے کتب فروش مہیا نہ کر سکے[1]۔ براہ کرم ایک جلد بذریعہ وی۔ پی بھجوا دیجئے۔

غلام قادر روہیلہ کے بارے میں آپ کا سلسلۂ مضامین 'ڈان' میں پڑھا اور نواب دوندے خاں پر مضمون 'مصنف' میں دیکھا تھا۔ خود میرا ایشان انھیں جراحتوں سے مجروح ہے خیر یہ قصہ طولانی ہے۔ مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ کیا بریلی میں

---

[1] حیاتِ حافظ رحمت خاں دسمبر ۳۳ء میں نظامی پریس بدایوں سے چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ پہلا اڈیشن عرصہ سے ختم ہے۔ بعد نظرِ ثانی دوسرا اڈیشن بوجوہ دیگر مصروفیات چھپوانے کی فرصت نہ ملی۔ پھر جنگ نے اس کام کو ناممکن بنا دیا۔ اب انشاء اللہ جنگ کا خاتمہ ہے۔ کتاب مذکور جلد دوبارہ شائع ہوگی۔

بحر امراض

یا

فنِ طب کی تاریخ

اور

اُس کا تدریجی ارتقاء

(از جناب مولانا سید طفیل احمد صاحب)

طبیب یا ڈاکٹر نہ ہونے پر میرے لئے موزوں نہ تھا کہ میں اس شریف اعلیٰ اور عالمانہ فن کے
لق کچھ لکھنے کی جرأت کرتا، بالخصوص جبکہ علی گڑھ میں قابل ترین اطبا اور ڈاکٹروں کا اجتماع ہے۔
یہ دیکھ کر کہ مجلس مصنفین کے قیام کے تین ۳ سال کے زمانہ میں برخلاف یونیورسٹی کے دیگر شعبہ جات
طبیہ کالج کے علماء نے اب تک اپنے کسی مقالہ سے اس مجلس کو عزت نہیں بخشی، میں نے ان سے
ستفادہ کی یہ صورت نکالی ہے کہ اپنے ناقص خیالات اُن کی موجودگی میں پیش کروں تاکہ اُن کی
دید اور تصحیح پر وہ مجبور ہو کر اس سلسلہ میں اپنے قیمتی خیالات کا اظہار فرمائیں۔ بہرحال میری یہ
ات چونکہ نیک نیتی پر مبنی ہے اس لئے قابل معافی ہے۔

میں نے اس مقالہ میں طبی ترقی کے اعتبار سے پانچ عہد قایم کئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) عہدِ قدیم (۲) عہدِ فلسفۂ یونان (۳) عہدِ وسطیٰ
(۴) عہدِ جدید (۵) عہدِ حاضرہ

اب میں اِن میں سے ہر ایک کے متعلق اپنے خیالات پیش کرتا ہوں:۔

میرا اشارہ اسلامک ریسرچ اور اس کی اکاڈیمی کی طرف ہے جو علیگڑھ میں قائم ہونے والی ہے۔ صرف ہنگامہ ہے یا واقعی کچھ کام کرنے کا ارادہ ہے۔ فرصت ملے تو اس سے مجھے مطلع فرمائیے۔

گزشتہ سال میری ایک کتاب "نظام تعلیم و تربیت" کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے۔ خیال یہ تھا کہ آپ کی نظر سے گزرے گی اور مطالعہ کے بعد اپنی رائے سے مطلع فرمائیں گے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ تک یہ کتاب نہیں پہنچی اس کا افسوس ہے کہ ناشر نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کرکے نتائج کو ضعیف کر دیا۔ تعطیل موسم گرما میں آجکل میں اپنے دیہاتی مستقر بہار میں ہوں۔

خان بہادر ابو عبداللہ محمد ذکاء اللہ صاحب ایم، اے، ریٹائرڈ کلکٹر و سابق نائب دیوان (دتیا)

نواب غلام قادر خاں صاحب کے متعلق جو مقالہ آپ نے لکھا تھا اس کو میں نے دلچسپی سے پڑھا۔ مقالہ بہت اچھا اور مفید ہے۔ اگر کچھ ضرورت ہے تو صرف اس قدر کہ ان ماخذوں کا حوالہ بھی آجاتا، جہاں سے آپ نے سب مضامین لئے ہیں۔ تاکہ نواب غلام قادر خاں کے متعلق جو غلط بیانیاں ابتک ہوتی رہی ہیں ان کی تردید محض آپ کے بیان پر منحصر نہ رہے۔ (مصنف کے اگلے شمارہ میں مقالہ مذکور کا اردو ترجمہ شائع ہوگا اور اس میں ماخذوں کی پوری بحث تمہید میں درج کر دی جائے گی۔ مدیر)

مجلس کے جلسے

اس سہ ماہی میں

پچپنویں مجلس زیر صدارت عالی جناب ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر مدظلہ: —

۹ر اپریل ۴۵ء کو ساڑھے پانچ بجے شام کانفرنس لائبریری سلطان جہاں منزل علیگڑھ میں مولوی محمد مقتدی خانصاحب شروانی کی دعوت عصرانہ پر منعقد ہوئی اور اس میں پروفیسر محمد عزیر صاحب ایم۔ اے نے اپنا مقالہ "دار المصنفین اعظم گڑھ" پڑھا۔ اس جلسہ میں تقریر صدارت بھی اپنی افادیت اور تاثیر کے اعتبار سے لاجواب ہوئی۔

چھپنویں مجلس جناب حکیم مولوی عبداللہ خاں نصر صاحب لکچرر طبیہ کالج کی دعوت عصرانہ پر

۲۲ر اپریل ۴۵ء کو ۶ بجے شام زیر صدارت پروفیسر محمد طاہر فاروقی صاحب ایم۔ اے۔ چیرمین شعبۂ اردو و فارسی آگرہ کالج، منعقد ہوئی۔ اور اس میں مولوی سراج الحق قریشی صاحب بی۔ اے۔ نے راقم السطور کے انگریزی مقالہ "غلام قادر روہیلہ" کا اپنا اردو ترجمہ مع ایک فاضلانہ تمہید اور سید شوکت علی سبزواری صاحب ایم۔ اے۔ نے اپنا مقالہ "غالب کا نظریۂ اخلاق" پڑھا۔ اس جلسہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ بیرونی مہمانوں میں سید مسعود الحسن نقوی صاحب ایم۔ اے پرنسپل اسلامیہ کالج بریلی۔ اور مرزا امیر الدین برلاس صاحب ڈپٹی کلکٹر خلف صاحب "عجیب التواریخ" نے بھی شرکت کی۔

ستاونویں مجلس ۱۲ر مئی ۴۵ء کو چھ بجے شام ڈاکٹر رفیق احمد خاں صاحب چیرمین شعبۂ نباتات مسلم یونیورسٹی کی دعوت پر موصوف کے اپنے دولت خانہ میں منعقد ہوئی۔

جناب پروفیسر ابو بکر احمد حلیم صاحب بی۔ اے (آکسن) بار ایٹ لا چیرمین ہسٹری ڈپارٹمنٹ اور حکیم عبداللہ خاں نصر صاحب نے علی الترتیب فرائض صدارت انجام دئے۔

اس مجلس میں مولانا ابرار حسین فاروقی صاحب نے اپنا پرکیف اور فلسفیانہ مقالہ "پریم رس" پڑھا۔

"مجلس ہیم" کرے ہے تجھہ باز خیال
ہیں ورق گردانیِ نیرنگ یک بتخانہ ہم

سید الطاف علی بریلوی
(مدیر)

ایسی عجیب و غریب شکل دیکھ کر اُس زمانہ کے مریضوں کا فضلات یا مرض فرو ہو جاتا تھا اور اُس زمانہ میں کیا موجودہ زمانہ میں بھی اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے جو ایسی چیزوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ دراصل انسان کے امراض میں سے اسّی فی صدی ایسے ہیں جو جسم میں فضلہ جمع ہو جانے سے پیدا ہوتے ہیں جس کو انسان کی طبیعت از خود بذریعہ بخار اور پسینہ، قے، اور دست کے خارج کر دیتی ہے اور مریض بغیر کسی علاج کے اچھا ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے امراض پر ابتدائی زمانہ کا انسان سحر یا عمل کے ذریعہ سے غالب آجاتا تھا۔ وہ اپنے زعم میں انھیں مسخر کر لیتا تھا۔ اسی نظریہ کے پیشِ نظر اس مقالہ کا عنوان "تسخیر امراض" تجویز کیا گیا ہے۔

تبرکات بطور دوا کے

مندرجہ بالا طرقِ علاج کی ایک شکل یہ تھی کہ بزرگوں کے بدن کی ہڈیاں اور دوسرے تبرکات بیماری کے وقت جسم پر پھیرے جاتے تھے۔ بعض جانوروں کی ہڈیاں گلے میں ڈالی جاتی تھیں۔ سونا اور قیمتی جواہرات جسم سے متصل رہنا دفعِ امراض کے لئے نفع بخش سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ دَور آیا کہ ان چیزوں کو پانی میں گھس کر مریض کو پلایا جاتا تھا۔ تاکہ جسم کے اندر پہونچ کر زیادہ مؤثر ہو۔ اب اُن چیزوں کے اثرات بجائے ایک کے دو طرح کے ہو گئے۔ ایک باعتبار سحر کے جس کا اثر مریض کے خیال پر پڑتا ہے۔ دوسرے معدہ میں پہونچ کر خون میں شامل ہونے سے اُن کی حیثیت دَوا کی سی ہو گئی جو بعض صورتوں میں مفید اور بعض میں مضر ثابت ہوتی تھیں۔ درحقیقت انھیں اثرات کے مطالعہ سے علم طب کی ابتدا ہوئی۔ اور سحر و عمل کا حصہ زیادہ تر شعبۂ روحانیات کی طرف منتقل ہونے لگا۔

بزرگوں کے رکھے ہوئے تبرکات کے استعمال کے سلسلہ ہی میں زندہ بزرگوں اور اعزہ کے جسم سے نکلے ہوئے فضلات کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ زمانہ قدیم میں دُکھتی آنکھ میں فاحشہ بیوی کا پیشاب ٹپکانا مفید سمجھا جاتا تھا۔ اور اب بھی بعض بزرگ اپنے لب سے مریضوں کا علاج کرتے ہیں اور بعض مُرید شدتِ عقیدت میں اپنے مرشدوں کا لعابِ دہن نگل جاتے ہیں۔

سمیات کا استعمال

تبرکات کے بعد انسان نے عرصہ دراز تک سمیات کا تجربہ کیا ہے۔ کیونکہ اُن کا اثر فوراً محسوس ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ سانپ کے کاٹنے سے انسان فوراً مر جاتا ہے۔ ابتدائی زمانہ کے لوگ اپنے تیروں پر سانپ، بچھو اور بر کے

(۱) عہدِ قدیم

علاج کے ابتدائی طریقے

عہدِ قدیم سے میری مُراد ابتدائی زمانہ سے لے کر گزشتہ قبل مسیح تک ہے وہ زمانہ انسان کے بچپن کا تھا۔ جب بچہ گر کر چوٹ لگ جانے سے روتا ہے تو اس کے سامنے جھنجھنا بجانے، زنجیر کھٹ کھٹانے اور اُچھلنے کودنے سے اُس کا خیال تکلیف کی طرف سے ہٹ جاتا ہے۔ اسی طرح ابتدائی زمانہ کا انسان جب کسی معمولی مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اسی قسم کے طریقوں سے اُس کا خیال تکلیف کی طرف سے ہٹا دیا جاتا ہے اور وہ تندرست ہو جاتا ہے۔ البتہ جب اندرونی اعضاء کے ماؤف ہونے سے وہ درد یا بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے تو سمجھا جاتا ہے کہ اُس کے کسی فعل سے کوئی دیبی اُس سے ناراض ہو گئی ہے۔ یا کوئی بھوت اُس کے جسم میں داخل ہو گیا ہے۔ یا کسی دُشمن نے اُس پر سحر کیا ہے۔ اِس قسم کی شکایتوں کا علاج اُس کے سامنے ڈھول اور جھانجہ بجانے اور مختلف قسم کی حرکتیں کرنے سے کیا جاتا ہے۔ علاج کے پُرانے طریقوں اور قدیم مراسم کی تلاش کے لئے بالعموم دُنیا کی ابتدائی قوموں کے حالات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جو بعض دُور افتادہ مقامات میں مہذب دُنیا سے دُور پڑے ہوئے ہیں۔ مثلاً آسٹریلیا کے جنگلی، سیلون کے ویدھ، ہندوستان کے منڈنے، گونڈ و بھیل، سماترا کے بٹک، افریقہ کے کافر، ملایا کے سمانگ وغیرہ لیکن یہ سب قومیں ہومیو سیپنس (Homeo Sapeans) کی نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ جس کو روئے زمین پر پھیلے ہوئے دس پندرہ ہزار سال سے زیادہ نہیں ہوئے۔ اس سے پہلے کرومیگنن نسل (Cromagnon) کا دَور دَورہ تھا جو عرصہ ہوا فنا ہو چکی۔ اُن لوگوں کی ہڈیوں کے ڈھانچوں سے جو غاروں میں سے ملے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا قد چھ فیٹ کے قریب تھا۔ چہرہ زیادہ چوڑا تھا۔ اُن کی عورت کا بھیجہ دانِ موجود نسل کے مردوں کے بھیجہ دان سے بڑا تھا۔ وہ لوگ اعلیٰ درجہ کے نقاش اور مصوّر تھے اُن کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھ کر آج کل کے لوگ حیرت کرتے ہیں۔ انھیں کی بنائی ہوئی ایک ڈاکٹر کی تصویر بیس ہزار قم کی ہے جس کو اب ۲۲ ہزار سال ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ریچھ کی کھال اوڑھے اور سر پر بارہ سنگھے کے سینگ لگائے ہوئے ہیں اور چہرہ پر لمبی ڈاڑھی ہے۔

قدیم عمل جراحی زمانہ قدیم میں عمل اور دوا کے علاوہ زخموں کے علاج اور بعض صورتوں میں عمل جراحی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ مصر کے شہر منفس (Memphis) میں پتھروں پر جو تصاویر سنہ ۲۵۰۰ قبل مسیح کی ہیں اُن میں جراح کسی کی ختنہ اور کسی کو خصی کر رہا ہے۔ کسی کے پھوڑے کو چیر رہا ہے۔ مگر اُس وقت کے عمل جراحی صرف جلد تک محدود تھی۔ زمانہ قدیم میں ایک علاج بہت دلچسپ تھا۔ وہ یہ کہ اگر کوئی شخص چھُرے سے زخمی ہو جاتا تو وہ چھُرا بڑے اہتمام سے فراہم کیا جاتا اور اُس پر مرہم لگا کر اُسے علٰحدہ رکھدیا جاتا اور زخم کو صاف کر کے صرف اُس پر کپڑے کی پٹی باندھ دی جاتی اور سمجھا جاتا کہ اس طریقہ سے زخم اچھا ہو جائیگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کی صحتوں کے اعتبار سے زخم صاف کر کے اُس پر پٹی باندھ دینا بالعموم کافی ثابت ہوتا ہوگا۔ دراصل زخموں کا علاج ہی اُن لوگوں سے شروع ہوا ہے جو لڑائی میں زخمی ہوتے تھے۔ ابتدا میں زخموں کے معالج صرف وہی ہو سکتے تھے جو پہلے زخمی ہو چکے ہوں اور اس کام کا تجربہ رکھتے ہوں۔

قدیم دایہ گری اِسی سلسلہ میں دایہ گری کی خدمات کی نسبت بھی کچھ عرض کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ اُس زمانہ میں بیابانی زندگی اور سادہ غذا ہونے کی وجہ سے نظامِ عصبی اس قدر عمدہ حالت میں رہتا تھا کہ عورت کو اس بارہ میں زیادہ امداد کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ بالخصوص چونکہ اپنے جرگوں سے باہر شادی نہ ہوتی تھی اور سب کے قد تقریباً یکساں ہوتے تھے اس لئے پیدائش کے وقت بچہ کے قدوں میں بھی یکسانیت ہوتی تھی۔ ضرورت کے وقت عورت تنہائی میں جا کر فارغ ہو جاتی تھی اور اپنی انا ول نال اپنے دانت سے کاٹ کر علٰحدہ کر دیتی تھی۔ تاہم اُس زمانہ کی تکلیف جو کبھی کبھی پیش آ جاتی تھی یہ تھی کہ ماں کے پیٹ کے اندر بچہ پلٹ جاتا تھا۔ اس کی نسبت قدیم حالات میں تحریر ہے کہ مصر میں سنہ ۳۰۰۰ ق م میں اور ہندوستان میں سنہ ۱۵۰۰ ق م میں مندروں کا پوجاری ہاتھ کے استعمال سے بچہ کو سیدھا کر کے نکال لیتا تھا اور اگر بچہ اندر مر جاتا تو دستی اور عمل جراحی کے ذریعہ سے اُسے نکال دیتا تھا جس سے زچہ کی جان بچ جاتی تھی۔

———————

زہر لگا کر انھیں دشمنوں پر پھینکتے تھے تاکہ دشمن ان کے زخم سے مرجائے۔ سانپ کا زہر لڑائی میں پکڑے ہوئے قیدیوں اور غلاموں کو کھلا کر اُس کا تجربہ کیا جاتا تھا۔ (Cleopatra) کلیو پیٹرا جو پہلی صدی قبل مسیح میں مصر کی مشہور ملکہ تھی اور متعدد طبی کتابوں کی مصنفہ تھی اُس نے بہت سے زہر کے تجربے کئے تھے۔ سمیات پر تجربے اس لئے کئے جاتے تھے کہ اُن کا تریاق معلوم کیا جائے۔ چنانچہ قدیم یونانی طبیب مسمیٰ متھریا ٹیس (Mithriates) نے جملہ اقسام کے زہر جمع کر کے ہر ایک تریاق کا نسخہ تیار کیا جو اُس حکیم کے نام سے مشہور ہوا۔ اُس میں ۳۷ سے لے کر ۶۳ تک دوائیں ہوتی تھیں جن میں سے کالے سانپ کا گوشت بھی تھا۔ وہ نہ صرف تریاق بلکہ اکسیر سمجھ کر ہر مرض میں دیا جاتا تھا۔ مگر صدیوں کے تجربہ کے بعد ثابت ہوا کہ وہ بالکل بیکار تھا اس لئے ترک کر دیا گیا۔

سمیات کے سلسلہ ہی میں تمام دیگر اشیاء پر تجربے کئے جاتے تھے۔ چنانچہ کسی زمانہ میں مخنث آدمی کی چربی بہت سے امراض میں مفید سمجھی جاتی تھی۔ زیادہ چلنے والے شخص کے پُرانے جوتے کا تلا گھِس کر پیچش کے مریض کو پلایا جاتا تھا۔ دانت کے درد کے مریض کو خود اُس کا پیشاب پلایا جاتا تھا۔ انھیں تجربوں سے انسان رفتہ رفتہ صحیح دوائیں معلوم کرتا چلا گیا۔ چنانچہ مصر قدیم میں آنکھ کے روہوں کے لئے توتیا کا استعمال ہوتا تھا اور وہ ابتک اس مرض کے لئے مفید سمجھا جاتا ہے۔ اُس زمانہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ہر دوا میں طلسمی اثر سمجھ کر اُسے ہر مرض میں استعمال کیا جاتا تھا اور یہ خیال کم و بیش اب تک چلا آتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ صدی کے انگریز فلسفی مسٹر کارلائیل کی نسبت تحریر ہے کہ اُس کا دوست مسٹر ٹیلر (Henry Taylor) بیمار ہوا تو وہ اپنے ساتھ ایک دوا لے گیا جو اُس کی بیوی کی بیماری میں مفید ثابت ہوئی تھی اور بچی ہوئی رکھی تھی اور بلا لحاظ اس کے کہ اُس کے دوست کا مرض کیا تھا کارلائیل Carlyle نے وہ دوا اُسے کھلا دی۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلسمی اثرات کے متعلق جو عقیدہ ہزاروں سال قبل تھا وہ کس قدر تسلسل اور یکسانیت کے ساتھ چلا آرہا ہے۔ اسی عقیدہ کی بنا پر ہزاروں سال تک انسان اکسیر کی تلاش میں رہا جو ہر مرض میں یکساں مفید ثابت ہو سکے۔ غالباً اکسیر کی جگہ زمانہ حال میں پیٹنٹ (Patent) ادویہ نے لیلی ہے جو بے شمار امراض میں مفید سمجھی جاتی ہیں۔ حالانکہ اصولاً ہر مرض کے خاص حالات کے مطابق نسخہ کا تجویز ہونا ضروری ہے۔

بے دینی سے منسوب کیا اور دونوں گروہوں میں روز بروز دوری اور دوری سے منافرت اور مخالفت پیدا ہوتی گئی۔

بقراط سے قبل حاملہ عورتوں کے ساتھ بڑی بے رحمی برتی جاتی تھی۔ وضع حمل کے وقت اُسے بستر سے اونچا اٹھا کر گرا دیا جاتا تھا۔ پیٹ بری طرح دبایا اور آٹے کی طرح گوندھا جاتا تھا۔ اُس نے اِن طریقوں کو بند کر کے دایہ گری کی باقاعدہ تعلیم کا انتظام کیا۔ بقراط کی ایک بڑی یادگار وہ قسم ہے جو وہ اپنے شاگردوں کو دیتا تھا۔ اور جو اب ڈھائی ہزار سال بعد تک مسلسل جاری ہے۔ اور اُسی کے نام سے موسوم ہے۔ سند پاتے وقت ڈاکٹر عہد کرتا ہے کہ وہ کسی شخص کو مہلک دوا نہ دے گا، کسی عورت کا پیٹ نہ گرائے گا، اُسے اغوا نہ کرے گا، ہر مریض کا علاج صداقت اور خلوص نیت سے کرے گا، اپنے پیشہ کے سلسلہ میں جو کچھ سُنے گا اُسے راز میں رکھے گا۔ بقراط کا قول تھا کہ:-

"میری فضیلت کا ماحصل یہ ہے کہ میں اپنے جہل سے مطلع ہوا"

بقراط نے ۳۷۷ ق م میں تراسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔

طب یونانی رُومہ میں

یونان کے طبی عروج کے زمانہ میں اُن کے ہمسایہ شہر رومہ کے باشندے سراسر اوہام میں مبتلا تھے۔ اُن کے ہاں ہر مرض کا ایک دیوتا تھا حتیٰ کہ خارش اور کھجلی کا بھی دیوتا تھا، جسے رضامند کئے بغیر اُس مرض کا ازالہ نہ ہو سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اطباء یونان کا اثر رومہ میں بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ۱۴۶ ق م میں شہر CORINTH کارنتھ تباہ ہوا اور اس سے طب یونانی پوری طرح رومہ میں پہونچ گئی۔ اور وہاں اُس نے اِس قدر روشن خیالی پیدا کر دی کہ خود رومہ کے طبیب نامی سورنیس (SORANUS) نے فن دایہ گری کو بہت ترقی دی۔ اور جھاڑ پھونک کی جگہ اُس نے طب کی علمی تعلیم جاری کی۔ اُس کا قول یہ تھا کہ "کسی دایہ کو ارواح پر عقیدہ نہ ہونا چاہئے"۔

جالینوس

طبی دُنیا میں حکیم جالینوس کا نام غالباً سب سے زیادہ عظمت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ ۱۳۱ء میں ایشیائے کوچک کے شہر PERGAMUS پرگامس میں پیدا ہوا اور طب کی تعلیم زیادہ تر اسکندریہ میں حاصل کی جو اُس زمانہ میں بڑا علمی مرکز تھا۔ ترقی کر کے وہ مارکس آریلس (MARCUS AURELUS) شہنشاہِ رومہ کا طبیب ہو گیا۔ بقراط اُس کا پیش رو بڑی تحقیقات اور تجربات کے بعد جزئیات سے کلیات تک

(۲) عہدِ فلاسفہ یونان

حکیم اسقولیفس

عہد قدیم کے بعد یونان کے عہد فلاسفہ کا دَور آتا ہے - جو پانچویں
سے شروع ہو کر پانچویں صدی عیسوی پر ختم ہوا - اُس دَور میں حکیم
(ESCULAPIUS) کا نام بڑی عظمت کے ساتھ لیا جاتا تھا مگر اُس کے زمانہ
وطن کا صحیح پتہ نہ تھا - صرف اس قدر معلوم تھا کہ وہ اپالو (APOLLO) دیوتا کا بیٹا
دیوتاؤں کا طبیب سمجھا جاتا تھا - وہ حضرت ادریس علیہ السلام کا اُمتی اور پیرو بتا
اُس کی نسبت یہ مشہور ہے کہ وہ اتنا بڑا طبیب تھا کہ اُس نے ایک مُردہ کو زندہ
اس لئے ZEUS دیوتا نے اُسے بجلی گرا کر مار ڈالا تھا - اُس کے نام کا بہت بڑ
اور بہت سے چھوٹے مندر یونان میں تھے جو پوجا کے علاوہ مریضوں کے اسپتا
صحت گاہوں کا کام دیتے تھے - یہ مندر پہاڑیوں اور بلند مقامات پر بنائے جاتے
مریضوں کا علاج سورج کی روشنی، تازہ ہوا، صاف پانی، ورزش اور غذا
جاتا تھا - ضرورت کے وقت پوجاری طبیب دواؤں اور عمل جراحی کا استعمال کرتے -
اُن کے علاجات کی بنیاد مذہب اور طلسم و اوہام پرستی پر قائم تھی -

اس حکیم کے دو لڑکیاں تھیں جن میں سے ایک کا نام HYGEIA تھا وہ
دیوی قرار دی گئی اور اُسی کے نام پر HYGINE کا لفظ ہے جو حفظانِ صحت کا مُ

بقراط

حکیم اسقولیفس کے بعد یونان میں بقراط کا نام آتا ہے وہ ۴۶۰ قم میں جز
میں پیدا ہوا - اُس کے طریقِ علاج کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ تجربہ اور مشاہد
بہت وقت صرف کرتا تھا - دواؤں کے زیادہ استعمال کا قائل نہ تھا اور مثل اپنے
اسقولیفس کے دھوپ، ہوا اور غذا سے علاج کرتا تھا - اُس نے فنِ طب کو اس قد
ترقی دی کہ مندروں کے قدامت پرست پوجاری جو صحت کے مندروں میں کام کر
اُس کے ساتھ نہ چل سکے - دراصل بقراط اور پوجاریوں کا اختلاف کوئی مذہبی ا
نہ تھا بلکہ قدیم اور جدید طرقِ علاج کا اختلاف تھا اور اسی بنا پر دونوں طبقوں میں
ہوئی - طبیبوں نے اپنے تجربہ میں جھاڑ پھونک، جنتر، منتر کے علاجوں کو بے اثر پایا
اُنھیں ترک کر دیا - پوجاریوں نے اپنے قدیم سائنس کو عین مذہب قرار دیکر جدید تج

دیوتاؤں کی پوجا بھی شامل کر لی جائے۔ قیام حکومت کے لئے عقائد کی اس رواداری کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں اوہام پرستی اور تنگ خیالی کا دَور دَورہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ ۵۲۹ء میں خود یونانی کے دارالحکومت شہر ایتھنز (ATHENS) میں جسٹینین (JUSTINAN) نے فلسفہ کی تعلیم ممنوع کر دی اور تمام مدرسے بند کر دیئے۔ مصر میں علم ریاضی کی ماہرہ ہائی پٹیا HYPATIA پر جبکہ وہ اپنی درس گاہ سے واپس آ رہی تھی عیسائی راہبوں کے ایک گروہ نے حملہ کر کے اُسے مار ڈالا۔ اُس کا برہنہ جسم کھینچ کر گرجا میں لائے اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُسے جلا دیا۔ یہ محض اُس فاضلہ کا جسم نہ تھا جو جلایا گیا، بلکہ اُس کے ساتھ یونانیوں کا فلسفہ اور اُس کے علوم بھی جل کر خاکستر ہو گئے۔ علم طب کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اور بجائے باقاعدہ علاج کے دیوتاؤں اور دیبیوں کی پوجا اور جھاڑ پھونک کے طریقے جاری ہو گئے۔ اس سے حکماء اور اطباء معطل ہو گئے اور امراض کا علاج اُنھیں پادریوں کے ہاتھوں میں پہونچ گیا جو قدیم بت پرستی اور اوہام پرستی کی تبلیغ مذہب عیسوی کے نام سے گرجاؤں کے منبروں پر کھڑے ہو کر کرتے تھے۔

پادریوں کا زور

اِن پادریوں کے علاج کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ مریض کے جسم پر ہاتھ پھیر کر اور مختلف قسم کے عمل پڑھ کر جو علاج کرتے تھے یا خرق عادات کے ذریعہ دوستوں کو نفع اور دشمنوں کو نقصان پہونچاتے تھے، اُنھیں تو وہ کرامات سے تعبیر کرتے تھے اور اگر کسی دُنیا دار شخص سے عوام کے نزدیک کوئی خرق عادت صادر ہوتا تو اُسے جادوگر قرار دیکر اُس پر مقدمہ چلاتے اور اُسے سزا کرا دیتے تھے۔ چنانچہ اُس تاریکی کے عہد میں جادوگروں کو سزا دینے کے لئے خاص عدالتیں قائم تھیں جو مجرموں کو جرمانہ قید اور موت کی سزائیں دیتی تھیں۔ ایک پرلطف واقعہ یہ ہوا کہ کسی شخص نے اتفاق سے ایک مرغ کے پاس مرغی کا انڈا دیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا اُس مرغ کی رپورٹ ہوئی۔ مقدمہ قائم ہوا۔ مقدمہ کی سماعت ہوئی اور مرغ کو سزائے موت دی گئی اور اُسے جادوگر قرار دیکر پھانسی پر چڑھایا گیا۔

اُس تاریک زمانہ میں عورتوں کی بُری گت ہوئی۔ پادریوں نے زچگی کی تکالیف کو گناہوں کا نتیجہ قرار دے کر عورت کی امداد کو غیر ضروری قرار دیا۔ البتہ بچہ کی پیدائش میں اگر دیر ہوتی تو پچکاری کے ذریعہ سے ماں کے پیٹ کے اندر بپتسمہ کا پانی پہونچایا جاتا تھا تاکہ اگر بچہ مر سے تو عیسائی ہونے کی وجہ سے دوزخ کی آگ سے محفوظ رہے خواہ اس عمل سے بچہ اور زچہ دونوں کیوں نہ ہلاک ہو جائیں۔

پہونچتا تھا اور دواؤں کا استعمال کم کرتا تھا۔ برخلاف اس کے حکیم جالینوس اول کلیات قائم کرکے پھر اُس کے جزئیات کی تفصیلات کی طرف توجہ کرتا تھا اور دواؤں کا استعمال زیادہ کرتا تھا۔ اپنے اسی اصول کے مطابق اُس نے انسان کے جسم میں چار اخلاط یا مزاج تجویز کئے یعنی صفروی، سوداوی، بلغمی اور دموی۔ انھیں چار اخلاط کے امراض کی دواؤں کو باعتبار خواص کے اُس نے گرم اور سرد، خشک اور تر میں تقسیم کیا اور طب کا ایک قانون بنا دیا جس پر نہ صرف صدیوں بلکہ ہزاروں سال سے عمل ہو رہا ہے۔

جالینوس نے فن جراحی کو بھی ترقی دی اور چونکہ مردہ انسان کے جسم کو چیرنا سخت جرم تھا اور اُس کی سزا موت تھی اس لئے اس حکیم نے بندر، کتے اور بیل وغیرہ پر تجربے کرکے علم تشریح ترتیب کیا جو اگرچہ صحیح بنیاد پر قایم نہ ہو سکا تاہم نہ ہونے سے اُس کا ہونا غنیمت تھا۔ اُس کی تصانیف میں چار سو مجلدات بتائے جاتے ہیں۔ حکیم جالینوس کا انتقال ۲۰۰ء میں اُنہتر (۶۹) سال کی عمر میں ہوا۔

---

(۳) عہدِ وسطیٰ

علم طب کا زوال

اب وہ وقت آیا جبکہ یورپ میں ذہنی زوال شروع ہوا اور اُس سے چونکہ علم طب بھی کسوف میں آگیا اس لئے اُس زمانہ کے انقلاب کے متعلق مختصر طور پر کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

مین اُسی زمانہ میں جبکہ رومتہ الکبریٰ کی حکومت عروج پر تھی، خالص مذہب عیسوی کی تحریک فلسطین سے اُٹھی اور بڑھکر یورپ تک پہونچی۔ وہ غرباء کی تحریک تھی جو توحید، پاکدامنی اور نفع عامہ کی بہبودی پر مبنی تھی اس لئے اول عوام اور رفتہ رفتہ خواص کے دلوں میں جاگزیں ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ اُس کی ٹکر حکومت سے ہوئی جو بُت پرستوں کی حکومت تھی۔ اس کشاکش میں شہنشاہ DIOCLETIAN کو تخت چھوڑنا پڑا اور شہنشاہ قسطنطین نے جو بظاہر عیسائیوں کا نمایندہ تھا ۳۱۲ء میں اسکی جگہ لی۔ مگر بت پرستوں کی قوت بھی کم نہ تھی، اس لئے قسطنطین نے اُن کی خوشنودی کے لئے یہ گوارا کیا کہ مذہب عیسوی میں مصر کے دیوتاؤں کی تثلیث اور یورپ کے

(۴) عہدِ جدید

مُردہ لاشوں پر عمل جراحی

بالآخر صدیوں کی مذہبی غلامی اور ذہنی انحطاط کے بعد یورپ پادریوں کے چنگل سے نکلا اور پندرھویں صدی سے وہ دَور شروع ہوا جسے عہدِ جدید یا نشاۃ ثانیہ کہتے ہیں۔ سب سے اوّل روم کے پوپ سے مارٹن لوتھر نے جو جرمنی کا ایک پادری تھا، بغاوت کی۔ اُس کی تحریک نے لوگوں کے خیالات میں ایک حرکت پیدا کر دی جس سے علم طب کی طرف بھی توجہ ہوئی۔ اُس وقت تک جراحی ترقی اس لئے رُکی ہوئی تھی کہ مُردوں پر عمل جراحی نہ ہو سکتا تھا اور اس لئے جسم کے اندرونی اعضا اور اُن کے افعال سے محض لاعلمی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جراحی کا کام حجاموں کے ہاتھوں میں تھا جو زخموں کے علاج کے ساتھ حجامت بھی بناتے تھے اور اس لئے ذلیل تھے۔ اُن کی زندگی بھی ہر وقت خطرہ میں رہتی تھی۔ مثلاً برگنڈی کی ملکہ کو طاعون ہو گیا اور اُس کی گلٹی میں شگاف دیا گیا مگر وہ نہ بچ سکی۔ اس پر شاہ QUTRAM اُس کے شوہر نے ۱۵۸۰ء میں دو جراحوں کو ملکہ کی قبر پر تلوار سے قتل کرا دیا۔

سنہ ۱۳۳۷ء میں بوہیما کا بادشاہ اندھا ہو گیا تھا۔ چونکہ جراح اُس کے علاج میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس لئے اُسے دریائے ODER میں پھینک دیا گیا۔

سنہ ۱۴۶۴ء میں شاہ ہنگری نے اعلان کیا کہ جو شخص اُس کے زخم کو اچھا کر دے گا اُسے انعام ملے گا ورنہ قتل کر دیا جائے گا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ علاج سے انکار کرنے پر بھی سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔

بالآخر فنِ جراحی کی ترقی کی بنیاد اُس وقت پڑی جبکہ مردہ جسم کو چیرنا گوارا کیا گیا۔ اُس کی ابتدا یوں ہوئی کہ نہ معلوم کس طرح پادریوں نے ایک مجرم پر جسے قتل کا حکم دیا جا چکا تھا عمل جراحی کرنے کی اجازت دے دی۔ اُس پر اوّل کچھ دُعائیں پڑھی گئیں، تب اُسے پھانسی دی گئی اور اُس کی لاش یونیورسٹی والوں کو سپرد کی گئی۔ عمل جراحی کے وقت عمائدین شہر جمع تھے جن کے سامنے پادری صاحب کا اجازت نامہ پڑھا گیا اور اُس پر یونیورسٹی کی مُہر لگا دی گئی۔ سر کی نسبت یہ عقیدہ تھا کہ اُس کے اندر رُوح رہتی ہے اس لئے اوّل اُسے کاٹ کر علحدہ رکھ دیا گیا، تب خطبہ پڑھا گیا اور سب نے مل کر گایا۔ ڈاکٹر نے خود مُردہ کے

عربوں کے ہاتھوں علم طب کا احیاء

جبکہ بُت پرستی نے غلبہ سے عیسوی توحید کا آفتاب مغربی ممالک میں غروب ہو چکا تھا تو وہ عرب میں آنحضرت صلعم کی پیدائش سے اسلامی توحید کی شکل میں مشرق کی جانب سے طلوع ہوا۔ اور روحانی زندگی پیدا کرنے کے ساتھ انسان کی ذہنی بیداری کا موجب ہوا۔ یونان کے علماء کا فلسفہ اور طب جو دفن ہو چکی تھی اُسے مسلمانوں نے باہر نکالا اور ان کی کتابوں کے ترجمے کر کے اُن علوم کو زندہ کیا۔ خلیفہ منصور نے آٹھویں صدی عیسوی میں ایک بڑا طبی کالج بغداد میں قایم کیا۔ عربوں نے اپنے علوم کی بنیاد بجائے قیاس کے تجربہ اور مشاہدہ پر رکھی۔ گندھک کا تیزاب، شورہ کا تیزاب اور الکحال تیار کرنا خاص مسلمانوں کی ایجادیں ہیں۔ اُنھوں نے پہلی مخزن الادویہ مرتب کی۔ مسلمانوں میں بوعلی سینا اور رازی (RHAZES) بڑے پایہ کے طبیب ہوئے ہیں۔ مسلمانوں نے اِن علوم کو نہ صرف اپنے وطن میں ترقی دی بلکہ یورپ کو بھی اپنے فیوض سے محروم نہ رکھا۔ چنانچہ دسویں صدی عیسوی میں ملک اٹلی کے مقام سیلرنو (SALERNO) میں ایک طبی کالج قایم کیا جو یورپ بھر میں پہلا تھا۔ عیسائی ممالک میں خلل دماغ کے مریضوں کے ساتھ خراب برتاؤ کیا جاتا تھا۔ اُنھیں نہ صرف زنجیروں میں باندھ کر رکھا جاتا تھا، بلکہ بعض اوقات زد و کوب کیا جاتا تھا۔ برخلاف اس کے مسلمان ایسے مریضوں کے ساتھ عمدہ برتاؤ کرتے تھے۔ اُنھیں دل بہلانے کے قصّے سنائے جاتے تھے۔ اُن کے لئے پاگل خانے بنائے گئے تھے۔ اُس کے صدیوں بعد لندن میں ۱۵۴۷ء میں پہلا پاگل خانہ بنایا گیا۔

فنِ جراحی کو بھی مسلمانوں نے بہت ترقی دی۔ اس سلسلہ میں ابوالقاسم کا نام تاریخ میں نمایاں نظر آتا ہے۔ جس کی تصنیف اُس کے وطن کی نسبت سے "زہراوی" کے نام سے مشہور ہے۔ وہ گیارھویں صدی عیسوی میں قرطبہ میں تھا۔ حال میں مولوی ابرار حسین فاروقی صاحب نے ایک قابلانہ مضمون مسلمانوں کے طبی کارناموں کے متعلق لکھا ہے۔ یقین ہے کہ وہ یا جناب حکیم صاحبان اس مسئلہ کو تفصیل سے بیان فرمائیں گے۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں نے یونانی طب کو اس قدر زیادہ ترقی دی کہ وہ اصلی معنوں میں "اسلامی طب" ہو گئی۔

تب سے اُس نے گرم تیل کا استعمال بند کر دیا۔

ڈاکٹر پارے نے دایہ گری کے فن کو اس طرح ترقی دی کہ رحم میں بچہ پلٹ جانے کی صورت میں اُس نے ہمت کرکے ڈھائی ہزار سال قبل کا طریقہ اختیار کیا، یعنی یہ کہ ہاتھ سے بچہ کو سیدھا کرکے اُسے زندہ نکال لیتا۔ اِس سے قبل بچہ کو کاٹ کر نکالا جاتا تھا۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں ایسے عمدہ عمدہ طریقے جاری تھے جو ہزاروں سال بعد مفید سمجھ کر پھر اختیار کئے جاتے ہیں۔

تحقیق ادویہ اس عہد میں دواؤں کی بہت تحقیق کی گئی۔ ہر نئی چیز جو مشکل سے ملتی یا دوسرے ملکوں سے اپنے ملک میں اوّل آتی اُسے بیماری میں کھلا کر اُسکا تجربہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ سولھویں صدی میں سر والٹر ریلے انگلستان میں آلو لائے تو وہ نامردی دُور کرنے کے لئے کھایا جاتا تھا۔ نیز اُس سے حُبّ کا عمل بھی کیا جاتا تھا۔ اُسی عہد میں ہندوستان کے تمام مسالے یعنی ایلوا، افیون، سیاہ مرچ وغیرہ بڑی بڑی قیمتوں میں یورپ جاکر بکتے تھے۔

(۵) عہدِ حاضرہ

کثرتِ ادویہ کا استعمال چارلس دوم پر سولھویں صدی عیسوی میں عہدِ جدید یا نشاۃِ ثانیہ ختم ہوا۔ اور سترھویں صدی سے وہ دَور شروع ہوا جسے عہدِ حاضرہ کہا جاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عہدِ حاضرہ کے شروع میں فنِ طب کی حالت کیا تھی۔ اُس وقت تک جالینوس کا طریق علاج جاری تھا جس میں دواؤں کا استعمال بہت کثرت سے کیا جاتا تھا۔ چنانچہ انگلستان کے بادشاہ چارلس دوم کا علاج جس طریقہ پر کیا گیا وہ سُننے کے قابل ہے۔

پچیس سال کی عمر میں چارلس حجامت بنواتے وقت بیہوش ہوگیا تو اوّل اُس کے داہنے ہاتھ سے آدھ سیر خون نکالا گیا۔ اُس کے بعد گلاسوں کے ذریعہ سے کندھے پر سے پاؤ بھر خون اور نکالا گیا۔ اِس قدر عمل جراحی کے بعد دواؤں کی بھرمار شروع ہوئی۔ قے اور دستاور

جسم کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ نوکر کو ہدایت کی کہ وہ جسم کو کاٹتا جائے۔ ڈاکٹر کے ایک ہاتھ میں جالینوس کی کتاب تھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک عصا تھا۔ جس سے وہ کتاب میں دیکھ کر اعضاء کے نام بتاتا جاتا تھا۔ اُس کے بعد بڑی شاندار دعوت ہوئی۔ محفل رقص و سرود منعقد ہوئی او تھیٹر کا تماشا ہوا۔

مگر پادری صاحبان کے اِن فتووں اور اُن پر باضابطہ عملدرآمد ہوجانے پر بھی عوام کے دلوں سے مُردہ لاش کی عظمت نہیں گئی اور کسی شخص کی مجال نہ تھی کہ وہ مردہ لاشوں پر عمل جراحی کرسکتا۔ البتہ بلجیم کے رہنے والے ویسے لیس ANDRENS-VESALEUS نامی نے اپنی زندگی خطرہ میں ڈال کر ایک پھانسی پر لٹکی ہوئی لاش کو رات کے وقت چرا لیا اور اسی طرح اور لاشیں حاصل کر کے ۱۵۴۳ء میں علم تشریح پر ایک کتاب شایع کی۔ اُس کتاب میں اُس نے اُس پُرانے خیال کو غلط ثابت کیا تھا کہ عورت کے مقابلہ میں مرد میں ایک پسلی کم ہوتی ہے۔ اُس نے جالینوس کی غلطیاں دکھائیں جو جانوروں کی تشریح پر مبنی تھیں جس کی وجہ سے اُس کی سخت مخالفت ہوئی۔ اور اُس کی کتابیں ضبط کر کے جلادی گئیں۔ وہ خود بھی کتابوں کے ڈھیر کے ساتھ کچھ جل کر بھاگا، اور غصّہ میں آکر اُس نے خود اپنے قلمی نسخوں کو آگ لگادی۔ فنِ جراحی کو چھوڑ کر شہنشاہ چارلس پنجم کا درباری بنا اور پھر شاہی طبیب ہوگیا۔ مگر اب اسپتال والوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ لاشوں کی قیمت ادا کرنے لگے جس کی وجہ سے مُردہ چور پیدا ہوگئے اور روپیہ کے لالچ میں اِن چوروں نے اکیلا پاکر زندہ لوگوں کو بھی قتل کرنا شروع کردیا۔ اس پر حکومت نے مجبور ہوکر لاوارث مُردوں کی لاشوں کو ہسپتال میں دیا جانا جائز قرار دیا۔

زخموں کے علاج میں اصلاح

ویسے لیس مذکور کا ایک ہمعصر AMBROISE PARE امبرائز پارے فرانس کا باشندہ تھا۔ وہ ۱۵۲۹ء میں پیرس میں ایک دیہاتی حجام کا اپرنٹس ہوا۔ اور ترقی کر کے بڑا سرجن ہوگیا۔ اُس کے زمانہ تک گولی کے زخم کا علاج زخم پر کھولتا ہوا تیل ڈال کر کیا جاتا تھا۔ جس سے مریض کو سخت تکلیف ہوتی تھی۔ اتفاق سے ایک روز اُس ڈاکٹر کا تیل ختم ہوگیا تو اُس نے انڈے کی زردی، روغن گلاب اور تارپین کا تیل ملاکر ایک مرہم بنایا اور اُسے زخم پر لگادیا۔ مگر رات بھر ڈرتا رہا کہ معلوم کیا نتیجہ ہوگا۔ صبح معلوم ہوا کہ مرہم والے مریض خوب آرام سے سوئے اور اچھے

مریضوں میں بچے، اور بوڑھے، مرد و عورت، متعدی امراض اور بہت محرقہ کے مریض، زچہ اور حاملہ عورتیں، سل اور دق کے مریض بلا امتیاز یکجا پڑے رہتے تھے یہاں تک کہ مردہ لاشیں بھی ۲۴ گھنٹہ تک انھیں میں پڑی رہتی تھیں۔ اور کوئی اٹھانے والا نہ ہوتا تھا اور ہوتا کہاں جبکہ ۴۹۵ مریضوں پر صرف ایک جراح تھا اور وہ بھی رات کو اپنے گھر رہتا تھا۔ اسی سے مریضوں کی دوا اور علاج کا قیاس کر لیا جائے۔ البتہ وارڈوں کے دروازے جو بیس گھنٹہ کھلے رہتے تھے تاکہ شہر سے خیراتی کھانا آجائے تو فاقہ کشی کی کچھ تو تلافی ہو سکے۔ دراصل اُس دور میں اسپتال قبرستان کے پیش خیمہ تھے جہاں سے کوئی سخت جان مریض ہی زندہ بچ کر نکل سکتا تھا۔ یہ حالات یورپ میں سترھویں صدی تک جاری رہے۔

جدید علمِ تشریح کے فوائد

ان حالات میں دور نیز طبی معلومات میں غیر معمولی اضافہ اُس وقت ہوا جبکہ جدید علم تشریح نے طبی ترقی کا نہ صرف دروازہ بلکہ پھاٹک کھول دیا۔ اُسوقت انسانی جسم کو چیرنے سے بہت سی بلکہ بیشمار نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ

۱۔ جالینوس کا نظریہ یہ تھا کہ خون قلب کی داہنی جانب سے درمیانی پردہ کے مسامات میں سے گزر کر قلب کی بائیں جانب براہ راست چلا جاتا ہے۔ مگر ڈاکٹر ہاروے (HARVEY) نے ۱۶۲۴ء میں بذریعہ مشاہدہ کے معلوم کیا کہ خون پھیپڑوں میں سے ہو کر قلب کو جاتا ہے۔ اور وہاں سے جسم کے کونے کونے میں پہونچ کر انسانی زندگی قائم رکھتا ہے۔ تب سے ڈاکٹر اس کوشش میں رہے کہ مختلف طریقوں سے مریضوں اور کمزوروں کے جسم میں تندرست آدمی کا خون پہونچائیں۔ مگر چونکہ خون جسم سے باہر نکل کر چند منٹ میں جم جاتا ہے اس لئے اس تجربہ میں بہت سی جانیں ضائع ہوگئیں۔ بالآخر ۱۹۱۴ء میں ڈاکٹر آگوٹے Dr Luis Agote of Agortina نے یہ دیکھ کر کہ Sodium citrate انڈے کی سفیدی کو جم جانے سے روکتا ہے اُس کا تجربہ انسان کے تازہ خون پر کیا۔ اور اس ایجاد میں رفتہ رفتہ اس قدر ترقی ہوئی کہ ۱۹۳۰ء سے خون کا ذخیرہ ۳۵ دن تک اس حالت میں رکھا جا سکتا ہے کہ وہ کامیابی کے ساتھ کسی شخص کے جسم میں داخل کر دیا جائے۔ چنانچہ جنگ کے زمانہ میں تازہ خون کے ذخیرے ہر وقت تیار رہتے ہیں جو Blood - Banks سے موسوم ہیں اور مرتے ہوئے انسانوں میں پہونچ کر انھیں جدید زندگی بخشتے ہیں۔

اسی جنگ میں حادثات سے تازہ مرے ہوئے سپاہیوں کو زندہ کرنے کی کوششیں

دوائیں مسلسل دی گئیں اور پھر جلاب دیا گیا۔ اِس کے بعد اُسے حسبِ ذیل ادویہ کا انیماو
سرمہ، مقدس کڑوی دوائیں، نمک، میلو کے پتے، بنفشہ، چقندر، گل بابونہ، سو
کے بیج، السی، دارچینی، الائچی، زعفران، قرمز اور ایلوا۔ دو گھنٹہ بعد ان دوا
دوبارہ انیما اور ایک جلاب دیا گیا۔ پھر بادشاہ کا سر مونڈھ کر اُس پر پلاسٹر لگایا گیا۔ ا
صفوف سے چھینکیں دی گئیں۔ اور تقویت دماغ کے لئے گل گاؤ زباں کا صفوف دیا
پھر مسہل ادویہ کا تھوڑی تھوڑی دیر بعد اعادہ کیا گیا اور درمیان میں آش جو، ملٹھی اور
کا شیرہ پلایا گیا۔ اسی طرح سفید شراب، افسنتین اور سونف، گوکھرو کے پتے اور پود
کالا دانے اور انجلیکا کے ساتھ دئے گئے۔ بیرونی علاج کے لئے برگنڈی پچ اور کبوتر کی بیٹ
تلووں پر لگائی گئی۔ اِن سب علاجوں کے ساتھ خون نکالنے اور دست آور دوائیں دینے
سلسلہ جاری رہا اور کھانے کی دواؤں میں تخم خربزہ، منّا، لیموں کے پھولوں کا عرق
سوسن، شقائق نعمان، لیونڈر اور حل شدہ موتی دئے جاتے تھے۔ پھر جنتایانا کی جب
جائفل، کونین اور لونگ دئے گئے۔ جب بادشاہ کی حالت خراب ہوتی گئی تو تشنج کے
انسانی کھوپڑی کے جوہر کے ۴۰ قطرے پلائے گئے۔ مگر افسوس کہ کسی دوا نے کوئی فائدہ نہ
بلکہ حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ بالآخر اطبا، نے مایوس ہو کر ریلے (RALEIGH) کا
تریاق جانکنی کی حالت میں زبردستی بادشاہ کے گلے میں اُتارا۔ جو موتی، ایک مفرح شر
اور ایمونیا سے مرکب تھا۔

اسپتالوں میں غربا، کی حالت

یہ تو بادشاہ کے علاج کی کیفیت تھی جو اطبا، کی کثر
توجہ اور کثرت ادویہ اور اخراج خون سے کمزور
جلد مر گیا۔ اب اُس زمانہ کے غربا، کی کیفیت بھی سننے کے قابل ہے جو پیرس کے بڑے اسپتا
میں ہوتی تھی۔ سولھویں صدی میں اِس کے قیام کو ایک ہزار سال ہو چکے تھے۔ اسوقت
اُس میں ۱۲۰۰ مریضوں کے بستر تھے جن میں سے ایک ثلث تو بیشک ایک ایک مریض کے
تھے۔ باقیماندہ کی یہ گت ہوتی تھی کہ پانچ فیٹ کی چوڑائی میں چھ مریض تک لٹائے جاتے۔
اس حساب سے فی مریض صرف دس انچ چوڑی جگہ دیجاتی تھی۔ ایک بڑے کمرہ میں جس
نہ روشنی تھی اور نہ روشندان، ۰۰۰ مریض بھونس کے ڈھیروں پر سامان کی طرح ایک
دوسرے پر پڑے رہتے تھے جس میں مریضوں کے سروں پر دوسرے مریضوں کے پاؤں لگتے

تدریجی ترقی دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ عجب نہیں کہ آیندہ زمانہ میں چل کر عہد حاضرہ کے بہترین اسپتال دوزخ کا نمونہ قرار دیئے جائیں۔ اور علاج کے ایسے آرام دہ طریقے نکل آئیں جن سے موجودہ زمانہ کے تکلیف دہ انجکشنوں کی بھرمار سے نجات ملے جو مرتے ہوئے انسان کو چھلنی بنا دیتے ہیں۔

تشخیص مرض زمانہ حال میں سرجری کے ساتھ فنِ تشخیص میں بھی ترقی ہوئی ہے۔ جالینوس کے زمانہ میں تشخیص مرض کا انحصار تمام تر نبض کی حرکات دیکھنے پر تھا۔ نیز قارورہ اور اجابت کا رنگ دیکھا جاتا تھا۔ عہدِ حاضرہ میں STETHOSCOPE اور تھرمامیٹر کا اضافہ ہوا۔ قارورہ، اور اجابت، تھوک اور خون کی جانچ بذریعہ تجزیہ کے کیجاتی ہے۔ ایکس رے سے اندرون جسم کے فوٹو اور جراثیم کا مشاہدہ خوردبین سے کیا جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نباضی کے فن نے بہت ترقی کی تھی مگر اس کے لئے نہایت ذہانت اور کثیر تجربہ ضروری تھا۔ اب ہر معمولی سمجھ والے شخص کے لئے اتنے بہت سے آلات موجود ہوگئے ہیں کہ وہ جسم کے متعلق ایک حد تک یقینی معلومات حاصل کر سکتا ہے۔

اجتماعی امراض انفرادی امراض کے بعد اجتماعی امراض کی نسبت کچھ عرض کرنا مناسب ہوگا۔ اس سے مراد وہ امراض ہیں جو متعدی ہیں اور بعض وقت بڑھکر وبائی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

زمانہ ہائے قدیم سے طاعون اور ملیریا اور چیچک سے ہزاروں۔ لاکھوں آدمی مرجاتے تھے۔ انھیں روکنے کے لئے دو طریقے اختیار کئے جاتے تھے۔ ایک یہ کہ جہاں وبائی مرض نمودار ہوتا وہاں سے آمد و رفت بند کیجاتی۔ دوسرے غلاظتوں کو دُور کیا جاتا اور آبادیوں کو صاف اور ستھرا رکھنے کی کوشش کیجاتی۔

اِن وبائی امراض میں سب سے زیادہ ہلاکت چیچک سے ہوتی تھی جو تقریباً ہر سال شدّت کے ساتھ پھیلتی تھی اور جو مریض اُس سے جانبر ہوتے اُنھیں مستقل طور پر بدصورت بنا دیتی تھی۔ چنانچہ مصری ممیوں پر چیچک کے نشانات اب تک دیکھے جاتے ہیں۔ یہ مرض زیادہ تر گرم ممالک میں تباہی لاتا تھا مگر دسویں صدی میں وہ یورپ میں بھی پہونچ گیا اور وہاں اس قدر زیادہ پھیلا کہ ۱۶۹۶ء میں ملکہ میری کو بھی ہلاک کر دیا۔ اٹھارھویں صدی میں وہاں چھ کروڑ آدمی چیچک سے ضائع ہوگئے۔ چیچک کے ٹیکہ کی ایجاد سب سے اوّل قسطنطنیہ میں ہوئی۔

وہاں کے شاہی دربار میں انگریزی سفیر کی بیوی Lady Mary Montagu

کی گئیں اور اس تجربہ میں مسلسل کامیابی ہو رہی ہے۔ یہ ابتدائی انسان کے اس خواب
تعبیر معلوم ہوتی ہے جس میں کہ وہ مردوں کو زندہ کیا کرتا تھا۔

۲۔ خون بند کرنے کی کوشش زمانہ قدیم میں اس طرح کی جاتی تھی کہ رگوں
دیا جاتا تھا مگر اس سے زخم سڑ جاتا تھا۔ اس لئے زخم کو لوہے سے داغ دینے یا گرم
سے خون بند کیا جاتا تھا۔ عرب طبیبوں نے بھی اس کو جاری رکھا۔ مگر اب جبکہ زخم کی سڑ
Infection روکنے کے طریقے معلوم ہو گئے ہیں۔ کٹی ہوئی رگوں کو باندھ کر
کرنے کا طریقہ کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔

۳۔ عمل جراحی کرنے کے لئے پہلے زمانہ میں شراب پلائی جاتی تھی۔ مگر وہ کم
اور عمل دیر تک جاری نہ رکھا جا سکتا تھا، اس لئے مریض کو رسّوں سے باندھ دیتے کہ
جنبش نہ کر سکے۔ اس بارہ میں سب سے پہلا تجربہ (MORTON) مارٹن و
ساکن باسٹن نے ستمبر ۱۸۴۶ء میں بذریعہ (ETHER) ایتھر کے کیا۔ اس سے ا
ڈاکٹر سیمسن (SiMS ON) نے کلوروفارم کا استعمال کیا جو نہایت کامیاب
اب صرف ماؤف مقام کو دواؤں کے انجکشن دیکر سُن کر دیا جاتا ہے، جس کا اثر دما
نہیں پڑتا۔ اور بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ گھنٹوں تک آپریشن جاری رہ سکتا

۴۔ زخم کی سڑن روکنے کے لئے ڈاکٹر لسٹر (JOSEPGH LiSTER
سب سے پہلا تجربہ مارچ ۱۸۶۵ء میں کیا۔ اُس کا نظریہ یہ تھا کہ زخم کو صرف بیرونی ہوا
صاف پٹی باندھ دی جائے تو وہ از خود اچھا ہو جاتا ہے۔ پہلے زمانہ میں شروع ہی
کے سڑ جانے کا اندیشہ رہتا تھا اور پیپ پڑ جانے کو صحت کی علامت سمجھ کر اس کا
کیا جاتا تھا۔ مگر لسٹر نے پیپ پڑنے کا قصہ بھی ختم کر دیا۔ اور ادویہ کے ذریعہ سے جراثیم کو
جلد سے جلد زخم کے صحت یاب ہونے کی صورت نکال لی۔ اس نے عمل جراحی کے خطرہ
کم کر دیا۔ جوزف لسٹر کی اس قدر عزت ہوئی کہ وہ ۱۸۹۷ء میں PEER یعنی لارڈ
گیا۔

مختصر یہ کہ عمل جراحی اور اُسی کے ساتھ اسپتالوں کی حالت مسلسل بہتر ہوتی گئی
زمانۂ حال کے اسپتالوں کا مقابلہ اگر عہدِ جدید کے اسپتالوں سے کیا جائے جن کا تذکر
کیا جا چکا ہے تو بلا تشبیہ جنّت اور دوزخ کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ مگر اُسی کے ساتھ ز

وہ ہیضہ پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس اطمینان پر انھوں نے کسی دوا کا استعمال نہ کیا اور وہ محفوظ و مامون رہے۔

مختلف امراض کے جراثیم کو نلکیوں میں رکھا ہوا دیکھ کر بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا انسان نے امراض کو مسخر کر لیا ہے جس کا خواب اُس نے ابتدائی زمانہ میں دیکھا تھا اور وہ سحر آور عمل یا اپنے تصور و خیال کی قدرت سے انھیں مسخر کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ دنیا کے مختلف ممالک کے نقشوں سے جو شائع ہوتے رہتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ جس نسبت سے خاص خاص امراض کی بیخ کنی کی کوشش کی جاتی ہے اُسی نسبت سے کامیابی ہوتی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ سوویٹ روس میں ہیضہ، طاعون اور ملیریا، ٹائیفائڈ کی جہاں کہیں سے خبر آتی ہے ڈاکٹروں کا ایک دستہ ہوائی جہاز سے پہونچ کر وہاں اُن کا قلع قمع کر دیتا ہے۔ اسی طرح انگلستان کی اموات میں کمی ہونے کے چند اعداد قابل ملاحظہ ہیں:۔

	۱۸۶۸ء میں	۱۹۴۳ء میں
عام اموات فی ہزار	۲۰٫۶	۱۲٫۱
شیر خوار بچوں کی اموات	۱۵۵	۴۹

ہیضہ سے اموات ۶ سال میں ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۴ء تک ۱۰ لاکھ (اب ندارد)

ٹائیفائڈ سے ۱۸۷۱-۷۵ء تک ۴ سال میں ۳۷۱ فی ۱۰ لاکھ ۱۹۴۲ء میں صرف ۳

چیچک سے ۳۹۲ " سے صفر تک

سرخ بخار سے ۱۸۶۱-۷۰ء میں ۲۴۱۶ " سے ۱۹۳۱-۳۵ء میں صرف ۵۷

ہندوستان میں اب تک چیچک سے موتوں کی تعداد ضرور گھٹی ہے۔ مگر دیگر امراض سے مجموعی تعداد اموات اب بھی بہت زیادہ ہے۔ مثلاً ۱۹۳۷ء میں ہندوستان کی مجموعی اموات انگلستان کی کل موتوں سے ڈھائی گونہ، اور بچوں کی شرح اموات دوگنی تھیں۔

حفظ ماتقدم سب سے آخر میں میں حفظ ماتقدم کے طریقوں کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جن کی موجودہ زمانہ میں بہت اہمیت ہو گئی ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ اسقولیفیس کے زمانہ سے لیکر جالینوس کے زمانہ تک حکماء کی توجہ کھلی ہوا اور صحت بخش مقامات کی طرف زیادہ تھی۔ اور سحر و عمل کے ذریعہ سے خیالات پر اثر ڈال کر زیادہ تر علاج کیا جاتا تھا۔ جالینوس کے زمانہ سے دواؤں کی طرف توجہ زیادہ ہوئی۔ پھر سولھویں صدی میں علم تشریح کی

لیڈی میری مانٹے گو تھی اُس نے ۱۷۱۸ء میں چیچک کے ٹیکہ کی بابت اپنے گھر کو لکھ کر بھیجا۔ اسوقت چیچک کا ٹیکہ خود چیچک کے مواد سے تیار کیا جاتا تھا۔ جب لیڈی مذکور اپنے وطن لندن میں آئی تو اُس نے ازراہِ ہمدردی لوگوں کو ٹیکہ لگانا شروع کیا۔ مگر پادریوں نے اُس کی اس قدر سخت مخالفت کی کہ وہ انگلستان آکر پچھتائی۔ اُس ٹیکہ میں چھوت لگنے کا بہت خطرہ رہتا تھا۔ اسکی رفعدادا انگلستان کے ایک گھوسی مسمی جینر
Edward Jenner of
Gloucestershire نے اس طرح کی کہ اپنی گایوں کے تھنوں سے دوا تیار کرکے اُس کا ٹیکہ ۱۷۹۶ء میں جاری کیا۔ اُسی کی وجہ سے اب چیچک کی وباؤں سے بہت کچھ حفاظت ہو گئی ہے۔ اس سے قبل ہر مرض کا علاج صرف اُس وقت شروع کیا جاتا تھا جبکہ وہ نمودار ہو جاتا تھا۔ چیچک کا ٹیکہ حفظ ما تقدم کا بہترین پہلا تجربہ تھا اور اُس کے بعد اب دیگر امراض سے حفاظت کے لئے ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔

مگر متعدی اور وبائی امراض کا مستقل علاج گزشتہ صدی کے آخر میں PASTEUR کے ہاتھوں سے ایجاد ہوا جو کوئی ڈاکٹر نہ تھا بلکہ محض علم کیمیا کا ماہر تھا۔ اُس نے جراثیم کی تحقیق کی۔ اور مختلف اشیاء سے اُن جراثیم کی پرورش کرنے، بڑھانے اور ہلاک کرنے کے تجربے کئے۔ اُس کی تحقیقات کا پہلا نتیجہ کتے کے کاٹے کا علاج تھا جو بہت کامیاب ثابت ہوا۔ اُس کے بعد اب کوئی متعدی مرض مشکل سے ایسا بچا ہوگا جس کے جراثیم بذریعہ خورد بین کے جدا جدا نہ پہچانے جاتے ہوں اور انھیں پرورش کرنے اور ہلاک کرنے کی دوائیں معلوم نہ ہو گئی ہوں۔ اب تو ٹائیفائڈ اور ہیضہ اور ملیریا کے جراثیم طبی لیبوریٹری میں شیشہ کی نلکیوں میں جدا جدا رکھے رہتے ہیں۔ وہ مرض کی حالت میں اور نیز بطور حفظ ما تقدم بذریعہ انجکشن کے خون میں پہونچائے جاتے ہیں جس سے جسم میں مرض کا مقابلہ کرنے اور اُسے دفع کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اُن کے نتائج تقریباً یقینی ہیں۔ ڈاکٹر محمد فیاض خاں صاحب نے ایک بار بیان کیا کہ وہ صیغہ حفظانِ صحت لکھنؤ کے معمل میں کام کر رہے تھے تو ہیضہ کے جراثیم نلکی میں سے اُنھوں نے حسب قاعدہ اُسے منہ میں لیکر سانس سے کھینچے تاکہ اُنھیں دوسری نلکی میں پہونچائیں۔ اتفاق سے ہیضہ کے جراثیم کھنچ کر اُن کے حلق میں پہونچ گئے جس سے اُنھیں پریشانی ہوئی۔ مگر تھوڑی دیر میں خیال آیا کہ وہ کھانا کھا کر آئے ہیں جس کی وجہ سے اُن کے معدہ میں GASTRIC JUICE موجود ہوگا اور اُس سے ہیضہ کے جراثیم فوراً مر جائیں گے اور آنتوں تک نہ پہونچ سکیں گے۔ جہاں پہنچکر

کئے جائیں جو یورپ اور امریکہ میں اختیار کئے گئے۔ اجتماعی طریقے یہ ہیں کہ مچھروں اور پسوؤں اور مرض پھیلانے والے کیڑوں کو ہلاک کرنے کا انتظام وسیع پیمانہ پر کیا جائے۔ لاکھوں کروڑوں روپیہ خرچ کر کے حفظانِ صحت کے طریقے جاری کئے جائیں۔ اور مرض سے بچنے کے انفرادی طریقے یہ ہیں کہ عوام الناس تک کو کافی مقدار میں غذا کے ضروری اجزاء اور وٹامین دستیاب ہوں۔ مگر یہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ عوام میں اتنی مالی استطاعت نہ ہو کہ وہ اپنا معیارِ زندگی بلند کر سکیں۔ کن طریقوں سے ملک میں حفظانِ صحت کے طریقے وسیع پیمانہ پر جاری کئے جا سکتے ہیں اور عوام کا معیارِ زندگی بلند کیا جا سکتا ہے اور ان ذرائع سے امراض کا قلع قمع یا اُن کی تسخیر کیجا سکتی ہے یہ امور ایک حد تک سیاسی ہونے کی وجہ سے اس مجلس کے حدود سے باہر ہیں۔ اگر میں اس میں مداخلت کروں تو اندیشہ ہے کہ میں "بسوز د پرم" کا مصداق نہ بن جاؤں اس لئے یہاں اس مقالہ کو ختم کرتا ہوں۔

سب سے آخر میں عرض ہے کہ میں نے جو کچھ آپ کے سامنے پیش کیا ہے وہ بطور ایک حاطب اللیل کے ہے۔ نہیں بلکہ میری حالت اُس شخص کے مانند ہے جسے راستہ میں ایک نعل پڑا مل گیا تھا اور وہ کہتا پھرتا تھا کہ اب صرف ۳ نعل اور ایک گھوڑے کی کسر باقی ہے۔ مگر اُسی کے ساتھ مجھے اس قدر احساس ضرور ہے کہ مجھ میں یہ کمی پورا کرنے کی اہلیت اور قابلیت نہیں ہے، اس لئے اُن اصحاب کی خدمت میں جو اس کے اہل ہیں عرض ہے کہ اپنے مقالوں کے ذریعہ سے "مجلس مصنفین" کے لئے ۳ نعل اور ایک گھوڑا فراہم کریں تاکہ طبی معلومات کا ایک مکمل گھوڑا تیار ہو جائے۔

طفیل احمد

علی گڑھ میڈیکل کالج

کے

قیام میں عملی حصہ لیکر جدید طبی تحقیقات اور معلومات میں اضافہ کیجئے!

(مُصنّف)

ترقی سے جسم کی چیر پھاڑ نے دواؤں کی طرف سے کسی قدر توجہ ہٹالی۔ کثرتِ ادویہ
ہومیوپیتھی کی شکل میں نمودار ہوا، جس کا نظریہ یہ ہے کہ جس نسبت سے دوا کی مقدار گ
اُسی نسبت سے اُس کی قوت اور اثر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ کثرتِ ادویہ کے ردِ
اور شکل اختیار کی اور دواؤں کو بالکل چھوڑ کر قدیم سحر اور عملیات کو مسمریزم و
(Mesmerisms & Hypnotisim) کی شکل مِ
اسی کے ساتھ پہاڑوں پر اور کھلی ہوا میں مریضوں کو رکھنے کا طریقہ جاری کیا گیا
سال قبل حکیم بقراط کے زمانہ میں جاری تھا۔
مگر اِن تمام جدید طریقوں میں سب سے زیادہ کامیاب وہ معلومات ہیں
جو (VITAIMINES) وٹامینوں کے متعلق حاصل ہوئی ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھ
کے لئے ایک وقت میں صرف ایک غذا مفید سمجھی جاتی تھی، مگر اب کہا جاتا ہے کہ عمد
کے لئے ضروری ہے کہ غذاؤں کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ ان میں مختلف وٹامینو
رہے۔ اور جسم میں جس وٹامین کی کمی ہو اُسے غذا کی شکل میں پورا کیا جائے۔ مثلاً یہ
غذاؤں کے ذریعہ سے جسم کے اندر ہر روز تین ہزار کیلوری (CALORIES)
جائیں جن سے اتنی حرارت پیدا ہوتی ہے کہ وہ سات گیلن یعنی ۲۵ سیر برف کے د
کو بھاپ بنا دے۔ چنانچہ اِس وقت خوشحال ممالک میں نہ صرف یہ کہ وبائی اور متعد
کے جراثیم کو وسیع پیمانہ پر ہلاک کیا جاتا ہے، بلکہ اُسی کے ساتھ غذاؤں میں توازن کو م
ہے۔ اِسی کا نتیجہ ہے کہ اُن ممالک میں اوسط عمر مسلسل بڑھتا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ امریکہ
سے اِس وقت تک یعنی ۵۴ سال میں اوسط عمر بقدر ستّرہ سال کے بڑھ گیا ہے اور
۶۵ سال اور اس سے زیادہ کی عمر والے لوگ نوّے لاکھ کے قریب موجود ہیں۔
غذاؤں کا اثر ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بالکل نمایاں معلوم ہوتا
یہ کہ شمالی ہند میں جہاں گیہوں اور دودھ دہی خوب کھایا جاتا ہے وہاں کے لوگوں کے
اوسط وزن جنوبی ہند کے لوگوں کے وزن سے دوگنا ہے۔ اور مختلف قسم کے امراض
کمی ہے۔ مگر فی الجملہ ہندوستان کے لوگوں کا اوسط عمر انگلستان سے نصف کے قر
یعنی ۴۶ فی ہزار کے مقابلہ میں صرف ۲۳ ہے۔ ہندوستان میں اوسط عمر بڑھنے کی ص
بجز اس کے نہیں ہو سکتی کہ یہاں بھی انفرادی اور اجتماعی امراض دور کرنے کے وہی ط

ایک ٹیکس مہانداری بھی تھا۔ پھر امیر کے عقیل دار تنخواہ کے آدمی نہیں بلکہ کمیشن دار ہوتے تھے، جتنا زیادہ وصول کریں اتنی ہی زیادہ کمیشن پائیں۔ صورت حال جب یہ ہو تو کیا اُمید رہ جاتی ہے کہ مسلمان امیر کی مسلمان رعایا سکھ کی روٹی کھا سکتی اور کوئی کلچری ترقی کر سکتی!

ریاست بخارا کا پورا مالیہ پونے دو کروڑ روبل سالانہ تھا۔ اس میں سے رعایا کی فلاح و بہبود پر مشکل سے پانچ فی صدی خرچ کیا جاتا تھا۔ امیر نصر اللہ خاں نے اپنی چھٹے سال کی حکومت میں ایک مدرسہ، ایک پُل اور ایک مسجد بنوائی اور ہمیشہ اس پر فخر کیا۔

بخارا کی تعلیمی حالت دو فی صدی سے کم تھی اور اس دو فی صدی تعلیم پر عمال، امیر، خوانین اور ملّا قابض تھے، عام مسلمان سو فی صدی جاہل رہتے تھے۔ اُزبک قوم کی یہی بدقسمتی شاید اس بات کی ذمہ دار ہے کہ ہماری زبان میں اُجبک کا لفظ اکھڑ، گنوار اور مطلق جاہل کے لئے بولا جانے لگا۔

سوویٹ روس کی حیرت انگیز ترقیاں روس پر نازی حملے کے باعث دنیا پر ظاہر ہوئیں۔ لیکن وسط ایشیا کی قوموں کی ترقی اس سے بہت زیادہ حیرت انگیز ہے۔ اس لئے کہ روس خاص کے لوگ تمدن و تہذیب کی بہت سی منزلیں طے کر چکے تھے۔ وسط ایشیا کی قوموں نے ابتداء سے ابتداء کی، اور صدیوں کے مذہبی تعصبات سے جنگ کی، اور اس قسم کی جنگ شاید اور ہر قسم کی جنگ سے زیادہ سخت و دشوار ہوتی ہے۔

الغرض جب ازبکستان کے افق پر انقلاب کا سورج جگمگایا، جب اس مفید سرزمین پر آزادی کا پرچم لہرایا تو بارہ پندرہ سال کی قلیل مدت میں ملک کی کایا پلٹ ہو کر دو فی صدی تعلیم نوّے فی صدی ہو گئی۔ اور آج یہ تمام قومیں تیز رفتاری کے ساتھ علمی، سائنسی، کلچری اور تمدنی ترقی کر رہی ہیں۔

میں اس موقع پر ازبکستان کے بعض علمی اداروں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور مقصود یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے ہم مذہب اور ہمسایہ قوموں کے حالات کا اندازہ کریں اور ہو سکے تو سبق لیں کہ قومی طور پر دنیا کا ہر مشکل ترین کام بھی آسان ہو جاتا ہے، کوئی جماعت جب عزم اور تہیہ کر لیتی ہے تو "انہونی" باتیں بھی ہو جاتی ہیں۔

رسالہ ہندوستانی میں میرا ایک مضمون "وسط ایشیا کی قوموں کا سوویٹ ادب" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے جس کے اندر ایک اُزبک شاعر غفور غلام کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

ازبکستان کی علمی سرگرمیاں

(از جناب ل۔ احمد صاحب اکبرآبادی)

خیوا بخارا وغیرہ کا علاقہ پہلے روسی ترکستان کہلاتا تھا۔ یہ علاقہ ایران وا
کے شمال میں بحر قزوین سے لے کر وادی فرغانہ تک پھیلا ہوا ہے۔ روسی ترکستان
بڑی ریاست تخارا کی تھی، جو زارشاہی کی محکوم اور ایک ہندوستانی رجواڑے
اس پورے علاقے کی آبادی مسلمان ہے، لیکن غریب رعایا مسلمان خاں، مسلمان ملاّ
یعنی زمیندار، مسلمان امیر، روسی نوآبادکار اور سفید زار کی مستقل خوں آشامی کا شکار
روسی ترکستان کی مسلمان آبادی قومیت کے اعتبار سے مختلف النسل یعنی ازبک
ترکمان، تاشکند اور کرغیز وغیرہ پر مشتمل تھی۔ حالت اتنی ردّی ہو چکی تھی کہ ایک کلمے کے
ایک دوسرے سے انتہائی نفرت کرتے اور حقیر سمجھتے تھے۔ یہ پورا علاقہ اب چھ نسلی
میں بٹ گیا ہے۔ سوویٹ انقلاب نے جب قوموں کی آزادی کا اعلان کیا تو ایک
میں سے چھ نسلی قومیں نکل پڑیں اور سب نے اپنی کلچری علیحدگی اور خودمختاری کا مطالبہ
نے اس مطالبے کو تسلیم کیا اور علیحدگی ہوگئی۔ حالت بہتر ہونے لگی اور اس کے ساتھ
باہمی بغض عناد بھی رفع ہو کر مخلصانہ تعلق اور سچا بھائی چارہ قائم ہو گیا۔ اب یہ تمام جمہ
خودمختاری کے طفیل تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہیں۔

غرض مسلمان امیر کی عمل داری میں عیسائی زار غریب مسلمانوں کی محنت و مشقت
جھپٹ لے جاتا تھا، روسی نوآبادکار جونک بنا ہوا تھا، امیر کے عمال و تحصیلدار اگر
چمٹے رہتے تھے، ان سے جو کچھ بچ جاتا اُس پر زمیندار اور خوانین کا دانت رہتا، اور
برستزاد تھا۔

امیر کے ٹیکسوں کی وہ بھرمار تھی کہ شاید ٹیکس کا کوئی معقول حیلہ نہ رہ گیا تھا

تاشقند کے جامعہ علوم یا ACADEMY of SEWCES نے مشرقی مخطوطات کا ایک کتب خانہ قائم کیا ہے جس میں ستر ہزار قلمی نسخے اس وقت موجود ہیں۔ مشرقی مخطوطات کا اتنا بڑا ذخیرہ دُنیا میں شاید دوسرا نہ ہو۔ بڑی حیرتناک بات یہ ہے کہ یہ عظیم الشان ذخیرہ سوویٹ عہد ہی کے اندر فراہم ہوا ہے۔ اُزبک جمہوریت وجود میں آتے ہی حکومت کی طرف سے قلمی نسخوں کی فراہمی شروع ہو گئی تھی اور جب یہ اکاڈمی قائم ہوئی تو وہ نسخے اس کو منتقل کر دیے گئے۔

اس کتب خانے میں ۱۹۰۰ء تک کے لکھے ہوئے نسخے ہیں، جن میں زیادہ تعداد فارسی، اس سے کم عربی اور اس سے کم ترکی زبان کے نسخوں کی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے سب سے بڑی تعداد تاریخ کی کتابوں کی ہے جو وسط ایشیا، ایران، افغانستان اور ہندوستان کی تاریخ سے متعلق ہیں۔ اکثر نسخے مُصوّر و مُطلا ہیں۔ تاریخ سے کم جس موضوع پر کتابیں ہیں وہ اسلامی شرق کا فلسفہ ہے۔ باقی کتابیں طب، ریاضی اور علم کیمیا وغیرہ پر ہیں۔ طب کی کتابوں میں بعض ایسے نسخے ہیں جن میں تشریح الابدان کے متعلق رنگین ڈایاگرام دئے ہوئے ہیں۔

اس کتب خانے میں ایسے نادر نسخے بہت ہیں جن کا کہیں ذکر یا حوالہ بھی نہیں آیا ہے۔ اور ایسے مسودّے بھی کافی تعداد میں ہیں جو خطاطی اور رضاعت کے اعتبار سے بے مثال اور نہایت پُرانے ہیں۔ نادر ترین نسخوں میں اُزبک لیڈر شعبان خاں کی خود نوشت سوانح حیات ہے جس کا کچھ حصہ شعبان خاں کے معتمد یا سکریٹری کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ ایسا ہی ایک نسخہ اُزبے خاں کی یادداشت ہے۔ اُزبے خاں اصفہان کا رہنے والا اور شعبان خاں کا دوست تھا۔ اس یادداشت کی ایک جلد استنبول کے کتب خانے میں اور ہے۔

ان ستر ہزار قلمی نسخوں کے علاوہ کوئی پچیس ہزار مطبوعہ کتابیں بھی ہیں جو وسط ایشیا، ایران یا ہندوستان میں چھپی تھیں، مگر ان میں سے اکثر کتابوں کا علم ان ملکوں کو نہیں ہے جہاں وہ چھپی تھیں۔

یہ ادارہ ساری سوویٹ یونین میں مشہور ہے اور نہایت ذی وقعت مانا جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے دُنیا کے معروف ترین کتب خانوں میں سے ایک ہے۔ سوویٹ یونین کے مختلف حصّوں سے بہت سے استفسار آتے رہتے ہیں، جن کا تشفی بخش جواب دینا ادارے کا فرض ہے۔ طبیب ڈاکٹر سوال کرتے رہتے ہیں کہ فلاں مرض میں عرب اطبا کا طریق علاج کیا تھا، یا فلاں مرض میں کیا دوائیں تجویز کرتے تھے۔ تھیٹروں اور فلموں کے ہدایت کار معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ فلاں عہد میں

نظامی کی آخری عمر کی تصنیف ہے۔ اس لئے اس کے عقائد و افکار سکندر نامے ہی میں پوری طرح جلوہ گر ہو سکتے تھے۔

تاشقند کے ادارۂ تحقیقات لسانی PHILOLOGICAL RESAERCH INSTITUTE اور وسط ایشیا کی مرکزی اسٹیٹ یونیورسٹی کی متفقہ سرپرستی میں پچھلے سال ملا علی شیر نوائی کے شعر و ادب پر بحث و نظر کے لئے ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں سوویٹ یونین کے ساٹھ مستشرقوں نے حصہ لیا۔ کانفرنس کی صدارت پروفیسر V.ZHIRMUNSKY نے کی جو سوویٹ اکاڈمی آف سائنسز کا اصلی ممبر اور ایک بلند پایہ مستشرق ہے۔ ملا علی شیر نوائی خراسان کی تیموری سلطنت کا وزیر تھا اور ایک مدبر سلطنت ہونے کے ساتھ ساتھ عالم و درویش، نقاش و موسیقی نواز اور ادیب و شاعر اور جامی کا ہم عصر تھا۔ ملا علی شیر نوائی علم و فن کا اتنا بڑا سرپرست تھا جس کی ہنر پروری کو شہنشاہ بابر نے عدیم المثال کہا ہے۔ بہزاد سا نقاش اور حسن عودی سا موسیقار اس کے وابستگان میں سے تھے۔ نظامی کے اتباع میں ملا علی شیر نے ایک خمسہ مرتب کیا اور ترکی و فارسی میں ۶ مثنویاں اور ۴ منظوم ڈرامے لکھے۔ نوائی کا پورا کلام روسی زبان میں ترجمہ ہو کر شائع ہو گیا ہے اور ازبکستان کے فلمی ادارے نے نوائی کی زندگی کا فلم بھی بنا لیا ہے۔

صدر کانفرنس نے اپنے خطبے میں ملا علی شیر کی عظمت اور بلند مرتبتی پر زور دیتے ہوئے بتایا کہ یہ جنگ سوویٹ یونین کے لئے موت اور زندگی کا مسئلہ ہے۔ لیکن جنگ کی اہم ذمہ داریوں اور انہماک کے باوجود نوائی پر ریسرچ کا کام ایک دن کے لئے ملتوی نہیں ہوا۔ اس سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہم ملا علی شیر کے علم و فضل کا کیا درجہ سمجھتے ہیں۔

پروفیسر VSEFOLODZUMM نے علی شیر کی تصویر پر ایک مقالہ پڑھا اور بتایا کہ دنیا میں نوائی کی ایک ہی مستند تصویر ہے جو مملکت ایران کی ملکیت ہے۔ یہ تصویر بخارا کے مشہور نقاش محمود مذہب کی قلم کاری کا نتیجہ ہے اور اس کے مستند ہونے پر ذرہ بھر شک نہیں کیا جا سکتا۔

ازبک نوعمر سائنس داں محمد یونسوف نے اپنے مقالے میں اس اثر کو ظاہر کیا جو ملا علی شیر کے شعر و ادب نے اپنے زمانے اور بعد کے زمانے پر چھوڑا۔

ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ گورِ امیر کی کھدائی میں چار ڈھانچے برآمد ہوئے جن میں ایک امیر تیمور کا ہے، دو اس کے بیٹوں کے، اور ایک اس کے پوتے الغ بیگ کا ہے۔ اس تمام تحقیقات سے اگرچہ پندرھویں صدی کی اس عظیم الشان شہنشاہی کے متعلق سوویٹ سائنس کو بہت تاریخی باتوں کا علم حاصل ہوا ہے، لیکن اس سلسلے میں اہم کارنامہ یہ ہے کہ سوویٹ سائنسداں گراسی موف نے جو علم الانسان کا ماہر ہونے کے ساتھ مانا ہوا فلم ساز بھی ہے۔ ان ڈھانچوں پر گوشت پوست چڑھا کر چہرے بنا دئے ہیں جو تاریخی قیافوں کے بالکل مطابق ہیں۔ گراسی موف کا یہ کارنامہ اسی قبیل کا کام ہے جیسا قدیم یونانی شاعرہ سیفو کے لفظوں اور جملوں کو لے کر سیفو کے رنگ میں نظمیں تیار کر دینا۔

اُزبکستان میں ایک اور تاریخی و کلچری تحقیقات ہو رہی ہے جس کی اہمیت کا پورا اندازہ آیندہ چل کر ہو سکے گا۔ اس ادارے کا نام INSTITUTE of THE HISTORY of MATERIAL CULTURE, ہے۔ اس ادارے نے ایک بہت بڑی کمیشن بھیج کر دریائے سیر کے کنارے بہت قدیم زمانے کے کلچری آثار برآمد کرائے ہیں۔ ایک شہر برآمد ہوا ہے، جس کی تاریخ تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح شمار کی جاتی ہے۔ ایک عالیشان محل کے بعض حصے نہایت اچھی حالت میں نکلے ہیں جس کے اندر بڑے بڑے ایوان ہیں اور چھتیں محرابی ہیں چھتوں میں سونے کے کڑے پڑے ہیں اور ان میں موتی جڑے ہیں۔ محل کی دوسری منزل کا برآمدہ فن تعمیر کا ایک خاص نمونہ سمجھا گیا ہے۔ ایک آوا یا بھٹا بھی دریافت ہوا ہے جس میں سے کمہار کے کام یعنی مٹی کے برتن اور ان پر روغن سازی کے بعض اعلیٰ نمونے ملے ہیں۔ ہڈی کی ایک چھری دستیاب ہوئی ہے جس پر باریک کندہ کاری کی گئی ہے۔

اِن ہمسایہ ملکوں کی یہ علمی سرگرمیاں ہندوستان کے علمی اور کلچری اداروں کے لئے بھی مفید ہو سکتی ہیں۔ اس لئے ہمارے اداروں کو چاہئے کہ وسط ایشیا سے اپنے تاریخی تعلق کو پھر سے زندہ کریں۔ نامناسب نہ ہوگا اگر ہم دس پانچ ماہرین کی ایک جماعت ان اسلامی ملکوں کی سیاحت کے لئے بھیجیں جو اپنے اپنے موضوع کے لحاظ اس تمام علاقے کا مطالعہ کریں اور پھر ایک ایک مقالے کی صورت میں اپنے تاثرات کو مرتب کریں اور تمام مقالے ایک مجلد میں شائع کئے جائیں +

ل۔ احمد

فلاں حصۂ ملک کا لباس کیا تھا۔ معاشرت کیا تھی وغیرہ۔ صناع و نقاش پوچھتے رہتے ہیں کہ مصور نسخوں میں کس کس عہد کی اور کس صناع کی دست کاری ہے اور کون کون سے رنگ استعمال ہوتے ہیں وغیرہ۔

تاریخی اور کلچری مطالعہ و تحقیق کے لئے تاشقند میں ایک اور ادارہ قائم ہے۔ یہ ادارہ سوویٹ تحفظ آثار قدیمہ کی ازبکستانی کمیٹی کہلاتا ہے۔ جس وقت یہ کمیٹی قائم ہوئی تو ازبکستان کی جمہوریت نے بیک وقت بیس لاکھ روبل عطا کئے۔ اس کمیٹی کا صدر واحد جہانگیروف ہے، اور یہ کمیٹی اس جنگ کے شروع ہونے سے قبل اپنا کام شروع کر چکی تھی جو برابر جاری ہے۔

سمرقند میں امیر تیمور کا مقبرہ گورِ امیر کے نام سے مشہور ہے۔ تین سال سے یہ کمیٹی گورِ امیر کی تحقیق کر رہی ہے۔ شروع میں اس تحقیق کے تمام ذرائع مفقود تھے۔ لیکن حسن اتفاق سے ایک اسپینی سفیر کا روزنامچہ دستیاب ہو گیا جو ۱۴۰۴ء میں امیر تیمور کے دربار میں حاضر ہوا تھا۔ اس سفیر نے اپنے روزنامچے میں ایک بہت بڑے مدرسے کی عمارت اور اس کے مقابل ایک عالیشان درویش خانہ یا خانقاہ کی عمارت کا ذکر کیا ہے۔ کھدائی سے ان دونوں عمارتوں کے آثار نکلے اور پتا چلا کہ گورِ امیر بعد کی چیز ہے۔ پہلے وہاں مدرسہ و خانقاہ تھی جو ایک چار دیواری سے محصور تھی۔ اور دونوں عمارتوں کے بیچ میں ایک نہایت خوشنما باغ تھا۔ یہ عمارتیں اور باغ شہزادے محمد سلطان یعنی امیر تیمور کے پوتے نے بنوایا تھا۔ باغ کا نقشہ و تعمیر ایک اصفہانی انجنیر نے بنایا تھا جس کا نام محمد بن محمود تھا۔

شہزادہ ایک جنگی معرکے میں مقتول ہوا اور اس کی لاش سمرقند لائی گئی اور خانقاہ میں دفن کر دی گئی۔ لیکن چونکہ امیر تیمور کو شہزادے سے بہت محبت تھی اور اس محبت کا تقاضا تھا کہ شہزادے کی قبر بہت عالیشان بنائی جائے۔ چنانچہ حکم تیموری کے مطابق وسط باغ میں شہزادے کا مقبرہ تیار ہوا جو پھر شاہی گورستان بن گیا اور بالآخر امیر تیمور بھی وہیں دفن ہوا اور اس شاہی قبرستان کا نام گورِ امیر پڑ گیا۔

خانقاہ کی عمارت تو مسمار ہو چکی تھی مگر ایک نیلی چینی کا گنبد باقی تھا۔ اس کمیٹی نے اس گنبد کی مرمت کرائی اور چار دیواری بھی اصل کے مطابق بنوائی ہے۔ چار دیواری میں اندر کے رخ پچہ کاری کا حاشیہ تھا۔ یہ حاشیہ بنوانے کے لئے سارے علاقے سے بوڑھے بوڑھے پچہ کار جمع کر کے اصل کے مطابق کام کرایا گیا۔ تعمیر کی تفصیلات اسپینی سفیر کے روزنامچہ سے حاصل کی گئی تھیں۔

اس سے بہت قبل مرحومہ کی نظمیں مُلک کے اکثر رسائل میں ز۔ خ۔ ش کے نام سے شائع ہوکر داد سخن لے چکی تھیں، لیکن ان کی حیثیت اجزائے پریشاں سے زائد نہ تھی۔ اگر کتاب مذکورا فق اشاعت پر نمودار نہ ہوتی تو زمانہ کا ظالم ہاتھ اس منتشر شیرازہ کو ہمیشہ کے واسطے فنا کر دیتا۔ اور یہ بے بہا موتی جو اب ایک رشتہ میں منسلک ہو کر ایک عمدہ ہار کی صورت اختیار کر چکے ہیں، ضائع ہو جاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ کارپردازان دارالاشاعت نے "فردوسِ تخیل" چھاپ کر ہمارے خاندان اور اُردو شاعری پر انتہائی احسان کیا ہے کہ اس سے سُبکدوشی کسی طور پر ممکن نہیں۔

آخر کار آسمانِ شاعری کا یہ نیرِ تاباں کچھ مدت تک اپنی ضیا باری سے دُنیائے ادب کو منور کر کے بہ عالمِ دوشیزگی فروری ۱۹۲۲ء میں ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے روپوش ہو گیا۔ لیکن ع

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

مرحومہ اگرچہ بہ ظاہر پردہ کر چکی ہیں۔ لیکن معنوی اعتبار سے زندہ ہیں۔ اور جب تک گردشِ لیل و نہار قائم ہے انشاء اللہ تعالیٰ خراجِ تحسین و آفریں وصول کرتی رہیں گی۔ کیونکہ خیالات کی وہ مے خالص جو اُنھوں نے جامِ شاعری میں بھر کر پلائی تھی اتنی نفیس اور خوش ذائقہ تھی کہ کام و ذہن اس کی لذت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ان کے کلام کا اگر بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ اس قلیل عمر میں وہ وہ کچھ کہہ گئیں جو لوگ ایک طویل مدت میں بھی نہیں کہہ پاتے، اور شاعری میں وہ مرتبہ پایا جو بہت کم اشخاص کو حاصل ہے۔

مرحومہ باوجود بے حد حریت پسند اور روشن خیال ہونے اور اعلیٰ ترقی پذیر رجحانات رکھنے کے مشرقی تہذیب و تمدن کی انتہائی دلدادہ تھیں اور اُنھیں مذہب سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اگر آپ ان کے کلام کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اسلام کی محبت اُن کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی اور مسلمانوں کی بے راہ روی اور مذہب سے بیگانگی اُنھیں ہمیشہ بے چین رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی صلاحیتوں اور وقت کو پامال شدہ مضامین کے بیان کرنے اور دُور از کار خیالات کے موزوں کرنے میں ضائع نہیں کیا بلکہ اُنھوں نے اپنی تمام کوششیں مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے میں صرف کر دیں۔

"آئینۂ حرم" اور "فردوسِ تخیل" کی اکثر نظمیں اس کا بیّن ثبوت ہیں۔ وہ معمولی واقعات سے اس درجہ متاثر ہوتی تھیں کہ کئی کئی دن تک ان پر محویت کا عالم طاری رہتا اور وہ خواب و خور سے تقریباً بے نیاز ہو جاتیں۔ ایک دفعہ کانپور کی ایک مسجد پر پولس والوں نے

زاہدہ خاتون نروہت

(از صاحبزادہ ممتاز علی خاں بی۔ اے (علیگ) نبیرۂ نواب صدر یار جنگ بہادر)

زاہدہ خاتون نروہت مرحومہ نواب ڈاکٹر سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب مرحوم و مغفور کی منجھلی صاحبزادی تھیں۔ وہ دسمبر ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئیں۔ ابھی منزل شعور میں قدم نہ رکھا تھا کہ آغوش مادر سے محروم ہو گئیں۔ لیکن اس کمی کا ازالہ قدرت نے شفیق خالہ کی صورت میں کر دیا۔ انھوں نے مرحومہ کو مثل اپنی اولاد کے پرورش کیا اور کبھی یسیری کا روح فرسا احساس نہ پیدا ہونے دیا۔ لیکن اُس وقت یہ بات اِن کے وہم و گمان میں بھی نہ گزری ہو گی کہ بوستان شیروانیان کی یہ نوخیز کلی ایک دن ایک خوشنما اور دل آویز پھول بن نے کا شرف حاصل کرے گی اور اپنی نکہتِ جاں فزا سے اہلِ ذوق کے مشامِ جاں کو معطر کر جائے گی۔ اس کا شمار ہندوستان کی چوٹی کی شاعرات میں ہو گا۔ اور علم جیسی بے بہا و عدیم النظیر شے کی حامل ہو گی۔

نواب صاحب مرحوم نے باوجودیکہ اس زمانہ میں عورتوں کو اور خاص کر ہمارے خاندان کی مستورات کو اعلیٰ تعلیم دلوانا معیوب اور گمراہ کن تصور کیا جاتا تھا، اپنی لڑکیوں کو پڑھانے کیواسطے سید احمد صاحب خیری اور آغا شاعر کی بہن کو مقرر کیا۔ اور یہ اسی تعلیم اور مذکورہ ہر دو ہستیوں کی صحبت کا فیض تھا کہ اس جوہر نے جو خالقِ ارض و سما نے مرحومہ کو عطا کیا تھا جلا پائی اور اس کی تابندگی سے دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ اگر خاندان کی دوسری عورتوں کی طرح انھیں بھی تعلیم سے بے بہرہ رکھا جاتا تو دلدادگان شاعری ایک اچھی شاعرہ کے افکارِ عالیہ سے محروم رہتے، اور خزانۂ اُردو میں ایک گرانقدر گوہر (یعنی تصانیفِ نروہت مرحومہ) کی کمی رہ جاتی۔

پر صد حیف کہ ایسی مقتدر ہستی اپنی زندگی میں اور انتقال کے بعد بیس سال تک گمنام رہی۔ غیر تو غیر خود اپنوں نے مرحومہ کی قدر نہ کی اور دنیا اس گرامی ذات سے کماحقہٗ روشناس نہ ہو سکی۔ ۱۹۴۱ء میں یعنی مرحومہ کی وفات کے پورے بیس سال بعد دارالاشاعت پنجاب نے "فردوسِ تخیل" (نروہت کے کلام کے مجموعہ کا نام) چھاپی (جسے مرحومہ اپنی زندگی ہی میں مرتب کر گئی تھیں۔ اگرچہ

اپنے مرنے کا عزیزوں کو بہت غم ہوگا
بعض سسکتے ہی رہیں گے کوئی نالاں ہوں گے

ہو ہی جائے گی مگر غم سے طبیعت خوگر
نہ ہم موجبِ آزارِ محباں ہوں گے

پھر یہی عیش و طرب ہوں گے یہی یار و رفیق
یہی دنیا یہی اس کے سر و ساماں ہوں گے

شاخ پر بیٹھ کے مرغانِ خوش الحانِ چمن
صورتِ نزہتِ مرحومہ غزل خواں ہوں گے

گائیں گے ہو کے ہم آواز ہمارے اشعار
اور ہم ساکنِ اقلیمِ خموشاں ہوں گے

ناظرین کو ان اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوا ہوگا کہ مرحومہ کس پایہ کی شاعرہ تھیں۔

ان کی ایک اور نظم ہے۔ جس کا عنوان "اے باپ" ہے۔ اس میں عہدِ رفتہ کا ماتم کیا گیا ہے اور اپنے والدِ ذی حشم کی محبت و شفقت کا تذکرہ کیا ہے۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں: ؎

شب کو جب ہوتا ہے حاصل فکرِ دنیا سے فراغ
یادِ عہدِ رفتہ سے معمور ہوتا ہے دماغ

اس تماشا گاہ میں کل واقعاتِ رنج و فرح
گھومنے لگتے ہیں چلتی پھرتی تصویروں کی طرح

دیکھ کر چھن جانے والے گوہرِ نایاب کو
دیکھ کر چھپ جانے والے روئے عالم تاب کو

مشتعل ہوتا ہے دل پہلو میں انگارے کی طرح
مرتعش ہوتا ہے رخ پر اشک سیارے کی طرح

کھینچتی ہوں سینۂ سوزاں سے آہِ پُر شرر
پوچھتی ہوں جانبِ گردوں اٹھا کر چشمِ تر

سچ بتا اے ماہتاب، اے عابدِ شب زندہ دار
تو نے دیکھا ہے کبھی مجھ سا حزیں مجھ سا فگار

لیلیٰ شب کھا کے آنکھوں کی سیاہی کی قسم
کہہ رہی ہے تجھ سے روشن بخت ہیں دنیا میں کم

ہاں مری مونس ہے وہ جانِ گراں قدر و عزیز
گنجِ ہفت اقلیم جس کے آگے بے قدر و پشیز

ہے اسے ہر وقت میرے رنج و راحت کا خیال
کیوں مجھے غمگیں کرے پھر اپنی حالت کا خیال

اسی نظم میں انھوں نے ایک جگہ اپنے بچپن کے تاثرات کو قلم بند کیا ہے۔ اسلوبِ بیان لائقِ توجہ ہے: ؎

میں ہرگز نہ بھولوں گی وہ ایامِ طرب
جب مجھے حاصل تھا بچہ کا محبت زا لقب

جب مجھے آتے تھے دنیا کے یہی دو چار کام
کھیلنا۔ کھانا۔ پہننا۔ شادماں رہنا مدام

تھا یہ حالِ علم گر سیدھی لکیر ایک دیکھ لی
ہو گئے خوش آہا الف آہا الف چلا اٹھی

جب سرور و عیش افزوں تھا خرد کم عقل کم
جب پہیلی تھیں معما تھیں لغاتِ فکر و غم

تب تک آیا تھا نہ جامِ تشنگی افزائے علم
طبع تھی نا واقفِ تکلیفِ استسقائے علم

گولی چلائی۔ مسجد کے ایک حصہ اور نمازیوں کی اکثریت نے جامِ شہادت نوش کیا۔ بہت سے مسلمانوں کو اس کی خبر تک نہ ہوئی۔ جنھیں اس رُوح فرسا واقعہ کا علم ہوا ان میں سے اکثر و بیشتر نے کوئی اثر قبول نہ کیا۔ بہت کم ایسے تھے جن کے دل اس صدمہ سے بیتاب ہوئے۔ اُن میں سے ایک مرحومہ بھی تھیں۔ اس جاں گسل واقعہ کی اطلاع سے ان کا دل لرز اٹھا اور اُنھوں نے "مسجد کانپور کی باتیں" کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ اس سے زیادہ ایک پردہ نشین خاتون اور کر ہی کیا سکتی تھی۔ بہتیروں کو تو اس کی بھی توفیق نہ ہوئی۔

لیکن اس ناصحانہ افتادِ طبع کے باوجود اُنھوں نے شاعری کے دامن کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں شعریت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اور اگر گاہے اشعار ثقیل الفاظ کی وجہ سے گراں بار نہ ہو جایا کرتے تو ان کے کلام کا مرتبہ اور زیادہ بلند ہو جاتا۔ بایں ہمہ تسلسل و روانی، عذوبت و دل آویزی، درد و تاثیر اور رفعتِ خیال جو جانِ شاعری ہے ان کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور یہی خوبیاں ہیں جو ایک شاعر کو وقیع بنا دیتی ہیں اور لوگ اس کے کلام میں لطف محسوس کرتے ہیں۔ مرحومہ کا کلام اگر آپ بار بار بھی پڑھیں تب بھی طبیعت سیر نہ ہوگی۔ بلکہ ہر مرتبہ نیا مزہ آئیگا اور خیال گزرے گا کہ آپ کلام کا پہلی مرتبہ مطالعہ کر رہے ہیں۔

اگر اُن کی زندگی وفا کرتی تو وہ اس سے کہیں زیادہ بلند و بالا مسندِ شہرت پر رونق افروز نظر آتیں۔ اور ان کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے شاعروں میں ہوتا۔ اب ان کے کلام کا کچھ نمونہ پیش کیا جاتا ہے، تاکہ ناظرین کو اندازہ ہو جائے کہ جو کچھ مرحومہ کے متعلق عرض کیا گیا ہے وہ صداقت پر مبنی ہے یا نہیں۔

اُن کی ایک نظم ہے "ہمارے بعد"۔ اس میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ اُن کے دُنیا سے جانے کے بعد کیا صورتِ حال ہوگی۔ بعد کو پیش آنے والے واقعات کی اس عمدگی سے وضاحت کی ہے کہ گمان ہوتا ہے کہ جو کچھ تحریر کیا ہے وہ عینی مشاہدہ کا رہینِ منت ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

یادِ ایام کہ ہم پیکرِ بے جاں ہوں گے	تاڑکِ خانہ و مہجورِ عزیزاں ہوں گے
کام آئے گی نہ کچھ آپ کی دانشمندی	لقمۂ کرم لحد حضرتِ انساں ہوں گے
رُخِ زیبائے حقیقت سے نقاب اُٹھے گا	جتنے اسرار ہیں پردے میں نمایاں ہوں گے
واہ کیا کیفیت آمیز زمانہ ہوگا	جبکہ ہم بے خبر شورشِ دوراں ہوں گے
غمِ پامالیِ حسرت سے نہ دل خوں ہوگا	نہ یہ اُمیدیں رہیں گی نہ یہ ارماں ہوں گے

ایک اور نظم جس کا عنوان "البلاغ المبین" ہے کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔ نظم مذکور میں اُمتِ مرحوم کو مخاطب کیا گیا ہے اور اسے منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہونے کی تلقین کی گئی ہے:

اے قوم! چند فارغ و بیکار بنیمت	غافل ز کیدِ دشمنِ عیار بنیمت
تا چند خصم زمرۂ احباب یا بمت	تا چند خاک و رگہِ اغیار بنیمت
کج میروی، بہ منزلِ مقصود کے رسی	باغی ز طوعِ قافلہ سالار بنیمت
اے کاش باز مصلحت اندیش خوانمت	اے کاش باز عاقل وہشیار بنیمت
اے در لبِ تو آبِ بقا! از چہ تشنۂ	اے عیسیٔ زمن! از چہ بیمار بنیمت
آئینۂ دلت، بہ صفا عکس نور بود	حیف است گر در آئینۂ زنگار بنیمت
اے نزہت! اے کہ مخزنِ راز است سینہ ات	خواہم ز لب ہمیشہ گہر بار بنیمت

جنسے نہ داشت شعر تو۔ الا دلم ربود
شاعر نہ ای۔ فسوں گر و سحار بنیمت

ایک اور غزل ہے۔ جس کا عنوان "چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما" ہے یہ حافظ کے ایک مشہور شعر پر تضمین ہے:

آہ کز گردوں گزشت آوازۂ تحقیرِ ما	در ملائک شد سحر محرومیٔ تقدیرِ ما
چرخ را صد رخنہ در جاں میکند یک تیرِ آہ	بسملے در خوں نہ غلطانید آہ از تیرِ ما
ہمچنیں باشیم در قعرِ مذلت سر نگوں	یا کند جولاں بہ گردوں مرکبِ توقیرِ ما
تارکِ آئینِ شرعِ پاک شد صنفِ رجال	آنکہ ہست از حکمِ رب فرماندۂ ما پیرِ ما

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیرِ ما
چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما"

نظم کے ساتھ ساتھ نزہت مرحومہ کو نثر پر بھی اچھی خاصی دستگاہ حاصل تھی۔ حالانکہ ایک اچھا شاعر عام طور سے ایک اچھا نثار نہیں ہوتا۔ ان کے مضامین وقتاً فوقتاً رسالہ استانی میں (جو خواجہ حسن نظامی کی اہلیہ محترمہ کے زیرِ ادارت دہلی سے نکلتا تھا) علی گڑھ کی ایک سخن گو خاتون کے نام سے شائع ہوتے رہتے تھے۔ میں نے جب اوّل بار ان کا مطالعہ کیا تو بہت متعجب ہوا، کیونکہ ان کی نظم کی طرح ان کی نثر بھی خوبی و عمدگی کا نمونہ نظر آئی۔ ناظرین کو اس سے روشناس کرانے کی غرض سے استانی میں شائع شدہ مضامین [illegible]

آہ میرا احمدِ طفلی تو بہ عہدِ سلطنت
کس قدر رشک آفریں تھا کس قدر پُر تمکنت

ایک اور نظم جس کا عنوان "جنگل" ہے کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ پاکیزہ زبان اور ندرت۔ تشبیہات قابلِ داد ہے: ؎

واہ کیا جاں بخش ہے جنگل کا منظر وقتِ شام — کھل گیا دل اے ہوا کے سرد جھونکو! مرحبا
چھوڑ کام۔ اے بیوفا دولت کے شائق! چھوڑ کام — جلد آ۔ اے شاہدِ قدرت کے عاشق! آ
الوداع۔ اے شہر کے ہنگامۂ گفت و شنید — ہے تخیل تجھ سے شاکی جیسے پالے سے گلاب
اے بیاباں! اے مجسّم شعر! تیری پاک دید — دل کشا ہے جیسے بعد ابر و باراں آفتاب
جھیل کے نغمے سکوتِ دشت سے کرتے ہیں چھیڑ — جیسے شب سے حمد و نعت عابدِ شب زندہ دار
ہے سپیِ نظارہ ساحل پر کھڑا پیپل کا پیڑ — جس کا سایہ آگے بڑھ کر جھیل سے ہے ہمکنار
یہ شفق ہے یا ملک لائے ہیں جنت سے شراب — یا ردائے حور ہے شفاف و سُرخ و لطف خیز
شام کی بازی میں ہے اک آتشیں گیند آفتاب — آتشیں گیند آب کے آئینہ میں ہے عکس ریز

اُردو کے علاوہ نزہت مرحومہ کو فارسی شاعری میں بھی دخل تھا۔ اگرچہ ان کا فارسی کا کلام ہم تک بہت کم پہونچا ہے۔ لیکن جو کچھ سامنے ہے وہی اپنے خالق کی عظمت ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ ناظرین کی طبائع عالیہ کی ضیافت کے لئے اُن کا تھوڑا سا فارسی کا کلام نمونہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اُمید ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد وہ میری رائے سے اتفاق کریں گے۔

"فردوسِ تخیل" میں ایک قصیدہ ہے جو "ذکرِ حبیب" کے نام سے موسوم ہے اور قاآنی کے رنگ میں کہا گیا ہے۔ اس میں اگرچہ الفاظ ہی الفاظ ہیں لیکن اس خوبی سے انھیں موزوں کیا گیا ہے کہ اس میں ترنمی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور بے ساختہ داد نکل جاتی ہے: ؎

بہ چرخ و ارض و بر و بحر غیر ذکرِ اللہ ہُو! — ہمہ ملعون، ہمہ مقتول، ہمہ افسوں، ہمہ جادو
لبانِ عاجز، دہانِ قاصر، زبانِ الکن، بیان کوتہ — ز وصفِ رب ز مدحِ شہ ز حمدِ ایں ز نعتِ او
شدت شاہا ز فضل و لطف و احسانِ عطائے رب — جہاں تابع زماں خادم زمیں چاکر فلک ہندو
منور جاں، مطہر جسم، عنبر زلف، شکر لب — مسیحا دم، سلیمانؑ جاہ، یوسفؑ چہرہ، موسیٰؑ خو
نگہ جاں بخش و جاں افزا و جاں آسا و جاں پرور — ادا دل بر، عطا دل دہ، حیا دل کش، وفا دل جو
شہا! ما ئیم کج رفتار و خوار و زار و بد سیرت — توئی ہادی، توئی شافع، توئی راحم، توئی خوش خو

آسامی نہیں۔ ایسی کھری کھری سنائیں گی کہ جن پر چوٹ ہو گی انھیں بغلیں جھانکنے کے سوا کچھ بن نہ پڑے گی۔"

ان کا ایک اور مضمون ہے۔ جس کی سرخی "سیاسی استانی" ہے۔ جس میں سیاست کو مسلمان خواتین کے واسطے ضروری قرار دیا ہے۔ اور یہ کہ موجودہ ادبار کی وجہ ہماری خواتین کی سیاست سے علٰحدگی ہے۔ مضمون کی ابتدا یوں کرتی ہیں :۔

"آج ہم ایک چونکا دینے والی بات کہنا چاہتے ہیں۔ آج ہم خفتگانِ غفلت کو اچھل پڑنے کی دعوت دینے والے ہیں۔ آج ہمارا قصد ہے کہ گوشہ نشینانِ حرم کو سیاسی میدان میں مدعو کریں۔"

آگے چل کر اسی مضمون میں ایک جگہ تحریر ہے :۔

"اب ذرا خوش نصیبی کے اُن ایام کا تصور ذہن میں تازہ کیجئے جب کرۂ ارض مسلم سواروں کی جولانیوں سے تھرا رہا تھا۔ جب فضائے آسمان اللہ اکبر کے رعشہ زا نعروں سے گونج رہی تھی۔ جب مخالفوں کے دل اسلام کی عظمت و جلال سے سینوں میں پتّے کی طرح ہل رہے تھے۔ اس زمانہ میں۔ آہ اُس نشاط انگیں زمانہ میں پیکرِ اسلام کا نصف حصہ آج کی طرح خوف از کار رفتہ نہ تھا

عضوِ مفلوج کی مانند نہ بے کار رہتے تھے ہم

قصرِ اسلام کی تعمیر میں معمار رہتے تھے ہم

مسلمان خواتین کے بے شمار مذہبی، سیاسی، اور علمی کارناموں سے تاریخ عالم لبریز ہے۔ اور اِن کے دُہرانے کے لئے ایک ضخیم تصنیف درکار ہے۔ میں یہاں فرو رتاً صرف اُن خواتین کے نام یاد دلانا چاہتی ہوں جنھوں نے نہ صرف علم و حکمت کی بزموں میں بلکہ عزت و دولت کی فیصلہ کن رزموں میں اپنے فرقہ کے اعلیٰ سپاہیانہ اوصاف کا ثبوت دیا۔ مسلمان خاتون نے رضیہ، چاند بی بی، نورجہاں، ترکان خاتون وغیرہم کی شکل میں تاج پوش ہو کر سلطنت رانی کی اور حضرت عائشہؓ، اسماء بنت ابی بکرؓ، خولہ، ام عمارہ وغیرہم کے پیکرِ خاکی میں شہسواری اور تیغ آزمائی۔"

مندرجہ بالا اقتباسات "مشتے نمونہ از خروارے" نثر کا ذخیرہ نظم کے مجموعہ سے کم ہے۔ اور خصوصاً ... کے باوجود کافی و وافر ہے اور بڑی حد تک ... کے مضامین کو پڑھیں تو یقیناً اس نتیجہ ...

... جب ہنسنے

... جگایا تو سب سونے لگے۔

... سے عجیب و غریب ہونے کا یہ حیرت انگیز

لیکن قبل اس کے کہ مذکورہ بالا مضامین کے اقتباسات گوش گزار کروں مناسب خیال کرتا ہوں کہ کتاب "آئینۂ حرم" کا انتساب پیش کروں۔ کیونکہ یہ بظاہر نثر کا ایک ٹکڑا ہے لیکن معنوی اعتبار سے ایک بسیط مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی بہت ہی ہشیار جوہری نے نہایت بیش قیمت موتیوں کو چابکدستی کے ساتھ ایک لڑی میں پرو دیا ہے:-

"یہ آنسوؤں کی لڑی، یہ درد کی تڑپ، یہ سوزش کی آہ، ہاں ایک فریادی کا بستر ماتم، ایک ناشاد کی نوحہ گری، ایک زخمی کی چیخ یعنی کتاب آئینۂ حرم، اسلام کے اس سچے شیدائی، تعلیم نسواں کے اس زبردست حامی کے نام نامی سے منسوب و معنون کی جاتی ہے۔ جس کا فیضانِ تربیت اس مجموعۂ پریشاں خیالی کی تسوید و تبشید کا معنوی سبب ہے اور جس کی قومی محبت وراثتی اثر و نسلی خصوصیت کے طور پر خاکسار مصنفہ کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ کے عام اصول کی مطابقت میں دریا کے سامنے قطرہ، خورشید کے حضور ذرہ، گلشن کے پاس پھول "گرچہ خوردیم نسبتیست بزرگ" کا فخریہ کلمہ پڑھتے ہوئے اپنی سعی بے حقیقت کو ہدیتاً پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ میرے جان سے زیادہ پیارے والد ماجد دام ظلہ العالی اس نذرِ محقر کو خوشی کے ساتھ شرفِ قبولیت مرحمت فرمائیں گے ؎

ہمتم بدرقۂ راہ کن اے طائرِ قدس
کہ دراز است رہِ منزل و من نو سفرم"

ایک مضمون اُنھوں نے رسالہ استانی کے تعارف میں لکھا تھا۔ اس کا ایک حصہ ملاحظہ کیجئے:-

"رات کے دل افروز سکوت و ظلمت میں ایک بزمِ سُرور منعقد کر کے لیمپ کی تیز روشنی کے سامنے ان استانی صاحبہ کو بٹھاؤ اور کچھ گنگنانے کی فرمائش کرو۔ خاموشی کے ساتھ ایسے شیریں نغمے فضائے ادب میں بلند ہوں گے کہ تم بھی مسحورانہ طور پر بے ساختہ ان کی ہم آواز ہو کر مترنم ہو جاؤ گی۔

ہاں ذرا یہ بھی یاد رہے غصہ تھوڑا بہت ان میں بھی ہے۔ ذاتی حملوں کے جواب میں تو یہ گونگے کا گڑ کھالیں گی مگر اپنے غیر محدود حلقۂ درس میں کسی کی بے راہ روی گوارا کرنیوالی

پیتل کی تھالی میں گرتی تھیں تو آواز پیدا ہوتی تھی۔ گولیوں کے گرنے کے بعد فوراً ہی ان بارہ دریچوں میں سے ایک دروازہ بند ہو جاتا تھا۔ اسی طرح ہر گھنٹے کے گزرنے پر یہی دَور جاری رہتا تھا۔ یا خلیفہ ہارون الرشید کی اُس گھڑی کو لے لیجئے جو اُس نے شارلمین شاہ فرانس کو روانہ کی تھی۔ اُس گھڑی میں بارہ سوار تھے جو گھنٹہ ختم ہونے پر وقت بتلاتے تھے۔

یہ وہ شاندار مثالیں ہیں جن کا جواب دنیا کی کوئی دوسری قوم نہیں پیش کر سکتی ہے۔ گو ان کے ڈھانچے اب بھی بگڑی ہوئی صورت میں موجود ہیں۔ لیکن کیا مجال کہ بڑے سے بڑا سائنٹسٹ ان میں دوبارہ جان ڈال سکے۔ بجز اس کے کہ عملیات (Experiments) سے ان کی خستہ حالی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ مسلمانوں کی یہ زبردست ترقی طلوع اسلام سے بہت دن بعد ہوئی ہے بلکہ اُن کی بنیاد آٹھویں صدی میں ہی پڑ گئی تھی۔ گھڑی کی ایجاد کا سہرا ابن یونس کے سَر تھا۔ اس کی موت کا زمانہ زبردست کارناموں کے بعد ۱۰۰۵ء ہے۔ ابن آلساعتی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مشہور گھڑی ساز تھا۔ یہ دو وہ زبردست ہستیاں ہیں، جنہوں نے ایّام جہالت کے تھوڑے ہی عرصہ بعد دنیائے سائنس میں کھلبلی مچادی۔ مسلمان ہی ان سے مسحور نہیں ہیں بلکہ خاص طور سے یورپ غیر مقلد ہوتے ہوئے بھی ان مسلمانوں کے کارناموں کا معتقد ہے۔

ہندوستان اور روم سے تجارت عہد قدیم میں برابر ہوتی رہی ہے لیکن تجارت کی راہیں خشکی کی تھیں، اس لئے پانچویں صدی عیسوی میں جہازوں کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔ البتہ جب مسلمانوں نے اندلس میں ترقی کی راہیں کھول دیں تو جہاز کی ایجاد کی طرف بھی خیال آرائیاں شروع ہو گئیں۔ جہاز کی ایجاد کا سہرا ابوالقاسم اندلسی کے سَر باندھا جاتا ہے۔ بعض روایتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ موجد نے اس میں سفر بھی کیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ دوربین اور قطب نما کا ذکر بھی آتا ہے، اس کی ایجاد ابن الہثیم متوفی ۱۰۳۹ء کے سَر ہے۔

موسیقی اور موسیقی کے آلات کا ماہر حکیم ابو نصر فارابی ہے۔ اس نے ہزاروں قسم کے گانے پیدا کئے اور ہزاروں قسم کے باجوں کی بنیاد ڈالی اس کا ایک بہت مشہور باجہ آلۂ قانون ہے، جو نفسیاتی پہلو پر بنایا گیا تھا۔ اس کو پہلی ترکیب سے سیف الدولہ کی مجلس میں بجایا گیا تو سب ہنسنے لگے۔ جب دوسری ترکیب سے بجایا تو سب رونے لگے اور جب تیسری ترکیب سے بجایا تو سب سونے لگے۔ اِس قسم کے باجوں کا اِس دَور میں کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے۔

رشید الدین ابن خلیفہ ایک ایسے پیالہ کا موجد ہے جس کے عجیب و غریب ہونے کا یہ حیرت انگیز

عرض کیا گیا ہے اس میں مبالغہ یا حسنِ ظن کا شائبہ تک نہیں بلکہ عین حقیقت ہے۔

نزہت مرحومہ کی زندگی اگرچہ تنوع سے خالی تھی اور اس قسم کے واقعات بیش
جن کا تذکرہ یہاں ضروری خیال کیا جاتا اور جو ان کی بڑائی پر دلالت کرتے۔ لیکن ان
وذکاوت، لیاقت و قابلیت انھیں عام سطح سے بلند کئے ہوئے ہیں۔ اور یہی وہ خوبیا
جنھوں نے مجھے انھیں مضمون ہٰذا کے ذریعہ ادبی حلقہ سے متعارف کرانے پر آمادہ کیا۔ مح
اور چہار دیواری کے اندر رہ کر اس قدر استعداد کا بہم پہونچانا اور بیرونی دنیا سے باخو
لائق صد ستائش ہے۔ مولانا سید احمد صاحب کے صاحبزادہ نے (جو ان کے
رہ چکے ہیں) مجھ سے فرمایا تھا کہ ان کے والد بزرگوار مرحومہ کی فہم و فراست کے بہت
موصوف جیسے عالم کی جس ذات کے متعلق اچھی رائے ہو اس کی لیاقت میں پھر کیسے کلا

ادب کی تیسری صنف یعنی مراسلات میں بھی ان کا پایہ عام لوگوں سے بلند تھا۔ اگر
کے خطوط قابلِ ذکر خوبیوں کے حامل نہ ہوتے تھے اور نہ ہی ان میں کوئی ندرت ہوتی تھ
اس کے باوجود مروجہ روش سے جداگانہ اور دلچسپ ہوتے تھے اور ان کے دوستوں
مایہ انبساط و بہجت۔

مختصر یہ کہ نزہت مرحومہ کی ذات خوبیوں اور اچھائیوں کا مجموعہ تھی۔ پاکیزہ جذ
داعلیٰ خیالات اور لیاقت و قابلیت کے امتزاج نے ان کے کلام کو رفعت و تاثیر عطا
ان کی نظم اور نثر دونوں وجد آگیں ہیں۔ مطالعہ کے اعادہ سے شان کیفیت بجائے ز
ہونے کے اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ اور ہر مرتبہ دل و دماغ ایک نیا حظ محسوس کر
ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مادرِ ہند نے آن جیسی شاعرات بہت کم پیدا کی ہیں۔ اس دور میں ا
ملنی اگر محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ مرحومہ کو غریق رحمت کرے۔ ان کی جانفشانیوں کو یاد آور کر
اہلِ خواہ قدر و منزلت کریں۔ ان کا نام رہتی دنیا تک آسمانِ شہرت پر
ایسے شیریں [illegible] نوا کے گیت سدا سامعہ نوازی کرتے رہیں۔ ان کی زندگی ا
ہو کر مترنم ہو جائیگی۔

ہاں ذرا یہ بھی یاد رہے کہ جس کو ہمارے خاندان کی مستورات کے واسطے مشعلِ ہدایہ
گونگے کا گڑ کھا لیں گی مگر اپنے غیر محدود [illegible] توفیق ہو۔

اس قدر سے تغیر و تبدل کے ساتھ ختم کرتا ہوں

سائنس باوجود اس قدر ترقی کے ایسے مضبوط نازک اور خوبصورت کپڑے نہیں بنا سکتا، جیسا کہ مسلمانانِ اندلس کے کرگھے نکال چکے ہیں، ان کے رنجب صناعی و رنگریزی کی انتہائی قابلیت ظاہر کرتے ہیں۔"

اُس عہد کی اب بھی بہت سی چیزیں بطور یادگار جگہ جگہ میوزیم ہاؤسس USEUM HOUSES میں موجود ہیں۔ نورمبرگ (جرمنی) میں اب بھی ایک چادر موجود ہے جس کو شاہانِ صقلیہ نے استعمال کیا تھا۔ اس پر ۱۱۲۳ء کا کتبہ درج ہے۔ اس کے دیکھنے سے مسلمانوں کے رنگائی کے فن کا صحیح صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کی کڑھائی بھی قابلِ تعریف ہے۔ آخیر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان جیسا خوبصورت اور باریک کپڑا آج تک نہ بن سکا۔ جیسا کہ ابن خلکان[۵] کا خیال ہے کہ اسپین کے زریفتی کپڑے مکڑی کے جالے سے زیادہ نازک اور ملائم اور بیش بہا ہوتے ہیں۔

آب پاشی کے طریقے بھی کوئی نئے نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔ مصر و اندلس میں اب بھی بارش کی قلت ہے اور دورِ حاضرہ میں بذریعہ آب پاشی کھیتی باڑی کی جاتی ہے، وہی مشکل عہدِ اسلامیہ میں بھی درپیش تھی۔ اُنھوں نے بھی آب پاشی کے نت نئے طریقے ایجاد کئے۔ چنانچہ بیسیوں قسم کے ایسے پُرزوں اور مشینوں کا پتہ چلتا ہے جو آب پاشی کے وقت استعمال کئے جاتے ہیں۔

عہدِ عباسیہ میں بغداد میں ۹۰۰ حمام کا ہونا پایا جاتا ہے۔ وہ بھی محض پبلک کے آرام و آسایش کے لئے ایسی صورت میں صابن کا پایا جانا غیر قیاسی نہیں۔ بقول مسٹر اسکاٹ کے " یہ (صابن) صرف اہلِ عرب کی ایجاد ہے۔

غرض یہ کہ مسلمانوں نے سائنس کے ہر ہر شعبہ میں جانفشانی دکھائی اور صحیح صحیح نتائج دنیا کے سامنے پیش کئے جن سے اس وقت بھی فائدے حاصل کئے جا رہے ہیں۔ گو ان کے ایجاد کرنے والوں کو زمانہ کی گردشوں نے بھلا دیا ہے۔ لیکن لاکھ دُنیا تغیر و تبدل ہو پھر بھی سلف کے کارنامے کسی طرح بھلائے نہیں جا سکتے۔ دریا کی روانی میں تنکے کو لازم ہے کہ وہ بھی دھارے کے ساتھ ساتھ بہتا جائے، لیکن اگر اس کا ماضی شاندار ہے تو بہت ممکن ہے کہ دھارا مع تنکے کے پیچھے کی طرف لوٹ پڑے کیونکہ تنکے کی قسمت کا فیصلہ اسی پر منحصر ہے۔

لطیف حسین

---

[۵] بحوالہ موازنۂ صلیب و ہلال نکہت شاہجہان پوری۔

واقعہ ہے کہ اس پیالہ کے بیچ میں ایک چڑیا بٹھائی گئی تھی۔ جب پیالہ میں پانی ڈالا جاتا تھا تو چڑیا بولتی تھی، حتیٰ کہ شرب کو زبردستی پانی پینا پڑتا تھا تب کہیں جاکر چڑیا کو چین آتا تھا۔

کاغذ کی اصل ایجاد چین سے منسوب کی جاتی ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے کاغذ اہلِ چین نے بنایا۔ لیکن چین کی ترقی کے زمانہ میں دُنیا کی دوسری اقوام ترقی یافتہ نہ تھیں، اس لئے کاغذ دوسرے ملکوں میں نہ پھیل سکا۔ خصوصاً یورپ جس میں اُس وقت تک وہاں کے بیشتر باشندے جھونپڑوں اور پیال کے نرم بستروں پر زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن جب مسلمانوں کی ترقی کا زمانہ آیا تو کاغذ کی ایجاد سُرعت کے ساتھ پھیل گئی۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ مسلمانوں نے چین سے کاغذ کی ایجاد کو کیسے حاصل کیا؟ کرسٹی[۵۱] صاحب کے خیال کے مطابق فتح سمرقند ۷۰۴ء کے موقع پر مسلمانوں نے چین سے اس ایجاد کو حاصل کیا۔ رفتہ رفتہ کاغذ کی صورت منجھتی گئی اور اس کی نفاست میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی منجھی ہوئی صورت کا دوسرا نام "دمشقی کاغذ" ہے۔ اس کو یوسف بن عمرو دمشقی نے ایجاد کیا۔ اُس زمانہ کے قلمی نسخوں کو (جن کی بوسیدگی ان کی رگ رگ سے ہویدا ہے) دیکھنے سے اس عہد کے کاغذ کی نوعیت کا صحیح صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

کپڑا بننے کے فن میں مسلمانوں کو وہ کمال حاصل تھا کہ اُس عہد میں اُن کی ہمسری کوئی دوسری قوم نہیں کر سکتی تھی۔ اس فن یا سائنس میں مسلمانانِ اُندلس سب سے آگے ہیں۔ اُندلس کی خوشگوار آب و ہوا کی موزونیت اور اُس پر مسلمانوں کے جوش و خروش نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ ریشمیں کپڑے۔ دیبا۔ قالینیں۔ دریاں۔ اونی کپڑے۔ غرض کہ سب کچھ بنایا اور ہر ایک میں یدِطُولیٰ حاصل کیا۔ یہی نہیں بلکہ رنگائی کے فن میں بھی اِنھیں مسلمانانِ اندلس کو وہ کمال حاصل تھا جو شاید اس دَور میں بھی نہ حاصل ہوا ہو۔ اس کے علاوہ کپڑوں پر چھپائی کا کام بھی بہت عمدہ ہوتا تھا، گو مشینیں تو نہ تھی مگر ٹھپّے ضرور تھے جن سے ہاتھوں کے ذریعہ وہی کام لیا جاتا تھا جو اِس دَور میں مشینیں کرتی ہیں۔ اُن چھپی ہوئی چیزوں یا بالفاظِ دیگر تصویروں میں ترچھی تیکھی صورتیں نہ تھیں، گل بوٹے نہ تھے، محبت بھرے الفاظ نہ تھے، بلکہ قرآنِ کریم کی آیتیں تھیں، بیل بوٹے تھے، جن میں ایک کاریگر اشاعتِ اسلام کا خیال کرکے ہمہ تن کام میں مصروف ہو جاتا تھا۔ اِس فن کا مرکز اندلس تھا۔ یہاں سے ہی ممالکِ غیر کو کپڑا بھیجا جاتا تھا۔[۵۲] مسٹر اسکاٹ رقمطراز ہیں "زمانۂ حال کا

---

۵۱ میراث اسلام ، M.A.H. Christie

۵۲ اخبار اندلس صفحہ ۲۴۴ بحوالہ موازنہ صلیب و ہلال تکلفت شاہجہان پوری۔

اور علما، کے سرگروہ مولوی احمد اللہ۔ مولوی لیاقت علی اور مولوی فضل حق خیر آبادی وغیرہ قرار پائے۔

غدر کو اب کافی زمانہ گزر گیا، پھر بھی اصل واقعات پر بہت کچھ تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اِس سلسلہ میں خواجہ حسن نظامی صاحب نے کافی واقعات کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی لیکن دانستہ یا نادانستہ طور پر اُن کی تحریروں میں افسانوی رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ تاہم جو کچھ بھی لکھا ہے وہ اُس جوشِ عقیدت کے تحت ہے، جو ایک مسلمان محبِّ وطن کو قلعۂ معلّٰے کی حکومت سے ہو سکتا ہے۔ خواجہ صاحب قلعہ کی تباہی پر خود بھی جی کھول کر روتے ہیں اور دُوسروں کو بھی رُلاتے ہیں۔

مُغلیہ حکومت تھی تو شخصی حکومت لیکن خدا معلوم اُس میں کیا خصوصیت تھی کہ ہر شخص نے قلعہ کی بربادی پر خون کے آنسو بہائے۔ چنانچہ نصف صدی گزر جانے پر بھی جب مسٹر اینڈریوز نے مولوی ذکاءاللہ کی لائف لکھنے کے سلسلہ میں غدر کے حالات دلّی کے بوڑھوں سے پوچھ پوچھ کر جمع کرنے شروع کئے تو صاحب موصوف نے انتہائی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا کہ:-

"جس بوڑھے شخص سے بادشاہ کا حال پوچھا خواہ ہندو ہو خواہ مسلمان اکثر کے آنسو نکل آتے تھے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی غیر کا واقعہ بیان کر رہا ہے بلکہ یہ نظر آتا تھا کہ یہ اپنی ہی بپتا سنا رہا ہے۔"[۱]

بنگالی اہلِ قلم نے اس موضوع پر خوب لکھا اور بہت لکھا۔ لیکن وہ انگریزی یا بنگلہ زبان تک محدود رہا اور اُردو کی تہی دستی جوں کی توں قایم رہی جو قلمی لٹریچر اُس زمانہ کے لوگوں نے اپنے اخلاف کے لئے چھوڑا تھا، وہ یا تو دیمک کی نذر ہو گیا۔ اور یا پرائیویٹ لائبریریوں میں شجرِ ممنوعہ بنا رکھا ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸: شیکسپیر کے مشہور ڈرامہ کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ صفحہ ۲۲۹ آٹھواں خطبۂ گارساں۔

۳ نواب صاحب غدر کی ناکامی کے بعد ہجرت کر کے مکّہ معظمہ چلے گئے تھے۔ نواب صدیق حسن خاں نے اُن کو وہاں سخت عسرت اور شکستہ حالت میں دیکھا، یہ جس شاہانہ آن بان سے رہتے تھے اُس کے متعلق غالبؔ نے لکھا تھا کہ:؎

دیا ہے اور کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے	بنا ہے عیش تجمّل حسین خاں کے لئے
زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا	کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

(مصنف بابت جنوری ۱۹۳۸ء)

۱ مضامین مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی۔

جنرل بخت خاں روہیلہ

از سیدہ انیس فاطمہ (بیگم الطاف علی بریلوی)

خدا جانے وہ کونسی مبارک ساعتیں تھیں، جن میں بابر کے مقدس ہاتھوں نے ہندوستا
میں مغلیہ حکومت کا سنگِ بنیاد رکھا تھا کہ بادِ حوادث کے تھپیڑوں نے سینکڑوں بار اِس کو مٹا
کی کوشش کی، لیکن وہ نہ مٹی اور مٹی تو اس طرح کہ ہندوستان جنت نشان سے مسلمانوں کا قو
وجود ہی ختم ہو گیا۔ اُن کی تہذیب، اُن کا تمدن، اُن کا علم، اُن کی دولت، غرضکہ تخت کے سا
ہر چیز جو باعثِ افتخار تھی، رُخصت ہو گئی۔ آخر زمانہ میں قلعۂ معلّٰی کی حکومت لاکھ مجبور و زوال
سہی، پھر بھی ماضی کی شان دار روایات اُس سے وابستہ تھیں! ور وہ عوام کی والہانہ عقیدت
کا مرکز تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی دست درازیاں دامن سے گزر کر گریبان تک پہونچ چکی تھیں کر
۱۸۵۶ء کے الحاق اودھ نے مسلمانوں کو یہ باور کرنے پر مجبور کر دیا کہ اگر چندے یہی حالت رہی تو

اب کے جنوں میں فاصلہ باقی نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

پہلے کافی ہیجان ہوا اور بالآخر ۱۸۵۷ء کا زبردست ہنگامہ رونما ہو گیا۔ عوام اور خواص دو
نے مل کر ملک و ملت کی آزادی کے لئے تلوار اُٹھائی۔ خواص میں جنرل بخت خاں۔ فیروز شا[۵۱]
نانا راؤ[۵۲] ۔ نواب تجمل حسین خاں[۵۳] ۔ جنرل محمود خاں۔ اور عظیم اللہ خاں تھے۔

---

۵۱ ایک تیموری شہزادہ تھا۔ میدانِ رزم میں اس کی تلوار نے دشمن کی صفوں میں ہلچل ڈال دی تھی جب خان بہادر خاں کو بریلی
شکست ہوئی تو فیروز شاہ نے بھی میدانِ جنگ کو خیرباد کہا۔ اکثر لوگوں کا بیان ہے کہ انھوں نے اُن کو گیروا لباس میں مکہ میں دیکھا! درپھا
۵۲ نانا راؤ پیشوا نے عدیم المثال بہادری سے انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ اس کی بہادری اور اعلیٰ علمی قابلیت کا اعتراف اکثر انگریز
کو بھی تھا۔ فرانسیسی مصنف گارساں لکھتا ہے کہ شنا ہے کہ یہ خونخوار انسان انگریزی تحریر و تقریر میں ید طولےٰ رکھتا ہے۔ وہ شخص
(باقی صفحہ ۴۹ حاشیہ دیکھو)

اعتراف حقیقت کے باوجود بھی یہ اصرار پردہ داری کس قدر دلچسپ ہے۔ دراصل کمپنی کی فوجوں کے ہاتھوں وہ بے پناہ مظالم جو عوام اور بے گناہوں پر توڑے گئے۔ جو لرزہ بر اندام چنگیزی داستانیں دلی میں دہرائی گئیں۔ اُن کا اقتضاء بھی یہی تھا لیکن جادو ہمیشہ سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔ خود انگریزوں ہی میں بعض نیک دل حضرات نے اپنے ہم قوموں کے ان مظالم کے خلاف سخت احتجاج بلند کیا جو انھوں نے مظلوم عوام پر بلا کسی خطا اور قصور کے توڑے تھے۔ جو تماشائی تھا وہ خود ہی تماشہ بن گیا۔ مسٹر رسل لکھتے ہیں :۔

"لیکن یہ تو انسانیت اور انصاف کے خلاف ہے کہ تمام اضلاع ہی کو تاخت و تاراج کر دیا جائے۔ محض اس جُرم پر کہ باغیوں نے ان علاقوں میں پڑاؤ کیا تھا۔ انگریزوں نے راستہ میں سیکڑوں میل تک سڑک کے دونوں طرف دیہاتیوں کو بے دریغ قتل و غارت اور برباد کرکے ملک کو صحرا کی طرح ویران کر دیا۔ ہزاروں شہری پھانسی پر لٹکائے گئے۔ حالانکہ ان کو بغاوت سے دُور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ بے گناہ شہریوں کو دراںحالیکہ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر رحم کی درخواست کر رہے تھے؛ گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ بلکہ عمر رسیدہ انسانوں کو حالانکہ ان کے جسم رعشے سے کانپ رہے تھے کاٹ کر رکھدیا گیا۔ دہلی میں قتل عام کا حکم دیا گیا۔ حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے متعلق ہمیں علم تھا کہ وہ ہماری فتح کے خواہشمند تھے۔" [۵۱]

پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں گورنمنٹ ہند کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں سے بھی مردوں۔ عورتوں۔ بچوں اور بوڑھوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا نہ صرف پھانسی پر اکتفا کیا گیا بلکہ دیہات میں ان کو اپنے مکانوں میں بند کرکے آگ میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ جنرل آوٹرم کی رائے میں "یہ واقعہ معصوم انسانوں کا سنگدلانہ قتل تھا۔" میجر رینالڈ کو جنرل نیل کی طرف سے ہدایت موصول ہوئی کہ :۔

"قصبۂ فتحپور کی تمام آبادی کو محاصرہ میں لے کر تہ تیغ کر دیا جائے۔" [۵۲]

ابتک بعض خاندانوں میں اس زمانہ کے مظالم کی داستانیں سینہ بسینہ چلی آتی ہیں۔ جن سے ان شدائد کا احساس ہو کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ایک بزرگ نے اپنی پھوپھی کی زبانی سُنا تھا کہ :۔

---

۵۱ تصویر کا دوسرا رُخ ۔

۵۲ تصویر کا دوسرا رُخ بحوالہ علمائے کا شاندار ماضی صفحہ ۹۱

جس کو ہاتھ لگانے کی جرأت کرنا ناممکن ہے

مسلمانوں میں دو حضرات نے تاریخی حیثیت سے اس موضوع پر قلم اُٹھایا، ایک سر سیّد دوسرے مولوی ذکاء اللہ۔ لیکن ان ہر دو حضرات نے قلم کی جگہ نشتر سے کام لیا۔ ذکاء اللہ حد ہی کر دی۔ قوم کی جاں گداز تباہی پر خوب دل کھول کر ہنسے، شہیدانِ وطن کی ذلّت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ نتیجہ میں خان بہادری اور شمس العلمائی پر خاتمہ بخیر ہوا۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

سر سیّد نے بیشک جو کچھ لکھا وہ خلوص نیّت اور ہمدردیٔ قومی کی بناء پر تھا۔ اُن کی کے ساتھ یہ رائے تھی کہ اس الزام کو مسلمانوں کے سر سے اُتارنے کا محض یہ طریقہ ہے کہ جس ہوا ان واقعات کو صفحاتِ تاریخ سے مٹا دیا جائے۔ غدر میں مسلمانوں کو جس تباہی سے دوچا وہ اُس کے خود شاہد تھے۔ جس وقت نواب ضابطہ خاں کے پوتے جنرل محمود خاں نے بجنور کا علم بلند کیا تو یہ اُس زمانہ میں بجنور میں منصفی کے عہدہ پر فائز تھے۔ اس کے بعد دلّی آئے خوفناک ٹریجڈی کے پسِ منظر میں اُنھوں نے **اسبابِ بغاوت** جیسی کتاب مرتب اُنھیں کا دل گردہ تھا۔ کتاب مذکور میں تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"سرکشی ہندوستان کے جواب مضمون میں جو میں نے اصلی اسبابِ بغاوت ہندوستان کے بیان کئے تھے اگرچہ دل چاہتا ہے کہ اب ان کو صفحۂ روزگار سے مٹا دوں بلکہ اپنے دل سے بھی بھلا دوں، کیونکہ جو اشتہار جناب ملکۂ معظمہ نے جاری کیا ہے۔ درحقیقت بغاوت کے ہر ایک اصلی سبب کا پورا علاج ہے۔ حتیٰ یہ ہے کہ اشتہار دیکھ کر بغاوت کے سبب لکھنے والوں کے ہاتھ سے قلم گر پڑے کسی کو ضرورت نہیں رہی کہ اُن کی تشخیص کریں۔"[1]

اس کے بعد تحریک کو محض معمولی اور چند شوریدہ سروں کے دماغوں کی اختراع کا نتیجہ دیتے ہوئے اُنھوں نے لکھا:۔

"اودھ کی ضبطی کو بھی ہم سبب اس سرکشی کا نہیں سمجھتے۔ اس میں شک نہیں کہ اودھ کی ضبطی سے سب لوگ ناراض ہوئے اور سب نے یہ یقین کر لیا کہ آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی نے خلاف عہد اقرار کے کیا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ صاحبِ ملک رئیسوں میں کوئی باغی نہیں ہوا۔ اس کے جواب میں یہ مت کہو کہ جھجر کا نواب اور بلب گڑھ کا راجہ فلاں فلاں باغی ہو گیا۔"

---

[1] اسبابِ بغاوتِ ہند۔

اور آخر میں چالیس ہزار کی جمعیت کے ساتھ تحریک کے اس سب سے بڑے ہیرو کا روپوش ہو جانا ابھی تک تاریخ کا ایک ناقابل حل معمہ ہے۔

حسب ونسب

۱۸۵۷ء کے متعلق جس قدر بھی لٹریچر نظر سے گزرا یا روایت بزرگوں سے سُنا اس سے جنرل بخت خاں کے حسب ونسب کے متعلق ہماری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ بہت سے لوگ مثل مولوی ذکاء اللہ جن کا قلم جنرل صاحب کی تحقیر و تخریب کے لئے ہر وقت آمادۂ رم رہتا ہے۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش ناکام کی ہے کہ اُنکا تعلق کسی گمنام اور پست خاندان سے تھا۔

لیکن بخت خاں نے ۱۸۵۷ء میں جو کارہائے نمایاں کئے تحریک کو جس قابلیت کے ساتھ تمام ہندوستان میں پھیلایا۔ وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا تعلق ضرور کسی اعلیٰ نسل و خاندان سے ہوگا۔

اس سلسلہ میں ایک سب سے بڑی اہم شہادت نواب دوندے خاں کی پرپوتی چندا بیگم کی ہے، جو خدا کے فضل سے ابھی بقید حیات ہیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ غلام قادر روہیلہ شہید سے ان کی قرابت قریبہ تھی اور وہ خاندان روہیلہ سے تھے۔ ان کے والد کا نام عبداللہ خاں تھا۔ والی روہیلکھنڈ حافظ الملک حافظ رحمت خاں کا خاندان جب انگریزوں اور شجاع الدولہ کے مظالم کا شکار ہو کر برباد ہوا تو غلام قادر خاں کا خاندان بھی اس سے محفوظ نہیں رہا۔ اس انتشار میں جس کا جدھر منہ اُٹھا اُدھر چلا گیا۔ چنانچہ بخت خاں کے والد مع اہل خاندان اودھ کے موضع سلطان پور میں بس گئے۔

نواب عبداللہ خاں روہیلہ جو خوبصورتی اور بہادری میں منفرد زمانہ تھے، شجاع الدولہ کے خاندان کی ایک شہزادی کی توجہ کا مرکز بن گئے اور اس معتوب روہیلہ سردار کی نوابان اودھ سے قرابت داری ہوگئی۔[۵۱]

خود بخت خاں نے بھی ایک مرتبہ شہنشاہ بہادر شاہ ظفر سے کہا تھا کہ:۔

> "میں موضع سلطان پور کا رہنے والا ہوں۔ اور خاندانِ اودھ سے ہوں۔ اگر آپ کو میرے بیان پر شک ہو تو آپ تصدیق فرما سکتے ہیں! بادشاہ نے فرمایا تصدیق کی ضرورت نہیں۔ مجھے آپ کی شرافت ونجابت پر پورا یقین ہے"۔[۵۲]

یہ امر کچھ بعید از قیاس نہیں کہ جو قوم حافظ الملک، نواب نجیب الدولہ اور غلام قادر جیسے سرفروش اور

---

۵۱ حیات علامہ فضل حق خیر آبادی مصنفہ مفتی انتظام اللہ خاں شہابی۔ ۵۲ غدر کی صبح و شام۔

"تلنگے مجمع میں گھس کر سینہ کھول کر سونگھتے تھے۔ اُس زمانہ میں مسلمان اور بالخصوص سیدوں کے سینوں میں سے ایک خاص قسم کی خوشبو نکلا کرتی تھی اور یہ مسلمان ہونے کی سب سے بڑی دلیل سمجھ کر سنگینوں کو اُن کے سینوں میں پیوست کر دیا جاتا تھا۔"

حکمراں جماعت کے ایک انصاف پسند طبقہ کا خیال تھا کہ یہ بغاوت کمپنی کے اُس طرزِ عمل کا نتیجہ تھی جو اِس کے گماشتوں نے عوام اور شاہی خاندان کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ جن وجوہ کی بناء پر بغاوت رونما ہوئی اُن کی چھان بین کر کے آپس کی غلط فہمیاں دُور اور آئندہ را احتیاط کے اصول پر کاربند ہوا جائے۔

چنانچہ جب ساورکر کی کتاب ضبط کی گئی تو مسٹر تامسن نے سخت احتجاج کرتے ہوئے

"میرے نزدیک یہ نہایت ہی نامناسب ہے کہ گورنمنٹ نے ساورکر کی تاریخ کو بھی سرکار ضبط شدہ قرار دیدیا ہے۔ لیکن اگر ہماری یہ خواہش ہے کہ اس لڑائی کے بعض حالات پر پردہ پڑا رہے تو ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم ہندوستانیوں کے نقطۂ نظر کو بھی اپنی تاریخ میں جگہ دیں۔"[1]

لیکن طبقۂ سول سروس کی رائے اس کے برعکس معتدل پالیسی کے خلاف تھی۔ ہلکے پردہ کے بجائے اس قدر گہرا اور بھاری پردہ ڈالنا چاہتے تھے کہ دُنیا اس کو سرے سے بھول ہی جائے۔ چنانچہ ایڈورڈ تامسن رقمطراز ہے کہ:-

"انگلستان اور ہندوستان کے مفاد کا اقتضاء یہ ہے کہ اس بغاوت کی تلخ یاد کو ہمیشہ کے لئے فراموش کر دیا جائے۔ ہمیں اس زہریلے کنوئیں کو پاٹ دینا چاہئے اور خوش قسمتی سے اس وقت ایک کثیر تعداد ایسے ہندوستانیوں اور انگریزوں کی ہے۔ جو نہایت دیانتداری سے یہ یقین رکھتی ہے کہ کسی طرح غدر کے رنجیدہ واقعات کی یاد کو ہمیشہ کے لئے تاریخ کے صفحات اور انسانوں کے قلوب سے محو کر دیا جائے۔ ہمارے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم کچھ سال اور انتظار کی پالیسی پر عمل کریں۔ یہاں تک کہ وہ انسان ہی رحلت کر جائیں جن کے دماغوں میں غدر کی تلخ یاد کا ذخیرہ موجود ہے۔"[2]

[1] تصویر کا دوسرا رخ

[2] تصویر کا دوسرا رخ

ہنگامۂ ۵۷ء کے واقعات نسیاً منسیاً کئے جانے کا سب سے زیادہ اثر جنرل بخت کی شخصیت پر پڑا۔ باعتبار تدبر و سیاست اور بہادری و اولوالعزمی اُن کی قائدانہ اہلیت کا دوست دشمن سب کو ہے لیکن اُن کے تفصیلی حالات اُن کا حسب و نسب۔ اُن کا

چنانچہ سب سے پہلا شخص جس نے بغاوت کا آغاز کیا وہ منگل پانڈے تھا جس کو اپریل ۱۸۵۷ء کو پھانسی کی سزا دی گئی۔[۵۱]

تحریک کا آغاز منگل سنگھ کی قربانی سے ہوا۔ چپاتیوں کی تقسیم نے بغاوت کو ہر جگہ بیک وقت شروع کرنے میں نمایاں کام کیا کوئی گاؤں۔ قصبہ۔ یا شہر باقی نہیں تھا جہاں یہ چپاتیاں نہ پہونچی ہوں۔ تمام انگریز اہلِ قلم کی یہ متفقہ رائے ہے کہ بغاوت کو پھیلانے اور ترقی دینے میں چپاتیوں نے کام کیا۔ مصنف تاریخ بغاوت ہند تحریر کرتا ہے:۔

"ظاہر ہے کہ کوئی امر بہتر اس سے واسطے شامل کرنے تمام مسلمانوں کے ایک خاص امر میں، حسب دلخواہ عمل میں لانے کے نہیں معلوم ہوتا۔"[۵۲]

اسی مصنف نے اپنے لیکچر میں بیان کیا تھا کہ:۔

"مولانا احمد اللہ صاحب خود روٹی کے ٹکڑے اور کنول کے پھول تقسیم کرتے تھے"[۵۳]

روہیلکھنڈ میں تباہی شورش کی آگ بھڑکتے ہی بخت خاں نے جو بعد کو جنرل کے لقب سے مشہور ہوئے، اپنے اجداد کے وطن بریلی کا رُخ کیا۔ بریلی جا کر خان بہادر خاں کو جو حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے پوتے اور خاندان میں بہت زیادہ با اثر اور بہادر تھے تختِ امارت پر بٹھلا۔ روہیلکھنڈ میں روہیلہ قوم اپنے غیر معمولی شجاعانہ کارناموں کی وجہ سے ابھی تک تفوق خاص رکھتی تھی۔ دولت اور حکومت تو ختم ہو چکی تھی لیکن ترکہ آبائی میں شجاعت و بسالت کا تھوڑا سا حصہ باقی رہ گیا تھا جو اس وقت بروئے کار آیا۔ چنانچہ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں کہ:۔

"جن ضلعوں میں بغاوت ہوئی وہ روہیلکھنڈ کی بغاوت کے آگے ضعیف تھی۔"[۵۴]

بریلی جو عرصہ تک حافظ رحمت خاں کا دار السلطنت رہا تھا جنرل بخت خاں کی جدّ و جہد کا مرکز قرار پایا۔ ظہیر دہلوی رقمطراز ہیں کہ:۔

"بریلی میں ہر طرف کے مفرورین کا اجتماع ہے اور سب سردار مثل تانتیا راؤ۔ فیروز شاہ۔ وغیرہ جمع ہیں۔ رامپور کے تخمیناً ۳۰ ہزار آدمی بریلی میں ملازم ہیں۔ اور مردمان رامپور کا یہ حال ہے کہ ایک ایک تھان دوپٹہ کا سر سے بندھا ہوا ہے۔ اور اس پر گوٹا لگا ہوا ہے۔ آدھا دوپٹہ سر سے بندھا اور آدھا گھوڑے کی رکاب سے نیچے لٹکتا ہوا ہے۔ اور چار چار پیچے کمریں لگے ہوئے ہیں۔ دوہری

---

[۵۲] تاریخ بغاوت ہند۔ [۵۳] علمائے ہند کا شاندار ماضی۔ [۵۴] عروج عہد انگلشیہ۔

اللہ وردی خاں جیسے مُدبر پیدا کر سکتی ہے کیا وہ ہندوستان کی آخری جنگ آزادی میں بخت خاں جیسے جانبازوں کو جنم نہیں دے سکتی۔

تعلیم و تربیت اور ملازمت

زمانہ قدیم کے نوابی خاندان کے لوگ کافی پڑھے لکھے ہونے کے علاوہ فنون حرب میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ بخت خاں کا بھی استثنیٰ نہ تھا۔ سلطان پور کی جاگیر نواب اودھ کی جانب سے ملی تھی اول تو خاندان کی ضروریات کے لئے ناکافی تھی۔ دوسرے اُن کی اولوالعزم اور بے چین طبیعت اس پُرسکون زندگی کی متحمل نہ ہوئی۔ بنابر اں انگریزی فوج میں ملازمت اختیار کی اور بہت جلد ترقی کر کے ممتاز عہدہ پر فائز ہو گئے۔ مسٹر سیبل کے تحت جنگ افغانستان میں ایسے بہادرانہ کارنامے دکھلائے کہ توپ خانہ باٹری کے سب سے بڑے افسر ہو گئے۔ ان کے ماتحت تمام ہندوستانی توپچی رہتے تھے۔ یہ باٹری اپنی کارگزاریوں کے لئے بہت مشہور تھی۔ اعزاز کے طور پر اُن کی توپوں پر پھولوں کا محراب نما تاج بھی رکھا گیا تھا۔ بخت خاں جلال آباد میں بھی اس باٹری کے ساتھ کام کر چکے تھے۔[۵۱]

افغانستان سے واپس آنے کے بعد نیمچ کی چھاؤنی پر بھیجدئے گئے۔ اور صوبے داری کا عہدہ عطا کیا گیا۔ اس طرح بخت خاں توپ خانہ کے بڑے افسر تھے اور انگریزی لشکر گاہ میں بہت سے لوگ اُن کو جانتے تھے۔ وہ ایک فربہ اندام شخص تھے اور انگریز اُن کو بہت ہوشیار اور بڑا دانشمند سمجھتے تھے۔[۵۲]

جنرل بخت خاں کی قیادت

مولوی عظیم اللہ خاں کانپور چھاؤنی میں مشن اسکول میں ملازم تھے اپنی لیاقت سے انگریزی۔ فرانسیسی اور فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں نانا صاحب اور انگریزوں سے دوستانہ تعلقات تھے۔ نانا صاحب کو انگریزی پڑھانے کے لئے انگریزوں کی طرف سے عظیم اللہ خاں مقرر ہوئے۔ اِس شخص کو قدرت نے عجیب دل و دماغ عطا کیا تھا۔ پڑھنے پڑھانے کا معاملہ تو غدر بود ہو گیا۔ اُستاد اور شاگرد کی دُور بین نگاہوں نے انگریزوں سے جنگ کی اسکیم مرتب کرنا شروع کر دی، طے شدہ پروگرام کے مطابق بیرونی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے "عظیم اللہ خاں اور بالا صاحب گوکھلے" یورپ روانہ ہوئے۔ عظیم اللہ خاں روس ہوتے ہوئے ہندوستان آئے، دونوں نے یورپ کے ہوٹلوں میں بیٹھ کر تاریخ بغاوت اور نقشہ جنگ تجویز کیا۔[۵۳]

---

[۵۱] یادداشت نوشتہ جی۔ ایچ۔ ایم۔ رگینس۔ سی بی۔ [۵۲] عروج عہد انگلشیہ۔ [۵۳] علمائے کا شاندار ماضی صفحہ ۴۰۔

ایسے محو ہوئے کہ دشمن دروازہ پر کھڑا تھا لیکن یہاں کسی خبر نہ تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔

یہ تھی دہلی کی وہ ناگفتہ بہ صورت حال، جس کو بخت خاں نے محسوس کیا اور بریلی چھوڑ کر دہلی روانہ ہو گئے۔ نانا راؤ کا بھائی ہمراہ تھا۔ بدایوں سے ہوتے ہوئے فرخ آباد آئے۔ جہاں جہاں سے گزرے راجہ اور جاگیرداروں کو معاونت پر آمادہ کرتے جاتے تھے۔ ظہیر دہلوی رقمطراز ہیں:۔

> "جنرل بخت خاں ۱۴ ہزار کا کمپو، چند توپ اور تین رجمنٹیں سواروں کی لے کر اور کئی لاکھ زر ۷ر جولائی کو دہلی میں داخل ہوا۔ سر پر انگوچھا لپٹا ہوا جال کرچ گلے میں پڑی ہوئی، پہچھے حال کھلا کہ بریلی والا جرنیل وہی تھا۔ بظاہر تو اس کا لباس گھس کھدوں کا سا تھا، میں تو سمجھا جیسے اور پوربیے سپاہی ہیں یہ بھی کوئی سپاہی ہوگا۔" [۵۱]

علاوہ کثیر التعداد فوج کے ایک سو کے قریب علما بھی اُن کے ہمراہ تھے جنھیں اس زمانہ میں مجاہدین کہا جاتا تھا۔ بادشاہ نے جب بخت خاں کی آمد کی خبر سنی تو اپنے خسر نواب احمد علی خاں۔ حکیم احسن اللہ خاں۔ صمد یار خاں۔ ابراہیم خاں اور غلام علی خاں کو اُن کے استقبال کے لئے روانہ کیا۔[۵۲] بخت خاں بادشاہ کے حضور میں باریاب ہوئے۔

بادشاہ کی طرف سے بڑے وسیع پیمانہ پر ان کی پوری فوج کو دعوت دی گئی۔ اور چار ہزار زر بطور انعام کے فوج کو جیب خاص سے عنایت کیا۔ مولوی ذکاء اللہ صاحب لکھتے ہیں:۔

> "سپاہ میں سب سے زیادہ اچھی حالت بریلی بریگیڈ کی تھی۔ کہ جس نے چھ ماہ کی تنخواہ پیشگی دیدی تھی اور اس کے سالار کے پاس چار لاکھ روپیہ بھی تھا۔" [۵۳]

بادشاہ نے فرزند کا خطاب عطا کیا۔ اس کے علاوہ ایک بیش قیمت ڈھال اور تلوار بھی عنایت کی۔ اور تمام شہر میں منادی کرائی گئی کہ پلٹنوں کے افسروں کو ہدایت سننے کے لئے جنرل کے پاس جانا چاہئے۔ اُنھوں نے اپنا فوجی دفتر علیحدہ قایم کیا۔ میر منشی خیرات علی مقرر ہوئے۔ ان کے ڈسپلن کی بدولت ان کی فوج میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔

انگریزوں سے جنگ ۹ر جولائی کو بخت خاں نے دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ انگریزی فوج پر حملہ کیا اور تیس ہزار کی میدان ان سے چھین لیا۔ گھوڑے۔ ہتھیار

---

۵۱ داستانِ غدر

۵۲ اختر الدولہ عمدۃ الحکما، معتمد الملک حاذق الزماں ثابت جنگ، ان کی شہادت پر بادشاہ کو رنگون بھیجا گیا۔ (مضامین فرحت اللہ بیگ)

۵۳ عروج عہد انگلشیہ۔

تلوار میں ڈاب رکھی ہوئی ہے۔ گھوڑوں پر سوار ہیں۔ اور شہر میں گھوڑے کو دائے پھرتے ہیں۔
پچاس ہزار کا اجتماع بریلی میں موجود ہے۔"[۵۱]

جب تک جنرل صاحب کا بریلی میں قیام رہا وہ نواب خان بہادر خاں کے دست راست رہے۔ چنانچہ جو امن وامان اس نواب گردی میں عوام کو میسر تھا اُس میں بخت خاں کا بھی حصہ ہے میں نے اپنے خاندان کی ایک بزرگ خاتون کی زبانی سُنا جن کی کہ والدہ نے اپنے چشم دید حالات اُنھیں بتائے تھے کہ "اُس دوران میں کثرت سے شادی بیاہ اور دوسری تقریبات ہوئیں اور اُن میں کسی قسم کی بے اطمینانی یا انتشار نہیں پایا جاتا تھا۔ ہر چیز کی ارزانی اور بہتات تھی، گرانی کہیں ذکر نہ تھا۔

روہیلکھنڈ کے علاوہ تمام ملک میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف سخت ہیجان برپا تھا۔

بادشاہ کے حضور میں روانگی اور دہلی کا انتظام

بیسکن دہلی میں بادشاہ جن کے اقتدار رفتہ کو واپس لانے کے لئے یہ سب ہنگامہ برپا تھا چین کی بنسری بجا رہے تھے۔ بادشاہ کمزور ومعذور زندگی کی اس منزل پر پہونچ گئے تھے جبکہ انسانی جوش وخروش مبدل بہ انحطاط ہوتا ہے؛ شاہ عالم کے زمانہ سے کمپنی کے زیر سیادت شاہان مغلیہ جس قسم کی زندگی بسر کر رہے تھے اُس سے اُنھوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ برائے نام حکومت ان کی ذات پر ختم ہوجائے گی۔ قلعۂ معلّٰی کی حیثیت درگاہ کی سی تھی اور بادشاہ اس کے مجاور۔ شاعرانہ اور صوفیانہ رنگ میں رنگے ہوئے۔ درود وظائف پیری مُریدی سے فرصت پاتے۔ تو شاعری کی محفلیں گرم ہوتیں۔ تھوڑی سی فارغ البالی کمپنی کی ذراسی نگاہِ کرم، مطمئن زندگی کے لئے کافی سرمایۂ تسکین تھا۔ ان کے شاہانہ مشاغل کی تفسیر اشعار ذیل سے ہوتی ہے ؂

صبح اُٹھ جام سے گزرتی ہے	شب دل آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے	اب تو آرام سے گزرتی ہے

رہے شاہزادے اُن میں مرزا مغل ذرا جوش اور جذبہ کے آدمی تھے۔ لیکن زینت محل نے سازشوں کا جو جال بچھا یا تھا۔ اور جواں بخت کو تخت دلوانے کے لئے جو ریشہ دوانیاں جاری تھیں، سب کی توجہ اُن کی طرف منعطف تھی۔ چنانچہ مرزا مغل بھی اُن سے دامن نہ بچا سکے اور اُن

---

[۵۱] داستانِ غدر از ظہیر دہلوی۔

اُسے پانچ بیگہ زمین دی جائے گی۔ اور اعزازی عہدہ بھی دیا جائے گا۔"

جنگی کونسل کے روبرو بخت خاں نے بیان کیا کہ وہ کشمیری دروازہ کے بالمقابل مورچہ بنا رہے ہیں۔ ہندوستان میں جہاں کہیں بغاوت ہوئی اس کی سرپرستی اور رہنمائی بادشاہ کی طرف سے اُن کے سپرد تھی۔ وہ لوگ اُن سے براہ راست ہدائتیں منگواتے اور اُس کے مطابق عمل درآمد ہوتا تھا۔ جنرل صاحب کے ایک خط سے جو انھوں نے جنرل سدھاری سنگھ اور غوث محمد خاں کو روانہ کیا ہے۔ اِن کے اُس مقصدِ عظیم کا اندازہ ہو سکتا ہے جس کو لے کر وہ اُٹھے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"محمد بخت خاں گورنر بہادر اور دہلی کے دارالخلافہ میں جو فوج ہے۔ اس کے سپاہی اور افسران آداب بجا لاتے ہیں۔ اور تم کو مبارک باد دیتے ہیں۔ جو بہادرانہ کارنامے تمہارے متعلق سے ہیں ہم سب کو اُن پر فخر ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اور تمہارے بادشاہ شب و روز ان مٹھی بھر عیسائیوں کو تباہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خدا نے چاہا تو بہت تھوڑے عرصہ میں دہلی کا ملک ان سے پاک ہو جائے گا۔"

جواب سدھاری سنگھ:۔

"خدا کے فضل سے دہلی کی جو سلطنت وجود میں آئی ہے۔ عالم طفولیت میں ہے۔ خدا نے آپ کو اس بچہ کی پرورش کے لئے بھیجا ہے۔ آپ کے تحت پانچ دستے ہیں اور آپ کا خطاب جنرل بہادر ہے۔ اور آپ کے ہاتھ میں ہر قسم کی قوت ہے۔"[۱]

جنرل اور اُن کی فوج کی بہادری

توپچیوں نے جنرل کی سرکردگی میں بہادری کے وہ جوہر دکھلائے کہ دشمن کی صفوں میں ہل چل ڈال دی تھی۔ ظہیر دہلوی ایک اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:۔

"چاندنی رات ہے اور میں ایک دوست کے کوٹھے پر بیٹھا ہوا ہوں کہ تیاری کا بگل ہوا اور فوج کی کمربندی ہو گئی۔ اور میگزین سے بڑی بڑی چھتیس بنی مندیاں دس دس بارہ بارہ جوڑی بیل لے چلے اور میگزین کی کراچیاں جداگانہ تھیں۔ کوئی پانچ گھڑی رات گئے یہ سب فوج باہر ہو گئی۔ بڑی بڑی توپیں پہاڑوں پر چڑھا کر مورچے باندھ لئے۔ دریا درمیان ہر دو لشکر کے بیچ ایک میل کا فاصلہ

---

[۱] محاصرہ کے دوران میں جنرل بخت کا خط سدھاری سنگھ کے نام غدر کا ریکارڈ (از گوری شنکر)۔

اور بہت سا سامان میدان جنگ سے ہاتھ آیا۔ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں :۔

"۲۹ جولائی کے دربار میں جنرل بخت خاں بادشاہ کا قائم مقام ہو کر آیا۔ بادشاہ نے ساری سپاہ اور شہر پر نیم بادشاہ بنا دیا۔ جنرل نے بھی کمی نذر ایجیٹ کی نقل اتاری۔ آج میگزین دیکھتا ہے۔ اس میں بالترتیب سامان رکھنے کی ہدایت کرتا ہے۔ لال ڈگی اور جامع مسجد کے درمیان ہزاروں فوج کی پریڈ لی۔ نمک اور شکر پر جو محصول تھا وہ معاف کر دیا۔ تاکہ غرباء کو تکلیف نہ ہو۔ نیز یہ بھی کہا کہ جو شہزادہ شہر کو لوٹے گا میں اس کی ناک کٹوا دوں گا۔"[۱]

آگے چل کر مولوی صاحب پھر لکھتے ہیں :۔

"جب تک بخت خاں دلی میں نہیں آیا تھا جہاد کے فتوے کا چرچا بہت کم تھا۔ مگر جب بخت خاں دلی آیا تو اس نے یہ فتوے لکھا یا کہ مسلمانوں پر جہاد اس لئے فرض ہے کہ اگر کافروں کو فتح ہو گئی۔ تو وہ ان کے بیوی بچوں کو قتل کر دیں گے۔ جامع مسجد میں مولویوں کو جمع کر کے ان کے دستخط کرائے۔ اس فتوئے جہاد کے علاوہ ایک حلف نامہ بھی تقسیم کرایا اور اس پر ہر سپاہی نے جن کی تعداد ۷۰/۸۰ ہزار کے لگ بھگ تھی عہد لیا۔ مرزا مغل نے یہ حلف نامہ فوجوں کو پڑھ کر سنایا۔ جس پر انھوں نے اقرار کیا کہ ہم آخری دم تک لڑیں گے! جنرل بخت خاں خلوت جلوت میں جب چاہتے بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہوتے کوئی پابندی عاید نہ تھی۔ بادشاہ نے ایک مرتبہ عید قرباں کے روز حسب ذیل شعر لکھکر ان کو بھیجا ؂

لشکر اعدا الٰہی آج سارا قتل ہو
گورکھا، گوجر سے لیکر تا نصاریٰ قتل ہو[۲]

پیدل فوج کی دو پلٹنیں اور پانچ سو رسالہ کے سپاہی چھ توپوں اور سامان اسلحہ کے ساتھ بخت خاں کے حکم سے باغپت روانہ ہوئے تاکہ انگریزوں کو پل تعمیر کرنے سے روکیں، اس کے علاوہ فوج کی کثیر تعداد مع سامان حرب کے علی پور روانہ ہوئی۔ سہ پہر کو یہ افواہ اڑی کہ باغیوں کو بہت بڑی فتح ہوئی۔ اس کی وجہ سے عوام میں بڑا جوش و خروش پھیل گیا۔ دہلی سے اجمیری دروازہ تک فوجوں کی پریڈ ہی گئی۔ جنرل نے سپاہیوں کے ساتھ نہایت شفقت کے ساتھ بات چیت کی اور بادشاہ کا خاص پیغام پہونچایا کہ جو شخص میدان جنگ میں کارہائے نمایاں کرے گا

---

[۱] عروج عہد انگلشیہ۔ [۲] رسالہ بغاوت ہند صفحہ ۱۲۹ بابت ۱۹۵۸ء ماہ دسمبر۔

چوکیوں اور پہرا دوں پر ہوئے۔ یہ ہمارے آدمیوں کے بہت کم قریب آتے تھے۔ اور یہ بھی اُسوقت جب ان پر اچانک حملہ کر دیا جاتا تھا۔ گو روزانہ جنگ آزما ہوتے تھے۔ ان کی اس مستقل جرأت بہادری سے کوئی چیز بازی نہیں لے جاسکتی تھی۔"[۵۱]

چارلس بال صاحب رقمطراز ہیں کہ :-

"شہر کے جس حصہ پر ہم نے سب سے پہلے حملہ کیا اس پر شراب کا کافی تعداد میں موجود ہونا باغیوں کی انتہائی چالاکی کا ثبوت ہے۔"[۵۲]

مجاہد علمائے اسلام سے اتحادِ عمل ۱۸۵۷ء کی تحریک سے بھلا علماء کی جماعت کیسے علٰحدہ رہتی سنہ ۱۸۴۰ء میں ان کو سرحدی جنگ میں جو ہزیمت ہوئی گورنمنٹ نے جو قیامتِ صغریٰ ان پر نازل کی تھی اُس کا بدلہ لینے کا اِس سے بہتر موقعہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ اس زمانہ میں وہابیوں کو مجاہدین کہا جاتا تھا۔ خواجہ حسن نظامی صاحب رقمطراز ہیں کہ :-

"بخت خاں خود بھی وہابی تھے اور محمود رفیع رسالہ دار۔ مولوی امام خاں۔ مولوی عبد الغفور خاں مولوی سرفراز علی بھی وہابی تھے۔ بخت خاں نے سرفراز علی کو پیشوائے مجاہدین مقرر کیا تھا۔ اور وہی ان کی سرپرستی کرتے تھے۔"[۵۳]

علماء کی جماعت پر جنرل صاحب کو اس قدر اعتماد تھا کہ تخلیہ کے اُن مخصوص مشوروں میں جن میں سوائے اُن کے اور بادشاہ کے کوئی نہ ہوتا تھا یہ لوگ ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ یہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ جنرل بخت خاں کے ہمراہ ایک سو علماء دہلی آئے تھے۔ دورانِ ہنگامہ میں ایک جماعت وہابی علماء کی ٹونک سے بھی آئی تھی۔ اِس کے علاوہ جے پور۔ بھوپال۔ ہانسی حصار اور آگرہ سے بھی کافی تعداد میں علماء آئے اور جنرل کے ساتھ کام کیا۔[۵۴]

لیکن علماء کی جماعت میں مولوی لیاقت علی خاص لیاقت اور شخصیت کے مالک تھے۔ جن کی کارگزاریوں سے خوش ہو کر بخت خاں نے انکو الہ آباد کا گورنر بنا دیا تھا۔ انھوں نے ایک رسالہ جہادِ حریت' بھی لکھکر شائع کیا۔ اس میں تحریر کیا تھا کہ :-

"جہاد میں سب سے بڑا اساملہ یہ ہے کہ بندے توکل بخدا کریں اور امداد جانب خالق کون و مکاں سے ہو۔ مسلمانانِ ہندوستان کو بوجہ بے استطاعتی زرعدم موجودگی گولہ بارود و توپ و لشکر تھے مجبور رہنا تولیا

---

[۵۱] نورِ عظیم کا تذکرہ۔ (از ٹیم فوربیس)۔ [۵۲] ہندوستان کے غدر کی تاریخ۔ (چارلس بال)۔
[۵۳] بہادر شاہ کا مقدمہ۔ (از خواجہ حسن نظامی) [۵۴] بہادر شاہ کا مقدمہ صفحہ ۳۲۶

ہوگیا۔ بڑی توپوں نے بڑا کام کیا اور فوج انگریزی کا بہت نقصان ہوا۔ زرد کوٹھی کے متصل پوربیوں نے ایک مورچہ قائم کر رکھا تھا۔ اور بڑی بڑی توپیں لگا رکھی تھیں۔ اُن توپوں سے انگریزی فوج کو بہت نقصان پہونچتا تھا۔ اس مورچہ کی حفاظت کے لئے ہر وقت دو پلٹنیں اور گولا انداز موجود رہا کرتے تھے۔"[1]

"انگریزی فوج نے ایک رات شب خون مارا۔ رات بھر ہنگامہ گیر و بکش گرم رہا۔ دونوں طرف سے توپ چلتی رہی۔ لڑائی کیا قیامت کے آثار نمودار تھے۔ خدا جانے طرفین سے تین سَو توپیں چل رہی تھیں یا چار سَو اس کا علم خدا کو ہے۔"

"گھوڑ چڑھی کے توپ خانہ نے یہ کام کیا کہ محلدار خاں کے برابر تر پولیہ ہے اس میں توپیں لگادیں۔ اور دو پلٹنیں باغیچہ میں چھپ کر کھڑی ہوگئیں۔ تر پولیہ کے تینوں دروں میں توپیں لگی ہوئی تھیں۔ اور دونوں طرف سے باغیوں نے راستہ رکھا تھا۔ لیکن انگریزی توپ خانہ نے ایسے گولے برسائے کہ تینوں توپیں بے کار ہو کر شہر روانہ ہوگئیں۔ فوج انگریزی اس سے بے خبر کہ پلٹنیں گھات میں بیٹھی ہیں۔ دور و یہ سلسلہ میں بندھی تعاقب میں بڑھی چلی آئیں۔ باغیوں نے جب دیکھا کہ وہ بیچ میں آگئیں۔ یکبارگی باغات کی دیوار کے پیچھے سے کھڑے ہو کر دونوں طرف سے باڑھ جھونک دی۔ اُس وقت فوج کا یہ حال ہوا جیسے کبوتروں میں چھرّہ مار دیا ہوا۔ بہت آدمی ضائع ہوئے اور مورچہ چھوڑ کر اُلٹے چھاؤنی کہنہ کی طرف روانہ ہوئے۔"[2]

"جنرل صاحب کی قیادت میں عوام نے سر دھڑ کی بازی لگا کر بے جگری سے اپنے خون کی ہولی کھیلی۔ اور ان کو معلوم ہوگیا کہ مقابلہ کسی معمولی دشمن سے نہیں ہے۔ فوج باغی نے بڑی سختی اور مضبوطی سے فوج انگریزی پر حملہ جاری رکھا۔ اور کوئی تدبیر یا دقیقہ ان کے وہاں سے نکال دینے میں اور غارت کرنے میں باقی نہیں چھوڑا۔ دشمنوں نے اپنی مورچہ بندی ایک بہت اچھے موقع پر باغات اور مکانات کی آڑ میں کی تھی۔ توپیں بہت عقلمندی کے ساتھ سرنگیں اور ان پر ٹت سے آگ برسائی کہ ایک لمحہ کیلئے بھی توقف نہ تھا۔"[3]

ولیم فوربس رقمطراز ہے کہ:۔

"محاصرہ کے زمانہ میں باغیوں نے متعدد حملے کئے اور یہ باغیوں کی لیاقت کا اچھا ثبوت ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم کسی معمولی دشمن سے مقابلہ نہ کر رہے تھے۔ ان حملوں کی تعداد ۲۶ تھی۔ ان میں سے ہر ایک نہایت ہی منظم اور باقاعدہ اقدام اور حملہ تھا۔ ان کے علاوہ بے شمار حملے دُور اُفتادہ

---

[1] داستان غدر از ظہیر دہلوی۔ [2] داستان غدر ۔۔۔۔ [3] رسالہ تاریخ بغاوت ہند۔ بابت اگست

ان بدیشیوں کے ساتھ جنگ کی۔ جنھوں نے اس کا وطن چھین لیا تھا۔ ہر ملک کے باشندوں پر اور سچے لوگوں کو مولوی احمد شاہ کو عزت کے ساتھ یاد رکھنا چاہیے۔" مولوی صاحب کے قتل کے بعد انگریزوں کو مکمل فتح ہوئی۔ اور ۱۲ جنوری ۱۸۵۸ء کو نواب تمو خان نائب حضرت محل۔ ۵ نفر قیدیان بغاوت کالے پانی بھیجے گئے اور وہیں فوت ہوئے۔"[۵۱]

انھیں مجاہدین میں ایک مجاہد جھنڈا شاہ تھے۔ جن کو مولانا جعفر تھانیسری نے کالے پانی میں دیکھا اور ان کے متعلق تحریر کیا:-

"جھنڈا شاہ ایک سر بھنگی فقیر سالہا سال سے مونٹ ہیریٹ میں دھونی لگائے بیٹھا تھا اور ۲۱ دسمبر ۱۸۵۸ء کو ضلع بریلی سے بجرم ترغیب دہی بغاوت ۱۴ برس کا سزایاب ہو کر پورٹ بلیر آیا اور جس کو حسب وارنٹ ضلع بریلی کے ۲۱ دسمبر کو رہا ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر ابتک رہا نہیں ہوا۔ اس کے بظاہر بے وجہ قید رکھنے میں جو حکمت ہے ہم عوام اس کو نہیں جانتے۔"[۵۲]

۱۷۹۶ء میں جو جزیرہ اپنی ہولناک اور جانکاہ آب و ہوا کی وجہ سے آباد ہو کر اُجڑ چکا تھا علماء ہند کی بدولت پھر آباد ہوا۔ مولوی جعفر صاحب لکھتے ہیں کہ:-

"ان جزائر کی ہوا ستم قاتل ہے۔ لیکن پھر بھی میں نے جا کر دیکھا کہ اس غدر ۱۸۵۷ء کی بدولت بیسوں راجے۔ مہاراجے اور نواب۔ زمیندار۔ مولوی۔ مفتی۔ قاضی۔ ڈپٹی کلکٹر۔ منصف صدر امین۔ رسالدار اور صوبہ دار۔ جمعدار۔ وغیرہ قید ہیں۔ جو کہ چوہڑے۔ چماروں کی طرح موٹا جھوٹا کھانا کھاتے ہیں۔ عام لوگوں کے ساتھ محنت مشقت کرتے ہیں۔"[۵۳]

اس کے علاوہ ایک اور انتہائی شرمناک سزا نوشتۂ تقدیر کی تھی۔ محمد جعفر لکھتے ہیں کہ:-

"ہم جب پہنچے ہزاروں مرد۔ عورت قیدیوں کو دیکھا کہ ماتھا کھود کر پیشانی پر ان کا نام اور جُرم اور لفظ دائم الحبس لکھا ہوا ہے کہ وہ مثل نوشتۂ تقدیر کے تمام عمر نہیں مٹتا۔ مگر بہ تائید الٰہی سنئے کہ ہمارے جانے سے کچھ عرصہ پہلے وہ حکم منسوخ ہو چکا تھا۔ اس سبب سے اس دائم الحبسی سے بھی ہم محفوظ رہے۔"[۵۴]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سیاسی قیدی بھی اس نوشتۂ تقدیر سے نہیں بچتے تھے۔

---

۵۱ "حکایاتِ عجیب" جعفر تھانیسری صفحہ ۸۲۔
۵۲ "حکایاتِ عجیب" صفحہ ۴۴۔
۵۳ "کالا پانی" صفحہ ۵۰-۵۱۔
۵۴ "کالا پانی" صفحہ ۴۹۔

وجہ سے تھے سو اُس خالق احد اللہ نے دین احمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا باطنی طور پر قوی و توانا کیا ہے۔ ویسا ہی ظاہری سامان تسکین خاطر ہم ضعفاء و مساکین ان نابکار فدا ر بد اطوار سے بلا سبب و کوشش ہم لوگوں کو دلوایا۔"[۵۱]

ہنٹر صاحب تحریر کرتے ہیں کہ :۔

"جب ۱۸۵۷ء میں غدر شروع ہوا تو مولوی جعفر تھانیسری اپنے دس معتبر مریدوں کے ساتھ مجاہدین کے کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جنگ کے غیر مانوس کام میں بھی اس کی اعلیٰ قابلیت نے اس کو نمایاں کر دیا اور اب وہ ان لوگوں میں شمار ہونے لگا۔ جن کے پاس باغیانہ راز محفوظ رہ سکتے ہیں۔ دہلی میں جب باغیوں کی اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ تو جعفر پھر تھانیسر واپس آگیا۔"[۵۲]

تاریخ بغاوت ہند میں تحریر ہے کہ :۔

"اس کے علاوہ ملک میں اور طرح بھی سازشیں کی گئیں۔ انقلابی لوگ فقیرانہ لباس پہن کر شہروں میں نکل جاتے تھے۔ تاکہ انتظام سرکار میں خلل ڈالیں۔ اور ہندوستانی سپاہیوں کو باغی بنائیں۔"[۵۳]

علماء کی جماعت میں مولوی احمد اللہ شاہ صاحب بھی تھے۔ ان کی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ :

"جب آگرہ میں وعظ فرماتے تھے۔ تو دس دس ہزار کا مجمع ہوتا تھا۔ بعض آباد کی پھانوتی پر دردست قابض ہو گئے۔ بیگم حضرت محل نے اُنھیں لکھنؤ بلا کر فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ جہاں وہ دس ماہ تک انگریزوں سے برسر پیکار رہے۔ جب انگریزوں کا لکھنؤ پر قبضہ ہو گیا تو راجہ پوایاں نے اپنے مکان میں بلا کر جبکہ وہ اس سے باتیں کر رہے تھے شہید کرا دیا۔ ان کی قبر موضع گنج متصل شاہجہان پور میں ہے۔"[۵۴]

راجہ جگناتھ کو ۵۰ ہزار روپیہ انعام میں ملا۔ مولوی صاحب کی نسبت مالیسن لکھتا ہے کہ :۔

"مولوی ایک بہت بڑا تجربہ کار شخص تھا۔ کوئی شخص فخر کے ساتھ نہ کہہ سکتا تھا کہ میں نے کالن کیمبل کمانڈر انچیف ہند کو دو بار میدان میں شکست دی۔ مولوی احمد اللہ شاہ سچا محب وطن تھا۔ اس نے کسی نہتے کا خون بہا کر اپنی تلوار کو خراب نہیں کیا۔ اس نے بہادری کے ساتھ ڈٹ کر کھلے میدان میں

---

[۵۱] علماء کا شاندار ماضی۔ علماء کی جماعت کے ساتھ مولوی لیاقت علی کو بھی کالے پانی بھیجا گیا۔ "حکایاتِ عجیب" میں علماء ہند کے علاوہ ا

[۵۲] ماخوذ از "ہمارے ہندوستانی مسلمان" مولوی صاحب وہابیہ تحریک کے مجاہدین میں سے تھے۔ ۱۸۶۵ء میں تھانہ کیپ سے

لکھنے کی بنا پر کالے پانی کی سزا ہوئی، ۲۰ سال وہاں گزارے۔

[۵۳] "تاریخ بغاوت ہند"۔

[۵۴] مولانا سید طفیل احمد صاحب نے قبر پر کتبہ لگوا دیا ہے اور اب سالانہ عرس بھی ہوتا ہے۔ مضمون "دلاور جنگ احمد اللہ شاہ" از مفتی انتظام اللہ صاحب (مصنف) ماہنامہ وسمبر ۱۹۴۳ء

اسبابِ ناکامی

مذکورہ بالا قربانیوں کا جو افسوسناک انجام ہوا۔ اس کا ایک بڑا سبب اُس میگزین کی تباہی تھا جس کی بربادی نے کامیابی کو ناکامیابی سے اور فتح کو شکست میں تبدیل کر دیا۔ ظہیر دہلوی لکھتے ہیں کہ:۔

"اسی زمانہ میں یہ ستم ہوا کہ ثمرو کی بیگم کی حویلی میں جو میگزین تھا اور جس میں سات سو من بارود تیار ہوتی تھی اور خرچ میں آجاتی تھی۔ ایک دن سہ پہر کا وقت ہے۔ دن کے تین بجے ہیں۔ کہ ایک دھماکے کی آواز ہوئی۔ میں اپنے دو منزلہ پر چڑھا۔ دیکھتا کیا ہوں گرد و غبار اور دھواں آسمان سے باتیں کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ میگزین اُڑ گیا۔ بارود کی عدم فراہمی کی وجہ سے تمام آلاتِ حرب بیکار تھے۔ دشمن دروازہ پر کھڑا تھا باہر سے امداد کی کوئی صورت نہ تھی۔ بادشاہ پہلے سے ہی سوختہ جگر۔ اور سوختہ سامان ہو رہے تھے۔ مرزا الٰہی بخش نے کچھ ایسا افسوں کیا کہ قلعہ چھوڑ کر ہمایوں کے مقبرہ میں گوشہ گیر ہونے میں عافیت سمجھی۔"

میلسن لکھتا ہے کہ:۔

"باغی فوج کے سپہ سالار بخت خاں نے اسی شب شہر کو خالی کر دیا اور اپنے ہمراہ ان لڑنے والوں کو بھی لے گیا۔ جن پر اس کو اعتماد تھا۔ بخت خان نے ہر ممکن الفاظ میں بادشاہ سے درخواست کی کہ اس کے ہمراہ چلیں انھیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اگرچہ انگریزوں نے قلعہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ لیکن ملک کے دروازے ان کے سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ بادشاہ کی موجودگی سے اب بھی اس کے نام پر جنگ کو جاری رکھنا ممکن ہے۔ اور کامیابی کے امکانات ہیں۔"[۱]

اگر بہادر شاہ کی فطرت میں اپنے اجداد بابر۔ ہمایوں۔ اکبر۔ اور عالمگیر کی سی ثابت قدمی ہوتی یا قوتِ ارادی کا شائبہ ہوتا تو بخت خاں کی درخواست بیکار نہ جاتی۔ شہزادوں نے بھی بادشاہ کا اتباع کیا۔

جنرل بخت خاں کی رُوپوشی

میگزین ختم ہو چکا تھا۔ بادشاہ قلعہ چھوڑ چکے تھے۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ جنرل صاحب مع اپنی فوج کے کہیں روپوش ہو گئے۔ سالہا سال تک ان کی تلاش و جستجو جاری رہی۔ لیکن اس بہادر غیور ملت کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ اکثر کا خیال ہے کہ وہ ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے۔ لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ وہاں فیروز شاہ

---

[۱] "تاریخ غدر" (از میلسن)

بہادری کی عجیب و غریب مثالیں | ظہیر دہلوی رقمطراز ہیں کہ:-

"میں جوہری بازار کے پھاٹک پر آیا تو دیکھا کہ زخمی بکثرت آ رہے ہیں۔ دو سو اور میری برابر سے نکلے، میں نے دیکھا کہ ان کے سینوں میں گولیاں لگی ہوئی ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوگئے ہیں۔ اور پشت پر بڑے بڑے بھباتے کھلے ہوئے تھے اور کلیجے کے ٹکڑے خون کے لتھے ہوئے پڑے تھے۔ دائیں ہاتھ میں تیغے۔ بائیں ہاتھ میں گھوڑے کی باگیں۔ کسی طرح کا کوب اور بدحواسی ان کے بشرے سے ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ ایک زخمی کو دیکھا کہ اس کا ہاتھ کہنی سے اُڑ گیا تھا اور کٹے ہوئے بازو سے خون گرتا جاتا تھا اور اپنے پاؤں سے چلا آتا تھا۔"[۵۱]

مجینڈی نے بہادری کی ایسی ہی مثالوں سے متاثر ہو کر تحریر کیا تھا کہ:-

"ان لوگوں پر انسان نہیں بلکہ کوئی مافوق البشر ہونے کا گمان ہوتا ہے۔"

ولیم فوربس لکھتا ہے کہ:-

"میجر ریڈ کی ہدایت پر بغیر کسی دشواری کے باغیوں کو باغوں سے انگریزی سپاہ نے نکال دیا۔ لیکن سراؤں۔ مکانوں میں باغیوں سے لڑائی ہوئی۔ مکانوں کی چھتوں پر جو زینے جاتے تھے اُن پر چڑھتے ہوئے باغیوں کو انگریزی سپاہ نے سنگینوں سے ہلاک کیا۔"[۵۲]

چارلس بال رقمطراز ہے کہ:-

"دشمن نے ہر سڑک پر ایک ایک انچ زمین کے لئے لڑائی لڑی تھی۔ اور بڑے استقلال کے ساتھ یکے بعد دیگرے ہر مقام پر قبضہ کیا تھا۔"[۵۳]

بادشاہ لاکھ بوڑھے اور کمزور تھے۔ پھر بھی تیموری خون کبھی کبھی گرما ہی جاتا تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے شرفا، دہلی کے لڑکوں۔ کم عمر شہزادوں اور سلاطین زادوں کی ایک فوج بنائی تھی۔ انکے میں چند جدتیں بھی کی تھیں، سبز کوٹ۔ سیاہ چمڑے کے جوتے۔ سبز پھریروں کے چھوٹے چھوٹے بڑے آن بان سے قدم ملا کر چلتے تھے، تھے تو کم کے مگر غدر میں باڑے کے نیچے سب کٹ کر ڈھیر ان کے قصّے دلّی کے بڈھے بیان کرتے تھے اور روتے تھے۔ تاریخ میں ان کے کارناموں کا کوئی نہیں۔ خدا معلوم کیا بات ہے۔ ہاری ہوئی فوج تھی اس لئے ان کا ذکر بے ضرورت سمجھا گیا۔[۵۴]

---

۵۱ داستان غدر۔ ۵۲ غدر عظیم کا تذکرہ (ولیم فوربس)۔
۵۳ ہندوستان کے غدر کی تاریخ (چارلس بال) ۵۴ مضامین مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی۔

مجینڈی لکھتا ہے :-

"جن کو ہم نے گرفتار کیا تھا ان میں سے بہت سے تو اسی وقت ختم ہو گئے۔ لیکن آخر وقت تک اُن کے چہروں سے شجاعت اور ضبط کے آثار ہویدا تھے جو اس سے کسی بڑے مقصد کے شایانِ شان علامات تھیں۔" [۵]

وہ مقصد عظیم جس کے لئے جنرل بخت خاں اور دوسرے لوگوں نے جان کی بازی لگائی ہندوستان کی کامل آزادی اور احیائے سلطنتِ اسلامیہ تھا۔ لیکن جب کوئی قوم ایک مرتبہ اپنی حماقتوں سے غلامی کی لعنت میں گرفتار ہو جاتی ہے تو پھر با سانی چھٹکارا نہیں پا سکتی۔ آزاد قوموں کی تاریخ اس کی شاہد ہے۔ تاہم ۱۸۵۷ء کی جد و جہد کو بالکلیہ ناکام بھی نہیں کہا جا سکتا۔

ظالم کمپنی کی حکومت کا بہر صورت خاتمہ ہو گیا۔ اُس کی جگہ ایک قسم کی جمہوری حکومت نے لے لی۔ جس میں ہم ہندوستانی نسبتاً زیادہ آزادی کی سانس لے رہے ہیں۔ اور کم از کم ملک کے اندرونی انتظام میں برابر کے شریک ہیں +

انیس فاطمہ

[۵] "علماءِ ہند کا شاندار ماضی" (مصنفہ مولوی محمد میاں صاحب صفحہ ۴۲)۔

مُعاونینِ مُصنّف

۲۶ مارچ ۴۵ء لغایۃ ۲۵ مئی ۴۵ء

۱- ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر علیگڑھ ..... للعہ

۲- مولوی مختار احمد خاں صاحب بی اے (علیگ) رئیس بریلی ..... سے

۳- خان بہادر خلیفہ اسد اللہ صاحب کلکتہ ..... صہ

۴- بیگم صاحبہ محمد نسیم صاحب بی اے، ڈبائی ..... للعہ

۵- یونین لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ..... للعہ

۶- مولوی حسن عبد اللہ صاحب ایم اے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ..... سے

۷- آنریبل خواجہ غلام السیدین صاحب وزیر تعلیمات رامپور ..... صہ

۸- خانبہادر شیخ وحید الدین صاحب سی آئی ای رئیس اعظم میرٹھ ..... للعہ

اور تجمل حسین خاں وغیرہ کو تو لوگوں نے دیکھا اور بخت خاں کو کسی نے نہ دیکھا نہ پہچانا۔ ایک بھی ہے اور ایک حد تک صحیح بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرحد آزاد کی طرف چلے گئے۔ اور وہاں انگریزوں کے خلاف کام کرتے رہے۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے۔

بادشاہ کو تخت حکومت پر برقرار رکھ کر خود تحریک کی قیادت کرنا شخصی دور حکومت ان کی زبردست سیاسی غلطی تھی جو ان کی ناکامیابی کا باعث ہوئی۔ خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں:

"بخت خاں بچارے پر دو حریفوں کا بوجھ پڑا۔ ایک طرف انگریز تھے۔ دوسری طرف مرزا مغل اسی کشمکش میں فوجیں قابو سے باہر ہو گئیں۔ انتظام کی مشین بے کار ہو گئی۔ انگریزوں نے دہلی فتح کر لی اور انقلاب کی اسکیم دھواں ہو کر اڑ گئی۔"

تحریک بغاوت

نیک دل انگریزوں کی نگاہ میں!!

مندرجۂ بالا واقعات سے ہمارے بزرگوں کی قربانیوں اور جانکاہیوں کا اندازہ ہو گیا ہو لیکن سوال یہ ہے کہ انھوں نے یہ سب کچھ جو کیا تو کون مقصد اعلیٰ سامنے رکھ کر کیا بعض انصاف انگریزوں نے اس کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ تحریر کرنا بے محل نہ ہو گا۔ مسٹر لیکی نے تحریر کیا تھا:

"اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جا سکتی ہے۔ تو وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بغاوت تھی۔"[۵۱]

ڈاکٹر ہنٹر نے تحریر کیا کہ:۔

"انھوں نے بغاوت میں حصہ لیا تو کسی ادنیٰ مقصد سے نہیں لیا۔"[۵۲]

مسٹر ڈزرائیلی وزیر اعظم انگلستان نے ۲۷ر جولائی ۱۸۵۷ء کی تقریر میں بیان کیا:۔

"مجھے یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ صرف فوجی تکلیف کی بنا پر یہ بغاوت نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ در پردہ ملک کی عام سیاسی بے چینی کی حمایت میں اٹھے تھے۔"[۵۳]

---

۵۱ "روشن مستقبل" مولوی سید طفیل احمد صاحب۔
۵۲ "ہمارے ہندوستانی مسلمان"۔
۵۳ "تصویر کا دوسرا رخ"۔

۹- خان بہادر مولوی حبیب الرحمٰن خانصاحب ڈپٹی کمشنر لکھیم پور ..... للعہ؍

۱۰- مولوی محمد ابراہیم علی خانصاحب رئیس قائم گنج ..... للعہ؍

۱۱- مولانا امتیاز علی خانصاحب عرشی رام پور ..... للعہ؍

۱۲- ڈاکٹر زبید احمد صاحب الہ آباد یونیورسٹی ..... للعہ؍

۱۳- خان بہادر سید آل علی نقوی صاحب ایم اے بدایوں ..... للعہ؍

۱۴- سید نصیر الدین حیدر صاحب ایم۔ اے لکھنؤ ..... للعہ؍

۱۵- پروفیسر نجیب اشرف صاحب اسمٰعیل ندھیری کالج بمبئی ..... للعہ؍

۱۶- انجمن عربی صوبہ متحدہ۔ الہ آباد ..... للعہ؍

۱۷- مولانا سید طفیل احمد صاحب منگلور ..... للعہ؍

۱۸- سید نائب حسن صاحب کاظمی علی گڑھ ..... للعہ؍

۱۹- ہیڈ ماسٹر صاحب مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول علیگڑھ ..... للعہ؍

۲۰- خان بہادر پروفیسر عبد المجید صاحب قریشی ایم اے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ..... للعہ؍

۲۱- ہیڈ ماسٹر حامدیہ ہائی اسکول رام پور ..... للعہ؍

۲۲- " " مرتضی " " " ..... للعہ؍

۲۳- پرنسپل رضا انٹر کالج " ..... للعہ؍

۲۴- " مدرسہ عالیہ " ..... للعہ؍

۲۵- ہیڈ مسٹرس صاحبہ اسلامیہ گرلز ہائی اسکول بریلی ..... للعہ؍

۲۶- خواجہ محمد نسیم صاحب لاہور ..... للعہ؍

۲۷- سید مسعود الحسن صاحب پرنسپل اسلامیہ انٹر کالج بریلی (ذاتی) ..... للعہ؍

۲۸- پرنسپل صاحب اسلامیہ انٹر کالج بریلی ..... للعہ؍

۲۹- میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ ایبٹ آباد ..... للعہ؍

۳۰- حکیم بشیر الدین صاحب وکیل۔ لوئے مادھوپور ..... للعہ؍

۳۱- پرو پرائٹر صاحب عالم شوز مرچنٹ دار جلنگ ..... للعہ؍

۳۲- مولوی شجاعت علیخانصاحب سپرنٹنڈنٹ اکسائز الموڑہ ..... للعہ؍

۳۳- مہتمم صاحب انجمن ترقی اردو بانکی پور پٹنہ ..... للعہ؍

۳۴- بیگم صاحبہ آباد احمد خانصاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس اٹیہ ..... للعہ؍

۳۵- ڈاکٹر عبد العزیز خانصاحب سول لیڈی ہسپتال۔ الہ آباد ..... للعہ؍

۳۶- بابو فضل دین صاحب بنگلور ..... للعہ؍

۳۷- بابو امام الدین صاحب نوساروی۔ سورت ..... للعہ؍

۳۸- مولوی حاجی ابو الحسن صاحب غازی پور ..... للعہ؍

۳۹- بابو محمد صدیق صاحب میسور ..... للعہ؍

۴۰- ڈاکٹر محمد راحت اللہ خانصاحب مہتمم کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن ..... للعہ؍

۴۱- مولوی عبد المجید صاحب بنگلور ..... للعہ؍

۴۲- بیگم اعزاز رسول صاحبہ ایم ایل سی۔ لکھنؤ ..... للعہ؍

۴۳- بیگم صدیقہ غلام احمد صاحبہ کوٹھی گلفشاں بستی پٹھانان پٹیالہ ..... للعہ؍

میزان مالعہ؍ ۱۹۰

[illegible] نمبر ۱۴

مجلس مصنفین علیگڑھ کا سہ ماہی علمی رسالہ

اپریل سنہ ۱۹۴۶ء

{مدیر و ناشر}

سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ)

قیمت سالانہ چار ۴ روپے

بیت المصنف
کانفرنس کمپاؤنڈ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
[illegible]
[illegible]

مُصنّف

جلد ۴ | بابت ماہ اپریل ۱۹۴۶ء | نمبر ۱۴

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	مولانا سید طفیل احمد صاحب مرحوم	مُدیر	۳ تا ۸
۲	بحیرۂ روم میں اسلامی حکومت	مولانا ابرار حسین صاحب فاروقی - ایم - اے	۹ ؍ ۵۴
۳	امام بخش صہبائی شہید دہلوی	مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی - اکبر آبادی	۵۵ ؍ ۶۹
۴	میر کی شاعری پر ایک عام نظر	سید لطیف حسین ادیب - بریلوی	۷۰ ؍ ۸۹
۵	یورپ کے ارتقا میں مسلمانوں کا حصّہ	صاحبزادہ ممتاز علی خاں صاحب بی - اے (علیگ)	۹۰ ؍ ۹۹
۶	اسلامیانِ ہند کی تعلیمی ضروریات	ڈاکٹر سید شریف احمد صاحب چشتی	۱۰۰ ؍ ۱۱۰
۷	قصیدہ ہفت بند فارسی در منقبت حضرت مولیٰ علی	منشی الملوک فخر الدولہ دبیر الملک راجہ رتن سنگھ بہادر ہشیار جنگ آنجہانی	۱۱۱ ؍ ۱۱۶
۸	بزمِ مصنّف	مولانا شہاب مالیرکوٹلوی و دیگر حضرات	۱۱۶ ؍ ۱۲۲
۹	تبصرے	سیّد انیس فاطمہ بریلوی	۱۲۳ ؍ ۱۲۸

اناللہ وانا الیہ راجعون

رونقِ ہستی "تھی" عشق خانہ ویران ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

×

صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ کی شاندار کامیابی - انتخاب کے تلخ و خوشگوار تجربات و تاثرات - وزارتی مشن کی ہندوستان میں آمد اور اس موقع پر ہندو مسلمانوں کی روایتی کشمکش - "آل انڈیا اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ" کے عہدہ داروں اور کمیٹیوں کے ارکان کا انتخاب نیز اکیڈمی کی شاخ علیگڑھ کا کانفرنس کے زیر سرپرستی باضابطہ قیام - ۲۹ مارچ کو ایک عرصہ کے بعد مجلس مصنفین کا جلسہ - اسی تاریخ کو علیگڑھ میں ہندو مسلم فساد اور اس کے نتائج مابعد - یہ سب ایسے موضوعات تھے جن پر ہم آج کے مصنف میں اپنا مقالۂ افتتاحیہ اور شذرات سپرد قلم کرتے لیکن ۳۰ مارچ ۴۶ء کو ۷ بجکر ۲ منٹ پر ہمیں ایک ایسا حادثۂ فاجعہ پیش آیا کہ ہمارے اوقات عزیز کا ہر لمحہ اسی کے درد و کرب میں بسر ہو رہا ہے۔ کوئی دوسرا خیال یا مضمون دل و دماغ میں محفوظ نہیں ہے

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل کہاں کی رُباعی کہاں کی غزل
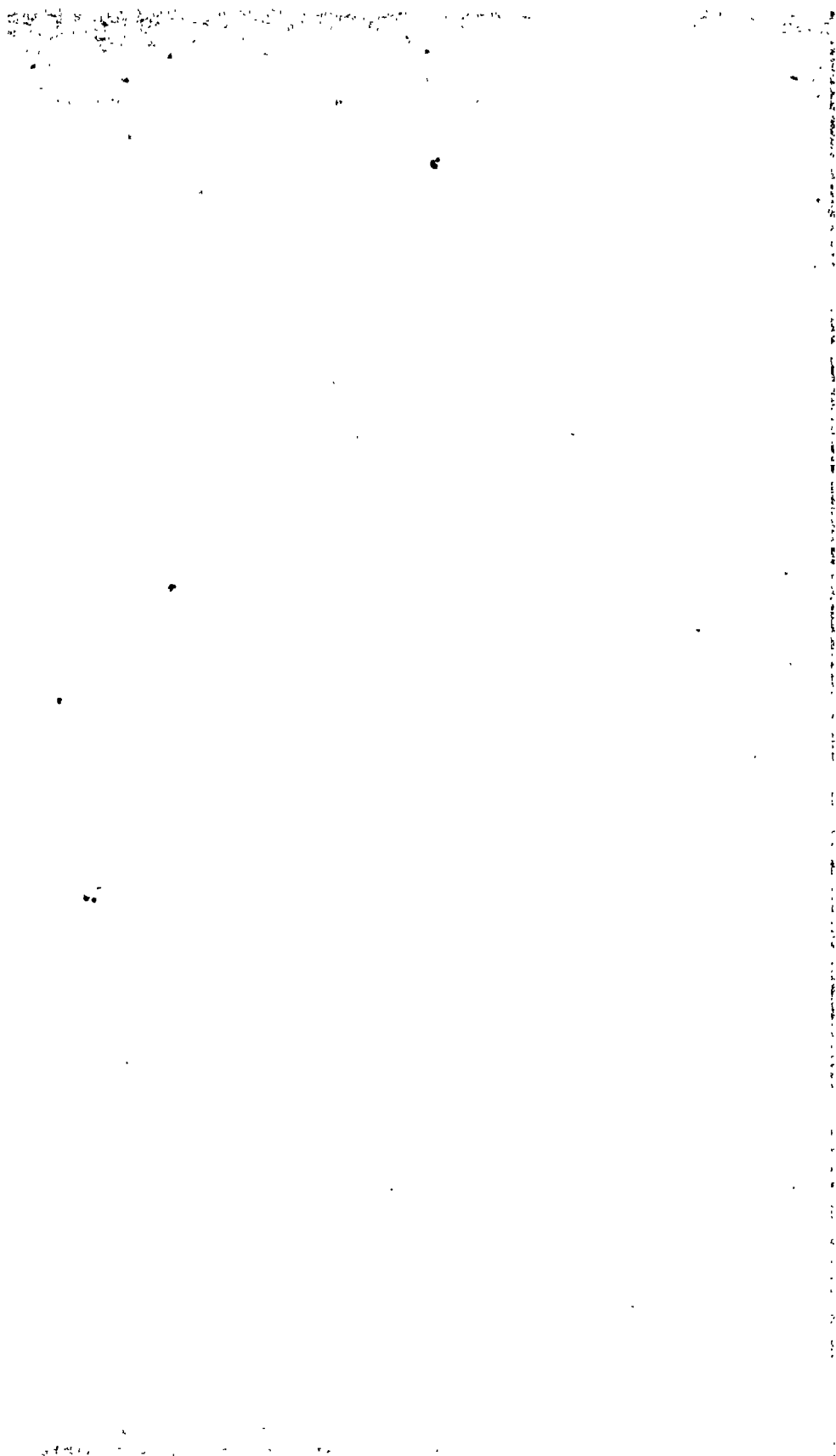
خیال کئے ہوئے تھے۔ کہ کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہ کیا کہ "یہ جانے والے ہیں" "مولانا" چلے گئے اور اب کبھی نہ آئیں گے۔ اس بات نے ایک ہیجان۔ ایک زبردست انتشار اور ایک حشرِ جذبات برپا کر دیا ہے۔ "مولانا" کے بغیر کیا ہوگا؟ پروازِ تخیل مضمحل اور قوتِ فیصلہ بیکار ہو گئی ہے۔

×

رسمِ دنیا اور تعلق خصوصی کا تقاضہ ہے کہ مولانا کے انتقال پر ایک مضمون لکھا جائے لیکن فی الحال یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ

تھی وہ اک شخص کے تصور سے اب وہ رعنائی خیال کہاں

ہر مضمون کے لکھتے وقت مولانا کی پُرعظمت شخصیت سامنے رہتی تھی اور اُنکی یہ ہدایت کہ ملک و ملت اور انسانیت کے لئے افادیت کا کوئی پہلو ہو تو لکھو ورنہ نہ لکھو۔ اسی معیار پر ہر تحریر جانچی جاتی۔ اگر پوری اُترتی تو داد ملتی ورنہ نہیں۔ خود اپنے متعلق تعریف و توصیف کبھی پسند ہی نہ کی۔ کیا مرنے کے بعد بھی اس کی اجازت نہ ہوگی؟ اسلئے نہیں کہ اس سے مولانا کی روح خوش ہوگی بلکہ اسلئے کہ موجودہ اور آئندہ نسلیں اُنکی زندگی سے سبق حاصل کریں۔ اُنکے نقشِ قدم پر چلیں اور اُنکی طرح اپنی زندگی کو بھی ملک و ملت کے لئے کارآمد بنائیں۔

×

تقریباً ساٹھ سال سے مولانا صاحب اپنی ڈائری لکھا کرتے تھے۔ نہایت مفصل اور پابندی کے ساتھ۔ اس ڈائری میں اُنکی زندگی اور زندگی کے کاموں کے متعلق غالباً سب ہی کچھ درج ہوگا۔ لہٰذا جب تک وہ سامنے نہ ہو اُنکی محتاط اور بااصول زندگی کے حالات پر قلم اُٹھانا آسان کام نہیں ہے۔ یوں لکھنے کو جو چاہے لکھدیا جائے لیکن اُسے سندِ اعتبار کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

مولانا سید طفیل احمد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اواخر ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ قریب ۸۰ سال کی عمر پائی۔ کہا جاسکتا ہے کہ کافی جیے۔ آخر کو ایک دن مرنا تھا۔ لیکن یہ روح پرور ہوا اور جاں بخش سورج کی روشنی بھی تو ہزاروں سال بوڑھی ہے۔ کیا ان کا رُک جانا اور بند ہوجانا کوئی گوارا کرے گا۔ آفتاب عالمتاب ہر روز صبح سے شام تک اپنی صحت بخش نور پاشی سے دُنیا کا کاروبار چلانے میں ناگزیر مدد دیتا ہے۔ لیکن مصروفیتِ کار میں نہ کبھی اس کا ذکر کیا جاتا ہے اور نہ اظہارِ شکر۔

چھوٹے چھوٹے کوائف وحوادث ہمیں گھنٹوں مصروفِ ذکر وفکر رکھتے ہیں لیکن وہ خاص سرچشمۂ حیات اور محرک کار کبھی زیرِ غور یا معرضِ گفتگو میں نہیں آتا جس کے بغیر نہ ہمیں کام کرنے کی اُپج ہوسکتی ہے اور نہ ہم کوئی کام کرنے کے قابل ہوسکتے ہیں۔ ایک انتہا درجہ قیمتی اور ضروری چیز کی بہتات طبیعت میں مساوات کی سی کیفیت پیدا کردیتی ہے اور اُس کا 'وجود' ہماری رگ وپے میں کچھ اس قدر رس بس جاتا ہے کہ اُس کے 'عدم' کا خیال ہی حیطۂ تصور میں نہیں آتا۔ لیکن فرض کرو کہ ہماری زندگی میں ایک نامبارک صبح ایسی آئے کہ اُس روز فضائے آسمانی پر سورج نمودار نہ ہو ساتھ ہی یہ بھی بتایا جائے کہ اب وہ کبھی نہ نکلے گا۔ تو بتاؤ کہ کیسا کچھ ہنگامہ اور تلاطم برپا نہ ہوگا اور کیا تم یہ کہہ کر اپنے دل کو صبر دے لوگے کہ "آخر تا بکے۔ ایک دن یہ ہونا ہی تھا۔"

اپنی ملی اور قومی زندگی میں "مولانا" کے وجود باجود کو نادانی سے ہم کچھ ایسا لافانی اور مستقل سا

اُن کی انفرادی خدمتیں۔ جماعتی تنظیمیں۔ تعلیمی، اصلاحی اور اقتصادی تحریکیں۔ بڑے سے بڑے نقصانات اور صدمات کو خاطر میں نہ لانا۔ اور بڑی سے بڑی خوشی کے موقع پر اظہارِ مسرت میں اعتدال و متانت۔ اپنی اور دوسروں کی صحت و تندرستی کی فکر! دنی اور اعلیٰ ہر مسلمان اور انسان کی ذہنی، دماغی اور روحانی، صلاحیتوں کو ابھارنے کی دُھن۔ ایک اور صرف ایک ہی خیال کے ماتحت تھی کہ انکی قوم اُن تمام خوبیوں اور محاسن کی حامل ہو جائے جن کی بدولت دوسری ترقی یافتہ قوموں نے عروج و اقبال کی منزلیں طے کرکے لیلائے آزادی سے ہمکناری حاصل کی ہے مولانا خود اپنے کو کبھی نہ دیکھتے تھے۔ صرف اپنی جد و جہد کے نتائج و اثرات اور ثمرات کو دیکھتے تھے ملکی آزادی اور قومی فلاح و بہبود کی انھوں نے ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کی جس کی وہ خود بنیاد تھی جو آج آنکھوں سے اوجھل خاموشی کے ساتھ زمین کے نیچے دفن ہے۔ جسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اوپر کے خوشنما دیوار و در اور دوسرا سامان آرائش البتہ سب کے سامنے ہے اور صرف اُسی کی تعریف ہوتی ہے۔ مولانا نے ہمیشہ قومی اجتماعات میں خود سب کام کیا لیکن جب پنڈال اور ڈائس سج سجا کر تیار ہو گیا تو نمود و نمایش کی تمام نشستوں پر دوسروں کو بٹھا کر آپ سب سے پچھلی صف میں جا کر کھڑے ہو گئے۔

آج دنیا شہرت و ناموری اور صلۂ خدمات کیلئے جان کھوتی ہے لیکن ہمارے مولانا اسی چیز سے قطعاً بے نیاز بلکہ متنفر تھے۔ اس عادت کو فطرت ثانیہ بنانے کیلئے انھوں نے کیسا کچھ جہادِ نفس نہ کیا ہو گا! اوّل نمبر کے سردار اور جنرل ہونیکے باوجود عمر بھر اپنے ہی بڑھائے ہوئے دوسرے قومی کارکنوں کی ماتحتی میں کام کرتے رہے۔ کسی ذہنی غلامی یا پستی کے سبب سے نہیں بلکہ انتہائی فراخ حوصلگی اور عالی ظرفی کی وجہ سے۔ دوسروں کے بڑے بڑے جلوس

ہماری رائے میں مولانا سید طفیل احمد صاحب بیسویں صدی عیسوی کے دوسرے جمال الدین افغا بانی النظر میں ممکن ہی کہ بعض اصحاب کو ہمارا یہ دعویٰ مبالغہ آمیز معلوم ہو لیکن جس وقت اُنکی تمام تصانیف۔ جملہ متفرق مضامین و مقالات۔ تقاریر کی یاد داشتیں اور اُن کی ذاتِ گرامی فیض یافتہ تعلیمی و سیاسی اداروں کے ریکارڈ۔ نیز ہر مذہب و ملت کے لاکھوں انسانو ر فرداً فرداً اور اجتماعی حیثیت سے بے لوث و بے ریا خدمت گزاریوں کی یادداشت فراہم ہونگی تو پتہ چلے گا کہ کتنا بڑا حکیم وقت۔ مفکر اعظم! و انقلابی شخص ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا

مولانا کی حد درجہ سادہ معاشرت اور غیر معمولی انکسار نے ہمیشہ اُنکے کارناموں پر پردہ رکھا۔ اُن کے ساتھ کام کرنیوالے اور اُن کے قریب ترین احباب و اعزا بھی صرف اُنھیں کو جانتے تھے جو مخصوص اُن سے متعلق ہوتے تھے۔ مولانا کی ہمہ گیر شخصیت کے سا گوشوں اور تمام پہلوؤں کی کسی کو خبر نہیں ہے۔

مولانا طفیل احمد صاحب کی زندگی کا ایک مشن تھا جو ابتدا تعلیمی اور اصلاحی بعد اقتصادی اور آخر میں وہ خالص سیاسی خدمات کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اُن کی شخصیہ اسی مشن کے تحت مختلف ارتقائی شکلیں اختیار کیں۔ اور مقامِ مسرت ہے کہ وہ ہر میں بدرجۂ اتم کامیاب ہوئے اور اُنھوں نے اپنی آنکھ سے وہ تمام تبدیلیاں اور اا دیکھ لئے جن کے وہ دل سے آرزومند اور جن کی دُھن میں وہ انتہا درجہ صبر آزما استقا کے ساتھ دن رات لگے رہتے تھے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بحیرۂ روم کی اسلامی تاریخ

(از مولانا ابرار حسین صاحب فاروقی ایم۔ اے۔ فاضل ازہر انسپکٹر آف اسکولز۔ عثمان آباد۔ دکن)

جس وقت اٹلی نے طرابلس الغرب یا "لیبیا" سے اپنی فوجیں مصری حدود کی طرف روانہ کیں اور مارشل گرازیانی نے مصری حدود میں داخل ہوکر اور مصر کے صوبۂ "لیبیا" پر قبضہ کر کے اٹلی کی طرف سے اپنی فتح کا ڈنکا بجانا شروع کیا۔ اس وقت میں نے ضرورت سمجھی کہ "افریقہ" کے اس مرکز کی مختصر تاریخ لکھ کر ہدیۂ ناظرین کروں۔ جس کی سیاسی اہمیت میں پرانے زمانے سے لے کر اس وقت تک کوئی فرق نہیں ہے۔ بلکہ بمقابلہ پہلے کے اب اہمیت ایک حد تک زیادہ ہوگئی ہے۔ بہرحال افسوس ہے کہ مارشل کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ فتح سراب ثابت ہوگی۔ چنانچہ جنرل ویول برطانوی سالار افواج مشرق وسطےٰ متعینہ مصر نے جب یہ یقین کرلیا کہ اٹلی کا مقصد مصر کو فتح کرنا ہے جس کا عملی ثبوت یہ تھا کہ مصر کے صوبۂ لیبیا کے تقریباً تمام شہروں پر اس کا قبضہ ہوچکا تھا۔ اس وقت جنرل ویول نے جوابی حملہ شروع کیا۔ اور جس علاقہ کو اٹلی نے مہینوں میں حاصل کیا تھا وہ اس سے مع "جرمانے" کے دنوں میں اس نے واپس لے لیا۔ اور پھر آگے بڑھ کر طرابلس الغرب کے نصف علاقہ پر بھی قبضہ کر کے "بن غازی" پر جاکر پڑاؤ ڈال دیا۔

چونکہ اس افریقی حملے کے سلسلے میں روزانہ اخبارات میں مختلف مقامات کے نام آرہے تھے۔ جس سے کان آشنا نہیں تھے۔ اس لئے میں نے اس مختصر تاریخ کا لکھنا ضروری سمجھا تاکہ ناواقف کو واقفیت اور واقف کو مزید معلومات ہوجائے۔ کیونکہ اردو داں طبقہ بالعموم اور دوسرے لوگ بالخصوص اس خطۂ دنیا کی

نکالے جشن منائے اور شاندار تعزیتی جلسے کئے۔ اور خود صرف ایک دینی رہبر و راہِ محبت بنے رہے حتیٰ کہ اپنے انتقال کا بھی کوئی ہنگامہ نہ ہونے دیا۔ علالت نے ترقی کی تو چپ چاپ اپنے دیہاتی وطن منگلور چلے گئے اور وہیں کی خاموش فضا میں سپردِ خاک ہو گئے۔ ~~~ وہ نہیں ہیں جو کسی پر بار ہوں / جنکی بوئے گل سفر ہوگا مرا

لیکن وقت آئے گا! اور ضرور آئے گا جب کہ دنیا **مولانا سید طفیل احمد منگلوری** کی قدر و قیمت کو پہچانے گی اور اُنکی پروان چڑھائی ہوئی اصلاحی و انقلابی تحریکِ ملّی کا سب سے بڑا ہیرو اُنکو تسلیم کرے گی۔ اُنکی بلند پایہ تصانیف کو افرادِ قوم حرزِ جاں بنائیں گے۔ اُنکی سالانہ یادگار منائی جایا کرے گی اور اُن کا مزارِ مبارک کسبِ فیضِ روحانی کے لئے مرجعِ خلائق ہوا کرے گا۔ مرحوم کا ایک تبرک راقم السطور کے پاس بھی ہے۔ جسے اُس کی آیندہ نسلیں فخر و مباہات کے ساتھ عزیز رکھیں گی اور وہ مولانا کے وہ پُرانے سلیپر ہیں جو آخر ایامِ حیات تک اُنکے استعمال میں رہے تھے۔ اکیس[21] سالہ کفش برداری کی جو برکت و سعادت حاصل ہوئی اُس کی اس سے بہتر یادگار اور کیا ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔ !!!

اب اس سے زیادہ لکھنے کی ہمت نہیں ؎

نہ کرتا کاش نالہ۔ مجھکو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

سید الطاف علی بریلوی

"تونس" کے نام سے مشہور ہوا۔ اور اس کے بعد پورے بر اعظم کا نام "افریقہ" رکھ دیا گیا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ رومیوں اور ان کے بعد عربوں نے عرصہ دراز تک "تونس" کو "افریقہ" ہی لکھا اور کہا اس کے بعد یہ خاص نام تمام بر اعظم کا نام ہو گیا۔ البتہ رومیوں نے اپنے زمانہ میں اس بر اعظم کے ایک مخصوص خطے کو جو "افریقہ" کے علاوہ تھا۔ "لیبیا" یا "لوبیا" سے بھی موسوم کر دیا تھا۔ چنانچہ اب بھی مصری صوبہ کا نام "صحرائے لوبیہ" ہے۔ جس کو صحرائے مغرب سے موسوم کیا جاتا ہے اور جس کا مستقر "مرسیٰ مطروح" ہے جو بعد میں "ملک تونس" کے نام سے مشہور ہوا۔ جس کی وجہ مورخین نے یہ لکھی ہے کہ حکومت موحدین نے جب پورے شمالی افریقہ پر قبضہ کیا تو ۶۲۵ھ میں "تونس" کو ایک صوبہ قرار دیکر اس پر قبیلہ "بنو حفص" کے ایک شخص کو صوبہ دار کیا اور "تونس" کو اس کا مستقر ٹھہرایا۔ فی الحقیقت نہ صرف "تونس" کی آبادی اور رونق بلکہ پورے اس علاقہ کی رونق قبیلہ "بنو حفص" کی رہینِ منت ہے جنھوں نے اس کی فلاح و بہبود میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ نہ صرف صوبہ داری کے زمانہ میں بلکہ اعلان خود مختاری کے بعد بھی نسلاً بعد نسلٍ "تونس" کے ہر گونہ ترقی میں مصروف رہے اور کبھی رعایا و برایا کے فلاح و صلاح سے غافل نہ ہوئے جس کا ذکر آئندہ اوراق میں نسبتاً تفصیل سے آئے گا۔

طرابلس کا وجہ تسمیہ لفظ طرابلس چونکہ معرب ہے اس لئے اس کو "ط" سے لکھا گیا۔ اصل لفظ "تری پولی" یا "تری پولس" ہے۔ "تری" بمعنی تین اور "پول" بمعنی شہر یا قصبہ کے ہیں۔ بمعنی "تین شہر" یا "تین آبادیاں" علامہ یاقوت الحموی کا بھی قریب یہی قول ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

> اس کو اطرابلس بھی کہتے ہیں۔ رومی اور یونانی میں اس کے معنی "تین شہر" کے ہیں۔ یونانی اس کو "طرابلیطہ" بھی کہتے تھے کیونکہ "طرا" بمعنی تین اور "بلیطہ" بمعنی شہر کے ہیں۔

بہر حال خواہ بقول یاقوت اس کو "بلیطہ" کہا جائے یا "پول" ہر حالت میں شہر کے معنی ہیں، اور اس اعتبار سے تین بستیوں کے مجموعہ کا نام عددی ہی رہنے دیا گیا اور جیسا کہ دستور ہے کہ کسی بسانے یا آباد کرنے والے کے نام سے شہر یا قصبہ کو موسوم کیا جاتا ہے ایسا نہیں کیا گیا۔ یاقوت ہی کے بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس جگہ کو قیصر اول شہنشاہ روم نے آباد کر کے اس کا نام "لوگوں کا شہر" رکھ دیا تھا۔ اغلباً یہی وجہ ہے کہ بعد کے لوگوں نے بھی اس کو بے نام ہی رکھا اور بستیوں کی تعداد پر جو

قدیم اور جدید تاریخ سے کما حقہ باخبر نہیں ہیں۔ جس کا سب سے بڑا سبب "فرنگ پسندی" ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانے کے تعلیم یافتہ نہ صرف انگلستان کی تاریخ سے ایک حد تک واقف ملیں گے بلکہ انگریزی کے ذریعے اس کی ہمسایہ قوموں کی بھی تاریخ سے لگاؤ رکھتے ہوئے ملیں گے۔ لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ وہ اپنے اور اپنے ہی ملکوں کی تاریخ سے بے بہرہ ہوں گے۔ اور اگر ان کو بہرہ ہوگا بھی تو بواسطہ انگریزی ہوگا جو ناقص بھی ہوگا اور بعض حالات میں غیر صحیح بھی جس کا اصلی سبب یہی ہے کہ قوموں کی بیداری کے جو طریقے ہیں۔ اس سے ہم لوگ محروم ہیں۔ تمام دُنیا کا دستور ہے کہ اہل ملک پہلے اپنے ملک اور اپنوں کے حالات سے کامل طور پر واقف ہوتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے ملکوں اور دوسروں کے حالات کا پتہ چلاتے ہیں۔ لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ بہرحال لیبیا کی یہ جنگ میرے لئے محرک ہوئی کہ میں تجربۃً اس کی مختصر جنگی و سیاسی تاریخ لکھ کر اردو داں طبقہ کو وہاں کے اسلامی حالات قدیم و جدید سے روشناس کرا دوں۔

لفظ "مختصر" کے بعد میری رائے میں فروگذاشت یا فروگذاشتوں کے لئے معذرت کا سوال ہی نہیں اُٹھ سکتا۔ اس لئے مجھے ناظرین "معنف" سے توقع ہے کہ ہر فروگذاشت کو وہ "مختصر" کا نتیجہ سمجھیں گے اور تفصیلی معلومات کے لئے مستند مصنفوں سے استفادہ کریں گے جن میں سے بعض کے حوالے میں نے دیدئے ہیں۔

محمد ابرار حسین

جو خطہ کہ اس وقت لیبیا کے نام سے مشہور ہے اس کو قدیم عرب جغرافیہ دانوں نے "لوبیہ" لکھا ہے چنانچہ یاقوت الحموی نے "معجم البلدان" میں لکھا ہے کہ یہ "اسکندریہ" اور "برقہ" کے درمیان ایک شہر کا نام ہے۔ اِس کے علاوہ ابو ریحان البیرونی نے جو مسلم الثبوت مورخ اور جغرافیہ داں تھا۔ لکھا ہے کہ یونانیوں نے دنیا کی آبادی کو تین حصوں پر منقسم کیا تھا جن میں سے ایک کو "لوبیہ" کہتے تھے جس کے جانب مغرب بحر اوقیانوس، جانب شمال بحر مصر، جانب جنوب بحر حبش، اور جانب مشرق بحر قلزم جس کو بحر سوف بھی کہتے ہیں اور جو بحر احمر بھی کہلاتا ہے۔ دوسرے حصہ کو "اوروفی" اور تیسرے حصہ کو "ایشیا" کہتے تھے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان تین مشہور براعظموں کے ناموں میں "افریقہ" کا ابتدائی نام "لوبیا" تھا۔ بعد میں جب فونیقین اس حصۂ دنیا میں آکر پناہ گزیں ہوئے تو انہوں نے اس مخصوص جگہ کا نام جہاں خود آکر آباد ہوئے تھے "افریقیہ" رکھا جو بعد میں

میں تہذیب کا کوسوں پتہ نہ تھا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اُن کی اور وحشی جانوروں کی زندگی میں کچھ فرق
ں تھا۔ اولادِ سام یا بنو کنعان نے اپنے وطن سے نکل کر افریقہ کے شمالی اور مشرقی حصہ پر پورا
قبضہ کرلیا۔ چنانچہ مصر کے فرعون" افریقہ" کے قرطاجنی اور "ایتوپیا" کے حبشی وہ فرزندانِ سام تھے
وں نے نہ صرف حکمرانی کی بلکہ ان علاقوں کو اپنا وطن بنا کر صحیح معنوں میں وطن اور اہلِ وطن کی پوری
ی خدمت بھی کی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ مصر کے اصلی باشندے جن کو "اہلِ توبہ" کہتے ہیں بھاگ کر
ائی نیل کے دور و دراز علاقہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ بربر بھاگ کر اندرونِ جزائر و مراکش کے
نگلوں اور صحراؤں میں جا چھپے۔ زنگیوں نے حبش کے پیچھے خطِ استوا میں جاکر پناہ لی۔ غرضکہ ان سب نے
ی پناہ کے لئے وسط افریقہ کے مختلف خطوں کو شاید اس لئے منتخب کیا تھا کہ وہ خطے اپنے میں انسانی
اش و معاشرت کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے، جہاں کوئی حملہ آور حملہ کر کے اپنی قوت اور استعداد
ضائع کرتا۔ بہر حال اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ کل اہلِ توبہ، یا بربر، یا زنگی بھاگ گئے۔ بلکہ بعض
سے بھی تھے جو رہ گئے اور اُنھوں نے اِن میں رل مل کر دُنیا، تمدن میں اپنا نام اور کام روشن
ہا۔ جس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

عہد قرطاجنہ کی سیاسی اور معاشی تاریخ بیان کرنے سے قبل لفظ "قرطاجنہ" کا تجزیہ اور اُس کا
جمالی جغرافیہ بھی بیان کرنا ضروری ہے۔ فی الحقیقت "تونس" یا قدیم نام "افریقہ" کے نواح میں ایک
انا شہر تھا جس کو "قرطا" کہتے تھے چونکہ چمنوں اور باغوں کی وجہ سے چمنستان بن گیا تھا، اس لئے لفظ
"قرطا" کے ساتھ بقول یاقوت حموی "جنہ" (بمعنی باغ) کے لفظ کا اضافہ کردیا گیا۔ اس نام کا ایک شہر
ہسپین میں بھی ہے جو "قرطاجنہ خلفاء" کے نام سے مشہور تھا، یہ خلفاءِ اندلس کا آباد کیا ہوا تھا اور اصل
قرطاجنہ کے نمونہ پر بنایا گیا تھا۔

بحوالہ اطلیموس یاقوت حموی کا قول ہے کہ قرطاجنہ کا طول البلد ۳۴ درجہ اور عرض البلد
۳۲ درجہ تھا، بحیرۂ رُوم کا یہ ساحلی شہر بہت بڑا تھا جس کی شہر پناہ سفید سنگ مرمر کی بنائی گئی
تھی۔ اس کے علاوہ مختلف الاقسام سنگِ مرمر کے لاتعداد ستون تھے جن کا شمار ممکن نہیں۔ چنانچہ
یاقوت حموی کا بیان ہے کہ جس وقت مسلمانوں کا وہاں قبضہ ہوا اور قرطاجنہ جو رومیوں کے زمانے سے
برباد ہو رہا تھا مزید برباد ہوا تو اس برباد شدہ ملبے و پتھروں سے کئی شہر تیار کئے گئے۔ یاقوت حموی نے

حقیقت "تھیں اس کا نام بدل دیا۔ گویا نام بھی نہ ہوا اور نام بھی ہو گیا۔ اس نام کے دو شہر ہیں، ایک افریقہ میں ہے جس کا ذکر اُوپر کیا گیا۔ دوسرا بیروت کے شمال میں، ملک شام میں ہے۔ یہ دونوں شہر بحیرۂ رُوم کے مغربی اور مشرقی ساحلی شہر ہیں۔

تُونس کی اداری تقسیم

تونس کی تاریخ کو اصولی طور پر حسب ذیل چھ زمانوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے:-

۱- عہد قرطاجنہ، ۲- عہد رُومی، ۳- عہد عربی اسلامی،
۴- عہد عثمانی، ۵- عہد بابات، ۶- عہد فرانسیسی،

ان عہدوں میں صرف پہلا عہد "آزاد" کہا جاسکتا ہے۔ باقیماندہ عہدوں میں تیسرا ضرور ایسا عہد ہے جس میں سے کم و بیش ایک سو سال کے زمانہ کو آزاد زمانہ شمار کیا جاسکتا ہے، باقیماندہ زمانہ اور عہود کسی نہ کسی کی ماتحتی میں گزرے۔ ہر عہد کی اجمالی تفصیل سے یہی واضح ہوگا کہ ملکوں کی ترقی کا جہاں تک تعلق رہا زمانہ سلف میں اس میں آزاد اور غیر آزاد حکمران دونوں برابر کے حصہ دار ہوتے تھے یہ کبھی نہیں ہوا کہ ملک نے آزادی کے زمانہ میں تو ترقی کی ہو اور محکومیت کے زمانہ میں ترقی نہ کی ہو فی الحقیقت زمانۂ امن میں ملک کی رفتار ترقی میں کبھی کمی نہیں ہوئی۔

۱ عہد قرطاجنہ

قرطاجنہ کے عہد کی تاریخ نویں صدی قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے۔ یہی وہ مشہور عہد ہے جس میں فلسطین کے مفرورین فونیقین[1] نے ایک صحرا کو گلستاں بنایا، وحشت کو تہذیب کا جامہ پہنایا، اور انسانیت کے مفہوم سے وہاں کے لوگوں کو واقف کیا۔ ورنہ اس سے قبل وہ سرزمین دوسرے حصۂ افریقہ کے مانند نہ صرف بربری قوم کا مسکن تھی بلکہ حقیقی بربریت کا آماجگاہ تھی۔ شامیوں یا سامیوں کا جن کو فونیقین بھی کہتے ہیں یہ احسان تمدن صرف بربری خطہ پر ہی نہیں رہا بلکہ مصر بھی اس احسان کا رہین منت رہا۔ چنانچہ اس واقعہ سے کچھ صدی قبل جب سامی لوگ اپنے ملک سے نکل کر مصر میں آئے تو مصر کے اصل باشندے ان کی تاب نہ لاکر وہاں سے بھاگ گئے اور اپنا ملک ناخواندہ مہمانوں کی گویا خدمت کے لئے چھوڑ گئے۔ افریقہ کا پورا براعظم ان بربر اور زنگی قبائل کا مامن تھا

---

[1] فونیقیہ کے رہنے والے شامی اور کنعان کی اولاد تھے جس وقت ان کا بادشاہ "جالوت" جس کو گلیاتھ بھی کہتے تھے، حضرت داؤد علیہ السلام کے مقابلہ میں قتل ہوا جس کا اشارہ قرآن پاک نے بھی کیا ہے۔ اس وقت یہ سب لوگ اپنے وطن فونیقیہ (فلسطین) سے بھاگ کر افریقہ کے مختلف حصوں میں آکر نہ صرف بس گئے بلکہ حکمرانی بھی کرنے لگے۔ ("فتوح المغرب" صفحہ ۱۵)

برائے نام ساحلی جانب سے حملہ کر دیا۔ اُنھوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ ساحلی حملہ حقیقی ہے۔ اس کو روکنے کے لئے جتنی لکڑیاں جمع کی تھیں ان میں آگ لگادی اور اس طرح سے اپنے زعم میں انھوں نے رُومیوں کے حملہ کو روک دیا، رُومیوں کی یہ چال کامیاب ہوئی اور اس عرصہ میں جبکہ اہلِ قرطاجنہ جانب ساحل متوجہ اور مصروف تھے، رُومی دوسری جانب سے حملہ کرکے شہر میں داخل ہو گئے اور اُنھوں نے اس کے بازار پر قبضہ کر لیا، اہل شہر نے جب یہ دیکھا تو وہ بھاگ بھاگ کر قلعہ میں پناہ لینے لگے، رُومی انکا پیچھا کرتے تھے اور مکانوں کی چھتوں سے اُن پر پتھروں کی بارش ہو رہی تھی۔ غرضکہ وسط شہر میں ایسی جنگ ہوئی کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ زخمیوں کی آہوں، عورتوں کی چیخوں، اور بچوں کے بلکنے سے فضا گونج رہی تھی۔ لیکن رُومیوں نے ان کے مصائب کی ذرا پروانہ کی اور وہ نعرے لگاتے ہوئے قلعہ میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد کامیاب و کامران سیپیو نے شہر میں آگ لگوادی جس کی لپٹ آسمان تک پہونچ رہی تھی۔ بوڑھے مردوں اور عورتوں اور بچوں نے گھروں سے بھاگ کر آگ سے بچنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ کیونکر ممکن تھا، کیونکہ اگر اتفاقاً کوئی آگ سے بچ جاتا تو تلوار کے گھاٹ اُترتا۔ غرضکہ یہ آگ چھ شبانہ روز جاری رہی، ساتویں روز قلعہ میں محصور قرطاجنیوں نے رُومیوں کے سرلشکر کو عرضہ بھیجا کہ اگر ان کو جان کی امان دیجائے تو وہ قلعہ سپرد کر دیں گے۔ یہ درخواست سیپیو نے اس شرط کے ساتھ منظور کی کہ محصورین قلعہ کو تو امان دیدیا جائے گا، لیکن اُن لوگوں کو تہہ تیغ کر دیا جائیگا جو "حسدروبال" کی سرکردگی میں "ادسکولاپیوسس" کے گرجا میں چھپ گئے اور جن کی تعداد نو سو تھی۔ یہ گرجا ایک بلند اور ناقابل گزر پہاڑی پر تھا۔ ایک عرصہ تک وہ محفوظ و محصور رہے، لیکن آخر کب تک تکلیف اور بھوک کے مصائب کو برداشت کرتے رہتے۔ آخر اُن کا لیڈر حسدروبال دفعتاً اس گرجا سے نکل آیا اور اس نے اپنے تئیں سیپیو کے سپرد کیا۔ سیپیو نے اس کو اپنے قدموں کے نیچے بٹھایا جس کو گرجا کے محصور دیکھ رہے تھے اور اُس پر لعنت برساتے ہوئے خیانت، بزدلی اور غداری کا اس کو مجرم ٹھیرا رہے تھے۔ آخرکار جب وہ سب کے سب مایوس ہو گئے تو اُنھوں نے خود گرجا میں آگ لگادی اور جل کر خاک ہو گئے۔ اُنھوں نے فی الحقیقت عربی کے اِس مشہور مقولہ کو اپنے عمل سے سچا ثابت کر دیا "النار ولا العار" یعنی نار کو عار (ننگ) پر ترجیح ہے۔

حسدروبال کی بیوی اور بچوں کا دردناک انجام اس واقعہ سے بھی زیادہ سخت ہے۔ ایک

لکھا ہے کہ "تونس وہاں سے بارہ میل تھا" حموی کے زمانہ میں ایک میل کی مسافت کتنی ہوتی تھی،
متعلق معجم البلدان خاموش ہے۔ اس کا صحیح اندازہ انھیں لوگوں کو ہو سکتا ہے جنھوں نے قرطاجنہ کے
کو دیکھا ہے۔ چنانچہ اُس کا "کول کم"[1] اِس کی عظمت و شان کا اب بھی شاہد ہے۔ بہر حال یہ ضرور ہے
قرطاجنہ کے ملبے اور پتھروں سے اور شہروں کے مانند تونس بھی تعمیر کیا گیا۔ غرضکہ قرطاجنوں نے سب
شمالی افریقہ کے غربی حصّہ کو آباد کیا جس کو عربوں نے مغرب کہا اور لکھا اور وہاں کے رہنے وا
مغاربہ یا مغربی۔

یہ ساحلی شہر آباد اور رونق پذیر ہونے کے بعد اگر رومیوں کے دندان آز کو تیز نہ کرتا تو تم
بحیرۂ روم کی ان دونوں ہمسایہ طاقتوں اور قوموں میں بجائے اس کے کہ کوئی معاہدۂ دوس
یا "میثاق عدم تعدی" ہوتا، رومیوں نے اپنی طاقت کے زعم میں کچھ عرصہ کے بعد قرطاجنہ کی آباد
سرزمین پر حملے شروع کر دئے جن کا قرطاجنوں نے خوب مقابلہ کیا اور ایک عرصہ تک رومیوں کو کا
نہ ہونے دیا۔ لیکن تابکے۔ یہ پے بہ پے جنگیں ایسی نہ تھیں جو حملہ آوروں کے لئے کامیابی کی د
نہ ڈالتیں۔ چنانچہ جس وقت رومیوں نے آخری حملہ زیر سرکردگی کمسن جنرل سیپیو نامی قرطاجنیوں
اُن کے مشہور لیڈر اور جنرل ہان بال نے جان توڑ مدافعت کی لیکن آخر کار سنہ ۱۴۶ قبل مسیح میں اس کو
ہوئی اور قرطاجنوں کی سات سَو سالہ حکومت پاش پاش ہوگئی اور اس طرح سے ملک پر رومیو
ہوگیا۔ مورخین نے اس آخری جنگ کو کافی تفصیل سے لکھا ہے۔ لیکن چونکہ یہ مختصر مقالہ اس تفصیل
نہیں ہو سکتا ہے اس لئے اس کے اجمال ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے کہ ر
نے زیر قیادت سیپیو قرطاجنہ کو کامل دو سال تک محصور رکھا، اس کے بعد ایسی سخت ناکہ بند
ان کی رسد و امداد سب بند ہوگئی اور اس طرح سے انھوں نے اپنے حصار کو اور سخت کر دیا۔ اِس
انھوں نے نہ صرف خشکی کے راستہ کی ناکہ بندی کی بلکہ اُن کے بحری تعلق کو بھی منقطع کر دیا جس کی
جنرل سیپیو نے یہ کی کہ ابنائے قرطاجنہ کو پتھروں سے پاٹ کر اس کو ان کے لئے بے کار کر دیا۔
اہل قرطاجنہ ہر چہار طرف سے محصور اور مجبور ہو گئے۔ اس تدبیر کے بعد ایک جنگی چال یہ چلی کہ قرط

---

[1] اس کو عربی میں "قلم" کہتے ہیں اور جس کو انگریزی میں "جمنازیم" کہا جاتا ہے۔ شہر تونس سے کچھ دور اس تماشہ گاہ کے آثار اب
ہیں جہاں دلہم اپنی عظمت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ "قلم" کے معنی مجمع کے ہیں۔ مثلاً ہم خیمہ جو لوگ اس مکان میں تماشہ دیکھنے کے لئے جمع

اب قرطاجنی و رُومی گھُل مل گئے تھے۔ عیسائیت نے پہنچ کر دونوں کی اخلاقی اور تمدنی حالت کو سنوارا تھا اور اس طرح سے ملک پھر ترقی کرنے لگا۔

غرضکہ رُومیوں نے چوتھی صدی تک وہاں حکمرانی کی، اس کے بعد پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں جب جرمنی قبائل "ونڈالیون" نے جن کے نام سے "اندلس" موسوم ہے، رُومیوں پر غلبہ پایا تو اُنھوں نے افریقہ بھی فتح کر لیا۔ لیکن یہ وہ عارضی فتح تھی جس کی بقا ایک صدی بھی نہ رہی اور چھٹی صدی کے شروع ہی میں رُومیوں نے اپنی کھوئی ہوئی عظمت و سطوت واپس لے کر افریقہ سے ونڈالیوں کو ہمیشہ کے لئے نکال دیا اور اُس وقت تک حکمرانی کی جب تک کہ عرب وہاں نہ پہونچے۔

عہدِ عربی ۳

. . . . رُومیوں کی افریقہ میں یہ دوسری فتح اُن کی افریقی اور مشرقی حکومت کے زوال کا پیش خیمہ تھی۔ دوسری فتح کے بعد افریقہ میں رُومیوں کو حکومت کرنے کے لئے کم و بیش اس قدر زمانہ ملا جتنا زمانہ ونڈالیوں کو ملا تھا۔ چنانچہ چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں یعنی ۱۸ھ سے ۲۲ھ تک حضرت عمرو بن العاص نے نہ صرف پورا فلسطین اور مصر فتح کیا بلکہ برقہ و طرابلس فتح کر کے افواج اسلامیہ کے لئے مغرب کا دروازہ کھول دیا

یہ عہدِ خلافت سوم ۲۶ھ میں حضرت عبداللہ بن سعد و حضرت عبداللہ بن نافع وغیرہ دوسرے ممتاز صحابیوں نے نہ صرف باقیماندہ شمالی افریقہ پر یورش کی بلکہ اُندلس تک بھی پہونچے اور خراج پر مصالحت کر کے واپس آگئے۔ لیکن ۴۵ھ و ۵۰ھ میں بنو امیہ کے سالاروں نے ان فتوحات کی تکمیل ہی نہیں کی بلکہ اُن کو فتح کر کے تمدن اور رونق سے مالا مال بھی کر دیا۔

چنانچہ عقبہ بن نافع الفہری جو فاتح مغرب کہلاتے ہیں "قیروان" کے بانی ہیں یہ مقام وہ جنگل تھا جہاں سوائے درندوں کے کسی دوسرے کا گزر نہیں تھا۔ سب سے پہلے ڈیرے اور خیموں سے اُنہوں نے اسلامی چھاؤنی قائم کی اس کے بعد اس کو شہر اور بہترین شہر کر دیا متقدمین فاتحین کا یہ دستور تھا کہ وہ مفتوحہ ممالک کی رونق اور مدنیت پر غیر معمولی توجہ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ افریقہ اور اندلس وغیرہ کے بیشتر شہروں کے نام ان کے تمدنی کارناموں کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ بحری جنگ کا سلسلہ ۳۰ھ یعنی چھٹی صدی عیسوی کے ابتدا سے شروع ہو چکا تھا جبکہ خلیفہ سوم کے زمانہ میں حضرت امیر معاویہ اور حضرت عبداللہ بن سعد نے مل کر مشہور جزیرہ "قبرص" فتح کر لیا تھا یہ وہ بحری فاتحانہ اقدام تھا جس نے مسلمانوں کو

مورخ نے لکھا ہے کہ اس کی بیوی مع اپنے دونوں بچوں کے اس کے پاس اُس وقت آئی جبکہ وہ شپیو کے قدموں کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ سب سے پہلے اُس نے شپیو کو یہ کہہ کر مخاطب کیا:۔

"اے رُومیو تم پر خدا کی مار کہ تم نے تو بے غدار کیا اور ہم کو ہلاک کیا۔ لیکن قرطاجنہ کا خدا حسنہ روبال کو سزا دے گا جس نے مجھ سے اور اپنی اولاد سے اور اپنے خدا سے غداری کی۔"

اس کے بعد اسی غیظ و غضب کے انداز میں وہ اپنے خاوند سے اس طرح مخاطب ہوئی:۔

"اے بدبخت غدار تجھ پر لعنت ہو تو دنیا میں سب سے زیادہ بزدل ہے۔ اے قرطاجنیوں کے سردار! جب تو اس آگ کو دیکھ چکا تھا جو مجھ کو اور تیرے ان دونوں بچوں کو جلائے گی تو پھر تیرے لئے کیا باقی رہا تھا۔ جس شخص کے قدموں کے نیچے تو پڑا ہے اس کے انتقام سے تجھ کو اب کون سی چیز بچا سکتی ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے دونوں بچوں کو ذبح کر کے آگ میں پھینکا، پھر خود بھی کود پڑی۔

۲ عہدرومی

قرطاجنیوں کی تباہی و بربادی کے بعد رُومیوں نے اس زرخیز خطۂ قرطاجنہ پر قبضہ کر کے شمالی افریقہ کی اپنی دوسری نوآبادیات میں اس کو شامل کر لیا۔ جو صوبہ افریقہ کے نام سے مشہور ہوا۔ عیسائیت کے ابتدائی زمانہ میں رُومیوں کی تاریخ میں افریقہ کا بہت بڑا مرتبہ ہے حتیٰ کہ اہمیت میں اس کو اٹلی پر فوقیت حاصل تھی۔ اس لئے کہ عیسائی لاطینی ادبیت نے اس سرزمین میں نشوونما پائی۔ وہ قرطاجنی یا بربری ہی تھے جنھوں نے عیسائیت قبول کرنے کے بعد زبان و قلم سے نہ صرف تبلیغ کی بلکہ مذہب پر قربان بھی ہو گئے۔ چنانچہ مصر کے مشہور اہل قلم جورجی زیدانی نے لکھا ہے کہ "ترتولیان" نے جو ایک بُت پرست تھا عیسائیت قبول کر کے لاطینی ادب میں چار چاند لگا دئے۔ اور زبان و قلم سے عیسائی مذہب کی تبلیغ کرتا ہوا ۲۴۰ء میں اس پر قربان ہو گیا۔ اسی طرح ایک شخص "سیربان" تھا جس نے ۲۴۶ء میں عیسائیت قبول کی تھی۔ اس نے تو اتنی ترقی کی۔ کہ وہ بڑا پادری ہو گیا تھا۔ اس کی کثرت سے تصانیف بھی ہیں۔ بہرحال آخر میں بزمانہ "والریان" اس پر سختیاں کی گئیں اور اس کو قتل کر دیا گیا۔ ان دو کے علاوہ "ارنوبیوس" "لکتانیوس" اور "اوگستینوس" وغیرہ بھی مشاہیر کلیسہ شمار کئے جاتے تھے۔ غرضکہ عیسائیت نے جو شمالی افریقہ کے قبضہ کرنے کے تقریباً دو صدی کے بعد رُومیوں میں آئی ایک طرف رومیوں میں انسانیت اور تہذیب پھیلائی تو دوسری طرف قرطاجنیوں میں جو محکوم تھے۔ مزید روشنی اور ترقی پیدا کی۔ اس کے علاوہ حاکم و محکوم کی اُس خلیج کو بھی پاٹا جو اختلاف مذہب یا بالفاظ دیگر لامذہبیت کی وجہ سے ان کے درمیان تھا۔

البتہ اس پر عمل کرنے کے لئے مدبرین کی ضرورت تھی۔ جو ان میں پیدا ہو چکے تھے۔ یہ کون نہیں جانتا ہے کہ بعثت نبوی سے قبل سوائے اس حصہ کے جہاں بعثت نبوی ہوئی تھی، باقیماندہ تقریباً کُل ممالک مشرقی یا مغربی یورپ کے حکمرانوں کے ماتحت تھے۔ چنانچہ شام وایشیا کوچک وغیرہ قسطنطنیہ کے ماتحت تھے اور مصر و شمالی افریقہ رُودیۃ الکبریٰ کے ماتحت۔ بحیرۂ روم کی یہ مشرقی اور مغربی دونوں حکومتیں اس حصۂ عرض کی مالک تھیں۔ اور دوسرے حصۂ مشرق کی ملکیت کاسرہ (فارس) کے نام لکھی ہوئی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے مدبر اعظم نے "اخرجوا الیھود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب" (یہود ونصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے باہر کر دو) کا حکم محکم ارشاد فرما کر صرف اس حصہ کو اُس مخصوص مذہب کے لئے مخصوص فرما دیا جس کے لئے یہ کہنا صحیح ہے ؎

ملتِ بیضا نے قوموں کی مٹا دی تھی تمیز!!
تھے بلالؓ و جعفرؓ و سلماںؓ برابر محترم

تاکہ دُنیا کو یہ معلوم ہو جائے کہ دُنیا بھر میں صرف ایک خطہ پاکستان ہو سکتا ہے خواہ وہاں زنگی رہے یا ایرانی یا عرب۔ البتہ مذہب ان کا اسلام ہو اور وہ خطۂ جزیرہ العرب ہے۔ اس مختصر جزیرہ کو جماعت اسلامیہ کے لئے مخصوص فرما کر "سیروا فی الارض" (دُنیا میں پھرو) کا وہ حکم محکم سُنا دیا جو توسیعی اسکیم کا بنیادی تخم تھا۔ یہی وہ اعلیٰ سیاست تھی جس نے آناً فاناً مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک مسلمانوں کو بحیثیت مُصلح دین و دنیا بحیثیت فاتح اور بحیثیت مبلغ پہنچا دیا یہی وہ افضل تدبر تھا جس نے مسلمانوں کو غیروں میں رہنے کے قابل بنایا تھا۔ دوسروں کی مدد کے لئے تیار کیا تھا۔ کمزور پر رحم کرنا اور زور آوروں کو زیر کرنا سکھایا تھا۔

اس حدیث سے دو باتیں صاف واضح ہوتی ہیں۔ اوّل یہ کہ پاکستان بنانے کا حق سوائے ایک کے اور کسی کو نہ حاصل تھا اور نہ ہو سکتا ہے جو خود بھی پاک تھا اور جس نے اپنے گرد و پیش کو بھی پاک کر دیا تھا تاکہ اس سرزمین پر اجنبی۔ یعنی غیر شرعی داخل ہو کر اس کی اعلیٰ مرکزیت کو صدمہ پہنچانے کی کوشش نہ کر سکیں۔ اس کے علاوہ گو اور سرزمین بھی مقدس تھیں اور جن کا فتح کرنا مسلم تھا لیکن ان مقامات کے لئے پاکستان کا حکم نہ ہوا۔ بلکہ ایک حد تک اس کے برعکس یہ حکم ہوا کہ مسلمان ان تمام لوگوں کے جان و مال کی محافظت کریں۔ خواہ کسی مذہب و ملت کے لوگ ہوں۔ جو وہاں رہتے ہوں یا آ کر رہیں۔ یہ حکم صرف امن ہی کے

نویں صدی عیسوی میں مشرقی و مغربی بحیرۂ روم کا مالک بنا دیا۔ چنانچہ ابن خلدون اس عہد کے بحری سیادت کی ان الفاظ میں تعریف کرتا ہے :۔

"عہد حکومت اسلامیہ میں مسلمانوں نے پورا بحیرۂ روم فتح کر کے اس پر اپنا سکہ بٹھا دیا۔ اور عیسائی حکومتو کے پاس اس سمندر میں کسی قسم کا بیڑا نہیں تھا۔ مسلمان لشکری رات دن سمندر میں تسخیر کے لئے پھرتے رہتے تھے ان کو فتح اور مالہائے غنیمت کے مقامات کا علم رہتا تھا۔ چنانچہ سواحل کے علاوہ جتنے جزائر تھے انھوں نے ان سب پر قبضہ کر لیا تھا۔ مثلاً جزائر البلیار (مایورقہ۔ منورقہ وغیرہ) یابسہ۔ سوڈانیہ۔ صقلیہ۔ قومرہ۔ مالطہ (مالٹا) اقریطش (کریٹ) قبرص مع تمام مقبوضات روم و فرانس۔

ابوالقاسم شیعی مع اپنے فرزندوں کے مہدیہ سے اپنے بیڑے کو نکال کر جزیرہ جنوہ میں جنگ کیا کرتا تھا اور وہاں سے مظفر و منصور مع مال غنیمت لوٹتا تھا۔ اس کے علاوہ مجاہد عامری نے ۴۰۵ھ میں اپنے بیڑے کے ذریعے سے جزیرہ سوڈانیہ فتح کیا۔ جس کو عیسائیوں نے قیمت دے کر واپس لے لیا تھا۔ غرضکہ مسلمانوں نے اس پورے زمانہ میں اس سمندر کے بیشتر حصہ پر قبضہ جما لیا تھا اس لئے ان کے بیڑے اس میں پھرا کرتے تھے۔ اور اسلامی لشکر بیڑوں میں بیٹھ کر صقلیہ سے بڑے سمندر تک جو اسپین اور شمالی افریقہ کے مقابل ہے جایا کرتا تھا۔ وہاں شاہان فرنگ سے مڈبھیڑ ہوتی تھی اور اُن کے ممالک مغلوب ہوتے تھے۔"

غرضکہ نویں صدی عیسوی میں مسلمان بحیرۂ روم کے بلا شرکتِ غیرے ایک مدت تک مالک تھے مشہور ملکۂ عالم "رُومتہ الکبریٰ" کی شان و شوکت "اغلبوں" کے سامنے ماند پڑ چکی تھی، جنھوں نے یہ زمانہ ابوالعباس اغلب امیر افریقہ صقلیہ سے چل کر نہ صرف سواحل اٹلی کے محاذی شمال میں حملہ کیا بلکہ اس کے صوبہ کو فتح بھی کر لیا تھا۔ اس کے علاقہ "جاتیا" کا محاصرہ کیا۔ "وانڈمی" کو لوٹا دریائی "ٹیبر" پر نہ صرف بیڑے پہنچا دئے تھے بلکہ اس کے کنارے کنارے اپنا پڑاؤ بھی ڈال دیا تفصیل آئندہ اوراق میں آئیگی۔

اسلامی سیاست میں پاکستان کا مفہوم

فی الحقیقت یورپ کے فتح کرنے کی اسکیم اُس زمانہ میں تیار ہو چکی تھی جس زمانہ میں عربوں نے اپنا چولا بدلا تھا۔ جاہلیت چھوڑ کر انسانیت کا جامہ اختیار کیا تھا اور بدویت میں مدنیت کا سبق سیکھا تھا۔ یہ توسیعی اسکیم قابل عمل ضرور تھی

یہ اٹلی کا وہی مشہور ساحل ہے جس پر ۹ فروری ۱۹۴۱ء یوم اتوار بوقت صبح برطانوی بیڑہ نے تاریخی بمباری کرتے ہوئے (۴۰۰۰۰ من) کے وزنی گولے برسائے۔

فتح قسطنطنیہ کے متعلق ارشادِ نبوی صلعم

جس اسکیم کا بنیادی پتھر اللہ کا حکم "دنیا کو پھر کر دیکھو" تھا اس کا اجمالی عملی پروگرام جماعت اسلامیہ کی تنظیم کی بعد جو تعداد میں کم لیکن استعداد میں بہت زیادہ تھی، ارشادِ نبوی میں بطور پیشین گوئی یوں ظاہر فرما دیا گیا تھا:۔

"قریب زمانہ میں رُومی (یونانی) عماق یا دابق[۱] میں آئیں گے، اُس وقت مدینہ کے بہترین لوگوں کا ایک لشکر نکلے گا۔ جس وقت وہ لشکر سامنے آئے گا تو یونانی کہیں گے کہ ہمارے اور ان لوگوں کے راستہ سے ہٹ جاؤ، جو ہم سے علیحدہ ہو چکے ہیں ہم اُن سے جنگ کریں گے، اس کا مسلمان یہ جواب دیں گے کہ تمہارے اور اپنے بھائیوں کے راستے سے ہم نہیں ہٹیں گے۔ اس کے بعد لڑائی ہوگی۔ ایک تہائی لشکر شکست کھا جائیگا اس کو اللہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ ایک تہائی شہید ہوگا یہ اللہ کے نزدیک بہترین شہداء ہوں گے۔ اور ایک تہائی کو فتح ہوگی۔ یہ کبھی فتنے نہیں پیدا کریں گے اور قسطنطنیہ کو فتح کریں گے۔"

صحیح مسلم نے اس حدیث کو تفصیل سے روایت کیا ہے یہ ارشادِ نبوی اس اسکیم کا ایک عملی پروگرام تھا۔ جس میں یہ بلیغ اشارہ تھا کہ مشرقی یورپ سے یورپ پر یلغار کیا جائے۔ چنانچہ اس اعتبار سے شام و مصر، افریقہ کے فتوحات کے بعد جو ۲۰ھ میں مکمل ہو چکی تھیں۔ خلیفہ سوم کی اجازت سے امیر معاویہ نے پہلی بحری جنگ لڑ کر شرقی بحیرۂ روم کے جزیرۂ قبرس کو جو بیروت کے سامنے ہے اور جو گویا قسطنطنیہ کے بحری حملہ کے لئے دروازہ تھا سیاسی حیثیت سے فتح کر لیا تھا، کیونکہ بقول "ابو الفدا" پانچ لاکھ دینار سالانہ خراج پر اہل جزیرہ سے مصالحت ہو کر گویا خلافت کی عملاً سیادت قائم ہو گئی تھی۔ اس بحری جنگ میں حضرت عبداللہ بن سعد والی مصر نے بھی اپنی فوج کے ساتھ شرکت کی تھی۔ اس واقعہ کے چار سال کے بعد ۳۲ھ میں امیر معاویہ والی شام نے اپنی فوج کو لے کر براہ خشکی بجانب ایشیائے کوچک کوچ کیا اور قسطنطنیہ فتح کرنے کے لئے سواحل باسفوس تک پہنچ گئے لیکن چونکہ بحر مرمرہ کو عبور کر کے قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کے لئے بیڑے کی ضرورت تھی، اس لئے حضرت بسر بن ارطاۃ اپنے بیڑے کو لے کر طرابلس[۲] (شام) سے لے کر نکلے۔ لیکن راستہ ہی میں

---

[۱] "دابق" اس کو بالکسر بھی پڑھتے ہیں اور بالفتح بھی۔ معجم البلدان نے لکھا ہے کہ حلب (شام) کے قریب ایک قصبہ ہے جہاں سلیمان بن عبدالملک بن مروان نے جہاد فی قتال کر قسطنطنیہ پر حملہ کیا تھا۔ آخر میں وہیں بیمار رہا اور مر گیا اور وہیں دفن ہوا۔ جوہری کے حوالے سے اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس جگہ کی ندی کا یہ نام ہے۔ واللہ اعلم

[۲] معجم البلدان نے اس کو اقلیم چہارم میں قرار دیتے ہوئے اس کا طول البلد ۶۰ درجہ اور ۳۵ دقیقہ اور عرض البلد ۳۴ درجہ لکھا ہے۔

زمانہ کے لئے نہیں تھا بلکہ نہ۔ نہ جنگ میں بھی شام دیرموک کے حملہ کے وقت جو بیزنطینوں یا یونانیوں کے مقابلہ میں بھیجا تھا۔ خلیفہ اول کا سالارانِ افواجِ اسلامیہ کے نام تقریباً یہی حکم تھا جو جنگی سیاست کا سرتاج تھا۔

"خیانت مت کرنا۔ دھوکہ مت دینا۔ ناک کان مت کاٹنا۔ بچوں۔ بوڑھوں اور عورتوں کی جان نہ لینا۔ درختوں کو نہ تو برباد کرنا۔ نہ جلانا۔ اور نہ کاٹنا۔ کھانے کے علاوہ کسی حالت میں نہ بکری ذبح کرنا۔ نہ گائے اور اونٹ۔ (ابن خلدون جلد دوم)

یہ وہ فوجی تنظیم یا سیاسی اصول تھے جن پر افواجِ اسلامیہ کے نہ صرف سپہ سالاران کاربند تھے اور رہے بلکہ ہر جنگی کاربند رہا۔ یہی سبب تھا کہ فتوحات پر فتوحات اور پُرامن حکومتیں قائم ہوتی گئیں۔ یہ وہ تنظیمی یا سیاسی اصول نہیں تھے جو غیروں کو اپنا لئے بغیر نہ رہتے۔ چنانچہ محکوم ہونے کے بعد بھی جب اُنھوں نے یہ منصفانہ اور مساویانہ برتاؤ دیکھا تو وہ جواب تک قالباً مسخر تھے قلباً مسخر ہو گئے۔ بعد اذاں یورپ نے انھیں اصولوں کو اختیار کر کے ان کو بین الاقوامی مرتبہ دیا۔ لیکن اُن کی پابندی کی گئی یا نہیں، اس پر وہاں کے قدیم و جدید واقعات جو زمانۂ جنگ میں اخبارات میں آتے ہیں شاہد ہیں۔ البتہ اس کے برخلاف عربی اسلامی تاریخ کے لکھنے والے۔ خواہ کسی مذہب و ملت کے ہوں۔ اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ افواجِ اسلامیہ نے اس پر پورا پورا عمل کیا اور اگر کسی سے اس کے خلاف لغزش ہوئی تو اس کی پوری پوری سرزنش کی گئی۔ چنانچہ خلیفہ دوم نے فتح بیت المقدس کے بعد جو اعلان جاری فرمایا تھا اُس میں صریحی طور پر یہ ارشاد تھا:۔

"ان کے خون معاف۔ ان کے بیوی بچے محفوظ۔ ان کے گرجے نہ ڈھائے جائیں گے اور نہ ان پر قبضہ کیا جائے گا۔" (ابن جوزی)

یہ اعلان صراحتاً اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ کسی خلیفہ تک کو یہ اختیار نہیں دیا گیا تھا کہ کسی جگہ کو اپنی طرف سے وہ پاکستان قرار دے کر وہاں صرف مسلمانوں کو آباد کر دے۔ حالانکہ اُس وقت یہ آسانی سے ہو سکتا تھا۔ یہاں تک کہ خلیفہ دوم نے بقول ابن خلدون بیت المقدس میں داخل ہونے کے بعد مشہور تر گرجا "کنیسۃ القیامہ" میں جس میں سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر ہے۔ نماز اسی وجہ سے نہیں پڑھی کہ بعد میں مسلمان اس کو مسجد کہہ کر اس پر قبضہ نہ کر لیں۔ یہ تھا انصاف۔ یہ تھا طریقِ حکومت جس نے لوگوں کے دلوں پر قبضہ کر لیا تھا۔[ط]

نوٹ: نمبر ط۔ اس مقالہ میں مصنف کے نقطۂ نظر سے پاکستان کی یہ بحث محل نظر ہے۔ (ایڈیٹر)

ین ترکی حکومت کے عہد میں چلا جو ایک بہت بڑا دینی کارنامہ ہے۔ بہرحال سات سال کے مسلسل حملے سے جو حملہ آوروں کی جماعت کو نقصان ہونا چاہئے تھا وہ ہوا اور مجبوراً اسلامی افواج کو پسپا ہونا پڑا۔ چنانچہ طبری اور ابن اثیر اس طویل محاصرہ کے اور حملے کے نقصان لکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آخر میں قسطنطنیہ اور دمشق میں باہم صلحنامہ ہوگیا جو چالیس سال رہا۔

مغربی یورپ اور اسلامی افواج

مشرقی یورپ کے دروازہ پر اسلامی افواج نے نہ صرف اپنے شہداء کو دفن کرکے اپنا حق قائم کردیا تھا بلکہ اس سرزمین کو اپنے خون سے اتنا سیراب کیا کہ آخرکار اس کے باغبان ہو ہی گئے جو باوجود مخالفانہ سازشوں اور طریقوں کے آج تک ہیں۔ بہرحال مدبرین وقت نے قسطنطنیہ سے واپسی کے بعد یہ تدبیر سوچی کہ مغرب سے یورپ پر براہ اندلس حملہ کیا جائے۔ چنانچہ شمالی افریقہ سے نکل کر افواج اسلامیہ نے آبنائے کو عبور کرتے ہوئے اسپین پر قبضہ کیا۔ اور گوتھ (Goths) کو مغلوب کیا وہاں سے کوہ پیرینیز پر ہوتے ہوئے گالش Gauls جو فرانس کے حکمراں تھے دھاوا کر دیا۔

یہ موسیٰ بن نصیر والی افریقہ کی جنگی اور سیاسی تدبیر تھی جس میں غالباً یہ ارادہ مضمر تھا کہ یورپ کے مغرب سے مشرق کی طرف چلنا چاہئے۔ اور اس طرح سے قسطنطنیہ ہوتے ہوئے دمشق پہونچنا چاہئے۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ انسان کی ہر تدبیر بار آور ہو جائے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا بھی غلط ہے کہ یہ ناقص یا ناقابل عمل تھی۔ فی الحقیقت تدبیر کارگر ہو جاتی۔ اگر عبدالرحمٰن بن عبداللہ غافقی والی اندلس نے اندازہ میں غلطی نہ کی ہوتی اور افواجِ اسلامیہ جنوبی فرانس میں پہنچکر وہاں کی لذتوں سے بقول ابن الریتہ مارتول" متاثر نہ ہوتیں یہی وجہ ہوئی تھی کہ جنگ پراتیہ میں جس کو عرب لوگ بجا طور پر

ف نمبر ۱۔ اس کا نام اصل چارلس مارتول تھا۔ یہ شہنشاہ فرانس تھیوڈو ایک چہارم کا لارڈ چیمبرلین (محافظ محل) تھا اور امیر الامراء منصب تھا۔ فی الحقیقت یہ صرف محافظ محل ہی نہیں بلکہ فرانس کا بھی اس وقت مالک بنا ہوا تھا جو چاہتا تھا وہ کرتا تھا۔ عہد ریاست کے "اور پراتیہ کی فتح نے اس کو نہ صرف فرانس والوں نے اپنا نجات دہندہ قرار دیدیا تھا بلکہ تمام یورپ اس کا ممنون احسان ہوا۔

ف نمبر ۲۔ اکثر مورخوں نے ۳ لاکھ تعداد لکھی ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر میں نے "فتوح المغرب" میں یہ تعداد لکھی۔ لیکن صاحب "مواقف ہمہ" اس روایت کو اس خط کی بنیاد قرار دیتے ہوئے جو ڈیوک اکیتاینہ نے فواتیہ کے معرکہ کے بعد پوپ گریگوری ثانی کو لکھا تھا۔ غلط ثابت کیا ہے لکھا ہے کہ "اسلامی لشکر جو فرانس میں داخل ہوا تھا اس کی کل تعداد ایک لاکھ سے زیادہ نہیں تھی جس کو نہ تو "تور" پر ہزیمت ہوئی اور وہاں برباد ہوا۔ بلکہ فی الحقیقت شام تک لڑنے کے بعد اپنے مرکز دل پر لے کر واپس ہو گیا۔ البتہ نقصان بہت زیادہ ہوا تھا" جس کے یہ ہو سکتے ہیں کہ کچھ ہزار آدمی ضائع ہوئے نہ کہ ۳ لاکھ مسلمان اور صرف ۱۵۰۰ فرنگی۔ جیسا کہ ڈیوک نے قومی پروپیگنڈا کی خاطر پوپ کو لکھا اور جس کو مغربی مورخین نے قومی کارنامہ ٹھہرایا۔

یونانی بیڑے سے مڈبھیڑ ہو گئی جو شہنشاہ قسطانس ثانی کی قیادت میں تھا۔ چنانچہ مشہور مقام فونیقیہ کے بالمقابل سمندر میں جنگ ہوئی جس میں بقول صاحب مواقف حاسمہ بحوالہ یونانی مورخ تھیوفانس :-

"تقریباً بیس ہزار یونانی کام آئے لیکن اسلامی بیڑے کو بھی اس قدر زیادہ نقصان پہونچا کہ وہ قسطنطنیہ نہ جاسکا اور واپس چلا گیا۔"

ان حالات میں مہم کی ناکامی یقینی تھی، چنانچہ اس وقت ایشیائے کوچک کے حملے اور قبضے پر اکتفا کیا گیا۔ حملے کے بیس سال کے بعد ۳۵ھ میں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا اور سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلافت ہوئی۔ لیکن اس ۵ سالہ عہد میں خوارج کی ریشہ دوانیوں نے سخت اندرونی خلفشار پیدا کر تھا جس کی وجہ سے فتوحات اسلامیہ میں مزید ترقی نہ ہو سکی۔ عہد خلافت راشدہ کے بعد جب امارت ہوئی اور حضرت امیر معاویہ نے امارت کی باگ ہاتھ میں لے کر دمشق پایہ تخت قرار دیا۔ اس وقت سے فتوحا کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ چنانچہ ۴۲ھ میں قسطنطنیہ پر اور ۴۵ھ میں افریقہ پر دوبارہ حملے کئے گئے۔ گویا مشر اور مغرب دونوں طرف سے بیک وقت پیہم حملے شروع ہوئے۔

خشکی کی افواج زیر قیادت عبدالرحمن بن خالد اناطولیہ کی راہ سے قسطنطنیہ پہنچیں اور اسلامی بیڑ زیر قیادت امیر البحر بسر بن ارطاہ بحیرۂ مرمرہ میں پہنچ گیا۔ گویا ۱۲ برس کے بعد یہ دوسرا حملہ پہلے سے زیا سخت اور نسبتاً کامیاب تھا۔ لیکن اناطولیہ کی برفباری اور سردی نے عربوں کو پسپائی پر مجبور کیا اور اس طرح سے حصار قسطنطنیہ کی تجویز ملتوی رہی۔ اس کے چار سال یا بقول بعض پانچ سال کے بعد جبکہ قسطنطنیہ کے تخت پر شہنشاہ قسطنطین چہارم جلوہ افروز تھا۔ افواج اسلامیہ خشکی اور بحری راستہ سے زیر قیادت حضرت سفیان بن عوف الازدی اور امیر البحر بسر بن ارطاہؓ نے علی الترتیب حسب ہدایت حضرت امیر معاویہ مضبوط تر اور منظم تر حملہ کیا اور اس حملہ میں قسطنطنیہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اسلامی افواج پیشقدمی کرتی ہوئی قسطنطنیہ کی دیواروں تک پہنچ گئی تھیں۔ شاخ زریں پر اپنا پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ لیکن قسطنطنیہ نے اپنے بلند اور مستحکم برجوں سے پوری پوری مدافعت کی۔ یونانیوں نے اسلامی فوجوں اور بیڑے پر وہ آگ برسائی کہ مسلمان ساحل مرمرہ کی طرف ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ سلسلۂ محاصرہ اور حملہ تقریباً چھ یا سات سال جاری رہا۔ ابتدائی حملہ اور محاصرہ میں ہزاروں مسلمان شہید ہوئے جن میں ممتاز صحابی بھی تھے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی شہادت اسی محاصرہ کے وقت ہوئی تھی۔ جن کی قبر کا پتہ آٹھ سو برس کے بعد ۱۴۵۳ء

چھوڑ کر جانب شمال فرار ہو گیا۔ عبدالرحمن نے اپنا رُخ اُس طرف کر دیا اور فتوحات کرتا ہوا "پارس" سے تقریباً سو میل تک پہونچ گیا۔ وکٹر ہیوگو مشہور فرانسیسی شاعر کے شہر "پٹرانسون" "لیون" اور "سانش" پر قبضہ کرنے کے بعد دریائے "لوار" کی جانب مغرب فرانسیسی پایۂ تخت پر قبضہ کرنے کے لئے چلا۔ فی الحقیقت اس نے چند مہینوں میں پورا جنوبی فرانس مشرق سے مغرب تک فتح کر لیا تھا۔ بقول مورخین اس نے اس قلیل عرصہ میں جبل طارق سے دریائے لوار تک ایک ہزار میل کا علاقہ سر کر لیا تھا۔ اسی بڑھتے ہوئے سیلاب نے یورپ کو بیدار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف مسلمانوں کو فرانس سے ہٹنا پڑا۔ بلکہ آخر کار اس حصۂ یورپ کو بھی چھوڑنا پڑا۔ جہاں سات سو سال تک مسلسل حکمرانی کر کے یورپ کی دُنیا پر تمدّنی اور معاشرتی احسان کیا۔ ورنہ آٹھویں صدی عیسوی کا یورپ بالعموم اور فرانس بالخصوص نہ صرف آپس کی خانہ جنگیوں کا مرکز تھا بلکہ جہل و تاریکی کا بھی وہ گھر تھا۔

کیونکہ تقریباً پانچویں صدی عیسوی سے ایک طرف جرمنی قبائل دریائے "رائن" کو عبور کر کے رُومۃ الکبریٰ کی سطوت کو صدمہ پہنچاتے ہوئے اس کے علاقہ پر قبضہ جما رہے تھے اور دوسری طرف "گوتھ" شمالی اٹلی سے گھس کر اسپین اور گالس (فرانسیسی قبائل) پر غالب آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ ان فرنگیوں نے رُومی حاکم سے آدھا شمالی فرانس اور گوتھ سے دوسرا آدھا جنوبی فرانس حاصل ہی کر لیا اور اس طرح سے رُومہ کی حکومت کے بجائے فرانس میں ایک نئی حکومت قائم ہو گئی تھی لیکن اس کے بعد ان میں آپس میں جنگیں شروع ہو گئیں اور ایک ملک میں کئی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہو گئیں، اور بادشاہت برائے نام رہ گئی تھی۔ چارلس مارتول کا فی الحقیقت یورپ پر یہ زبردست احسان ہے کہ جس کی وجہ سے بقول ایڈورڈ گبن :-

"دریائے لوار و پوائتیہ کی کامیاب جنگوں نے ہمارے برطانوی اجداد اور ہمارے پڑوسی فرانسیسیوں کو قرآن مدنی و دینی سے بچالیا۔ رُومہ کی شوکت کو محفوظ کر دیا اور قسطنطنیہ کے قبضہ کو تاخیر میں ڈال دیا۔"

یا بقول سرایڈورڈ کریزی :-

"چارلس مارتول کی وہ زبردست فتح جو اس کو عربوں پر ۷۳۲ء میں حاصل ہوئی، عربی فتوحات کے لئے مغربی یورپ میں سدِ سکندری بن گئی۔ جس نے عیسائیت کو اسلام سے بچالیا۔"

بہرحال واقعہ پوائتیہ خواہ اس کو عربوں کی ہزیمت سے تعبیر کیا جائے یا نہ کیا جائے لیکن اس سے انکار نہیں

بلاط شہدا کہتے ہیں۔ کافی تعداد مسلمانوں کی شہید ہوئی۔

غرضیکہ مغربی فتح کا سیلاب دوبارہ انگلستان کے مشہور فرانسیسی ساحلی شہر "بورڈیو" سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ورنہ بقول انگریزی مورخ اڈوارڈ گبن[1] "آکسفورڈ یونیورسٹی میں قرآن و حدیث کا درس ہوتا" سر اڈورڈ کریزی نے اپنی کتاب (Deci-sive Battles of the world) میں اس اسلامی سیلاب کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ"

"۷۳۲ء میں چارلس مارتل کو عربوں پر جو شاندار فتح ہوئی اس نے عربوں کو مغربی یورپ میں اُن سے ہمیشہ کے لئے روک دیا۔ عیسائیت کو اسلام سے بچا لیا۔ قدیم تمدن کی یادگاروں کو محفوظ کر دیا۔ جدید تمدن کو مٹنے سے روکا اور یورپ کی آرین (ہندی) قوم کے قدیم تفوق کو سامی قوموں پر ظاہر کر دیا۔"

مغربی مورخین نے پروپاگنڈے کی خاطر واقعہ "بواتیہ" میں بلاشبہ بے حد مبالغہ سے کام لیا ہے۔ لیکن باوجود اس کے اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس واقعہ کے بعد یورپ میں عربوں کی فتوحات کا نہ صرف سدباب ہوا۔ بلکہ ان تمام مفتوحہ ممالک کو بھی رفتہ رفتہ چھوڑنا پڑا۔ جہاں ان کے اسلاف نے اپنے خون بہائے تھے اس مسلسل کامیابی میں یورپ کی بہادری کو اتنا دخل نہیں تھا جتنا کہ اُندلس میں باہم مسلمانوں کی دست و گریبانی کو دخل تھا۔ اگر ان میں وہی اتحاد رہتا جس کو لے کر وہ اپنے مرکز سے نکلے تھے اور جس کا مظاہرہ کامل ایک سو سال تک کرتے ہوئے جنوبی فرانس تک پہنچے تو ان کو یہ دن ہرگز نہ دیکھنا پڑتا۔

یورپ کی سرزمین میں سب سے پہلے ولید بن عبدالملک اموی کے عہد میں موسیٰ بن نصیر والی افریقہ نے پہلے اپنے غلام طارق بن زیاد کی سرکردگی میں ایک لشکر اسپین کی طرف ۷۱۱ء مطابق ۹۷ھ میں روانہ کیا۔ طارق نے ہنوز اسپین میں پہونچ کر وادی "لیتہ" کو ہی فتح کیا تھا کہ موسیٰ بن نصیر بھی لشکر جرار لے کر وہاں پہونچ گیا۔ اور اس کے بعد ان دونوں لشکروں نے مل کر نہ صرف سارے اسپین کو فتح کیا بلکہ کوہستان "پیرینیہ" کو عبور کر کے وادی "استورغہ" کو بھی فتح کر لیا تھا۔ اس فتح کے ۲۰ سال کے بعد ہشام بن عبدالملک اُموی کے عہد میں عبدالرحمٰن غافقی والی اندلس نے ۷۳۲ء میں فرانس پر حملہ کر کے تقریباً پورے جنوبی فرانس کو فتح کر لیا۔ حتیٰ کہ فرانس کے مشہور مغربی ساحل "بورڈیو" پر بھی کچھ دنوں کے حصار کے بعد قبضہ کر لیا۔ ڈیوک اوڈو امیر اکیتانیہ جو بورڈیو کا بھی مالک تھا اپنے پورے علاقہ کو

[1] (ا) انگریزی (۲) فرانسیسی ... [illegible]

عبدالرحمٰن نے اپنی حکومت قائم کرکے دمشقی بنو امیہ کی کھوئی ہوئی عظمت کی تلافی کی تھی۔ اس لئے بنو عباس نے معمولی ناکام کوشش کے بعد اس کی سیادت سے ہاتھ اٹھالیا اور افریقہ کو حسب حال اپنے ماتحت صوبہ رکھا۔ لیکن فی الحقیقت حکومت کا دائرہ شرقاً و غرباً اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ اُس کی سنبھال بہت دشوار تھی پھر بھی جتنے عرصہ تک اس وسیع حکومت کو ایک نظام کے تحت پُرامن رکھا گیا، وہ کچھ کم تعجب خیز نہیں ہے درحالیکہ آمدورفت اور معلومات اطلاعات کے ذرائع میں جو دشواریاں تھیں وہ محتاج بیان نہیں۔ چونکہ بنو عباس نے مشرق میں مزید فتوحات کی تھیں اس لئے وسیع حکومت وسیع تر ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ صوبہ کے حکمرانوں نے خود مختاری کا طریقہ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ البتہ سکہ و خطبہ خلیفہ کے نام کا ہوتا تھا یعنی سیادت تسلیم کرتے ہوئے اندرونی طور پر سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ یہی صورت افریقہ کے صوبہ کے خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ میں تھی۔ اس لئے خلیفہ ہارون الرشید نے بہترین سیاست سے کام لیکر افریقہ کے صوبہ کو ۱۸۴ھ مطابق ۸۰۰ء حکومت خود اختیاری دے کر ابراہیم بن اغلب کو اس کی امارت سپرد کر دی۔

چنانچہ اس گھرانے کے کل گیارہ امیر اس پر حکمراں ہوئے جنھوں نے پورے ۱۱۲ سال حکمرانی کی۔ یہی وہ حکومت تھی جس نے اسلامی بحری سیادت کو بالخصوص بحیرۂ رُوم میں عروج پر پہنچا دیا تھا، جس نے جزائر سوڈانیہ، صقلیہ[۱] اور مالٹا پر قبضہ کے علاوہ اکثر سواحل اٹلی اور فرانس اور جزیرہ "کورسیکا" پر قبضہ کر لیا تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ مسلمانوں نے بحری طاقت کے اعتبار سے کسی زمانہ میں یہ شہرت حاصل نہیں کی جو "اغلبوں" کے زمانہ میں ہوئی۔ اسی عہد میں غلام زرافہ نے جس کو مغربی مورخین لیون طرابلسی لکھتے ہیں۔ "مشرقی بحیرہ رُوم اور بحر الجزائر میں شجاعانہ اور مدبرانہ حملہ کرکے حقیقی "امیر البحری" کا لقب حاصل کیا۔ اُسی عہد میں ابوحفص عمر اندلسی بلوطی نے مغربی بحیرۂ روم کو اپنے قبضہ میں کرکے بحری جنگ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

بنو فاطمہ اور افریقہ

افریقہ میں بنو اغلب کی خود مختارانہ یا آزاد حکومت ایک سو بارہ سال سے زیادہ نہ رہی، اس کے بعد ۲۹۶ھ مطابق ۹۰۸ء میں بنو اغلب کے آخری حکمراں ابو نصر زیادۃ اللہ کی شراب خواری اور زیادتیوں نے اغلبوں کے عہد کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ "ابو الفداء" نے لکھا ہے کہ

---

[۱] صقلیہ جس کو سسلی بھی کہتے ہیں، اب اٹلی کی حکومت ہے۔ اس پر مسلسل دو سو سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی۔ اس کے بعد ۴۶۳ھ مطابق ۱۰۷۰ء میں نارمن راجہ نے جنگ کرکے اس کو فتح کر لیا۔ مالٹا اب برطانوی جزیرہ ہے اور بحری بیڑے کا بڑا مرکز ہے۔

کیا جا سکتا ہے کہ وہ عربوں کی مغربی پیش قدمی کے لئے کاری ضرب ضرور ثابت ہوا۔ کیونکہ عبدالرحمٰن غافقی کی شہادت کے بعد پھر اس کے کسی جانشین میں ہمت نہ ہوئی کہ وہ کوہستان بیرینہ کو عبور کر کے یورپ کی کھوئی ہوئی سیادت کو پھر قائم کرتا۔ جس میں ایجابی اور سلبی دونوں وجوہ کارفرما تھے۔ یعنی اندلسیوں میں باہمی نزاع اور کوہستان بیرینہ کے پار ایک متحدہ اور مجتمع قوت۔ مغربی پیشقدمی کے رُک جانے سے ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ عربوں نے ان ممالک پر پوری توجہ دینی شروع کر دی جو انھوں نے بیزنطینوں اور رُومیوں کی استبدادیت سے چھڑائے تھے۔ غرضکہ ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں بحیرۂ روم کے سواحل اور جزائر پر عربوں کے حملے اس قدر کامیاب ہوئے کہ آخرکار نویں صدی عیسوی (تیسری صدی ہجری) میں عرب پورے بحیرۂ رُوم کے مالک ہو گئے تھے۔ نہ صرف تقریباً تمام جزائر بحیرۂ رُوم مثلاً قبرص۔ رودس۔ کریٹ۔ مالٹا۔ صقلیہ۔ سوڈانیہ۔ جزائر البلیار۔ یعنی (منورقہ۔ مایورقہ وغیرہ) پر اپنی حکومتیں قائم کر دی تھیں بلکہ جنوبی مغربی اور مشرقی سواحل اسلامی حدود میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ شمالی سواحل گو عرب کی سیادت میں تو نہیں تھے لیکن ہر وقت عربوں کی زد میں ضرور تھے۔ جہاں انھوں نے وقتاً فوقتاً ایک حد تک کامیاب حملے کئے۔ اس کے ساتھ ہی اُس کے ملحق دونوں سمندروں "بحرالجزائر" جس کو بحرایجیم کہتے ہیں اور "بحر اڈریاٹک" بھی عربوں کے حملے اور کامیابی کے میدان رہے۔

اِس میں شک نہیں کہ بحری جنگ کا آغاز خلیفہ سوم کے زمانہ میں ہوا۔ لیکن اس کی تکمیل صحیح معنوں میں دسویں صدی عیسوی کے شروع میں بنو اغلب کے عہد میں امیرالبحر ابو عمر حفص عیسیٰ اندلسی اور امیرالبحر غلام زرافہ کے ہاتھوں ہوئی۔ جنھوں نے نہ صرف بحیرۂ روم کے مغربی اور مشرقی جزائر کو فتح کیا۔ بلکہ موخرالذکر نے بحرالجزائر میں پہونچ کر سالونیکا پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ جو اس زمانہ میں بیزنطیوں کا قسطنطنیہ کے بعد سب سے بڑا ساحلی شہر مانا جاتا تھا۔

عہد بنو عباس

بنو امیہ نے تقریباً ایک سو سال تک تبلیغ و توسیع اسلام کی خدمت کی اور مشرق اور مغرب دونوں سمتوں میں فتوحات کر کے تمدن اور تہذیب کی تخم ریزی کی۔ اُن کے بعد ان کے جانشین "بنو عباس" نے اپنی توجہ صرف مشرق ہی کی طرف رکھی جہاں فتوحات ہوئیں اور مغرب کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔ بلکہ صرف شمالی افریقہ کی حد تک سیادت پر اکتفا کیا جس کا سبب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ اندلس میں ہشام بن عبدالملک اموی، دسویں خلیفہ دمشق کے پو-

یونس خادم نے قائم کو شکست فاش دی۔ اس شکست کے بعد پھر مہدی نے مصر پر حملہ کی جرأت نہ کی۔ اور مہدیہ میں رہ کر بحیرۂ روم کے جزائر پر حکمرانی کرتا رہا۔ ۲۴ سال کی حکمرانی کے بعد ۳۲۲ھ میں بعمر ۶۳ سال بعہد راضی باللہ عباسی اس کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا ابو القاسم محمد الملقب بہ قائم بامر اللہ اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔

قائم نے تخت نشینی کے ایک سال بعد بحری راستہ سے اٹلی کے مشہور ساحل جنیوہ پر حملہ کر کے اس کو فتح کیا۔ اس کی تخت نشینی کے ۱۱ سال بعد مراکو کے قبیلہ "زمانہ" کے ایک شخص ابو یزید خارجی نے قیروان میں ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی، جس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ جملہ مسلمان کافر اور ان کا مال اور خون حلال۔ مرکزیت کے فنا ہو جانے کی وجہ سے چونکہ افریقہ اس وقت ایک حد تک طوائف الملوکی کے دور سے گزر رہا تھا۔ اس لئے ابو یزید خارجی کو اپنے مسلک میں کامیابی ہوئی اور اس نے ایک بڑی جماعت منظم کر کے قائم پر حملہ کر دیا۔ تونس۔ قیروان اور رقادہ پر قبضہ کر لیا اور قائم "مہدیہ" میں محصور ہو گیا۔ اُسی زمانہ جنگ و حصار میں قائم کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا اسمٰعیل منصور باللہ ۳۳۴ھ میں تخت پر بیٹھا۔ اس نے ابو یزید کا پیچھا کر کے آخر کار ۳۳۶ھ میں اُس کا خاتمہ کیا اور ملک کو اس کی لعنت سے بچایا۔ منصور باللہ کا بعمر ۳۹ سال ۳۴۱ھ میں سات سال کی حکمرانی کے بعد انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا بعمر ۲۴ سال ابو تمیم محمد الملقب بہ المعز الدین اللہ تخت نشیں ہوا۔ بنو فاطمہ کا یہ پہلا حکمران تھا جس نے خلافت پر لوگوں سے بیعت لی۔ بنو عباس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر معز الدین اللہ نے اپنے رومی غلام جوہر[5] کی قیادت میں لشکر اور بیڑا تیار کر کے اپنے پردادا کی ڈالی ہوئی داغ بیل کی تکمیل کی اور ۳۵۸ھ و ۳۵۹ھ مطابق ۹۶۹ء و ۹۷۰ء میں نہ صرف پورے مصر پر قبضہ کیا۔ بلکہ شام بھی فتح کر لیا اور جس طرح قاہرہ کی مسجد جامع ابن طولون میں اپنا خطبہ پڑھوایا، اُسی طرح جامع دمشق میں بھی کیا، اب ان دونوں صوبوں سے بنو عباس کا گویا نام بھی گیا۔ علویہ حکومت میں یہ پہلا شخص تھا جس نے توسیع حکومت کے بعد ہی نہ صرف خلیفہ کا لقب اختیار کیا بلکہ "مہدیہ" کو چھوڑ کر مصر چلا آیا اور قاہرہ کو پایۂ تخت قرار دیا۔ جہاں وہ بقول ابو الفداء بتاریخ ۵ رمضان ۳۶۵ھ مطابق

---

[5] جوہر رومی معز الدین اللہ کا غلام اور سالار افواج تھا۔ اس نے قاہرہ کی تعمیر کے وقت ۳۵۹ھ تا ۳۶۱ھ جامع ازہر کو مکمل کیا تھا۔ جو آج تک اس کے نام و کام کو روشن کر رہی ہے۔ اس میں اس نے ایک ایسا طلسم بنوایا تھا کہ اس کے اندر کوئی پرندہ از قسم کبوتر وغیرہ نہیں رہ سکتا تھا۔ (حسن المحاضرہ۔ جلد دوم ۔ علامہ سیوطیؒ)

اس زمانہ میں جبکہ ابونصر عیاشی کے ساتھ ظلم و زیادتیاں بھی کر رہا تھا، ابوعبداللہ مغرب میں بنو فا
سے نہ صرف لوگوں کو دعوت دے رہا تھا۔ بلکہ ان کو حکومت کے مقابلہ کے لئے تیار بھی کر رہا ت
مخمور آنکھیں اُس وقت کھلیں جب ابوعبداللہ داعی کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ تیر کمان سے نکل
کیونکہ ایک طرف تمام ملک اِس کے لہو و لعب اور زیادتیوں سے عاجز، دوسری طرف بنو فاطمہ کا د
کے لئے تیار۔ ابونصر کی فوجی کارروائی مفر ثابت ہوئی اور اس کو ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ در بد
پھرا۔ مقتدر عباسی سے مدد مانگی جو ملی۔ لیکن وائے بر شراب خواری و عیاشی جس نے غربت میں بھی
نہ چھوڑا۔ لہٰذا وہ مدد بھی مفید نہ ہوئی اور اس کو مجبوراً ہمیشہ کے لئے نہ صرف اپنے ملک کو خیر باد کہ
فلسطین کے قصبہ "رملہ" میں پہونچ کر دُنیا بھی چھوڑنی پڑی۔ اُس وقت سے "افریقہ" یا "تونس
حکومت بنو فاطمہ کی طرف منتقل ہوئی۔ جس کا سب سے پہلا حکمران ابو محمد عبیداللہ مہدی بن محمد ہوا
حکومت کے قیام میں صرف ابوعبداللہ اور ابوالعباس کی جان توڑ مساعی کو دخل تھا۔ ورنہ
عبیداللہ مہدی اور اس کے بیٹے کی زندگیوں کا خاتمہ سجلماسہ (افریقہ) کے قید خانہ ہی میں ہو چکا ہوتا
امیر سجلماسہ "یسوع" نامی۔ نے ابونصیر زیادۃ اللہ کے اشارہ سے ان کو قید کر رکھا تھا۔ قدرت کی ستم
کیئے یا دُنیائے سیاست کا ظالمانہ اور تباہ کن اُصول کہ اس مہدی نے اپنے ان دونوں محسنوں کو
ملنے کے بعد بقول ابن اثیر و ابن خلکان اس شبہ میں کہ وہ مہدی کے خلاف پروپاگنڈا کر رہے
۲۹۸ھ مطابق ۹۱۰ء میں قتل کر دیا۔ غرضکہ مہدی نے ابتداءً اپنا پایہ تخت "رقادہ" قرار دیا لیکن

ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت

کے اصول کے مدنظر حکمرانی کے سات سال بعد بقول ابوالفدا ۳۰۳ھ مطابق ۹۱۵ء میں اپنے
تخت کو ساحل کے متصل ایک چھوٹے سے جزیرہ میں منتقل کر کے اس کا نام "مہدیہ" رکھا اور اس کو
سے مکمل و مستحکم کیا۔ اسی عرصہ میں مہدی نے ۳۰۲ھ مطابق ۹۱۴ء میں اسکندریہ پر اپنے لشکر سے حملہ
لیکن مقتدر باللہ کی فوجوں نے جو اس کے مشہور خادم مونس کی زیر قیادت تھیں، شدید نقصان سے
کو لپسپا کیا۔ اس حملہ کے چار سال بعد ۳۰۶ھ مطابق ۹۱۸ء میں مہدی نے پھر مصر پر زیادہ تیار
کے ساتھ چڑھائی کی اور اپنے بیٹے قائم کی قیادت میں ایک زبردست فوج سمندر کے راستہ سے روا
کی جس نے ابتداءً اسکندریہ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں مقتدر باللہ کی کمک پہنچنے کے بد

جب سلطان نورالدین کا انتقال ہوگیا تو صلاح الدین دمشق وغیرہ کا بھی حکمراں ہوگیا۔ اور اس طرح سے سلطان صلاح الدین کے لقب سے ملقب ہوا۔ بقول ابن خلکان سلطان صلاح الدین کے جنگی کارناموں کے ساتھ ساتھ علمی کارنامے بھی بے شمار ہیں۔ علاوہ اُن مدارس اور اوقاف کے جو سلطان نورالدین نے دمشق وغیرہ میں جاری کئے تھے سلطان صلاح الدین نے مصر کو جامع العلوم بنا دیا تھا۔ بنو فاطمہ کے حکمرانوں نے جتنی زیادہ اس طرف سے غفلت برتی تھی۔ اسی قدر زیادہ اُس نے اِس طرف توجہ کی اور بہت سے مدارس اور اوقاف اور شفاخانہ جات مختلف ناموں سے مصر و نیز بیت المقدس میں قائم کئے۔ لیکن بقول ابن خلکان "کسی کو اپنے نام سے منسوب نہیں کیا فی الحقیقت خفیہ صدقہ اسی کو کہتے ہیں"۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو اپنی ذاتی شہرت کا خیال مطلقاً نہیں تھا۔ بلکہ خدمتِ اسلام و انسان اس کا مسلک تھا۔ اپنے عروج اور اپنی خود مختاری کے بعد وہ اپنے اور اپنی اولاد کے لئے بہت کچھ کر سکتا تھا لیکن بقول ابن خلکان:-

> "مرنے کے بعد اس (سلطان) کے ذاتی خزانہ میں سوائے (۴۷) درہم کے نہ سونا تھا۔ اور نہ چاندی تھی۔ بوقت موت اپنے وارثوں کے لئے اس نے نہ کوئی مکان چھوڑا۔ نہ باغ۔ نہ زمین چھوڑی نہ جاگیر۔"

مصر کے انصرام و انتظام کے بعد جب وہ ۵۷۸ھ میں رُومیوں کے مقابلہ کے لئے جانب شام روانہ ہونے لگا۔ اُس وقت تمام مصر پر ایک سوگ کا عالم طاری تھا۔ جملہ اعیان و امراء و شرفاء و علماءِ مصر خدا حافظ کہنے کے لئے آئے۔ انھیں میں سلطان کے لڑکوں کا اتالیق بھی تھا جو عالم ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھا۔ خیمہ شہر کے باہر نصب کیا گیا۔ سب لوگ خدا حافظ کہنے کے لئے جمع تھے۔ شعراء قصائد سُنا رہے تھے۔ شہزادوں کے اتالیق نے بھی قصیدہ سُنایا جو تمام ترغم و فراق کا مرقع تھا۔ چنانچہ جس وقت اس نے یہ شعر پڑھا:-[۵۱]

تمتع من شمیم عرار نجد
فما بعد العشیة من عرار

تمتع گیر از خوشبوئے نرگس	چو شب بگزشت ایں نرگس نماند
نرگس نجد کی خوشبو سے تمتع کر لے	ورنہ پچتائے گا تو شب کے گزر جانے پر

[۵۲]

---

۵۱ حسن المحاضرہ۔ جلد دوم (علامہ سیوطیؒ)

۵۲ مولف مقالہ نے اردو و فارسی اشعار میں ترجمہ کیا۔

۹۷۵ء عیسوی داخل ہوا۔ اور افریقہ (تیونس) طرابلس الغرب۔ اور صقلیہ کو صوبہ جات قرار دے کر اپنی علی الترتیب بربری قبیلہ صنہاجہ کے ایک مشہور شخص بلکین بن زیری۔ عبد اللہ بن محلف کتامی اور ابو القاسم علی بن الحسن کو صوبے دار مقرر کر دیا۔ اس کے بعد سے یکے بعد دیگرے دس خلیفہ عزیز، حاکم، ظاہر، مستنصر، مستعلی، آمر، حافظ، ظافر، فائز، عاضد، تخت خلافت مصر پر بیٹھے۔

اس طرح سے بنو فاطمہ کے ۱۴ حکمران ہوئے۔ جنھوں نے ۲۹۶ھ تا ۵۶۷ھ تک دو سو بہتر سال[۵۱] حکمرانی کی۔ ابتدائی حکمران محض امیر کہلائے۔ البتہ چوتھے حکمران معز الدین اللہ سے خلافت کا سلسلہ چلا جو ۵۶۷ھ میں عاضد الدین اللہ کے خاتمہ سے چند روز پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ کیونکہ بقول ابو الفداء صلاح الدین[۵۲] نے مصر کی وزارت کے بعد سلطان نور الدین والی دمشق کے حکم سے محرم ۵۶۷ھ کے پہلے جمعہ کو تمام مساجد مصر میں خلیفہ مستضئ باللہ عباسی کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور عبیدیہ یا بنو فاطمہ کا خطبہ مسدود کیا۔ بنو فاطمہ کے آخری خلیفہ عاضد الدین اللہ کے حالات زندگی کا مختصراً ذکر کرتے ہوئے ابن خلکان[۵۳] راوی ہے:۔

"بنو فاطمہ کے ایک ابتدائی حکمران نے علماء وقت سے یہ درخواست کی کہ وہ خلفائے بنو فاطمہ کے لئے چند موزوں القاب لکھ دے تاکہ ہر خلیفہ ان القاب میں سے کسی ایک لقب کو اختیار کرتا رہے۔ چنانچہ انھوں نے چند القاب لکھ دئے۔ انھیں میں "عاضد" بھی تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ لقب آخری خلیفہ نے اختیار کیا۔ لغت میں اس کے معنے "توڑنے والے" کے ہیں۔ گویا حکومت کا توڑنے والا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور حکومت پاش پاش ہو گئی۔"

سلطان صلاح الدین اور بنو فاطمہ

غرضکہ بقول ابن خلکان عاضد الدین اللہ کا دوشنبہ ۱۱ محرم ۵۶۷ھ کو انقطاع خطبہ کے تیسرے روز انتقال ہو گیا اور صلاح الدین سلطان نور الدین والی دمشق کی طرف سے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ اس کے دو سال کے بعد ۵۶۹ھ ہجری میں

---

[۵۱] ابو الفداء نے دو سو بہتر سال لکھے ہیں۔ لیکن ابن خلکان نے دو سو چھیاسٹھ سال کل اور دو سو آٹھ سال مصر میں حکومت کے لکھے ہیں۔

[۵۲] اس کا پورا نام ابو المظفر یوسف بن ایوب بن شادی الملقب بہ ملک الناصر صلاح الدین تھا۔ نسلاً کُردی تھا اور اپنے باپ نجم الدین ایوب کے ہمراہ دمشق میں آ کر ابو القاسم محمود الملقب بہ سلطان ملک العادل نور الدین والی دمشق کی آمد و رفت میں داخل ہوا۔ اور رفتہ رفتہ اس نے ترقی کی۔ مالک مصر، شام، عراق، اور یمن، کا حکمران بنا۔ فرنگیوں سے صلیبی جنگیں کر کے اسلامی تاریخ میں اپنے کارناموں کو زندۂ جاوید کر گیا۔ ابن خلکان نے اس کے تفصیلی کارناموں کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جمعہ ۲۷ رجب ۵۸۳ھ کو بیت المقدس پر قابض ہوا جو معراج کا مبارک دن تھا۔"

[۵۳] وفیات الاعیان۔ جلد دوم۔ مطبوعہ مصر۔

باپ نے کہا قسم خدا کی اگر میں اور تیرا ماموں شہاب الدین (سلطان) نورالدین کو دیکھ لیں تو یہ ممکن نہیں کہ (سواری) سے اُتر کر زمین بوس نہ ہوں۔ اور اگر وہ مجھ کو یہ حکم دے کہ ہم تیری گردن مار دیں تو ہم ضرور مار دیں گے۔

جب ہم ایسے ہیں تو دوسروں کا کیا ذکر یہ جتنے تیرے امرا اور فوجی ہیں اگر نورالدین ان کو تنہا مل جائے تو کسی کی یہ جرأت نہیں ہوگی کہ وہ گھوڑے کی زین پر رہے۔ بلکہ وہ فوراً اُتر کر زمین بوس ہوگا۔ یہ ملک اُسی کا ہے۔ اُس نے تجھ کو یہاں ٹھیرایا ہے۔ اگر وہ تجھ کو معزول کر دے تو بسر و چشم منظور، تجھ کو چاہئے کہ اُس کو ایک معروضہ بھیج۔ اور عرض کر کہ یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ کا اس مُلک پر ہم بھیجنے کا ارادہ ہے اس کی ضرورت نہیں، ایک غلام بھیج دیا جائے وہ میری گردن میں رومال ڈال کر آپ تک پہونچا دے گا۔

اس کے بعد جماعت سے یوں خطاب کیا۔

تم سب یہاں سے چلے جاؤ۔ ہم نورالدین کے غلام ہیں جو چاہے وہ ہمارے ساتھ کرے۔

چنانچہ وہ لوگ چلے گئے لیکن اُن میں سے بعض نے سلطان نورالدین کو اس واقعہ کی اطلاع دیدی۔ اس تخاطب کے بعد اپنے بیٹے صلاح الدین کو تخلیہ میں لے جا کر یوں مخاطب ہوا۔

تو جاہل اور کم سمجھ ہے، لوگوں کو اکٹھا کر کے ان کو تو اپنے راز سے واقف کرتا ہے۔ اگر نورالدین یہ سُن پائے کہ تو اس کو ملک میں آنے سے روکنے کا ارادہ رکھتا ہے تو تیرے لئے بہت ہی بُرا ہوگا۔ اور پھر وہ ضرور آئے گا۔ اور اگر آگیا تو پھر ان فوجیوں میں سے تیرے ساتھ ایک نہیں نظر آئے گا۔ اور تجھے اُس کے سپرد کر دیں گے۔ البتہ اب وہ جو کچھ لکھیں گے وہ صرف میرا کہنا دُہرائیں گے۔ تو اُس کو لکھ دے کہ آپ کے تشریف لانے کی کیا ضرورت "تر جاب" خادم میرے گلے میں رسی ڈال کر آپ تک مجھ کو پہونچا دے گا۔ چنانچہ وہ جب یہ سنے گا تو فوراً ارادہ ملتوی کر دے گا۔ اُس نے باپ کے حکم کے مطابق عمل کیا۔ چنانچہ نورالدین اپنے ارادہ سے باز رہا۔ اور جیسا نجم الدین نے کہا ویسا ہی ہوا۔ اور پھر نورالدین نے مرتے دم تک مصر کا ارادہ نہیں کیا۔"

اس تنبیہ اور نصیحت کا اس پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ پھر اس کے بعد اس کے دل میں اس قسم کا کبھی خیال تک نہیں آیا۔ دوسری طرف سلطان نورالدین کا دل بھی اس کی طرف سے ہمیشہ کے لئے صاف ہوگیا۔ جو بعض وجوہ سے مکدر تھا۔ بزرگوں کی نصیحت اور خوردوں کی اطاعت کی مثال اس سے بہتر کیا ہو سکتی ہے۔ سلطان کی ترقی کا راز اطاعت گزاری، انصاف پسندی اور دینداری میں مضمر تھا۔

اس شعر کے پڑھتے ہی سلطان پر بھی سوگ کا عالم طاری ہو گیا۔ یہ وہ الہامی شعر تھا جو حرف بہ حرف بعد میں صحیح ثابت ہوا، کیونکہ باوجود کوشش کے سلطان کو پھر واپس آنا نصیب نہ ہوا، اور دس سال کا زمانہ صلیبی جنگوں میں اور انھیں مقبوضہ ممالک کے نظم و نسق میں گزار کر دمشق میں بعمر ۵۷ سال بقول ابن خلکان "بعد نماز فجر یوم چہارم شنبہ بتاریخ ۲۷ صفر ۵۸۹ھ انتقال کیا" جملہ مورخین اس بارے میں متفق ہیں کہ سلطان انتہائی دیندار، منصف مزاج، رحم دل، باخبر اور پابند اوقات انسان تھا۔ حتیٰ کہ بقول ابو الفداء "نماز ہمیشہ با جماعت ادا کرتا تھا اور کبھی اس میں تاخیر نہیں کرتا تھا۔"

درگزر کرنا اس کے خمیر میں داخل تھا اور چشم پوشی اس کی عادت تھی۔ چنانچہ ابو الفداء نے لکھا ہے کہ ایک بار غلاموں نے آپس میں کھیل کرتے ہوئے ایک نے دوسرے کی طرف موز (کیلے) کا چھلکا پھینکا جو اس کے تو نہ لگا بلکہ سلطان کے قریب جا کر گرا۔ سلطان دوسری طرف دیکھنے لگا۔ تاکہ غلاموں کو یہ محسوس ہو کہ اس نے دیکھا ہی نہیں کہ انھوں نے کیا کیا۔ چھوٹوں پر رحم، بڑوں کی عزت اور بزرگوں کی اطاعت اس کے یہ وہ اعمال تھے جنھوں نے دنیاوی و دینی حیثیت سے اس کو کہیں کا کہیں پہونچا دیا تھا۔ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ مصر پر وزارت کے بعد سلطان نور الدین بن محمود زنگی والی دمشق کو معروضہ بھیج کر اپنے والد نجم الدین ایوب کو دمشق سے مصر بلوایا۔ تاکہ اپنے باپ کی مشفقانہ رہبری میں وہ اپنے فرائض کو انجام دے۔

ابن خلکان کا بیان ہے کہ عاضد الدین اللہ کے بعد منجانب سلطان نور الدین جب وہ مصر کا حکمراں بن گیا تو ایک بار حکومت کے زعم میں سلطان نور الدین سے سرتابی کا خیال پیدا ہوا۔ مشیروں نے سلطان کے خلاف مقابلہ اور مقاتلہ کا مشورہ دیتے ہوئے اپنی خدمات بھی پیش کیں۔ باپ نے یہ سب باتیں اس مجمع میں سنیں، جہاں یہ مشورہ ہو رہا تھا۔ آخر کار نجم الدین ایوب نے بقول ابن خلکان مشیروں کو برا بھلا کہتے ہوئے اور یوسف صلاح الدین کو بھی مخاطب کرتے ہوئے کہا:[۵]

"کیا تو سمجھتا ہے کہ یہ سب کے سب مجھ سے اور تیرے ماموں شہاب الدین سے زیادہ تیرے بھی خواہ اور تجھ سے محبت کرتے ہیں۔

اس نے جواب دیا۔ نہیں۔

---

۵ وفیات الاعیان۔ جلد دوم۔ مطبوعہ مصر۔ صفحہ ۳۸۰

جاسکتے ہیں۔ اس کی سوانح اکثر عالموں، زاہدوں، اور ادیبوں نے لکھتے ہوئے اس کی سیرت
حد تک یکتا قرار دیا ہے۔"

در حکومت صنہاجیہ | تونس (افریقہ) کا نظم ونسق قبیلہ صنہاجیہ "زیری" گھرانے کے حصہ میں اسوقت
سے آچکا تھا جب سے کہ بنو فاطمہ کے چوتھے امیر اور پہلے خلیفہ معز الدین اللہ
رف سے اس قبیلہ کے سردار یوسف بلکین بن زیری کو وہاں کا امیر مقرر کیا اور خود اپنے مقبوضہ
یا آیا تھا جہاں اس نے اپنی خلافت کا اعلان کر کے اپنے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کیا اور اس
قتدر باللہ عباسی یا "بنو عباس" کے اقتدار اور سیادت کا خاتمہ کیا۔ افریقہ پر "بنو فاطمہ" کے اقتدار
لی عمر ۷۰ سال سے زیادہ نہ ہوئی۔ کیونکہ بقول ابن خلکان وابو الفداء یوسف بلکین کے پر دتے
یونے اپنی تخت نشینی کے ۲۰ سال کے بعد ۴۳۵ھ میں بعہد مستنصر باللہ علوی بنو فاطمہ کا
سے مسدود کیا اور بجائے اس کے قائم بامر اللہ عباسی کا خطبہ پڑھوایا۔ گویا اُس نے بجائے
ے بنو عباس کی سیادت کو حسب سابق بحال وتسلیم کیا۔ مستنصر باللہ کو جب اس انحراف وانقطاع
ملاع ہوئی تو معز بن بادیس کو دھمکاتے ہوئے اس نے لکھا کہ کیا تو نے اپنے آباؤ اجداد کی اطاعت
اری کو پس پشت ڈال دیا۔ ہے؟ تو اُس نے جواب دیا کہ:۔[۵]

میرے آباؤ اجداد آپ کے اسلاف کے قبضہ کرنے کے پہلے ہی سے مغرب کے بادشاہ تھے۔"

یک حد تک اعلانِ جنگ تھا اس لئے مستنصر نے اپنے وزیر حسن بن علی بارزوری کے مشورہ
ں کے قبیلہ "زعبہ" اور "رباح" میں باہم صلح کرا کر ان کو افریقہ کی مہم کے لئے تیار کیا۔ چنانچہ
۴۴۲ھ معز بن بادیس پر پوری تیاری کے ساتھ حملہ کر دیا۔ معز بن بادیس کو تونس، برقہ، اور
ں تخت ہزیمت ہوئی۔ آخر کار وہ قیروان سے بھاگ کر ۴۴۹ھ میں مہدیہ چلا گیا۔ جہاں ۴۵۳ھ
ن کی حکمرانی کے بعد ۵۰ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا اور اس کے بعد اس کا بیٹا ابو یحییٰ تمیم
ل تخت نشین ہوا جو ۷۹ سال کی عمر میں ۵۰۱ھ میں مرگیا۔ بقول ابن خلکان۔ اس کی اولاد
ڑکوں اور ساٹھ لڑکیوں پر مشتمل تھی۔ غرضیکہ اس گھرانے میں تونس کی حکومت کم وبیش ایک سو بیاسی
اور حسن۔ علی۔ یحییٰ تمیم۔ معز۔ بادیس۔ منصور۔ یوسف بلکین اور اگر یوسف کے باپ

---

[۵] الاعیان۔ جلد دوم۔ مطبوعہ مصر۔ صفحہ ۱۰۵

سلطان صلاح الدین ایوبی نے مشرق کے علاوہ مغرب میں بھی فتوحات حاصل کیں اور طرابلس۔ برقہ اور تونس کو فتح کر کے صدیوں کے بعد بنو عباس کا خطبہ پڑھوایا۔ اگر اس وقت اس کے بعض فوجی افسروں میں جزوی اختلاف پیدا ہو گیا ہوتا تو وہ سارے شمالی افریقہ پر بھی قابض ہو گیا ہوتا۔

بہر حال سلطان نے اپنی زندگی کے آخری ۱۹ سال غزوات اور اصلاحات ہی میں گزارے۔ بالخصوص مشرقی غزوات میں زیادہ زمانہ گزرا کیونکہ قسطنطنیہ وغیرہ سے رومیوں نے نکل کر نہ صرف تمام ایشائے کوچک بلکہ شام کے بیشتر حصہ اور بیت المقدس پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ یہ صلاح الدین ایوبی ہی کا کارنامہ تھا کہ دس سال میں اس نے تمام ممالک عرب کو رومیوں کی دست برد سے پاک کیا۔ اور ظلم و زیادتیوں کی بیخ کنی کر کے عدل و انصاف کو عام کیا۔ اس کے دربار میں جھوٹے اور مسخروں کا گزر نہیں تھا۔ اس کے لشکر میں باوجود کثرت کے اختلاف کا نام نہیں تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ کبھی اپنی مہم میں ناکام نہیں ہوا۔ وہ سپاہی بھی تھا اور مدبر بھی، بادشاہ بھی تھا، اور فقیر بھی۔ بقول علامہ جلال الدین سیوطیؒ سوائے روئی۔ کتان اور اون کے کسی قسم کا لباس نہیں پہنتا تھا۔ رحمدلی اور انصاف پسندی میں اپنا آپ ہی نظیر تھا۔ چنانچہ بقول علامہ سیوطیؒ [۵۲]:۔

"بعض مسلمان ڈاکو فرنگیوں کے پڑاؤ میں داخل ہو کر چوری کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار ان میں سے ایک ڈاکو دودھ پیتے بچے کو وہاں سے اٹھا لایا۔ اس کی ماں بے حال ہو گئی اور اس نے ان کے سردار سے فریاد کی، وہاں سے اس کو یہ جواب ملا کہ سلطان المسلمین رحمدل ہے اس کے پاس جا۔ چنانچہ وہ سلطان صلاح الدین کے پاس آئی اور اپنے بچے کی جدائی میں اس قدر روئی کہ سلطان بھی رونے لگا اور فوراً اس نے اس کے لڑکے کی حاضری کا حکم دیا۔ چنانچہ جب یہ معلوم ہوا کہ وہ بازار میں بیچ دیا گیا ہے تو اس کی رقم ادا کر کے اس کو وہیں کھڑے کھڑے منگوایا اور اس کی ماں کو شیر و شکر کر کے سواری پر آدمیوں کی نگرانی میں قبیلہ میں عزت کے ساتھ بھجوا دیا"

اس کے بعد ان چوروں کو جو سزا ملی ہو گی وہ ظاہر ہے۔ کیونکہ انصاف پسند ہستیاں ظالم اور مجرم پر رحم نہیں کیا کرتی ہیں۔ بہر حال بقول علامہ جلال الدین سیوطیؒ [۵۳] "اس کے مناقب اتنے زیادہ ہیں جو مجلدات ہی

---

[۵۱] حافظ ذہبی نے اپنی کتاب "دول الاسلام" جلد دوم مطبوعہ حیدرآباد صفحہ ۷۵ میں اس کی حکمرانی کے ۲۴ سال لکھے ہیں۔ کیونکہ عاضد الدین اللہ نے اس کے چچا اسد الدین شیرکوہ کے مرنے کے بعد بقول ابن خلکان جمادی الآخر ۵۶۴ھ میں اس کو قلمدان وزارت سپرد کر دیا تھا جب کہ اس کی عمر تقریباً ۳۲ سال کی تھی۔

[۵۲] حسن المحاضرہ۔ مطبوعہ مصر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۷۔

[۵۳] " " " " ۲۷۔

ابن تومرت نے وہاں سے نکل کر ایک پہاڑ میں پناہ لی اور مہدی ہونے کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ اس کے بعد اس کی قوت روز بروز ترقی کرتی گئی۔ ابن تومرت اپنی جماعت میں کسی اہل تر شخص کے انتخاب کی فکر میں تھا۔ چنانچہ جب عبد المومن بن علی اس کی جماعت میں داخل ہوا تو اس نے اس کو اپنا جانشین منتخب کر لیا۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ عبد المومن کسی ممتاز گھرانے کا آدمی نہیں تھا بلکہ ایک کمہار کا لڑکا تھا۔ جس کی نہ تعلیم ہوئی تھی نہ تربیت البتہ[۵۱] "پیدائشی دانشمند اور باوقار تھا" بہر حال ابن تومرت کو جب اپنی قوت پر نسبتاً بھروسہ ہو گیا تو اس نے سب سے پہلے مراکش پر حملہ کر دیا۔ جس کا اگرچہ ۴۰ روز محاصرہ رکھا لیکن ابن تومرت کے خلیفہ یا جرنیل عبد المومن کو شکست ہوئی۔ اسی شکست کی حالت میں ابن تومرت کی حالت زیادہ خراب ہو گئی اور اس نے عبد المومن کو اپنا خلیفہ مقرر کر کے اور امیر المومنین کا لقب دے کر ۵۲۵ھ میں بقول ابو الفداء ۵۱ سال اور بقول ابن خلکان ۶۱ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس کی عمر کے آخری دس سال "مہدیت" یا بالفاظ دیگر رسِ حکمرانی میں گزرے۔

اس کے بعد عبد المومن نے نہ صرف تونس بلکہ پورے مغرب اقصیٰ اور اندلس پر حکمرانی کی۔ غرضیکہ عبد المومن[۵۲] بعمر ۵۸ یا ۶۰ سال بہترین حکمرانی کے بعد ۵۵۸ھ میں مر گیا۔ رفاہی کاموں کے اعتبار سے اس کا شمار بہترین حکمرانوں میں کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ[۵۳] "پہلا حکمراں تھا جس نے مغرب اقصیٰ کے اراضی کی پیمائش کرا کر اس پر مالگزاری مقرر کی۔ ورزشی کھیلوں کو ایجاد کیا اور مدارس میں سب سے پہلے اسی نے کشافہ (اسکاؤٹنگ) کو جاری کیا"۔ اس کے بعد اس کے گھرانے کے ابو یعقوب یوسف بن عبد المومن، یعقوب منصور باللہ، ابو عبد اللہ محمد بن یعقوب الملقب ناصر لدین اللہ، یوسف بن ابو عبد اللہ محمد ناصر لدین اللہ الملقب بہ مستنصر باللہ، عبد الواحد بن یوسف بن عبد المومن الملقب بہ مستکفی باللہ، عبد اللہ بن یعقوب منصور باللہ الملقب بہ عادل، یحییٰ بن ابو عبد اللہ محمد ناصر لدین اللہ، ابو العلا ادریس بن یعقوب [illegible] مومن، عبد [illegible] بن ابو العلا ادریس الملقب بہ رشید، علی بن ادریس الملقب بہ معتضد، عمر بن [illegible] یعقوب منصور باللہ الملقب بہ مرتضیٰ، ابو دبوس ادریس بن عبد اللہ بن یعقوب منصور باللہ، کل بارہ حکمرانوں نے ایک سو دس سال تک حکمرانی کی

---

۵۱ وفیات الاعیان۔ جلد اول۔ صفحہ ۳۱۰۔

۵۲ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ سال ولادت ۵۰۰ھ بھی کہا جاتا ہے اور ۴۹۰ھ بھی۔

۵۳ فتوح المغرب۔ مطبوعہ انتظامی پریس حیدرآباد دکن۔ صفحہ ۷۶۔

"زیری" کو شریک کر لیا جائے تو بقول ابو الفداء ۹ حکمرانوں نے یکے بعد دیگرے حکومت کی آخری حکمران حسن بن علی، جو بحیرۂ روم کا سلطان المسلمین کہلاتا تھا افریقہ کے اندرونی خلفشار و نیز اس شدید قحط کی وجہ سے جو وہاں تقریباً آٹھ سال رہا۔ صقلیہ کے حکمران "نارمن راجر" کے حملہ کی تاب نہ لا سکا جس نے موقع کو غنیمت جان کر اپنے زبردست بیڑے سے جس کی تعداد بقول ابو الفداء دو سو پچاس تھی مہدیہ پر ۵۴۳ھ میں حملہ کر کے قبضہ کر لیا جس نے مہدیہ سے نکل کر مصر سے مدد چاہی مگر نہ مل سکی۔ اس کے بعد سلطان بجایہ (مراکو) کی طرف رجوع کیا لیکن "بجایہ" اس وقت "موحدین" کے پہلے حکمران عبد المومن بن علی کے قبضہ میں آ چکا تھا۔ اسلئے کچھ نہ ہوا۔ غرضیکہ ۵۴۳ھ میں صنہاجی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ البتہ ۵۵۵ھ میں جب عبد المومن بن علی نے فرنگیوں کو ۱۲ سال کے بعد مہدیہ سے نکالکر اس پر قبضہ کیا تو حسن بن علی کو اپنی طرف سے وہاں کا نائب والی مقرر کر دیا تھا۔

تونس اور مُوحّدین

مغرب اقصی کے "کوہ سوس" کے قبیلہ کا ایک شخص محمد بن تومرت نامی نے حصول علم اور مشرقی سیاحت کے بعد اپنے ملک میں آکر پابندی شرع کی۔ دعوت دینی شروع کی اور اس طرح سے اپنی ایک جماعت بنالی جس کا نام اس نے "موحدین" اور اپنا لقب "مہدی" رکھا۔ سب سے پہلے مصر سے واپسی پر بقول ابن خلکان ۵۱۱ھ میں وہ بعہد امیر یحیٰی بن تمیم صنہاجی "مہدیہ" میں آیا اور یہیں سے اس نے یہ تحریک شروع کی جو ممکن ہے کہ ابتداءً محض دینی ہو۔ لیکن بعد میں جب اس کو قوت حاصل ہو گئی تو وہ خالص سیاسی تحریک تھی۔ جس کا منشا اغلباً نہ صرف یہ تھا کہ دولت "مرابطینہ" کا خاتمہ کر کے مراکش پر قبضہ کرے۔ بلکہ پورے ممالک مغرب اور اندلس پر بھی قبضہ کر لے۔ بہر حال جب وہ اپنی اس تحریک کو لیے ہوئے مراکش[۵۱] پہنچا۔ جہاں سلطان یوسف بن تاشفین حکمران تھا تو اس کے وزیر مالک بن وہیب قرطبی نے سلطان کو اس کے قتل کا مشورہ دیتے ہوئے کہا:[۵۲]

> "واللہ اس کی غرض پابندی شرع نہیں ہے بلکہ ملک پر قبضہ کرنا ہے۔ اگر آپ اس کو قتل نہ کریں تو کم از کم قید کر دیں۔ لیکن اُس نے اِن دونوں باتوں کو نہ مانا۔ البتہ اُس کو شہر بدر کر دیا۔"

---

۵۱ مراکش (میم کو زیر۔ ر کو تشدید اور ک کو پیش ہے) دو لفظوں سے مرکب ہے جس کے معنی "جلد بھاگو" کے ہیں۔ یہ ایک سخت ناپاک جگہ تھی جہاں ڈاکو رہتے تھے اور قافلوں کو لوٹتے تھے۔ چنانچہ جس وقت قافلے اس جگہ پہنچتے تھے تو ان کو سالار کی طرف سے یہ حکم ہوتا تھا کہ یہاں سے "جلد چلو" اسی نام پر اسی جگہ سلطان یوسف بن تاشفین نے اپنے پایۂ تخت کی تعمیر کی اور اس کا نام "جلد چلو" (مراکش) مشہور ہو گیا۔ (معجم البلدان۔ مطبوعہ مصر۔ جلد ہشتم۔ صفحہ ۷۔)

۵۲ تاریخ ابو الفداء۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۳۲۔

باز پرس کی جس کا جواب اس نے علانیہ دیا کہ تونس کے خطبہ سے عبدالمومن کا نام نکال دیا۔ اور موحدین کی اطاعت کا جُوا اپنی گردن سے پھینک دیا۔ البتہ خطبہ میں مہدی کا نام باقی رکھا۔ اس نے نہ صرف اپنے آقا مرتضیٰ باللہ کی حکومت چھینی بلکہ لقب بھی چھین لیا۔ اور خود کو مرتضیٰ باللہ کے لقب سے ملقب کیا۔ چونکہ موحدین انتہائی عروج پا کر اب انتہائی کمزور ہو چکے تھے۔ اس لئے ابو زکریا کا کچھ نہ کر سکے۔ بلکہ ابو زکریا نے اعلان خود مختاری کے بعد "تلمسان" اور "زاب" تک کے علاقہ جات کو فتح کر کے تونس کی مملکت میں اُن کو شامل کر لیا تھا۔

اس کے بعد اس کا بیٹا ابو عبداللہ محمد الملقب بہ مستنصر باللہ حکمران ہوا۔ جس نے تقریباً سات سال حکمرانی کر کے ۶۷۵ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے یحییٰ بن محمد الملقب بہ واثق باللہ نے عنانِ حکومت سنبھال لی۔ لیکن اتنا کمزور تھا کہ تین سال بھی مشکل سے حکومت کر سکا۔ چنانچہ ۶۷۸ھ میں اس کے چچا ابو اسحٰق ابراہیم (امیر بجایہ) نے اس کو حکومت سے ہٹا کر خود حکومت لے لی۔ اور اس کے لڑکوں سے مل کر اس کو اور اس کے ایک لڑکے الفضل کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد واثق کے حامیوں نے "بجایہ" ایک شخص احمد بن مرزوق بن ابی عمار کو محض ابو اسحٰق سے واثق کا انتقام لینے کی خاطر یہ کہہ کر کھڑا کر دیا کہ یہ واثق کا بیٹا الفضل ہے۔ جس کے متعلق یہ شہرت دیدی گئی تھی کہ وہ بھی باپ کے ساتھ قتل کر دیا گیا ـــــ پھر کیا تھا اس مصنوعی الفضل کے بہت سے حامی ہو گئے اور تونس میدانِ کارزار بن گیا۔ بہر حال اس جنگ میں ابو اسحٰق وغیرہ کام آ گئے۔ البتہ اس کا بھائی ابو حفص عمر بن ابو زکریا بچ گیا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد جب یہ راز کھل گیا کہ جو شخص الفضل بنا تھا وہ فی الحقیقت جھوٹا مدعی تھا۔ تو فوراً ہی سیاست کا پانسہ پلٹ گیا۔ وہ جھوٹا مدعی قتل کیا گیا اور ابو حفص عمر بن ابو زکریا الملقب بہ مستنصر باللہ ثانی نے حکومت سنبھالی۔

مستنصر باللہ ثانی کا شدید علالت کے بعد ۶۹۵ھ میں انتقال ہو گیا۔ اور لوگوں نے واثق کے چھوٹے بیٹے ابو عصید کو جو بچ گیا تھا اور اب جوان تھا، اس کے بجائے تخت حکومت پر بٹھا دیا۔ اس کا لقب مستنصر باللہ ثالث ہوا۔ یہ زیادہ ـــــ زندہ نہ رہا۔ اور ۷۰۹ھ میں ۱۴ سال کی حکمرانی کے بعد مرگیا۔ اس کے مرنے کے بعد پھر خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اور ابو حفصی آپس میں ۷۲۱ھ تک دست و گریباں رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یحییٰ بن زکریا لحیانی جو عبدالواحد کا پوتا تھا۔ باوجود کوشش اور مقابلہ و مقاتلہ کے اپنے بھائی ابو بکر کی تاب نہ لا کر اسکندریہ چلا گیا۔ اور پھر باوجودیکہ ابو بکر کو تونس سے بھاگنا پڑا اور ملک لحیانی کے لئے

کانفرنس گزٹ علی گڑھ

یعنی

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا تعلیمی و اصلاحی اخبار

جو زیر نگرانی

نواب صدر یار جنگ بہادر آنریری سکرٹری کانفرنس

مہینہ میں چار بار شائع ہوتا ہے اور اس میں علی گڑھ تعلیمی تحریک، مسائل تعلیم و تربیت، موجودہ نظام تعلیم اور اصلاح تمدن و معاشرت پر بحث کیجاتی ہے۔ ہندوستان کے اسلامی پریس نے نہایت عمدہ و حوصلہ افزا الفاظ میں اس پر ریویو کیا ہے اور اس کے اخلاقی و اصلاحی بلند پایہ مضامین کی خاص طور پر مدح و ستائش کی ہے۔ طلبہ، اساتذہ، والدین اور عام ناظرین غرض سب کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور ضروری ہے۔ اخبار بہت عمدگی اور نفاست سے اچھے کاغذ پر چھپتا ہے اور متعدد تعلیم یافتہ و لائق اصحاب اس میں بلند پایہ مضامین لکھتے ہیں اور جدید تالیفات پر خاص اہتمام سے ریویو کر کے ارباب تالیف کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ نمونہ ایک کارڈ لکھنے پر مفت ملتا ہے۔ جو اصحاب بلا ادائے قیمت پیشگی اخبار کے خریدار ہوں گے اُن کی خدمت میں دو کتابیں یعنی التربیتہ و التعلیم ضخامت ۱۵۰ صفحہ اور رسالہ تمدن و معاشرت ضخامت ۸۰ صفحہ ہدیۃً پیش کش کی جائیں گی۔ یہ دونوں کتابیں نہایت مفید و قیمتی مضامین پر مشتمل ہیں، جو تعلیم و تربیت، مذہب اور اصلاح معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ کانفرنس گزٹ کی سالانہ قیمت تین ۳ روپیہ ہے۔ جنگ کی وجہ سے قیمت میں اضافہ نہیں کیا گیا۔

ایڈیٹر:- محمد اکرام اللہ خاں ندوی

ملنے کا پتہ

صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علیگڑھ یو۔پی

غرضیکہ جب سلطان سلیم بن بایزید نے ۹۲۳ھ میں مصر کو فتح کر کے اس کا انتظام و انصرام ایک نائب حاکم بے مصری کے سپرد کیا تو اس وقت سے افریقہ بھی جو فرنگیوں کے حملوں سے نجات چاہتا تھا دولتِ عثمانیہ کی بڑھتی ہوئی قوت سے امداد کا طالب ہوا۔ کیونکہ تونس شمالی کے قرب و جوار کے جزائر بھی دولتِ عثمانیہ کے تحت آچکے تھے۔ چنانچہ حفصیوں کی مدد کے لئے ایک طرف سے دوستانہ لباس میں اسپینی آئے تو دوسری طرف سے حفصیوں کی درخواست پر دولتِ عثمانیہ نے اپنے اس مشہور جرنیل خیر الدین پاشا باربروس کو بھیجا جس کی سپاہ گری کا اس وقت سکہ بیٹھا ہوا تھا چنانچہ باربروس کو فتح ہوئی اور اسپینیوں کو شکست ہوئی۔ باربروس نے تونس پر قبضہ کر کے دولتِ عثمانیہ سے ملحق کر دیا۔ چنانچہ ۹۸۱ھ سے یہ حکومتِ عثمانیہ ہی کا صوبہ رہا۔ غرضیکہ حفصیوں کے آپس کے جھگڑوں نے آخر کار حفصی حکومت کا دسویں صدی ہجری کے وسط میں ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ اور خود مختار سلطنت نے مصر کی طرح سے صوبہ کی شکل اختیار کر لی۔

حکومتِ عثمانیہ اور تونس حکومتِ عثمانیہ نے دسویں صدی ہجری کے وسط میں تونس پر قبضہ کرنے کے بعد اس کا نظام ابتداءً وہی رکھا جو مصر کا تھا۔ البتہ لقب کا فرق رکھا۔ چنانچہ مصر کے والی کو خدیو اور تونس کے حکمران کو والی کہتے تھے جو "پاشا" کے مرتبے کا آدمی ہوتا تھا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد بعض مقامی سیاسی پیچیدگیوں کی وجہ سے وہاں دو ہم مرتبہ عہدیدار۔ ایک فوجی اور دوسرا ملکی۔ مقرر کر دئے، جن کو علی الترتیب "دائے" اور "بائے" سے ملقب کیا گیا۔ اور اس طرح سے فوجی اور ملکی نظام کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا۔ مگر پھر بھی "بائے" یا "بک" کو اول الذکر پر بہ اعتبار اختیارات کے تفوق حاصل رہا۔ کیونکہ اصولاً تمام ملک کا نظام داخلی "بائے" کے سپرد تھا۔ اور وہی اس کا ذمہ وار تھا۔ البتہ جتنی فوج تھی جو سات اوجاقات (پلٹنوں) پر مشتمل تھی اور جو مختلف مقامات کی سات چھاونیوں میں منقسم تھی، وہ "دائے" کے ماتحت تھی۔

ہر "اوجاق" پر ایک فوجی افسر ہوتا تھا۔ جس کو "آغا" کہتے تھے۔ بہر حال یہ طریق کچھ عرصے تک کامیابی سے چلا۔ لیکن آخر کار دونوں حاکموں میں نزاع شروع ہو گیا۔ جو یہاں تک بڑھا کہ ملک میں بدامنی اور شورشیں شروع ہو گئیں۔ جس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ انقلاب شدید ہوا اور وہاں کے لوگوں نے ولایت "باجہ" کی چھاؤنی کے ایک افسر "آغا" حسین بن علی ترکی کو ۱۱۱۷ھ میں باتفاق آراء

خالی کرنا پڑا۔ اور اہل ملک اس کے خواہاں بھی تھے مگر وہ رُک گیا۔ چنانچہ جن کو انھوں نے اس کو رکھا تھا اور جو ابوبکر معزول کا بیٹا تھا بھائی یعنی محمد بن ابوبکر نے کچھ عرصے تک حکمرانی کی۔

اس کے بعد ابو یحییٰ بن ذکریا اس کو حکمران ہوگیا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ[1] نے لکھا۔ ۷۲۵ھ میں بارادۂ حج بیت اللہ اپنے وطن طنجہ سے نکلا ہے تو سب سے پہلے تونس پہو سلطان ابو یحییٰ بن ابو ذکریا یحییٰ بن ابو اسحٰق ابراہیم بن ابو ذکریا یحییٰ بن عبد الواحد حکمران تھا۔ جب وہ دنیائے مشرق کی سیاحت کر کے ربع صدی کے بعد ۷۵۰ھ میں اپنے وطن جا۔ پھر تونس آیا تو اس وقت ابو الحسن[1] بن ابو سعید بن ابو یوسف بن عبد الحق حکمران تھا۔ حفصیوں کم و بیش تین صدی تک رہی۔ اس عرصہ میں شاہ فرانس لوئیس نہم نے جس کو سانت ! بعہد ابو عبد اللہ محمد بن ابو ذکریا المستنصر باللہ ۶۶۸ھ مطابق ۱۲۷۰ء میں تونس پر حملہ کر دیا۔ کو سخت ہزیمت ہوئی۔ فرنگیوں کو اسلامی ممالک میں یہ پہلی ہزیمت نہیں ہوئی۔ بلکہ اس سے ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ لیکن چونکہ فرنگستان بیدار ہو چکا تھا اس لئے اپنے بچاؤ کا اس بہتر طریقہ استعمال نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مختلف اوقات میں بلا خیال انجام حملہ آوروں پر الغیر میں حملہ کرتا رہے۔ تاکہ اپنی مدافعت سے ان کو فرصت ہی نہ ہو۔ کہ وہ فرنگستان کے حملے یہ اسکیم کامیاب ہوئی اور نہ صرف فرنگستان پر حملے کا سدباب ہوا بلکہ فاتح کو آخر کار ایک نا مفتوح ہونا پڑا۔ بہرحال تونس نے حفصیوں کے عہد میں ہر گونہ ترقی کی۔ عالی شان محلات کارخانہ جات کپڑہ سازی وغیرہ انہی کے عہد کے زریں کارنامے ہیں۔ تجارتی تعلقات او توسیع اسی عہد میں زیادہ ہوئی۔ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت تک۔ تھا جب تک کہ حفصیوں میں وارتباط کارفرما رہا۔ دسویں صدی کے وسط میں جب ان کے آپس میں رسہ کشی شروع ہو گئی فرنگستان تھا۔ اور اب بھی رہتا ہے۔ تو فرنگیوں نے دوستانہ کے دستانے پہن کر دشمن کے لئے بڑھایا۔ چنانچہ بعض حفصیوں نے ان کی مدد کو لبیک کہا۔ لیکن بعض ایسے بھی تھے دولتِ عثمانیہ سے مدد مانگی۔ جو اس وقت تقریباً پورے ایشیائے کوچک اور مشرقی یورپ حصے کی مالک ہو چکی تھی۔

---

[1] رحلہ ابن بطوطہ۔ طبع مصر۔ صفحہ ۱۷۹۔

کی سماعت کرتا تھا۔ اس کے علاوہ فرنگیوں کے مقدمات اور جھگڑوں کا بھی یہی فیصلہ کرتا تھا۔

آغا قصبہ[12] :۔ یہ چھوٹے چھوٹے فوجداری مقدمات کی سماعت کرتا تھا اور انکشاری فوج کا افسر بھی ہوتا تھا۔

صدر مجلس تجارت[13] :۔ جس میں دس[1] اراکین ہوتے تھے۔ یہ مجلس اہم تجارتی معاملات پر غور کیا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ ہر صنعت کے لئے ایک انسپکٹر (امین) بھی ہوتا تھا۔ جو متعلقہ صنعت کے معاملات اور جھگڑوں کو طے کیا کرتا۔

کاہیہ[14] دار باشا :۔ یہ بلدہ کا ناظم فوجداری درجہ دوم (سٹی مجسٹریٹ) ہوتا تھا۔ ان انتظامی عہدوں کے علاوہ قاضی اور مفتی وغیرہ کے بھی عہدے ہوتے تھے۔

اس طریقہ انتظام پر ایک صدی بھی گزرنے نہیں پائی تھی کہ گورنروں کے دماغوں میں خود مختاری کا سودا سمایا۔ چنانچہ بعد احمد پاشا (جو ۱۲۵۲ھ میں گورنر ہوا تھا) اس کا اظہار کھلم کھلا ہونے لگا۔ احمد پاشا نے اپنے باپ کی ڈالی ہوئی داغ بیل پر یوں تکمیل کرنی شروع کی کہ فوج کی تنظیم پر زیادہ توجہ کرنے لگا۔ اور ان کے سرداروں کو معزز تر کرنے لگا۔ اس کے علاوہ حکومت کی حیثیت ترکیبی کو بھی اس طرح سے بدلا کہ گویا باب عالی سے تعلقات بحال رکھے۔ حنفیوں کے بڑے مفتی کو "شیخ الاسلام" کا لقب دیا۔

فوج کے عہدوں کی تنظیم شاہی فوج کی مانند شروع کر کے ان کے عہدوں کے نام وہی رکھے۔ چنانچہ "بک باشی" (کپتان) "بلوک امین" (کمپنی کمانڈر) "قائم مقام" (لفٹننٹ کرنل) "امیر الائی" (کرنل) "امیر لواء" (بریگیڈیر جنرل) "امیر الامراء با فریق" (ڈویژنل جنرل) کے علی الترتیب عہدے قائم کئے اس کے علاوہ پانچ قسم کے "تمغہ جات" (نشانات افتخار) فوجیوں کے لئے اور ایک مخصوص "تمغہ" (نشان) اپنے خاندان کے لئے ایجاد کیا۔

اُس وقت تک ماتحت صوبہ ہونے کی حیثیت سے وزارت کا عہدہ نہیں تھا۔ اس نے سیاسی حیثیت کو بڑھانے کے لئے وزارت بھی قائم کی۔ اور وزیروں کا تقرر کر کے اُن سرکاری خطابات بھی دئیے۔ لیکن ان تمام انتظامات و تبدیلیوں کے باوجود باب عالی سے مراسلت کے وقت کافی احتیاط سے کام لیتا تھا تاکہ ایسا نہ ہو کہ باب عالی کو "خود مختاری" کے اس مخفی جذبہ کا علم ہو جائے۔ اسی لئے صوبہ کو دولت یا مملکت کے الفاظ سے بھی تعبیر نہیں کیا کرتا تھا۔ اسی طرح سے سیاسی مراسلت میں اپنے بنائے ہوئے وزیروں کو ظاہر نہیں کرتا تھا۔ غرضیکہ خود مختاری کا یہ مخفی سودا آخر رنگ لائے بغیر نہ رہ سکا۔

اپنا حاکم مقرر کر کے دونوں "دائے" اور "باشے" کو قتل کر دیا اور اس کے بعد بابِ عالی میں معروضہ پیش کر کے اپنے انتخاب کی توثیق کرا لی۔ لیکن اس کے باوجود اس کا لقب "باشے" ہی رکھا۔ بابِ عالی نے صرف ان کے انتخاب کی توثیق ہی نہیں کی بلکہ اس خدمت کو اس گھرانے میں موروثی بھی قرار دے دیا۔

اس کے ایک سو سال کے بعد ہی مصر میں بھی اسی طرح سے "خدیوی" محمد علی پاشا کے گھرانے میں موروثی کر دیا گیا۔ ۱۱۱۷ھ سے اس وقت تک تونس میں حسین بن علی کا ہی گھرانا حکمراں ہے۔ بہرحال باوجود تغیرات بیرونی و ریشہ دوانیوں کے تونس کا بابِ عالی سے ماتحتانہ تعلق عرصہ دراز تک رہا۔ اور حسب دستور اندرونی انتظامات کے اہل تونس مختار رہے۔ بابِ عالی نے ان کے اندرونی انتظامات میں کبھی مداخلت نہیں کی۔ حکومت کی تشکیل حسب ذیل عہدیداروں پر منحصر تھی:۔

والی :۔ گورنر۔

دیوان :۔ گورنر کی مُہر کی محافظت اور نیچے کے درجے کے ملازمین سرکار سے مراسلت کرتا تھا۔ گویا گورنر اور ملازمین تخت کے درمیان ایک واسطہ تھا جس کو "حافظ ختم الوالی" یا "صاحب الطابع" کہتے تھے۔

چیف سکریٹری :۔ باش کاتب۔

بخشی :۔ خزانہ دار۔

چیف آغا :۔ باش آغا جو تمام پلٹنوں اور رسالوں کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا۔

مہتمم اسلحہ خانہ :۔ امین ترسانہ۔

کاہیہ :۔ گورنر کا نائب جو احکام جاری کرتا تھا۔

چیف حاجب :۔ یہ فریادیوں اور گورنر کے درمیان واسطہ ہوتا تھا۔ یہ دو ہوتے تھے۔ ایک تُرک اور ایک عرب تاکہ دونوں جماعتوں کی صحیح فریاد گورنر تک پہنچ سکے۔

چیف مملوک :۔ "باش مملوک" یہ محل کے انتظامی امور کا سردار ہوتا تھا۔

دائے :۔ یہ صدر ناظم عدالت فوجداری (چیف مجسٹریٹ) ہوتا تھا۔ جس کو سوائے قتل کے جو خاص گورنر کا اختیاری ہوتا تھا۔ جملہ فوجداری اختیارات ہوتے تھے۔

کوتوال شہر :۔ "شیخ المدینہ" اس کے ذمہ نہ صرف شہر کی حفاظت و راحت تھی بلکہ جملہ فوجداری مقدمات

عرض کرتا ہے کہ میں نے اعیان موجودین کی بیعت کو بتاریخ ۲۰ محرم الحرام ۱۲۵۱ھ کو اپنے بھائی مرحوم و مقدس سیدی محمد پاشا "بائے" کی طرف سے قبول کیا۔ جس نے تمام باشندگان سے عہد کیا تھا کہ اُن کی جانیں، اُن کا مال، اور اُن کے دین مامون و محفوظ رہیں گے۔ میں نے بھی اسی قسم کی قسم کھائی ہے۔ اور اب بھی اللہ سے اسی کا مضبوط عہد کرتا ہوں۔ اور یہ بھی عہد کرتا ہوں کہ میں اس کی خلاف ورزی نہیں کرونگا۔ یہ الفاظ میرے لکھے ہوئے ہیں۔ میرا خط اور میری مہر اس کی توی ترشاہد، اور واضح تر اعلان تمام ملازمین اور باشندگان ملک کے لئے ہیں۔ لہٰذا اسی کے اعتبار سے تم پر اس کی فرمانبرداری لازم ہے۔ اللہ کی قوت جماعت کے ساتھ ہوتی ہے۔"

تاریخ واقعات کا اعادہ کیا کرتی ہے۔ چنانچہ تونس پر قبضہ کرنے سے قبل جس طرح سے آلِ عثمان نے الجزائر پر قبضہ کیا تھا۔ اسی طرح سے اُس فرانس نے جو عرصے سے تونس کو للچائی ہوئی نظر والے سے دیکھ رہا تھا، پہلے الجزائر پر (جس کو "الجیریا" کہتے ہیں) قبضہ کیا۔ اور اس کے بعد حسب دستور اس پر قبضہ کا راستہ نکالا۔ مغربی سیاست کا یہ کرشمہ ہے کہ پہلے ایک ملک میں آپس میں پھوٹ ڈلوائی جائے، اس کے بعد بیچ بچاؤ کی کوشش کی جائے۔ اس کے علاوہ دوسری چال قرضہ دینے کی بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ملک خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ جب کبھی وہاں وزارت کی کشمکش ہوگی تو نہ صرف استبدادیت اپنا مظاہرہ کرتی ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی ملک کی مالی حالت روز بروز گرتی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وزارت خواہ بادی النظر میں کمزور ہو یا نہ ہو۔ لیکن حکومت کے اجزائے ترکیبی میں گھن لگ جاتا ہے۔ اور بالآخر "ساہوکارانہ" قبضہ ہمیشہ کے لئے ہو جاتا ہے۔

چنانچہ یہی حال "تونس" کا ہوا۔ وہ تونس جو صنعت گھر تھا اور اسی وجہ سے وہ مالا مال بھی تھا۔ مالی پستی میں مبتلا ہوگیا۔ چنانچہ بعہد وزارت مصطفےٰ خزانہ دار ملک کی مالی حالت جب بد سے بدتر ہوگئی، تو قرض کے لئے ہاتھ بڑھانا پڑا۔ مشرقی حکومتوں میں نہ ساہوکارے کا دستور تھا، نہ ان کے اُصول میں ساہوکارانہ قبضہ جائز تھا۔ اِس کے علاوہ خیالی آزادی کی خاطر مشرق کی طرف رجوع کرنا خلافِ مصلحت بھی تھا۔ لہٰذا دول یورپ اور بالخصوص دولتِ فرانس نے فوراً قرضہ دے دیا۔ جو بڑھتے بڑھتے اتنا ہوگیا کہ ادائیگی ناممکن ہوگئی۔ جب فرانس کو یہ اطمینان ہوگیا کہ اب ادائیگی ناممکن ہوگئی ہے، تو اُس وقت اُس نے نہ صرف ہاتھ روک لیا۔ بلکہ ادائیگی کا تقاضہ شروع کر دیا۔ جس وزارت کی زندگی مسلسل قرضہ پر گزری ہو

اور یہ چھوٹا سا صوبہ جو عرصے سے فرنگیوں کے لئے جاذبِ نظر تھا۔ آخر کار ان کے نذر ہوگیا۔ کسی ملک کا محض ادعائے خود مختاری اُسے خود مختار نہیں بنا سکتا ہے۔ بلکہ اُس ملک کے پاس خود مختاری کو برقرار رکھنے کے لئے المضاعف طاقت ہونی چاہیئے۔ تاکہ خود مختاری حاصل ہونے کے بعد جو شکاری ہمدردی کے پردے میں بیٹھے ہوئے شکار کے منتظر ہیں وہ نشانے کی جرأت نہ کرسکیں اسلام کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہے کہ جب کسی دُور دراز مقام کے کسی صوبہ نے بعض بیرونی اثرات میں آکر مرکز سے علیحدگی اختیار کی اور گویا خود مختار ہوا۔ اُس کی نہ صرف خود مختارانہ زندگی حُباب ثابت ہوئی۔ بلکہ اُس کی غلامی کا دائمی پٹہ لکھدیا گیا۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سابقہ جنگِ فرنگ کے واقعات اِس قسم کے خود مختارانہ جذبے اور اس کے انجام کی شہادت دے رہے ہیں۔

اُنیس۱۹ سال کی اسکیمی حکمرانی کے بعد ۱۲۷۱ھ میں احمد پاشا کا انتقال ہوگیا۔ اور اس کے بعد اس کا بیٹا محمد پاشا حکمراں ہوا۔ جس نے باپ کی پوری پوری تقلید کی۔ پانچ سال کے بعد ۱۲۷۵ھ میں اس کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور اس کے بجائے اس کا بھائی صادق پاشا حکمراں ہوا۔

عہدِ بابایات صادق پاشا کے عہد کو اصولاً اعلانِ خود مختاری کا عہد کہنا چاہیئے۔ جس نے بابِ عالی سے نہ صرف مساویانہ مراسلت شروع کی۔ بلکہ "صوبہ" کو "مملکت" اور "بائے" یا "بے" کو "بادشاہ" کے الفاظ میں بدل کر "قانون حکومت" میں درج و داخل کیا۔ اور اس مرمرہ قانون کے نسخہ جات تقریباً تمام مغربی حکومتوں کے پاس بھیجدیئے تاکہ اِس خود ساختہ آزادی کے وہ گواہ رہیں۔ نپولین ثالث سے "الجزائر" میں ملاقات کی اور اُس کو دست بدست یہ نسخہ دیا۔

بابِ عالی سے مراسلت کرتے ہوئے وزارت کی ایجاد کا اظہار کیا۔ اور جس طرح سے شاہانِ ممالک یورپ تاج پوشی کے وقت عہد لیتے اور دیتے ہیں۔ اسی طرح سے اس نے بھی عوام سے بیعت لیتے ہوئے حسب ذیل عہدنامے یا حلف نامے کا اعلان کیا:۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ مبارک ہے وہ ذات جس نے امن کو آبادی کا قوی تر سبب بنایا اور درود و سلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم پر۔

بندۂ ناچیز محمد "صادق پاشا" بائے (خدا اپنی مرضی کی اس کو توفیق عطا فرمائے اور اُس کی مدد فرمائے

توجہ دلائی۔ "بائے" نے فوراً ارباب حکومت کو جمع کرکے جس میں خیرالدین پاشا بھی تھا۔ اس مسئلہ پر گفتگو کی۔ کمزور کی گفتگو کمزور تر ہوتی ہے۔ چنانچہ سوائے سر تسلیم خم کرنے کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ یورپ کے سیاسی ڈرامہ کا یہ پہلا پردہ تھا۔ چنانچہ یہ تماشہ کامیابی سے ختم ہوا۔ اور اختلاف دور ہوگیا۔

سیاست کا دوسرا قدم بھی اٹھنا ضروری تھا۔ اسلئے مخلوط مجلسیں اور عدالتیں قائم کی گئیں۔ جو "امتیازات" یا بلفظ انگریزی (Capitulation) کا پہلا قدم تھا۔ ان مجلسوں کے ذریعہ سے سب سے پہلے یہ کام کیا گیا کہ قوانین مغرب اور قوانین اسلامی کو مخلوط کیا گیا۔ چنانچہ یورپ کے قوانین کے ایک ماہر کو مقرر کیا گیا کہ وہ ملک کے حالات کے اعتبار سے مغربی قوانین سے احکام منتخب کرے۔ چنانچہ ایسا ہوا اور وہ مغربی احکام، قانون شرع کے ہوتے ہوئے جس کے نل ہونے میں صرف عقیدے ہی کے اعتبار سے نہیں بلکہ فی الحقیقت شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ خ الاسلام اور علماء کے سامنے تنقید و تبصرہ کے لئے پیش کئے گئے اور یہ خواہش کی گئی کہ ان کو یکہ کر وہ ایسا قانون شرعی مرتب کریں کہ احکام مغرب اور شرع کے مطابق وہ قانون ہو۔ یہ ستم ظریفی بس تھی تو کیا تھی۔ جس طرح سے شرعی احکام کو برقرار رکھتے ہوئے مغربی احکام نافذ کئے گئے ہونگے ں کے لئے تونس کا موجودہ سیاسی مرتبہ خود شاہد ہے۔ کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ ب "امتیازات" کا پہلا قدم مضبوط ہوگیا اور دونوں قسم کے قانون جاری ہوگئے تو دوسرا قدم رپی سرمایہ سے ریلوے کا اجرا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے ایک انگریزی کمپنی سے حسب درخواست ماہدہ ہوا۔ لیکن وہ کسی وجہ سے فسخ ہوگیا۔ جس میں بالیقین فرانس کا ہاتھ ہوگا۔ کیونکہ فرانس نے ض کا ڈھیر لگا کر اس پر مالی اور سیاسی حیثیت سے پورا قبضہ پہلے ہی سے کر رکھا تھا۔ چنانچہ اسکے ایک فرانسیسی کمپنی[۵] "بون کا ملہ" کو ٹھیکہ دے دیا گیا۔ جس نے تونس سے الجزائر تک کی لوہے بنادی۔

ان دوستانہ مداخلتوں اور مشوروں کے بعد "اقتدار اعلیٰ" کا جو وزن ہو سکتا ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ لیکن ادھر مغربی یورپ حکومت عثمانیہ کی نوآبادیات میں اپنے "ہمدردانہ" مشوروں سے تونس کو "آزاد"

---

۵ "الہلال" جورجی زیدان۔ مصر۔ جلد ۱۰۔ ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۹۰۔

اُس کا خزانہ مال سے بے نیاز رہتا ہے۔ چنانچہ جب تقاضہ سخت ہوا تو مصطفیٰ خزانہ دار نے (جو بے خزانہ کا خزانہ دار تھا) قلمدانِ وزارت مال شیخ محمد عبدالعزیز کے سپرد کر دیا۔ اور یہ سارا بوجھ اُس پر ڈال دیا۔ شیخ کا کام سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ وہ احکام پر اپنی مُہر لگا دیا کرے۔

دولِ یورپ کو جب یہ کامل یقین ہو گیا کہ اب تونس میں ہرگز قرضہ کی ادائیگی کی طاقت نہیں رہی تو ادائیگی کا سختی سے تقاضہ شروع کر دیا۔ چنانچہ فرانس کے قونصل نے تقاضے کا عملاً مظاہرہ اس طرح سے کیا کہ سیاسی تعلقات کو ہی منقطع کر دیا۔ جو قبضہ کی تمہید تھی ــــ فیصلہ اس سمجھوتے پر ہوا کہ ملکی اور غیر ملکی ماہرینِ مالیات کا ایک کمیشن مقرر کر دیا جائے ــــ ۱۲۸۶ھ میں مالی کمیشن کی تشکیل کر دی گئی۔ بعینہ یہی صورت "نہر سویز" کی تعمیر کے سلسلہ میں بعہد اسمٰعیل پاشا خدیو مصر وہاں بھی اختیار کی گئی۔ جس کے انجام سے کون واقف نہیں ہے۔

تونس کا قرضہ سات برس میں بڑھتے بڑھتے ۲۷ کروڑ پچاس لاکھ فرانک تک پہنچ گیا۔ (ایک فرانک کم و بیش = دس آنے کے مساوی ہوتا ہے) غرضیکہ مالی کمیشن جس نے فی الحقیقت وہاں کے مالیات پر پورا پورا قبضہ کر لیا تھا۔ وزیر کے اس طرح سے ہاتھ باندھ دیئے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جب بات اس نوبت پر پہنچ گئی تو ۱۲۹۰ھ میں اس کو خدمت سے سُبکدوش کر دیا گیا۔ یہ بھی ایک سیاسی چال تھی، کیونکہ اس عمل سے عوام کو خوش کرنا اور ان کو اپنا کرنا منظور تھا۔

سارے تونس میں اِس برطرفی سے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور مطالبہ کیا جانے لگا کہ اس وزیر کا محاسبہ کیا جائے۔ اِس پر مقدمہ چلایا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور اُس سے کچھ مال واپس لیا گیا۔ اِس کے بعد وزارت خیر الدین پاشا تونسی مشہور مصنف کتاب "اقوم المسالک" کے سپرد کی گئی۔ خیر الدین پاشا عالِم اور مدبّر تھا۔ اِس نے عنانِ وزارت ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے سررشتۂ وزارت میں جو بے ضابطگیاں ہوتی تھیں اُن کو بند کیا۔ اس کے ساتھ ہی "مالی کمیشن" کے بھی جو فی الحقیقت ایک سیاسی کمیشن تھا اور جس نے اپنے بہت کچھ پیر پھیلائے تھے، اختیارات کا محاسبہ کر کے اس کو اپنے حدود پر واپس کرنے اور غیر اختیاری اعمال کو روکنے لگا۔

بھلا "مالی کمیشن" جو عملاً سفید تھا اس رنگینی مداخلت کو کیونکر گوارا کر سکتا تھا۔ فوراً اراکین نے اپنے اپنے قونصلوں کو اس مداخلت کی شکایتاً اطلاع کی۔ قونصلوں نے اطلاع پاتے ہی "بائے" کو

اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خیر الدین پاشا کو ۱۲۹۴ھ میں سبکدوش ہونا پڑا۔ اور مسئلۂ امداد زیر تصفیہ ہی رہا۔

عہدِ فرانسیسی اور تونس یوں تو تونس پر فرانسیسوں کا سیاسی قبضہ اُسی وقت سے ہو چکا تھا جس وقت سے کہ دوستانہ قرضہ کی بنیاد پڑی تھی۔ لیکن اس کے کم و بیش دس سال کے بعد مسئلۂ امدادِ جنگ نے فرانسیسیوں کو تونس کا پورا قبضہ دلا دیا۔ خیر الدین پاشا کی سبکدوشی کے بعد "محمد خزانہ دار" کو قلمدانِ وزارت دیا گیا۔ چنانچہ اس نے وزارت کا جائزہ لیتے ہی بابِ عالی کو صاف لکھ دیا کہ "تونس صرف مالی امداد دے سکتا ہے۔" یہ جواب اگر ایک طرف ترکی سیادت کے خاتمہ کا پیام تھا تو دوسری طرف فرانسیسی سیادت کا خیر مقدم بھی کر رہا تھا۔ کیونکہ اس جواب کے بعد دولتِ عثمانیہ کو تونس کے کسی معاملے سے بحث نہیں رہ سکتی تھی۔ عام ازیں کہ وہ آزاد رہے یا غلام بنے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور تونس پر فرانسیسیوں کا قبضہ آج سے پورے ساٹھ سال قبل مکمل طور پر ہو گیا۔ اور صادق پاشا "بائے" نے حکومت عثمانیہ سے تونس کو ہمیشہ کے لئے آزاد کرا دیا۔ اس "مقید آزادی" کے بعد ہی متذکرہ بالا ریلوے کمپنی نے حکومت سے شمالاً جنوباً توسیع ریلوے لائن کی گویا درخواست کی جس پر حسب دفعہ معاہدۂ متعلقہ حکومت تونس نے اختلاف کرتے ہوئے اعتراض کیا۔ جس کا آخر کار حکومت فرانس ہی نے تصفیہ کیا۔ اس قضیہ اور تصفیہ کے بعد ایک زمین کا مسئلہ اٹھا جس کو ایک فرانسیسی "کونت دی سانسی" نامی نے "مصطفےٰ خزانہ دار" کے زمانۂ وزارت میں اس شرط سے خریدا تھا کہ وہاں جانوروں کی پرورش کی جائے گی۔ لیکن چونکہ خریدار نے شرائط کی پابندی سے گریز کیا' لہذا حکومت نے اُس سے باز پرس کی۔ "آزادی" دلانے والی قوم کے فرد نے اس باز پرس اور الزام کے جواب میں اُلٹا حکومت پر ہی یہ الزام لگا دیا کہ "حکومت نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور شرائط کی پابندی نہیں کی۔"

یہ سلسلہ اتنا لمبا چلا کہ وزارتوں پر وزارتیں تبدیل ہوئیں لیکن اس قضیہ کا تصفیہ نہ ہوا۔ آخر کار مصطفےٰ بن اسمٰعیل کے عہدِ وزارت میں گویا جرأت کر کے یہ فیصلہ کیا گیا کہ "کونٹ کا زمین پر کوئی حق نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو بے دخل کیا جائے۔" چنانچہ اس فیصلے کے بعد وزیر نے ایک شخص کو متعین کیا کہ وہ بجبر اس فرانسیسی کو زمین سے بے دخل کر دے۔ لیکن کونٹ نے اس جبر و قوت اور وزارتی تصفیہ

کر رہا تھا۔ اور اُدھر مشرقی یورپ کے صوبہ جات اس سے دست وگریباں اور ایک ایک کر
علیحدہ ہو رہے تھے۔ "معاہدہ" برلین" نے ۱۸۷۸ء میں آخر کار" بلغاریہ" کو نیم مختار کرا دیا جو مختار
ہو کر رہا۔ اس کے بعد جب ۱۲۹۳ھ میں گویا "سرویا" نے دولتِ عثمانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ
اس وقت حسب دستور مروجہ حکومت نے اپنے جملہ ماتحت صوبہ جات کو مدد کے لئے لکھا۔
میں تونس بھی تھا۔ لیکن اس کی نوبت بھی نہ آنے پائی کہ جنگ ختم ہو گئی۔ یہ جنگ ختم ہی ہوئی تھی
رُوس نے اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس موقع پر حکومت نے تونس سے صرف مالی مدد ہی نہیں مانگی
فوجی مدد بھی مانگی۔ خیرالدین پاشا وزیر نے" باشے" سے معروضہ کر کے علماء و وزراء کا ایک
طلب کیا جس میں" باشے" اور ولیعہد نے بھی شرکت کی۔

اس مجلس کے سامنے بغرضِ تصفیہ یہ اہم مسئلہ اس نے پیش کیا۔ جنگی معاملات میں متعلق اور غیر
افراد کی مجلس سے مشورہ کرنا کہاں تک قرینِ مصلحت و سیاست وعقل ہو سکتا ہے۔ اس کی شہادت
نہ صرف سابقہ جنگی تاریخیں پیش کرتی ہیں۔ بلکہ حالیہ واقعات اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ حتّٰی کہ ا
امن کے زمانے میں جو مجلسیں حکمرانی کرتی ہیں وہ جنگ کے زمانے میں ایک حد تک معطل ہو جا
ہیں۔ اور اُن کے بجائے ماہرینِ جنگ کی ایک مختصر جماعت جس کو "جنگی مجلس" کہتے ہیں نہ صرف
جنگ کی مالک ہوتی ہے بلکہ پورے ملک یا ملکوں کی بقا کا بوجھ اپنی گردن پر لے لیتی ہے۔ لیکن
تونس نے جنگی سیاست کے اصول کے خلاف اس مسئلہ کو ایک حد تک مجلس عام کے سامنے بغرض
تصفیہ پیش کیا۔ یہ تجویز کس کے حکم سے؟ اور کیوں رُوبہ عمل لائی گئی؟ اس کے جواب میں ق
دینے والے محسنوں کا نام لے دینا کافی ہے۔ غرضیکہ مجلس میں اختلافِ رائے ہوا جو یقینی تھا۔

چنانچہ بعض افراد مالی مدد پر اڑ گئے۔ بعض مالی وجانی دونوں مددوں پر مصر تھے۔ اور
جو گویا بہت" آزاد" ہو چکے تھے۔ وہ قطعاً انکار کر رہے تھے۔ یہاں یہ کھیل ہو رہا تھا اور و
جانیں اور زمینیں جا رہی تھیں۔ یہاں تصفیہ کرنے میں دیر کی جا رہی تھی۔ وہاں سے بہ عجلتِ ممکنہ امداد
کی جا رہی تھی۔ فرانس کو اپنا بنایا ہوا موقع ہاتھ آگیا۔ اور اُس نے خیرالدین پاشا کو فوراً یہ مشورہ
دیا کہ امداد قطعاً نہ دی جائے۔ چنانچہ اس "دوستانہ" مشورہ کا خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن اسی عرصہ میں ع
میں یہ شہرت پھیل گئی کہ" خیرالدین پاشا کا یہ ارادہ ہے کہ وہ ملک کو فرانس کے حوالے کر دے

اسی طرح سے تونس کے حالات کی بھی اصلاح کر سکیں۔ یہ تجویزیں ایسی نہیں تھیں جن کے نتائج سے اغلباً "بائے" اور اس کے مشیر حتیٰ کہ اہلِ ملک بے خبر ہوں۔ لیکن ملک بالکلیہ بے دست و پا اور بے یار و مددگار تھا۔ اس لئے انکار کی مجال نہیں تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دوسری ہمسایہ حکومت نے اس تحریک پر اعتراض کیا جو شاید تکمیل ضابطہ کے لئے ہو۔ کیونکہ اس اعتراض نے مداخلت کو قوی سے قوی تر بنا دیا تھا۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اضافہ مداخلت کی خاطر اس قسم کا اعتراض تھا۔

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ امیدوار حکومت ابن اسمٰعیل وزیر نے قونصل کو تونس پر قبضہ کرنے کی یہ دوسری تدبیر بتائی کہ وہ ایک فوجی دستہ گورنر (والی) کے محل پر بھیج دے۔ اس فوجی دستہ کو دیکھ کر محل کی عورتیں چلا اٹھیں گی۔ اس وقت "بائے" پیش کردہ شرائط پر دستخط کر دے گا۔ چنانچہ ایسا کیا گیا۔ "بائے" کی اس وقت یہ سمجھ میں آیا کہ مدد کے لئے "اقتدار اعلیٰ" کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ لیکن گھبراہٹ میں اغلباً وہ اس چیز کو فراموش کر چکا تھا کہ وہ "اقتدار اعلیٰ" کی سیادت کا عرصہ ہوا خاتمہ کر چکا تھا۔ چنانچہ "باب عالی" میں معروضہ بے نتیجہ ثابت ہوا اور وزیر با تدبیر کی چالبازی نے اس کو شرائط پیش کردہ پر دستخط کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔ جس نے تونس کی آزادی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

ہم پلہ کا معاہدہ مساویانہ ہوتا ہے اور اصولاً و معناً وہی معاہدہ ہے۔ لیکن ضعیف و قوی کے مقابلے میں لفظ "معاہدہ" کا اطلاق غلط ہے۔ کیونکہ یہ لفظ اپنے میں مساوی تقابل کا مفہوم رکھتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ فرانسیسیوں نے جتنی شرطیں پیش کیں جو ایک کمزور کے مقابلے میں تھیں وہ سب فرانسیسی مفاد کی حامل تھیں۔ کمزور کا کمزور ہونا موجودہ مغربی سیاست کی بارگاہ میں وہ جرم ہے جس کی سزا سوائے موت کے اور کچھ نہیں ہے۔ جس کے معلوم کرنے کے لئے پرانی تاریخوں کے اوراق الٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ حالیہ جنگ کی رفتار اس کا زندہ ثبوت ہے۔ جس نے صدیوں کے آزاد ملکوں کا گھنٹوں اور منٹوں میں گلا گھونٹ دیا۔ جرم صرف یہ تھا کہ وہ ملک حملہ آور کے مقابلے میں کمزور تھے۔ غرضکہ "بائے" کی خدمت میں فرانس نے جو معاہدہ پیش کیا اور جس پر مجبور ہو کر "بائے" نے دستخط کئے وہ درج ذیل ہے[۵]:۔

"جمہوریت فرانس اور حکومت "بائے" تونس دونوں نے یہ تصفیہ کر لیا ہے کہ ان تباہ کن ہنگاموں کا

---

[۵] "الہلال" مصر۔ جلد ۱۰۔ صفحہ ۱۹۲ سنہ ۱۹۰۲ء۔

کی ذرا پرواہ نہ کی۔ بلکہ زمین چھوڑنے سے صاف انکار کر دیا۔ فرانسیسی حکومت نے تونس کی وزارت کے اس فیصلہ کو نہ صرف ناپسند کیا بلکہ اس کو اپنی توہین سے تعبیر کیا۔ چنانچہ حکومت تونس کے فیصلے کو رد کیا جا کر اس کو صرف دو یوم کی مہلت دی گئی تاکہ وہ اس عرصہ میں اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کر کے فرانسیسی کے حق میں، جو فی الحقیقت فرانس کا حق تھا، فیصلہ صادر کرے۔ بے چارے وزیر نے دو یوم کی مہلت کو غنیمت جانا اور اس فیصلے کو نہ صرف بدلا بلکہ سابقہ فیصلے کی ساری ذمہ داری اپنے سکریٹری پر رکھ کر فرانس کی خوشنودی کی خاطر اس کو برطرف بھی کر دیا۔ اور مزید خوشنودی حاصل کرنے کے لئے خود قونصل کی بارگاہ میں حاضر ہو کر معذرت خواہ بھی ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ پھر بھی ابن اسمٰعیل کو فرانس کی طرف سے اپنے متعلق خطرہ ہی رہا۔ جس کے دور کرنے کے لئے وہ پیہم کوشش کرتا رہا۔ آخر کار اس کا خطرہ اس طرح سے دور ہوا کہ اس نے فرانس کے من مانی مراد پوری کرنے کا ارادہ کر لیا۔ جو یہ تھی کہ تونس بالکلیہ فرانس کی غلامی میں آ جائے۔

اس کی واحد سبیل یہ تھی کہ وہ صادق پاشا کے بعد اپنے تئیں تونس کی حکومت کا وارث ٹھہرائے، جس کے لئے فرانس اس شرط پر اس کی مدد کرے کہ "تونس" کامل طور پر فرانس کے ماتحت ہو جائے۔ حکومت کی طمع نے نہ صرف اس کو اس غداری پر مجبور کیا۔ بلکہ اپنی اور حکومت کی غلامی کو بھی اس نے منظور کر لیا اس مخفی تصفیہ کے بعد قونصل کی خوشنودی حاصل ہو گئی اور خطرہ گویا زائل ہو گیا۔ لیکن مغربی حکومتیں اپنے وعدوں کی طرح سے دوسروں کے وعدوں کو بھی اس وقت تک کچھ وزن نہیں دیتی ہیں جب تک کہ اس کا عملاً ایفا، نہ شروع ہو جائے۔ اور اس کا کچھ نتیجہ سامنے نہ آ جائے۔ جس کی شکل یہ نکالی گئی کہ وزیر نے گویا بعض فرانسیسی حقوق کی طرف سے لاپروائی برتنی شروع کی اور فرانس نے محض دکھاوے کے لئے اس کا مطالبہ شروع کیا۔ اس کے بعد ہی فرانسیسیوں نے اپنی فوجیں وہاں اتار کر یہ اعلان کیا کہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے آئے ہیں۔ کیونکہ "الجزائر" کی حفاظت کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ تونس میں امن رہے۔ ورنہ الجزائر کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔ اس لئے "الجزائر" کو خطرے سے محفوظ کرنے کے لئے ان کو اپنی فوجوں سے تونس میں امن قائم کرنا یا رکھنا ضروری ہے۔

اس کے ساتھ ہی "باشے" کو یہ مشورہ دیا گیا کہ وہ داخلی امور بھی فرانسیسیوں کے سپرد کر دے، تاکہ جس طرح سے انھوں نے اپنے ملک میں مالیات کو درست کر کے ملک کی حالت کو بہتر بنا دیا ہے۔

(۸) حدود اور سواحل کے باغی قبائل تاوانِ جنگ کو ادا کرنے میں سرکشی کرتے ہیں۔ اس کے لئے حکومت جمہوریہ اور حضرت "بائے" مل کر اس کی مقدار اور ادائیگی کے متعلق طے کریں گے جس کے ضامن حضرت "بائے" ہوں گے۔

(۹) فرانسیسی الجیریا (الجزائر) میں ہتھیاروں اور سامانِ جنگ کی درآمد کو روکنے کے لئے حکومت "بائے" تونس عہد کرتی ہے کہ وہ مذکورہ بالا سامان کی درآمد کو جزیرہ "جربہ" "ساحل" "قابس" اور حکومت تونس کے جملہ جنوبی سواحل سے روک دے گی۔

(۱۰) یہ معاہدہ حکومت جمہوریہ فرانس کے سامنے پیش کیا جا کر جلد سے جلد اعلیٰحضرت "بائے" کی خدمت میں واپس ہو جائے گا۔

دستخط

المرقوم ۱۲ مئی ۱۸۸۱ء بمقام قصر سعید۔ تونس۔ محمد صادق "بائے"

و

جنرل بریارہ

اس عہد نامہ کے بعد تونس کامل طور پر فرانس کا استعماری صوبہ بن گیا اور اُس وقت سے اِس وقت تک فرانسیسی پرچم کے سایہ میں زندگی بسر کر رہا ہے۔

محمد صادق پاشا نے "تونس" پر ۲۳ سال حکمرانی کر کے ۱۲۹۹ھ میں انتقال کیا۔ اِس کے بعد اِس کا بھائی علی پاشا اس کا جانشین ہوا۔ جس نے ۲۲ سال حکمرانی کر کے ۸۰ سال کی عمر میں بتاریخ ۱۰ جون ۱۹۰۲ء داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اِس کے بعد اس کا بڑا بیٹا محمد ہادی پاشا تخت نشین ہوا۔ جس نے ۱۶ جون ۱۹۰۲ء کو حسبِ دستورِ قدیم جشنِ تاجپوشی و بیعت وعوام و عام سے منایا۔ اس کے چار روز کے بعد امیر محمد ناصر کو ولیعہد بنانے کا بھی جشن کیا گیا۔ امیر محمد ولی عہد مغربی علوم سے بہرہ اندوز ہوا۔ اور ان پر اس نے کافی عبور حاصل کیا۔ غرضیکہ "حسینی" خاندان میں اس وقت تک ۱۴ حکمراں ہوئے۔ اور زمانۂ حکمرانی ۲۴۳ سال ہوا۔ جس میں عہدِ عثمانی۔ عہدِ بائی۔ اور عہدِ فرانسیسی تینوں شامل ہیں۔

خاتمہ تونس کا سیاسی مدوجزر تاریخ کے صفحات پر یورپ کے افریقی سیاست کا وہ منظر ہے جس سے یورپ کی جوع الارضی کا پورا پورا پردہ فاش ہوتا ہے۔ جن کے سامنے بحیرۂ رُوم کا نقشہ ہے وہ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ بحیرۂ روم کے ساحلی شہر "تونس" کو کتنی بڑی اہمیت ہونی چاہئے بحیرۂ روم کے سب سے بڑے جزیرے "صقلیہ" کی تونس سے قربت اس کو اور زیادہ اہم بنا دیتی ہے۔ "صقلیہ"

سد باب کیا جائے جو آئے دن دونوں حکومتوں کے حدود اور سواحل تونس پر ہوتے رہتے ہیں۔ اور اپنے اُن پُرانے تعلقات کو مضبوط کریں جو دوستی اور بہتر ہمسائگی پر مبنی ہیں۔ چنانچہ دونوں نے اس پر بھروسہ کر کے فریقین کے مصالح کے مدنظر آپس میں معاہدہ کر لیا ہے۔ اس کے لئے صدر جمہوریت فرانس کی طرف سے جنرل "بریار" کو نمایندہ مقرر کیا گیا ہے۔ تاکہ وہ اعلیٰحضرت "بائے" کے ساتھ شرائط ذیل پر اتفاق کرے:۔

(۱) اس سے پہلے جمہوریت فرانس اور اعلیٰحضرت "بائے" کے درمیان جتنے معاہدات تجارتی۔ دوستانہ اور مصالحہ ہوئے ہیں۔ ان کو بحال رکھا جاتا ہے۔

(۲) حکومت جمہوریہ کی مقصد براری میں آسانی پیدا کرنے کے لئے حضرت "بائے" کو منظور ہے کہ "فرانسیسی فوجی مجلس" اپنی فوجوں کو ان جگہوں پر رکھے جہاں وہ مناسب سمجھے۔ تاکہ حدود اور سواحل پر امن و سکون رہے۔ اور یہ فوجیں وہاں سے اُس وقت ہٹائی جائیں جب "فرانسیسی اور تونسی فوجی مجلس" کو یہ یقین ہو جائے کہ حکومت تونس امن قائم کر سکتی ہے۔

(۳) حکومت جمہوریہ حضرت "بائے" سے یہ وعدہ کرتی ہے کہ وہ اُس کی، اُس کے کنبے، اور اُس کی حکومت کی ہر خطرے کے موقع پر مدافعت کرے گی۔

(۴) حکومت جمہوریہ فرانس ان تمام معاہدات کے اجرا کی ضامن ہے۔ جو اس سے پہلے حکومت تونس اور دول یورپ کے درمیان ہوئے۔

(۵) "بائے" کے دربار میں حکومت جمہوریہ فرانس اپنا ایک نمایندہ رکھے گی تاکہ وہ ان معاہدات یا شرائط کے اجرا کی نگرانی کرے۔ اور حکومتِ فرانس و ارباب حکومت تونس کے درمیان جو معاملات پیش آئیں اس میں اور اس کے علاوہ دونوں ملکوں کے کل مشترک معاملات میں وہ "وزیر مقیم" واسطہ ہوگا۔

(۶) فرانس کے وہ سیاسی نمایندے اور قونصل جو دوسرے ملکوں میں ہیں ان کا فرض ہوگا کہ وہ تونس اور اسکی رعایا کے معاملات کی وہاں نگرانی کریں۔ اور مدد کریں۔ اس کے صلے میں حضرت "بائے" پر لازم ہوگا کہ وہ حکومت جمہوریہ فرانس کے علم و اتفاق کے بغیر ممالک غیر سے کوئی معاہدہ نہ کرے۔

(۷) حکومت ہائے جمہوریہ فرانس و تونس دونوں اپنے لئے اس بات کا حق محفوظ رکھتی ہیں کہ وہ مالیہ کو اس انداز میں مرتب کریں کہ وہ ترتیب تونس کے عام قرضہ کی ادائی میں معاون و مددگار ہو۔ اور تونس کے قرضخواہوں کے حقوق کی ضامن بھی رہے۔

امام بخش صہبائی شہید دہلوی

(از جناب مفتی محمد انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی)

پیش لفظ مولانا صہبائی ہندوستان میں فارسی زبان کے مسلّم الثبوت اُستاد تھے، فارسی زبان کا چراغ ہندوستان میں مدت سے ٹمٹما رہا تھا۔ اور فارسی شاعری کی طبعی عمر اختتام کے قریب تھی، مگر حُسنِ اتفاق دیکھئے اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ کے زمانہ میں کچھ اس نے سنبھالا لیا کہ چند صاحبانِ فضل و کمال خاص دارالخلافہ دلّی میں آجمع ہوئے، کچھ خاک پاک دلّی سے پیدا ہوئے، کچھ حضرات باہر سے آئے، ہر ایک یگانۂ روزگار تھا۔ یہ لوگ علم وفضل کے ساتھ شعر و سخن میں بھی صاحبِ کمال تھے۔

علامہ فرقتی، فضل حق خیرآبادی، مولانا عبداللہ خاں علوی قائم گنجی، حکیم مومن خاں مومن، نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر، سیّد غلام علی خاں وحشت، نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب اکبرآبادی، مولوی امام بخش صہبائی سے حضرات فارسی کے دلدادہ و جاں دادہ تھے۔ صہبائی تو اس کے عاشق و شیفتہ تھے ہی۔ بلکہ اس پر مٹے ہوئے تھے۔ تمام عمر فارسی زبان کی خدمت میں ہی گزار دی۔

نام و نسب مولانا امام بخش صہبائی، مولانا محمد بخش تھانیسری کے خلفِ ارشد تھے، صہبائی کے دوسرے بھائی حکیم پیر بخش تھے[۱]۔ مرزا آقا درخش صابر گورگانی "گلستانِ سخن" میں لکھتے ہیں کہ:۔

[۱] گلستان سخن

"سلسلہ ان کے نسب کا سلالۂ الد ماجد والد ماجد مرحوم و مغفور کی طرف سے تو فاروق حق و باطل فاروق ابن خطاب علیہ رضوان اللہ الوہاب تک اور زبدۂ مستورات سراپردۂ عصمت و عفت حضرت والدہ شریفہ غفر اللہ لہا کی جانب سے قدوۂ واصلان درگاہ رہنمائے سالکان عرفان و ستگاہ محبوب سبحانی سیّد عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک پہونچتا ہے۔"

صہبائی کے والد ماجد تھانیسر سے دلّی آئے اور رہ پڑے، کوچہ چیلاں میں مکان بنا لیا تھا۔

بحیرۂ رُوم کا وہ وسطی جزیرہ ہے۔ جو اٹلی کی ملکیت ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں وہ جرمنی کے قبضہ میں رہا۔ جہاں سے جرمنی افواج "ڈارلان" نائب وزیر فرانس کی سازش سے بہ آسانی تونس میں آگئی تھیں۔ اور وہاں سے طرابلس ہوتی ہوئی آج مصر کی طرف متوجہ ہیں۔ جہاں برطانوی افواج سے مقابلہ ہوا۔ چنانچہ ۲۸ اپریل ۱۹۴۱ء کا بحری تار لندن سے خبر رساں تھا کہ:-

"مصری حدود میں مقام "سُلّم" یقینی طور پر دشمنوں کے قبضہ میں آگیا ہے۔"

بہرحال شمالی افریقہ کے بساط پر مغربی طاقتوں نے جس طریقہ پر اپنے مُہرے بٹھائے تھے۔ جن میں فرانس، اٹلی، اور اسپین پیش پیش تھے۔ آج دُنیا ان مہروں کی نزاعی اور سیاسی رفتار کا بغور مطالعہ کر رہی ہے۔ اور اس رفتار کے انجام کی بے چینی سے منتظر ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا ہے کہ "تونس" کو مجبور کرنے والا فرض خواہ اگر اپنی غیر جانب داری پر قایم رہتا اور اپنے فاتح کو سہولت بہم نہ پہنچاتا تو "لوبیا" یا جدید "لیبیا" پر برطانوی پرچم ہی رہتا۔ اور مصر کو اس خطرے کا مقابلہ نہ کرنا پڑتا جو اسس کو جنگ میں پیش کرنا پڑ رہا ہے۔

راقم

محمد ابرار حسین

"مفتی صدرالدین خاں صدرالصدور نے لفٹنٹ گورنر سے عرض کی کہ ہمارے شہر میں فارسی کے استاد صرف تین شخص ہیں۔ ایک مرزا نوشہ، دوسرے حکیم مومن خاں، تیسرے امام بخش صہبائی۔ لفٹنٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا۔ مرزا نوشہ بھلا یہ روگ کیوں پالنے لگے تھے اُنھوں نے تو انکار کر دیا۔ مومن خاں نے یہ شرط کی کہ سو روپیہ ماہانہ سے کم کی خدمت قبول نہ کروں گا۔ مولوی امام بخش کا کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا۔ انھوں نے یہ خدمت چالیس روپیہ ماہانہ کی قبول کرلی۔ بعد کو پنشن ہوگئے۔"[۵۱]

[عر]صہ بعد مسٹر بوترس پرنسپل مدارس دلّی کے عہد میں صہبائی مدرس اوّل کے عہدہ پر سرفراز کئے گئے۔

[...]ت | "مرحوم دہلی کالج" میں ہے:۔

"مولوی امام بخش صہبائی صدر مدرس فارسی اپنے وقت کے بہت بڑے فارسی ادیب تھے۔ مصنف اور شاعر بھی تھے۔ ان کی کتابیں نصاب تعلیم میں داخل تھیں، ان کی بعض کتابیں اب تک پڑھی جاتی ہیں۔ شہر میں ان کی بڑی عزت تھی۔" (صفحہ ۱۴۹)

[گار]سان دتاسی فرانسیسی اپنے خطبات اردو میں لکھتے ہیں:۔

"مولانا صہبائی، منشی کریم الدین کے ہمعصر ہیں۔ اور منشی صاحب اپنے تذکرۂ شعراء میں بیان کرتے ہیں کہ یہ قابل مصنف دہلی میں فارسی کے سب سے زیادہ فاضل ادیب تصور کئے جاتے ہیں اور اس وجہ سے دہلی کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر کئے گئے۔"[۵۲]

[...]ت | مولانا صہبائی کا درس و تدریس کے بعد تمام وقت تصنیف و تالیف میں گزرتا تھا۔ فارسی میں [...]سے کتابیں لکھیں۔ اردو کی کتابوں کی ملک میں مانگ دن بدن بڑھ رہی تھی، اور قدر بھی ہونے [...] اس طرف بھی توجہ کی۔ جس سال کالج میں منسلک ہوئے منشی شمس الدین فقیر کی تصنیف "حدائق [بلاغ]ت (مصنفہ ۱۱۶۸) کا اردو ترجمہ مرتب کیا۔ مولانا حامد حسن قادری پروفیسر سینٹ جانسن کالج آگرہ [کت]اب "داستان تاریخ اردو" میں لکھتے ہیں:۔

"صرف کہنے کو ترجمہ ہے ورنہ اصل میں فن بلاغت کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ اردو میں اس فن کی پہلی مکمل و مستند کتاب ہے۔"[۵۳]

---

[۵۱] [مرحو]م دہلی کالج۔ صفحہ ۱۵۰، و طبقات الشعراء مولوی کریم الدین دہلوی، و تاریخ نثر اردو۔ صفحہ ۴۹۰۔

[۵۲] [خطب]ات گارساں دتاسی۔ صفحہ ۱۶۴

[۵۳] داستان تاریخ اردو۔ صفحہ ۲۰۳۔

تعلیم و تربیت | صہبائی غریب گھرانہ کے فرد تھے۔ علوم فارسی، عربی علامہ عبداللہ خاں علوی سے حاصل کئے۔ علوی خاں اپنے زمانہ کا استادِ وقت تھا۔ عربی، فارسی کا مسلمہ اُستاد تھا۔ اس کے ساتھ ہی عربی، فارسی، اُردو میں فکرِ سخن بھی کرتا تھا۔ ریختہ میں کہتے ہیں کہ ؎

دامن سے ڈھانک جیسے کوئی لے چلے چراغ
جاتے ہیں سوزِ عشق لئے یوں کفن میں ہم

شاعری | حضرت علوی کی شعر و شاعری کا اثر صہبائی پر پڑے بغیر نہ رہا۔ یہ کم عمری سے فارسی میں فکرِ سخن کرنے لگے۔ اُردو میں گنتی کے شعر کہے۔ فارسی سے دِلی لگاؤ تھا۔ اس میں ہی شعر گوئی کرتے تھے۔ فراواں کاوش اور اُستاد کی توجہ سے فارسی زبان پر تبحر کا درجہ حاصل کیا۔ عربی میں بھی معقول استعداد بہم پہنچائی۔ حقیقت یہ ہے کہ با کمال اُستاد نے وہ گُر سکھائے تھے کہ نوعمری میں مرزا قتیل فریدآبادی کے ہم پایۂ اُستاد سمجھے جانے لگے اور ہم چشموں میں عزت و قدر سے دیکھے جاتے تھے۔ سر سید احمد خاں "آثار الصنادید" میں آپ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"کمالاتِ ظاہری اور جلائلِ باطنی اور حُسنِ خُلق اور حمائدِ اطوار میں پسندیدۂ خالق و مقبولِ خلائق ہیں۔ خلق نوشس آپ کا آئینۂ بہار اور اوضاعِ حمیدہ آپ کے محمود روزگار اس جزو زماں میں ایسی جامعیت کے ساتھ کم کوئی نظر سے گزرا ہے اور طرفہ یہ ہے کہ فنونِ متعارفہ و سخنوری مثل تحقیق لغت و اصطلاحات زبان دری اور تدقیق مقاماتِ کتابی اور تکمیل عروض و قافیہ و استکمالِ فن معما وغیرہا میں ایسا کمال بہم پہونچایا ہے کہ ہر فن میں ایک فنی کہنا چاہئے ؎

پذیرفتہ از ہر فنے روشنی — جداگانہ در ہر فنے یک فنی"[1]

ملازمت | مولانا محمد حسین آزاد "آبِ حیات" میں لکھتے ہیں کہ :۔

"۱۸۴۲ء میں جبکہ دہلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا، مسٹر ٹامسن سکریٹری گورنمنٹ ہند جو آخر کو اضلاع شمال و مغرب میں لفٹنٹ گورنر ہو گئے تھے مدرسین کے امتحان کے لئے دلّی میں آئے اور چاہا کہ جس طرح سَو روپیہ ماہوار کا ایک عربی مدرس ہے، فارسی کا بھی استاد مقرر کیا جائے۔"[2]

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے "مرحوم دہلی کالج" کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ :۔

---

[1] آثار الصنادید صفحہ ۹۸
[2] یادگارِ غالب صفحہ ۲۶

کا سبق لیتا، کوئی سکندر نامہ سناتا، ہر ایک کو بتاتا اور شرح او نکات بیان کرتا۔

بروایت مولوی عبد الحمید خاں صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد انھوں نے اپنے والد مولوی عبد الغنی مصنف "ارمغانِ آصفی" جو علامہ عبد اللہ کے شاگرد تھے، بیان کیا کہ علامہ کے یہاں ایک امامی نامی خاکروب تھے، اِن کا حافظہ اِس غضب کا تھا کہ جو سنتے وہ یاد ہو جاتا۔ علامہ طلباء کو درس دے رہے ہیں، یہ خاکروبی کرتے ہوئے آئے کھڑے سن رہے ہیں۔ کسی نے کہا میاں امامی کیا سنا، فرفر پورا سبق سنا دیا۔ عام اساتذہ دلی کے منتخب اشعار نوکِ زبان پر تھے، سخن فہمی میں بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ مشاعرہ میں یا کہیں مجلس ہوتی آپ کے لئے ایک چوکی بچھائی جاتی اس پر شیخ امامی بیٹھتے اور شعراء اپنا کلام ان کو مخاطب کر کے پڑھتے۔ اگر کسی شعر پر ان کا سر ہل گیا بس مقبولیت اس کو حاصل ہو گئی۔ ذوق، غالب، مومن ہر ایک اُن کی قدر کرتا تھا، یہ تھے دلی کے روڑے۔

طب | فنِ طب میں بھی کمال حاصل کیا تھا مگر مطب نہیں کیا۔ آپ کے بھائی مشہور طبیب حکیم پیر بخش تھے۔

احباب میں قدر و منزلت | مولانا صہبائی جس سبھا کے رکن رکین تھے صاحبِ "گلِ رعنا" کے لفظوں میں سنئے:۔

"دلی اُس وقت آج کی ایسی دلی نہ تھی۔ بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر مولوی امام بخش صہبائی، علامہ عبد اللہ خاں علوی، مفتی صدر الدین خاں آزردہ، مرزا اسد اللہ خاں غالب، نواب ضیاء الدین خاں نیّر، شاہ نصیر الدین نصیر، شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم آغا جان عیش، حافظ عبد الرحمن خان احسان، میر حسین تسکین، اور خدا جانے کتنے سخنورانِ باکمال کا جمگھٹا تھا، جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہو گا۔"

یہ سب حضرات صہبائی کی قدر و منزلت کرتے تھے۔

غالب و صہبائی | مرزا غالب اور صہبائی میں گہرے تعلقات تھے، ایک دوسرے کی قدر دانی کرتا تھا چنانچہ مرزا نے اپنے کلام میں جہاں معاصرین کا ذکر کیا ہے صہبائی کو بھولے نہیں ہیں، کہتے ہیں ؎

مومن و نیّر و صہبائی و علوی و انگاہ
حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں

جہاں مرزا صاحب نے اپنی ہمہ دانی کو ٹھیس لگتے ہوئے دیکھا، دوستی و ملاقات کو بالائے طاق رکھ دیتے تھے۔ چنانچہ "قاطع برہان" کی مخالفت میں مرزا رحیم بیگ شاگرد مولانا امام بخش صہبائی ساکن میرٹھ

"مرحوم دہلی کالج" میں ہے :-

"اردو صرف و نحو پر بھی ایک اچھی کتاب لکھی جس کے آخر میں بہ ترتیب حروف تہجی اردو کے محاورات اور کہیں کہیں ضرب الامثال بھی درج ہیں .... شعرائے اردو کا انتخاب بھی تیار کیا تھا جو اُسی زمانہ میں طبع ہو کر شائع ہوا (صفحہ ۱۴۹)۔

گارساں دتاسی لکھتا ہے :-

"سب سے آخر میں قابل ذکر کتابیں صہبائی کی تصانیف ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ حدائق البلاغت، انتخابات نظم اور قواعد اردو۔ ان کی قواعد اردو اس وجہ سے اور بھی زیادہ قابل قدر ہے کہ اس کے آخر میں ضرب الامثال اور محاورات کی ایک فہرست درج ہے۔"[۱]

اردو کی خدمت مولانا نے صحیح معنی میں اردو کی ہر عنوان سے خدمت کی ہے۔ سر سید احمد خاں "آثار الصنادید" کی ترتیب میں صہبائی سے کافی مدد لی۔ جس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ "گلستان سخن" میں پوری پوری صہبائی کی کار فرمائی کو دخل ہے۔ مقدمہ بالخصوص آپ کا لکھا ہوا ہے۔ شمس العلما ذکاء اللہ نے "خمخانۂ جاوید" کی تقریظ میں ایک جگہ لکھا ہے "گلستانِ سخن حضرت صہبائی کی تصنیف سے ہے"[۲] فارسی میں "کلیاتِ صہبائی" میں نظم و نثر کے رسائل شائع ہو گئے ہیں۔ مولانا حالی لکھتے ہیں۔

"صہبائی جن کی نظم و نثر فارسی اور دیگر رسائل اور شرح تین جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔"[۳]

شرح شرح "سہ نثر ظہوری" ۱۲۶۰ھ میں لکھی ایک رسالہ "معما" کے حل میں لکھا۔ اس میں ایک شعر سے سات سَو نام نکلتے ہیں۔ اردو زبان کے شعراء کا مجموعہ تیار کر کے اس میں غزلیات اور گیت گانے کی مع تعریف قصیدہ اور بیان بحور عروض کے چھپوایا۔[۴]

علامہ عبداللہ خاں علوی قائم گنجی۔ بکا ایک شاگرد و بزبان دہاں مس تمبولی تھا۔ فارسی کی اہم اس کو بڑی معقول تھی علمی لیاقت حاصل کرنے کے بعد اپنا پیشہ آبائی قائم رکھا، ایک پیر میں دوکان پر پیر پہ پیر رکھے بیٹھا رہتا اور پان کی گلوریاں لگاتا رہتا، اس کے ساتھ طلبا، فارسی درس دیتا، طلبا، دوکان کے نیچے کتابیں لئے کھڑے رہتے، کوئی "سہ نثر ظہوری" پڑھتا، کوئی

---

[۱] خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۱۹۴۔ — [۲] خمخانۂ جاوید حصہ اول تقاریظ۔

[۳] یادگار غالب صفحہ ۲۳۰۔ — [۴] طبقات الشعراء مولوی کریم الدین۔

مفتی صاحب کے دیوان خانہ کا رُخ کرتا۔[۵] ان صحبتوں کے رکن ایک حضرت صہبائی بھی تھے۔ کالج سے
لوٹتے گھر آتے، پھر شام کو ہوا خوری کے بجائے مولانا فضل حق خیرآبادی کے یہاں جاتے۔ وہاں سہپہری
نوالکہات کھائے، شب میں بعد نماز عشا مفتی صاحب کے یہاں جاتے، یہاں کی محفل برخاست ہوتی
تو گھر جاکر سو رہتے۔"

فارسی | ہندوستان میں صرف دلّی کو یہ فخر حاصل تھا کہ فارسی زبان کے ماہر مثل اہل زبان کے دلّی
ہی میں کثرت سے تھے، یہاں کی فارسی زبان میں وہی چٹخارہ تھا جو اہل زبان میں ہوا کرتا ہے۔ جامع مسجد
دہلی کی سیڑھیوں پر قصہ خواں فارسی میں قصہ خوانی کرتے تھے، بوستان خیال زبانی سُنائی جاتی،
عوام تو عوام خواص شریک ہوا کرتے۔ زبان دانی کے لئے اہل علم اس صحبت میں شریک ہوتے ـــــ
سیکڑوں جمع ہو جاتے، کم عمری میں صہبائی بھی شریک ہوئے ہیں۔ اپنے زمانہ میں مرزا محمد حسین قتیل
فریدآبادی نے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر زبان حاصل کی ہے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں نواب ذوالفقار الدولہ
نجف خاں ایرانی کی وجہ سے کثرت سے ایرانی دلّی میں آبسے تھے، ان کا مجمع عموماً بعد نماز عشا جامع مسجد
کی سیڑھیوں پر ہوا کرتا، انھیں ایرانیوں میں سے ملا محمد باقر تھا جس نے فریدآباد میں رہنا اختیار کیا تھا۔
اس سے بھی قتیل نے فارسی پڑھی ایسے گرویدہ ہوئے ہند و مذہب چھوڑ کر مسلمان ہوگئے۔ اور نجف خاں
کی صحبت اختیار کی، پھر ایران گئے لوٹے تو لکھنؤ گئے اور آصف الدولہ کے پاس میر انشاء اللہ خاں
کے توسل سے پہونچے۔

لطیفہ | دلّی میں علم و فضل کے ساتھ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا گھرانہ فارسی میں بھی یگانہ حیثیت رکھتا تھا۔
حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی فارسی دانی اور زبان کی شہرت عام تھی۔ شاہ صاحب کا "تحفۂ اثنا عشری"
لکھنؤ پہونچا، آصف الدولہ کا زمانہ تھا نواب آصف الدولہ نے مجتہدین شیعہ سے درخواست کی کہ تحفہ کا
جواب لکھا جائے۔ مجتہدین میں سے مولوی دلدار علی خاں نے جواب لکھنے کا بیڑا اُٹھایا۔ لیکن "تحفہ" کی
زبان چونکہ بے نظیر تھی اس لئے مرزا قتیل سے کہا گیا کہ مضامین قبلہ و کعبہ لکھیں اور آپ ان کو اپنی عبارت
میں ادا کردیں تاکہ مضامین کا جواب مضامین سے اور عبارت کا جواب عبارت سے ہو جائے۔ مگر قتیل
نے عذر کیا اور کہا میں شاہ صاحب کی سی فارسی عبارت لکھنے پر قادر نہیں ہوں اور اس کی تائید

---

۵ "غالب" از مولانا مہر صفحہ ۹۰۔

نے "ساطع برہان" شائع کی۔ مرزا صاحب چراغ پا ہوگئے۔ رحیم الدین کی لے دے شروع کر دی۔ مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھ ڈالا:۔

"نامۂ غالب کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دو تین برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ وہ قوتِ علمی بھی نہیں رکھتا اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہل دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ بھی ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو اُن کا شاگرد بتاتا ہے، میں کہتا ہوں کہ وائے اُس ہیچ پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجبِ عزو وقار ہو۔"[1]

غرضکہ مرزا غالب رحیم بیگ سے بگڑے ہوئے تھے بچارے صہبائی پر بھی لگے ہاتھوں لے دے کر گئے۔
دلی کے دیوان خانے مولانا فضل حق کے یہاں اُن کے والد مولانا فضل امام صدر الصدور کے زمانہ سے بعد نمازِ عصر روزانہ اہل علم کی صحبت رہا کرتی، علماء و فضلاء آجاتے، علمی مذاکرے رہتے، معمولی لکھے پڑھے کی تو گزر ہی نہ تھی۔ شب میں مفتی صدر الدین خاں کے یہاں محفل جمتی، مولانا صہبائی ہر دو جگہ کے بیٹھنے والے تھے۔ مفتی صدر الدین کا مکان چتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے تھا، اُس کے نزدیک مٹیا محل میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رہتے تھے، مکان کوٹھی کے نمونہ کا تھا۔ انگریزی اور ہندوستانی دونوں وضعوں کے ساتھ ملا کر بنایا گیا تھا، صحن گو بہت بڑا نہیں مگر مختصر سی نہر، سامنے دالان در دالان، پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے، باہر کے دالان میں کواڑ لگا کر اس کو بھی کمرہ کی شکل کا کر دیا تھا۔ دالانوں کے سامنے اونچا چبوترا جس پر تخت کا چوکا لگا ہوا، اُس پر دری اور دری پر چٹی چاندنی کا فرش، اور دو طرف گاؤ تکیے لگے ہوئے ہوتے، آنے والے حسبِ مراتب بیٹھتے۔ اس محفل کی کیفیت حضرت مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی سے سنئے۔ فرماتے ہیں:۔

"والد مرحوم دہلی کے دیوان خانوں کی مجلس کے جو افسانے سنایا کرتے تھے۔ بجھنے والے چراغ کا یہ آخری اُجالا تھے، دہلی مرحوم کی ہفت صد سالہ زندگی کی انجمن طرازیوں کی یہ آخری بزم تھی۔
مفتی صاحب کا دیوان خانہ دہلی کے منتخب افراد کا مجمع و مرکز تھا، جاڑا گرمی برسات کوئی موسم ہو لیکن شب کی مجلس کوئی تھا نہیں کرتا تھا، ہر فن کے اکابر کو وہاں ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جاسکتا اگر کوئی نو وارد دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے فضل و کمال کو بیک وقت و بیک مجلس دیکھ لے دو رسیدہ تھا

---

[1] "غالب" صفحہ ۲۲۴۔

شہزادگانِ تیموریہ میں شعر و شاعری کا ذوق کافی پیدا ہوگیا تھا۔

قلعہ کے مشاعرے | قلعہ میں شہزادوں اور بادشاہ کی طرف سے جو مشاعرہ ہوتا وہ شاہانہ انداز سے ہوتا۔ بادشاہ سلامت خود بنفسِ نفیس شرکت فرما کر عزت بخشتے تھے۔ شہزادے عموماً مشاعرہ کرتے تھے قلعہ میں عجیب چہل پہل رہتی۔ مرزا محمد اختر گورگانی نبیرۂ مرزا دارا بخت ولیعہد بہادر ابوظفر راقم السطور کے ملنے والے ہیں، میرے مکان کے قریب ایک عرصہ تک "کیرانہ" سے آکے رہے تھے۔ حیدرآباد سے یکصدی روپیہ کا منصب تھا۔ وہ قلعہ کے مشاعروں کا اپنے والد کی زبانی ذکر کیا کرتے تھے۔ مشاعرے "دربارِ عام" اور کبھی "باغ حیات بخش" میں منعقد ہوا کرتے۔ "باغ حیات بخش" میں ایک محل سنگِ سرخ کا بنا ہوا تھا۔ اس کو سنگِ پتھانی سے سفید کر کے رنگ آمیزی و طلاکاری کے گل بوٹے سے مزین کیا تھا۔ محل میں ایک درجہ پندرہ گز لمبا اور آٹھ گز چوڑا تھا، جہاں شعر و سخن کی صحبت رہتی۔ اس میں ایک حوض بھی تھا جس کا فوارہ ہر وقت چھوٹا کرتا تھا۔ اس باغ میں ساون بھادوں کی عمارتیں ہیں۔ مشاعرہ کے دن ساون بھادوں کا سماں بھی رہتا تھا۔

۲۵ فروری ۱۸۴۵ء کو "محل حیات بخش" میں بادشاہ کی طرف سے مشاعرہ کا انتظام ہوا۔ شاہانہ اہتمام و انتظام کیا گیا۔ محل فرش و فروش جھاڑ فانوس سے سجایا گیا۔ بادشاہ کی طرف سے اذنِ عام ہوا۔ اساتذہ دلی کو دعوت دی گئی۔ چنانچہ سب شعرا قلعہ میں جمع ہوئے۔ خاندانِ بابر کے شہزادوں ایک ایک نے شرکت کی۔ مرزا اعظم شاہ نبیرۂ سلیمان شکوہ متخلص آزاد، مرزا وحیدالدین متخلص اختر، مرزا سپہر شکوہ اسرار، مرزا غلام محی الدین اشکی، مرزا بلاقی بدر، مرزا الطاف تاب، مرزا معز الدین ثابت، مرزا عزیز الدین شرر، داماد ابوظفر بہادر شاہ سلطان شاہ سلطان مرزا فخر الدین سیارہ، مرزا نور الدین شاہی، مرزا حاجی قادر بخش ششدر، مرزا بلند بخت فدا، مرزا اسکندر بخت فدا، مرزا مصلح الدین صالح، مرزا عزیز الدین عزیز، مرزا نصیر الدین قناعت، مرزا خدا بخش قیصر، شہزادہ بہرام شاہ خسب، مرزا منگو مخزون، مرزا محمود محمود، مرزا حسین متخلص مرزا، حضرت ذوق، حضرت غالب، صہبائی، عارف، نیر وغیرہ مشاہیر شعرائے دلی شریک ہوئے۔

ان کے علاوہ دوسرے لوگ اس قدر تعداد میں آئے کہ نشست گاہ میں بیٹھنے کو جگہ نہ تھی۔ شعرا و سامعین سب جمع ہوگئے تو سلطان الشعرا شیخ محمد ابراہیم ذوق نے بادشاہ ابوظفر کی

میں اُنھوں نے بیان کیا کہ دلّی میں ایک رنڈی سے میرے تعلقات ہیں، میں نے نہایت دماغ
سے اپنی پوری قابلیت صرف کرکے اُسے ایک خط لکھا تھا وہ رنڈی خط کو دلّی کے تمام لائق وف
لوگوں کے پاس لے گئی اور درخواست کی کہ اس کا جواب لکھ دیا جائے مگر اس کے جواب لکھنے
نے اقرار نہیں کیا۔ مجبور ہو کر وہ اس خط کو شاہ صاحب کی خدمت میں لے گئی اور ظاہر کیا کہ میں تما
پھر چکی ہوں مگر کسی نے جواب کی حامی نہیں بھری۔ اب میں مجبور ہو کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئی
حضور اس کا جواب لکھ دیں۔ شاہ صاحب نے خط سنتے ہی فی البدیہہ اس کا جواب لکھوا دیا۔ وہ خو
پہنے سے میرے پاس رکھا ہوا ہے اور میں کوشش کرتا ہوں کہ اس کا جواب لکھوں۔ مگر ابتک م
اس کا جواب نہیں ہو سکا۔ اب آپ غور فرمالیں کہ میں تحفہ کی عبارت کا جواب کس طرح دے سکتا ہو
جب قتیل نے عذر کیا تو ناچار قبلہ وکعبہ نے خود ہی جواب لکھا۔ اس جواب کو نواب صاحب نے مرز
کے سامنے پیش کیا۔ اور پوچھا کہ بتلائیے کیسا جواب ہے۔

مرزا قتیل نے اُس کو دیکھ کر کہا کہ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو عرض کروں۔ نواب صاحب نے فر
فرمائیے۔ مرزا قتیل نے کہا سچ تو یہ ہے کہ قبلہ وکعبہ نے تو اپنی کتاب کا نام بھی رکھنا نہ آیا۔ شاہ صا
تو تحفہ پیش کرتے ہیں اور قبلہ وکعبہ تحفہ کے جواب میں ذوالفقار (نامی کتاب) دیتے ہیں۔ اس پ
نواب نے فرمایا کہ اچھا عبارت کی نسبت کچھ کہئے۔ قتیل نے کہا کہ حضور کہاں جائس کا جولاہہ (قتیل
جائس کے رہنے والے تھے) اور کہاں دلّی کی سیڑھیوں کا بیٹھا ہوا شہدا۔[۱] غرضکہ واقعہ ہے صح
نے آنکھ دلّی کے اہل علم کی صحبت میں کھولی کچھ سے کچھ ہو گئے۔ فارسی دانی میں جواب نہ رکھتے تھے۔

بزم شعر و سخن | دلّی میں مشاعرہ کی بنا قاضی سراج الدین خان آرزو نے ڈالی۔ ان کے عہد سے لے
میر اور غالب تک یہ سلسلہ شاندار طور سے رہا۔ میر نظام الدین ممنون کے مدرسہ اور مفتی صدر الدین
اور نواب شیفتہ کے دیوان خانوں میں بڑے پیمانہ پر مشاعرے ہوتے۔ قلعہ میں جیسے حضرت ذوق کی
کی گرم بازاری ہوئی، بادشاہ اور شہزادوں کی طرف سے آئے دن مشاعرے ہوا کرتے، دلّی
اساتذہ سب ہی ان مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ ممنون۔ آزردہ۔ غالب۔ ذوق۔ صہبائی
عارف۔ محو۔ احسان وغیرہ۔ ارباب شعر و ادب کی شمولیت ضرور ہوتی۔ ان بزرگوں کی صحبت

---

[۱] "امیر الروایات" صفحہ ۴۰۔

صابر کے بعد نواب زین العابدین خاں عارف نے پُر درد لہجہ میں اپنی غزل سُنائی ایک شعر تحریر ہے ؎

رسوا ہوا تو اہلِ وفا میں ہوا عزیز　　اچھا ہوا وہ حق میں مرے جو بُرا ہوا

مولوی امیر علی عالی نے فارسی میں طرحی اشعار سُنائے، کہتے ہیں ؎

شکایتے چہ کنم از بتاں کہ خود دلِ من　　ہمیشہ دشمنِ جانم بود کنار مرا

نواب ضیاء الدین خاں نیر نے فارسی طرح پر غزل کہی، لکھتے ہیں ؎

بس ست طولِ خدایا شبانِ تار مرا　　بیاضِ صبح مدہ چشم انتظار مرا

اس کے بعد مولانا امام بخش صہبائی نے پہلے یہ رباعی پڑھی ؎

شاہا بدرت کہ اصل عز و جاہ ست　　از عرش ہزار سالہ آں سو راہ ست
از چرخ نہم سوال کردم گفتند　　لیکن ذرہ عتبہ بہادر شاہ ست

غزل طرحی ؎

چہ گل کہ در کفِ پا نشگفد ز خار مرا　　جنوں بفصلِ خزاں میکند بہار مرا
چنانکہ بادہ در انگور نیست بادہ بنام　　بہر کجا کہ توئی نیست اعتبار مرا
برنگِ لالہ در آغوشِ نو بہار بہشت　　ز دستِ داغِ دل آسودہ روزگار مرا

فلک بماتمِ یارانِ رفتہ صہبائی
سرود ماغ و دل و چشم اشکبار مرا

عالی کے پاس مرزا غالب بیٹھے ہوئے تھے اپنی غزل دس شعر کی غیر طرح سُنائی ؎

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے　　رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے
بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے　　رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لئے

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

نواب مصطفیٰ خاں فرماتے تھے ذوق نے شعر سوم کی مشاعرہ میں بے حد تعریف کی اور بار بار دُہرایا[۱۵]۔ عموماً مرزا غالب مشاعروں میں فارسی کی طرح پر غزل کہا کرتے تھے، یہ پہلی مرتبہ اردو میں غزل سُنائی۔ مولانا

۱۵؎ "غالب" از مولانا مہر صفحہ ۲۰۲ -

ں پڑھی جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

گردشِ چشمِ بتاں سے دل کو ہو کب مخلصی — حلقۂ گرداب سے نکلے ہے کب ڈوبا ہوا
خار سا کھٹکے ہے جی میں اُس کی مژگاں کا خیال — ہے رگِ جاں میں یہ نشتر کیا غضب ڈوبا ہوا

شہزادہ حضرت سلطان نے اپنی غزل سُنائی جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

تارِ نفس سے ہے پیہم اُلجھا ہوا یہ تار — نکلے گا دم بھی ساتھ جو نالہ رسا ہوا
گالی سے کون خوش ہو مگر حسنِ اتفاق — جو تیری خو تھی وہ ہی مرا مدعا ہوا

ن کے بعد مرزا حیدر شکوہ مرزا نور الدین نے غزل سُنائی۔ مرزا روشن الدولہ ابن مرزا آغا جان ششدر کہتے ہیں ؎

کام تو کچھ بھی نہیں ہے حشر میں اپنا مگر — آن نکلیں گے تری خاطر اگر آنا ہوا

طلب علی عالی دہلوی فرماتے ہیں ؎

کل تو عالی کا حال بہت ہی تباہ تھا — کیا گزری آج اس پہ خدا جانے کیا ہوا

رزا علاء الدین ابن مرزا منور بخت بنارسی متخلص آزرد کہتے ہیں ؎

یہاں بیخودی ہے مانعِ نظارہ ہم نفس — اُس نے جمال اپنا دکھایا تو کیا ہوا

حافظ محمد حسین بسمل کی باری آئی وہ فرماتے ہیں ؎

شکوہ مت کر حال جو بسمل ترے دل کا ہوا — شکر ہے ہر حال میں جو کچھ ہوا اچھا ہوا

رزا غیاث الدین تمنا کہتے ہیں ؎

اے تمنا دل پہ کیوں رکھے ہوئے ہو ہاتھ تم — پھر کہیں کیا دل لگا عشقِ بتاں پیدا ہوا

رزا حاجی شہرت خلف مرزا قیام الدین نے کم و بیش ستر شعر زمینِ طرح میں سُنائے ؎

ہے یہ مستی میں بھی ہوشیاری کہ اب اُس کا نقاب — رُخ سے سرکا ہی تو ہے ایک یوں ہی سامنا ہوا
اہلِ عالم کی نظر میں شانِ ظالم ہے بلند — ہے فلک ان سب کی نظروں میں بڑا ٹھہرا ہوا

رزا قادر بخش صابر صاحب "گلستانِ سخن" عنہ غزل سُنائی ؎

ہے نگاہِ آشنا کو ہر جگہ جلوہ سے ربط — دیر بھی کعبہ تھا جب میں ناصیہ فرسا ہوا
وصل سے عاشق نے پایا مرتبہ معشوق کا — قطرہ خود دریا ہوا جب واصلِ دریا ہوا

مرزا حاجی شہرت کم و بیش ہفتاد بیت در زمین طرح بر سامعہ انجمن نشینان عرضہ داد من بہ بہانۂ آب تاختن از بزم بیروں آمدم و راہ غمکدہ گرفتم در و کا نہا کشودہ بود و چراغہا روشن ہمانا نیمہ از شب گذشتہ بود کہ بر بوریائے بے نوائی دو سہ جام بادہ روانی خواہ و بادہ آشامیدم و ختم بادہ و بہ ارک ہمایوں رو ئے آوردم ہر چہار سلطان زادہ کہ نام نامی آناں بر زبان قلم رفت زمزمہ شبانہ تازہ کردند من نیز غزل دوبارہ خواندم از ہمدماں شنیدہ شد کہ شب در ہنگامہ سر آمد و نزدیک بدمیدن سپیدہ سحر بزم برشکست گویند سلطان الشعراء بپایانِ انجمن دو غزل از خویشتن سرود ومانہ در طرح از امروز نیست“[۵۱]

قلعہ کے ایک مشاعرہ میں غالب اور صہبائی کی ہم طرح غزلیں تھیں۔ ”گریبانم نمی آید۔ دامانم نمی آید“ طرح ہوئی، صہبائی نے یہ غزل پڑھی ؂

زکس یارب علاج دردِ ہجرانم نمی آید شدم خاک و ہنوز آں برق جولانم نمی آید
بنازم پاسِ ناموسِ تمنا را کہ در ردیش سخن تا لب نگہ تا نوکِ مژگانم نمی آید

چو دیدم غالب و آزردہ را از ہند صہبائی
بخاطر ہیچ یاد از خاک ایرانم نمی آید

آزردہ بیمار تھے شریک مشاعرہ نہ ہو سکے، مرزا غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

”چوں نوبت بہ من رسید نخست ملک نخواست فلک نخواست سر دادم آنگاہ غزل طرحی خواندم ؂

چہ عیش از وعدہ چوں بادہ زعنوانم نمی آید
بہ نوعے گفت می آیم کہ می دانم نمی آید

شہادت

آفت اس شہر میں قلعہ کی بدولت آئی وہاں کے اعمال سے دلّی کی بھی شامت آئی
روز موعود سے پہلے ہی قیامت آئی کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی

ابوظفر قلعہ میں بیٹھے کمپنی بہادر کے وظیفہ پر گزران کر رہے تھے، ان کی ضعیفی سے فائدہ اٹھا کر نواب زینت محل جانشینی کے ڈورے ڈال رہی تھی۔ کمپنی بہادر کو یہ کانٹا بھی چبھ رہا تھا۔ یکایک ہنگامہ رونما ہوا۔ اوباش آوارہ لوگوں کی بن آئی، لوٹ مار پر کمر باندھی، میرٹھ کے نکالے ہوئے فوجی تلنگے انکی ہمنوائی کرنے لگے۔ اُدھر بادشاہ کو آگھیرا، پہلے تو وہ بچے مگر دہائی تہائی سے، اور کچھ سر پھیر سے

---

۵۱ ”کلیاتِ نثر غالب“ صفحہ ۲۲۸ ۔

حالی نے بھی قلعہ کے مشاعرہ کا ذکر کیا ہے کہ ذوق اور غالب نے ہم طرح غزل پڑھی تھی۔

مشاعرہ ساری رات جاری رہا، سب کے آخر میں سلطان الشعرا ذوق نے غزل طرح پر سنائی اور مرزا صاحب نے جو غزل پڑھی اُس پر بھی فی البدیہہ شعر سُنائے، پہلے بادشاہ کی شان میں رُباعی کہی، کہتے ہیں ؎

پہلے نہ اشرفی آفتاب عالم میں　　خطِ شعاع سے اس پر اگر نہ ہو تحریر
ابوظفر شہ والا گہر بہادر شاہ　　سراجِ دینِ نبی سایۂ خدائے قدیر

غزل طرح ؎

پانی طبیب دے ہے ہمیں کیا بجھا ہوا　　ہے دل بھی زندگی سے ہمارا بجھا ہوا
پھر دل میں آہ سرد ہوئی میرے شعلہ زن　　لو پھر بھڑک اُٹھا یہ فتیلہ بجھا ہوا

ہم آپ جل بجھے مگر اس دل کی آگ کو
سینے میں ہم نے ذوق نہ پایا بجھا ہوا

مرزا غالب جا چکے تھے اُن کی غزل پر غزل اُسی وقت کہی، فرماتے ہیں ؎

مُنہ یہ دل کے لئے تھے نہ تھے زباں کے لئے　　سو ہم نے دل میں مُنہ سوزشِ نہاں کے لئے

بنایا آدمی کو ذوق ایک جزوِ ضعیف
اور اس ضعیف سے کُل کام دو جہاں کے لئے

اس کے بعد مشاعرہ ختم ہوا۔ اس مشاعرہ کا ذکر مرزا غالب نے میر مہدی مجروح کو لکھا:۔

"شاہ زمان داد و حاجت بارگاہ سخن گستران را ایوانِ نظارت نشان داد کہ روز آدینہ بست و پنجم فروری سہ بداں خجستہ نشیمن بیائید و جام سخن بریک دگر پیمائید، گروہے از شاہزادگانِ بابریہ و تنے چند از آزادگان شہر فراہم آمدند جا بر مردم تنگی کرد۔ گوئی پیکر اندر پیکرای خوید نخست، سلطان الشعرا، شیخ محمد ابراہیم ذوق زخمہ برتار زد و غزل سلطان را بداں نظر بر خواند کہ زہرہ از سپہر فرود آمد پیش شاہزادۂ یوسف دیدار ہمایوں آثار۔ مرزا خضر سلطان بہادر غزل طرح بداں سخن سرود کہ پنداری پروین بر بساط بزم افشاند مرزا حیدر شکوہ و مرزا نور الدین و مرزا عالی بخت عالی را ساز سخن بلند آہنگ شد غالب آشفتہ نوا کہ پہلوی عالی جا داشت دو بیت از خویشتن خواند محوی نام مردے از ہم آشامان خمکدۂ صہبائی نشید مستانہ زد

کے دروازہ سے دریا پار لیجا کر بندوقوں کی باڑیں ماری گئیں اور لاشیں دریا میں پھکوا دی گئیں ۔[۵۱]

کیونکر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بیجرم جو صہبائی ہو

حضرت اکبر لکھتے ہیں ۔

نوجوانوں کو ہوئیں پھانسیاں بیجرم قصور — ماردیں گولیاں پایا جسے کچھ زور آور
یہی صہبائی جو تھے صاحبِ قولِ فیصل — ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدر اور پسر[۱]

حلیہ | قدمیانہ تمام سر پہ بال، رنگ گندم گوں کھلا ہوا، دُبلے پتلے مُنہ پر چیچک کے سے داغ کہیں کہیں تھے ۔[۵۲]

یہ تھی حضرت صہبائی کی کہانی۔

آخر میں ان کی دردانگیز شہادت پر ایک مرثیہ ملاحظہ ہو ۔[۵۳]

ندانم کجا رفت آں نعش پاک — ملک بردیا ماند بر روئے خاک
ندانم کسے داد اورا کفن — ویا ماند چوں سایہ بر خاک تن
ندانم چہ کرد است با او سپہر — ز جامہ کفن کرد یا تاب مہر
بخاکش نمو وند اورانہاں — ویا مُرتفع شد سوئے آسماں
کسے فاتحہ ہم برو خواندہ است — بعطر گلابی برافشاندہ است
کدامی گل و بلبل و باد دشت — بخاکش بجز عقیدت گزشت
الٰہی بیامرز مظلوم را — کلاہِ شہی دہ بہ ملکِ بقا

بفردوس اعلیٰ بود جائے او
بہشتِ بریں باد ماوائے او

انتظام اللہ شہابی

---

[۱] دیوان اکبر [۵۲] طبقات الشعراء از مولوی کریم الدین دہلوی ۔ [۵۳] سفینۂ رحمانی صفحہ ۸۸

شہزادوں کے کہنے سننے سے نئے نئے خواب دیکھنے لگے۔

جنرل فیروز بخت خاں روہیلہ، بریلی سے آگیا، اس کے ساتھ توپ خانہ تھا، بادشاہ کی پشت پناہی کرنے لگا۔ بادشاہ نے جرنل فوج کا بنا دیا، آگے چل کے لارڈ کمانڈر بن گئے۔ جرنل تھا بڑا بہادر اس کے طریقہ کار کے مرزا مغل وغیرہ آڑے آئے، نتیجہ تباہی تھا، جرنل لکھنؤ گئے مولوی احمد اللہ شاہ مدراسی کے ہمراہ کر لکھنؤ میں بھی نئی اسلامی حکومت قائم کرنا چاہی، ناکامیابی پر روپوش ہو گئے۔

ابو ظفر رنگون بھیجدئے گئے، جو جو قلعہ سے تعلق رکھتا تھا لپیٹے میں آئے بغیر نہ رہا۔ آزردہ جیل گئے، شیفتہ کو بھی قید ہوئی۔ مولانا فضل حق کو انڈمان جانا پڑا وہیں سپرد خاک ہوئے۔ سعی سفارش سے آزردہ اور شیفتہ کی گلو خلاصی ہوئی۔ غالب روپوش رہے تو خطرہ سے بچے رہے، صہبائی گولی کا نشانہ بنے، چنانچہ ظہیر دہلوی کہتے ہیں ؎

جہاں کی تشنہ خون تیغ آبدار ہوئی — سنانِ نیزہ ہر اک سینہ سے دوچار ہوئی
رسن ہر ایک بشر کے گلے کا ہار ہوئی — ہر ایک سمت سے فریاد گیرودار ہوئی

ہر ایک دشتِ قضا میں کشاں کشاں پہنچا
جہاں کی خاک تھی جس جس کی وہ وہاں پہنچا

ہر ایک شہر کا پیر اور جوان قتل ہوا — ہر اک قبیلۂ و ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک اہل زبان خوش بیان قتل ہوا — غرض خلاصہ یہ ہر اک جہان قتل ہوا

گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

غرضکہ جو لوگ شہر میں رہ گئے تھے اُن میں کئی اشخاص باکمال نامی اور فرد روزگار مارے گئے[۵/۱] جو دہلی کی ناک اور یگانۂ آفاق تھے، جن کی نظیر آج تک پیدا نہیں ہوئی اور نہ ہوگی میاں محمد امیر پنجہ کش خوشنویس جن کا ثانی روئے زمین پر نہیں۔

مولوی امام بخش صہبائی اور اُن کے دو بیٹے اور میر نیاز علی واقعہ خواں اور چیلوں کے کوچے کے اور بہت سے شریف خاندانی لوگ سُنا گیا ہے کہ اُسی محلہ کے چودہ ۱۴۰۰ سو آدمی گرفتار کر کے راج گھاٹ

۵/۱ "داستان غدر" صفحہ ۱۲۰۔

قطع نظر دوسری فرسودہ باتوں کے ان کے کلام پر ایک عام نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

تیرؔ کی تمام عمر مصیبت و آلام کا مسکن بنی رہی۔ ان کو حقیقی خوشی سے دوچار ہونے کا موقع کبھی نہ مل سکا ہمیشہ مصیبت کے کالے اور بھیانک بادل ان کے سر پر منڈلاتے رہے۔ وہ خود فرماتے ہیں ؎

اس گلشنِ دنیا میں شگفتہ نہ ہوا میں — ہوں غنچۂ افسردہ کہ مردودِ صبا ہوں

یا

دلِ پُر خون کی اک گلابی سے — عمر بھر ہم رہے شرابی سے

ایک رُباعی میں بھی اسی طرف اشارہ ہے ؎

ہر صبح غموں میں شام کی ہے میں نے — خونابہ کشی مدام کی ہے میں نے
یہ مہلتِ کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر — مر مر کے غرض تمام کی ہے میں نے

تیرؔ کی اس ناشادی اور نامرادی کا سبب اُن کا دل باختگی کا سودا تھا جو انھوں نے عہد جوانی میں کیا تھا۔ عشق کی ناکامیابی نے ان کے دل و دماغ کو کارگاہِ غم بنا دیا۔ اُس پر حوادثاتِ زمانہ اور عزیزوں کی بے اعتنائی نے زخمی دل پر نمک پاشی کی۔ وہ صدمہ کی تاب نہ لاکر مجنوں ہو گئے۔ جنون کی حالت میں وہی ماہ پیکر ان کی اُجڑی ہوئی بستی کو آباد کیا کرتا تھا:۔

"در شبِ ماہ پیکرے خوش صورت باکمال خوبی از جرم قمر انداز طرف من می کرد و موجب بیخودی من می شد۔ بہر طرف کہ چشم می افتاد، بر آں رشک پری می افتاد۔ بہر جا کہ نگاہ می کردم تماشائے آں غیرت ماہ می کردم.......... ہر شب با دجمعت، ہر صبح بے او وحشت۔ دمے کہ سفیدیِ صبح می دمید از دلِ گرم آہ سرد می کشیدہ یعنی آہ می کرد و انداز ماہ می کرد۔ تمام روز جنوں می کردم۔ دلِ دریا دار خوں می کردم.......... ناگاہ موسم گُل رسید دماغ سودا سیاہ گردید یعنی چوں پری دیدہ شدم معلق اندکارشدم۔ صورتِ آں شکل وہمی در نظر ایستادہ زلف مشکینش در سر شاخ تاکن گیرہی شدم زندانی زنجیری شدم۔"

عزیزوں کی وقتی کوشش سے ان کو بہت جلد افاقہ ہو گیا اور زندگی بھر وہ صورت کبھی نظر نہیں آئی۔ لیکن اس سانحہ نے ان کے بربطِ شاعری کے ایسے تار چھیڑے جن سے صدا خون میں ڈوبے ہوئے نغمے نکلنے لگے ؎

کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہگیں نہیں — اس غم کدہ میں آہ دلِ خوش کہیں نہیں

میر کی شاعری پر ایک عام نظر

(از سید لطیف حسین ادیب بریلوی)

میر کی ہستی محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ ایسا عمیق سمندر ہے جس میں لہریں عجیب جوش و خروش کے ساتھ اٹھیں اور ساحل سے ہم کنار ہو کر خاموش ہو گئیں یعنی سکوت وجہ زندگانی بن گیا ؎

کیا کروں شرح خستہ جانی کی
میں نے مر مر کے زندگانی کی

اس خدائے سخن کی شاعری خستہ جان زندگی کا ایک پرتو ہے، ایک ایسا شیشۂ سرخ ہے جس پر خونِ عاشق کا شبہ ہوتا ہے، ایک ایسا جام جہاں نما ہے جس میں درد و کرب، غم و اندوہ، یاس و حرماں، رنج و الم کی ہزاروں حشر آفریں صورتیں اپنا جلوہ دکھاتی ہیں، ایک ایسا رومان ہے جس میں محرومِ قسمت تخیل کی فلک پیمائیوں کے ساتھ زندگی کو خوشی کا پیام شادمانی سناتی ہے۔ ایک ایسا ابرِ قنوطیت ہے جس کے درمیان سے بجلی کی دمک بھٹکے ہوئے مسافروں کو راستہ دکھاتی ہے۔ اس کے خزینۂ شعر، حوصلہ خیز اور نشاط انگیز امکانات کے کاشفِ اسرار ہیں جن کے مطالعہ سے بیٹھے ہوئے دلوں اور پژمردہ چہروں پر مسرت اور زیرِ لب تبسم کے آثار بہت جلد نمایاں ہو جاتے ہیں۔ کسی فن کار میں اتنا حوصلہ اور قابلیت نہیں کہ وہ توضیح اور توثیق کے ساتھ شاعری اور خصوصاً میر صاحب کی شاعری کا تجزیہ کر سکے۔ فنونِ لطیفہ میں شاعری ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس کی مثال ایک چمن کی سی ہے جس میں رنگ رنگ کے پھول مسکرا رہے ہیں۔ پھولوں کے رنگ و بو کو علیحدہ علیحدہ مقید کرنے کی کوشش اس کی موت کے مرادف ہوگی۔ اسی طرح شعر ایک گلِ رنگ و بو ہے۔ اس کی روح یعنی جذبات کو علیحدہ کرنے کی سعی یقینی طور پر اس کے دفن کر دینے کے برابر ہوگی۔ البتہ ذوقِ سلیم سے جاننا شعر کو سمجھنا ہے۔ اس کے خارجی حسن و نمائش اور زیب و زینت پر نظر کر کے محاسن و معائب بیان کرنا ہی ایک ناقد کا پیشہ ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کی روشنی میں میں نے کلامِ میر کو پرکھا ہے اور

شکوۂ آبلہ ابھی سے میرؔ ہے پیارے ہنوز دلّی دُور

یک رنگی میں اُن کو اپنے آئینۂ ہستی میں محبوب کی تصویر نظر آتی ہے۔ چنانچہ دبی زبان سے وہ اس طنز کر دیتے ہیں ؎

واں تم تو بناتے ہی رہے زلف عاشق کی بھی یاں گئی گزر رات

کبھی ان کا طنز تمسخر کی سند پاتا ہے۔ تمتماتے چہرے سے پھول جھڑتے نظر آتے ہیں۔ حزن و ملال وارفتگی میں زیرِ لب تبسم جھلکیاں مارتا نظر آتا ہے۔ اس لئے عجب نہیں کہ شیخ سے بھی دو دو ہاتھ جاتے ہیں ؎

کل رقصِ شیخ مطلق دل کو لگا نہ میرے آیا وہ حیزِ شرعی لنگا مٹک مٹک کر

حقیقت شیخ کی "شیخی" پر طنز کیا ہے۔

شیخ کا وجود قدما کے دواوین میں بھی ملتا ہے۔ صوفیانہ شاعری نے راہِ طریقت کے تمام گناہوں تک اس اکیلی جان کو ٹھہرایا ہے۔ محبوب کے جور و ستم کے نعم البدل یہی حضرت ہیں۔ لیکن میرؔ نے جناب کوئی سج دھج سے پیش کیا۔ اس نے ان سے وہ کام لئے جو ایک کٹھ پتلی بھی ادا نہ کر سکتی تھی۔ کہیں کے لونڈے" عمامہ کھینچتے ہیں تو کہیں دستار۔ کہیں "داماد" بن کر اس کی لڑکی بیاہ لاتے ہیں تو کہیں "کو نگلا" سمجھ کر شکار کرنے کی سعی لاحاصل کرتے ہیں۔ اگر ایک طرف محفل میں نچاتے ہیں تو دوسری طرف "کہہ کر اس کے "جبّہ" اور "عمامہ" پر طنز کرتے ہیں۔ کبھی اس کی "پارسائی" پر معترض ہیں تو کبھی حیلہ پر۔ غرض یہ کہ "شیخ مشیخت پناہ" کو گھوارۂ کد اور تصویرِ بد بنا کر پیش کیا ہے۔ لیکن فہم یہ سمجھنے سے ہے کہ یہ سب کیوں کیا؟ واضح رہے کہ شیخ کا وجود بھی اتنا ہی پیچدار ہے جتنے اس کی پگڑی کے پیچ دار ہیں۔ اس کی ہستی سراپا راز ہے۔ جس طرح کلی کا کھلنا گل کی آفرینش کا پتہ دیتا ہے، اسی طرح شیخ کا منظرِ عام پر آجانا میرؔ کی حقیقت کا باعث ہوتا ہے۔

میرؔ نے اپنی رُوح کے اس عُنصر کو اس خاکی پُتلے میں بھر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ مردِ مقابل بن کر عشق میں آتا ہے۔ وہ دراصل رقیب ہے جو گاہ گاہ نبرد آزمائی کرتا ہے۔ لیکن میرؔ کی شرر فشانی کے لئے اس کی شیخی کر کری ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ تصویرِ عبرت بھی ہے۔ میرؔ نے شیخ کو روپ میں ان دشمنانِ کو پیش کیا ہے جن کی بوالہوسی سچے عاشق کی طبیعت پر بار ہے۔ اس لئے وہ "طنز" کرتے ہیں اور

. میر کے اس حُزن و ملال نے شاعری کے وسیع میدان میں نئی نئی راہیں تلاش کیں۔
شاعری کی صنفِ نازک یعنی غزل نے جس کا دارو مدار محض وارداتِ قلبیہ اور داخلی کیفیات پر
کے گراں بہا تحفہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ابھی تک اردو غزل غم کے اس میٹھے درد سے نا آشنا تھی
خارجی جذبات سے آراستہ کیا گیا تھا۔ لیکن میر کی تڑپ نے اس کو ایک نئی شعاعِ زندگانی
محبت کو نئے رنگ سے پیش کیا۔ اُس نے ساغرِ کہنہ میں شراب نو بھری۔ اُس نے محبت کے اش

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا   ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

اپنے آنسوؤں سے دھو دیا ؎

درد ہی خود ہے خود دوا ہے عشق   شیخ کیا جانے تو کہ کیا ہے عشق

وہ ایک بوالہوس عاشق نہیں۔ اس کے وصل کا دامن موت سے بندھا ہوا ہے۔ اس کی
کامیابی کا راز 'موت' اور محض موت پر ہے ؎

نہ ملیں گو کہ ہجر میں مر جائیں   عاشقوں کا وصال ہے کچھ اور

یعنی وہ مر کر دوسری دنیا کے اس مقابلۂ محبت میں حصہ لینے کے لئے کوشاں ہے، جہاں "ابھی
امتحاں اور بھی ہیں" دوسرے الفاظ میں وہ اِن دُنیوی ناکامیوں اور بے ثباتی کے گھر سے
گزر کر نورِ حقیقت سے ہم کنار ہونے کی سعی پیہم کرتا ہے۔ اس لئے اس کا پریم مستحکم اور لافانی۔
زیست سے بھی بوئے وفا آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی محبت میں 'خودداری' ہے' بدو:
اور ساتھ ساتھ مکمل کامیابی ہے۔

میر نے خونِ دل سے ہولی کھیل کر معیارِ محبت کو ہمیشہ بلند رکھا۔ عشق کی راہ روی میں
چھا جانے کے ارادے رکھے۔ محض لفظِ 'محبت' کی پاسداری میں عمر بھر فقیرانہ زندگی بسر کی۔ زمانہ
کو اپنے سینہ پر لیا۔ وہ جانتے تھے کہ محبت ایک پاک جذبہ ہے جس سے وصل، ہوس پرستی
پر نہیں بلکہ جنازہ پر ہوتا ہے۔ اس لئے جگر کے شراروں نے نفس اَمّارہ کی سرکشی کو جلا کر خاک
ان شراروں میں 'طنز' کا وہ سُمِ قاتل موجود تھا جس سے عرقِ ہوس پانی ہو کر بہہ گیا۔ 'طنز'
زنگ آلود انی تھی۔ جس سے پاسِ محبت میں خود اپنے اوپر کچھ کے لئے اور سرکش نفس کو کبھی معہ
خلافِ علمِ بغاوت بلند نہ کرنے دیا۔ کیسے لطیف پیرائے میں اپنے اُوپر طنز کرتے ہیں! ؎

ن وہ اس فنا میں بقا کے خواب دیکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کائنات عالم فانی شئے ہے۔ لیکن عنصر حقیقی، وہ نور معرفت، وہ پرتو ازلی، ہمیشہ قائم رہنے والی چیز ہے۔ جس سے محبت کے پینگ بڑھائے تے ہیں۔ جس تک پہونچنے کی کوشش میں خود کو فنا کیا جاتا ہے تاکہ فنا (-) فنا (-) سے بل کر بقا (+) سبب بنے۔ دنیا کا عیش و طرب عشق کی اس منزل میں سنگ گراں ہے جس سے جہاز زندگانی ٹکرا کر پاش ش ہو جاتا ہے۔ دنیا کی کوئی خوشی وجہ بقا نہیں بن سکتی۔ کیونکہ وہ ایک دائمی خوشی سے ہم کنار ہونا چاہتا ہے جس تک پہنچنے ذریعہ خود خوشی نہیں بن سکتی البتہ غم ہو سکتا ہے اس لئے وہ دنیا کے عارضی نشاط کو پس پشت ڈال کر غم کی وادی پرخار سے رتا ہے تاکہ ایک نئی دنیا بسانے میں کامیاب ہو سکے۔

وہ جب کائنات پر نظر غائر ڈالتا ہے تو اس کو "سوز و ساز" و "درد و داغ" میں "آرزو و جستجو" کے دریا لہریں مارتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے دل میں شوق اور جستجو کے سمندر موجزن پاتا ہے۔ یہی وہ ق ہے، یہی وہ آرزو ہے، یہی وہ جستجو ہے جو خود اس کی ہستی کا سبب بنی ہے ؎

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر   میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں

بچہ جہاں وہ دنیا میں بے ثباتی کی آنی جانی چھاؤں دیکھتا ہے، وہاں اس شوق کے زیر اثر ان سے ر جانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ عشق میں خود کو کامیاب بنانے کے لئے نہایت ذوق و شوق سے ارضی نشاط کو پس پشت ڈال کر وادی پرخار سے گزر جانے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ وہ اس دنیا سے سکے جس کا وہ خود ایک قطرہ ہے۔ اس لئے وہ دنیا میں ہر چیز کو مرکز غم پاتا ہے ؎

کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہگیں نہیں   اس غم کدہ میں آہ دل خوش کہیں نہیں

اس کی ہستی بھی حزن و ملال کا ایک مرقع ہے ؎

دل گیا، ہوش گیا، صبر گیا، جی بھی گیا   شغل میں غم کے ترے ہم سے گیا کیا کیا کچھ

ہر فانی کی تمام نشاط انگیز چیزیں بھی پیغام آہ کا ایک نمونہ ہیں مثلاً گل تر شہادت گاہ باغ زمانہ۔ ع

کہ ہر گل اس میں ایک خونیں کفن ہے

یا

یہ عیش گاہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے
ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا

جی کھول کر کرتے ہیں۔ چنانچہ میرؔ کے طنزیہ طمانچوں کی بارش جو اکثر و بیشتر شیخ پر ہوئی ہے محض سامانِ تفنن نہیں بلکہ مقامِ عبرت ہے۔ ایک درسِ محبت ہے۔ ایک پیغامِ وفا ہے۔ جو نامعِ مشفق اور سچے عاشق کی حیثیت سے اپنے ہم مشربوں کو سنایا ہے۔ میرؔ کا یہ طنز صدائے جرس ہے جس سے شیخ کی قافلہ سالاری میں رہنمائی کی ہے ؎

پھرے ہے شیخ مجلس ہی میں رقصاں ادھر آ نکلے تو ہم بھی نچا دیں

اس شعر میں اگر ایک طرف 'رقصاں' کہہ کر شیخ کی مجلس سماع میں جھوٹے وجد کی طرف اشارتاً طنز کیا ہے تو دوسری طرف 'ہم بھی نچا دیں' کہہ کر سرِ محفل اس کی تضحیک کی ہے۔

اسی قبیل کا ایک اور شعر ہے ؎

شیخ کی تو نماز پر مت جا بوجھ سر کا سا ڈال آتا ہے

یعنی محبت ایک وبال نہیں، ایک رسم نہیں، ایک بارِ گراں نہیں بلکہ ایک عزم بالجزم ہے جس کو ضرورت ہے صبر و استقلال کی اور پاک نفس کی۔ اس طرح میرؔ صاحب فلسفۂ عشق کے دقیق سے دقیق مسئلوں کو نہایت ہی لطیف و نازک پیرائے میں اس 'طنز' کی بدولت حل کر لیجاتے ہیں۔

کچھ حضرتِ شیخ ہی پر منحصر نہیں۔ اگر حقیقت کی روشنی میں میرؔ کو دیکھا جائے تو "اس کی زندگی ہی ایک المناک طنز تھی" انھوں نے اس طنز کی بدولت اپنی ہستی کو مابعد کی اقوام کے لئے نمونۂ عبرت بنا لیا جس سے سچی حقیقی محبت کے مرقعے تیار کئے گئے اور رقیبانہ محبت کا خاکہ اُڑایا گیا۔

میرؔ نے فلسفۂ حیات کو بخوبی سمجھا ہے۔ انھوں نے زندگی اور موت کی گتھیوں کو بآسانی سلجھا کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک زندگی ایک فانی شئے ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ فنا کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔ زیست ہمیشہ موت کے انتظار میں رہتی ہے۔ ہستی کی مثال ایک حباب کی سی ہے جس کی بقا بقا نہیں فنا ہے۔ یہ عالم ایک خواب و خیال ہے جس کی ابتدا خوشی سے اور انتہا غم پر ہوئی ؎

ہستی اپنی حباب کی سی ہے یہ نمائش سراب کی سی ہے
چشمِ دل کھول اس ہی عالم پر یاں کی اوقات خواب کی سی ہے

ایک جگہ خود کو مخاطب کر کے اپنی بے ثباتی پر روشنی ڈالی ہے ؎

ہے زیست یہی کوئی جو میرؔ کہے ہو تو ہر آن میں مرنے کو تیار رہا کیجئے

ی ہے فلسفۂ موت جس کو اُنھوں نے گاہ گاہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ اس مصرع میں اسی حقیقت پر روشنی
تی ہے۔ ع ـــــــــــ مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے

عشق کی پُرخار راہیں تو ابھی طے کرنے کو باقی ہیں۔ تھوڑی دیر دم لے کر، پھر خاک اُڑاتے، آہیں
رتے منزل کی طرف چل دیں گے۔ حزن و ملال تو مدام ہے اِس سے کبھی چھٹکارا نہیں۔

کسی ناقد کا یہ کہنا کہ ان کے کلام میں بالکل شادابی نہیں ہے بالکل درست ہے۔ حقیقت شناس نظریں
کھتی ہیں کہ ان کا کلام سراپا 'آہ' ہے اور 'واہ' سے اس کو دُور کا بھی تعلق نہیں۔ ان کی شاعری سراپا
رد' ہے۔ رجائیت سے اس کو سروکار نہیں۔ قنوطیت کے اندھے چراغ منزل نما ہیں۔ دواوین میں
س کہیں زہرخند ظرافت سے آنکھیں دوچار ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس کو سامانِ نشاط اور وجہ سرور لکھنا
ک نہیں۔ وہ درحقیقت بلاواسطہ طنز ہے۔ عمیق اور شعرنواز نظریں بہت جلد اس کو محسوس کر لیتی ہیں۔
ی النظر میں یہ ظرافت یا تمسخر ہوتا ہے لیکن درحقیقت وہ 'آہ' یا دبی ہوئی چنگاری' ہوتی ہے جو خون سے
ب کر نکلتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی ہجویات کو لے لیجئے۔

دیکھئے بلاس رائے کی کیسی درگت بنائی ہے۔ کس بُری طرح غریب پر برسے ہیں۔ کوئی دقیقہ اُٹھا
ں رکھا ہے۔ فحش اور خلاف متانت کلام بھی نوکِ زبان پر آگیا ہے۔ ایک وجد اور بیخودی معلوم
تی ہے جس میں بڑبڑاتے چلے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بھرے بیٹھے تھے اور شہ پاتے ہی برس پڑے۔ کیا
کو رجائیت اور کلام کی شادابی کہتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ دراصل وہ طنزیہ نشتر ہیں جن کی بارش ہم پر کی گئی
۔ کوئی دل جلا بیٹھا ہو ذرا چھیڑ دیجئے، دیکھئے پھر کس شان سے اپنی جودتِ طبع کا مظاہرہ کرتا ہے!

بالکل اسی طرح میر ایک 'دل جلے' ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی اور درد و غم کے تیرہ و تاریک بادلوں نے
کے دل میں ایک سیلاب رواں کر دیا۔ معمولی سی شہ محرک ہوئی۔ اور وہ کس طرح برسے۔ ہجویات خود اس
نظیر ہیں۔ یہی ایک نمایاں فرق ہے جو میر اور سودا کی ہجویات کے درمیان ایک امتیازی نشان
م کر دیتا ہے۔

یہ تھیں وہ چند جھلکیاں جو خدائے سخن کی شاعری میں قوس و قزح کی طرح دلفریب اور نمایاں ہیں۔
دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس فنِ نازک میں کس حد تک کامیاب ہیں۔ وہ محض تخیل یا فلسفہ ہی کے بندے
۔ یا خارجی رنگ آمیزی سے اس کو سجایا بھی ہے۔ ہم نے اب تک ان کے کلام کو کیا پیش کیا ہے، کے

وہ دُنیا سے خود پوچھتے ہیں ؎

گزرا کسے جہاں میں خوشی سے تمام روز؟ کس کی کٹی زمانے میں بے غم تمام شب ؟

لیکن جواب نفی میں ملتا ہے اس لئے منہ بسور کر کہہ دیتے ہیں ؎

ہرگز زمین یہاں کی رونے ہی کی جگہ تھی مانند ابر ہر جا میں زار زار رویا

جب محبوب کی جُدائی زیادہ بار گزرتی ہے تو اس کا شوق پہلے سے زیادہ بڑھ جاتا ہے اس لئے دہ

دُنیا سے اظہارِ بیزاری کرتا ہے ؎

مر رہتے جو گل ہم تو سارا یہ خلل جاتا نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا

یا

روزِ محشر ہے رات ہجراں کی ایسی ہم زندگی سے ہیں بیزار

اب یہ کہنا کہ میرؔ ایک قنوطی شاعر ہیں بالکل بجا ہے۔

یہ ابھی واضح ہو چکا ہے کہ میرؔ ایک قنوطی شاعر ہیں۔ وہ رنج و مصیبت کو وجہ نجات سمجھتے ہیں۔ وہ

'رو کر' ایک نئی 'زندگانی' کے خواہاں ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کا معیارِ موت کیا ہے؟ کیا موت

ارتقائی منازل کی ایک منزل ہے۔ جہاں سے عشقِ حقیقی کا نیا باب کھلتا ہے؟ اس کا جواب اُنھوں نے

نہایت آسان الفاظ میں دیا ہے ؎

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دَم لے کر

درحقیقت میرؔ کی قنوطیت کے تین مدارج ہیں۔ پہلا درجہ وہ ہے جس میں دُنیا کی ہر چیز کو وہ 'اندوہگیں' سمجھتے

یں۔ کائنات کی ہر چیز ان کو نمونۂ غم نظر آتی ہے۔ عشق میں دُنیا ان کو اندھیر سی معلوم ہوتی ہے۔ بالآخر

ہ مر کر ایک نئی زندگانی چاہتے ہیں۔ یہیں سے ان کا دوسرا درجہ شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی موت ایک کڑی

ں کر سامنے آتی ہے اور اوّل و آخر کی منازل کو نصفین میں تقسیم کر دیتی ہے۔ مرنے کے بعد وہ ایک نئی

ندگی میں داخل ہوتا ہے۔ جہاں حسن و عشق نئے روپ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ وہی آشفتہ سری وہی

خستہ سامانی پھر سامنے آتی ہے۔ حسن بدستور پردہ میں رہتا ہے۔ ماحصل یہ ہوا کہ ارتقا، خود قنوطیت کا

ادنیٰ جزو ہے۔ اگر قنوطیت ایک بحرِ بے کنار ہے تو 'ارتقاء' اس میں محض ایک راستہ ہے۔ جس پر عشاق

رکرتے نظر آتے ہیں۔ موت ایک منزل ہوئی جہاں مسافر آرام کر کے پھر راہِ عشق پر گامزن ہو جاتا ہے۔

گھٹا دیتا ہے شعر کا بدنما داغ ہے۔ زیادہ بہتر یہی ہے کہ ایسی صورت میں اس کے استعمال سے پرہیز کیا جائے۔

جہاں تک تشبیہات و استعارات کا تعلق ہے میر بہت زیادہ کامیاب ہیں۔ ان کی محفل میں یہ دو ایسے ساز ہیں جن سے پُرسوز سُر نکلتے ہیں۔ ان کو سن کر جھومتے ہوئے لوگوں پر وجدانیت طاری ہو جاتی ہے "آہ" "آہ" کی صداؤں سے دشت و جبل خون رو رو دیتے ہیں۔ جب ساز کے پرسوز دل سے صدا آتی ہے

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

تو ارباب نشاط محوِ حیرت رہجاتے ہیں۔ منہ سے تعریف کے الفاظ ادا نہیں ہو پاتے۔ البتہ دل سے ایک آہ گرم نکلتی ہے جو لبِ خموش تک آتے آتے سرد ہو جاتی ہے۔ 'شام' 'کچھ' 'سا' 'چراغ' اور وہ بھی 'مفلس کا' تشبیہ کے ایسے جزویات ہیں جن سے اس کی رونق، اس کا درد و اثر پہلے سے دوچند ہو گیا ہے۔ شعر تیر کی طرح سینہ کے پار ہو جاتا ہے۔ اسی کو منتہائے کلام کہتے ہیں۔

اسی قبیل کا ایک اور نشتر ہے ؎

مانند طیر نو پر اُٹھے جہاں گئے ہم — دشوار ہے ہمارا آنا پھر آشیاں تک

خود کو 'طیر نو' کہہ کر تخیل کے دریا بہا دئے ہیں۔ ایسا پرند جس نے دُنیا کی سیر نہ کی ہو جو گرد و پیش کے حالات و واقعات سے نابلد ہو لیکن آرزو و جستجو میں گھر کو سلام آخر کہہ کر صحرا نوردی کرے تو یقینی ہے کہ شوقِ پرواز میں اس کی نظر آشیاں پر نہ رہے گی۔ یہی حال ایک عاشق کا ہے اس کا ذوقِ عشق اس کو سوئے وحشت لیجاتا ہے۔ گھر تو گھر اس کو اپنی ہستی کی بھی سوجھ بوجھ نہیں رہتی۔ وہ عشق کی ارتقائی منازل عیش و آرام کی قیمت پر طے کرتا ہے۔ یعنی 'آشیاں' وہ منزل ہوئی جہاں سے پرواز لا انتہا منزل کی طرف خطِ مستقیم میں شروع ہوئی۔ اس لئے یہ امر مسلمہ ہے کہ وہ آگے کو ہی بڑھے گا۔ واپس آنے کی کوئی اُمید اس سے وابستہ نہیں کی جاسکتی۔ اس کی یہ پرواز چکر نہیں (Rovement in a circle) بلکہ خطِ مستقیم (Movement in a straight line) میں ہے۔

شاید اب کم سے کم یہ احساس ہو گیا ہو گا کہ 'طیر نو' اور 'آشیاں' میں کس طرح سمندر کو جذب کر لیا ہے۔ سادی سی تشبیہ میں نہ صرف فلسفہ ہے بلکہ درد و اثر سوز و گداز کی خونیں شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔ اسی کو معراجِ تشبیہ کہتے ہیں۔

عنوان کے ماتحت جانچا تھا۔ اب میزان کے دوسرے پلڑے پر رکھ کر تولیں گے کہ کس طرح پیش کیا ہے۔

کسی چیز کو پیش کرنے کی ہزاروں صورتیں بہم پہنچائی جاسکتی ہیں۔ ایک ہی چیز کو اچھی یا بری طرح پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ حرف پیش کرنے والے پر منحصر ہے۔ ایک ہی تخیل کو سینکڑوں بوقلموں گلدستوں میں سجایا جاسکتا ہے۔ کچھ ایسے گلدستے ہوں گے جن میں مرجھائے ہوئے گل تر تیرہ کر کرائیں گے۔ کچھ ایسے گلدستے ہوں گے جن میں نگاہ باز نرگس پھوٹی آنکھ سے عالم بالا کی سیر کرے گی۔

میر صاحب کی بلند پروازی نشیمن سے ہٹ کر نہیں ہے۔ ان کے یہاں ایک طرف فلک پیما اُڑان ہیں تو دوسری طرف قوت پرواز بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ تخیل کی پرواز اور فلسفوں کے حل کے ساتھ ان کو پیش کرنے پر بھی حاکمانہ قدرت حاصل ہے۔ لیکن ان کی محفل میں اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ عروس سخن تمام ظاہری زیب و زینت سے بھی آراستہ کیا گیا ہے۔ وہ ہر اُس آرائش سے ملبوس ہے جو ایک باکمال صناع کے ہاتھوں بہم پہنچائی جاسکتی ہے۔ قریب سے کچھ ایسے آویزے بھی نظر آتے ہیں جن کا ان سے قبل فقدان ہے۔ اس سجی سجائی عروس کی چال ڈھال نئی ہے۔ ہر ہر قدم پر ایک فتنہ پیغام نکاح بن کر آتا ہے۔ جوش پر آئی ہوئی کافر جوانی جس طرف نظر کے تیر چلا دیتی ہے "آہ" "آہ" کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ خون میں لوٹتی ہوئی لاشوں کے پشتے لگ جاتے ہیں۔ اس کے ہر ہر زیور کی دمک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔

اس کافرہ کا سب سے پہلا اور درخشاں زیور نادر تشبیہات اور استعارات ہیں۔ تشبیہ ایک دوربین ہے جو دور کی چیز قریب اور قریب کی چیز قریب تر لا کر پیش کرتی ہے۔ یہی کام استعارے کا ہے۔ منھ بولتی تشبیہ اور قابل ستائش استعارہ وہ ہوگا جو مطلب کو واضح کرے نہ کہ اس پر پردہ ڈال دے۔ تشبیہ اور استعارہ اس جال کا نام نہیں جس میں شاعر اکثر و بیشتر پھنس جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کا کلام بھی ایک لاینحل معمہ بن جاتا ہے۔ کلام میں تنافر خیال اور تعقید معنوی تشبیہ اور استعارہ کے دوست نما دشمن ہیں۔ ہر چند شعر ظاہری زیب و زینت اور تخیل کی بلندی کا حامل ہو لیکن یہ دو داغ اس کی خوبی کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔ صاف اور کھلی ہوئی تشبیہ سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے اور استعارہ اس کی پردہ داری کرتا ہے۔ جس طرح مصور کے صحیح رنگوں کا انتخاب تصویر کے روشن مستقبل کا پیش خیمہ ہوتا ہے بالکل اسی طرح تشبیہات اور استعارات کا صحیح منتخب ہونا شعر کی رنگینیت میں ایک نئے باب کے اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ تشبیہ وہ تشبیہ ہے اور استعارہ وہ استعارہ ہے جو کلام کے اثر کو دوچند کر دے۔ وہ تشبیہ یا استعارہ جو کلام کے اثر کو

سوداکے جو بالیں پہ ہوا شور قیامت
خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

اس شعر میں ہر ہر لفظ ' واہ ' کا مصداق ہے۔ اس کے برخلاف ذیل کے شعر میں میر کا مخصوص ملال ' آہ ' کی منہ بولتی تصویر ہے ؎

سرہانے میر کے کوئی نہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

میر کے تمام تر اشعار اس خوبی سے مزین ہیں۔ تخیل کی پابندی اور نظر کی پرواز میں وہ الفاظ کے مرتبہ سے قطع نظر نہیں کرتے۔ وہ ایک باکمال جوہری کی طرح الفاظ کو بہترین نشستوں پر بٹھاتے ہیں اس شعر میں ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

صرف اپنی بیکسی کا اظہار ہے بلکہ ترنم الفاظ کے ذریعہ منظر کشی کی ہے۔ وہ اس مہتم بالشان خوبی میں اتنے بڑھے ہوئے ہیں کہ بسا اوقات ان کے نشتروں پر صنعت ایہام صوت کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ صنعت محض صوری نہیں بلکہ کلام کے اثر میں نئے اضافہ کا سبب ہوتی ہے۔ انھوں نے گاہ گاہ ان لفظی کھیلوں سے پست خیال کو بلند اور بلند کو بلند تر کر دیا ہے۔ اس پر ملال کی پالش نے نئی جلا بخشی ہے۔

اسی قبیل کی ایک اور صنعت ایہام ہے۔ قدماء کے دواوین میں یہ صنعت بدرجہ اتم موجود ہے۔ میر صاحب کی اس زد سے نہیں بچ سکے۔ انھوں نے بھی اس کا گوناگوں استعمال کیا۔ لیکن انھوں نے اس کی اندھی تقلید نہ کی۔ یہ صنعت جو قدماء کے ہاتھوں بدعت بن چکی تھی میر صاحب کی وجہ سے حسین نظر آنے لگی۔ انھوں نے محض ایک ہی لفظ کو پیشِ نظر رکھ کر شعر میں ایہام کا استعمال نہیں کیا بلکہ متعدد الفاظ ایک دوسرے کی مناسبت سے لائے اور پھر اس کا اطلاق کیا۔ مثلاً ؎

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز میر اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

' غیرتِ یوسف ' کی مناسبت سے ' وقتِ عزیز ' لائے۔ اب وقتِ عزیز ' قیمتی وقت ' کے معنی بھی رکھتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ عہد عزیز (مصر) کے بھی۔ لیکن مطلوب یہاں اول الذکر معنی ہیں۔ میر صاحب کی یہ بہت ہی نمایاں خوبی ہے اکثر و بیشتر شعراء ایہام کی اس منزلت سے محروم ہیں۔ یہ سب میر صاحب کی مسلم الثبوت استادی کا نتیجہ ہے۔ ان کے بعد اس کی اندھی تقلید کی گئی۔ چنانچہ لکھنؤ اسکول کے بانی جنابِ ناسخ نے اس دبستانِ نو

ان کی تشبیہات زیادہ تر شمع محفل کے گرد گھومتی نظر آتی ہیں۔ شاید اس کی وجہ وہ سوز و گداز ہے جس سے ان کی زندگی ہم آہنگ ہے۔ اگر وہ خود سر محفل شکل تصویر بے خودی ہیں، تو شمع محفل کی رو۔ صورت ہے، ان کو شمع سے کافی دلچسپی ہے۔ ان کو اس میں اپنی ہستی کی نمایاں صفات نظر آتی ہیں۔ یعنی بے ثباتی اور حزن و ملال کی ہزاروں سرخیاں اس میں پوشیدہ ہیں۔ لیکن عشق کی مجبوریاں اُن رازہائے درد کو نوکِ زبان پر نہیں آنے دیتیں۔ وہ اپنی گرمیٔ عشق کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ نہایت خندہ پیشانی سے اس میٹھے درد اور اُٹھتی ہوئی کسک کو انگیز کر جاتا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ قدرت نے سچے عاشق میں اظہارِ درد یا اظہارِ تمنا کی طاقت ودیعت ہی نہیں کی ہے۔ عاشق کا اپنے نفس کے خلاف یہ زبردست جہاد ہے کہ نالہ و فریاد کو زبان تک نہ آنے دے ؎

نالہ عجز نقصِ الفت ہے رنج و محنت کمال راحت ہے

اس لئے حیاتِ عاشق مانند شمع ہوئی جس کا کام ہے جلنا اور آنسو بہانا ؎

تصویر کی سی شمعیں خاموش جلتے ہیں ہم سوزِ دروں ہمارا آتا نہیں زباں تک

لیکن بہت سے شاعروں نے محبوب کو 'شمع محفل' کہہ کر پکارا ہے۔ اس بدعت کے علمبردار اکثر و بیشتر شاعر رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محبوب کے حسن میں اور شمع کے حسن میں مناسبت ہے لیکن مشابہت نہیں۔ مشابہت ہر اعتبار سے ہوتی ہے اور مناسبت کسی خاص اعتبار سے۔ شمع کا معیارِ حسن گردن زنی ہے۔ اس کے برخلاف محبوب گردن دیتا ہے۔ گردن لیتا ہے۔ اس کے حسن کا نکھار خونِ عشاق ہے۔ ایسی صورت میں شمع کو محبوب کہہ دینا سراسر ناانصافی ہوگی۔ شمع دراصل مونث نما عاشق ہے جس کا ہر ہر آنسو پیغامِ محبت ہوتا ہے۔ وہ تمام رات سرِ محفل قطع نظر کیف و سرور کے اپنے محبوب کی تسبیح کرتی ہے۔ ہر در رفو کے بعد ایک سفید دانہ سبحہ گراتی ہے۔ وہ سراپا عشق ہے۔ محبوب کے تبسم اور اُس کے غم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایسے شعرائے کرام کو میر صاحب نے نہایت سادے الفاظ میں درس دیا ہے ؎

ایسے ہنس مکھ کو شمع سے تشبیہ شمع مجلس کی رونی صورت ہے

میر صاحب کے کلام میں مناسب الفاظ کی بھرمار ہے۔ الفاظ کو منصب کے اعتبار سے جگہ دی ہے۔ خزینۂ مضامین خون چکاں لفظ ماتم کناں ہیں، دوسری طرف ہجویات میں رکاکت نوکِ زبان پر ہے۔ اس لئے انکا نام بلیغ ہے۔ چنانچہ بہت مشہور مثال ہے ؎

پیش کیا ہے بلکہ ان کے اشعار جذباتِ انسانی کے مرقع ہیں۔ ان میں بیمانہ احساسات کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے

گلی میں اس کی پھٹے کپڑوں پر مرے مت جا لباس فقر ہے واں فخر بادشاہوں کا

یہ شعر بلندی خیال کی ایک اچھی مثال ہے۔

ان کی سادگی باریکی کی بھی متحمل ہے۔ سطحی خیالات اور پیش پا افتادہ مضامین سے اجتناب کیا ہے۔ ان کے اشعار انسانی فطرت کے گہرے مطالعے اور کائنات کے وسیع مشاہدے کا نتیجہ ہیں۔ ان کے خیالات باریک ہیں لیکن طرز ادا میں الجھاؤ نہیں ہے

یہ عیش گاہ نہیں ہے یہاں رنگ اور کچھ ہے ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا

اس شعر میں خیال کی باریکی اچھی طرح واضح ہے۔

کہیں کہیں یہ باریکی مبالغہ کی حد کو پہنچتی ہے۔ لیکن مبالغہ شعر کے اثر کو فنا نہیں کرتا۔ اس سے سادگی میں اور اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ زود اثر تریاق اکثر شعرا کے یہاں سمِ قاتل بھی بن جاتا ہے۔ وہ مبالغہ میں شعر کے اثر اور اس کے حسن و قبح کو بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ مبالغہ کے استاد انیسؔ ہیں لیکن اس کی بنیاد دل کی مضبوطی میرؔ کے یہاں ہوئی ہے۔ انھوں نے بھی مبالغہ سے کام لیا ہے۔ لیکن ان کا مبالغہ سطحی نہیں ہے۔ اس میں جدّت ہے اور جدّت میں زور ہے۔ ان کا مبالغہ سادہ لیکن جدید ہوتا ہے۔ جس پر زور رنگینی جِلا دیتا ہے۔ وہ بات سے بات پیدا کر لیتے ہیں اور قادر الکلامی کے زور میں کہیں سے کہیں بہا لیجاتے ہیں۔ حسن و عشق کے تلخ لیکن سادے تجربات زور کی مٹھی کے زور سے حلق سے نیچے اتر جاتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں مبالغہ کی رنگ آمیزی کر کے کہہ جاتے ہیں۔ وارداتِ قلبیہ کے تمام تر مضامین اس حسن سے مرقع ہیں۔ وہ اپنے خزینۂ تخیل و تصور سے ہمارے تخیل و تصور کو مبالغہ کی رنگ آمیزی سے تحریک میں لاتے ہیں۔ ان کا شعر تیر کی طرح دل پر چبھ جاتا ہے۔ ہمارے جذبات ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں۔ آخر کیوں؟ یہ سب زورِ کلام کی کارفرمائیاں ہیں۔ وہ جس چیز کی منظر کشی کرتے ہیں اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ یہی ان کی شاعری کا معراج ہے۔ ماقبل اور مابعد کے شعرا اس خوبی سے محروم ہیں۔ یہ خوبی قدرت نے صرف میرؔ صاحب کو ودیعت کی تھی جس کے وہ علمبردار ہیں ہے

کام ہے اس کا خوں افشانی ہر دم تیری فرقت میں چشم کو میری آ کر دیکھ اب لوہو کا فوارہ ہے

کی بنیاد ہی ایسی ہی صنعت گری پر ڈالی۔ یہ وہی پرانا صاف شفاف چشمہ تھا جو دکن میں پھوٹا لیکن دہلی پر آکر گدلا ہوا، لکھنؤ میں پہونچ کر دوبارہ آب دی گئی اور کچھ اس طرح کہ محبوب کی سیاہ زلفوں کا پرتو، انگ کرتی کی جھلک، کنگھی چوٹی کی چمک، اور سُرمہ مسّی کی دمک بوقلموں موجوں میں نظر آنے لگی۔ چشمہ اب بھی بہتا ہے لیکن اس کی وہ شان و شوکت نہیں۔ بھولا بھٹکا راہی کبھی آکر وضو کر لیتا ہے۔ گو اس کی چنداں ضرورت باقی نہیں ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے میرؔ کے یہاں تشبیہات و استعارات اور مترنم ایہام کی کوئی کمی نہیں۔ ان کا کلام ان محاسن سے پُر ہے۔ لیکن قادر الکلام کی حیثیت سے اُن کو زبانِ شعر پر حاکمانہ قدرت حاصل ہے۔ وہ بہت سادہ شاعر ہیں۔ سادگی اُن کے کلام کا جوہر ہے۔ دقیق سے دقیق فلسفہ کو وہ سادہ الفاظ میں حل کر جاتے ہیں۔ ان کے اشعار لفظوں کا الٹ پھیر نہیں ہیں بلکہ وہ جو کچھ سمجھانا چاہتے ہیں آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ یہی کمالِ سادگی ہے۔ ان کا کلام تعقید سے پاک ہے۔ خیال میں لفظوں کی فراوانی کے ساتھ روانی ہے۔ اگر ان کے اشعار کی نثر بنائی جائے تو آسانی سے بن جائے گی ؎

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

ان کے کلام میں یہ صنعت کمال کی سند پاتی ہے۔ اس سے بیشتر اشعار کو 'سہل ممتنع' کہنا بیجا نہیں۔

میرؔ کی سادگی شرمندۂ وضع نہیں۔ اس میں تڑپ کا عنصر موجود ہے۔ خیال کی روانی میں وہ جذبات کی پامالی نہیں کرتے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں تڑپ کر کہتے ہیں۔ ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبالؒ کا یہ شعر ان کے حسب الحال ہے ؎

حق اگر سوزے ندارد حکمت است   شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

حقیقت یہ ہے کہ ان کا تخیل ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتا نظر آتا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر میں ؎

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا   دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

بسمل کی سی تڑپ موجود ہے۔

ان کی سادگی میں بلندی ہے۔ عام فہم اور روزمرہ کی گفتگو میں بلند خیالات کو پیش کیا ہے یہی استادی کا بیّن ثبوت ہے۔ بلندیِ خیال سے یہ مقصد ہرگز نہیں کہ کسی انوکھی یا عجوبہ روزگار چیز کو

'داغ ایں حسرت ام' کو اس طور پر باندھا ہے ؎

داغ ہوں رشک محبت سے کہ اتنا بے تاب — کس کی تسکیں کے لئے گھر سے تو باہر نکلا

'ایکہ' یا 'آنکہ' فارسی محاورات ہیں۔ میر صاحب نے بجنسہٖ نقل کر دیئے ہیں ؎

اے تو کہ یاں سے عاقبت کار جائیگا — غافل نہ رہ کہ قافلہ یک بار جائیگا

میر صاحب کی یہ زباندانی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ ان کی تشنگی فارسی محاورات اور تراکیب سے نہ بجھ سکی۔ ان کے شوق نے ان کو ایک نئی سمت بہا دیا ؎

رات محفل میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے — جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

اسی خیال کو انھوں نے فارسی میں ادا کیا ؎

بہ بزم عیش او استادہ ام خاموش از حیرت — بداں مانند کہ بر دیوار چسپانند تصویرے

اسی قسم کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں ؎

تری چال ٹیڑھی، تری بات انوکھی — تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

خرامت بطرزے، کلامت بطورے — ترا کم کسے میر فہمیدہ باشد

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر — مذہب عشق اختیار کیا

چہ نا عاقبت بیں کسے بود ظالم — نخست آنکہ عشق تو ورزیدہ باشد

جنس دل دونوں جہاں جس کی بہا تھی اس کا — اک نگہ مول ہوا تم نہ خریدار ہوئے

یک نگہ بیش بہائش نہ نہادم لیکن — خود پسنداں نہ نمودند خریداری دل

ان اشعار سے میر کی قادر الکلامی کا بھی سکہ دلوں پر بیٹھتا ہے۔

ابھی تک ہم نے میر کی شاعری کے مختلف محاسن پر نظر ڈالی۔ ان کے کلام کو مختلف میزانوں میں تولا اب صرف ایک میزان اور باقی ہے جس کی بابت علامہ طباطبائی رقمطراز ہیں۔

"چند لفظوں میں معنی کثیر کا ادا کر دینا ایجاز نہیں اعجاز سمجھئے، دانہ کی گرہ میں خرمن غنچہ کی مٹھی میں گلشن کا

اس شعر کو اگر نظرِ عمیق سے دیکھا جائے تو سادگی، مبالغہ، جدت اور زور سب اپنے اپنے وجود کا دیتے ہیں۔ دردِ فرقت میں کثرتِ گریہ کی منظر کشی ہے۔ اس کو انھوں نے مبالغہ کے رنگ میں پیش کیا ہے خونی اشکوں کی لڑی لہو کا فوارہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ مبالغہ ہے۔ لیکن جدت نے اس میں چار چاند لگا دیئے ہیں یعنی جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں بلا تکلف کہہ گئے ہیں۔ اس پر زورِ سبحان اللہ۔ غمِ فرقت او لال لال آنسوؤں کی بارش مصوری نہیں تو کیا ہے۔ گریہ و غم کی تصویریں آنکھوں تلے پھر جاتی ہیں۔

میر صاحب نے جگہ جگہ فارسی تراکیب کا استعمال کیا ہے۔ لیکن ان کی سادگی میں کبھی فرق نہ آیا شعر کی روانی اسی طرح موجزن رہی۔ اردو شاعری کا یہ دور جس میں میر اور اُن کے ہمعصر شعراء نے فلک پیمائیاں کیں۔ زبانِ اردو کے ارتقاء کا زمانہ ہے۔ دکن جس کی آغوش میں ریختہ کی بنیادیں پڑیں اس پر عمارت کی صحیح تعمیر اسی عہد میں ہوئی۔ ادب کو غیر مانوس الفاظ سے پاک کرنے کی کوشش کی گئی۔ غیر زبانوں کے غیر فصیح الفاظ کو یکسر خارج کر دیا گیا۔ اس کی جگہ فارسی کی دلنشین تراکیب اور محاورات نے لے لی۔ اول میر بعد کو سودا زبان کے مصلحِ اعظم ہیں۔ روزمرہ کی پابندی اور محاورات کا استعمال شعر کی جان ہیں۔ میر اس معیار میں پورے اُترے ہیں۔ لیکن ان کے عہد میں اُردو کا خزانہ بخوبی مالامال نہ تھا۔ الفاظ کی کمی تھی۔ شعر محاورات سے تشنہ تھے۔ روزمرہ کا چٹخارا ضرور تھا لیکن متعدد زبانوں کی گھلک نے اس کو بھی بے سروسامان گھسیٹا تھا۔ چنانچہ فارسی کی تقلید میں ایرانی محاورات کو اشعار میں جگہ دی گئی۔ میر صاحب پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ماحول کا احساس کیا اور اسی قالب میں ڈھل گئے۔ انھوں نے جگہ جگہ فارسی محاورات کو اشعار میں جگہ دی لیکن سادگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے۔ اشعار کی آن بان اسی طرح قائم رہتی ہے بلکہ یوں کہئے کہ فارسی محاورات کا برمحل ترجمہ شعر کی شان میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ "گل" یعنی شرمندہ شدن فارسی کا محاورہ ہے، میر صاحب نے اس کو یوں باندھا ہے۔

کھلنے میں ترے منہ کی کلی پھاڑے گریباں
آگے ترے رخسار کے گل برگ تر آوے

خوش نمی آید' مجھے بھلا نہیں لگتا۔ فارسی کا محاورہ ہے۔ میر صاحب نے اس کا بجنسہ ترجمہ کر دیا ہے ؎

ناکامیِ صد حسرت خوش لگتی نہیں ورنہ
اب جی سے گزر جانا کچھ کام نہیں رکھتا

'شابحال کسا نیکہ' کا اس طرح ترجمہ کیا ہے ؎

احوال خوش اُنھوں کا ہم بزم ہیں جو تیرے
افسوس ہے کہ ہم نے واں کا نہ بار پایا

اس کے علاوہ اور بھی اشعار ہیں ؎

کس گنہ کا ہے پس از مرگ یہ عذر جانسوز
پاؤں پر شمع کے پاتے ہیں سر پروانہ

فقیرانہ آئے صدا کر چلے میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ

ہماری تو گزری اسی طور عمر یہی نالہ کرنا یہی زاریاں

عشق کیا کیا ہمیں دکھاتا ہے آہ تم بھی تو اک نظر دیکھو

خاک میں مل کے میرؔ ہم سمجھے بے ادائی تھی آسماں کی ادا

برقع اُٹھتے ہی چاند سا نکلا داغ ہوں اس کی بے حجابی سے

رکا کلام بھی معائب سے مبرّا نہیں۔ موتیوں کے انبار میں کہیں کہیں خزف ریزے بھی نظر آتے ہیں۔ رکاکت
رابتذال کے مضامین نظر تحقیق کا راستہ روکتے ہیں۔ روزمرہ کی پابندی، اور صحتِ الفاظ، تقطیع کی پروا
ں کرتی۔ چلے دل سے پھول سے جھڑتے خلاف متانت الفاظ کلام کا بدنما داغ بن جاتے ہیں۔ لیکن ان سے
کی استادی میں فرق نہیں آتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہی معائب وجہ حسن اور سببِ شہرت ہیں۔

کسی کا کلام سراپا بے عیب نہیں ہوتا۔ یہ اصول فطرت کے منافی ہے۔ فطرت نے 'خیر' کے ساتھ
' پیدا کیا ہے۔ اگر 'شر' نہ ہو تو 'خیر' کو پرکھنے کا کوئی امتیازی نشان نہیں۔ حسن بغیر عیب کے مکمل
ا عیب کی روشنی میں حسن کو پرکھا جاتا ہے۔ کائنات اسی اصول کی تابع فرمان ہے۔ لالہ کی خوبصورتی
سبب اس کا کالا داغ ہے جس کی ضیا پاشیاں شاعروں کے تھکے دلوں کو سکون و نشاط بخشتی
۔ ماہتاب صحیح معنی میں ماہتاب نہ ہوتا۔ اگر اس کے چہرہ پر کالی جھائیاں نہ ہوتیں۔ دن کے امتیاز کیلئے

سما جاتا تو دیکھئے' ذرا سی بات کو پیرائے بدل بدل کر کہنا اطناب نہیں تو کیا؟ غرض جن سے سات طرح کے رنگ پیدا ہوتے ہیں اور شعاع ایک ہی ہے۔" ایجاز ہو خواہ اطناب، اگر جوشِ طبع سے پیدا ہو تو وہ آبِ زلال کی نہر ہے۔ اور یہ سمندر کی لہر، تکلف و آورد کو دخل دیا اور ایجاز مخل و اطناب مخل پیدا ہوا۔"

چنانچہ میر صاحب اس صنعت میں بہت نمایاں ہیں۔ ان کا کلام اختصار کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دانہ کی گرہ میں خرمن اور غنچہ کی مٹھی میں گلشن کو سمایا ہے ؎

نہ شرمندہ کر اپنے منہ سے مجھے　　کہا میں نے کب یہ کہ تو ماہ ہے

شاعر نے کہیں اپنے محبوب سے کہہ دیا کہ تو 'ماہ' ہے۔ یعنی تیرا حسن ماہتاب کی طرح ہے۔ لیکن محبوب چیں بر جبیں ہوگیا۔ اس لئے شاعر سے کہا کہ اپنے منھ سے شرمندہ نہ کر۔ اس پر شاعر نے معذرت چاہی اور کہا کہ میں نے تجھے ماہ کب کہا تھا۔ حالانکہ در پردہ وہ اس کو حسین ہی ثابت کرنا چاہتا ہے۔ بسا اوقات جوشِ طبع میں میر صاحب نے پیرائے بدل بدل کر ایک ہی خیال کو باندھا ہے ؎

خدا جانے ہمیں اس بے خودی نے کس طرف پھینکا
کہ مدت ہوگئی ہم کھینچتے ہیں انتظار اپنا

اس کو دوسری جگہ بدل کر یوں کہا ہے ؎

بیخودی لے گئی کہاں ہم کو　　دیر سے انتظار ہے اپنا

اس شعر میں ایک نکتہ اور قابلِ غور ہے۔ بہ نسبت پہلے شعر کے اس میں اختصار سے کام لیا ہے اس کی وجہ سے شعر کا اثر دوچند ہوگیا ہے۔ کیونکہ جوشِ طبیعت سے کام لیا گیا تھا۔ اس لئے آبِ زلال کی نہر کہنا بجا نہیں۔ ان کا کلام قریب قریب سب تکلف اور آورد سے مبرّا ہے۔ چنانچہ ایجاز مخل اور اطناب مخل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میر صاحب کے اختصار کلام کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان کا بہت مشہور قطعہ ہے ؎

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا　　یکسر وہ استخوانِ شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر　　میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

اسی مضمون کو نظیر اکبرآبادی نے نو اشعار میں باندھا ہے۔ قطعہ کا آخری شعر ہے ؎

ایسی بیدردی سے ہم پر پاؤں مت رکھ اے نظیر　　او میاں! ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

سونگھیں، اس کے برخلاف ہاتھ سے چھونے کی زحمت گوارہ نہ کی جائے۔

ان تمام ناقدانہ کاوشوں کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ میر احسان اللہ درویش کی پیشگوئی میں پورے اترتے ہیں "این بچہ ہنوز سوزن بال است۔ اما چنیں معلوم میشود کہ اگر بخوبی پر برآورد بیک پرواز آن طرف آسمان فواہد رفت" اسی طرح خواجہ عندلیب "اے میر تو میر مجلس خواہی شد" کی زبانی میر مجلس ثابت ہوتے ہیں۔

انہوں نے خود بھی اپنے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ لیکن اس کو بے جا مدح سرائی اور خودستائی سے تعبیر کر لینا قرین قیاس نہیں۔ انہوں نے جو کچھ بھی فرمایا ہے مستند ہے ؎

سارے عالم پہ ہوں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

کیا مابعد کے شعراء ان کے سرچشمۂ فیض سے فیضیاب نہیں ہیں؟

بلبل غزل سرائی آگے ہمارے مت کر
سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا

یہ بغیر کسی شک و شبہ کے کہا جا سکتا ہے کہ وہ گلستانِ ادب کے اپنے عہد میں بلبل سے بھی زیادہ شیریں بیان رہے ہیں اور اس کے بعد بھی ان کا تتبع کیا گیا۔ چنانچہ ان کا اپنے متعلق ایسی رائے ظاہر کرنا قطعاً درست ہے۔

اب اگر میں ناسخ کی زبانی یہ کہوں ؎

"آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں"

شاید بے جا نہ ہوگا۔

لطیف حسین

رات اور رات کے امتیاز کے لئے دن کا ہونا ضروری ہے۔ حق کے لئے دروغ اور زہد کے لئے ریا ایک لازمی شے ہے۔ اگر زنگار نہ ہوتا تو آئینۂ حیران کی کوئی قدر نہ ہوتی۔ میر کا کلام ایک صاف شفاف آئینہ ہے جس میں زنگار کی پالش موجب عکس ہے۔ کائنات کی چلتی پھرتی تصویریں، یاس و الم کے تیرہ بادل، شرر آلود آہ پاشیاں، اور زلفِ دوتا کی تاریکی اسی زنگار کی آڑ سے جھلک مارتی ہے یہی وہ معائب ہیں جن کی مدد سے شعر کے محاسن پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اگر میر اس حسن شعر سے محروم رہتے تو وہ یقیناً خدائے سخن کہلانے کے مستحق نہ ہوتے۔ ان کی شہرت کا سبب یہی گلے سڑے دانے ہیں جو خوشۂ انگور میں کہیں کہیں نظر پڑ جاتے ہیں۔ بے عیب ذات صرف اس وحدہٗ لاشریک کی ہے۔ اس کا اطلاق نعوذ باللہ من ذالک میر پر نہیں ہو سکتا۔ اور میر ہی پر کیا منحصر ہے، دُنیا کے کسی فرد واحد پر نہیں ہو سکتا کیونکہ حق کے ساتھ باطل کا ہونا لازمی امر ہے۔ میر صاحب نے خود بھی اشارہ کیا ہے۔ ع

کفر کچھ چاہئے اسلام کی رونق کے لئے

چنانچہ اسلام کی رونق کا سبب کفر ہے۔ اگر کفر نہ ہو تو دنیا سراپا زوال کا نمونہ بن جائے۔ اور اسلام کا دُنیا میں بھیجنے کا مقصد اعلیٰ حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔ یعنی حق باطل کا رہینِ منت ہے۔ باطل کا وجود حق کا وجود ہے۔ اگر باطل نہ ہو تو حق بھی نہ ہو۔ اس لئے ہر شاعر کے یہاں پُر آب موتیوں میں بے آب موتیوں کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ البتہ یہ ملحوظِ خاطر رہے کہ یاوہ گوئی کی کثرت حسن و قبح پر پانی نہ پھیر دے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میزانِ حق میں بُرائیوں کا پلہ اچھائیوں کے مقابلہ میں نیچا ہو جائے۔ اس کا اس طرح نیچا دیکھنا درست نہیں۔ اس کی یہ خاکساری اچھائیوں کے لئے زہرِ ہلاہل ہے۔ بلکہ کمتر بُرائی اور زیادہ تر اچھائی کا اصول پیشِ نظر رہے۔ لیکن اگر معائب محاسن سے بازی لے گئے تو شاعر کی حیات شہرت تمام تر عمدگی کے باوجود بھی ختم ہو جائے گی۔ نظیر اکبر آبادی کی مثال اس کا بیّن ثبوت ہے۔ لیکن اگر محاسن معائب کے مقابلہ میں زیادہ ہیں تو تمامتر نقائص کے ہوتے ہوئے بھی اس کی شہرت کے پائے استقلال کو جنبش نہیں ہو سکتی۔ میر ا ر تنقیدی میزان میں پورے اترے ہیں۔ زاہدوں کے ہجوم پر حیب میں چند شرابیوں کی یاوہ گوئی پیش نہیں جاتی۔ ان کے ایک نہیں، دو نہیں، بلکہ پورے چھ گلدستوں میں نوکِ خار کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ ا خاروں سے الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں، گو یہ دامن خود بھی پکڑ لیتے ہیں۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ دامن سمیٹ کر چلا جائے۔ وقتاً فوقتاً چشم پوشی سے کام لیا جائے اور پھولوں کو ادب کے سچے پرستار کی حیثیت سے

ہین منت ہے۔ یہ کمال جو یورپ کو حاصل ہے اکتسابی نہیں بلکہ وہبی ہے۔ باشندگانِ مغرب کو یہ
بارک دن مسلمانوں کی بدولت دیکھنا نصیب ہوا۔ جو اہلِ مغرب اس راز سے آشنا ہیں اُن
ں سے اکثر اس کے اعتراف سے گریز کرتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو مسلمانوں کے مغربی تہذیب پر
سانات کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن انتہائی بخل کے ساتھ۔ بہت کم ایسے اشخاص گزرے ہیں جنھوں نے
ن احسانات کا کھلے الفاظ میں اعتراف کیا۔ اور چونکہ تاریخ نی زمانہ ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے
ں لئے وہ واقعات کو جس طرح چاہتے ہیں پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقت کا چہرہ تعصب
ے پردہ میں چھپا ہوا ہے۔ اور بہت کم اصحاب اس کے دیدار سے محظوظ ہو سکے ہیں۔ اس مضمون کی
بحث کا مقصد اسی حقیقت کو بے نقاب کرنا ہے۔

مغرب کو جو فوائد مسلمانوں کی بدولت حاصل ہوئے ان سے واقف ہونے کے لئے ضروری ہے
وہاں کے مسلمانوں سے روشناس ہونے سے قبل کے دور کی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے۔
اس کے بعد مسلمانوں سے روابط قائم ہونے کے بعد کی حالت کا جائزہ لیا جائے۔ ان دونوں کا
ق ہر صاحب بصیرت پر واضح کر دے گا کہ نی الحقیقت یورپ مسلمانوں کا شرمندۂ احسان ہے اور
وہ شمع علم انھیں کی روشنی کی ہوئی ہے۔ اور یہ کہ اگر مسلمان یورپ میں داخل نہ ہوتے تو اسے
ترقی کبھی نصیب نہ ہوتی۔

آفتاب اسلام کے سرزمینِ یورپ میں جلوہ افگن ہونے سے قبل وہاں کی حالت انتہائی
تھی۔ دیارِ مغرب کے رہنے والے تہذیب و تمدن سے قطعاً ناآشنا تھے۔ انھیں سوائے
یں لڑنے جھگڑنے اور عیش و عشرت میں زندگی بسر کرنے کے اور کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ نفس پرستی
ن و حسد نے ان کی ساری صلاحیتوں کو فنا کر دیا تھا۔ ان کی دولت اور لیاقت انھیں مذموم
ے کے حصول میں صرف ہوتی تھی۔ ایک کا اقتدار دوسرے کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اگر کسی کا حقیقی
بھی اس سے زیادہ بلند مرتبہ پر پہنچ جاتا تو وہ اپنی ساری قوت اس کی عزت خاک میں ملا دینے
رف کر دیتا۔ تحصیلِ علم کو تضیع اوقات کے مرادف خیال کیا جاتا تھا۔ جوا اور شراب ان کے
مشاغل تھے۔ زنا کا ارتکاب عام طور پر ہوتا تھا۔ چنانچہ "حرامزادوں" "جنگی بچوں" اور
ئی شدہ ماں کا اس زمانہ میں عام رواج تھا۔ کوئی مرد ایسا نہ تھا جو اپنی بیوی پر قناعت

یورپ کے ارتقاء میں مسلمانوں کا حصّہ

از صاحبزادہ ممتاز علی خاں صاحب بی۔ اے (علیگ)

یورپ آج علوم و فنون کا گہوارہ بنا ہوا ہے۔ تشنہ کامانِ علم دنیا کے ہر گوشہ سے اپنے علم کی پیاس بجھانے کے واسطے وہاں پہنچتے ہیں۔ کیونکہ علم و فن کے کسی شعبہ میں یورپ سے رجوع کئے بغیر مہارت حاصل کرنا تقریباً محال ہے۔ اور اس کلیہ کا اطلاق صرف مغربی علوم ہی پر نہیں ہوتا بلکہ مشرقی علوم میں سلاً بہم پہنچانے کے لئے بھی وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ ضروری ہے۔ عربی، فارسی اور دوسری مشرقی زبانوں کے جو نوادر یورپ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں ان کا عشر عشیر بھی ایشیائی ممالک میں موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کے سند یافتہ حضرات کی قدر مشرق کے تعلیم یافتہ اصحاب سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر جوہر اُس وقت تک جِلا نہیں پاسکتا جب تک کہ یورپ کی کسوٹی پر کس نہ جائے۔

لیکن یورپ کو یہ بلند مرتبہ یوں ہی حاصل نہیں ہوگیا۔ وہاں کے علما اور علم دوست حضرات بڑی جد و جہد اور دولت کو پانی کی طرح بہانے کے بعد خزانۂ علم میں نادر الوجود و در بیش بہا جواہرات کا اضافہ کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ ان کی کاوشیں لائق ستائش ہیں۔ وہ اپنی فضیلت پر جتنا بھی ناز کریں کم ہے۔ وہاں کے سائنس دانوں نے حیرت انگیز انکشافات کئے ہیں۔ اِن کی بدولت ہم کو وہ چیزیں میسّر آئیں جن کے متعلق ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اور بعض ایسے مسائل ان کے زیر غور ہیں کہ ان کو دریافت کرنے اور انھیں عالمِ وجود میں لانے میں وہ لوگ کامیاب ہوگئے تو انسان قدرت کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا۔ مثلاً موت پر اختیار، پیدائشِ انسان مصنوعی طریقہ سے۔ مہلک اور ناقابلِ علاج امراض کا تدارک وغیرہ۔

لیکن اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ ذرّاتِ مغرب کی یہ چمک آفتاب مشرق کی

سے آلودہ کیا گیا تھا۔ غرض کہ یہی خیالات ہر شخص پر غالب تھے "۔

ایم گوزٹ اپنی کتاب دی ہسٹری آف سویلزیشن میں ایک جگہ رقم طراز ہیں :۔

"فی الحقیقت اگر اس دور کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ کردار سے عاری ہے۔ اس زمانہ میں اضطراب و بے چینی کی زیادتی رہی جس کی وجوہات سمجھنے سے ہم قاصر ہیں۔ اس زمانہ میں حرکت کا وجود تو پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ حرکت کسی نظام کے تحت نہیں تھی۔ تگ و دو بھی تھی لیکن لاحاصل۔ بادشاہت، امارت، مذہبیت، تجارت، مختصر یہ کہ زندگی کے سارے عناصر ایک ہی حلقہ میں گردش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ سب کے سب یکساں طور پر ترقی کی اہلیت سے مبرا ہیں۔ وہ ہر قسم کی جد و جہد کرتے ہیں۔ لیکن کامیاب نہیں ہوتے۔ وہ حکومتیں قائم کرنے اور عوام کو آزاد کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ وہ مذہبی اصلاحات نافذ کرنے کے بھی خواہش مند ہیں۔ لیکن حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ اور کوئی کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ اگر کبھی بھی انسانیت غیر محرک تقدیر کے رحم و کرم پر رہی ہے۔ اگر کبھی انسان کو اس کی جانفشانیوں کا ثمرہ میسر نہیں آیا ہے تو یہ تیرھویں، اور پندرھویں صدی کے درمیانی زمانہ میں ہوا۔"

یہ کیفیت تھی یورپ والوں کی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں صدی میں جب کہ وہ اپنی حالت لو بہت کچھ سدھار چکے تھے۔ اس سے قبل تو ان کی اس سے کہیں زیادہ ابتر حالت تھی۔ گبن کے اس قول سے کہ :۔

"اگر نویں اور دسویں صدیاں تاریکی کا زمانہ تھیں تو تیرھویں اور چودھویں صدیاں لغویات اور بعید از عقل کہانیوں کا زمانہ تھیں۔" ۵؎

اف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ حروب صلیبیہ کے وقوع پذیر ہونے سے بہت پہلے سے یورپ پر الت اور بربریت کا تسلط تھا۔

ان حالات میں خورشیدِ اسلام کی کرنیں اُفقِ اسپین پر نمودار ہوئیں۔ مسلمانوں کا اسپین ، داخلہ اہلِ اسپین کے لئے خصوصاً اور یورپ کے دوسرے ممالک کے لئے عموماً نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ا۔ مسلمان ابرِ کرم بن کر سرزمینِ مغرب پر برسے اور اس شور ونا کارہ زمین کو گلستاں بنا دیا۔ ان چشمۂ علم سے سارا برِ اعظم فیضیاب ہوا

۵؎ محاربات صلیبی۔ ترجمۂ معشوق حسین خانصاحب ۔ صفحہ ۱۶۶

کرتا ہو۔ علاوہ بیوی کے اوروں سے بھی ازدواجانہ مراسم قائم کئے جاتے تھے۔ اور اس قبیح رسم کو نہ صرف یہ کہ معیوب خیال نہ کیا جاتا تھا بلکہ یہ چیز اس زمانہ کے فیشن میں داخل تھی اور جو اس سے پرہیز کرتا اس کے لئے اس دور کی سوسائٹی میں کوئی جگہ نہ تھی۔ اگر ان ذلیل مقاصد کے حصول میں ان کے قریبی عزیز بھی حائل ہوتے تو انھیں بلا تکلف قتل کر دیا جاتا۔ یہانتک کہ بیٹا باپ کو اور باپ بیٹے کو بلا خوف وخطر تہہ تیغ کر دیتا۔

یہ اخلاقی پستی عوام تک ہی محدود نہ تھی بلکہ پادریوں تک کے دامن گناہوں میں آلودہ تھے۔ اور اگر سچ پوچھئے تو پادریوں کی حالت سب سے زیادہ نازک تھی۔ ذاتی اغراض کی خاطر انھوں نے مذہب تک کو قربان کر دیا۔ بلکہ اسے ان کے حصول کا وسیلہ بنایا۔ علوم وفنون کی کتابوں کو کلیساؤں میں مقفل رکھتے تھے۔ اور ان کا پڑھنا عوام کے لئے باعثِ گناہ قرار دے دیا تھا۔ اور یہ سب کچھ اس لئے تھا۔ کہ لوگ حقائق سے بے خبر رہیں اور ان کے کرسے آگاہ نہ ہونے پائیں۔ کیونکہ انھیں یقین تھا کہ اگر ایسا ہوا تو ان کا اقتدار ختم ہو جائے گا اور ان کی لاتعداد آمدنی کی راہیں مسدود ہو جائینگی کیونکہ یہ عمارت جن بنیادوں پر قائم کی گئی تھی وہ انتہائی کمزور تھیں۔ یہ تھی کیفیت ان لوگوں کی جو آج مذہب کے علمبردار ہیں۔ اور سب سے زیادہ متمدن خیال کئے جاتے ہیں۔

ذیل میں اس زمانہ کے متعلق یورپین مورخین کی آرا پیش کیجاتی ہیں تاکہ ناظرین پر واضح ہو جائے کہ جو کچھ اوپر تحریر کیا گیا ہے وہ تعصب کی بنا پر نہیں کیا گیا بلکہ وہ عین حقیقت ہے۔ لیجس ٹریکٹ سوسائٹی منعقدہ ۱۷۹۹ء) کی جانب سے حروب صلیبیہ پر ایک کتاب تصنیف کی گئی۔ اس کا ترجمہ محمد معشوق حسین صاحب بی۔ اے نے کیا۔ ترجمہ کے ص ۳۲۲ پر یہ عبارت درج ہے:۔

> "جس زمانہ میں حروب صلیبیہ کی ابتدا ہوئی بہت سے اور ایسے اسباب پیدا ہو گئے جنھوں نے ان مہمات کے برپا ہونے میں ایک حد تک حصہ لیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ باہمی جذبات کی کشاکش انتہائی درجہ پر پہنچ گئی تھی جن کے محرک اعلیٰ مذہبی خیالات تھے۔ اور گو وہ کتنے ہی فاسد اور باطل کیوں نہ ہوں لیکن ہر شخص ان کے نشہ میں سرشار تھا۔ علوم وفنون کی حالت یہ تھی کہ انھوں نے راہبوں کے تاریک حجروں سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ محض پادری لوگوں کے معلم تھے اور بحیثیت اپنی شان آسمانی کے خلعت سے معرا ہو کر جھوٹے اور نمائشی زیورات سے آراستہ نظر آتی تھی۔ اس کا مقدس نام نہایت درجہ باطل خیالات اور فحش ترین جرائم

یورپ کے باشندے دنیا ومافیہا سے بے خبر جہالت وظلمت کے راستہ پر آنکھیں بند کئے چلے جا رہے تھے کہ یکایک ان کی قسمت کا ستارہ برجِ زوال سے نکل کر برجِ سعادت میں جلوہ گر ہوا۔ ان کی سوئی ہوئی تقدیر جاگ اٹھی یعنی حروب صلیبیہ وقوع پذیر ہوئیں۔ یہ لڑائیاں بیت المقدس کے حصول کے لئے عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہوئی تھیں۔ ان کے بانی عیسائی تھے اور ان کا سلسلہ دو سو برس تک رہا (۱۰۹۶ء لغایت ۱۲۹۱ء) بظاہر ان جنگوں سے مشرق اور مغرب، اور خاصکر مغرب کو بے انتہا جانی ومالی نقصان ہوا۔ لاکھوں نفوس جنگ کے دیوتا کی بھینٹ چڑھے اور ہزاروں راستے کی تکالیف، بھوک اور بیماریوں کی نذر ہوئے۔ بڑے بڑے جاگیردار غریبوں کی صف میں آکھڑے ہوئے اور جو غریب تھے وہ نانِ شبینہ تک کو محتاج ہو گئے۔ لیکن بالواسطہ طور پر حروب صلیبیہ اہلِ مغرب کے حق میں رحمت ثابت ہوئیں۔ انھوں نے ان کی کایا پلٹ دی۔ وہی افراد جو بہائم سے بدتر تھے اور جن کی صلاحیتوں کو جہالت اور معصیت نے بالکل فنا کر دیا تھا۔ ان کی بدولت مہذب بن گئے۔ علوم و فنون کا چرچا ہوا۔ اجزائے سوسائٹی جو منتشر تھے ایک رشتہ میں منسلک ہو گئے اور اس اتحاد کی وجہ سے زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ترقی ہوئی۔ مذہبی پیشواؤں کا اثر زائل ہو گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افراد نے اپنی قدر پہچانی اور ہر شخص کے دل میں ترقی کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ وہ بھاری رقمیں جو نجات حاصل کرنے کی نیت سے پادریوں کی نذر کی جاتی تھیں مفید کاموں میں لگائی جانے لگیں۔ باقاعدہ حکومتیں قائم ہوئیں اور وہ اشخاص جو آزادانہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے اور جو احکامات کی پابندی کو اپنے لئے باعثِ ہتک خیال کرتے تھے قوانین کے پابند ہو گئے اور جرائم سے اجتناب کرنے لگے۔

مختصر یہ کہ یورپ کا تعطل اور اضمحلال دُور ہوا اور اس کی جگہ حرارت اور نشو ونما نے لے لی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حروب صلیبیہ بنیاد تھی جس پر زمانہ مابعد میں موجودہ تہذیب وتمدن کا قصر عالی شان تعمیر ہوا۔

"جہاں ہم اس لاتعداد جانی نقصان پر جو حروب صلیبیہ کی وجہ سے ہوا، اظہار افسوس کرنے پر مجبور ہیں وہاں ہم اس اعتراف پر بھی مجبور ہیں کہ وہ بالواسطہ طور پر موجودہ تہذیب کے لئے انتہائی منفعت بخش ثابت ہوئیں۔ انکی بدولت انسانیت کو بعض وہ فوائد حاصل ہوئے جو بغیر ان کے شاید ہی میسر آتے۔" [۵]

---

[۵] چیمبرس انسائیکلوپیڈیا۔ صفحہ ۵۹۵

"اسپین کی اسلامی درسگاہیں ساری دنیا میں مشہور تھیں۔ قرطبہ کی جامعہ سے صرف قاہرہ کی جامعہ بہتر تھی۔ اوّل الذکر ادارہ میں بارہ ہزار طالبِ علم تعلیم پاتے تھے۔ بہت سے عیسائی ان اداروں سے مستفیض ہوئے۔ وہ لوگ طب، جغرافیہ اور ریاضی خاص طور پر پڑھتے تھے۔" ؎۱

اگر مسلمانوں سے یورپ والوں کے روابط قائم نہ ہوتے تو وہ لوگ ترقی کا خواب بھی نہ دیکھ پاتے اور مادۂ تفکر و تدبر جو آج انھیں دوسری اقوام سے ممتاز کئے ہوئے ہے ان میں پیدا نہ ہوتا۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ مسلمانوں کے اسپین میں داخل ہونے کے کافی بعد تک دوسرے ممالک کے رہنے والے پستی و ذلت کی زندگی گزارتے رہے اور انھوں نے من حیث القوم کوئی ترقی نہ کی۔ مسلمانوں کے قائم کئے ہوئے علمی اداروں سے بیرونِ اسپین کے بہت کم اشخاص متمتع ہوئے۔

یورپ کے دوسرے ممالک کے رہنے والوں نے بھی اُس وقت ترقی کی جب کہ حروبِ صلیبیہ کے ذریعہ وہ مسلمانوں سے روشناس ہوئے۔ اس سے پیشتر انھیں لکھنے پڑھنے اور اپنی حالت کو سدھارنے کا خیال تک نہ آیا۔ میرے اس بیان کی تائید لین پول کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتی ہے:۔

"صدیوں تک اسپین تہذیب، علوم و فنون اور ہر قسم کی نفاست کا مرکز بنا رہا۔ یورپ کے کسی دوسرے ملک کو اُس زمانہ تک متمدن اسلامی سلطنت کی ہمسری نصیب نہ ہوئی۔ فرڈی نینڈ اور ازبیلا کے مختصر عہد اور چارلس پنجم کے دورِ حکومت کی ترقی کو استقامت میسر نہ آئی۔ مسلمانوں کو اسپین سے جلاوطن کر دیا گیا۔ کچھ مدت تک عیسائی اسپین چاند کی طرح چمکا۔ لیکن اس کی یہ روشنی مستعار تھی۔ اس کے بعد وہ گہن آلود ہو گیا۔ اور اُس وقت سے اسپین پر تاریکی مسلط ہے۔"

مزید تائید کے لئے ایک اور کتاب کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

"آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مسلمان بربریت سے کوسوں دُور تھے۔ بہت سی باتوں میں وہ اپنے ہمسایہ عیسائیوں سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ وہ شریف اور فنونِ لطیفہ کے ماہر تھے۔ اور جب کہ اسپین والوں نے انھیں اپنے وطن سے تیرھویں صدی میں نکال دیا (سوائے غرناطہ کے جہاں وہ ۱۴۹۲ء تک حکمراں رہے) تو انھیں بجائے فائدہ کے نقصان ہوا۔"

؎۱ دی ٹریژری آف نالج۔ صفحہ ۸

؎۲ دی ٹریژری آف نالج۔ صفحہ ۸۴

بابرا اور تہذیب نا آشنا تھے اور ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر انھیں اپنے اس مقصد میں کامیابی ہوگئی دُنیا کی ساری قومیں ان کے حضور میں خراجِ تحسین پیش کریں گی اور ان کی قیادت تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گی۔

اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے ہر امکانی کوشش کی۔ معمولی باتوں کو بڑا کر کے پیش کیا اور جہاں مسلمانوں کی معمولی لغزشوں تک کا فقدان پایا وہاں بے بنیاد الزامات ان پر عائد کئے۔ چونکہ ان کے پاس دولت تھی تعلیم کے سارے شعبے ان کے قبضہ میں تھے اور مسلمان اپنے اسلاف کے کارناموں سے بے خبر تھے اس لئے انھیں اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ غیر تو غیر خود مسلمانوں کو یقین ہوگیا کہ گزشتہ اَدوار کے مسلمان ایسے ہی تھے جیسا کہ اہلِ مغرب انھیں بتاتے ہیں۔ چنانچہ انھیں انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ اور ان کے بے مثل کارنامے ع

نقشِ زنگار طاقِ نسیاں ہوگئے

لیکن ایک وقت آیا کہ ان الزامات کی جو مسلمانوں پر عائد کئے گئے تھے تردید ہونے لگی۔ اور لطف یہ کہ یہ تردید خود اہلِ مغرب نے کی۔ اُنھوں نے تسلیم کرلیا کہ یورپ کی ترقی مسلمانوں کی مرہونِ منت ہے۔ اگر مسلمانوں کا کرم ان کے شاملِ حال نہ ہوتا تو انھیں یہ مبارک دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ جو فوائد یورپ والوں کو مسلمانوں کی بدولت نصیب ہوئے ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس مضمون میں ان سب کو بیان کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے صرف چند اقتباسات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اور یہ سارے اقتباسات انگریزوں کی تصانیف سے لئے گئے ہیں۔

"محاربات صلیبی کی بدولت تجارت کو انتہائی فروغ ہوا۔ فی الحقیقت جنوا کی ساری ترقی رہینِ منت تھی ان نئے بازاروں کی جو شام اور لبنان میں قائم ہوئے۔ سیاحوں نے بھی مشرقی ممالک میں جانا اور وہاں کی مصنوعات لانی شروع کیں۔ مثلاً سلک، مصالحے اور بخارا کے شال، مشرقی زبانوں کا مطالعہ کیا گیا اور مشرقی عادات اور فیشن یورپ میں رائج ہوئے۔ شکر، ملکا، لیمو، خربزہ، روئی، ململ، اطلس، بارود اور آئینہ، یہ سب چیزیں ہماری تہذیب کو محاربات صلیبی کی وجہ سے میسر آئیں۔ بہت سے عربی الفاظ ہماری زبان میں داخل ہوئے۔ مثلاً ایک لفظ جو آجکل کثرت سے اخبارات میں استعمال ہوتا ہے یعنی 'ٹیرف' (یہ لفظ تعرف سے ماخوذ ہے)"[۵۱]

---

[۵۱] دی ٹریژری آف نالج۔ صفحہ ۵۰۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان جنگوں نے کس طور پر یورپ والوں کو فائدہ پہنچایا؟ جنگ کا خاصہ تو نظام کو درہم برہم کرنا ہے نہ کہ تعمیری کام انجام دینا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حروب صلیبیہ بذاتِ خود یورپ کی ترقی کا سبب نہیں بنیں۔ بلکہ ان کی وساطت سے باشندگانِ مغرب کو مسلمانوں سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ اُس وقت مسلمان دنیا میں سب سے زیادہ متمدن اور تعلیم یافتہ تھے۔ ان کی ذہانت و ذکاوت کا ڈنکا چار دانگِ عالم میں بج رہا تھا۔ اور ساری اقوام ان کے زیر سایہ پروان چڑھ رہی تھیں۔ یورپ والوں نے جب انھیں دیکھا تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ انھوں نے اپنے اور مسلمانوں کے درمیان زمین آسمان کا فرق پایا۔ رزم اور بزم دونوں میں مسلمان انھیں اپنے سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع نظر آئے۔ انھوں نے ان کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ مسلمانوں کی فراخ دلی ملاحظہ ہو انھوں نے اس قوم کو جو ان پر حملہ آور ہوئی تھی، جس نے انتہائی ظالمانہ سلوک کیا تھا، اُسے بلا تکلف تعلیم دی۔ لائق اور شفیق استاد کی عنایت سے شاگرد نے بہت جلد علوم و فنون پر عبور حاصل کر لیا۔ لیکن اس کا ظرف اتھلا تھا، علوم پر قدرت حاصل ہوتے ہی چھلک پڑا۔ اور اس نے اُستاد کی ہمسری کا دعویٰ کیا۔ لاپرواہی، تساہل اور سب سے زیادہ کمزوری ایمان نے استاد کو پہلے ہی سے ناکارہ بنا رکھا تھا۔ شاگرد کے میدان میں آتے ہی اسے پسپا ہونا پڑا۔ موقع کو غنیمت خیال کرتے ہی شاگرد نے استاد کی جگہ سنبھال لی۔ لیکن اس کی احسان فراموشی ملاحظہ ہو کہ اُستاد کی مہربانیوں کا اعتراف کرنے اور اپنی قابلیت کو اس کی رہینِ منّت قرار دینے کی بجائے شاگرد نے اُستاد کو نا اہل بتایا اور بہ بانگِ دُہل کہہ دیا کہ جو کچھ اسے حاصل ہوا ہے وہ اس کی اپنی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ اور اس کے لئے وہ کسی کا احسان مند نہیں۔

عام طور سے، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، اہلِ مغرب اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں اور مغرب کی ترقی کو خود اہلِ مغرب کی کوششوں کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ ان کا یہ انکار کسی غلط فہمی یا عدم واقفیت کی وجہ سے نہیں بلکہ تعصب کی بنا پر ہے۔ کیونکہ عیسائیوں نے ہمیشہ مسلمانوں کے مقابلہ میں شکست کھائی اور سپاہ کی کثرت اور اسلحہ کی زیادتی کے باوجود انھیں سوائے دو ایک دفعہ کے کبھی فتح نصیب نہ ہوئی اس لئے وہ مسلمانوں کو انتہائی نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور انھیں بُرا بھلا کہہ کر دل کی بھڑاس نکالتے رہتے ہیں، ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ دنیا والوں پر ظاہر ہو جائے کہ مسلمان بے انتہا ظالم و

یہاں یہ کہا گیا ہے کہ چودھویں اور پندرھویں صدی کی محیر العقول معلومات جو یورپ کی تہذیب کی ترقی کا باعث ہوئیں۔ مثلاً قطب نما، چھاپا، بارود — کا اکثر حصہ اہلِ مشرق کے علم میں تھا اور یہ کہ اغلباً صلیبی سپاہیوں نے ان اشیاء کو وہاں سے حاصل کیا۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن ان میں سے بعض بیانات قابلِ تردید ہیں۔ لیکن ایک بات جس کی تردید ممکن نہیں یہ ہے کہ محاربات صلیبی ذہن انسانی اور معاشرت پر اثر انداز ہوئیں۔ انھوں نے مغربی معاشرت کو جو ایک انتہائی نازک حالت میں تھی ایک نئے اور پہلے سے کہیں زیادہ فراخ راستے پر لا کھڑا کیا۔ انھوں نے مغربی تہذیب کے منتشر اجزا کو "حکومتوں اور عوام" کی لڑی میں پرونے کا آغاز کیا، جو موجودہ تہذیب کی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ تقریباً اسی زمانہ میں حکومت کا استحکام عمل میں آیا۔" [۵]

ان اقتباسات کے مطالعہ کے بعد یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ جو کچھ اوپر تحریر کیا گیا ہے وہ عین حقیقت ہے اور اس میں تعصب یا غلط بیانی کا شائبہ تک نہیں۔ اور یہ کہ اہلِ مغرب جنھیں فی زمانہ میکدۂ علم کی ساقی گری کا شرف حاصل ہے اور جو سیاستِ عالم پر چھائے ہوئے ہیں اور جن کی شرافت و نجابت کے ساری دنیا میں گیت گائے جا رہے ہیں، اپنی ترقی کے لئے مسلمانوں کے مرہونِ منت ہیں۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان اپنے آپ کو ان سے کمتر خیال کریں۔ یہ بات کتنی افسوسناک اور اذیت رساں ہے کہ وہ لوگ جو کل تک مسلمانوں کے خوانِ کرم کے خوشہ چیں تھے آج ان کے رہبر بنے ہوئے ہیں۔ ماضی قریب میں انھوں نے جنکی قیادت کی تھی آج ان کے نقشِ قدم پر چلنا اپنے لئے باعثِ فخر تصور کرتے ہیں۔ اور جو خود دار مسلمان ان کی تقلید نہیں کرتا اسے مطعون کیا جاتا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ مسلمان میدانِ عمل میں آئیں اور ثابت کر دیں کہ جو اعتراضات ان پر کئے گئے ہیں وہ قطعاً بے بنیاد ہیں۔ اور جو کارنامے ان کے اسلاف نے انجام دئے ان کی مثال دنیا کی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اگر مسلمان بیدار ہو گئے تو اہلِ مغرب اپنا رویہ بدلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ان کی ہمتیں پست ہو جائیں گی اور وہ ان کے آبا و اجداد کی تذلیل نہ کر سکیں گے۔ لیکن اگر وہ اسی طور پر مغربی تہذیب کا اتباع کرتے رہے اور انھوں نے اپنی حیثیت کا احساس نہ کیا تو رہا سہا اقتدار بھی ختم ہو جائیگا اور ان کے اسلاف کی یاد تاریخ کے صفحات تک میں باقی نہ رہے گی۔ ع

اٹھ مسلمِ خوابیدہ یہ خوابِ گراں کب تک

ممتاز علی خاں

[۵] ہسٹری آف سویلیزیشن

"لیکن تمام امور پر نظر کرنے کے بعد ہمیں یقین حاصل ہوتا ہے کہ حروبِ صلیبیہ انجام کار فائدہ بخش ثابت ہوئیں۔ سب لوگ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ زمانہ حروب میں یورپ نے بہت ترقی کی۔ گبن کہتا ہے" تہذیب و تمدن کی موج جو اتنی مدت سے معرض زوال میں پڑی تھی مستقل تیز رفتاری کے ساتھ بہنی شروع ہو گئی اور نئی نسلوں کے سامنے امیدوں کا ایک خوشِ آیند منظر دکھائی دینے لگا۔ حروبِ صلیبیہ کی اس دو سو برس کی مدت میں یورپ کے تمدن میں بہت اصلاح ہوئی۔ اور ترقی کی رفتار بہت تیز رہی"[۵۱]

"جب ہم اپنی توجہات سیاست سے ہٹا کر تاریخ تہذیب و تمدن کی طرف مبذول کرتے ہیں تو ہم محارباتِ صلیبی کے اثرات کو گہرے طور پر منقش پاتے ہیں۔ اگرچہ وہ اتنے واضح طور پر متعین نہیں ہیں۔ یہ لڑائیاں پیداوار تھیں حکومتِ الٰہیہ کی حکمتِ عملی کی جس کا انحصار نظریۂ عقلی پر تھا۔ ان جنگوں نے اس نظریہ کا استیصال کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ حکومت بھی ختم ہو گئی جو اس نظریہ کی وجہ سے عالم وجود میں آئی تھی۔ ایک طرف تو ان محاربات نے ایسا ماحول پیدا کر دیا جس میں ایک جاہل بھی خود کو پادری ثابت کر سکتا تھا۔ اور دوسری طرف انھوں نے مغرب کو ایک نئے مذہب اور ایک نئی تہذیب سے روشناس کرایا۔ یہ درست نہیں کہ مغرب کا ایک خاص مشرقی تہذیب سے رابطہ قائم ہوا یا اس نے اس تہذیب سے کچھ حاصل کیا۔ بلکہ حقیقت صرف اس قدر ہے کہ مغرب کو ایک ایسی تہذیب سے متعارف ہونے کا موقع ملا جو اس سے مختلف تھی۔ اور اکثر باتوں میں اگر اس (مغرب) سے زیادہ نہیں تو اُس جیسی ترقی یافتہ ضرور تھی۔ ایک نیا جذبہ جو تقابل اور رواداری کا محرک ہوتا ہے۔ حروبِ صلیبیہ کی بدولت پیدا ہوا۔ نئے علم اور تجربہ کے لئے وسیع میدان میسر آیا۔ شاعرانہ تخیل اور سائنٹفک تجربات کے واسطے ان مہموں نے نیا مواد فراہم کیا۔"[۵۲]

"یہ ہیں میری رائے میں وہ رفیع الشان اور حقیقی اثرات جو محارباتِ صلیبی کی وجہ سے مرتب ہوئے۔ اولاً خیالات میں وسعت پیدا ہوئی۔ اور ذہن نے قیود سے نجات پائی۔ اور ثانیاً وجدانی کو بلندی نصیب ہوئی اور ہر قسم کی جد و جہد کے لئے مواقع حاصل ہوئے۔ انھوں نے (محارباتِ صلیبی) فی الفور شخصی آزادی کے مرتبہ کو بلند کر دیا اور سیاسی وحدت عطا کی۔ انھوں نے بنی نوع انسان کو آزاد ہونے میں مدد دی اور ان کی بدولت معاشرت کو شانِ مرکزیت حاصل ہوئی۔ اُن ذرائع تہذیب کے بارے میں جو اُنھوں نے براہِ راست مشرق سے درآمد کئے بہت سے سوالات کئے جا چکے ہیں۔ ان سوالات کے جواب

---

۵۱ محارباتِ صلیبیہ۔ صفحہ ۶۷ - ۱۶۶ -
۵۲ انسائکلوپیڈیا برٹینکا۔ جلد ۹

اپنی کامیابی اور فتوحات کی ضمانت خیال کرتا تھا۔

سلطنتِ روما کا عروج و اقبال | کون تاریخ داں نہیں جانتا کہ سلطنتِ روما کے عروج و اقبال میں سسرو کے فاضلانہ لیکچروں اور مارک اینٹنی کے علم و فضل کو نمایاں اہمیت حاصل تھی۔

مصر۔ ایران اور ہندوستان | دنیا یہ بھی جانتی ہے کہ تہذیبِ مصر کی تہہ میں علمائے مصر کا فلسفہ اور علمی کاوشوں کا جذبہ کارفرما تھا۔ اسی طرح ایران کے عروج و اقبال کو ژند و اوستا پر بجا طور پر فخر اور ناز ہے۔ مزید براں آپ جانتے ہیں کہ دنیا کے ایک کثیر حصہ پر جب کہ ابھی جہالت کے بادل چھائے ہوئے تھے ہندو سلطنت انتہائی عروج پر تھی۔ بنظرِ تعمق تحقیق کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ بھگوت گیتا۔ رامائن۔ مہابھارت۔ پران اور ویدوں کی روشنی میں اہلِ ہند شاہراہِ ترقی پر گامزن تھے۔

ویاس جی۔ بالمیک۔ سری کرشن۔ کالیداس۔ ودیا دھنتر ایسے علماء نے اپنی تصنیفات اور تعلیم و تلقین سے قوم کی صحیح رہنمائی کی۔

مسلمانانِ عالم کی وحید المثال ترقی | لیکن یہ تمام اصولِ حکمت ایک محدود وقت تک کے لئے تھے۔ جو اپنے فرائض سرانجام دینے کے بعد دنیا سے بہت حد تک روپوش ہو گئے۔

تاہم اتنا ضرور ثابت ہوا۔ کہ جو قوم علم و حکمت ایسی نعمت کے حصول میں کوشاں رہی وہ دنیا میں سربلند اور کامراں رہی۔ اور جو قوم علم و عمل کے بغیر میدانِ کارزار میں نکلی اس کی حکومت، اقتدار اور دولت عارضی اور ناپائیدار ثابت ہوا۔

اسی اصول اور آیتہ کریمہ کی روشنی میں مسلمانانِ عالم نے بھی ترقی کی۔ اور جب مسلمانوں نے علم و عمل کو چھوڑ کر جہالت کو اپنا شعار بنا لیا ذلیل ہو گئے۔ قرآنِ حکیم میں اکثر مقامات پر صاف طور پر اقوام و افراد کی عزت و حشمت کا یہ اصول بیان کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:۔ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟)
اسی طرح قرآنِ حکیم نے وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا...... الخ کی آیت شریفہ پیش کر کے اپنے اصولِ زندگی اور اسلامی علوم کے ارفع و اعلیٰ ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے دنیا کی زبانیں گنگ اور مشل کر کے دکھا دیئے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ...... الخ کا دعویٰ ہمارے لئے کم فخر و مباہات کا باعث نہیں۔ المختصر! اس

اسلامیانِ ہند کی تعلیمی ضروریات ؂

(از جناب ڈاکٹر سید شریف احمد صاحب چشتی ایم۔ اے۔ ڈی لیسٹ امرتسر)

اسلامی قانون اور لائحۂ عمل اس رُبع مسکون پر ہزارہا اقوام اور مذاہب آباد ہیں۔ اور ان سب میں اسلام ہی ایک ایسا فطری مذہب ہے۔ جو اپنے ہر قانون اور اپنے پیش کردہ لائحۂ عمل کو عقل و تدبر کی کسوٹی پر پرکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ اور اخلاق کے مسلّمہ اصولوں پر استنباط و استشہاد کے لئے بلاتا ہے۔

اور سب سے بڑھکر اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ..... الخ کا فخریہ دعویٰ بھی کرتا ہے۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اور اَفَلَا یَعْقِلُوْنَ کی روشن آیات پیش کرنے کے بعد اسلام نے انسانی تمدن اور ترقی کے لئے جو عدیم النظیر جامع اور مانع اصول پیش کئے ہیں۔ ان پر عمل پیرا ہونے کے بعد پیدائش سے تا دمِ واپسیں انسان کسی دوسرے قانون کا محتاج نہیں ہو سکتا۔

عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ..... الخ کی آیت شریف میں ثابت کیا گیا ہے کہ ابنِ آدم کے اشرف المخلوقات قرار دئے جانے کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ عالم ہے۔ اور ملائکہ حضرتِ آدمؑ کے سامنے ان کے علم سے ہی مجبور ہو کر سجدہ ریز ہونے پر مجبور ہوئے۔ ہبوطِ آدم سے تا دمِ ہنوز جس قوم اور ملت نے عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ..... الخ کی حقیقت کو سمجھا اور اس پر عمل پیرا ہوئی۔ وہ ہی قوم اور ملت اس فلکِ نیلگوں کے نیچے صاحبِ اقتدار و ثروت ہوئی۔

یونانیوں کی ترقی کا راز یونان کی تاریخ سے ہر علم دوست شخص واقف ہے کہ یونانیوں کی فتح و نصرت کے پس پردہ جو طاقت کام کر رہی تھی وہ علم و حکمت کی روشنی تھی۔ فیثاغورث۔ سقراط۔ بقراط۔ افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ و حکمت نے مردہ قوم کے پیکر میں روح پھونک دی۔ اور قوم کو تحت الثریٰ سے نکال کر عروج کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ سکندرِ اعظم تلوار کے ساتھ ہومر کی کتاب سرہانے رکھتا

؂ یہ مقالہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس آگرہ (دسمبر [illegible]) کے شعبۂ تعلیمی میں پڑھا گیا تھا۔

اسلام کے اعاظم رجال | کیا حضرت امام غزالیؒ کے علم و فضل اور فلسفہ و حکمت کے مقابلہ میں کوئی مغربی مشرقی پیش کیا جا سکتا ہے؟

کیا یہ ایک حقیقت نہیں؟ کہ اسماء الرجال کا سلسلہ دنیا میں قائم کرنے کا فخر صرف مسلمانوں کو حاصل ہے۔ امام مالکؒ۔ امام احمد بن حنبلؒ۔ امام ابو حنیفہؒ۔ امام شافعیؒ کی تحقیقات انسانی تمدن و معاشرت کے لئے عدیم النظیر نہیں ہیں؟

حضرت امام بخاریؒ، مسلمؒ۔ ابو داؤدؒ کی علمی عرق ریزیاں اور جاں فشانیاں کس سے پوشیدہ ہیں؟

امام نصیر الدین محمد محقق طوسی کے علم و فضل سے کون انکار کر سکتا ہے؟ شیخ الرئیس بو علی سینا۔ ابو نصر ابو زید بلخیؒ۔ محمد بن جابرؒ۔ یحییٰ بن ابو منصورؒ۔ حنین بن اسحاقؒ کی تصنیفات آج بھی خضر راہ کا کام دے رہی ہیں۔

شیخ سعدیؒ شیرازی، فرید الدینؒ۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ۔ حضرت علی الہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ سرہندی کے علم الاخلاق کے مقابلہ میں کسی غیر مسلم کی تصنیف پیش کی جا سکتی ہے؟

ابن بطوطہ۔ ابن خلکان اور مصنف تاریخ فرشتہ نے جن حقائق سے ہمیں متعارف کرایا یہ فخر کسی اور کے حصہ میں بھی آیا ہے؟

ان سب کا جواب ایک ہی ہے اور وہ ہے بالکل نہیں ہرگز نہیں۔

یہی وہ لوگ تھے۔ جن کی بدولت اسلام دنیا میں پھیلا اور نامور رہا۔

مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے نوجوان ہر علم۔ ہر فن اور ہر فلسفہ کے موجد اہلِ مغرب اور حکمران قوم کو ہی سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دلوں میں اسلام اور بزرگانِ اسلام کی عزت کم ہو رہی نہیں رہی ہے اور ہمارے تنزل اور انحطاط کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے۔ حالانکہ اگر وہ اپنے علوم کا بغور مطالعہ کریں۔ تو مغرب سے کہیں زیادہ اور ٹھوس حقائق انھیں اپنے ہاں پوشیدہ نظر آئیں گے۔

اندوہناک داستانِ زوال | اسلامی تعلیمات، اسلامی تمدن اور اصول انتہائی بلندیوں پر جلوہ گر تھے! ہر تشنہ لب اس بحرِ ناپیدا کنار سے سیراب ہو رہا تھا کہ یکا یک مغرب کی طرف سے ایک کالی آندھی اٹھی جس نے ہماری حکومت کے ایوان کو درہم برہم کر دیا۔ اور مسلمان اپنی سادہ لوحی اور تساہل کے باعث

مضمون پر کہاں تک کہا جائے۔ اسلامی تعلیم۔ اسلامی فلسفہ اور لائحۂ عمل کی فضیلت بیان کرنے کے لئے ایک طویل دفتر درکار ہے۔

اسلام میں علم کی حیثیت | رسالت پر ایمان لانے والوں کے لئے ہادیٔ اسلامؐ نے جس سختی کے ساتھ حصولِ علم کے لئے ہدایت فرمائی ہے۔ اور علم کی اہمیت و فضیلت جس زور اور تاکید کے ساتھ آقائے دوجہاں نے پیش کی ہے۔ وہ کسی قوم کے مصلح نے نہیں کی۔

ارشاد ہوتا ہے :- انا مدینۃ العلم و علیٌّ بابھا (میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے)

پھر فرمایا :- اطلبوا العلم ولو کان بالصین (علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین جانا پڑے)

ان آیات و احادیث سے فضیلتِ علم و اہمیت کے ساتھ ساتھ انسانی ترقی کی صحیح راہ دکھائی گئی ہے۔ خلفائے راشدین کے بعد حضرات تابعین و تبع تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس حقیقت کو بخوبی سمجھا۔ اور جب تک سرورِ عالمؐ کے نام لیوا اس پر عمل پیرا رہے اور تحقیق و تحصیل علم میں سرگرداں رہے۔ دنیا جہان میں سربلند اور سرفراز رہے۔ وانتم الاعلون ..... الخ پر عمل ان کا طغرائے امتیاز تھا۔

بغداد۔ دمشق۔ جامع ازہر قاہرہ۔ غرناطہ۔ دہلی۔ استنبول۔ بشبشر کی اسلامی یونیورسٹیاں ان بزرگوں کی علمی کاوشوں اور کارناموں کا روشن اور بیّن ثبوت تھیں۔

خلیفہ ہارون رشید ایک عالم کو دیکھ کر تخت سے نیچے اتر آتے ہیں۔ سلطان محمود غزنویؒ ایک معمولی عالم کے سامنے بھی سرِ تعظیم خم کر دیتے ہیں۔ شہاب الدین شاہجہاں صرف علم و فضل سے متاثر ہو کر ایک بے یار و مددگار انسان کے ہاتھ میں قلمدانِ وزارت سپرد کر دیتے ہیں۔ خلفاء اور شاہانِ اسلام کی تقلید میں امراء اور سرمایہ دار طبقے نے بھی علمی خدمات کو اپنا فرضِ عین سمجھا۔ چنانچہ تاریخ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی سلطنت میں لاکھوں علماء اور فضلاء کے وظائف مقرر تھے۔ جو فارغ البالی اور دنیوی تفکرات سے بے نیاز ہو کر خدمتِ دین اور تحقیق و تشہیرِ علومِ عالیہ اسلامیہ میں مصروف رہتے تھے۔

یورپ کا اعترافِ حقیقت | اور یہ اسی قدر دانی کا نتیجہ تھا کہ یورپ جو آج دنیا میں ہر علم اور ہر فن کا اجارہ دار بنا ہوا ہے۔ وہ اس حقیقت کا معترف ہے کہ وہ آفتابِ اسلام کے نور سے روشنی مستعار لے کر منور ہوا۔ جذبۂ تعمیلِ ارشادِ نبویؐ نے اسلام میں وہ انسان پیدا کئے۔ جو اپنی نظیر آپ تھے۔ اور جن کے کمالات اور ترقیات نے دنیا جہان کو ان کا لوہا ماننے پر مجبور کر دیا۔

اور حتی المقدور اپنے مفوضہ فرائض کی ادائگی میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ابھی علم کے متعدد شعبے تشنۂ تکمیل ہیں۔

مسلمانوں کے لئے میڈیکل کالج کی ضرورت آپ جانتے ہیں کہ مسلمان جہاں دیگر علوم جدیدہ میں اپنی ہمعصر اقوام سے بہت پیچھے ہیں۔ وہاں ڈاکٹری اور انجنیرنگ کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔ دس کروڑ مسلمانانِ ہندوستان کا ایک بھی میڈیکل کالج یا طبی ادارہ ایسا نہیں۔ جو ہماری موجودہ ضرورتوں کے لئے مکتفی ہو گا۔ ور گورنمنٹ اور برادرانِ وطن کی جو درسگاہیں ان علوم و فنون کی خدمت کے لئے قائم ہیں۔ وہاں اغیار دستِ تصرف اس حد تک پہنچ چکا ہے۔ اور اس قدر مضبوطی سے قابض ہے۔ کہ مسلمان اپنے جائز حقوق رتناسب سے بھی محروم رہتا چلا آرہا ہے۔ اور داخلے کے وقت مسلمانوں کو وہ مشکلات پیش آتی ہیں کہ الامان !!

وائس چانسلر کی مخلصانہ مساعی انتہائی مسرت اور خوشی کا مقام ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے موجودہ وائس چانسلر لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر سر ضیاءالدین احمد ایم۔ ایل۔ اے (سنٹرل) کے نکتہ رس اور عاقبت اندیش دماغ اور بلند نے اس اہم کمی کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اس ہولناک، اور ہوشربا جنگی ہاؤ ہو میں نیز اس خطرناک گرانی کے زمانہ میں بھی اپنی مخلصانہ سعی کو کام میں لاتے ہوئے اس نیک کام کی بنیاد رکھ دی۔ اور اپنے اخلاص مدردیِ ملت کا ثبوت بہم پہنچایا ؎

الوالعزمانِ دانشمند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر پھاڑتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

اس اہم کام کے لئے زرِ کثیر کی ضرورت تھی۔ قوم نے بے شک فراخ دلی کے ساتھ وائس چانسلر کی اس آواز لبیک کہا۔ لیکن اندازۂ مصارف کے مطابق ہم فراہمیٔ زر کا کام شرمندۂ تکمیل نہ کر سکے۔ مخیر حضرات کے لئے ر اور دستِ خیر دراز کرنے کی ضرورت ہے۔

حضرت حضور نظام کی عظیم القدر معارف پروری ہز اگزالٹڈ ہائی نس اعلیٰحضرت حضور نظام خسرو حیدرآباد (دکن) و برار بالقابہ کی ذاتِ گرامی کا دم غنیمت ہے جو ہمیشہ ہر ایسے سے وقت میں مسلمانانِ ہندوستان کے کام آتے ہیں۔ اور حضور اپنی علم دوستی، رعایا پروری، مسلم نوازی میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ حال ہی میں حضور ممدوح نے اپنی روایتی دریا دلی کے مطابق ۱۰ لاکھ روپے

صدیوں کے اقتدار کو کھو بیٹھا۔ دانایانِ مغرب نے اسلامی تعلیم اور علوم کے خاتمہ میں ہی اپنی خیر سمجھی۔ چنانچہ مسلمانانِ عالم کی خانہ جنگیوں اور رقابتوں کے باعث وہ اپنے مشئوم مقاصد میں بہت کامیاب رہے اور آہستہ آہستہ ہمارا تمام سرمایۂ علم و فضل کمالِ عیاری اور چابکدستی سے یورپ منتقل کر دیا گیا۔ حکیم الامت حضرت علامہ اقبال مرحوم اسی بات سے متاثر ہو کر فرماتے ہیں ؎

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارہ
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسلمان جو علم کا دیوانہ اور حکمت اور دانائی کے آسمان کا روشن ستارہ تھا۔ جاہل اور تاریک ہو کر پڑ گیا۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں پر مصائب کی یہ گھٹائیں کچھ اس طرح چھا گئیں کہ اُسے اپنے آپ کا بھی ہوش نہ رہا۔

رہبرِ اعظم کا ظہور

قریب تھا کہ اسلامیانِ ہند جہالت کے تاریک سمندر میں غرق ہو جائیں اور شاید ان کی داستانِ ہستی بھی باقی نہ رہتی۔ اور وہ دن بھی دُور نہیں تھا کہ ہسپانیہ کے جانگداز اور دلسوز واقعات کا یہاں اعادہ ہو جائے۔ کہ مادرِ ہند نے ہمیں ایک ناخدا بخشا۔ ایک رہنما پیدا کیا۔ جس نے ملت کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو کنارے لگانے کا تہیہ کیا۔ اور واعتصموبحبل اللہ جمیعا اور علم آدم الاسما... الخ کا بھولا ہوا سبق ہمیں یاد دلایا۔ میری مراد حضرت سر سید احمد خاں مرحوم و مغفور نور اللہ مرقدہٗ کی ذاتِ گرامی سے ہے۔ اس طبیب الامتؒ نے سب سے پہلے ملت کی درماندگی۔ ذلت۔ پستی۔ اور افلاس ایسے مہلک امراض کے اسباب و علل پر غور کرنے کے بعد وہی چودہ سو سال کا بے خطا نسخہ تجویز کیا جسے ہم ایک مدت سے فراموش کر چکے تھے۔ یعنی "تحصیلِ علم" اور اسی راہ کو ملت کی نجات کا واحد ذریعہ قرار دیا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ذمہ داریاں

خدا کا یہ بندہ انتہائی مصائب و مشکلات کے باوجود اپنے مقاصد میں کامیاب ہوا۔ لیکن مرحوم کے بعد ہمارا فرض ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ انفرادی حیثیت میں اکثر محنتیں رائگاں جاتی ہیں۔ اس لئے مرحوم کے بعد سب سے اہم ذمہ داری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس پر عائد ہوتی ہے۔ ملتِ اسلامیہ ہندیہ کو اس حقیقت کا اعتراف ہے۔ کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل نے حتی الامکان

قابلِ عمل مشترک پروگرام مرتب کیا جائے ضرورت ہے کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس صنعت و حرفت کی تکمیل کے لئے ایک جامع اور قابلِ عمل پروگرام مرتب کرے یہ صحیح ہے کہ ملت نے اس طرف کما حقہٗ توجہ نہیں کی۔ لیکن احساس پیدا کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔ ہمارا اہم فرض ہے کہ پورے جوش اور ہوش کے ساتھ میدان میں نکلیں۔ اور کانفرنس کے ہر اجلاس میں گزشتہ کارروائی کی مکمل رپورٹ پیش کرنے کے بعد آئندہ کے لئے جدید شاہراہیں معلوم کی جائیں اور مشکلات پر قابو پانے کے لئے آسان حل تجویز کئے جائیں۔

تجارتی مرکزی بورڈ کا قیام اس کے ساتھ ہی آل انڈیا مسلم تجارتی مرکزی بورڈ کا قیام ازبس ضروری ہے۔ قوم کے افلاس اور جہالت کا بے خطا نسخہ تجارت ہے۔ اور اس مرکزی بورڈ کے ماتحت تمام صوبوں، اضلاع اور قصبات میں باقاعدہ شاخیں قائم کی جائیں۔

شاہانِ اسلام کے زمانہ میں ہم نشۂ حکومت میں مست رہے لیکن ہمارے دور اندیش برادرانِ وطن آہستہ آہستہ ملک کی تجارت پر قابض ہوتے چلے گئے۔ اس تساہل اور استغنا کا نتیجہ ہم آج بھگت رہے ہیں۔ آج ملک کی تجارت کا ۹۵ فیصدی حصہ انھیں کے قبضہ میں ہے۔ ستم بر ستم یہ ہوا کہ ہمسایہ اقوام تجارت کے ساتھ ہی صنعت و حرفت پر بھی قابض ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے فرائض کا یہ ایک نہایت ضروری حصہ ہے۔ ضرورت ہے کہ کانفرنس اس طرف کوئی موثر قدم اٹھائے۔

اسلامی اخلاق کے احیاء کی اہمیت اب میں آپ کی توجہ انسانی تمدن اور امن کے ایک نہایت ضروری پہلو کی طرف منعطف کرا رہا ہوں جس کا فقدان ہماری ذلت اور پستی کا سبب بن رہا ہے۔ وہ مسلمان جو دوست اور دشمن دونوں کی نظروں میں قابلِ عزت تھا۔ وہ آج اپنوں کے لئے بھی کوئی قابلِ فخر انسان نہیں رہا۔ وہ ہے "علم الاخلاق" کا فقدان۔

اشرف الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث حیف ہے کہ:۔

خصلتانِ لا تجتمعان فی منافقٍ حُسن سمتٍ ولا فقهٌ فی الدّین۔!!!

(منافق میں دو خصلتیں خوش خلقی اور دین کا علم بیک وقت جمع نہیں ہو سکتے۔)

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان فضلاء اخلاق اور علم الاخلاق کے روشن آفتاب تھے اور اخلاقِ نبوی کی شعاعیں قریباً ہر مسلمان کی پیشانی سے جلوہ ریز تھیں۔ لیکن آج کی حالت کا اگر زمانۂ صدرِ اسلام سے موازنہ

کی رقم خطیر میڈیکل کالج کے لئے مرحمت فرمائی ہے۔ مسلمانانِ ہندوستان کی گردنیں پہلے ہی اس علم پرور، قابل فخر اور واجب التعظیم ہستی کے احسانات سے خم تھیں کہ اس احسانِ عظیم کی وجہ سے ہندوستان کا ہر ذی نفس مسلمان اعلیحضرت کا والا و شیدا نظر آتا ہے۔ ہمارے دل کی گہرائیوں سے رہ رہ کر یہی دعا نکلتی ہے کہ پروردگارِ عالم اور احکم الحاکمین حضور موصوف کے رتبۂ و شان کو بلند تر کرے۔ اور شہریار دکن و برار کا سایۂ ہما پایہ طویل مدت تک ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ آمین! ثم آمین!!

ہمدردانِ ملت کا فرض

لیکن آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور ہمدردانِ ملت کا فرض ہے کہ اس کالج کو جلد کمال تک پہنچا کر دم لیں۔ اور اسے اس قدر وسعت دیں کہ دس کروڑ مسلمانانِ ہندوستان کی مرکزی حیثیت کے شایانِ شان ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان بھر میں میڈیکل کالجوں کا جال پھیلا دیا جائے جو مقامی ضروریات کو بھی باحسن الوجوہ پورا کر سکیں۔

صنعت و تجارت کی اہمیت

اب میں آپ کی توجہ ایک ضروری امر کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ صنعت و حرفت اور تجارت ایک وقت میں مسلم قوم کی خانہ زاد لونڈیاں تھیں۔ ہمارے ملک اور بالخصوص ہمارے ہاتھوں کی تیار کردہ اشیاء اپنی بے نظیر نفاست اور مضبوطی کے باعث یورپ میں سونے کے بھاؤ فروخت ہوتی تھیں۔ ہماری صنعت و حرفت کیوں برباد ہوئی؟ میں اس تلخ حقیقت میں نہیں پڑنا چاہتا۔

دنیا کے کسی دور دراز جزیرے یا گوشے میں چلے جائیے۔ دشوار گزار پہاڑوں کی چوٹیوں پر قدم رنجہ فرمائیے۔ غرضیکہ جس مقام پر ابن آدم آباد ہے۔ وہاں آپ کو ہادیٔ عرب کے نام لیواؤں کی کافی تعداد ملے گی۔ اور اہلِ مغرب کے لئے یہ امر انتہائی حیرت و استعجاب کا موجب ہے کہ اسلام کا پیغام کس طرح اور کن مشنریوں کے ذریعے سے یہاں پہنچا۔

غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ عروجِ اسلام میں مسلمان ہماری طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہتے تھے۔ بلکہ مسلمان تاجروں نے دُنیا کا کونہ کونہ چھان مارا اور یہ تاجر جہاں بھی گیا۔ وہاں مالِ تجارت کے ساتھ ساتھ متاعِ ایمان بھی تقسیم کرتا رہا۔

تجارت ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو قوم میں فارغ البالی اور جذبۂ غیرت پیدا کرتی ہے۔ اور حصولِ حکومت جاہ و حشمت۔ عز و وقار اور تبلیغ کے لئے علم و حکمت کے پہلو بہ پہلو تجارت بھی ایک جزوِ لاینفک ہے۔

تیار ہیں۔ م   برگ سبز است تحفۂ درویش

تعلیمی نظام کا اتحاد | آپ جانتے ہیں کہ ہمارا خدا ایک۔ ہمارا رسولؐ ایک۔ ہمارا کعبہ ایک۔ ہمارا قرآن ایک۔ ہماری راہ ایک۔ ہماری منزل ایک۔ ہماری تعلیم ایک۔ پھر اگر ہمارا تعلیمی نظام جس پر کہ ہماری تہذیب اور زندگی کی عمارت قائم ہے۔ ایک ہو جائے تو کس قدر خوش قسمتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسلامی درسگاہوں کے ارکان کے دلوں میں خدشہ پیدا ہو جائے کہ ایجوکیشنل کانفرنس اس طریق سے ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت کرے گی۔ اس کا حل یہی ہو سکتا ہے کہ ایجوکیشنل کانفرنس تخریبی حالات کی اصلاح کے ماسواء اندرونی معاملات میں مطلقاً مداخلت نہ کرے۔ اور الحاق سے قبل اس ادارے سے یہ وعدہ کرے۔

مالی مشکلات کا حل | آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ہمارے اکثر پروگرام محض مالی اور اقتصادی مشکلات کے باعث جامۂ تکمیل نہیں پہن سکتے۔ اور وہ ادھورے رہ کر بجائے فائدہ کے اُلٹا قوم کی تخریب اور انتشار کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس امر کی اشد ضرورت ہے۔ کہ متذکرہ بالا جملہ مقاصد کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لئے مالی مشکلات کا حل سوچا جائے۔ اسلام نے ہمیں ایک مکمل نظام اور اکمل لائحۂ عمل بخشا ہے۔ اگر ہم آج بھی اس کو اپنا لیں تو یقیناً تمام مشکلات سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اور آزادانہ طور پر اپنی تعلیمی۔ تجارتی۔ اخلاقی اور صنعت و حرفت کی رفتارِ ترقی کو بحال رکھ سکتے ہیں۔ اور وہ ہے۔۔۔۔۔ زکوٰۃ فنڈ کا قیام۔

سرورِ عالمؐ نے مالی مشکلات کا بے نظیر حل جو تجویز فرمایا ہے۔ وہ بے مثال اور نہایت آسان ہے۔ مگر آہ! ہم اس پر کما حقہٗ عمل پیرا نہ ہونے کی وجہ سے مجبور و معذور ہو کر رہ گئے ہیں۔ اگر بہی خواہانِ ملت، قوم کے صحیح دل و دماغ امراء اور علماء کا طبقہ اس طرف پوری پوری توجہ مبذول کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایک کامیاب زکوٰۃ فنڈ کے قیام میں ناکام ہوں۔

اسلام کا یہ ضروری اور مضبوط ترین بازو عدم نظام کے باعث روز بروز کمزور اور بے کار ہو رہا ہے۔ اور میں لگی لپٹی رکھے بغیر یہ کہنے میں باک نہیں کروں گا۔ کہ انفرادی حیثیت میں ہمارا یہ ثواب مبدل بہ عذاب ہو رہا ہے۔ اور عدم توجہی کے باعث ملت کا ایک طبقہ ہم نے بے کار اور معطل کر کے رکھ دیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ارباب بست و کشاد میری اس گزارش پر غور فرما کر لیے

کیا جائے تو ہماری آنکھیں شرم سے نیچی اور سر ندامت سے جھک جاتے ہیں۔ ہم ایک مستقل اور مسلمہ اخلاق کے مالک تھے۔ اور مالک ہیں۔

ہمارا فرض ہے کہ اسلامی پیکر اخلاق میں دوبارہ زندگی پیدا کریں۔ جسے ہم اپنے ہی ہاتھوں دفن کر چکے ہیں۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ہمہ گیر پالیسی اس امر کی مقتضی ہے کہ مسلم یونیورسٹی اور ہندوستان کی تمام دوسری اسلامی درسگاہوں کے لئے اسلامی مطمح نظر کی روشنی میں علم الاخلاق کا ایک جامع لیکن آسان نصاب تعلیم مرتب کر کے اُسے نافذ العمل کرنے کی سعی بروئے کار لائے۔

تکمیل مقاصد کے لئے ضروری گزارشات | ملک کے صحیح دل و دماغ اس کام میں رہنمایان قوم کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں۔ مگر ان جملہ مقاصد کی تکمیل کے لئے اور تمام مسلمانانِ ہندوستان کو ایک رشتہ میں منسلک کرنے کے لئے دو باتوں کی اشد ضرورت ہے اور میری گزارشات کا اہم حصہ بھی یہی ہے۔

اول۔ ہمارا تعلیمی نظام ایک ہو۔

دوم۔ مالی مشکلات کے حل کے لئے ہمارا ایک مستقل زکوٰۃ فنڈ ہو۔

ہماری مشکلات اور نجات کا واحد حل یہ ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام ایک ہو۔ ہندوستان بھر کے مسلم تعلیمی، تجارتی، اور صنعتی ادارے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ منسلک ہو جائیں۔ اور اگر ہم ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنی تکمیل تعلیم میں کمربستہ ہو جائیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک قلیل عرصہ میں ہماری بگڑی نہ بن جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ ابتدائً اس راہ میں بے شمار مشکلات اور مصائب حائل ہوں گے۔ جہاں مقامی رقابتیں مانع آئے گی وہاں وقار کا خبط بھی سدِ سکندری ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن مقامی رقابتوں کو موثر پروپاگنڈا کے ذریعے سے دُور کیا جا سکتا ہے اور وقار کا خیال ہی ہماری غلط فہمی ہو گی۔ کیونکہ وقار اس طریق سے بلند ہوگا۔ نہ کہ کم۔ حقیقی وقار ملی وقار ہوتا ہے نہ کہ ذاتی۔

جملہ ملحقہ مدارس کی نگرانی و ہدایات کے لئے ایک باتنخواہ قابل اور تجربہ کار ہستی کی خدمات حاصل کی جائیں۔ جو دورہ کر کے ہر درسگاہ میں خود پہنچے۔ اور جملہ ملحقہ مدارس کو ایک مرکز پر لانے کی کوشش کرے۔ اگر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ارباب حل وعقد اس کام کو جامۂ عمل پہنانے کا اقدام کریں تو سب سے پہلے ہم اپنے اسکول "چشتیہ ہائی اسکول امرتسر" کو جو ایک کامیاب تعلیمی ادارہ ہے انتہائی مسرت اور فخر و مباہات کے ساتھ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ ملحق کرنے کو

قصیدۂ ہفت بند

در منقبت شیر خدا امیر المومنین حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ

(از منشی الملوک فخر الدولہ دبیر الملک راجہ رتن سنگھ بہادر ہشیار جنگ)

راجہ رتن سنگھ بہادر لکھنؤ کے ساکن اور قوم کے کایستھ تھے۔ اُن کا خاندان تین[2] پشت سے دربار اودھ میں معزز عہدوں پر ممتاز تھا۔ ان کے دادا راجہ بھگوان داس نواب آصف الدولہ کے ایام شہزادگی میں اتالیق تھے اور جب وہ سریر آرائے حکومت ہوئے تو دیوان مقرر کئے گئے۔

راجہ رتن سنگھ بڑے فاضل اور علامۂ وقت تھے، صاحب تصانیف اور قادر الکلام شاعر تھے۔ زخمی تخلص فرماتے تھے۔ شاہان اودھ کے حالات میں سلطان التواریخ نامی کتاب لکھی جس کو اُنھوں نے ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں بعمر ساٹھ سال ختم کیا۔ درج ذیل قصیدہ ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء کی تصنیف ہے۔ جس کا نہایت مطلا اور مذہب نسخہ جو فن خطاطی کا بھی قابل دید نمونہ ہے۔ کتب خانۂ اسلامیہ انٹر کالج بریلی میں محفوظ ہے۔ کاتب کا نام اللہ بخش تحریر ہے۔ معلوم نہیں ان کا مصنف علام سے کیا رشتہ یا تعلق تھا۔

محبی مولوی سید مسعود الحسن صاحب ایم۔ اے پرنسپل کالج مذکور جن کی عنایت سے ہمیں قصیدہ کی نقل حاصل ہوئی۔ فرماتے ہیں کہ اُن کو یہ قیمتی نسخہ مولوی حسین احمد صاحب مرحوم ساکن نصیر آباد (ضلع رائے بریلی) کے ذاتی کتب خانہ سے حاصل ہوا تھا۔ مولوی صاحب کی بابتہ بیان کیا کہ مرحوم فقہ اور حدیث کے صاحب تصانیف عالم اور مہاراجہ صاحب بہادر آف جہانگیر آباد (اودھ) کے اُستاد تھے۔ ۱۹۲۲ء یا ۱۹۲۳ء میں انتقال فرمایا۔
جناب مولوی محمد محسن صاحب اُستاد فارسی اسلامیہ انٹر کالج بریلی کا بھی شکر واجب ہے کہ انھوں نے ازراہِ مہربانی اس قصیدہ کو نقل کرکے ہمیں دیا۔

(سید الطاف علی)

بقیمیل تمام جامۂ عمل پہنا کر ملت کی ایک اہم کمی کو پورا کرنے کا ثواب حاصل فرمائیں گے۔

خاتمۂ کلام میرا مضمون نامکمل رہ جائے گا اگر میں زکوٰۃ فنڈ کے ساتھ اوقافِ اسلامی کے ذکر سے پہلو تہی کروں۔ ہندوستان میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ایسے اسلامی اوقاف اور خانقاہیں موجود ہیں۔ جن کی سالانہ آمدنی لاکھوں روپے کے قریب ہے اور جس بیدردی سے قوم کا یہ سرمایہ لغویات میں صرف ہوتا ہے اس کا ذکر ہی بدن کے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ اور اکثر اوقات مسلمانانِ ہندوستان کی اس کمزوری پر غور کرنے کے بعد میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہ نکلتے ہیں۔

ارکانِ ملت، بہی خواہانِ قوم، قانون داں حضرات، اور مرکز اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کا فرض اولیٰ ہے کہ وہ انسدادی قوانین کے پاس کرانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں۔ اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس سلسلہ میں ذاتی نفع کو ملی مفاد پر قربان کر دے۔ اور اگر خود غرض طبقہ اس نیک راہ میں حائل ہو جائے تو ہر ممکن ذریعہ سے رکاوٹوں کو دُور کرنے کی سعی عمل میں لائی جائے۔

مختلف اوقافِ اسلامی اور خانقاہوں کا تذکرہ میرے مضمون کی طوالت اور ناظرین کے تضیع اوقات کا موجب ہو سکتا ہے۔

ورنہ اس ضمن میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ میں اسے یہیں ختم کرتا ہوا ملک کی قابل ہستیوں اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے معزز ارکان سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ ان حقائق و واقعات پر غور فرما کر ایک ٹھوس اور جامع پروگرام مرتب کر کے ملتِ اسلامیہ ہندیہ کو اس پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیں گے۔

سید شریف احمد چشتی امرتسری

——→•※••←——

داستانِ رستم و دستاں ز سر بیروں کند　　ہر کہ بیند زورِ بازوئے تو شاہا یک نفس
کیست شاہا جز تو کو کامِ دلِ ما میدہد　　چارۂ درماندگاں ختم است بر ذاتِ تو بس
مضطرم و ز دستِ دردِ دل ز پا افتادہ ام　　دمبدم می نالم اندر دستِ غم ہمچوں جرس
کارِ من بر مشکل و حلّالِ ہر مشکل توئی　　زود تر بہرِ خدا اکنوں بدردِ من برس

عیسیِ دوراں توئی درمانِ دردِ جاں توئی
جاں توئی، جاناں توئی، سلطانِ انس و جاں توئی

(۳)

اے کہ نورِ جاں ز حضرت نورِ دیگر یافتہ　　آفتابے تافتہ جاں نورہا در یافتہ
آبِ مروارید دارد دیدۂ آں بدگہر　　کو دُرِ مہرِ ترا اکثر ز گوہر یافتہ
ہر کہ چشمش وا بامیدِ نگاہِ لطفِ تست　　بادۂ مہرِ ترا بہ ز آبِ کوثر یافتہ
از نگاہِ خاص سلماں را سلیماں کردۂ　　صد گدا از فضلِ عامت تخت و افسر یافتہ
بادشاہانِ جہاں شاہا کمینہ چاکرت　　صد شہے از بندگی ہائے تو قیصر یافتہ
چوں قدم بر داشتہ بہرِ جہاد اندر رہت　　زیرِ راں صد اشترِ فردوس استر یافتہ
پہلوانے چوں عمر را گشتۂ از ضربتے　　جاں نصیر از لطفِ جاں بخشت مکرر یافتہ
تا بدستت ذوالفقار آمد رسولِ حق پرست　　لشکرِ ابلیس را در خوں تپاں سر یافتہ
بہرِ تو صد بار ز حق گفتہ خیر المرسلیں　　صد شرف از منکما روح الامیں دریافتہ

قدسیاں را قوتِ پرواز تا بامِ تو نیست
کیست کو زیب نہ بانش بر زباں نامِ تو نیست

(۴)

اے کہ شانِ تست در رفعت بسانِ مصطفےٰ　　باقی از صُلبِ تو در عالم نشانِ مصطفےٰ
آستیں افشاندہ بر دنیٰ حق اگر روزی تدست　　سائلے را بے تو رہ بر آستانِ مصطفےٰ
نے ہمیں امروز من حرف از ثنایت میزنم　　ہر زماں بود است وصفت بر زبانِ مصطفےٰ
مشتری سیرت زحل رفعت مہِ بہرام رزم　　نیست شاہا جز تو کس بر آسمانِ مصطفےٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؁

(۱)

السلام اے مشرقِ انوارِ ربّ العالمین
ماہ بُرجِ برتری مہرِ سپہرِ داد و دیں

بادشاہِ ملکِ ہستی، ہستیِ عزّ و شرف
عالمِ اسرار، عالم، عالمِ علم و یقیں

مطلب از من کنت مولیٰ مدعا از انّما
مقصد از وحیِ اطیعوا، باعثِ اکمالِ دیں

سرورِ دیں دستگیرِ ما ز پا افتادگاں
عیب پوشِ ما گنہگاراں شفیع المذنبیں

ساقیِ کوثر لوائے الحمد را صاحب لوا
رہنمائے خلق روزِ دیں بفردوسِ بریں

مرجعِ والنجم سلطانِ سریرِ لافتیٰ
فخرِ شاہانِ زماں شاہنشہِ رُوئے زمیں

منجیِ سلماں بدشت ارژنہ از دستِ شیر
شیرِ یزداں شاہِ مرداں نفسِ خیر المرسلیں

دافعِ رنج و البلا شافعِ ہر دو سرا
رافعِ اعلامِ نصرت قامعِ بنیادِ کیں

صاحبِ سرِّ سلونی رازدارِ لوکشف
صدرِ دیوانِ کرامت مصطفیٰ را جانشیں

مظہرِ اسرارِ حکمت مظہرِ صدق و صفا
ماحیِ آثارِ بدعت حامیِ دینِ متیں

موسیِ طورِ تجلی شاہِ ہارون منزلت
عیسیِ گردون رفعت رافعِ اعلامِ دیں

بادشاہِ ہر دو عالم جان و جانانِ رسول
سیّدِ اولادِ آدم زوجِ زہرائے بتول

(۲)

اے کہ گر لطفِ ورت روزی نبودے ہر نفس
روضۂ رضواں شدی بر قدسیاں رشکِ قفس

با جمالِ با کمالت نیست گل را نسبتے
تو گلِ گلزارِ عصمت کو کجا ایں خار و خس

آفتاب از نور رائے رہ روشن تو پرتوے
پیشِ روئے رشکِ ماہت اختران مشتِ قبس

با شکوہت قبۂ نُہ چرخ ہمچوں بیضۂ
نیست عنقا پیشِ قاف شانت الا یک مگس

ہر کرا از خرمنِ جودِ تو روزی شد جوئے
کوہِ زر اندر نگاہش کمتر آید از عدس

نے ہمیں در جانِ برق آتش زدہ شمشیرِ تو
فارسِ گردوں شود آب از برائی یر فرس

(۶)

اے کہ حسنِ جسم و جاں از فیضِ دامانِ شماست
خواہشِ حسن آفریں رمزے ز فرمانِ شماست

پیرِ گردوں روز و شب باصد ادب چوں بندگاں
گوئے مہر و مہ بکف از بہرِ چوگانِ شماست

مطلعِ نورِ امامت شاہ بیتِ عز و جاہ
مقطعِ تطہیر و عصمت خاصہ در شانِ شماست

آنکہ با موسےٰ بطورِ ایمن آمد در سخن
در سخن ہر دم بوصفِ لعلِ خندانِ شماست

کیستم تا من زنم حرف از ثنایت پیشِ کس
صاحبِ جملہ ثنا ہا خود ثنا خوانِ شماست

آنکہ از یکدم بیکدم مردگاں را زندہ کرد
دردمندِ زندہ بر امید در مانِ شماست

آنکہ کیدِ ساحراں را کرد باطل از عصا
از عصا داران قصرِ شوکت و شانِ شماست

آنچہ پیرِ عقل را بر ناز ہا آوردہ است
کمتریں بازیچۂ طفلِ دبستانِ شماست

ہر کہ زد دستے بدامانت شبش گردید روز
مطلعِ صبحِ سعادت ہا گریبانِ شماست

بر ندارم دست خود از دامنت ہرگز شہا
تا ابد دستِ امیدِ من بدامانِ شماست

آں کریمی تو کہ بخشش را صلا چوں دادۂ
ہر گدا را از کرم صد گنجِ قاروں دادۂ

(۷)

آں شہنشاہی کہ می بخشی گدایاں را مدام
افسرِ سلطانی و اکلیلِ شاہی صبح و شام

مظہرِ یوفون بالنذر و یطعمون جز تو کیست
بخشش و ایثارِ نفس و مال شد بر تو تمام

تا ز مہرت پرتوے حاصل کند باصد ادب
مہر از تارِ شعاعی ہر سحر گستردہ دام

طائفانِ کعبۂ کوئے ترا بر ہر قدم
بہرِ استقبال می آید دواں دار السلام

چیست رستم میکند بہرام رم از بیمِ جاں
گر بتقریبی براری خنجرِ کیں از نیام

حسنِ یوسف، علمِ آدم، صبرِ ایوب، آبِ خضر
از کجا بود است اینہا گر نہ بردند از تو وام

میزند صد ناز ہا از فخر در بازارِ قدس
تا خریدی ناقہ از رُوح الامیں در رہ بوام

گر کسے رخسار چوں ماہِ تو بیند صبح دم
چشمِ او چوں مہرِ انور نور باشد تا بشام

شوکت و شانِ سلیمان شاہیِ کسریٰ و جم
بودہ است انموذجے از شوکت و شانت بتام

چوں مکیں سدرہ شد جبریل از رفتار ماند ‏ لامکاں بود است جایت ہمعنانِ مصطفےٰ

ورنہ وادے چوں شہا از رازِ او ادنیٰ خبر ‏ بگذرد بے آنکہ حرفے بر زبانِ مصطفےٰ

چوں بہم آمد بمعنی قوسِ امکاں با وجوب ‏ بود در صورت کمانت باکمانِ مصطفےٰ

مرتضائی مجتبائی مصطفائی مقتدا ‏ ہم جہانِ اصطفائی ہم توجانِ مصطفےٰ

ما من دیگر ندارم جز درت ہرگز شہا ‏ دہ مرا بہرِ خدا جا در امانِ مصطفےٰ

سخت مایوسم ندارم جز تو امید از کسے ‏ رحم کن بر حالِ زارِ من بجانِ مصطفےٰ

کن مرا از دیگراں در دیں و دنیا بے نیاز

اے کہ بخشیدی بسائل مالہا اندر نماز

(۵)

گفت حق بلّغ برایت یا امیرالمومنین ‏ خواند مولیٰ مصطفایت یا امیرالمومنین

در دلِ خلق است جائے حق چنیں میگفتہ اند ‏ در دلِ حق است جایت یا امیرالمومنین

پایۂ قدرت کجا ایں عالمِ امکاں کجا ‏ بر سرِ عرش است پایت یا امیرالمومنین

ارضِ یثرب را بیک مالک تو تسکیں دادۂ ‏ رد نشد ہرگز دعایت یا امیرالمومنین

مہر نفروشد تجلی کز برآید راستیں ‏ ساعدِ بیضا ضیایت یا امیرالمومنین

عقلِ کل از پیرواں بود است چوں بُردند پیش ‏ رایتِ پُر نور رایت یا امیرالمومنین

زندۂ جاوید شد ہر کس کہ بر لب وقتِ مرگ ‏ داشت نامِ جانفزایت یا امیرالمومنین

دل غنی شد از دو عالم ہر فقیرے را کہ دوخت ‏ چشم بر دستِ سخایت یا امیرالمومنین

زالِ دنیا را بہ تیغِ دیں بخوں غلطاندہ است ‏ بازوئے رستم نمایت یا امیرالمومنین

صاحبِ لولاک را نقشے بجز ایجادِ تو ‏ زآفرینش نیست غایت یا امیرالمومنین

شاہدِ میخانۂ املائے جلیں توئی

شاہم پیشوا شاہ خضرِ راہِ دیں توئی

اور دل میں رکھا ہے۔ اور ہمیشہ یہ یقین کیا ہے کہ علم و ادب اور تاریخ و سیر میں یہ انداز نگارش اپنی پوری محبوبانہ رعنائیوں کے ساتھ بے نظیر اور بے مثل ہے۔ خواہ وہ مثنوی لیلےٰ مجنوں کا دیباچہ ہو۔ یا 'علماءِ سلف' اور 'ابوبکر صدیقؓ' کی سیرت پاک۔ یا امام ابن جوزیؒ کی ایک تالیف کا خلاصہ مندرجہ معارف موصوف نے 'شیخ علی حزیں' پر جو کچھ لکھا ہے وہ نظر سے نہیں گزرا باقی قریباً تمام مطبوعات سے استفادہ کر چکا ہوں۔ 'علماءِ سلف' میں موصوف نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ایک بزرگ ایک عالم کے علم و حافظہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ کہا آپ اپنی زبان نکالئے جب اُنھوں نے زبان نکالی تو بزرگ موصوف نے اُنکی زبان کا بوسہ لے لیا۔"

میں بھی اس کتاب سے اس قدر متاثر تھا کہ اگر میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تو اُن کی اُنگلیوں کو ضرور بوسہ دیتا۔ اُس وقت خیال آیا تھا کہ تاثرات لکھدوں مگر "حیدرآباد کے صدیار جنگ بہادر" کو مخاطب کرنا اپنی نگاہوں میں خود نہیں جچا اس لئے خاموش رہا۔ اور اب بھی بے اختیار پُرانی بات یہ سطور لکھتے ہوئے قلم سے نکل گئی۔ صاحب مقالہ نے موصوف کے "بابر بادشاہ" والے مضمون کے متعلق لکھا ہے کہ رسالہ "حسن امرت سر" میں شائع ہوا تھا۔ میرے خیال میں "امرت سر" کی جگہ "حیدرآباد" ہونا چاہئے تھا۔ میں نے امرت سر کے "حسن" کا نام کبھی نہیں سُنا۔ البتہ حیدرآباد کے "حسن" کے چالیس سال ہوتے ہیں کہ ایک رئیس کی لائبریری میں چند نمبر نظر سے گزرے تھے۔ نواب عماد الملک مرحوم اس کے مدیر تھے اور اُسی میں یہ مضمون شائع ہوا تھا۔ نامہ نگاروں کو اچھے مضامین پر ایک اشرفی انعام دیا جایا کرتا تھا۔ خیر یہ ایک تسامح ہے مگر اس کی اصلاح ہو جائے تو اچھا ہے۔ "تذکرۂ بابر" مطبوعہ حیدرآباد میرے کتاب خانہ میں ہے۔ اس میں بھی تصریح موجود ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ آپ کو مولانائے ممدوح کی خدمت میں نیاز حاصل ہے اگر اب حاضری ہو تو عرض کیجئے کہ آپ کے علمی کمالات کے شیدا طول و عرض ہند میں بہت سے ہیں۔ اُن کی غائبانہ محبتوں کی قدر دانی یہی ہو سکتی ہے کہ آپ کے تمام مقالات جنھوں نے اب تک کتابی صورت اختیار نہیں کی اُنھیں مرتب کر کے شائع کر دیا جائے۔ کیونکہ آپ کے قلم کا ہر ہر لفظ ہمارے علم و ادب میں ایک خاص درجۂ امتیاز کا مالک ہے۔ ستم ہوگا کہ ان شاہ پاروں کو رسالوں کے اخباروں میں محجوب دستور رکھ کر گمنام ہو جلنے دیا جائے۔ یا ان کی افادیت سے دنیا کو محروم رکھا جائے۔

تاب دردو غم ندارد بیش ازیں زخمی جگر　　زود تر مے کن بحالش اے شہ والا مقام
تا بکے ایں دردِ غربت تا کجے ایں رنج سفر　　دربدر تا چند گریاں سینہ دل خوں را بکام

بر تو شاہا صد سلام و بر تو شاہا صد درود
زخمیِ غمدیدہ را بہر خدا دریاب زود

بتاریخ غرہ رمضان المبارک ۱۲۵۴ ہجری ہفت بند تصنیف منشی الملوک فخر الدولہ دبیر الملک راجہ رتن سنگھ بہادر ہشیار جنگ متخلص بہ زخمی ، بخط فدوی عقیدت نہاد اندرجیت سمت...... تحریر پذیرفت۔

بزمِ مصنّف

مولوی مہر محمد خانصاحب شہاب مالیرکوٹلوی بمبئی

اس وقت جنوری ۴۹ء کا "مصنف" میرے سامنے ہے۔ جس میں مضمون بعنوان "نواب صدر یار جنگ بہادر" (از مولوی عبدالشاہد خانصاحب) میں نے پڑھا اور اسی کو پڑھ کر یہ چند سطور لکھنے کی جرأت کرتا ہوں۔ اول اس لئے کہ اس مضمون میں مولانا شروانی دام ظلہٗ موضوع سخن ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ اس میں "شروانیوں" کی اصل و نسل سے متعلق ضمنی بحث آگئی ہے۔ تیسرے اسی مضمون کے ذیل میں شروانیانِ مالیرکوٹلہ کا ذکر آگیا ہے اور راقم الحروف اس خاندان کا ایک ادنیٰ فرد ہے۔

اوّل مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کی ذات گرامی۔ ع

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا

کو یقین کیجئے کم و بیش ۲۵ برس سے مولانائے موصوف کا نام زبان پر ہے اور رشحاتِ قلم سے مستفید ہو رہا ہوں۔ یقین کیجئے کہ آپ کے قلم کا ایک ایک لفظ عقیدت و شوق اور والہیت کی نگاہوں سے پڑھا

سے اس جگہ وارد ہوئے تھے جو اب "مالیر کوٹلہ" کے نام سے موسوم ہے۔ حضرت موصوف نہ کسی دربار سے متوسل و متمسک تھے نہ کشور کشائی اور شمشیر زنی ان کا پیشہ تھا۔ وہ ایک عالم باطن اور صوفی صافی اور درویش باخدا تھے۔ اور ان کا یہاں آنا تسخیر قلوب انسانی کے لئے اپنے مرشد کے حکم سے ہوا تھا۔ آپ کا ذکر اب تک ہر کہہ و مہ کی زبان پر "حضرت شیخ" کے نام سے جاری و ساری ہے۔ آپ لودھیوں کے زمانہ میں یہاں آئے تھے اور خاندانی روایت یہ ہے کہ حضرت سلطان بہلول لودھی نے ایک اپنی دختر نیک بنام حضرت "تاج مرصع" کو "حضرت شیخ" کی زوجیت میں دے دیا تھا۔ اور سلطان موصوف نے اپنی بیٹی کو ایک بہت بڑا علاقہ بھی دیا تھا جو اب ریاست مالیر کوٹلہ کہلاتا ہے۔ اور جس میں سے بہت کچھ مرور ایام سے ریاست پٹیالہ میں شامل ہو گیا ہے۔ ہز ہائی نس نواب صاحب مالیر کوٹلہ بالقابہ رئیس باتمکین اور خاندان کے دوسرے لوگ جاگیر دار کہلاتے ہیں۔ اور ان کی جاگیریں اب تک ابًا عن جدٍ وہی عطیہ سلطان بہلول ہیں جو تقسیم ہوتی ہوئی چلی آ رہی ہیں۔ کسی کے پاس کم کسی کے پاس زیادہ۔

میں آجکل سلطان سکندر لودھی کے متعلق ایک قدیم تاریخ کو اردو میں منتقل کر رہا ہوں۔ اگر خدا نے توفیق دی مالیر کوٹلہ کی تاریخ بھی لکھوں گا۔ مالیر کوٹلہ کی تاریخ بعض کتب میں ملتی ہے۔ ریاست بھی لکھوا رہی ہے۔ میں نے اگر کچھ لکھا تو وہ آزادانہ علمی بناؤں پر لکھا جائے گا۔ وباللہ التوفیق۔ میری وطن سے دوری نے آج تک مجھے موقع نہیں دیا کہ وطن میں بیٹھوں اور کام کروں لیکن جب بھی توفیقِ الٰہی شاملِ حال ہوئی۔ کام کروں گا۔ اگرچہ اسی انتظار میں وہ بزرگ اٹھتے چلے جا رہے ہیں جن سے مجھے اس کام میں علمی مدد مل سکتی تھی اور جو اپنی مختلف خصوصیات کی بناء پر مالیر کوٹلہ کی زندہ تاریخ تھے۔ مثلاً خود میرے نانا حضرت قادر بخش خاں صاحب مرحوم اور میرے بڑے چچا خاں صاحب محمد غیرت علی خاں صاحب مرحوم جاگیر دارانِ مالیر کوٹلہ دونوں بزرگوں نے بڑی اور بہت بڑی عمر پائی۔ اور دونوں تاریخ خاندانی کے حافظ تھے۔ لیکن پھر بھی اگر کام شروع کیا جائے تو خدا کے فضل سے تکمیل ناممکن نہیں۔

طول کلام کی معافی چاہتا ہوں۔ غلطی ہو گئی ہو تو اصلاح کا طالب ہوں۔ اور امیدوار ہوں کہ اگر مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی زاد مجدہٗ سے ملاقات ہو تو اس گمنام کا سلام و شوق و عقیدہ پیش کر دیجئے اور اگر تکلف نہ ہو تو دریافت کیجئے کہ مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہٗ کی ایک کتاب یا ان کے ایک مجموعۂ مکاتیب کا ذکر بعنوان "غبار خاطر" اردو انگریزی اخبارات میں آ رہا ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ وہ

علی گڑھ کی پچاسش سالہ جوبلی کے موقع پر دو بار زیارت ہوئی تھی ایک تو کانفرنس کے اجلاس
میں جب نواب سر عبدالقیوم سرحدی مرحوم صدارت فرما رہے تھے، دوسرے ایک مشاعرہ میں جہاں
اصغر مرحوم کی غزل پڑھی گئی تھی۔ اصغر بیچ میں تھے۔ ایک طرف مولانا تشریف فرما تھے۔ اور میں اور شاد
دل گیر اکبر آبادی مرحوم پاس پاس ہی ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ بات چیت کی نوبت نہیں آئی تھی۔ دعا ہے
کہ اللہ تعالےٰ ممدوح و مخدوم کو ہمیشہ اور ہر جگہ اپنے فضل ولطف کے زیر سایہ شاد کام و بامراد رکھے۔

اب لفظِ شروانی اور خاندانِ شروانی کی بحث کی طرف آئیے۔ مجھے اس خبر سے بہت خوشی ہوئی
جناب مولوی محمد عباس خاں صاحب نے "تاریخ خاندانِ شروانی" لکھی ہے۔ بے تابی سے انتظار ہے کہ
وہ شائع ہو اور ہم لوگ اس سے مستفید ہوں۔

آپ کا یہ لکھنا کہ ہم لوگ طالوتی نسل سے ہیں مسلّم۔ کم از کم زیادہ بحث طلب نہیں۔ لیکن "قیس بن
عیص" کا آنحضرت کی حیاتِ طیبہ میں مدینۂ منورہ میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہونا اور ان کا اسلامی نام
عبدالرشید رکھا جانا اور ان سے حضرت سیف اللہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی کسی صاحبزادی کا منسوب
ہو جانا امکانات کے باوجود تاریخی اور علمی حیثیت سے محل توقف اور مقام غور وفکر اور تلاش وتحقیق ہے۔
کم از کم "قیس بن عیص" دونوں ناموں میں سے کوئی ایک نام بھی ایسا نہیں جسے بدل کر دوسرا نام تجویز
کیا جائے۔ دونوں نام عربی نام ہیں "قیس عامری" کو کون نہیں جانتا اور "عیص" عربی نام ہونے کے
علاوہ حضرت اسحاقؑ کے ایک فرزند کا نام تھا جو افغانوں یا شروانیوں کے نسلاً طالوتی یا اسرائیلی ہونے
پر اشارۂ خفی تو ہو سکتا ہے لیکن ایسا نام نہیں ہو سکتا جس کو مذہبی لحاظ سے یا لسانی لحاظ سے بدلنے کی
ضرورت لاحق ہوئی ہو۔ ابتدائی تاریخ اسلام میں متعدد غیر عرب بزرگوں کے نام محفوظ ہیں۔ ضرورت ہے کہ
عبدالرشید کا تذکرہ بھی کہیں سے نکالا جائے۔ مقصد یہ ہے کہ "حیاتِ افغانی" کا بیان ابھی اور محتاج
تحقیق وتفتیش ہے۔ آخری فیصلہ نہیں۔

دورانِ مقالہ میں ہے کہ "کچھ لوگ پنجاب چلے گئے۔ ریاست مالیر کوٹلہ کے فرمانروا شروانی ہی ہیں۔"
(مصنف صـ۹۶) اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً مالیر کوٹلہ کے شروانی یو۔پی سے مالیر کوٹلہ گئے ہیں۔ اگر میں
اس عبارت کو صحیح سمجھا ہوں تو میرے نزدیک اس خیال میں کسی قدر غلطی ہے۔ ہمارا خاندان یو۔پی سے
پنجاب نہیں گیا۔ بلکہ مالیر کوٹلہ کے شروانیوں کے جد امجد حضرت صدرالدین صدر جہاں "دریابن" وغیرہ علاقہ

مسلم پیرونیٹس آف انڈیا" پر اُن کے قلم سے ایک مفصل کتاب کی توقع بے جا نہ ہوگی۔ غالباً یہ "ادبی تخلیق" آپ کے لئے بھی بہت کچھ باعث سکون ہوگی۔

سر سید لیاقت علی صاحب مشیر المہام بھوپال — مصنف کا جنوری نمبر موصول ہوا۔ فی الحقیقت اس رسالہ کی کامیابی آپ ہی کی کوشش اور ہمت کا نتیجہ ہے اور کے اعتراف میں میں ایک چھوٹی سی رقم کا چک ہمسلک ہذا ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اس کو قبول کر کے مصنف فنڈ میں داخل کر دیں گے۔

شیخ ممتاز حسین صاحب جونپوری جوائنٹ سکریٹری آل انڈیا شیعہ پولیٹیکل کانفرنس لکھنؤ — لکھنؤ سے ایک روزانہ اخبار جاری کرنے کی تجویز کا علم ہوا۔ آج کل یہاں مسلم لیگ کے اخبار تنویر اور کانگریس کے اخبار قومی آواز کی کثیر اشاعت اور گرا گرمی کی وجہ سے کاتب تیس ۳۰ روپے تنخواہ والے اسی ۸۰ اور نوے ۹۰ پر بھی نہیں ملتے۔ مشین مین وغیرہ کی بھی یہی حالت ہے۔ اخبار کے لئے سرفراز پریس میں طباعت کا بہترین انتظام ہو سکتا ہے۔ لیکن اس وقت کسی نئے پرچہ کے نکالنے میں طرح طرح کی دشواریاں ہوں گی۔ سرفراز ۲۵ سال کا پرانا اخبار ہے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ کاتب نہ ہونے کی وجہ سے اپنے بوڑھے لرزاں ہاتھوں سے پرچہ کا بڑا حصہ مجھے خود کتابت کر کے تمام کرنا پڑا۔ لکھنؤ دوسرے جنگل کی طرح طرح بہت خوشنما نظر آتا ہے لیکن یہ جگہ مسلمانوں کی اقتصادی پستی کی وجہ سے مرکز نقائص ہے۔ میں تو ہر حالت میں بندۂ بے دام ہوں اور اس قدر کثیر المشاغل کہ لوگوں کا خیال ہے کہ یہی حال رہا تو جلد زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مگر نہیں معلوم کیا ہے کہ موت کو فریب دے کر جی رہا ہوں۔ تمام اداروں کا کوئی نہ کوئی عہدہ اور کام سپرد۔ پھر احباب کی خدمت۔ کسی کو کبھی دردِ سر ہو جاتا ہوگا مجھے ہر روز۔

میں اور مولوی طفیل احمد صاحب۔ میر ولایت حسین صاحب اور خان بہادر حبیب اللہ خاں صاحب بالکل سر سید مرحوم کی طرح ہمدرد مسلمان ہیں۔ عقائد کچھ ہوں مگر مسلمانوں کے فائدہ کے لئے کھلے دل سے مددگار ہیں۔ میں نے جہاں تک جانچا آپ کے دل میں بھی یہی جذبہ ہے اور اسی لئے میں آپ کی بڑی قدر کرتا ہوں لیکن ابھی لکھنؤ کا قصد نہ کیجئے۔ شاید بعض ظاہری آسائشوں کی وجہ سے آپ نے لکھنؤ کے متعلق رائے قائم کر لی۔ میں تو خود ارادہ کر رہا ہوں کہ لکھنؤ کو چھوڑ کر کہیں اور پنشن کا زمانہ بسر کروں۔ مگر اب تک

مکاتیب اُس مخدوم ہی کے نام ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے؟ کیا وہ شائع ہونے والے ہیں؟ ۔ کب؟

قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی

ولی کے سلسلہ میں ہمارے ایک پنجابی دوست پروفیسر عبداللہ ٹوار گجرات کالج احمد آباد نے اپنے خط میں مقالہ کی بعض ضمنی اور جزئی باتوں پر اعتراضات کئے ہیں جن میں سے دو ایک کے سوا باقی زیادہ اہم نہیں ہیں تاہم میرا خیال ہے کہ میں اسی مقالہ پر ایک استدراک لکھ کر بھیجوں جس میں ان اعتراضات کا جواب بھی ہو جائے اور جو غلطیاں رہ گئی ہیں اُن کی تصحیح بھی ہو جائے۔ ساتھ ہی بعض امور کی تشریح بھی۔

علی گڑھ کی سبحان اللہ خاں لائبریری میں ولی کا قلمی دیوان موجود ہے ذرا وہ دیکھ کر مجھے بتائیے کہ اُس میں کتنی غزلیں ہیں۔

۲۔ کس سنہ کا لکھا ہوا ہے اور کاتب کون ہے۔

۳۔ کتاب کے آگے پیچھے کوئی عبارت لکھی ہوئی ہے یا نہیں۔

۴۔ مصنف کا نام سرورق پر یا آخر میں دیا ہے۔ یا نہیں۔

۵۔ خط اور کاغذ کیسے ہیں۔

بہت عرصہ سے میری خواہش ہے کہ اضمحلال طبع دور کرنے اور طبیعت کا رنگ بدلنے کے لئے چند روز کو یہاں چلے آئیے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہاں کے مناظر خصوصاً دیہاتی زندگی سے آپ کا دل ضرور بہل جائے گا۔

معنف مل گیا۔ ایڈیٹوریل تو پورا کانفرنس کی روداد کی نظر ہو گیا ہے۔ آپ نے "بزم معنف" کو "فکر فردا" سے علیحدہ کر دیا۔ یہ بہت اچھا کیا۔ لیکن میں اس تقدیم و تاخیر کو پسند نہیں کرتا۔ نواب صدر یار جنگ بہادر قبلہ پر بہت مفصل مقالہ چھپا ہے۔ اس کے باوجود حضرت موصوف کی ادبی حیثیت پر سیر حاصل روشنی نہیں ڈالی گئی۔ اور اس لحاظ سے وہ بہت تشنہ ہے۔ اُن کی انشاپردازی تنہا اظہار خیال چاہتی ہے۔ میں اُن کو اُردو کے اساتین میں سے سمجھتا ہوں اور طرز انشاء کے لحاظ سے "آزاد ثانی" اور "آزاد ثانی" کو اُن کے بعد۔

بہن آنسہ فاطمہ کا مقالہ "حضرت محل" پر جہاں اپنے مخصوص طرز بیان کے لحاظ سے "خلاصہ کی چیز" ہے۔ وہاں تاریخی تحقیق و جستجو کا بہترین نمونہ ہے کسے مبارکباد دوں؟ اُن کو۔ یا آپ کو؟ کم سے کم

تبصرے
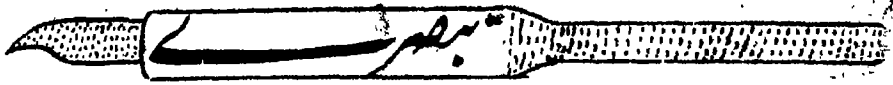
(از سید انیس فاطمہ بریلوی)

پیش نظر کتاب حضرت نکہت شاہجہاں پوری کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں مصنف کا ایک پر از معلومات مفصل مقدمہ بھی شامل ہے۔ کسی قوم کی اقتصادی۔ اخلاقی۔ معاشرتی اور سیاسی حالت کا اندازہ کرنا چاہو تو اس کے لٹریچر کو دیکھو اس میں نظم و نثر کی تخصیص ضروری نہیں ہے۔

ادیب اور شاعر دونوں ہی مل کر ملک و ملت کے اچھے یا برے جذبات کی ترجمانی کا فرض ادا کرتے ہیں۔ کشمکش حیات کی وہ کٹھن منزلیں جن میں سے عوام گزرتے ہیں۔ ان سے دونوں ہی متاثر ہوتے ہیں۔ شاعر اپنے جذبات و حسیات کو نظم کرتا ہے۔ ادیب انھیں افکار و آرا کو بحور و قوافی کی قید و بند کے بغیر قلمبند کرتا ہے۔ غرضکہ گرد و پیش کے حالات و واقعات کا دونوں پر یکساں اثر ہوتا ہے۔ ہماری شاعری پر ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جبکہ وہ فرصت میں دل بہلانے کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ لیکن۔ ع

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

اب ہم مجبور ہیں کہ اپنے درمیان بجائے ایک فنافی الشہرت الست شاعر کے ایک حکیم و فن کار شاعر کو دیکھیں جو اپنے نغموں سے نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑ کر جگا دے۔ جس کی ایک صدا پوری قوم میں زندگی کی لہر دوڑ جائے اور یہ اجڑا ہوا اور خزاں رسیدہ دیار از سر نو سر سبز ہو کر "چمن زار" میں تبدیل ہو جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب ہماری قوم کے نوجوانوں میں ایک طبقہ ایسے شاعروں کا پیدا ہو گیا ہے اور انھیں میں نکہت صاحب کا بھی شمار ہے۔ جن کا دکھا دل قوم کی زبوں حالی پر ہر لمحہ نالہ خواں نظر آتا ہے۔ خواہ وہ "جوہو" کا کنارہ ہو۔ یا شاہجہاں پور کی بے کیف سرزمین مثلاً ان کی ایک نظم کا عنوان ہے "ساحل جوہو پر" ؎

حیف وہ شیرازہ ملت کے جو یکجا نہ ہو — تیری ہر موج طرب زنجیر در زنجیر ہے
ہائے اپنی غلامی اور تیری حریت — پاؤں میں بیڑی گلے میں طوق اور زنجیر ہے

موقع مل رہا ہے چھوٹیے! کہاں سے آپ نے یہ آرزو پیدا کی۔؟

مولوی سید احمد علی صاحب جبل پور — آسام کے سفر سے واپس آگیا ہوں۔ وہاں میں نے حق صاحب بی۔ اے کو "معنف" دیا تھا۔ موصوف نہایت قابل ہستی ہیں اور آسام میں سب سے پہلے جو مسلمان داخل ہوئے ہیں اُن کے خاندان سے ہیں۔ سر سید سعد اللہ صاحب وزیر عظم کے ماموں ہیں۔ خود بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ہیں۔ اور عربی۔ فارسی کے عالم ہیں۔ صاحب موصوف نے قرآن شریف کا آسامی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور وہاں کے مسلمانوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک رسالہ فلسفۂ زندگی لکھی ہے۔ چونکہ اُردو کم جانتے ہیں اس لئے انگریزی میں لکھی ہے۔ اُن کی خواہش ہے کہ اس کا ترجمہ اُردو زبان میں ہو جائے اور تمام مسلمانانِ ہند میں تقسیم کیا جائے۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا ہے کہ میں جناب کے ذریعہ کوشش کروں گا۔ حق صاحب نے میری خواہش پر آسام میں مسلمانوں کے خاندانوں کی مفصل تاریخ انگریزی میں لکھ کر مجھ کو دی تھی جو میں نے اپنے لڑکے کی بیگم کو جو بی۔ اے بی۔ ٹی ہیں۔ (بنت خواجہ لطیف احمد صاحب مرحوم) دی ہے جس کا اُنھوں نے اُردو میں ترجمہ کیا ہے میں اصل انگریزی کا مضمون اور اُس کا ترجمہ آپ کی خدمت میں روانہ کروں گا۔ اگر پسند ہو تو اُس کو معنف میں شائع کر دیجئے گا۔

مولانا الیاس حسین صاحب خیرآباد — میں نے رسالہ معنف غور سے پڑھا۔ اس کا اسلوب تحریر و طرز ترتیب بہت خوب اور مضامین اپنے اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت موزوں و دلچسپ ہیں اور لائق تحسین و آفریں۔ اگر یہ رسالہ اسی طرح پابندی اور انواع و اقسام کے چیدہ مضامین سے شائع ہوتا رہا تو ادب اردو کی ایک بڑی کمی پوری ہوتی رہے گی۔ اور ناظرین کی معلومات میں کافی اضافہ ہوتا رہے گا۔ موجودہ زمانہ میں ایسے رسالہ کی بہت ضرورت تھی اگر یہ رسالہ جاری رہا تو بہت سے ایسے بزرگوں کے حالات سے لوگ واقف ہوتے رہیں گے جن کے سوانح حیات پر گم نامی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اور اُن کے کمالات و کرامات سے لوگ بالکل ناواقف ہیں۔ خدا کرے اسکی دن دونی رات چوگنی ترقی ہو اور اس مجلس علمی کی کوششیں بار آور ہوں۔ ع

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

ایک فہرست مؤلفین و مصنفین سیتاپور و خیرآباد کی مختصر حالات کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ میں نے بڑا وقت صرف کر کے بڑی کوشش و جستجو سے اِسے مرتب کیا ہے۔

۳) نشری تقاریر:۔ سنہ مولوی عبدالرحمٰن خانصاحب سابق پرنسپل جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔
۴) جنگ شرق و خاتمہ جاپان:۔ مؤلفہ محمد اسحاق صاحب وزبیدہ مستم صاحبہ حیدرآباد دکن۔

مارکسزم اور مسئلہ قومیت:۔ مصنفہ اسٹالین۔ و
مترجمہ ل۔ احمد صاحب اکبرآبادی۔ شائع کردہ قومی دارالاشاعت بمبئی ۴

ہندوستان ورڈوما کے انوکھے قصے:۔ مؤلفہ
امجد علی صاحب حیدرآباد دکن

تقویۃ الایمان:۔ مؤلفہ حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہید صاحب رحمۃ اللہ علیہ
شائع کردہ اقبال اکیڈمی لاہور

جواہرلال کی کہانی:۔ مولوی حافظ محمد رحیم صاحب دہلوی۔ پبلشر
نیا کتاب گھر۔ اردو بازار دہلی

صحت و تندرستی:۔ مرتبہ مولانا سید طفیل احمد صاحب مرحوم۔
ناشر نظامی پریس بدایوں

مسلمانوں کا روشن مستقبل:۔ (پانچواں ایڈیشن)
مؤلفہ مولانا سید طفیل احمد صاحب مرحوم۔ ناشر عزیزیہ کتب خانہ دہلی

جواب تبصرہ:۔ از شمس العلماء پروفیسر عبدالغنی صاحب
ناشر حکیم محمد عبدالباقی صاحب ندوی۔ آسی پریس۔ محمود نگر۔ لکھنؤ

رہ گئے۔ ضرورت ہے کہ ان کو علیحدہ کر لکھا جائے۔ بحیثیت مجموعی کتاب پڑھنے کے قابل ہے ۲۰۹ صفحات کتابت و طباعت وغیرہ دیدہ زیب ہے۔

البلاغ المبین مصنفہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا فارسی سے اردو میں ترجمہ مولانا محمد علی مظفری صاحب نے کیا ہے۔ زبان سلیس اور صاف ہے۔ شاہ صاحب کے نام سے یہ کتاب پہلی مرتبہ سامنے آئی ہے۔ اصلاح عقائد پر لاجواب کتاب ہے۔ کفر و شرک اور بدعات و مشرکانہ رسوم کی مذمت اور صحیح توحید کی تعلیم کی جانب مسلمانوں کو مصنف علام نے متوجہ کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے انسان توہمات کی تاریکیوں سے نکل کر سچا موحد بن جاتا ہے۔ اندازِ تحریر مدلل ہے۔ قرآن و حدیث اور آثار صحابہ و تابعین کے علاوہ اکابر اہلِ طریقت کی تعلیمات سے بھی جگہ جگہ کام لیا گیا ہے۔ اپنی نوعیت کی بہترین تالیف ہے۔ اس کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ ادارۂ اشاعتِ اسلامیات حیدرآباد دکن سے ۱۲؍ قیمت پر مل سکتی ہے۔ سیدہ انیس فاطمہ

رسید کتب موصولہ برائے ریویو:۔

مطبوعاتِ ادارۂ اشاعتِ اسلامیات حیدرآباد دکن

(۱) قرآن اور سیرت سازی:۔ از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔

(۲) اسلامی تقاریب:۔ از مولوی غلام دستگیر صاحب رشید ایم۔ اے پروفیسر نظام کالج حیدرآباد دکن۔

(۳) تعلیم قرآن:۔ از 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

(۴) رہنمائے قرآن:۔ از نواب سر نظامت جنگ بہادر مترجمہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔

مطبوعاتِ ادارۂ نشریاتِ اردو

(۱) روحِ حیات:۔ از جناب اختر قریشی صاحب۔

(۲) رموزِ اقبال:۔ از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبۂ فلسفہ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔

"سب سے زیادہ شعریت اُس بیت میں ہوتی ہے، جس کو سنتے ہی انسان کہہ دے کہ سچ کہا ہے"

مخدوم کے کچھ شعر سنئے اور غور فرمائیے کہ اُس نے سچ کہا ہے یا نہیں ہے؎

جہل، فاقہ، بھیک، بیماری، نجاست کا مکاں — زندگانی، تازگی، عقل و فراست کا مساں
وہم زائیدہ خداؤں کا، روایت کا غلام — پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام
جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے اُس "مشرق" کو دیکھ — کھیلتی ہے سانس سینے میں مریضِ دق کو دیکھ
ایک ننگی لاش بے گور و کفن، ٹھٹھری ہوئی — مغربی جینوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوئی
ایک قبرستان جس میں ہول نہ ہاں کچھ بھی نہیں — اک بھٹکتی روح ہے، جس کا مکاں کوئی نہیں

شعرا کے تذکرہ میں مخدوم کا ذکر پہلے اور اُس کے ان پانچ شعروں کا انتخاب ہم نے یوں کیا ہے کہ پڑھنے والا اس "تلخی" یا سچی بات کو محسوس کرلے اور جان لے کہ مخدوم کی انقلابی روح اس "غلام آباد" میں اپنے لئے کوئی جگہ نہیں پاتی۔ وہ ایک چونچیلی چڑیا کی طرح ہر اُس ہاتھ پر ٹھونگیں مارتی ہے جو اُسے پکڑنے کے لئے آگے بڑھتا ہے اب چاہے اِس کا نتیجہ اُس کی موت ہی کی شکل میں کیوں نہ نکلے؟

مخدوم کی ایک نظم "انتظار" کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں ؎

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے — سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
خوش تھے ہم اپنی تمناؤں کا خواب آئے گا — اپنا ارماں بر افگندہ نقاب آئے گا
نظریں نیچی کئے شرمائے ہوئے آئے گا — کاکلیں چہرے پہ بکھرائے ہوئے آئے گا
آ گئی تھی دلِ مضطر میں شکیبائی سی — بج رہی تھی میرے غم خانہ میں شہنائی سی
پتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آ ہی گئے — سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے
شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی — آپ کے آنے کی اک آس تھی اب جانے لگی
صبح نے سیج سے اُٹھتے ہوئے لی انگڑائی — او صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی
میرے محبوب مری نیند اُڑانے والے — میرے مسجود مری روح پہ چھانے والے
آ بھی جا تاکہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے — آ بھی جا تا ترے قدموں پہ مری جاں نکلے

مخدوم کی زندگی میں کبھی کبھی "یوں بھی ہوتا ہے" لیکن انتظار کے لذت آگیں درد سے تڑپ کر وہ آہستہ آہستہ کہنا شروع کرتا ہے: ؎

نہ رو ہمنشیں یہ جہاں اور ہی ہے — یہاں کی رہِ امتحاں اور ہی ہے

جو ۶۶۸ھ میں ابو دبوس کے خاتمہ پر جس نے صرف ۳ سال حکمرانی کی۔ ختم ہو گئی۔ فی الحقیقت عبدالمومن کے بعد صرف ۲۵ سال ایسے گزرے کہ جو مراکو، اندلس، اور مغرب کی فلاح و صلاح کے تھے۔ اس کے بعد ۹۰ سال کا زمانہ آپس کے قتل و خون ہی میں گزرا۔ کبھی بھتیجے نے چچا کو مارا تو کبھی چچا نے بھتیجے کو۔ کبھی بھائی نے بھائی کو مارا۔ تو کبھی دادا نے پوتے کو، اور پوتے نے دادا کو۔ اس قسم کی حکمرانی جو انفرادی قتل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ملک کی فلاح و صلاح کی ضامن نہیں ہو سکتی ہے۔ بلکہ اس کے برعکس اس کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے اور عیاشی اپنا گھر کر لیتی ہے۔ یہ کوئی حیرت انگیز حقیقت نہیں ہے کہ ان حالات میں عیاشی عمر کی قید سے بھی مستثنیٰ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یوسف بن محمد الملقب بہ مستنصر باللہ نے اپنا ۱۰ سالہ عہد حکومت صرف عیاشی ہی میں گزارا اور اس جہان سے ۶۲۰ھ میں وہ لاولد چل بسا۔ اس کے بعد اس کا دادا (یعنی اس کے باپ ابو عبداللہ محمد ناصر کا چچا) عبدالواحد بن یوسف مستضئ باللہ کو بڑھاپے میں جانشین کیا گیا۔ لیکن اس نے بقول ابوالفداء[۵۱]

"عیش و عشرت اور کھانے پینے ہی میں وقت گزارا۔"

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ گروں نے نو ہی مہینے کے بعد اس کو معزول کر کے قتل کر دیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے سات حکمران اور تخت نشین ہوئے۔ جنہوں نے اپنی حکومت کے باقی ماندہ ۴۰ سال پورے کر کے مہدی یادگاری حکومت کا خاتمہ کیا۔

تونس اور ابوحفص

موحدین نے مراکش وغیرہ فتح کرنے کے بعد چونکہ اپنا پایہ تخت تونس نہیں رکھا تھا۔ اس لئے تونس پر ابو عبداللہ محمد ناصر بن یعقوب موحدین کے چوتھے حکمران نے ۶۰۳ھ میں ابن تومرت مہدی کے ایک دوسرے مرید خاص ابوحفص کے بیٹے عبدالواحد کو اپنی طرف سے نائب مقرر کر دیا تھا۔ جس نے ۱۵ سال نیابت کی۔ اس کے مرنے کے بعد مستنصر باللہ مومنی ابو عبداللہ محمد ناصر کے بیٹے نے اپنے عہد حکومت میں اپنے چچا ابوالعلاء الملقب بہ مامون کو وہاں کا نواب مقرر کر دیا۔ لیکن مامون کے مرنے کے بعد پھر وہاں کی نیابت یا حکومت ابوحفصیوں کے حصے میں آئی۔ اور عبدالواحد بن ابوحفص کا بیٹا عبداللہ وہاں کا حکمران ہوا۔ لیکن کم و بیش ۳۰ سال کی حکمرانی کے بعد ۶۶۲ھ میں تونس کے لوگوں نے بغاوت کر کے عبداللہ کو قتل کر دیا۔ اور اس کے بجائے اس کے بھائی ابوزکریا کو حکمران کر دیا۔ یہ بات موحدین کے گیارھویں حکمران مرتضیٰ باللہ کو سخت ناگوار ہوئی۔ اس لئے بحیثیت اقتدار اعلیٰ اس نے ابوزکریا سے

---

[۵۱] تاریخ ابوالفداء۔ جلد سوم۔ صفحہ ۱۴۳۔

"کٹور لگا مارہ" تھا۔ یہی لوگ ایشیائے کوچک اور عراق میں سب سے اوّل گھوڑے لے گ
وہ تیر و کمان استعمال کرتے تھے اور کمہار کے چاک پر مٹی کے برتن بناتے تھے۔ "حفریات
یعنی زمین کھودنے کے علم سے اُن کے قدیم تمدّن کے حالات کا اب پتہ چلا ہے جہاں اور
کے بڑے بڑے محلوں کی عمارتیں اور ستھری بدرروئیں نکلی ہیں۔ وہ سولھویں صدی
قبل مسیح میں سونے کی تلاش میں ہندوستان آئے تھے اور ہندوستان سے ان کے تعلق
تھے۔ غالباً اسی وجہ سے اُن کے دیوتا ہندوؤں کے دیوتاؤں سے ملتے جلتے تھے۔ چنانچہ
سوسا کے کھنڈروں میں ایک ستون نکلا ہے جس کے اوپر بیل کے دو بڑے بڑے سر بنے
ہیں۔ یہ لوگ سورج کی بھی پوجا کرتے تھے۔ تیرھویں صدی قبل مسیح میں ان کی قوت
اس قدر زیادہ تھی کہ اُن کے بادشاہ (Sutruk Nakh Khointe
"سترک نکھ کھنٹے" نے شہر بابل کو برباد کر دیا۔ اور شاہ حمورابی کے قانون کی پتھر کی
سِل دہاں سے اکھاڑ لایا۔ بالآخر بابل کے بادشاہ شرغون ثانی نے ساتویں صدی
قبل مسیح میں ان کے شہر سوسا کو مسمار کر دیا اور تب سے ایران کے دوسرے صوبہ
'میدیا' کا عروج ہوا۔

میدیا کا صوبہ ایران کے شمال میں ہے۔ اس کا پایۂ تخت "اکبتانہ" تھا۔ جو اب ہمدان کہلاتا
ہے۔ جدید تحقیقات کی رو سے یہ لوگ سیتھین (Scythian) قرار دئے گئے ہیں۔
میدیا کا صوبہ ۵۲۰ سال تک حکومت بابل کے تحت میں رہنے کے بعد ۷۰۸ ق۔م
میں آزاد ہوا۔ آزاد ہونے کا قصہ اس طرح ہے کہ اس وقت میدیا بہت سے ضلعوں
میں منقسم تھا اور ہر ضلع کے جدا جدا خود مختار حاکم تھے۔ ان میں سے ایک ضلع کا حاکم
"ڈیوکسیز" (Deioces) تھا جو اپنے انصاف کے لئے دور دور مشہور تھا
اس کی وجہ سے دوسرے اضلاع کے لوگ اپنے معاملات ڈیوکسیز کے سپرد کر کے
اس سے اپنا انصاف کراتے تھے۔ زیادتی کام سے تنگ آکر اس نے اعلان
کرا دیا کہ اب وہ دوسرے اضلاع کے مقدّمات طے نہ کرے گا بلکہ خود اپنے ضلع کی
بہبودی میں اپنا وقت صرف کیا کرے گا۔ مگر چونکہ دوسرے اضلاع کے حاکم لالچی اور
بے ایمان تھے اس لئے اُن کے ہاں بدامنی اور لوٹ مار کی زیادتی ہوئی۔ اس سے
تنگ آکر جملہ اضلاع کے لوگوں نے جمع ہو کر مشورہ کیا کہ قانونی حکومت قائم کرنے کے لئے

کرنے تو وہ نسبتاً قلیل مدت تک زندہ رہتا ہے۔ برخلاف اس کے تنفس کی رفتار آہستہ ہو جانے سے اس کی عمر طویل ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ دونوں صورتوں میں خارج شدہ کاربن ڈکسائڈ کی کل مقدار تقریباً مساوی ہوتی ہے۔ اس قانون قدرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے محققین نے وقتاً فوقتاً ایسے ذرائع دریافت کرنے کی کوشش کی ہے جن کے استعمال سے تنفس کو ضرورت کے مطابق ہلکا کرکے پھل کو عرصہ دراز تک محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً سردی میں پھل دیر تک قائم رہتا ہے۔ نیز ہوا میں آکسیجن کی مقدار کم ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ عرصہ تک ٹھیک رہ سکتا ہے۔ اس لئے پھلوں کو برقرار رکھنے کے لئے عام طور پر یہ دونوں طریقے بیک وقت استعمال کئے جاتے ہیں۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ گرمی کی وجہ سے پھل سرعت کے ساتھ سانس لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گرمی میں وہ جلدی پک کر تیار ہو جاتا ہے۔ امریکہ میں ہزاروں من کیلوں اور دیگر پھلوں کو ایتھلین گیس کی مدد سے بھی پختہ کیا جاتا ہے۔ یہ گیس کوئلہ کے دھوئیں میں موجود ہوتی ہے اور اس کے اثر سے نباتاتی اجسام کا تنفس بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس امر کا انکشاف پہلی مرتبہ تقریباً بیس سال قبل ایک نوجوان انگریز ہرکلائس نے کیا تھا۔ اس کے بعد امریکہ کے سائنسدانوں نے خود بخود اس حقیقت کو دریافت کر لیا۔ بدقسمتی سے دنیائے سائنس بیچارے ہرکلائس کے دلچسپ تجربات سے اب تک بے خبر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پتوں کے تنفس کا مطالعہ کرنے کے دوران میں ایک صبح ہرکلائس کو تنفس کی رفتار میں اچانک تیزی دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔ چونکہ بعض اوقات مختلف امراض کی وجہ سے نباتاتی اجسام کا تنفس معمول سے تجاوز کر جاتا ہے اس لئے سب سے پہلے اس نے تجرباتی پتوں کا بغور امتحان کیا مگر وہ بالکل صحیح و سالم تھے۔ اس کے بعد اس نے آلات کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کی مگر وہ بھی ہر ممکن نقص سے پاک تھے۔ بعد ازاں پریشانی اور مایوسی کی حالت میں وہ اپنے استاد کے پاس پہنچا اور ان کو اس قسم کی شیطانی مداخلت سے آگاہ کیا۔ تمام واقعہ سن کر استاد مسکراتے ہوئے اور بڑے اعتماد کے ساتھ کمرہ میں گئے۔ وہاں داخل ہوتے ہی انھوں نے کمرہ کی فضا میں کوئلہ کی گیس کی بدبو محسوس کی جس کو ہرکلائس زکام کی وجہ سے معلوم نہیں کر سکا تھا۔ تحقیقات کرنے کے بعد پتہ چلا کہ ایک نوآوردہ اور ناتجربہ کار ملازم نے پہلے روز شام کے وقت کپڑے کے جھاڑن سے میزیں صاف کرتے ہوئے بے خبری میں گیس کی ٹونٹی قدرے کھول دیا تھا۔ اس لئے رات بھر گیس آہستہ آہستہ ہوا میں مل کر بیرونی نلکی کے راستہ ... کی صندوقچی کے اندر داخل ہوتی رہی۔ اگلے روز صبح کے وقت جب ملازم مذکور کو

ہوئے ہیں۔ اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری میں [illegible] شاعری کی ابتدا [illegible] ہو چکی تھی مگر اس میں ادبیانی خصوصیات بھی پیدا ہو چکے تھے۔ تصنیف و تالیف عام طور سے رائج ہو چکی تھی۔ موجودہ معلومات کے لحاظ سے بہمنی عہد کے نظامی شاعر کی مثنوی کو جو [illegible] ہجری میں مرتب ہوئی ہے۔ اور خواجہ بندہ نواز متوفی ۸۲۵ھ کی مثنویوں کو اردو شاعری کے ابتدائی نمونے قرار دینا ناگزیر ہے۔

اردو شاعری کے اقسام

اس بات میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ ابتدائی اردو شعرا نے اپنی فکر کی جولانی کے لئے جو میدان منتخب کیا اسی میں اس سے پہلے فارسی شعرا نے اپنی جودت و ذہانت کے جوہر دکھائے تھے۔ لامحالہ یہ امر ناگزیر تھا کہ اردو شاعری اسی ڈگر پر چلتی رہی جس پر اس سے پہلے فارسی شاعری چل چکی تھی اور قصیدہ۔ غزل۔ مثنوی۔ رُباعی۔ قطعات وغیرہ کا وہی قالب تیار ہوا جو اس سے قبل ایران میں بن چکا تھا۔ چنانچہ اردو شاعری کے ابتدا ہی سے یہ تمام نظم نگاری کے اقسام اردو نظم نگاری میں بھی پائے جاتے ہیں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ شعرائے اردو نے اولاً مثنوی میں اپنے قلم کا زور دکھایا، اس کے بعد قصیدہ اور غزل وغیرہ وجود میں آئے ہیں۔ بہرحال یہ بحث خود علحدہ صراحت طلب ہے۔

اردو شاعری کے موضوعات

اب اصل موضوع اردو شاعری کے موضوعات کی جانب توجہ کرنا ضروری ہے، قدیم اردو شاعری کا سرسری جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے موضوع متعدد تھے۔ فکر کا میدان بہت وسیع تھا۔ تصوّف، فلسفہ، اخلاق، تاریخ، واقعہ نگاری، سوانح، نیچرل امور کی ترجمانی سب اس دائرہ میں شامل تھے۔ اردو شاعری آج سے چار سو سال پہلے بھی اپنے موضوعات کے لحاظ سے کسی اور زبان کی شاعری سے کسی طرح شرمندہ نہیں تھی، اس کے متعلق اس قدر کثیر ذخیرہ موجود ہے کہ خود ایک مستقل کتاب تصنیف ہو سکتی ہے۔

تصوّف

یہ سب کو معلوم ہے کہ فارسی شاعری میں تصوّف کا خاص حصہ ہے، فارسی کے نامور اور جلیل القدر شعرا مثلاً ابو سعید ابوالخیر، مولانا رومی، عطار [illegible] [illegible] کا کلام سراپا تصوّف ہی تصوّف ہے [illegible] دل پر وارفتگی کی [illegible] [illegible] دنیا میں [illegible] [illegible] خیالات میں [illegible] [illegible] کی [illegible] [illegible] [illegible]